سوشلزم نمبر

(جلد اوّل)

اشاعت خاص، ۱۹۶۷ء

*

مجلسِ ادارت:
خورشید احمد
احمد انس
ممتاز احمد

علمی کتاب گھر،
۵۵-فلیمنگ روڈ-لاہور

جلد — ۲۱
شمارہ — ۱۲

دسمبر ۱۹۶۷ء

سالانہ چندہ ــــــــ 9/= روپے
قیمت فی شمارہ ــــــــ 75/= پیسے
بھارتی خریدار : اپنی رقومات مکتبہ الحسنات رام پور
یو۔پی کے پتہ پر ارسال فرماکر ہمیں مطلع فرمائیں۔

ادارتی امور:

ادارہ معارف اسلامی ۱/جی/۵/۱۳۔ ناظم آباد۔کراچی

انتظامی امور:

مینجر چراغ راہ۔ یوسف منزل ھرمزجی روڈ ۔ کراچی

طابع و ناشر :

سید کاظم علی

مطبع :

مشہور پریس ۔کراچی

مقام اشاعت:

یوسف منزل، ھرمزجی روڈ۔ کراچی

قیمت، سوشلزم نمبر : 6/- روپے

ادارۂ معارف اسلامی

ادارہ معارف اسلامی (رجسٹرڈ) ایک آزاد علمی اور تحقیقی ادارہ ہے جو اسلام کی حقیقی اور بے آمیز تعلیمات کو دورِ جدید کی زبان میں پیش کرنے اور اسلام کی رہنمائی میں آج کے معاشرہ کے مسائل کا حل تلاش کرنے کے علمی کام میں مصروف ہے۔ اس ادارہ کا قیام ۱۹۶۳ء میں عمل میں آیا۔ ایک با اختیار مجلس منتظمہ اس کے تمام امور کی ذمہ دار ہے۔ ادارہ کا مرکزی نظم کراچی میں ہے اور ایک مختصر شاخ ڈھاکہ میں کام کر رہی ہے۔ جن مقاصد کے حصول کے لئے یہ ادارہ کوشاں ہے وہ یہ ہیں:

- اسلامی تعلیمات کو، پوری تحقیق اور علمی جستجو کے بعد، جدید ترین اسلوبِ اظہار کو اختیار کرتے ہوئے پیش کرنا اور تمدن، تاریخ، قانون، معیشت اور دوسرے دائروں میں جو مسائل درپیش ہیں ان کا حل اسلام کی روشنی میں پیش کرنا۔
- علمائے اسلام کے تحقیقی کارناموں کا ترجمہ، ترتیبِ نو، تشریح و توضیح اور اشاعت۔ اس طرح قدیم علمی خزانوں تک آج کے طالب علموں کی رسائی کا سامان کرنا۔
- عالم اسلام کے موجودہ مسائل اور مستقبل کے امکانات کے بارے میں صحیح اور حقیقت پسندانہ فہم پیدا کرنے کے لئے، مسلم ممالک کے بارے میں بالعموم اور پاکستان کے بارے میں بالخصوص تحقیقی کام کرنا۔
- اسلامی موضوعات پر دورِ حاضر کے مسلم علماء کے نمایاں کارناموں کے وسیع اشاعت اور نفوذ کی خاطر، دنیا کی اہم زبانوں میں بالخصوص عربی، اردو، انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور سواحلی میں انکے ترجمہ اور اشاعت کا انتظام کرنا۔
- عام پڑھے لکھے لوگوں میں اسلامی تہذیب و تمدن اور تاریخ اور مسلم دنیا کے موجودہ مسائل کا صحیح فہم پیدا کرنے کے لئے مناسب طرز کی عام فہم کتابوں کی تیاری اور اشاعت کا انتظام کرنا۔
- تعلیم کو مثبت اسلامی آہنگ دینے کے لئے اور اسلامی بنیادوں پر تشکیل شدہ ایک نئے نظامِ تعلیم کے ارتقاء کی راہ ہموار کرنے کیلئے تعلیم کے مختلف مراحل کی نصابی اور امدادی کتب کی تیاری اور اشاعت کا انتظام کرنا۔

لکھنے والے

عبدالحمید صدیقی۔ مدیر معاون ترجمان القرآن لاہور، رفیق ادارہ معارف اسلامی، مصنف "اسلام کا فلسفۂ تاریخ (اردو، انگریزی) اسلامی تھیاکریسی (اردو، انگریزی) اور کئی دیگر کتابیں۔

قاضی عبدالقادر۔ استاد شعبۂ فلسفہ، جامعہ کراچی

ممتاز احمد۔ متعلم ایم۔ اے۔ جامعہ کراچی۔ رفیق ادارہ معارفِ اسلامی

محمد عثمان رمز۔ مقالہ نگار، شاعر، ویلفیئر آفیسر امین جوٹ ملز۔ چٹاگانگ۔

حسین حنان۔ متعلم ایم۔ اے، ٹوکیو یونیورسٹی، سکریٹری، اسلامک سنٹر جاپان۔

ظفر اسحاق انصاری۔ ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی۔ (میکگل یونیورسٹی) پروفیسر کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی۔ جدہ۔

خلیل حامدی۔ رفیق۔ دارالعروبہ۔ جماعت اسلامی پاکستان، لاہور۔

حسان کلیمی۔ ایم۔ اے۔ سابق ایڈیٹر مسلم نیوز انٹرنیشنل

یعقوب طاہر۔

وزیر غازی۔

احمد النبی۔ مدیر معاون چراغ راہ، کراچی

آباد شاہ پوری

اے۔ کے۔ بروہی۔ ایڈوکیٹ سپریم کورٹ آف پاکستان۔ مصنف "پاکستان کا اساسی قانون"

نعیم صدیقی ۔ مدیر سیارہ لاہور۔ مصنف شعلۂ خیال، خون آہنگ، پھر ایک کارواں لٹا (شعری مجموعے)۔ فکر و نظر، تحریب و تعمیر۔ معروف و منکر۔ اسلام کا فلسفۂ ملکیت، معاشی ناہمواریوں کا اسلامی حل۔ وغیرہ

فاتک عزیز احمد چوہدری ایم۔ اے

خورشید احمد۔

شرکاء مذاکرہ:

آرنلڈ۔ جے۔ ٹائن بی ۔ ادارہ بین الاقوامی تعلقات۔ لندن۔

آئی۔ آئی۔ جے۔ روزنتھال ۔ پیم بروک کالج۔ کیمبرج یونیورسٹی۔

ڈبلیو۔ مونٹگمری واٹ ۔ شعبۂ عربی و اسلامی علوم، ایڈنبرا یونیورسٹی۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی ۔ رکن مجلس تاسیسی رابطہ عالم اسلامی، مکہ۔ امیر جماعت اسلامی پاکستان، مصنف تفہیم القرآن۔ اسلامی تہذیب۔ پردہ وغیرہ

چودھری محمد علی ۔ صدر نظام اسلام پارٹی۔ سابق وزیر اعظم پاکستان مصنف ظہور پاکستان (انگریزی)، معاشی ترقی کا جائزہ (انگریزی)،

جسٹس عبدالحمید ۔ پرنسپل لاء کالج پشاور۔ سابق جسٹس عدالت عالیہ مغربی پاکستان۔

مندرجات

۵
اسلامی سوشلزم

۶

۷
تیسرا راستہ

اہم اعلان

سوشلزم نمبر

حصہ دوم

صفحات کی کمی کی وجہ سے سوشلزم نمبر میں بعض مضامین شامل اشاعت نہیں کئے جاسکے ہیں۔ ان مضامین کے ساتھ کچھ نئے مزید مضامین شامل کر کے سوشلزم نمبر حصہ دوم شائع کیا جارہا ہے ــــ اسکی قیمت وغیرہ کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔ اسکے مشمولات درج ذیل ہیں:۔

- مارکسزم کا نشوو ارتقاء، جیلانی بی اے
- اسلامی ریاست کی معاشی ذمہ داریاں، نجات اللہ صدیقی
- اسلام اور سوشلزم، حکیم محمد اسحاق
- روس اور چین کے مابین افتراق، عبدالحمید صدیقی
- اردو ادب میں اشتراکی رجحانات، عبدالمغنی
- ادیب اور کمیونسٹ نظام، گوپال متل
- روس میں اسلام، والٹر کولارز۔ ترجمہ: اعجاز احمد۔ احمد انس
- جنوں کی حکایات خونچکاں، ترتیب۔ ممتاز احمد
- [illegible] راز: ، ترتیب: ممتاز احمد
- اشتراکیت: دانشوروں کی نظر میں۔ ترتیب: ممتاز احمد

ــــ حصہ اول اور دوم کا مکمل اشاریہ

ــــ کتابیات۔ سوشلزم پر انگریزی اور اردو کتابوں کی فہرست

دفتر: ماہنامہ چراغ راہ
[illegible]

پیرایہ آغاز

چراغ راہ کے دورِنو کا پہلا خاص نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ہم خدائے بزرگ و برتر کا صمیم قلب سے شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے اس اشاعت خاص کو آپ تک پہنچانے کی توفیق بخشی۔

○

اس وقت پوری اسلامی دنیا میں، اور خود پاکستان میں، سوشلزم موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ ایک گروہ سوشلزم کے مبلغ کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔ کچھ دوسرے لوگ سوشلزم اور اسلام کا ایک مرکب بنانا چاہتے ہیں اور وہ اسلامی سوشلزم کی بات کر رہے ہیں۔ یہ آوازیں مختلف سمتوں سے اٹھ رہی ہیں۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ اصل مسئلہ کا خالص علمی انداز میں تحقیقی دیانت کے ساتھ جائزہ لیا جائے اور جو راستہ بھی اختیار کیا جاتے سوچ سمجھ کر اختیار کیا جائے۔ یہ نمبر آپ کو اس مسئلہ کے سمجھنے میں مدد دے گا۔

جو لوگ سوشلزم کی بات کر رہے ہیں اگر ان کے افکار و آراء کا تجزیہ کیا جائے تو ان کو مندرجہ ذیل گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(الف) وہ حضرات جنھوں نے اشتراکیت کو سوچ سمجھ کر اختیار کیا ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اشتراکیت کے سوا کوئی اور نظریہ یا مذہب آج کی دنیا کی ضرورت کو پورا نہیں کر سکتا۔ یہ حضرات اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ ان کی نگاہ میں مذہب کو مٹا دینا چاہئے یا کم از کم نظر انداز کر دینا چاہئے اور سماجی تعمیر اشتراکی اصولوں کے مطابق ہونی چاہیے۔ اپنی بات اتنے کھل کر کہنے کی اخلاقی جرأت کم ہی لوگوں میں ہے۔ لیکن یہ گروہ بھی مسلمان ممالک میں موجود ہے، گو معمولی اقلیت میں ہے۔

(ب) وہ حضرات جن کے دل و دماغ اشتراکیت کو قبول کر چکے ہیں لیکن وہ اشتراکیت کی بات کھلے عام کرنا قرین مصلحت نہیں سمجھتے۔ اس لئے اس پر اسلامی سوشلزم کا لیبل لگاتے ہیں تاکہ اس قوم کے لئے اشتراکیت قابل قبول ہو جائے۔ جو لوگ جان بوجھ کر یہ کام کر رہے ہیں وہ بھی ہیں تو دراصل زمرہ (الف) ہی سے متعلق، لیکن اخلاقی جرأت کی کمی کے باعث کڑوی گولی پر شکر کی تہ جمانے کا کام کر رہے ہیں۔

(ج) وہ حضرات جنھوں نے اشتراکیت کو غور و فکر کے بعد قبول نہیں کیا ہے بلکہ محض فیشن ہونے کی وجہ سے اختیار کر لیا ہے۔ ان کا مطالعہ بہت کم اور معلومات بہت نامکمل ہیں۔ یہ نہ اشتراکیت کی بنیادوں سے واقف ہیں نہ اس کے نظام کار سے اور نہ ہی ان نتائج سے جو اشتراکیت کا تجربہ پیدا کر چکا ہے۔

(د) اوپر کے گروہ (ج) میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اخلاص کے ساتھ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اشتراکیت میں خیر ہے اور

وہ اسلام سے متصادم نہیں۔ اس لئے دونوں کا اجتماع ہو سکتا ہے۔ ان کا یہ خیال اس وجہ سے بھی ہے کہ وہ اشتراکیت سے پوری طرح واقف نہیں ہیں اور اس وجہ سے بھی کہ ان میں سے کچھ کا تصور مذہب وہی روایتی تصور ہے۔ یعنی مذہب نماز روزہ سے عبارت ہے اور اجتماعی زندگی کے باقی تمام امور وقت کے تصورات کے مطابق طے کئے جا سکتے ہیں۔

(ھ) ایک بڑا گروہ ہے جسے اشتراکیت سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ اس لئے کہ اس کے بارے میں اخباروں میں تھوڑا بہت دیکھا ہے اور اڑتی اڑاتی باتیں سنی ہیں۔ لیکن اس نظریہ کے ضروری پہلوؤں سے وہ کما حقہ واقف نہیں ہے۔ وہ ابھی اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا ہے۔ لیکن کوئی رائے قائم ضرور کرنا چاہتا ہے۔

ان میں سے ہر گروہ کے اپنے مسائل اور نفسیات ہیں۔ اس نمبر میں ہمارے مخاطب یہ تمام ہی لوگ ہیں۔

(الف) اور (ب) میں بیان کئے ہوئے حضرات سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اس نمبر کے مضامین پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ اور ہٹ دھرمی کی جگہ حق پرستی کی روش اختیار کریں۔ وہ صرف دلیل کی زبان کو وزن دیں اور جس چیز پر دل و دماغ مطمئن ہو جائیں اسے قبول کر لیں۔ اگر آپ دلیل سے اپنی کوئی رائے بدل دیتے ہیں تو یہ تلون مزاجی نہیں حق دوستی ہے۔ (ج) (د) اور (ھ) میں بیان کئے ہوئے بھائیوں سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اشتراکیت کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر اس کے بارے میں رائے قائم کریں۔ محض کچھ مقامات پر کسی چیز کا چلن اس کی صداقت کی دلیل نہیں ہے۔ محض نعرہ بازی اور فیشن پرستی میں نہ نظریات کو قبول کیا جاتا ہے اور نہ رد۔ یہ کام تحقیقی مطالعہ اور ٹھنڈے سوچ بچار سے ہونا چاہئے اور ہم ان کو اسی کی دعوت دیتے ہیں۔ کسی نے صحیح کہا ہے کہ "جو دلیل کا مقابلہ نہ کر سکتا ہو وہ بزدل ہے، جو دلیل کے آگے سر تسلیم خم نہ کر دے وہ بے وقوف ہے اور جو دلیل کی زبان سمجھنے کا اہل ہی نہ ہو وہ احمق ہے۔" ہم ان سب گروہوں کو دعوت دیتے ہیں کہ جذباتیت سے بلند ہو کر خالص استدلالی سطح پر اس مسئلہ پر غور کریں۔ اس اشاعت خاص میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے۔ وہ دلیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، ناقابل انکار شواہد کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ اور دلیل کا جواب دلیل سے دینے اور علمی مجادلہ کرنے کے لئے ہم ہر وقت تیار ہیں۔ اس میں علم کی ترقی ہے اور ذہن کی زندگی کا راز مضمر ہے۔

○

یہاں ہم ایک امر کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں۔ کچھ لوگ جنھیں اشتراکیت سے نہ معلوم کس قسم کی دلچسپی ہے، یہ شوشہ چھوڑتے ہیں کہ اشتراکیت پر تنقید سے اشتراکی ممالک سے پاکستان کے تعلقات کشیدہ ہو جائیں گے۔ یہ بات نہ صرف سطحی اور بے حقیقت ہے بلکہ مضحکہ خیز ہے۔ اس سلسلہ میں چند باتیں ذہن میں رہیں تو بہتر ہے۔

۱۔ اشتراکیت، سرمایہ داری، جمہوریت، فسطائیت، مغربیت، صنعتیت، یہ سب مختلف نوع کے نظریات ہیں اور ان کا تنقیدی اور تحقیقی مطالعہ ایک خالص علمی کام ہے۔ اس کا کوئی تعلق تعلقات خارجہ سے نہیں۔ دنیا کے سارے ممالک میں مختلف نظاموں اور نظریات کا تنقیدی مطالعہ ہوتا ہے اور کوئی صاحب ہوش اسے تعلقات خارجہ کا مسئلہ نہیں بناتا۔ حد یہ ہے کہ مذاہب کے باب میں بھی جہاں جذبات سب سے زیادہ نازک ہوتے ہیں، کبھی سفارتی تعلقات کا ڈھول نہیں پیٹا جاتا۔ جس زمانے میں ہمارے تعلقات امریکہ سے نہایت گہرے تھے، اس زمانے میں بھی ہم نے سرمایہ داری پر کڑی تنقید کی ہے۔ لادینی جمہوریت

کی دھجیاں بکھیری ہیں لیکن تعلقات خارجہ پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ اب اگر اشتراکی ممالک سے ہمارے تعلقات دوستانہ ہیں.. تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اشتراکیت کا علمی محاسبہ نہ کیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ خود مغربی اور اشتراکی ممالک میں اسلام کے خلاف جو کچھ لکھا جاتا ہے، اور علمی انداز میں یا تحقیقی طریقہ پر نہیں بلکہ سطحی اور بازاری انداز میں لکھا جاتا ہے اس نے آج تک مسلمان ملکوں سے ان کے سفارتی تعلقات کو متاثر کیوں نہیں کیا؟ ہر شخص اس امر سے واقف ہے کہ امریکہ میں اشتراکیت کے خلاف سب سے زیادہ کام ہو رہا ہے اور حد یہ ہے کہ ان کی چند یونیورسٹیوں میں تو اشتراکیت کا مطالعہ تک ممنوع ہے لیکن اس کے باوجود روس اور امریکہ کے نہ صرف یہ کہ سفارتی تعلقات ہیں بلکہ گذشتہ پانچ چھ سال سے بین الاقوامی امور پر ان دونوں کا اتحاد و اشتراک بڑھتا جا رہا ہے۔ ایشیا اور افریقہ کے کئی ممالک ایسے ہیں جہاں اشتراکی پارٹی اور اشتراکی فکر پر قانونی پابندی رہی ہے۔ لیکن روس سے نہ صرف یہ کہ ان کے تعلقات دوستانہ تھے، بلکہ معاشی تعاون اور مالی امداد تک کا سلسلہ جاری تھا۔

۲ ۔ پھر ایک اصولی بات یہ سامنے رہنی چاہئے کہ مغربی ممالک سے دوستی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان کے نظام تمدن اور نظریۂ حیات کو بھی ہم قبول کرلیں یا اس کا تنقیدی مطالعہ ترک کردیں۔ اسی طرح اشتراکی ممالک سے دوستی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم اشتراکیت کے کاسہ لیس بن جائیں۔ سفارتی تعلقات ایک چیز ہیں اور نظریاتی الحاق اور تمدنی امور میں لین دین بالکل جدا چیز۔ ان دونوں میں خلط مبحث وہی لوگ کرتے ہیں جن کا یا کوئی مخصوص مفاد ہو، اور یا جو بین الاقوامی سیاست کے مبادیات سے بھی واقف نہیں ہیں۔

۳ ۔ ایک اور بات جو قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ ایک ملک کی خارجہ پالیسی کا انحصار کن چیزوں پر ہوتا ہے۔ اس کا اپنا نظریۂ حیات اور اس کا ملی مفاد۔ اگر ان دونوں کو خارجہ تعلقات کے نام پر بھینٹ چڑھایا جا سکتا ہو تو پھر ایسے تعلقات کا کیا فائدہ؟ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اشتراکیت پر تنقید سے اشتراکی ممالک سے تعلقات خراب ہو جائیں گے، کیا انھوں نے یہ غور کیا ہے کہ اس میں کیا مضمر ہے؟ کیا اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اشتراکی ممالک کے تعلقات کی قیمت ہم کو یہ ادا کرنی چاہئے کہ اپنے نظریۂ حیات کو ترک کردیں اور اشتراکیت کو قبول کریں؟ ہم یہ ماننے سے انکاری ہیں کہ روس یا چین ایسی احمقانہ بات کریں گے کہ تم سے دوستی صرف اس شرط پر ہو سکتی ہے کہ تم اشتراکیت پر تنقید نہ کرو؟ یا امریکہ اور برطانیہ ہم سے یہ مطالبہ کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ ہماری دوستی کی قیمت اس طرح ادا کرو کہ سرمایہ دارانہ نظام اختیار کرو اور ہماری لادینیت پر تنقید نہ کرو۔ اگر کوئی ایسی احمقانہ اور سرکشانہ بات کہتا ہے تو ہمارا جواب صرف یہ ہونا چاہیئے کہ ہمیں ایسی دوستی نہیں چاہیئے جس کی قیمت اپنے نظریۂ حیات اور اپنی فکر و عمل کی آزادی کی شکل میں دینی پڑے۔

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

ہمارے خیال میں یہ بات یا تو شرپسند عناصر کہتے ہیں یا وہ لوگ جو بادشاہ سے بھی زیادہ تاج کے وفادار ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور بہر دو صورت یہ بات مہمل اور ناقابل التفات ہے۔

•

سوشلزم نمبر کو ، حصوں میں تقسیم کیا جا رہا ہے ۔ پہلے حصہ میں سوشلزم کا مفصل علمی جائزہ لیا جا رہا ہے ۔ اس کی حیثیت ایک مقدمہ کی سی ہے جس میں اشتراکیت کے حق میں دیئے جانے والے دلائل اور اس کے خلاف پیش کئے جانے والے مواد کا محاکمہ ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح بحیثیت مجموعی اس تحریک اور اس نظام سے دنیا کو خسارہ پہنچا ہے ۔

دوسرے حصے میں اشتراکیت کا علمی جائزہ لیا گیا ہے ۔ اس میں پانچ مضامین ہیں ۔ پروفیسر عبدالحمید صدیقی نے ایک نئے انداز میں اشتراکیت کی فکری بنیادوں کا علمی تجزیہ کیا ہے اور ان کی خامیوں اور کمزوریوں کو واضح کیا ہے ۔ قاضی عبدالقادر صاحب نے مارکس کی فکر کے ایک اچھوتے لیکن اہم پہلو پر روشنی ڈالی ہے اور مارکس کے تجزیہ کو ذرا اور وسعت دے کر خود اشتراکی نظام کو اس پر جانچا ہے ۔ ممتاز احمد صاحب نے فرانسیسی مفکر سارتر کے افکار کی روشنی میں ، مارکس کی طبیعات اور مابعد الطبیعات سے بحث کی ہے ۔ رمز صاحب نے اشتراکیت اور مذہب کی ابدی کشمکش کو نمایاں کیا ہے اور حسین خاں نے اشتراکیت اور معاشی ترقی کے موضوع پر داد تحقیق دی ہے ۔ قاضی عبدالقادر صاحب پہلی بار چراغ راہ کی بزم میں شریک ہو رہے ہیں اور ہم ان کو خوش آمدید کہتے ہیں ۔ حسین خاں صاحب بھی بحیثیت مقالہ نگار پہلی بار ہماری محفل میں شریک ہو رہے ہیں ۔ ہمیں توقع ہے کہ وہ انشاء اللہ آئندہ علمی میدان میں مفید خدمات انجام دیں گے ۔

تیسرے حصہ میں ان حقائق کو پیش کیا جا رہا ہے جن کے ذریعہ یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اشتراکیت کے زیر سایہ اسلام اور مسلمانوں پر کیا بیتی ۔ احمد انس صاحب نے اشتراکی مستشرقین کے کام کا جائزہ لیا ہے اور دکھایا ہے کہ کس طرح انھوں نے اسلام کی تعلیمات کو مسخ کیا ہے اور آبادشاہ پوری صاحب نے روس کی مسلم کش پالیسی کا تاریخی جائزہ لیا ہے ۔

چوتھے حصے میں عالم اسلام میں اشتراکی تحریک کا جائزہ لیا گیا ہے ۔ اس حصے میں ۶ مضامین ہیں ۔ دو عرب دنیا کے متعلق ، دو پاکستان کے متعلق اور ایک ایک انڈونیشیا اور الجزائر کے بارے میں ۔ یہ حصہ ہمارے اس خاص نمبر کی ایک خاص چیز ہے اور ہمیں توقع ہے کہ قارئین اس میں اشتراکی تحریک کے حقیقی خدوخال کا مطالعہ کر سکیں گے ۔

پانچواں حصہ وقت کے اس مسئلہ کے بارے میں ہے جس نے اس نمبر کی ضرورت کا احساس پیدا کیا ۔ یعنی اسلامی سوشلزم ۔ ایک حیثیت سے یہ اس اشاعت خاص کا قلب ہے ۔ اس میں چار مضامین دیئے جا رہے ہیں ۔ محترم بردہی صاحب نے اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز میں بحث کا آغاز کیا ہے ۔ برادر محترم نعیم صدیقی صاحب نے متعلقہ مسئلہ کے تمام ضروری پہلوؤں پر بڑی جامعیت کے ساتھ گفتگو کی ہے اور سوچنے کے لئے بہت سا مواد فراہم کر دیا ہے ۔ محترم مولانا معین الدین صاحب نے اسلام اور سوشلزم کی متضاد راہوں کو بڑی خوبی کے ساتھ واضح کیا ہے اور عزیز احمد صاحب نے اس سلسلہ میں اقبال کے افکار کو پیش کیا ہے اور شاعر مشرق کے نام پر جو دھوکہ دینے کی کوشش ہو رہی ہے اس کا پردہ چاک کیا ہے ۔

چھٹے حصہ میں مذاکرہ دیا جا رہا ہے جس میں پاکستان سے چار چوٹی کے اہل قلم اور یورپ کے تین اہم مفکر شرکت کر رہے ہیں ۔

آخری حصہ میں صرف ایک مضمون دیا جا رہا ہے ــــــ نعیم صدیقی صاحب کا " اسلام کا میزانی نظریہ معیشت " ۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اسلام اصل معاشی مسئلہ کو کس طرح حل کرتا ہے اور پاکستان اور پورے عالم اسلام کا مستقبل اشتراکیت کی پٹی ہوئی راہ کی جادہ پیمائی میں نہیں اسلام کے زندگی بخش نظام کو اختیار کرنے اور اسے انسانیت کے سامنے پیش کرنے میں ہے ، اشتراکیت نے صرف انصاف کا نام استعمال

کیا ہے، ورنہ اسے عدل وانصاف سے کوئی حقیقی دلچسپی نہیں ہے۔ اسلام عدل اور قسط کا نظام قائم کرنے آیا ہے اور دکھی انسانیت کی نجات اسی نظام میں ہے۔ محض اس کا نام لینے میں نہیں، یا دوسرے نظاموں پر اس کا لیبل چسپاں کرنے میں نہیں، بلکہ اسلام کے پورے نظام کو قائم کرنے میں ہے۔

اور یہی وہ نقطۂ نظر ہے جسے چراغ راہ ملت اسلامیہ کے سامنے پیش کر رہا ہے!

•

اس نمبر کے لئے جو دوسری چیزیں تیار کی گئی تھیں ان کو صفحات کی قلت کے باعث روک لیا گیا ہے۔ اس تمام مواد کو مزید اضافوں کے ساتھ دوسری جلد میں پیش کیا جائے گا۔ اور اسی جلد میں پورے نمبر کا مفصل اشاریہ (INDEX) بھی ہوگا۔ یہ اشاعت خاص ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ایک ایسے موقع پر شائع ہو رہی ہے جب اشتراکیت نے علمی دنیا میں اپنے پچاس سال پورے کرلئے ہیں۔ اب آئینۂ تاریخ میں اس کے حقیقی خدوخال صاف دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس نمبر میں بھی اشتراکیت کی پوری تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔ اور ہم نے جو بات بھی کہی ہے، دلیل کے ساتھ کہی ہے، سند کی بنیاد پر کہی ہے اور علمی انداز میں اور افہام وتفہیم کے مقصد سے کہی ہے ہم ملتِ اسلامیہ کے تمام طبقات کو، حتیٰ کہ ان لوگوں کو بھی جو اشتراکیت سے مرعوب یا اس کے زیر اثر ہیں، دعوت دیتے ہیں کہ اس میں پیش کئے ہوئے مواد پر ایمانداری کے ساتھ اور ٹھنڈے دل سے غور کریں اور پھر اس راستہ کو اختیار کریں جس کی طرف دلائل وشواہد اشارہ کریں۔ اور دل ودماغ جسے حقیقی اطمینان کے ساتھ قبول کریں۔ اگر دلیل کی جگہ نعرے لے لیں اور حقائق کی جگہ پروپیگنڈہ تو یہ فکر ونظر ہی کی موت نہیں، تہذیب وثقافت کے لئے بھی خطرہ ہے۔ ہم اس خطرہ سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں اور دلیل کی روشنی میں شاہراہ حیات کو طے کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ وما علینا الا البلاغ۔

•

اس اشاعت خاص میں ارکان ادارہ کے ناموں میں آپ ایک کمی محسوس کر رہے ہوں گے۔ رفیق محترم مصباح الاسلام فاروقی کا نام شریک بزم نہیں ہے۔ ہم نے یہ کمی دلی رنج کے ساتھ کی ہے۔ برادرم فاروقی صاحب پر حکومت پاکستان نے یہ پابندی لگادی ہے کہ ان کی ہر وہ تحریر یا ان کی مرتب کردہ ہر وہ چیز جو امور خارجہ سے متعلق ہو، قبل طباعت سنسر کے بغیر شائع نہیں ہو سکتی۔ اس فرمان خاص کے بعد ہم مجبور تھے کہ با دل ناخواستہ ان کا نام مجلس ادارت سے ہٹا دیں۔ اب ہم جیسے نیازمند اس کے سوا کیا کہیں۔

یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

خورشید احمد

افکار و مسائل

خورشید احمد
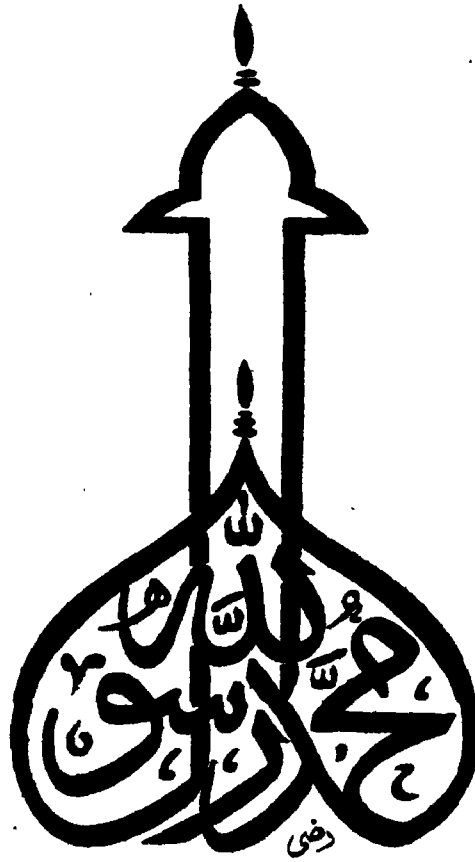
سوشلزم یا اسلام

ایک مسلم معاشرہ میں یہ سوال اٹھنا کہ اس کی منزل سوشلزم ہوگی یا اسلام ہے تو اچنبھے کی بات، لیکن یہ ایک ناخوش گوار حقیقت ہے کہ آج عالم اسلام میں یہ سوال اس شکل میں اٹھ چکا ہے اور اسے نظر انداز کرنا کسی طرح بھی دانشمندی کی روش نہیں ہو سکتی۔

آج عالم اسلام شدید ذہنی انتشار سے دوچار ہے۔ کبھی مسلم معاشرہ کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ اپنے مخصوص مزاج کے بارے میں غیر معمولی طور پر مضبوط اور حساس تھا۔ وہ ہر باطل نظریہ کے مقابلے میں ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند تھا۔ اس کی کیفیت اس شجر طیبہ کی سی تھی جس کی جڑیں ایمان اور عقیدہ میں مضبوطی کے ساتھ اتری ہوئی ہوں، جس کا تنا مضبوط اور شاخیں اپنی اصل سے پیوستہ ہوں، جس کے پتے تر و تازہ اور جس کے پھول شگفتہ ہوں۔ مختلف سمتوں سے آنے والی ہوائیں، خواہ وہ کیسی ہی تند و تیز کیوں نہ ہوں، اس درخت کو کوئی نقصان نہ پہنچا پاتی ہوں، بلکہ ان سے وہ اپنی ضرورت اور اپنے مزاج کے مطابق غذا حاصل کرتا اور اپنی بنیاد پر نئی وسعتوں اور بلندیوں سے ہم کنار ہوتا رہا۔ لیکن آج کیفیت بڑی مختلف ہے۔ اب وہ درخت کمزور ہو چکا ہے۔ صرصر اور باد سموم کے تھپیڑے اس کی تازگی اور سرسبزی کو مٹائے ڈال رہے ہیں۔ وہ دیوار جس کے قدموں پر کبھی ہر حملہ آور سرنگوں کر پسپا ہو جاتا تھا۔ آج اس کی بنیاد کمزور ہو گئی ہے۔ اس دیوار میں چھید اور رخنے پڑ چکے ہیں اور خود مسلم معاشرہ میں نئے آوازیں اٹھ رہی ہیں جو اس کے کانوں کے لئے اجنبی اور نامانوس ہیں۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج وقت کے چلتے ہوئے نظاموں سے شدید مرعوبیت کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ کچھ لوگ لادینیت پر فریفتہ ہیں۔ کچھ سرمایہ داری کے طلسم میں گرفتار ہیں۔ کچھ قومیت کے ہاتھوں نقد دل ہار چکے ہیں۔ کچھ اشتراکیت کے سحر میں مبتلا ہیں۔ غرض وقت کے ہر نظام کے کچھ نہ کچھ مؤید اور مدعی خود مسلمانوں میں سے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور اسلامی دنیا کو اپنے دل پسند نظام کی تجربہ گاہ بنانا چاہتے ہیں۔ اس کے لئے تعلیم و تبلیغ اور نشر و اشاعت کے ذرائع بھی استعمال کئے جا رہے ہیں اور جہاں جس حد تک ممکن ہے جبر و تشدد کے حربے بھی اختیار کئے جا رہے ہیں۔ یہ سب تحریکات اسلامی تہذیب و ثقافت کے لئے چیلنج کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان میں سے ایک نہایت اہم اور مؤثر چیلنج اشتراکیت کا ہے۔ ان صفحات میں ہم مختلف پہلوؤں سے اس رجحان کا جائزہ لینا چاہتے ہیں اور دلائل و شواہد کے ذریعہ اپنی قوم کے سوچنے سمجھنے والے عناصر کے سامنے یہ بات رکھنا چاہتے ہیں کہ ان کی اصل منزل کونسی ہے ——— سوشلزم یا اسلام؟

(۱)

سوشلزم کیا ہے؟

سب سے پہلے جس چیز کو سمجھنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ سوشلزم ہے کیا؟ اس کے معنی، مفہوم اور اس کے پروگرام کو متعین کرنے کے بعد ہی عالم اسلام کے لئے اس کے چیلنج کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

سوشلزم کا لفظ ان چند اصطلاحات میں سے ایک ہے جن کے مفہوم کے بارے میں شدید اختلاف اور انتشار فکر پایا جاتا ہے۔ معاشی اور معاشرتی امور میں حکومت کی معمولی مداخلت سے لے کر تمام وسائل دولت اور اشیائے صرف کے بہ جبر قومی تحویل میں لے لئے جانے تک کی کیفیات کے لئے یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ فکر و فلسفہ سے لے کر معمولی معمولی معاشی اصلاحات تک پر اس کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ مختلف محرکات کے تحت پیش کئے جانے والے مختلف النوع معاشی اور سیاسی خیالات کو اس لفظ کے سہارے بیان کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جتنے اختلافات سوشلزم کے معنیٰ کے بارے میں پائے جاتے ہیں، شاید کسی دوسرے لفظ کے بارے میں نہیں پائے جاتے! اسی بناء پر پروفیسر جوڈ نے کہا تھا کہ "سوشلزم اس ٹوپی کی مانند ہے جو اپنی شکل و صورت کھو چکی ہے، اور یہ اس لئے کہ ہر کوئی اسے اپنے سر پر منڈھنے میں مصروف ہے"[1] انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز کا فاضل مقالہ نگار بھی شکایت کرتا ہے کہ "سوشلزم، کمیونزم، اور اجتماعیت کی اصلاحات، جو بالعموم ایک دوسرے کے متبادل کے طور پر استعمال ہوتی ہیں، نہایت مبہم، غیر واضح اور صحیح تعریف .... سے محروم ہیں"[2] ایک انگریز اہل قلم اس صورت حال کا اس طرح اظہار کرتا ہے:

"یہ (سوشلزم) مرئی بھی ہے اور غیر مرئی بھی، نظری بھی ہے اور عملی بھی، تصوراتی بھی ہے اور مادی بھی، بہت قدیم بھی ہے اور بالکل جدید بھی۔ یہ لفظ ایک معمولی سے جذبے اور احساس سے لے کر واضح عملی پروگرام تک کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس کے مختلف مویدا سے مختلف صورتوں میں پیش کرتے ہیں۔ مثلاً اسے ایک فلسفۂ حیات، ایک قسم کے مذہب، ایک اخلاقی ضابطہ، ایک معاشی نظام، ایک تاریخی عرض، ایک قانونی اصول کہا جاتا ہے۔ پھر اسے بیک وقت ایک عوامی تحریک اور ایک سائنسی تجزیہ، ماضی کی ایک تعبیر اور مستقبل کا ایک تصور، آوازۂ جنگ اور نقارۂ امن، متشددانہ انقلاب اور خاموش تغیر، محبت اور بے لوثی کا صحیفہ اور نفرت اور خود غرضی کا مجسمہ، انسانیت کی امید اور تہذیب کا قاتل، دورِ نو کی علمبردار اور خوفناک تباہی کا پیامبر قرار دیا جاتا ہے"[3]

گویا اشتراکیت نہ ہوئی، اردو شاعری کے روایتی محبوب کی محفل ہو گئی کہ ؎

لائے ہیں اس کی بزم سے یار خبر الگ الگ

یا یوں سمجھئے کہ حضرتِ شیخ کا نقشِ قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

اور نتیجہ ظاہر ہے: شد پریشاں خواب من از کثرتِ تعبیر ہا

اور یہی وجہ ہے کہ بحث و گفتگو میں سوشلزم کے بہت سے مویدین اپنے موقف کو تبدیل کرنے اور ہر مشکل کے وقت پہلو بدلنے میں زیادہ دشواری محسوس نہیں کرتے۔

---

1. Joad, C. E. M., *Modern Political Theory*, Oxford,
2. Jaszi, Ozcar, "Socialism", *Encyclopaedia of the Social Sciences*, The Macmillan Co., New York, 1950, Vol: XIV, p. 210.
3. Shadwell, A. *Quarterly Review*, London, July, 1924, p. 2. Quoted by Loucks, William N., *Comparative Economic Systems*, Harper & Bros., New York, 1964, p. 179.

اشتراکیت کے اس پہلو کے پورے پورے اعتراف کے بعد ہم اس امر کی کوشش کریں گے کہ آوازوں کے اس جنگل میں سے کوئی صورت معنی پیدا کریں اور ان انواع کو نظرانداز کر کے جن پر اشتراکیت کا اطلاق بس تکلفاً ہی ہوتا ہے، ان بنیادی افکار و تصورات کو متشخص کرنے کی کوشش کریں جن سے اشتراکیت عبارت ہے۔

ہم ان تمام اشتراکی رجحانات کو نظرانداز کر سکتے ہیں جن کا سراغ ماضی بعید میں لگایا جاتا ہے۔ وہ سب بہت جزوی، نامکمل، مبہم اور خیالی (utopian) تھے۔ وہ اپنے وقت کی کسی مخصوص صورت حال کی پیداوار یا کسی وقتی عدم توازن کو دور کرنے کی ایک کوشش کی حیثیت رکھتے ہیں۔ البتہ ایک جامع نظریہ اور اجتماعی تحریک کی حیثیت سے اشتراکیت انیسویں صدی میں رونما ہوئی۔ ہماری توجہ کا اصل مرکز اشتراکیت کا یہی جدید دور رہے۔

اشتراکیت نے مغربی تہذیب کے بطن سے جنم لیا ہے اور اسی کی گود میں اس نے پرورش پائی ہے۔ اس نظریہ اور اس تحریک کو سمجھنے کے لیے اس کے تہذیبی پس منظر کو نگاہ میں رکھنا بے حد ضروری ہے۔

مغرب کی نئی زندگی کا آغاز اس فکری اور ذہنی رو سے ہوا جسے نشاۃ ثانیہ کہتے ہیں اور جو عبارت تھی قرونِ وسطیٰ کے مذہبی جبر و تشدد کے نظام کے خلاف بغاوت سے۔ سب سے پہلے فکری میدان میں آزادروی اور حرّیت پسندی (Liberalism) رونما ہوئی جس کا سب سے نمایاں مظہر پرانے ادب کا احیا رتھا۔ یہ تحریک دراصل یورپ کے مذہبی دور کے مقابلہ میں اس سے قبل کی دنیا سے ذہنی وابستگی کی علامت تھی۔ پرانی دیومالاؤں اور یونانی اور رومی اصنامی ادب (Pagan literature) سے رجوع کیا گیا اور فکر و فن کے ہر میدان میں مذہب کی دی ہوئی اقدار سے گریز، بلکہ ان سے انحراف اور ان کے خلاف بغاوت اور متشددانہ بغاوت کی روش اختیار کی گئی۔ پھر یہ لبرلزم فلسفہ کے میدان میں رونما ہوا اور الہامی ہدایت سے بے نیاز ہو کر محض عقل کے سہارے سفرِ حیات طے کرنے کا دعویٰ پیش کیا۔ عقلیت (rationalism) اور انسانیت پرستی (Humanism) کی تحریکات اسی رجحان کی علمبردار تھیں۔ اس کے بعد اس کا اظہار اخلاق و معاشرت کے دائرے میں ہوا اور روایتی اخلاق کے مقابلہ میں ایک قسم کی بے قیدی، آزادی پسندی اور بے راہ روی کی کیفیت رونما ہوئی۔ پھر یہ حریت پسندی خود مذہب کے دائرے میں رونما ہوئی اور اس نے تحریک اصلاح مذہب (Reformation) کو جنم دیا۔ بحیثیت مجموعی جو نیا نقطۂ نظر ابھرا اس میں آخرت کو اساس بنانے کی بجائے صرف اس دنیا کے سود و زیاں کو بنیاد بنانے کا رویہ تھا۔ نئی اقدار کا محور و مرکز جلب دنیا، حصول منفعت، لذت پسندی اور مادہ پرستی قرار پائی۔ اس کے اظہار کا اگلا میدان سیاست تھی۔ یہاں اس نے انفرادیت (individualism) کا روپ دھارا۔ بادشاہت اور استبدادی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا گیا، فرد کے حقوق کے لیے لڑائی لڑی گئی اور بالآخر عوام کی حاکمیت کی بنیاد پر لادینی جمہوری نظام قائم کیا گیا۔ سیاست ہی کا ایک اور پہلو مذہب کے نام پر ہمہ گیر بین الاقوامی ریاست تھی۔ اس کے خلاف بھی تحریک رونما ہوئی اور بین الاقوامیت کی جگہ قومیت کا محدود جغرافیائی تصور رونما ہوا۔ اور بالآخر خود معیشت کے دائرہ میں اس نئی روئے اپنا اظہار کیا اور صنعتی انقلاب کے سہارے جدید سرمایہ داری رونما ہوئی جس میں فرد کو معاشی سعی و جہد کی بے قید آزادی دی گئی، اور سرمایہ کو اصل فیصلہ کن قوت بنا دیا گیا اور ذاتی نفع کا حصول معیشت کی رہنما طاقت بنا۔ حکومت کی مداخلت کو محدود تر کر دیا گیا۔ اس کے نتیجہ میں شدید قسم کی معاشی انفرادیت (economic individualism) رونما ہوئی۔ سائنس اور ٹکنیک (technology) کی تمام قوتیں انفرادیت پسند تہذیب کو پروان چڑھانے کے لیے استعمال ہوئیں۔

لبرلزم کی اس تحریک نے جہاں مذہبی اور سیاسی استبداد سے پیدا ہونے والی بہت سی خرابیوں کو دور کیا اور نئی تخلیقی قوتوں کو جنم دیا، وہیں اس نے متعدد نئے مسائل اور پیچیدگیاں پیدا کردیں۔ نیا انسان، اخلاق، مذہب، قانون اور رواج کے تمام بندھنوں کو توڑ کر بالکل مادر پدر آزادی کے تباہ کن راستہ پر لگ گیا اور ظلم و استحصال کا ایک نیا اور خراب تر دور شروع ہوگیا۔ معیشت کے میدان میں یہ بگاڑ سب سے زیادہ شدید تھا۔ اس کے خلاف جو ہمہ گیر ردعمل رونما ہوا اس میں انفرادیت پرستی کی جگہ اجتماع پرستی نے لے لی۔ مغربی تہذیب کی باقی تمام بنیادوں کو جوں کا توں محفوظ رکھا گیا البتہ فرد کو اجتماعی مفاد کا پابند بنانے کی شکلیں تجویز ہونے لگیں۔ فرد کی جگہ سماج کو مرکزی اہمیت دینے کا تصور رونما ہوا اس کا اپنی انتہائی شکل میں اظہار سوشلزم کی تحریک میں ہوا۔

سوشلزم مغربی تہذیب کی اساس۔ عقلیت، لامذہبیت اور مادیت سے ابھرا اور اس کی کچھ بے اعتدالیوں۔ قومیت، انفرادیت اور سرمایہ داری۔ کی اجتماعیت کے ذریعہ تصحیح و تکمیل کی کوشش میں مصروف ہوگیا۔ جس مٹی سے اس کا خمیر اٹھا ہے وہ مغربی تہذیب ہی کی مٹی ہے، البتہ یہ اس کے کچھ پہلوؤں کی تکمیل کرتا ہے اور کچھ کی تردید و تنقیص یہ ہے، اشتراکیت کا ذہنی اور تہذیبی پس منظر[۵]۔

جدید لٹریچر میں اشتراکیت کا لفظ تین مختلف چیزوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

(الف) وہ نظام فکر اور اجتماعی نظریہ جو انفرادیت اور سرمایہ داری کے مقابلہ میں رونما ہوا۔

(ب) وہ عملی اجتماعی تحریک جو سرمایہ دارانہ نظام کو ختم کرنے اور اشتراکی نظام کو قائم کرنے کے لئے برپا ہوئی۔

(ج) وہ نظام مملکت جو ان ممالک میں قائم ہوا جہاں اشتراکی تحریک اپنا مطلوبہ انقلاب برپا کرنے میں کامیاب ہوگئی۔

ان تینوں کے اندر ایک جوہری وحدت پائی جاتی ہے لیکن تجزیہ اور محاکمہ کے لئے نظریہ، تحریک اور نظام میں فرق کرنا ضروری ہے۔ اس مطالعہ میں ہمارے پیش نظر نظریہ اور نظام ہوں گے، تحریک کی کیفیت اور اس کے پیدا کردہ مسائل سے ہم ضمناً تو تعرض کریں گے لیکن

---

[۵] ایک مشہور امریکی اہل قلم رسل ڈبلیو ڈیوینپورٹ لکھتا ہے کہ مغربی صنعتی تہذیب اور اشتراکی تمدن کا رشتہ ماں اور بیٹی کا رشتہ ہے، دونوں کی رگوں میں ایک ہی خون جاری و ساری ہے، دونوں کی اساس مشترک ہے۔

"دراصل وہ چیزیں جو امریکہ اور روس کو ایک دوسرے سے جدا اور ممیز کرتی ہیں آزاد دنیا کو اس درجہ حیرت اور خوف میں مبتلا نہیں کرتیں جتنی وہ چیزیں جو ان دونوں میں مشترک ہیں۔ ان دونوں "تکنیکی تہذیبوں" میں جو چیز مشترک ہے وہ ان کی فلسفیانہ رجائیت ہے، ایک کے سلسلہ میں کلیت پسندانہ اور بے جھجک، اور دوسرے کے سلسلہ میں اضافی اور متردد، لیکن بہر نوع ایک ایسی رجائیت جس کی نگاہ میں انسان صرفی کی تخلیق ہے، اس کی نجات اس دنیا کے اجتماعی مقاصد کے حصول کی شکل میں ہے اور جس کے حصول کا ذریعہ زیادہ صنعتی پیداوار، معاشی فراوانی اور ذہنی تعاون ہے۔ یہ بجائے کہ کلیت پسند رجائیت اور آزادی پسند رجائیت کے نتیجہ میں دو مختلف قسم کے انسان رونما ہوتے ہیں۔ یعنی صرفی انسان۔ اور صنعتی انسان۔ لیکن جس در پردہ خجالت اور پریشانی سے آزادی کی پری دوچار ہے وہ یہ ہے کہ صنعتی انسان صرفی انسان سے ایک حد تک جدا ہونے کے باوجود ایک طرز ماق سے انداز میں اس سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صرفی انسان، صنعتی انسان ہی کی اولاد ہے جیسا کہ مارکزم کی تاریخ سے ثابت ہے"

Russel W. Devenport,
The Dignity of Man, p. 238-39.

وہ ہمارا اصل موضوع بحث نہیں ہیں۔

سرمایہ داری کی بے اعتدالیوں، اس کے ظلم و استحصال اور عوام اور خصوصیت سے مزدور طبقہ کے ساتھ اس کے ناروا سلوک کے خلاف اٹھارویں صدی کے آخری نصف ہی میں آوازیں اٹھنا شروع ہوگئی تھیں۔ انیسویں صدی کے شروع میں یہ احساس اور بھی شدید ہوگیا کہ اصلاح حال کے لئے ضروری ہے کہ معاشی زندگی میں بنیادی تبدیلیاں کی جائیں۔ چونکہ سرمایہ داری کی بنیاد بے قید انفرادی ملکیت اور آزاد کاروبار پر تھی اس لئے ان حضرات نے اس بنیاد پر ضرب لگائی اور یہ تصور پیش کیا کہ اگر ساری پیداواری املاک قومی تحویل یا اجتماعی ملکیت میں لے لی جائیں تو سب مساوی ہوجائیں گے اور وہ چیز جو معاشی ظلم کا ذریعہ بن رہی ہے باقی نہ رہے گی۔ اس کے نتیجہ میں ایک دوسرا سماج رونما ہوگا اور وہ کہیں زیادہ صحت مند ہوگا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ تبدیلی رائے عامہ کی تیاری کے ذریعہ، عام سیاسی جدوجہد کے نتیجہ میں لائی جاسکتی ہے اور خود برسراقتدار اور بااثر طبقات کو اس کے لئے ذریعہ بنایا جاسکتا ہے۔ سینٹ سائمن، فیوریر اور رابرٹ اوون اس نقطۂ نظر کے علمبردار اور اسی مسلک کے پرچار میں معروف تھے۔ چونکہ وہ سرمایہ داری کی انفرادیت پرستی کو ختم کرنا چاہتے تھے اور فرد کی جگہ اجتماع کے مفاد کو اصل رہنما بنانا چاہتے تھے اس لئے اس نئی فکر کو سوشلزم کے نام سے موسوم کیا گیا۔ انیسویں صدی کی دوسری چوتھائی (۱۸۲۵-۵۰) میں اشتراکی افق پر مارکس رونما ہوا اور اگلے ۵۰ سال تک وہ اور اس کے افکار فضا پر چھائے رہے۔ جس بات کو مارکس کے پیش رو اخلاقی اور انسانی بنیادوں پر پیش کر رہے تھے مارکس نے اس کو ایک سائنس بنا کر پیش کیا اور اس وقت سے آج تک سوشلزم کے تقریباً ہر مکتبہ فکر پر مارکس اور اس کے علمی رفیق فریڈرک اینجلز کے نظریات کی چھاپ موجود ہے۔ اشتراکی فکر ایک امنگ، ایک تمنا اور ایک تجویز کی شکل میں تو موجود تھی لیکن اسے ایک جامع نظریہ اور ایک متبادل نظام کی حیثیت حاصل نہ تھی۔ مارکس اور اینجلز کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اسے یہ حیثیت عطا کی۔[۵] سوشلزم کی وہ شاخیں بھی جنھوں نے

---

[۵] مارکس اور اینجلز کی اہم تصانیف یہ ہیں۔

۱۔ اشتراکی منشور (Communist Manifesto) جو فروری ۱۸۴۸ء میں شائع ہوا۔ اس کا اصل ہدف نظام سرمایہ داری ہے، جس کے بارے میں پورے زور و شور کے ساتھ یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ وہ قریب المرگ ہے اور یہ دعویٰ تاریخ کی ایک خاص تعبیر۔ معاشی تعبیر۔ پر مبنی ہے۔ اس منشور نے بحث و گفتگو کو اخلاقیات کی سطح سے اٹھا کر تاریخ اور عمرانیات کی سطح پر پہنچا دیا اور سرمایہ داری کی موت اور اشتراکیت کا ظہور تاریخ کا تقاضا قرار دیئے گئے۔ مسئلہ پورے سماج کا مسئلہ بن گیا اور اس کی قسمت کا فیصلہ طبقاتی کشمکش کو سونپ دیا گیا۔ (ملاحظہ ہو مارکس اور اینجلز۔ منتخب مقالات، ماسکو، ۱۹۴۶ء صفحہ ۹-۱۴۲)

۲۔ نقد معاشیات قومی (Critique of Political Economy) یہ تحریر اس دعوے کے ثبوت میں لکھی گئی تھی جو منشور اشتراکیت میں کیا گیا تھا۔ لیکن اصل کتاب نامکمل رہی۔ صرف دو ابواب لکھے جاسکے جو اس عنوان سے چھپے ہیں۔ اس کا پیش لفظ اشتراکی لٹریچر کی اہم ترین تحریرات میں سے ایک ہے اور اس میں تاریخی مادیت کے نظریہ کو پندرہ نکات میں مرتب کیا گیا ہے۔ نقد معاشیات قومی میں قدر زائد کے نظریہ کو اس کی ابتدائی شکل میں بیان کیا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو کارل مارکس، اینجلز۔ منتخب مقالات، ماسکو۔ جلد اول۔ صفحہ ۲۹۹ تا ۳۱۴)

۳۔ سرمایہ (Capital) نقد معاشیات قومی اس دعویٰ کو ثابت کرنے میں ناکام رہی۔ نتیجتاً غیر موثر رہی (باقی اگلے صفحہ پر)

جزوی اصلاح پر آمادگی کا اظہار کر دیا ہے، اس کلی نظام کے تصور کے اثرات سے پاک نہیں ہیں۔[۵] یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے مصالح یا ضروریات کے پیش نظر کسی خاص پہلو کو نمایاں کرتی ہوں۔ اب سوشلزم ایک سماج اور ایک تہذیب کے معنی رکھتا ہے، اور اپنے نقطۂ نظر کے مطابق کلی

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) مایوس کن رہی۔ مارکس نے ۱۸۶۲ میں پھر اس کام کو شروع کیا اور ان دو ابواب اور برٹش میوزیم سے جمع کردہ معلومات کی بنیاد پر سرمایہ داری پر اپنی اصل تنقید لکھنی شروع کی۔ ۱۸۵۰ سے ۱۸۶۲ تک وہ صرف مواد جمع کرتا رہا اور ۱۸۶۲ سے ۱۸۶۷ تک پانچ سال کی شب و روز کی محنت سے کتاب کی پہلی جلد لکھی۔ اس کی دوسری اور تیسری جلد مارکس کی موت کے بعد شائع ہوئیں، دوسری ۱۸۸۵ میں اور تیسری ۱۸۹۴ میں آخری جلد مارکس کی یادداشتوں اور مسودات سے مرتب کی گئی۔ اس کتاب کا اصل موضوع اشتراکیت نہیں، سرمایہ داری ہے۔ مارکس کی تاریخی اور معاشی فکر اس ایک کتاب میں جمع ہو گئی ہے ۔۔۔ لیکن تجزیاتی انداز کے ساتھ ساتھ اس میں واقعاتی اور بیانیہ انداز بھی اختیار کیا گیا ہے۔ اس میں سرمایہ داری کے ارتقا، اور اس کے مستقبل کے تاریخی قوانین کو پیش کیا گیا ہے اور اسی سلسلہ میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ ایک دور کا پورا نظام زندگی دراصل اس دور کے وسائل پیداوار اور ان پر مبنی پیداواری تعلقات کی پیداوار ہوتا ہے۔ اب اگر سرمایہ دارانہ تہذیب کو ختم کرنا ہے تو اس کا ذریعہ وسائل پیداوار کو انفرادی ملک سے نکال کر اجتماعی تحویل میں لانا ہوگا۔ سرمایہ داری کے موجودہ مرحلہ میں جو پیداواری تعلقات ہیں اور جو اجتماعی ادارے کام کر رہے ہیں وہ نئی پیداواری قوتوں سے مناسبت نہیں رکھتے۔ اس لئے حالات کی یہ قوت ان تعلقات اور ادارات کو ختم کر کے رہے گی۔ اور ان کی جگہ فطری سماجی قانون کے تحت اشتراکیت رونما ہوگی۔ مارکس کا اصل موضوع سرمایہ داری میں پائے جانے والے تضادات، اس کا ظلم و استحصال (exploitation) اور اس میں پائی جانے والی مغائرت (alienation) ہے۔ اور ان پر اس نے بڑی مہتم بالشان بحثیں کی ہیں۔

۴۔ سرمایہ کی تحریر و تسوید سے قبل مارکس نے ایک مختصر تحریر (۱۸۴۵) جرمن مفکر لڈوک فیورباخ (These of Feverbach) پر لکھی تھی جس میں مذہب پر فلسفیانہ حملہ کیا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو منتخب مقالات جلد اول صفحہ ۵۲ ۳۔ ۵۵) اس طرح اس نے اسی دور میں ایک اور کتاب افلاس فلسفہ (Poverty of Philosophy) لکھی (۱۸۴۷) اس کتاب میں خیالی اشتراکیت پر زوردار تنقید ہے اور یہ فرانسیسی پروڈھون کے رد میں لکھی گئی ہے۔ (ملاحظہ ہو Poverty of Philosophy مطبوعہ ماسکو) انقلاب اور طریق انقلاب کے سلسلہ میں مارکس کی متعدد تحریریں ہیں جن میں فرانس کے ۱۸۴۸ کے ناکام انقلاب پر تبصرہ (Civil War in France) اور ۱۸۷۱ کے پیرس کمیون پر تنقید شامل ہے۔

۵۔ گوتھا پروگرام پر تنقید (Critique of the Gotha Programme) یہ مارکس کی آخری تحریرات میں سے ایک ہے اور اس میں جرمنی کی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے پیش کردہ پروگرام (جسے گوتھا پروگرام کہا جاتا تھا، اس مناسبت سے کہ وہ گوتھا کے مقام پر ہونے والی کانفرنس میں منظور کیا گیا تھا) ملاحظہ ہو منتخب مقالات۔ جلد دوئم صفحہ ۱۳ تا ۴۸) مارکس نے اس تحریر میں پہلی مرتبہ اشتراکیت کے دو مراحل۔ اولیں و آخری کی تخصیص کی۔ اس میں اشتراکی سماج کے بارے میں مارکس کے کچھ خیالات بہت واضح شکل میں سامنے آئے، ورنہ دوسری تحریرات میں تنقیدی اور منفی رنگ غالب ہے۔

اینجلز کی اولیں تصنیف۔ انگلستان میں مزدوروں کی حالت، (Conditions of the Working Class in England)

تبدیلی کا مدعی ہے۔ یہ وہ بنیادی بات ہے جس کا دعویٰ چوٹی کے اشتراکی اہل قلم کرتے ہیں اور جس کا اعتراف اشتراکیت پر علمی اور تحقیقی کام کرنے والے تمام اہم نقادوں نے کیا ہے۔ ٹ۵

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ہے جو ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد اشتراکی منشور کی تسوید میں اس نے حصہ لیا، گو اس کا اپنا قول یہ ہے کہ یہ منشور مارکس کا لکھا ہوا ہے میرا اس میں بجز نام کے اور کوئی حصہ نہیں (دیباچہ - تیسرا ایڈیشن) اینجلز نے بہت سے نہایت اہم اور قیمتی مضامین اور پمفلٹ لکھے ہیں جو اشتراکیت کے مختلف پہلوؤں کی تشریح و توضیح کرتے ہیں۔ البتہ اینجلز نے جدلی مادیت کے پورے فلسفہ کو ایک کتاب میں نہایت جامع انداز میں مرتب کردیا ہے اور وہ ہے Anti-Duhring (مطبوعہ ۱۸۷۷) مارکسی اشتراکیت کی تبلیغ و تشہیر میں اس کتاب کا حصہ نہایت نمایاں ہے۔ سائنس سے متعلقہ امور پر پیدا ہونے والے بہت سے بنیادی سوالات پر اینجلز نے Dialectics of Nature میں بحث کی ہے۔ یہ ایک حیثیت سے رڈیوہرنگ کا تکملہ ہے۔ (مطبوعہ ماسکو ۱۹۵۴ء) اس لٹریچر کے ایک سرسری جائزہ سے اندازہ ہوجائے گا کہ مارکس اور اینجلز نے پوری فکر کو ایک نظام کی شکل میں مرتب کیا ہے۔

ٹ۵ ۱۹۴۸ء میں اشتراکی منشور کی سو سالہ جوبلی منانے کے لئے برطانیہ کی لیبر پارٹی نے اس کا ایک نیا ایڈیشن وہاں کے مشہور سوشلسٹ مفکر ہیرالڈ جے لاسکی کے نئے تعارف کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس کے نام میں دونوں کے باہم اثر و تاثر کی اچھی عکاسی ہوگئی ہے کتاب کا نام ہے۔ اشتمالی منشور — اشتراکی سنگ میل

The Communist Manifesto - Socialist Landmark)

ٹ۵ ہم اس امر سے واقف ہیں کہ چند اہل قلم اس بات کو بھی پیش کرتے ہیں کہ اشتراکیت کی بنیادی معاشی فکر کو اس کی مابعد الطبیعیات سے کاٹا جاسکتا ہے۔ اس لئے کہ دونوں لازم و ملزوم نہیں ہیں۔ یہ بات صرف ان لوگوں نے کہی ہے جو اشتراکیت سے کوئی مرکب بنانا چاہتے تھے۔ مثلاً مسیحی سوشلزم کے علمبردار — لیکن وہاں یہ بات صرف اس لئے ممکن ہوئی کہ عیسائیت خود ثنویت کی قائل تھی اور اس کا اپنا معاشی اور سماجی نظام نہ تھا۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ پیوند کامیاب نہ ہوسکا۔ اس مرکب میں سے مسیحیت آہستہ آہستہ دم توڑ گئی اور صرف اشتراکیت باقی رہ گئی۔ دور جدید میں یہ بات سڈنی ہک اور دو ایک دوسرے اہل قلم نے کہی ہے کہ ان حضرات کی حیثیت ایک ناقابل التفات اقلیت کی سی ہے جس کی بات کو اشتراکی مفکرین کی عظیم اکثریت بلکہ ان کی mainstream قبول نہیں کرتی ہے۔ نیز اشتراکیت کے بانیوں کی تحریرات اور ان کا مجموعی نظام فکر بھی اس کی تائید سے قاصر ہے۔

ٹ۵ مارکس اور اینجلز کی تحریرات کا جو سرسری جائزہ ہم اس سے پہلے پیش کرچکے ہیں۔ اس سے اس امر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اشتراکیت کے ان بانیوں نے صرف معاشی امور ہی سے بحث نہیں کی ہے بلکہ کائنات کا تصور، تاریخ کے ارتقاء کے اصول، تمدن کے قوانین، فلسفہ، مذہب کی حقیقت، ریاست اور قانون وغیرہ تمام مباحث پر گفتگو کی ہے اور ان مباحث کو اپنے مرکزی تصور سے متعلق اور مربوط کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو خلاق نظام (system builders) کہا جاتا ہے۔

سب سے پہلے مارکس اور اینجلز کو لیجئے۔ بلاشبہ ان کے پروگرام میں وسائل پیداوار کی قومی ملکیت کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔
لیکن یہ اس لئے کہ ان کی نگاہ میں ایک دور کا پورا تمدن، اس کا فلسفہ، مذہب، اخلاق، قانون، معاشرت، ثقافت، سیاسی نظام، بین الاقوامی تعلقات، غرض ہر چیز وسائل پیداوار اور پیداواری تعلقات پر مبنی ہے۔ تمدن اس معاشی زیریں ساخت (Economic infra structure) کا پیدا کردہ ہے۔ اس کی حیثیت ثانوی اور طفیلی ہے جب کہ معاشی زیریں ساخت اصل اور حقیقی ہے۔ باقی سب کچھ اسی کا عکس اور پرتو ہے۔ ان معاشی وسائل پر جسے ملک اور تصرف حاصل ہو وہ صاحبِ اقتدار طبقہ ہے اور باقی تمام افراد ان کے تابع ہیں۔ ان دونوں طبقات میں کشمکش سے ساری انسانی تاریخ عبارت ہے۔ قانون اور ریاست برسرِ اقتدار طبقہ کے تسلط کو مستحکم کرنے کا کام انجام دیتے ہیں اور آلہ استحصال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مذہب اور اخلاق انہی کے مفاد کے تحفظ کا وظیفہ ادا کرتے ہیں، معاشرت و ثقافت اسی طبقاتی صورت حال کی پیداوار ہوتے ہیں، فلسفہ ادب اور فن انہی کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس لئے تمدن میں فیصلہ کن چیز وسائل پیداوار اور ان پر تصرف ہے۔ انھیں انفرادی ملک سے نکال کر قومی تحویل میں لے آنے سے سارا نظام بدل جائے گا۔ قومی ملکیت کے معنی محض ایک معاشی تبدیلی نہیں بلکہ ایک سماجی اور تمدنی انقلاب کے ہیں جس کے نتیجہ میں ایک نیا سماج اور نیا تمدن رونما ہوگا اور مروجہ تمدن کی کایا پلٹ ہو جائے گی۔ [۵۹] اینجلز منشور اشتراکیت کے مقدمہ میں اشتراکی فکر کے بنیادی اور اساسی تصور کو اس طرح پیش کرتا ہے:

"کہ ہر تاریخی دور میں اس کا مروجہ معاشی طریق پیداوار و تبادلہ اور اس کے تحت لازمی طور پر رونما ہونے والی سماجی تنظیم وہ ہیئت وہ اساس اور بنیاد ہیں جس پر اس دور کی فکری اور سیاسی تاریخ مبنی ہوتی ہے اور صرف اسی کی روشنی میں ان کی تعبیر و تفہیم ممکن ہے پس اس کا نتیجہ ہے کہ انسانیت کی ساری تاریخ (اولیں قبائلی سماج جس میں تمام زمین مشترک ملک تھی، کے انتشار سے لے کر) طبقاتی کشمکش کی تاریخ ہے۔ استحصال کرنے والے اور مظلوم حکمران اور مجبور طبقات کے درمیان تنازع کی تاریخ۔ نیز یہ کہ طبقاتی تنازع کی یہ تاریخ ایک ایسے سلسلہ کی حیثیت رکھتی ہے جس میں ارتقاء کارفرما ہے اور جو اب ایک ایسے مقام پر پہنچ گئی ہے کہ مظلوم اور پسے ہوئے طبقات — (پرولتاریہ) استحصالی اور برسر اقتدار طبقات (بورژوا) کے تسلط سے نجات حاصل نہیں کریں گے، مگر اس طرح کہ اس کے ساتھ ساتھ، اور ہمیشہ کے لئے، پورے سماج کو استحصال، ظلم و تشدد، طبقاتی تفریق اور طبقاتی نزاع سے بھی پاک کر دیں گے۔
— یہ بنیادی بات، میرے خیال میں، تاریخ کے لئے وہی کچھ کرنے والی ہے جو ڈارون کے نظریہ نے حیاتیات کے لئے کیا۔" [۵۹]

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مارکسی اشتراکیت کا پورا نظام فکر مربوط اور منظم ہے۔ اس کے معاشی تصورات کو اس کی تعبیر تاریخ سے کاٹ کر نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس کے تعبیر تاریخ کے تصور کی جڑیں اس کے جدلی فلسفہ میں اتری ہوئی ہیں، اس کا جدلی فلسفہ مادیت اور عقلیت پر مبنی ہے، اس کے ساری سماجی تصورات اسی نظام فکر کی پیداوار ہیں۔ یہ فکر صحیح ہو یا غلط (اور ہماری نگاہ میں غلط ہے) لیکن اس کے ایک جزو کو دوسرے سے کاٹ دینے سے کوئی معنیٰ باقی نہیں رہتے۔ مارکس اور اینجلز کے مطالعہ سے

---

[۵۹] اشتراکی منشور، اینجلز کا پیش لفظ برائے طبع ۱۸۸۳۔ ملاحظہ ہو کمیونسٹ مینی فسٹو: سوشلسٹ لینڈ مارک۔ مرتبہ ہیرالڈ لاسکی۔ مطبوعہ ایلن اینڈ انون۔ لندن، ۱۹۵۱ء صفحہ ۱۰۵۔

معلوم ہوتا ہے کہ ان کے فکر کی اساس یہ تصور تھا کہ سوسائٹی ایک نامی (organic) وجود ہے، جس کا ہر حصہ دوسرے سے مربوط ہے "تاریخ ایک ارتقائی عمل کا نام، ہر دور اپنے ماقبل کا بوجھ اٹھا کر آگے بڑھتا ہے اور اس سے چند قدم آگے نکل جاتا ہے اور ترقی ایک مسلسل اور پیہم کشمکش اور پیکار کا نتیجہ ہے۔ تنازع ہی میں ترقی کا راز ہے۔"[10]

مارکسزم چونکہ اشتراکیت کی مکمل ترین اور معتبر ترین شکل ہے اس لئے ہم کوشش کریں گے کہ اس نظام فکر کے ہمہ پہلوؤں کو مختصر ترین الفاظ میں تلخیص کر دیں تاکہ اس کی وسعتوں کا پورا پورا اندازہ ہو سکے۔

۱ ۔ اشتراکیت کا تصور کائنات یہ ہے کہ مادہ ازلی ہے اور اجتماع ضدین پر مبنی ہے یعنی متضاد عناصر کے اجتماع سے عبارت ہے۔ تناقض و تضاد فطری اور لازمی طور پر حرکت کو پیدا کرتے ہیں اس لئے مادہ خود حرکی (autodynamic) ہے۔ مارکسی فلسفہ کا پہلا بنیادی قانون ہی اجتماع ضدین (unity of opposites) ہے۔ اس کا دوسرا قانون اصول نفی (negation) ہے۔ جس کے تحت مادہ نفی کے ذریعہ کمیتی ترقی حاصل کرتا ہے۔ گیہوں کا دانہ فنا ہو کر اپنے سے سوگنا زیادہ دانے پیدا کر دیتا ہے۔ اس طرح مادی حقیقت اپنی مقدار اور کمیت میں اضافہ کرتی چلی جاتی ہے۔ پھر تیسرا قانون اصول قلب ماہیت (Transformation) ہے جو نئی حقیقتوں اور کیفیتی تبدیلیوں کی توجیہہ کرتا ہے۔ اس طرح اشتراکیت کا تصور کائنات خالص مادیت پر مبنی ہے اور اینجلز کے الفاظ میں اس کے ذریعہ (نعوذ باللہ) "اس کائنات سے باہر کسی خالق کے تصور کا آخری نشان بھی مٹا دیا گیا ہے۔"[11]

۲ ۔ مارکسیت کا تصور شعور بھی خالص مادی ہے۔ اس کی نگاہ میں روح یا نفس (mind) کا کوئی وجود نہیں۔ شعور محض ذہن کا وظیفہ ہے جو مادہ ہی کے ایک لمبے ارتقائی سلسلہ کا نتیجہ ہے۔ ذہن انسانی معروض حقیقت کے علم کو حاصل کر سکتا ہے اور حصول علم کے لیے کسی دوسرے ذریعہ کی حاجت نہیں۔ صداقت کی میزان عمل اور تجربہ ہے اور علم و عمل باہم مربوط ہیں۔ اگر علم عمل کے میدان میں اچھے نتائج نکالے تو وہ مبنی بر صداقت ہے ورنہ باطل ہے۔ اس طرح روح کی مکمل نفی ہو جاتی ہے اور خود شعوری زندگی کی توجیہہ خالص مادی بنیادوں پر کی جاتی ہے۔[12]

---

[10] اس پہلو سے ہیرنشو نے بڑی قیمتی اور مفید بحث کی ہے۔ ملاحظہ ہو

Hearnshaw, F., *Suivey of Socialism*, London, 1929, p. 214.

[11] بحوالہ Hnti-Duhring مطبوعہ نیو یارک، ۱۹۲۷، صفحہ ۱۹۱۔ مارکسیت کے تصور کائنات کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل اصل ماخذ سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

Marx, K., *Capital*, London, Vol. 1 and 2.
Marx, K., *Selected Correspondence*, Moscow, 1954.
Engles, F., *Ludwig Fenerbach*, New York, 1934.
Thesis on Fenerbach
Engles, F., *Anti-Duhring*,
Lenin, V. I., *Materialism and Empirio-Criticism*, Moscom.

۳۔ اشتراکیت کا تصورِ تاریخ بھی خالص مادی ہے۔ وہ اس میں کسی بالاتر قوت کی کارفرمائی کو مانتی ہے اور نہ فرد ہی کو کوئی آزاد تخلیقی کردار عطا کرتی ہے۔ اصل تاریخ ساز قوت معاشی کوائف ہیں اور انہی سے باقی تمام سماجی تصورات اور ادارات جنم لیتے ہیں۔ اس میں ایک قسم کی سماجی جبریت بھی پائی جاتی ہے۔ ہر دور اپنے ماقبل سے پیداواری قوتیں وراثت میں حاصل کرتا ہے۔ پورے سماجی نظام کی صورت گری معاشی قوتوں کے ہاتھوں ہوتی ہے۔ اور جب ایک سماج اور اس کے ادارات معاشی قوتوں سے پیچھے رہ جاتے ہیں تو تنازع رونما ہوتا ہے جو بڑھتا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک انقلاب کے ذریعے یہ ثنویت اور تناقض رفع ہو جاتا ہے اور نئی سماجی ہیئت رونما ہوتی ہے۔ انقلاب ہی وہ راستہ ہے جس سے تضادات رفع ہوتے ہیں اور نئے تضادات کے رونما ہونے کے دروازے کھلتے ہیں۔ تاریخ اسی کشمکش اور پیکار سے عبارت ہے اور اس کو نظر انداز کر کے تاریخ یا سماج کے کسی پہلو کو اور تاریخ میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔[12]

۴۔ ریاست کے بارے میں مارکسی تصور یہ ہے کہ وہ اس وقت وجود میں آئی جب وسائل پیداوار کی انفرادی ملکیت کی وجہ سے معاشرہ دو طبقات میں بٹ گیا۔ برسرِ اقتدار طبقہ نے اپنے تسلط کو قائم رکھنے کے لئے ریاست کا آلہ وضع کیا۔ یہ ایک خالص طبقاتی ادارہ ہے اور استحصالی قوتوں کا ممد و معاون ہے۔ اس کا اولین مقصد انفرادی ملکیت کا تحفظ ہے اور قوت و تشدد کے ذریعہ وہ یہ مقصد حاصل کرتی ہے۔[13]

۱۱؎ اس نکتہ کے لئے بھی اوپر کے ماخذ سے رجوع کیا جائے۔ ان کے علاوہ اس موضوع اور مذکورہ بالا نکتہ کو سمجھنے کے لئے ان کتب کا مطالعہ بھی مفید ہوگا۔

Murry, J., *Marxism*, London, 1935; Jackson, T., *Dialectics: The Logic of Marxism*, London, 1936, Russel, B., *Freedom versus Arganisation*, Allen and Unwin, London, 1949, Cole, G. D. H., *The Meaning of Marxism*, Gollancz, London, 1948, Palekanov, G., *Fundamental Problems of Marxism*, London, 1929, Adoratsky, V., *Dialectical Materialism*, London, 1934, McFadden, Charles J., *The Philosophy of Communism*, Benziger Bros., New Zork, 1939; Crew-Hunt, R.N., *The Theory and Practice of Communism*, Geoffrey Bles, 1951; Cornforth, Maurica, *Dialectical Materialism*, Lawrence & Wishart, London, 3 volumes.

۱۲؎ اشتراکیت کے اس قضیہ کے مطالعہ کے لئے مندرجہ بالا کتب کے علاوہ ملاحظہ ہو۔

Marx, *Communist Manifesto*; Marx, *A Contribution to the Critique of Political Economy*; Bober, M. M. *Karl Marx's Interpretation of History*, Harvard University, Cambridge. 1950.

۱۳؎ مندرجہ بالا کتب کے علاوہ ان کا مطالعہ بھی اس پہلو کے سمجھنے کے لئے مفید ہوگا۔

Engles, *The Origin of the Family, Private Property and the State.* یہ مضمون الگ کتابی شکل میں بھی شائع ہوا ہے اور "منتخب مقالات" میں بھی شامل ہے۔

Lenin, V., *The State and Revolution*, Moscow.

۵ ۔ مذہب بھی طبقاتی تصادم کی پیداوار ہے۔ یہ عوام کو اپنے زخموں کی ٹیس سے غافل کرنے کا ایک حربہ ہے۔ یہ ان کو ان کے فرائض کی تو تعلیم دیتا ہے لیکن حقوق کا کوئی درس نہیں دیتا۔ بلکہ ظلم اور زیادتی پر سر تسلیم خم کرنے کا سبق پڑھاتا ہے اس لئے مذہب کو مٹائے بغیر اصلاح کی راہ نہیں کھل سکتی۔ اسی طرح اخلاق طبقاتی تقسیم ہی کی پیداوار ہے اور بالآخر طبقات کے مفاد کے تحفظ کا کام انجام دیتا ہے[۱۴]

۶ ۔ سرمایہ دارانہ نظام ایک نظام ظلم ہے۔ اس میں نجی ملکیت کی وجہ سے ایک اقلیتی طبقہ تمام وسائل پیداوار پر قابض ہے اس کا مقصد اپنے نفع کو بڑھانا ہے اور یہ اضافہ وہ دوسروں پر ظلم و زیادتی اور ان کے حق محنت کو خرد برد کر کے حاصل کرتا ہے۔ قدر محنت کی پیدا کردہ ہے لیکن اس کا صرف ایک حصہ اصل محنت کار کو جاتا ہے، ایک بڑا حصہ سرمایہ دار لے لیتا ہے۔ اور اس ظلم کی چکی کو تیزی سے چلنے میں مدد دیتا ہے۔ لیکن سرمایہ داری کا نظام اب اس مقام پر آگیا ہے کہ اس کا بنایا ہوا سماجی نظام وسائل پیداوار کے بنیادی حقائق سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اس میں مغائرت کی کیفیت رونما ہوگئی ہے جو بڑھتی جا رہی ہے۔ سرمایہ داری نے خود نئے تضادات کو ختم کر دیا ہے۔ اس میں سرمایہ کے ارتکاز کا قانون کارفرما ہے جس کے نتیجہ میں دولت کم سے کم تر ہاتھوں میں جمع ہوتی جا رہی ہے اور دوسری طرف غربت پھیلتی اور بڑھتی جا رہی ہے۔ خود سرمایہ کی ہیئت ترکیبی (organic Composition of Capital) بدل رہی ہے، ان کے نتیجہ میں پیداوار اور صرف میں توازن باقی نہیں ہے اور یہ چیز معاشی عدم استقلال کو پیدا کر رہی ہے۔ معاشی بحران رونما ہو رہے ہیں اور مزید ہوں گے اور بالآخر نظام سرمایہ داری کو لے ڈوبیں گے۔ سرمایہ داری سہارا لینے کے لئے سامراجیت کا روپ دھارتی ہے۔ لیکن یہ اس کا آخری سنبھالا ہوتا ہے نتیجتاً اپنے ہی بطن سے رونما ہونے والے تناقضات اور اختلافی قوتوں کے ہاتھوں یہ نظام ختم ہو جائے گا اور اشتراکیت اسکی جگہ ایک تاریخی تقاضے کی حیثیت سے رونما ہوگی یہ تبدیلی ایک انقلاب کے ذریعہ ہوگی جس کے بعد پرولتاریہ کی آمریت رونما ہوگی یہ آمریت وسائل پیداوار کی قومی تحویل کریگی اور اس بنیادی تبدیلی کے نتیجہ میں نیا سماج رونما ہوگا۔ جب یہ انقلابی عمل اپنی تکمیل کو پہنچے گا تو ایک غیر طبقاتی معاشرہ وجود میں آئے گا جس کے کامیابی سے کام کرنے کے لئے ریاست کی جبری قوت کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ یہ ہوگی اصل معیاری اشتراکی سوسائٹی، جس میں نہ طبقہ واریت ہوگی، نہ اس کے پیدا کردہ تنازعات مناقضات ہوں گے اور نہ تشدد اور جبر کے آلات۔ اس معاشرہ میں مادی فراوانی (affluence) کی کیفیت بھی ہوگی۔ اور یہی ہے اشتراکیت کا منتہیٰ و مقصود۔

---

[۱۴] ملاحظہ ہو، اینجلز کی لڈوک فیورباخ' اور روڈو ہرنگ' لینن کی مذہب' مطبوعہ ماسکو و نیو یارک' بخارین (N. Bukharin) کی The A. B. C. of Communism مطبوعہ لندن ۱۹۲۲' ہیرالڈ لاسکی کی Communism: مطبوعہ لندن ۱۹۳۵' اشتراکی پارٹی کا پروگرام Programme of the Communist Internationol مطبوعہ نیو یارک ۱۹۳۶ اور سڈنی اور بیرٹرس ویب کی Soviet Communism A New Civilivation مطبوعہ لندن ۱۹۴۷۔

اشتراکیت کی ان بنیادی تعلیمات کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ

(الف) اشتراکیت ایک مکمل نظام فکر اور ایک سماج اور تہذیب ہے ۔ اس کے مختلف اجزا رباہم مربوط ہیں یہ جزوی اصلاح کا کوئی منصوبہ نہیں۔

(ب) اس کی بنیاد اور روح خالص مادیت اور مذہب سے بیگانگی بلکہ اس کی مخالفت پر مبنی ہے ۔ اس کی حیثیت مذہب کے ایک متبادل (alternate) اور رقیب کی ہے، حلیف کی نہیں ۔

اب تک ہم نے ان باتوں کو اشتراکیت کے بانیوں کے افکار کی روشنی میں بیان کیا ہے ۔ اب ہم اس دعوے کی تائید میں اپنے دور کے چند چوٹی کے اہل قلم کی آراء پیش کرتے ہیں ۔

امریکہ کا سب سے بڑا مارکسی ماہر معاشیات پروفیسر پال ایم سویزی اپنی کتاب "سوشلزم" میں لکھتا ہے ۔

"سوشلزم کے معنیٰ وہ سماجی نظام ہیں جس کی امتیازی خصوصیت، دوسرے سماجی نظاموں کے مقابلہ میں مخصوص نوعیت کے تعلقات ملکیت ہیں۔" [۱۶]

سویزی اس کی وضاحت کرتے ہوئے مزید لکھتا ہے کہ

"جب ہم اشتراکیت کی بات کرتے ہیں تو ایک سماجی نظام کے بارے میں بات کرتے ہیں، محض ایک خاص قسم کے تعلقات ملکیت کے مجموعہ سے نہیں ۔" [۱۷]

یعنی اصل چیز یہ نہیں ہے کہ اشتراکیت میں وسائل پیداوار اجتماعی ملکیت میں آجاتے ہیں بلکہ اس بنیاد پر رونما ہونے والا پورا سماجی نظام ہے ۔

کیرو ہنٹ، جس نے اشتراکیت پر بڑے مدلل اور تحقیقی انداز میں کام کیا ہے، لکھتا ہے ۔

"پس اشتراکیت ایک مکمل تمدن اور نظام حیات (weltanschauung) ہے جو ایک مربوط فلسفیانہ، معاشی، سیاسی، اور سماجی نظریہ پر مبنی ہے، وہ نظریہ جو دنیا کی واحد سائنسی تعبیر کرنے کا مدعی ہے ۔ اس کا مطالعہ کل کے کل کی حیثیت سے ہونا چاہیے ۔ یہ بات بالکل روا نہیں کہ اس کے کچھ اجزاء کو جو ہماری توجہ کو جذب کریں پورے نظام سے جدا کر کے غور کیا جائے اور باقی حصوں کو نظر انداز کر دیا جائے ۔ اشتراکی سرگرمیوں کی تفہیم اس پورے نظام کے مطالعے کے بغیر ممکن نہیں جس پر وہ مبنی ہیں۔" [۱۸]

یہی مصنف اپنی ایک دوسری کتاب میں اشتراکیت کے نظام کے بارے میں اس بات کا یوں اظہار کرتا ہے کہ :

"نیز یہ کہ اس کا نظام ایک مکمل نظام ہے ۔۔ ایسا کلی نظام جس میں انسانی فکر و عمل کے تمام پہلو ایک موثر اور فیصلہ کن اصول

---

۱۶ Sweezy, Paul M., *Socialism*. McGraw-Hill, New York, 1949, p. 3.

۱۷ *ibid*., p. 5 and p. 7.

۱۸ Carew-Hunt, R. N., *The Theory and Practice of Communism*, Geoffrey Bles, London, 1951, p. 7-8.

پر مبنی ہیں۔[19]

ایک دوسرے مقام پر کیرو ہنٹ لکھتا ہے :

"مارکسزم ایک انقلابی نظریہ ہے ..... موجودہ نظام کا پورا ہیولا۔ اس کا نظام قانون، فوج، پولیس وغیرہ سب کو یکسر بدل کر پورے سماج کو نئی بنیادوں پر استوار کیا جائے۔"[20]

اسی بات کا اظہار سائرل زیبٹ نے کیا ہے۔

"ایک آئیڈیالوجی کی حیثیت سے اشتراکیت مذہب سے ظاہری مماثلت رکھنے والا عنصر ہے۔ یہ سیاسی فکر و عمل کا ایک نظام ہے اور مذہب کے متبادل (substitute) کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے جد مادیت کے نظریہ کی جب تاریخ پر تطبیق کی جاتی ہے اور مستقبل میں اس کی تطلیل PROJECTION کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ انسانیت کے آخری ہدف کے طور پر ایک عالمگیر نظام کا تصور پیش کرتا ہے جس میں پیداوار اجتماعی ہو اور ایک غیر طبقاتی سماج میں عالمگیر مادی فراوانی کا دور دورہ ہو۔"[21]

اشتراکیت کے ایک مکمل نظام ہونے کی بات صرف نظری طور پر ہی ثابت نہیں ہے بلکہ روس کا تجربہ ہر حیثیت سے اس کی تائید کرتا ہے۔ کیرو ہنٹ کے الفاظ میں :

"جس نظریہ پر سویٹ نظام کی بنیاد ہے وہ ایک مادہ پرست آئیڈیالوجی ہے۔ اس کا بنیادی مفروضہ یہ ہے کہ معاشی عامل اولین اہمیت کا حامل ہے، اس کے سوا جو کچھ ہے اس کا عکس ہے۔ اس کا سب سے پہلا اور منطقی تقاضا یہ ہے کہ معاشرے کی معاشی بنیاد کی تشکیل نو ہو۔ یعنی ان وسائل پیداوار کو قومی ملکیت میں لایا جائے جنھیں سرمایہ داری اب تک اپنے فائدے کے لئے استعمال کر رہی تھی۔ یہ وسائل پیداوار اب مزدوروں کی تحویل میں ہوں گے۔ لیکن مزدوران پر تصرف کے بارے میں مجبور ہیں، اس لئے نئی منصوبہ بند معیشت کی ذمہ داری اشتراکی پارٹی پر ہوگی جو اب واحد طبقہ کی نمائندہ تصور کی جاتی ہے۔ اس کا لازمی تقاضا یک جماعتی حکومت ہے، اس لئے کہ ایسا کوئی گروہ یا مفاد باقی ہی نہیں رہا ہے جس کی نمائندگی دوسری پارٹی کرے گی۔ اگر وہ حکومت سے اتفاق کرتی ہے تو وہ بیکار ہے۔ اگر اختلاف کرتی ہے تو باغیانہ ہے۔ پھر حکومت کے اختیارات کی بھی کوئی حد نہیں ہو سکتی۔ فرد معاشرہ اور گروہ کے ایک فرد ہی کی حیثیت سے اپنا کوئی وجود رکھ سکتا ہے، اس سے باہر نہیں۔ قانون انفرادی اور تخریبی عناصر کی سرکوبی کا آلہ بن جاتا ہے۔ فلسفہ، آرٹ، ادب، اور سائنس کوئی بھی اس نظام میں اپنے لئے آزاد مقام کا مطالبہ نہیں کر سکتے۔ ان سب کی اصل قدر و قیمت اور حقیقی جواز اس میں ہے کہ نظام کی کارکردگی میں کیسے اضافہ کریں۔ خاندان کا نظام اس حد تک گوارا کیا جائے گا جس حد تک ریاست اسے مفید مطلب سمجھے

---

[19] Carew-Hunt, R. N., *Marxism: Post and Present*, Geoffrey Bles, London, 1954, p. 5.

[20] Carew-Hunt, *Marxism*, p. 167.

[21] Zebot, Cyril A., *The Economics of CompefidiveCo-existerce*, Praeger, London, 1964, p. 24.

بچے معاشرے کی دولت ہوں گے، والدین کی ذاتی دولت نہیں۔ مذہب کا گوارا کیا جانا بہت ہی مشکل ہے، اس لئے کہ اس کی وجہ سے وفاداریوں میں ثنویت کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور اسے اس معاشرے میں کیسے گوارا کیا جا سکتا ہے جس میں سب کچھ قیصر کا ہے۔ نئے نظام کا مہندس کسی رقیب کو گوارا نہیں کر سکتا۔"[22]

یہ ایک بلند پایہ نقاد کی رائے تھی۔ اب ایک چوٹی کے مداح کی رائے بھی سن لیجے۔ بات وہ بھی یہی کہتا ہے اور کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر کہتا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ اس کلیت پسند مزاج اور دوئی اور ثنویت کے ختم کئے جانے کے بارے میں زبان بھی تقریباً یہی استعمال کرتا ہے۔ کیریو ہنٹ "سب کچھ قیصر" کے لئے کہتا ہے اور مشہور سوشلسٹ مفکرین سڈنی اور بٹرس ویب اتوار اور باقی ایام کی تفریق کے مٹ جانے اور سب کے ایک رنگ میں رنگ جانے کی خبر دیتے ہیں۔ واضح رہے کہ اتوار اور باقی ایام کی تلمیح بڑی معنی خیز ہے۔ عیسائیت میں اتوار خدا کا دن تھا اور باقی تمام دن دنیا پرستی کے۔ ایک اہم جرمن مفکر نے بہت خوب لکھا تھا کہ یورپ کی عیسائی اخلاقیات کا حال یہ ہے کہ اتوار کو ہر عیسائی کی بائیبل اس کا بہی کھاتہ (ledger) بن جاتی ہے اور ہفتہ کے باقی تمام دنوں میں اس کا بہی کھاتہ اس کی بائیبل ہوتی ہے۔ سڈنی ویب اور اس کی اہلیہ برطانیہ کے مشہور سوشلسٹ ہیں۔ ان کی کتاب اشتراکی روس کے ایک نہایت مستند اور دوستانہ مطالعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے اشتراکیت کو ایک مکمل تہذیب کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ ان کی مشہور کتاب Soviet Communism: A New Civilization اس کا ثبوت ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۵ میں آیا ہے تو مصنفین نے "نئی تہذیب" کے آگے ایک سوالیہ نشان (؟) لگا دیا تھا لیکن بعد کے حالات کے مطالعہ کے بعد انھوں نے سوالیہ نشان ہٹا دیا آخری ایڈیشن (۱۹۴۴) میں ایک تکملہ میں اس بات کا فیصلہ کن انداز میں اظہار کیا کہ وہ ایک نئی مادی تہذیب ہے۔

"یہ بلاشبہ توہمات اور جادو وغیرہ کے سلسلہ کے ان تمام بچے کھچے تصورات کا ابطال کرتی ہے جو بیسویں صدی کا انسان سرمایہ داری سوسائٹی میں کائنات اور اس میں انسان کے نظام کے بارے میں رکھتا ہے۔ روسی اشتراکیت ایک نئی آئیڈیالوجی اور نئی معاشیات دیتی ہے۔ یہ صرف یہ کہ علم کے لئے کوئی حد متعین نہیں کرتی اور سائنس کی ترقی پر انحصار کرتی ہے بلکہ (اور یہ بات اس تہذیب کی امتیازی خصوصیت ہے) ہر اس علم کو ماننے یا اسے اپنے ضابطہ اخلاق کی بنیاد بنانے سے انکاری ہے جو محض روایتی عقائد سے ماخوذ ہے اور جو انسان فلسفی یا مذہبی مفکر کی خیال آرائیوں کے سوا کوئی عقلی بنیاد فراہم نہیں کرتا۔"

پھر یہ مصنفین لکھتے ہیں کہ اب یہی نئی غیر مذہبی اخلاقیات پوری زندگی میں جاری و ساری ہیں، معاشی پیداوار قومی ملکیت کے تحت اجتماعی صرفہ کے لئے ہو رہی ہے اور منصوبہ بندی کے ذریعہ ہو رہی ہے۔ اتوار (مذہبی زندگی) اور ہفتہ کے بقیہ ایام (کاروباری زندگی) میں کوئی فرق باقی نہیں رہا ہے۔ ایک شہری فیکٹری اور کھیت میں بھی اسی نظام اقدار کے مطابق عمل کرتا ہے جس کے مطابق گھر، کھیل یا انتخابات میں کرتا ہے۔" مذہبی اور دنیوی ایک ہو چکے ہیں" مذہب کی نہیں دنیویت کی بنیاد پر! دورنگی کی جگہ یک رنگی

۲۲ه Carew-Hunt, *The Theory and Practice of Communism*, p. 213-214.

پیدا ہو گئی ہے، لیکن لادینی کی یک رنگی!

مندرجہ بالا بحث ہمارے قائم کردہ نکات کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ اب ہم کو صرف دو امور کی وضاحت کی مزید ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ ہم نے جو کچھ اشتراکیت کی اس اصل اور مرکزی تحریک کے بارے میں کہا ہے، وہ ان سوشلسٹ تحریکات کے باب میں بھی صحیح ہے جو اپنے کو مارکسی نہیں کہتیں؟ اور دوسری چیز یہ ہے کہ کیا ہم کیمونزم اور سوشلزم میں کوئی تفریق کرتے ہیں یا نہیں؟ اور اگر یہ دو مختلف چیزیں ہیں، تو ان میں کیا فرق ہے۔ ان دونوں امور کی وضاحت کے بعد سوشلزم کی نوعیت کے بارے میں غالباً کوئی اشتباہ باقی نہیں رہے گا۔

پہلی بات کے بارے میں ہم یہ عرض کریں گے کہ مارکس اور اینجلز کے بعد پوری اشتراکی فکر پر ان کے اثرات بہت نمایاں ہیں جن لوگوں نے جزوی طور پر ان سے اختلاف کیا ہے یا کچھ دوسرے انداز میں اشتراکیت کی دعوت کو پیش کیا ہے۔ وہ بھی مارکس کی بنائی ہوئی ساخت (framework) سے باہر نہیں نکل سکے ہیں۔ تمام اہم سوشلسٹ مفکرین نے انفرادی اور قومی ملکیت کو سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان فرق کی نبیاد قرار دیا ہے۔ اگر کسی دائرہ میں کوئی نمایاں فرق ہے تو وہ سیاسی ہیئت اور طریق انقلاب کا دائرہ ہے۔ نبیادی فکر یا سوچنے کے انداز کا نہیں۔ اس لئے دیکھئے کہ برطانیہ کی لیبر پارٹی اشتراکی منشور کو اپنی فکر کے ماخذ کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔ اور مارکس اور اینجلز دونوں کو ساری مزدور تحریک کا مرجع قرار دیتی ہے۔[۲۳] قومی ملکیت کے مسئلہ پر تقریباً تمام سوشلسٹ مفکرین اور جماعتوں کے درمیان اتفاق رہا ہے اور یہی ان کی امتیازی خصوصیت ہے۔ اور ساری اصلاح کا مدار اس ایک چیز پر رکھنا دراصل مارکسزم کی روح ہے۔ دوسرے سوشلسٹ کبھی ان دلائل کو بھی استعمال کرتے ہیں جو مارکس نے دیئے کبھی صرف نتیجہ اور حاصل بحث کو پیش کر دیتے ہیں اور کبھی اپنی طرف سے دوسرے دلائل کا اضافہ کرتے ہیں لیکن مرکزی فکر ان سب کی ایک ہے۔[۲۴]

یہی وجہ ہے کہ اصل اور مرکزی خیال کے اعتبار سے سوشلزم اور کیمونزم میں کوئی جوہری فرق نہیں ہے۔ اپنے اصل مقاصد کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں۔ فرق جو بھی ہے وہ ضمنی اور ذیلی ہے۔ نبیادی اور اساسی نہیں۔ چونکہ اس مسئلہ پر خاصا ژولیدہ فکری پائی جاتی ہے، یا پیدا کی جاتی ہے۔ اس لئے ہم اس کے ضروری پہلوؤں کی مختصراً وضاحت کر دیتے ہیں۔

سوشلزم کے مقابلہ میں کیمونزم نسبتاً پرانی اصطلاح ہے۔ پرانے لٹریچر میں کیمونزم کا لفظ بار بار استعمال ہوتا نظر آتا ہے۔ مور (Muir) کی خیالی جنت (utopia) میں یہ غالباً پہلی بار وسائل پیداوار کی اجتماعی ملکیت کے معنیٰ میں استعمال ہوا اور اس طرح ایک سماجی نظام کا تصور ابھرا۔ اس سے پہلے کی تمام تحریرات میں یہ لفظ اشیاء کے صرف کے اشتراک کے لئے بولا جاتا تھا۔ انیسویں صدی کے شروع میں سوشلزم کا لفظ مستعمل ہوا اور ایک اجتماعی نظام اور تحریک کی حیثیت سے یہ لفظ پہلے پہل رابرٹ آون Owen

---

[۲۳] ملاحظہ ہو۔ پیش لفظ از لیبر پارٹی۔ اشتراکی منشور۔ سوشلسٹ سنگ میل۔ لاسکی صفحہ ۷۰

[۲۴] ملاحظہ ہو Laidler, Harry W., *Social-Economic Movements*, Routledge & Kegan Paul, London, 1953, p. 110.

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں جارج برنارڈ شاہ مضمون بھی اس سلسلہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اور اس کے متبعین کی تحریرات میں استعمال ہوا۔ ۱۸۲۵ء سے ۱۸۴۸ء تک اسے بڑا چلن حاصل ہوا۔ مارکس اور انیجلز نے اپنے کو اس دور کے سوشلسٹوں سے (جنھیں وہ خیالی کہتے ہیں) ممیز کرنے کے لیے کیمونسٹ کہا۔ پارٹی کا نام کیمونسٹ لیگ اور اپنے نظریہ کو کیمونزم کہا۔ جلد ہی اس فکر کا اتنا اثر ہوا کہ دونوں میں تفریق مشکل ہوگئی۔ پہلی بین الاقوامی تحریک کے بعد دونوں لفظ تقریباً مترادف کی حیثیت سے استعمال ہونے لگے۔ خود مارکس اور مارکسیوں نے اپنے کو سوشلسٹ کہنا شروع کر دیا۔ انیجلز نے سائنسی سوشلزم کی اصطلاح کو رواج دیا۔ بقول سویزی

"نتیجتاً کیمونسٹ اور سوشلسٹ کے الفاظ کم وبیش ایک دوسرے کے متبادل کی حیثیت سے استعمال ہونے لگے۔ وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ کیمونسٹ کی جگہ "سوشلسٹ" نے لے لی۔ کیمونسٹ منشور کو سوشلسٹ تحریک کے مقاصد اور طریق کار کا مستند اور متفق علیہ بیان سمجھا جانے لگا۔" [۵]

اس طرح "من تو شدم تو من شدی" کی کیفیت پیدا ہوگئی اور یہ سلسلہ تقریباً پہلی جنگ عظیم کے اختتام تک جاری رہا۔ روس کے اشتراکی انقلاب کے بعد پھر فرق رونما ہوا اور یورپ کے اشتراکیوں نے اپنے کو سوشلسٹ کہا جب کہ روس نے کیمونزم کی اصطلاح استعمال کی، لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ روس کا دستور بھی روس کو ایک سوشلسٹ ریاست کہتا ہے، کیمونسٹ ریاست نہیں، یہ فرق سیاسی اور ایک حد تک طریق کار کا فرق تھا، اصل مقاصد کا نہیں۔ حقیقی منزل اور بنیادی رویہ کے اعتبار سے دونوں میں کوئی بنیادی فرق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آکسفورڈ ڈکشنری میں کیمونزم اور سوشلزم کی تعریف یہ کی گئی ہے۔

کمیونزم	سوشلزم
"A theory of society according to which all property should be vested in the community and labour organised for the common benefit."	"A theory or policy of social organization which advocates the ownership and control of the means of production, capital, land, property etc. of the community as a whole, and their administration or distribution in the interests of all.
سماج کا ایک ایسا نظریہ جس کی رو سے تمام ملکیت معاشرہ میں تفویض ہونی چاہیے اور محنت کی تنظیم مفاد عامہ کی خاطر انجام پانی چاہیے۔	سماجی تنظیم کا ایک ایسا نظریہ یا مسلک جو تمام وسائل پیداوار سرمایہ، زمین، ملک وغیرہ پر پورے معاشرے کی ملکیت اور اجتماعی تصرف کا مدعی ہو اور جس کا مقصد سب کے مفاد میں ان وسائل کی تنظیم اور تقسیم ہو۔

[۵] Sweezy, *Socialism*, p. 9.

[۶] *Shorter Oxford Dictionery*, p. 352.

[۷] *ibid.*, p. 1936.

سویزی[۲۸] کیریو ہنٹ، لوکس، ہیوے سی وغیرہ سب اس پر متفق ہیں کہ اپنے اصل مقاصد اور منزل اور بنیاد کے اعتبار سے دونوں میں کوئی اساسی فرق نہیں ہے۔ ہم طوالت سے بچنے کے لئے صرف ایک دو حوالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔

"جہاں تک ان مقاصد کا تعلق ہے جو ان دونوں کے سامنے ہیں، ان کی رو سے سوشلزم اور کمیونزم تقریباً باہم مترادف اور متبادل اصطلاحات ("interchangeable terms") ہیں ...... ان کے درمیان جو بھی اختلافات ہوں اصل مقصد اور منشاء کے اعتبار سے ایک ہیں، فرق ذرائع کا ہے، مقاصد کا نہیں"[۲۹]

پال ہیوے سی لکھتا ہے کہ:

"سوشلزم اور کمیونزم کی اصطلاحات اپنے معاشی معنی میں تقریباً ہم معنی ہیں۔ اس لئے کہ دونوں نظاموں کا جن کا فرق کیفیت کا نہیں، کمیت کا ہے، آخری مقصد انفرادی ملکیت کی جگہ قومی ملکیت اور آزاد کاروبار کی جگہ سرکاری منصوبہ بندی ہیں۔"[۳۰]

لوکس کا خیال ہے کہ فرق صرف زمانی میزان کا ہے۔ سوشلسٹ بھی اپنا طویل المدت مقصود کمیونزم ہی کو کہیں گے جبکہ کمیونسٹ اپنے قلیل المدت یا فوری ہدف کی حیثیت سے سوشلزم کو پیش کرتے ہیں۔"[۳۱]

اس مقصدی اشتراک اور یک رنگی کے اعتراف کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہ بھی بتادیں کہ علمی اعتبار سے ان کے درمیان جو فرق کیا گیا ہے وہ کیا ہے۔ اگر تمام اہم حکایت فکر کا تجزیہ کیا جائے تو دو واضح رجحان ملتے ہیں۔

۱ ۔ جمہوریت پسند اشتراکی۔ ان کا کہنا یہ ہے سوشلزم وسائل پیداوار کو قومی تحویل میں تو لینا چاہتا ہے لیکن انقلابی اور متشددانہ طریقہ سے نہیں، بلکہ ایک تدریجی، اصلاحی تبدیلی کے ذریعہ جس میں عوام کی رائے کو مسخر کرکے، انھی کے ووٹوں سے اشتراکی قوتیں برسر اقتدار آئیں گی، پارلیمانی قانون سازی کے ذریعہ اصلاحات نافذ ہوں گی، بالواسطہ ذرائع کو زیادہ اہمیت دی جائے گی۔ اور عوام کی آزادیوں اور جمہوری فضا کی حفاظت کی جائے گی۔ اس مکتب فکر کی طرف ایک فرق کی نشان دہی بھی کی جاتی ہے اور وہ یہ کہ اشیائے صرف میں اجتماعی ملکیت اس کے پیش نظر نہیں ہے اور نہ ہی یہ ریاست کے ادارے کے بالکل فنا ہوجانے کا قائل ہے جب کہ کمیونزم اپنی انتہائی شکل میں ان کا بھی دعویٰ کرتا ہے۔

۲ ۔ مارکس اور اس کے متبعین ان دونوں اصطلاحات میں جو اصولی فرق کرتے ہیں اسے پہلی مرتبہ خود مارکس نے ۱۸۴۳ء میں

---

[۲۸] ' *Socialism*, pp. 8-14.

[۲۹] Carew-Hunt, *The Theory and Prectice of Communism*, p. 5

[۳۰] Paul de Hevesy, *The Unification of the World*, Pergamon Press, Oxfoɹd, 1966, p. 98.

[۳۱] Loucks, William N., *Comparative Economic Tystems*, Harper & ßos., New York, (Oxford edition for students), 1961, p. 187.

اس سلسلہ میں مزید شواہد کے لئے ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، مقالہ "سوشلزم" و "کمیونزم" اور ڈی رونز کی ڈکشنری آف فلاسفی سے "مارکسزم" - "سائنٹفک سوشلزم" اور خصوصاً "سوشلزم" پر نوٹس۔

بیان کیا تھا۔[۳۲] اس نے کہا تھا کہ ایک اشتراکیت کا اولیں یا عبوری دور ہوگا اور دوسرا اس کا آخری اور تکمیلی دور۔ اولیں دور میں مزدوروں کی آمریت قائم ہوگی۔ ریاست موجود رہے گی، اس کو چلانے والے ہاتھ بدل جائیں گے۔ اجرت کے تعین میں بھی کارکردگی کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ البتہ قومی ملکیت کا نظام نافذ کر دیا جائے گا اور وہ آہستہ آہستہ دور رس سماجی تبدیلیاں لے آئے گا۔ اس عبوری دور کے اختتام پر جو دور قائم ہوگا وہ اصل اشتراکی دور ہے۔ اس میں غیر طبقاتی معاشرہ وجود میں آئے گا۔ فرد کی کوئی ملک نہیں ہوگی۔ کوئی ریاست یا آلہ جبر نہیں ہوگا۔ پیداوار کی فراوانی ہوگی۔ ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق دیا جائے گا وغیرہ۔ مارکس نے پہلے کو ابتدائی دور اور سوشلزم کا دور کہا ہے جب کہ آخری مرحلہ کو کمیونزم کا آخری اسٹیج کہا ہے۔ لینن نے اس تقسیم کو اور بھی نمایاں کیا اور "ریاست اور انقلاب" میں زیادہ صاف لفظوں میں پہلے اور عبوری دور کو سوشلزم اور دوسرے دور کو کمیونزم کہا۔ اس مناسبت سے روس کے دستور نے روس کو ایک سوشلسٹ ریاست قرار دیا۔ کمیونزم کا ذکر اس میں صرف کمیونسٹ پارٹی اور اس کے مقاصد کے ذیل میں ہے۔ البتہ اشتراکی پارٹی نے اپنے تیسرے پروگرام[۳۳] میں (۱۹۶۱) کمیونزم کی تعمیر اور ۱۹۸۰ تک غیر طبقاتی معاشرہ کے قیام کو اپنے سامنے رکھا ہے۔ اس پروگرام کی تکمیل کے بعد کیا صورت ہوتی ہے، ابھی کہنا مشکل ہے۔ لیکن فی الحال تو خود روس کا نظام بھی سوشلزم پر مبنی ہے، اور کوسیجن کے آنے کے بعد ۲۰ سالہ پروگرام کے سلسلہ میں وہ جوش و خروش نہیں ہے جس کا مظاہرہ خروشچیف کر رہا تھا۔

اس وقت تک کی بحث کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ

۱ ۔ سوشلزم اور کمیونزم میں جزوی اختلافات کے باوجود مقصد اور بنیادی فکر کا اتفاق پایا جاتا ہے اور ہم ان دونوں الفاظ کو ہم معنیٰ اصطلاحات کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔

۲ ۔ سوشلزم ایک تمدنی نظریہ اور ایک مکمل نظام حیات ہے، جو مادیت اور اجتماعیت کی بنیادوں پر معاشی وسائل کی قومی ملکیت کے ذریعہ ایک نیا سماج قائم کرنا چاہتا ہے۔ وہ کلیت پسند سماج ایک بنیادی اصول پر مبنی ہوگا اور اس میں روح اور مادہ کی ثنویت اور دین و دنیا کی تفریق کا کوئی موقع نہ ہوگا۔ روح کی نفی اور دین و مذہب کا ابطال اس کا نقطۂ آغاز ہے اور لادینیت اور مادیت کی بنیادوں پر پوری زندگی کی تعمیر اس کے پیش نظر ہے۔

۳ ۔ اس کام کو انجام دینے کے لئے اشتراکیت معاشی ہیئت کو تبدیل کرنا چاہتی ہے اور اس کا دعویٰ ہے کہ وسائل پیداوار کی قومی ملکیت کے نتیجہ میں زندگی کے ہمہ پہلوؤں میں بنیادی تبدیلیاں رونما ہوں گی اور ایک نیا تمدن اور نئی تہذیب وجود میں آئے گی۔ یہی تہذیب اشتراکیت کا مقصود ہے۔ ہم نے یہ بحث اتنی تفصیل سے اس لئے کی ہے کہ اشتراکیت کی نوعیت کے بارے میں کوئی غلط فہمی باقی نہ رہے۔ جسے اس نظریہ کو قبول کرنا ہے وہ بھی سوچ سمجھ کر اور اس کے سارے مقتضیات کے شعور کے ساتھ اسے قبول کرے اور

---

[۳۲] "Critique of the Gotha Programme", *Selected Wbrks*, Moscow, Vol. II. *The State and Revolution*, p. 81.

یہی بات زیادہ صفائی کے ساتھ لینن نے لکھی ہے۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۸۱

[۳۳] واضح رہے کہ اشتراکی پارٹی نے اپنا عالمگیر پروگرام سب سے پہلے ۱۹۰۳ میں پیش کیا تھا اور اسے پہلا پروگرام کہتے ہیں۔ اس میں اشتراکی انقلاب کی عام دعوت دی گئی ہے۔ دوسرا پروگرام ۱۹۱۹ میں آیا اور اس میں روس میں سوشلسٹ ریاست کی تعمیر کا پروگرام پیش کیا گیا۔ اور ۱۹۶۱ میں سوشلسٹ نظام کو بالآخر کمیونزم سے ہم آہنگ کرنے اور اس آخری مرحلہ کو طے کرنے کا پروگرام پیش کیا گیا ہے۔

جسے اس کو رد کرنا ہے وہ بھی یہ جان لے کہ وہ اسے کیوں ناپسند کرتا ہے۔

(۲)

سوشلزم کو جانچنے کے معیار

سوشلزم کو جانچنے اور پرکھنے کے مختلف طریقے ہو سکتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک طریقہ فکر و نظر کے مختلف گوشے ہمارے سامنے لاتا ہے اگر ہم تمام ضروری معیارات کو سامنے رکھ کر بحث کریں تو گفتگو بہت طویل ہو جائے گی۔ اس لئے ہم چند پہلوؤں پر صرف سرسری نظر ڈالیں گے اور چند دوسرے گوشوں پر نسبتاً تفصیلی نگاہ۔ اس سلسلہ میں جو اہم معیارات ہو سکتے ہیں وہ یہ ہیں:

(i) عقلی تنقید اور تجزیہ کے ذریعہ اشتراکی نظریہ کا جائزہ اور یہ محقق کرنے کی کوشش کہ وہ کہاں تک مبنی بر صداقت ہے اور زندگی اور کائنات کے حقائق سے مطابقت رکھتا ہے۔

(ii) فکری اور عملی دونوں پہلوؤں سے اس امر کا جائزہ کہ وہ کیسی تہذیب قائم کرتا ہے اور انسان کی زندگی کے مسائل کو کہاں تک کامیابی کے ساتھ حل کرتا ہے۔ اس میں انسان کا مقام کیا ہے؟ اور حق و انصاف کا کہاں تک بول بالا ہے۔

(iii) محدود معاشی نقطۂ نظر سے بھی اشتراکیت کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کا سب سے بنیادی دعویٰ معاشی میدان ہی میں ہے۔ اس لئے اس پہلو سے یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ اشتراکیت کا معاشی پروگرام کہاں تک حقیقت پسندانہ ہے اور نتائج کی روشنی میں جو معاشی مثال (Model) اشتراکیت نے پیش کیا ہے اس میں انسانیت کے لئے کتنی کشش ہے؟

(iv) پھر اشتراکیت کو خود اس کے اپنے دیئے ہوئے معیار پر بھی پرکھا جا سکتا ہے۔ یعنی اشتراکی نظریہ اور عملی مثال میں کتنی مطابقت ہے اور خود اپنے اصولوں پر وہ کہاں تک پوری اترتی ہے۔

(v) مطالعہ اور محاسبہ کا ایک اور طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ اشتراکیت اور اسلام کا تقابل و موازنہ کیا جائے اور یہ جاننے کی کوشش کی جائے کہ ان دونوں میں اشتراک اور اختلاف کے کون کون سے پہلو ہیں۔

ان میں سے ہر معیار اپنے طور پر بے حد اہم ہے اور بحث و نظر کے بہت سے پہلوؤں پر سے پردہ اٹھاتا ہے۔ مسلمانوں کے سوچنے سمجھنے والے عناصر کو ان میں سے ہر نقطۂ نظر سے حالات کا گہرا مطالعہ کرنا چاہئے اور اچھی طرح چھان پھٹک کر سوشلزم کے بارے میں اپنا موقف طے کرنا چاہئے۔ محض جذباتیت یا نعرہ بازی سے ان مسائل کو حل نہیں کیا جا سکتا۔

(۳)

اشتراکیت کے مثبت پہلو

اشتراکیت شروع ہی سے محض ایک نظریہ نہیں رہی، بلکہ اس نے ایک تحریک کی شکل اختیار کی۔ نظریے نے جن لوگوں کو متاثر کیا وہ اس کو بروئے کار لانے کی جدوجہد میں مصروف ہو گئے۔ پھر مارکس نے اپنے تاریخی تجزیے سے یہ تاثر پیدا کیا کہ سرمایہ داری کا نظام موت کی آغوش میں ہے اور نیا اشتراکی نظام تاریخ کی ناگزیر قوتوں کے سہارے طلوع ہونے والا ہے۔ انقلاب دستک دے رہا ہے، ہمارا کام اس کے لئے دروازے کھول دینا ہے۔ اس نقطۂ نظر نے ایک عملی ہلچل پیدا کر دی اور ہر طرف انقلابی گروہ اور تنظیمیں حرکت میں آگئیں۔ یورپ کے مختلف ممالک میں اشتراکی پارٹیاں قائم ہوئیں۔ مارکس نے خود ایک بین الاقوامی تحریک [۳۴] برپا کرنے کی کوشش کی لیکن

---

[۳۴] International Working Men's Association

دس سال کی کوششوں کے بعد وہ تحریک منتشر ہوگئی۔ انیسویں صدی ہی میں ایک بار پھر بین الاقوامی تحریک[۳۵] قائم کرنے کی کوشش ہوئی اس میں انجلز، لینن اور یورپ کے بیشتر سوشلسٹوں نے حصہ لیا لیکن دوسری جنگ کے آغاز پر یہ بھی قومیت کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگئی۔ فرانس میں ۱۸۷۰ء میں انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی گئی لیکن یہ تحریک ناکام رہی پہلی جنگ کے آخری دنوں میں روس میں اشتراکی پارٹی کو کامیابی حاصل ہوئی اور اکتوبر ۱۹۱۷ء میں پہلی اشتراکی ریاست قائم ہوئی۔ مغربی یورپ میں سوشلسٹ پارٹیاں وقتاً فوقتاً برسر اقتدار آتی رہیں لیکن جس نوعیت کی تبدیلی وہ لانا چاہتی تھیں اس کا پورا موقع ان کو نہ مل سکا۔ روس میں یہ موقع بدرجۂ کمال حاصل رہا اور یہی وجہ ہے اس کے بعد سے روس بین الاقوامی اشتراکی تحریک کا قائد اور سب کے لئے نمونہ بن گیا۔ وہ سوشلسٹ جو روس کے نظام کے کچھ پہلوؤں سے اختلاف کرتے ہیں وہ بھی اس تجربہ کو بہ نظر تحسین دیکھتے ہیں۔ روس میں اشتراکیت کو روبہ عمل آئے اب ۵۰ سال کی مدت ہوچکی ہے اور یہ زمانہ کسی بھی تہذیبی تجربہ کو جانچنے اور پرکھنے کے لئے کافی ہے۔ اس وقت جو نسل روس میں برسر اقتدار ہے وہ انقلاب کی آغوش میں پلی ہے اور اشتراکیت کے سایہ میں پروان چڑھی ہے۔ دوسری جنگ کے بعد مشرقی یورپ کے مختلف ممالک میں اشتراکی انقلاب برپا ہوئے اور ۱۹۴۹ء میں چین میں اشتراکیت برسر اقتدار آگئی۔ ان تمام مقامات پر بھی اسے اپنے نظریہ کے مطابق سماج کو تبدیل کرنے کے لئے تقریباً ۲۰ سال کی مدت مل چکی ہے۔ آج اشتراکیت کا ایک طالب علم اس پوزیشن میں ہے کہ اس کا نظری اور عملی دونوں پہلوؤں سے مطالعہ کرے اور تحقیق و جستجو کے بعد کوئی رائے قائم کرے۔

۱ ۔ اس وقت اشتراکیت کی دنیوی پوزیشن یہ ہے۔[۳۶]

	کل دنیا	اشتراکی دنیا	سرمایہ دار کیمپ	غیر منسلک ممالک
رقبہ (۱۹۶۲) (ملین کلومیٹر)	۱۳۵.۲	۳۵.۲	۱۵.۰	۸۵.۰
فی صد ۔	۱۰۰	۲۶.۱٪	۱۱.۱٪	۶۲.۸٪
آبادی ۔ (ملین)		۱,۱۱۲.۰	۵۲۶.۳	۱۵۱۳.۰
فی صد		۳۵.۳٪	۱۶.۶٪	۴۸.۱٪

نوٹ :۔ سرمایہ دار کیمپ میں امریکہ، برطانیہ، مغربی جرمنی، فرانس، اٹلی، جاپان اور ان کے مقبوضات کو شامل کیا گیا ہے۔

اس طرح دنیا کے کل رقبہ کا ۲۶ فی صد اور کل آبادی کا ۳۵ فی صد اشتراکیت کے زیر سایہ ہے۔ یہ اس کی مادی اور سیاسی طاقت کا ایک اشاریہ ہے۔ پھر ان اشتراکی ممالک میں معاشی، تعلیمی، سائنسی، معاشرتی اور عسکری میدانوں میں نمایاں کارنامے انجام دیئے گئے ہیں۔ آج روس دنیا کی دوسری بڑی قوت کی حیثیت رکھتا ہے اور سائنس اور فنیت (technologp) کے

---

۳۵ Second International (1889-1914.)

۳۶ Ingram, David, *The Communist Economic Challenge*, George Allen and Unwin, London, 1965, p. 13.

میدان میں اس نے بڑا اونچا مقام حاصل کر لیا ہے۔ زندگی کی دوڑ میں تقریباً ہر دائرہ میں وہ مغربی اقوام کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر رہا ہے۔ اگر صرف مادی نقطۂ نظر سے حالات کا مطالعہ کیا جائے تو اشتراکیت کے دامن میں بہت سی کامیابیوں کے نشان ہیں اور مغربی ممالک سے کچھ پہلوؤں سے پیچھے ہونے کے باوجود، وہ آنکھیں چار کر سکتی ہے۔

۲ - نظری اعتبار سے اشتراکیت کا ایک نمایاں کارنامہ سرمایہ داری کا مطالعہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے معاشی نظریہ (economic tleory) پر جتنا کام مارکس اور دوسرے اشتراکی مفکرین نے کیا ہے اتنا سرمایہ داری کے علمبرداروں نے نہیں کیا۔ اور اس موخرالذکر گروہ نے جو کام کیا بھی ہے وہ اس چیلنج کے جواب میں ہے جو اشتراکیت نے پیش کیا۔ اس طرح اشتراکیت نے علمی تحقیق، مطالعہ اور بحث و مجادلہ کا ایک نیا میدان کھولا۔ فرانسیسی اہل قلم اے موئڈایرون نے بہت صحیح کہا ہے کہ مارکسزم دراصل سرمایہ داری کی سائنس (Science of Capitalism) ہے۔ سرمایہ داری کی خامیوں پر سے پردہ اٹھانا اور ان رستے ہوئے ناسوروں کو دنیا کے سامنے بے نقاب کرنا جو اس نظام ظلم نے جسم انسانی پر پیدا کر دیئے تھے اشتراکیت کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔

پھر اشتراکیت نے سرمایہ داری کو ایک اور پہلو سے بھی متاثر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کی تنقید کے زیر اثر سرمایہ داری کی خرابیاں کو دور کرنے اور اس کے تناقضات کو رفع کرنے کی کوشش شروع ہوئی۔ گذشتہ سو سوا سو سال میں جو بھی اصلاحات سرمایہ داری میں ہوئی ہیں ان میں سے بیشتر کا سہرا بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر اشتراکیت کے سر ہے۔ یہی نہیں بلکہ اشتراکیت نے جو نظریہ پیش کیا اس کے زیر اثر معاشیات کی اہمیت غیر معمولی طور پر بڑھ گئی۔ اشتراکیت کی بے اعتدالی اپنی جگہ لیکن دوسرے تمام علوم میں معاشیات کو جس طرح نظر انداز کیا جا رہا تھا وہ بڑا غیر حقیقت پسندانہ تھا۔ اشتراکی افکار کے زیر اثر اس پوزیشن پر نظرثانی کی گئی اور تقریباً تمام ہی عمرانی علوم اس سے متاثر ہوئے اور انھوں نے اپنے اپنے دائرے میں بہت سی اصلاحات کیں اور بہت سے نئے مباحث پر گفتگو اور تحقیق کا دروازہ کھل گیا عمرانی علوم میں تاریخی نقطۂ نظر کو فروغ دینے اور معاشرہ کے مختلف پہلوؤں کو ایک ہمہ گیر عمل کا جزو سمجھ کر تجزیہ کرنے کے رجحان کو تقویت دینے میں بھی اشتراکی فکر کا خاصا دخل ہے۔

اسی طرح طریق استناج (pragmaric method) کو رواج بخشنے میں بھی اشتراکیت کا حصہ ہے۔ اس نے نظریہ کے ساتھ عمل کی اہمیت کو واضح کیا اور نظریات کو عمل کی تجربہ گاہ میں پرکھنے کی روش ڈالی۔

اشتراکیت کے سارے علمی اثرات قابل ذکر اور ایک حد تک لائق تحسین ہیں۔

۳ - پھر اشتراکیت نے مغربی دنیا کی ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ مذہب سے انحراف اور انکار کے بعد اس میں ذہنی تردد اور تشکیک (scepticism) کو فروغ حاصل ہوا تھا۔ انسان عقیدہ کی قوت سے محروم ہو گیا تھا۔ ہر علم کسی خاص سمت میں ترقی کر رہا تھا اور سب کو جوڑ کر ان میں یک رنگی پیدا کرنے والا کوئی اصول باقی نہ رہا تھا۔ ادھوری مادیت اور لذت پرستی بلاشبہ میدان میں موجود تھی لیکن محض یہ کوئی انضباطی قوت (integrating force) نہیں بن سکتی تھی۔ اس لئے بڑے پیمانے پر ذہنی انتشار اور تشکیک رونما ہوئی اور کیفیت یہ ہو گئی کہ:

جاتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ

اس پس منظر میں اشتراکیت نے مغربی تہذیب کی ادھوری مادیت کی تکمیل کی اور مکمل مادیت اور معاشی عوامل کی اولیت کے اصول پر فکر و عمل کے ہر شعبہ کو منظم کرنے کی کوشش کی۔ اس نے تاریخی وجوب (historical necessity) کے تصور کے ذریعہ ایک نیا ایمان پیدا کیا، مستقبل کو پر امید بنایا اور انقلاب کو تمام آرزوؤں اور امنگوں کا مرکز و محور بنا دیا۔ اب دکھی انسانیت کو نجات کی ایک راہ نظر آنے لگی۔ عقیدہ سے محروم دنیا کو ایک نیا عقیدہ مل گیا۔ جو سرمایہ داری کے مظالم کا نشانہ تھے ان کے لئے نئی زندگی کا ایک تصور ابھر آیا۔ اس چیز نے تمام مظلوم اور پس ماندہ عناصر کو اور ذہین طبقات (intelligentsia) میں سے پرعزم باہمت اور حوصلہ مند اشخاص کو اس نئی تحریک سے وابستہ کر دیا۔ اب ان کے دبے ہوئے احساسات کو اظہار کا راستہ مل گیا، سویا ہوا انقلابی جذبہ بیدار ہو گیا۔ قوت عمل کو پامال کرنے والی تشکیک کی جگہ روشن مستقبل کی امید نے لی۔ اشتراکیت نے پرانے مذہب کی بیخ کنی کی، لیکن خود ایک مذہب بن گئی۔ وہ عینیت (idealism) کی منکر تھی، لیکن اس کے اپنے فروغ کا سب سے بڑا سبب اس کی عینیت ہی ثابت ہوئی۔ یہ وہ پہلو ہے جس پر اس کی ساری کامیابی کا انحصار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لاسکی جیسے سوشلسٹ مفکر نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ:

"کمیونزم کا فروغ اِسکی اور مقصدیت (idealism) کی بناء پر ہے، حقیقت پسندی اور مادیت کی وجہ سے نہیں، اس کے روحانی امکان کی وجہ سے ہے، مادی توقعات کی بنا پر نہیں۔" [۳۴]

اور بیسویں صدی کے سب سے اہم معاشی مفکر کینس نے اس حقیقت کو یوں ادا کیا ہے کہ

"اگر اشتراکیت کوئی کامیابی حاصل کرتی ہے تو وہ اس کے مسلط کردہ معاشی تکنیک کی وجہ سے نہیں ہوگی، بلکہ ایک مذہب کی حیثیت سے ہوگی۔" [۳۵]

مشہور اشتراکی نقاد کیرویٹ اس بات کو بھی وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

"اشتراکیت غربت اور خراب سماجی حالات کی پیداوار نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس کی اصل اپیل نچلے افلاس زدہ طبقات کے مقابلے میں بہتر اُجرت پانے والے مزدوروں اور تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ کارکنوں کے لئے ہے۔ یہ اس امر کا نتیجہ بھی نہیں ہے کہ عوام میں اب سرمایہ دارانہ نظام کی خباثتوں اور بے انصافیوں کا شعور پیدا ہو گیا ہے اور نہ ہی یہ نظام پیداوار کی اکتا دینے والی یکسانی کا نتیجہ ہے کیونکہ اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ مزدور روٹین کام سے کوئی نفرت رکھتے ہیں بشرطیکہ ان کو ملازمت کی ضمانت حاصل ہو اور ان کے معیار زندگی کو کوئی خطرہ نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے اور بے لاگ تجزیہ ہمیں بالآخر اس نتیجہ تک لاتا ہے کہ اشتراکیت ان نظریات کے مجموعہ کا نام ہے جنھوں نے ہماری زندگی کے اس خلا کو پُر کیا ہے جسے منظم مذہب کے انہدام نے پیدا کر دیا تھا اور جو زندگی پر لادینیت کے غلبہ کا لازمی

---

[۳۴] Laski, Harold, J., *Communism*, Henry Holt & Co., New York. 1927, p. 250.

[۳۵] Quoted by Oscar Jaszi, "Socialism", *Encyclopaedia of the Social Sciences*, Vol: X 209.

نتیجہ تھا۔ اس نظام کا مقابلہ اگر کیا جا سکتا ہے تو ایک دوسرے ہمہ گیر نظامِ حیات ہی سے کیا جا سکتا ہے جو کچھ متبادل اصولوں کا علمبردار ہو"۔ ؎۳۹

اشتراکیت کے اس پہلو نے بیسویں صدی کی دنیا کو بے حد متاثر کیا ہے ۔لیکن یہی وہ پہلو ہے جس کی توجیہ خالص اشتراکی ہیئت فکر (framework) اور اصول تجزیہ کی روشنی میں نہیں کی جا سکتی۔ ایک نظریہ کی حیثیت سے اشتراکیت کی کامیابی اشتراکیت کی فلسفیانہ بنیادوں پر ایک ضرب کاری ہے ۔

۴ ۔ اشتراکیت نے بیسویں صدی کو نظریاتی مزاج دینے میں بھی غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں جغرافیائی قوم پرستی کے بت پر اشتراکی

؎۳۹ Carew-Hunt, R.N., *The Theory and Practice of Communism*, op. cit., p. 6.

یہی نقطہ نظر سابق کیمونسٹ اور انگلستان کی کیمونسٹ پارٹی کے ترجمان *The Daily Worker* کے سابق ایڈیٹر ڈگلس ہائیڈ نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو

پھر بات صرف اس وظیفہ ہی کی نہیں ہے جو مذہب سماج اور تاریخ میں ادا کرتا ہے بلکہ اشتراکیت نے اپنے پیرووں میں وہی تقلیدی ذہن پیدا کیا ہے جو مذہب کا خاصہ رہا ہے ۔اشتراکیوں کے لئے مارکس اور انجلز کی تحریریں "آیات ربانی" کا درجہ رکھتی ہیں ۔ان کی کتب کو وہی درجہ دیا جاتا ہے جو صحف سماوی کو دیا جاتا ہے ۔اس کے لئے کسی اور مثال کو چھوڑیئے صرف لینن کے خط سے یہ دو اقتباسات بغور پڑھ لیجئے ۔

"انجلز بالکل برسرِ حق تھا ۔ میں اپنے زمانہ میں جب یہ سنتا ہوں کہ انجلز موقع پرست تھا تو مجھے بے حد دکھ ہوتا ہے ۔ میرا رد یہ سرتاسر تشکیکی ہے .... میں دعویٰ کرتا ہوں کہ آگے بڑھو اور صرف ایک بار یہ ثابت کردو کہ انجلز سے کبھی غلطی بھی ہوئی ہے۔ تم ایسا کبھی نہ کرسکو گے ۔"

لینن ۔ خط بنام انیسا ارماند مورخہ ۲۵ دسمبر ۱۹۱۶ء ۔

" میں اب بھی مارکس اور انجلز سے گہری محبت کرتا ہوں ۔اور ان کے خلاف کسی بدزبانی کو خاموشی سے برداشت نہیں کرسکتا ۔ نہیں ۔ یہ دونوں تو اصل معیاری انسان ہیں۔ ہمیں لازماً ان سے سیکھنا چاہئے ۔اس بنیاد سے ہمیں سرِمو انحراف نہیں کرنا چاہئے ۔"

لینن خط بنام انیسا ارماند ۔ مورخہ ۱۲ر جنوری ۱۹۱۷ء ۔

اس طرح چین میں ماؤزے تنگ کی "لال کتاب" کو جس طرح صحیفۂ آسمانی کی حیثیت سے استعمال کیا جا رہا ہے حتیٰ کہ یہ تک کہا جاتا ہے کہ چینی سپاہیوں نے "لال کتاب" سے اقتباسات کی "تلاوت" کرتے ہوئے امریکی جہاز مار گرائے ۔ یہ سب "مذہبی جذبہ" کے اظہار کی صورتیں نہیں تو اور کیا ہیں ؟ جبھی تو والٹیر نے کہا تھا کہ اگر خدا نہیں ہے تو ہمیں ایک خدا بنانا پڑے گا !

عالمگیریت نے ایک نہایت ہی کامیاب ضرب لگائی ہے۔ اشتراکی تجربہ کا مطالعہ اس پہلو سے بے حد معنی خیز ہے کہ ایک نظریہ کس کس پہلو سے انسانوں کی قوتوں کو بیدار کرتا ہے اور انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کیا کیا کارنامے انجام دے سکتا ہے۔ پھر تمام ہی علوم کے دائروں میں نظریہ کی بنیاد پر تحقیقی اور تخلیقی کام ہوا۔ چونکہ وہ نظریہ ایک متوازن نظریہ نہ تھا اور چونکہ وہ کائنات کی بنیادی حقیقتوں سے متصادم تھا اس لئے بلاشبہ اس نے ہزاروں پیچیدگیاں اور مشکلات پیدا کیں، لیکن یہ بات کہ ایک نظریہ کس کس پہلو سے متاثر کن ہوسکتا ہے خود ایک دلچسپ موضوع مطالعہ ہے۔

۵ - اشتراکیت نے بہت سے نئے تجربات بھی کئے ہیں اور یہ تجربات انسانیت کی مشترک میراث ہیں، ان سے ہر قوم اپنی ضرورت، اپنے حالات اور اپنے اصول و اقدار کی مناسبت سے استفادہ کرسکتی ہے۔ جس طرح ہم بہت سے معاملات میں مغربی سرمایہ داری کے کئے ہوئے تجربات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور جس طرح بہت سے امور میں جمہوریت کے تجربہ سے سبق سیکھ سکتے ہیں اسی طرح اشتراکی تجربہ سے بھی بہت سی چیزیں سمجھی اور اخذ کی جاسکتی ہیں۔ البتہ ہر صورت میں اس احتیاط کے ساتھ کہ ان میں سے کوئی چیز ہمارے دین و ایمان، ہمارے تمدن و معاشرت اور ہماری اقدار حیات سے متصادم نہ ہو یا ان کے مزاج سے نامطابقت نہ رکھتی ہو۔ اشتراکیت نے جو مفید تجربات کئے ہیں ان میں سے ایک معاشی منصوبہ بندی ہے۔ گو اس پہلو سے بھی اشتراکیت دوسری انتہا کو پہنچ گئی لیکن بے اعتدالیوں سے دامن بچاتے ہوئے اس پہلو سے بہت سی مفید چیزیں اخذ کی جاسکتی ہیں۔ اسی طرح یہ بات کہ ایک نظریہ کو کس طرح اور کس کس پہلو سے روبہ عمل لایا جاتا ہے اور آج کی دنیا میں، اس کے مختلف اداروں میں نظریہ کو کیونکر سمویا جاسکتا ہے۔ یہاں بھی بہت سی احتیاطیں ضروری ہیں۔ بے اعتدالیوں اور تشدد سے بچنا ہوگا۔ لیکن کئی پہلو بہت مفید اور سبق آموز ہیں اور ان کو سامنے رکھا جاسکتا ہے۔ اسی طرح معاشی ترقی کے سلسلہ میں انسانی سرمایہ کی تشکیل اور پورے ترقیاتی عمل سے اس متغیرہ کا تعلق بھی ایک ایسا میدان ہے جس میں اشتراکی تجربات سے بہت کچھ سیکھا جاسکتا ہے۔ اشتراکیت کے مفید تجربات سے اس بناء پر صرف نظر نہیں کرنا چاہئے کہ وہ دین دشمن تہذیب میں ہوئے ہیں۔ ایک مسلمان ملک کو ان دونوں کے زہریلے پہلوؤں سے اپنے کو بچانا ہے اور مفید اور اپنے نظام کے لئے قابل قبول پہلوؤں سے بالغ ذہن اور آزاد رویہ کے ساتھ استفادہ بھی کرنا ہے۔

۶ - اشتراکیت نے اخلاق اور مذہب کی نفی کی ہے اور اپنے پورے نظام کو خالص مادی بنیادوں پر بیان کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے اس کی پکار پر لبیک کہا ہے وہ اخلاقی حس کی بنا پر کیا ہے! اس نے انسانوں کی توجہ کو سرمایہ دارانہ نظام میں برپا ہونے والے ظلم و استحصال اور بے انصافی پر مرکوز کیا۔ اشتراکیت کے خالص مادی نقطۂ نظر میں "انصاف" اور "ظلم" کا کوئی مقام بحیثیت اخلاقی تصورات کے نہیں ہے لیکن عام انسانوں کے لئے یہ الفاظ اخلاقی مفہوم ہی رکھتے ہیں اور سرمایہ داری کے خلاف ان کا غم و غصہ اخلاقی محرکات ہی کا پیدا کردہ ہے۔ اس پہلو سے اشتراکیت نیم ارادی طور پر ایک مفید کام کرنے کا ذریعہ بنی ہے، گو اس کی نفی اس نے طبقاتی تصادم اور نفرت کو ہوا دے کر کردی۔ اس نقصان دہ پہلو کے باوجود جو چیز کسی حیثیت سے بھی مفید تھی اس کا ذکر نہ کرنا ہم دیانت و انصاف کے خلاف سمجھتے ہیں۔ ہم اشتراکیت پر جتنا بھی غور کرسکے ہیں ہماری نگاہ میں اس کے مفید اور مثبت پہلو بس یہی ہیں۔ اور تنقیدی مطالعہ سے پہلے ہم نے بلا تکلف ان کا اظہار کردیا ہے۔

اشتراکیت کی نظری الجھنیں

اس مضمون میں ہم اشتراکیت کے نظری پہلو سے زیادہ بحث نہیں کرنا چاہتے ہیں[1] لیکن چونکہ یہ بھی اشتراکیت کو جانچنے اور پرکھنے کا ایک اہم معیار ہے اس لئے ہم چند ضروری نکات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

۱ ۔ اشتراکیت کا سب سے کمزور پہلو اس کا بنیادی تصور ہے۔ یعنی معاشی عامل کی اولیت اور بالادستی، یہ چیز عقلاً غلط، عملاً خلاف واقع اور تاریخی طور پر ناقابل ثبوت ہے۔ اس کے لئے مارکس اور اس کے حامیوں نے جو بھی استدلال کیا ہے وہ یک طرفہ اور بودا ہے۔ انسان محض معاشی حیوان نہیں ہے اور نہ ہی معاشی قوتیں اصل تاریخ ساز ہیں۔ انسانی زندگی بہت سے محرکات کے اثر پذیر ہوتی ہے۔ ساری تاریخ تہذیب کو کسی ایک جزوی فارمولے کی روشنی میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلہ کی جتنی بھی کوششیں ہوئی ہیں وہ سب خام اور غیر تسلی بخش ہیں۔ اشتراکیت نہ انسانی نفسیات کو سمجھ سکی اور نہ تہذیب کے عناصر ترکیبی کو۔ اس نے ہر چیز کو اپنے ایک مخصوص فارمولے پر صادق کرنا چاہا اور اس میں وہ بری طرح ناکام رہی۔

۲ ۔ اشتراکیت کا تصور کائنات و انسان بھی سرتاسر باطل ہے۔ اس نے انیسویں صدی کے نصف اوّل کی مادیت کو من و عن قبول کر لیا اور اس کی بنیاد پر ایک ممکن فلسفہ وضع کر ڈالا۔ حالانکہ مادیت کا وہ نقطہ نظر ان حقائق کی نفی کرتا ہے جنھیں انسانیت نے وحی الٰہی اور انبیائے کرام کی رہنمائی میں ہمیشہ سے سچ مانا ہے اور ان صداقتوں سے بھی متصادم ہے جو انسانی تجربے اور خود سائنس کی جدید تحقیقات سے ہمارے سامنے آتی ہیں۔ محض مادیت کائنات کے بنیادی حقائق اور انسانی زندگی کے اولیں سوالات کا کوئی معقول اور تسلی بخش جواب فراہم نہیں کر سکتی۔ پھر اشتراکیت نے اس مادیت پر جدلی عمل کا مزید اضافہ کیا جس نے اس کے پورے مطالعہ کو اور بھی غیر متوازن اور غیر حقیقی بنا دیا۔

۳ ۔ اشتراکیت کا تصور تاریخ بھی نہایت خام اور غیر متوازن ہے۔ اگر ساری تاریخ طبقاتی تنازع کی تاریخ ہے تو ماننا پڑے گا کہ انسانیت کی تاریخ بہت ہی مختصر اور جزوی۔ اس پوری کتاب میں صرف چند صفحوں پر کوئی تحریر ہے اور وہ بھی چند سطروں سے آگے نہیں بڑھتی! نہ تاریخ میں وہ جبریت ہے جس کی نشان دہی اشتراکیت نے کی ہے، نہ یہ ان واضح مرحلوں اور منزلوں میں منقسم ہے جن کی دریافت اشتراکیت نے کی ہے اور نہ اس میں کشمکش کی وہ نوعیت ہے جسے اشتراکیت نے ترقی کی بنیاد قرار دیا ہے۔ پھر تاریخ میں محض یک طرفہ ٹریفک نہیں ہے۔ ایک ہی قوت دوسروں کو متاثر نہیں کرتی بلکہ بیک وقت

---

[1] اس کے لئے اس شمارہ میں پروفیسر عبدالحمید صدیقی کا مضمون "اشتراکیت کی فکری بنیادیں اور ان کا تنقیدی جائزہ" ملاحظہ ہو مزید مطالعہ کے لئے ملاحظہ ہو۔ اشتراکیت اور نظام اسلام" از مظہر الدین صدیقی؛ انسانیت کی تعمیر نو اور اسلام از عبدالحمید صدیقی؛

بے شمار قوتیں کارفرما ہیں جو اثر انداز بھی ہوتی ہیں اور اثر پذیر بھی۔ اشتراکیت تاریخی عمل کو اس درجہ آسان بناتی ہے کہ وہ غیر حقیقی ہو جاتا ہے۔

۵ ۔ اشتراکیت نے فکر و فن، فلسفہ و مذہب، سیاست و قانون، معاشرت و مدنیت، اخلاق و ثقافت، غرض ہر چیز کو معاشی اسباب و کوائف کی پیداوار قرار دیا ہے۔ لیکن وہ یہ بتانے میں ناکام ہے کہ خود معاشی ہئیت اور پیداواری ساخت میں تبدیلی کیسے ہوتی ہے؛ وہ کونسی قوتیں ہیں جو اس میدان میں تغیر کی لہروں کو پیدا کرتی ہیں اور پھر پورے نظام کی قلب ماہیت پر منتج ہوتی ہیں۔ تہذیب کے آغاز و ارتقاء کی پیداواری قوتوں کی جبریت کی روشنی میں توجیہ ناممکن ہے۔ [۱۴۵]

۶ ۔ اشتراکیت شعور انسانی کے آزاد اور مختار وجود کی نفی کرتی ہے اور اس طرح خود عقلیت کی بنیادوں کو منہدم کر دیتی ہے پھر جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، اشتراکیت کے اس دعوے کے بعد خود اشتراکیت کی ترقی اور اس کے فروغ کی کوئی توجیہہ نہیں کی جا سکتی۔ مارکس نے طبقاتی شعور کو بیدار کیا۔ یہ آپ سے آپ وجود میں نہیں آ گیا تھا، پوری اشتراکی تحریک اسی شعور کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی کوشش کرتی ہے۔ خارجی ذرائع سے اس شعور کو ابھارنے کے بعد اس کا دعویٰ یہی رہتا ہے کہ شعور محض مادی کوائف کا ایک بے جان پرتو ہے! اشتراکیت کی دبی ہوئی نفسیات بڑی بے بنیاد ہے۔ یہ انسانیت کی نفی پر مبنی ہے۔

۷ ۔ معاشی دائرہ میں مارکس کا بنیادی تصور قدر زائد کا نظریہ ہے لیکن اس کا باطل ہونا اب ایک ثابت شدہ حقیقت ہے لاسکی جیسا سوشلسٹ بھی اعتراف کرتا ہے کہ قدر زائد کا نظریہ کوئی صداقت نہیں رکھتا۔ اسی طرح سرمایہ داری کے ارتقا کے بارے میں مارکس نے جو اصول وضع کئے تھے ان میں سے معاشی عدم توازن اور بحران کی پیشین گوئی کے علاوہ کوئی بھی صحیح ثابت نہیں ہوا۔ نہ ارتکاز کی وہ کیفیت رونما ہوئی جو مارکس نے بتائی تھی، نہ غربت میں اضافہ ہوا، نہ ہیئت سرمایہ میں وہ تغیرات واقع ہوئے اور معاشی بحران کو بھی خلاف بحران مسلک کے ذریعہ بڑی حد تک قابو میں کیا جا چکا ہے۔ اجرتوں میں کامل مساوات بھی اسی طرح ایک استحصالی کیفیت ہے۔ جس طرح ان میں غیر فطری عدم توازن۔ مارکس نے ان تمام پہلوؤں کا مطالعہ بڑے جذباتی انداز میں کیا اور اپنے سائنٹفک ہونے کے بارے میں سارے دعووں کے باوجود اپنے ان مفروضوں دعووں کو عقل و تجربہ کی میزان پر نہ کسا۔ اسی لئے مارکس کی معاشیات یک رخی اور غیر حقیقت پسندانہ رہی۔

۸ ۔ سیاست میں بھی یہی کیفیت ہے۔ ریاست اور قانون کو ظلم و استحصال کا آلہ سمجھنا حالات کا بڑا غلط اور غیر حقیقت پسندانہ مطالعہ ہے۔ اسی طرح بلا ریاست کے سماج کا تصور بھی ایک خیالی واہمہ ہے۔ جب تک انسان انسان ہے اسے نظام کی ضرورت ہوگی اور کوئی نظم قانون اور احتساب کے بغیر نہیں چل سکتا۔ اشتراکیت ایک متشددانہ اور انتہا پسند نظریہ ہے

۱۴۵

اور ہر دو صورتوں میں وہ راہ اعتدال سے کوسوں دور ہے۔

۹ - مذہب اور اخلاق کے بارے میں بھی اشتراکیت کی تنقید بڑی سطحی اور غلط ہے۔ نہ اس کی معلومات صحیح ہیں، نہ تجزیہ درست ہے اور نہ نتائج مبنی بر صداقت ہیں۔

۱۰ - اشتراکیت نے نفرت کے جذبہ کو ابھارا ہے تشدد کے طریقہ کی تبلیغ کی ہے۔ انقلاب اور خون خرابے کو پسند کیا ہے، بلکہ راہِ نجات قرار دیا ہے اور جیساکہ برٹرینڈ رسل نے کہا ہے کہ ایسی کوئی کیمیا نہیں پائی جاتی کہ فساد، جنگ و جدل اور تشدد اور خون خرابے سے امن، تعاون اور محبت و مودت کو پیدا کر دیا جائے۔

۱۱ - اشتراکیت کا سارا کام منفی نوعیت کا ہے۔ اس نے نہ زندگی کا کوئی مثبت نقشہ پیش کیا ہے اور نہ ہی ایک منصفانہ اور عادلانہ نظام کے خدوخال بیان کئے ہیں۔ وہ سرمایہ داری کے خلاف نفرت پیدا کرنے اور انقلابی جذبہ بیدار کرنے کا کام کرتی ہے، کوئی مثبت نظام نہیں پیش کرتی۔

۱۲ - اگر اشتراکیت پر خود اشتراکی تجزیہ کا اطلاق کیا جائے تو بڑا دلچسپ نتیجہ نکلتا ہے۔ اشتراکیت کا دعویٰ ہے کہ ہر دور کے نظریات اپنے مخصوص معاشی حالات کی پیداوار ہوتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر اشتراکیت انیسویں صدی کے مخصوص معاشی حالات کی پیداوار قرار پاتی ہے اور اگر ایسا ہے تو پھر اشتراکیت اور اس کے معاشی تجزیہ کو ابدی صداقت کی حیثیت سے کیسے مانا جا سکتا ہے۔ جب کوئی بھی ابدی صداقت نہیں ہے تو اس نظریہ کو یہ مقام کیسے دے دیا جائے؟ اشتراکیت چند خاص حالات کی پیداوار تھی اور اس صدی کے خاتمہ اور ان حالات کے بدل جانے کے بعد اس کی بھی ختم ہو گئی۔ اگر کوئی سنہری اصول نہیں ہے تو اس قول کو ایک سنہری اصول کیسے مان لیا جائے! جبھی تو آرنالڈ لن نے کہا تھا کہ اگر اشتراکیت صحیح ہے، تو اشتراکیت غلط ہے! ۵۴۲

(۵)
اشتراکیت کی اصل ناکامی

اگر اشتراکی نظریہ میں ایک نہیں ایک لاکھ نظری الجھنیں اور پیچیدگیاں ہوتیں لیکن وہ ایک ایسی تہذیب قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتا جس میں انسان کو اس کا حقیقی مقام حاصل ہوتا، جہاں حق و انصاف کا دور دورہ ہوتا، جو امن و سلامتی کا پیامبر بنتا، جو نیکی اور بھلائی کا گہوارہ ہوتا، جہاں دل کو سکون اور روح کو اطمینان ملتا تو شاید ان الجھنوں کو نظر انداز بھی کر دیا جاتا۔ لیکن اشتراکیت شدید نظری الجھنوں کے ساتھ اس معیار پر بھی پوری نہیں اتری۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ یہی وہ پہلو ہے جو اشتراکیت کا سب سے کمزور اور سب سے زیادہ تاریک پہلو ہے۔

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ اشتراکیت نے بہت سے پہلوؤں سے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ اس کے زیر سایہ معاشی پیداوار بڑھی ہے اور تعلیم و سائنس نے فروغ حاصل کیا ہے۔ اس نے نئے ملک فتح کئے ہیں اور آج بین الاقوامی دنیا میں اس کی آواز ایک نہایت

---

۵۴۲ Lunn, Arnold. *The Revolt Against Reason*, London.

حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے پیرووں نے تباہ کن اسلحہ سے لے کر مصنوعی سیاروں تک کی صناعی میں ایک نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔ یہ سب کچھ بجا! لیکن سوال یہ ہے کہ کسی نظام کی عظمت کا انحصار آخر کن چیزوں پر ہے؟ اگر اس کا انحصار محض دولت کی فراوانی اور پیداوار کی زیادتی پر ہے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ سرمایہ دارانہ نظام اشتراکیت سے افضل ہے۔ آج بھی اس پہلو سے مغرب کے سرمایہ دار ممالک اشتراکی ممالک پر فوقیت رکھتے ہیں۔ اگر آبادی کی کثافت اور رقبہ کی وسعت کسی نظام کی عظمت کی دلیل ہے تو سکندر کا یونان، سیزر کا روم اور تیمور کی سلطنت اشتراکیت سے اعلیٰ و ارفع قرار پائیں گے! اگر بڑی بڑی فیکٹریاں، اونچے اونچے قلعے اور عظیم معاشی منصوبے برتری کا ثبوت ہیں تو پھر فرعونوں کے دور میں مجبور کسانوں کے زخمی ہاتھوں سے تیار شدہ اہرام انسانی کاریگری اور مادی عظمت کے زیادہ بڑے اور روشن نشان ہیں! اور اگر کسی نظام کی صداقت کی دلیل اس کا تیزی کے ساتھ پھیل جانا دنیا پر چھا جانا اور چند سالوں میں بڑی بڑی آبادیوں کو اپنے زیر اثر لے آنا ہے تو پھر چنگیز اور ہلاکو کے طوفانی غلبہ اور یورپی استعمار کے بلا کیش تسلط کے بارے میں منصف نقاد کیا رائے ظاہر کرے گا؟ اور ان میں سے کس کو عظیم تر قرار دے گا!

حقیقت یہ ہے کہ کسی نظامِ تہذیب کی عظمت نہ اس کے مال اگلتے ہوئے کارخانوں سے ہے اور نہ آگ برساتے ہوئے اسلحہ سے۔ نہ دولت کی فراوانی اسے عظیم بناتی ہے اور نہ فوجی سطوت۔ اس کی بڑائی نہ رقبہ کی وسعت سے ہے۔ اور نہ ہی غلبہ کی سرعت سے۔ عظمت کا اصل پیمانہ یہ ہے کہ ایک نظام انسانیت کے لئے کتنا مفید اور نافع ہے اور کائنات کے مقاصد سے کہاں تک ہم آہنگ ہے؟ اس کے ذریعہ انسانیت شرف کی اعلیٰ ترین منزلوں سے ہم کنار ہو رہی ہے یا غلامی اور ذلت کی گہرائیوں میں گر رہی ہے! اخلاق سنور رہے ہیں یا بہیمیت کو ترقی ہو رہی ہے؟ آزادی، اخوت اور بھائی چارہ میں اضافہ ہو رہا ہے یا ظلم، فساد اور انسان کشی میں؟ دنیا میں حقیقی امن قائم ہو رہا ہے یا جنگ و جدل اور کشمکش و پیکار کو ہوا دی جا رہی ہے؟ انصاف کا دور دورہ ہے یا بے انصافی کا؟ حق و صداقت کو سربلندی نصیب ہو رہی ہے یا باطل و طاغوت کو؟ انسان خوش اور مطمئن ہے یا اس کی روح بے چین و مضطرب؟[۴۳] اس لئے کہ

نہ کلی ہے وجہ نظر کشی، نہ کنول کے پھول میں تازگی
فقط ایک دل کی شگفتگی، سببِ نشاطِ بہار ہے

اگر ایک نظام، خواہ اس نے کتنی ہی مادی ترقی کیوں نہ کر لی ہو، انسانیت کے بنیادی مسائل کو حل نہیں کرتا، انسانی شرف و عزت کو قائم نہیں کرتا، اخلاق کو صحت مند بنیادوں پر تعمیر نہیں کرتا اور چمن حیات کو انصاف، آزادی، خدا ترسی، محبت اور اخوت کے پھولوں سے آراستہ نہیں کرتا تو وہ دنیا کے لئے ایک نعمت نہیں لعنت ہے اور وہ انسانیت کے دکھوں کا کوئی مداوا نہ کر سکے گا۔

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

جب ہم اشتراکیت کا اس نقطۂ نظر سے جائزہ لیتے ہیں تو اس نتیجہ سے کوئی مفر نہیں کہ وہ بری طرح ناکام رہی ہے۔

---

[۴۳] "حقیقی تہذیب لازمی طور پر ایک روحانی حقیقت ہے اور اس کے جانچنے کا معیار مادی دولت نہیں بلکہ روحانی نظر ہے"
چارلس ڈرسن۔ Essays in Order نیویارک۔ ۱۹۳۱، صفحہ ۹-۲۲۸

اشتراکیت نے جس مقام سے اپنے سفر کا آغاز کیا وہ مغربی تہذیب کا وہ دور تھا جس میں انسان کی خاصی تخفیف قدر (devaluation) ہو چکی تھی۔ کبھی انسان کا مسکن (دنیا) کائنات کا مرکز تھی اور انسان اس کا مقصد تخلیق۔ کائنات کی ہر شے انسان کے لئے تھی اور انسان کا مقام خدا کے خلیفہ کا تھا۔ ہر دوسری چیز اس کے تابع تھی۔ اب زاویہ نظر بدلنا شروع ہوا۔ سائنس والوں کی ایک کھیپ اٹھی اور اس نے یہ ثابت کیا کہ دنیا کائنات کا مرکز نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت اس عظیم کائنات میں ریت کے ایک حقیر ذرہ سے زیادہ نہیں۔ پھر یہ تصور آیا کہ انسان کوئی خاص مخلوق اور خدا کا خلیفہ نہیں بلکہ محض جانور کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ بھیڑیے، کتے، اور بندر سب اس کے افراد خاندان ہیں! پھر ایک اور ضرب لگی کہ انسان مختار اور آزاد بھی نہیں ہے بلکہ معاشرہ کی پیداوار ہے۔ اشتراکیت نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور اس نے بتایا کہ معاشرہ بھی مخصوص معاشی ہیئت کا ثمرہ ہے۔ فرد کا کوئی مستقل وجود نہیں، وہ تاریخی قوتوں کے ہاتھوں مجبور محض ہے۔ اب انسان صرف ایک چلتا پھرتا پرزہ مشین ہو کر رہ گیا۔ اشتراکی فلسفہ نے شعور، اخلاق اور روح ہر چیز کی نفی کی۔ اب نہ انسانی اقدار کو کوئی مقام حاصل تھا اور نہ انسان کی کوئی اعلیٰ اخلاقی حیثیت تھی۔ انسانی احساسات اور جذبات کی بھی کوئی وقعت باقی نہ رہی۔ فکر و نظر کا مرکز انسان نہ رہا پیداواری نظام بن گیا۔ اصل اہمیت عاملین پیداوار کی قرار پائی انسانی اقدار کی نہیں۔ پھر اخلاق ایک اضافی شے قرار دی گئی اور اس کو مادی ترقی کے تابع کیا گیا۔ حق و انصاف، سچائی و محبت، اور خیر و فلاح کی کوئی مستقل حیثیت باقی نہ رہی۔ اصل اہمیت پیداوار میں اضافہ کی ہو گئی خواہ وہ کسی قیمت پر ہو، اور کسی بھی طریقہ سے حاصل ہو۔ مستقل اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کا کوئی سوال ہی باقی نہ رہا۔

مغرب کی سرمایہ دارانہ جمہوریت میں انسان کی کافی تذلیل اور اس کے مقام کی تخفیف ہو گئی تھی، لیکن نظری طور پر ایک چیز باقی تھی۔ فرد کا احترام! فرد کی شخصیت کا اثبات موجود تھا اور اس کی آزادی کو ایک ناقابل تخفیف حق مانا جاتا تھا۔ اشتراکیت نے روح اور اخلاق کی نفی کے ساتھ فرد کی نفی بھی کی اور اسے اجتماع اور طبقہ کی بھینٹ چڑھا دیا۔ اب فرد زیادہ سے زیادہ ایک گروہ یا طبقہ کا جزو تھا۔

موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

گروہ اور طبقہ کے اس "ضمیمہ" کی آزادی اب بے معنی تھی۔ طبقہ کا مفاد اس کا مفاد تھا اور طبقہ کا نقصان اس کا نقصان۔ سرمایہ دارانہ جمہوریت کی دست برد سے جو کچھ بچ گیا تھا اس سے اشتراکیت نے آ کر محروم کر دیا۔ اب فرد بالکل مجبور تھا۔

یہی وہ تصور ہے جس نے اشتراکی کلیت پسندی (totalitarianism) کو جنم دیا اور جس کے نتیجہ میں

گھٹ گئے انسان، بڑھ گئے سائے!

پھر اس پر ایک فتنہ کا مزید اضافہ ہوا۔ یعنی اس تصور کا کہ مقصد برآری کے لئے کوئی سے بھی ذرائع استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ اصل چیز حصول مقصد ہے، ذرائع کا درست یا نادرست ہونا نہیں۔ اگر تشدد، دھوکہ، فریب، جھوٹ، قتل و غارت گری کے بغیر کام نہیں چل سکتا تو یہ سب روا ہیں۔ لینن نے اشتراکی پارٹی کے کارکنوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ

"اگر ضرورت پیش آئے تو مزدور تنظیموں میں اپنا اثر و نفوذ قائم کرنے، ان میں گھسے رہنے اور ہر قیمت پر اشتراکی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے لئے ہر قسم کے حربوں سے بلا تکلف کام لو۔ سازش، جوڑ توڑ، غیر قانونی ذرائع کا استعمال، دھوکہ وغیرہ سب سے پورا پورا فائدہ اٹھاؤ۔"[۳۴]

---

[۳۴] Lenin, V.I., *Left Wing Communism*, p. 38.

ایک اور موقع پر لینن نے کہا:

"جب کسی کے پاس عظیم اکثریت ہو تو وہ بلا واسطہ سامنے سے حملہ آور ہو کر کامیاب ہو سکتا ہے۔ لیکن جب قوت ناکافی ہو تو پھر دوسرے حربوں کا استعمال ناگزیر ہوتا ہے یعنی اصل رستہ سے ہٹنا اور مقبی راستہ اختیار کرنا انتظار اور خالی دنیا، پیچھے ہٹنا، پیچ وخم کھانا وغیرہ وغیرہ"

پھر اپنی مقصد براری کے لئے اشتراکیت تشدد اور قوت کا استعمال بھی ضروری سمجھتی ہے۔ مارکس اور اینجلز نے اشتراکی منشور میں کہہ دیا تھا کہ

"اشتراکی اپنے اصل نظریات اور عزائم کے اظہار میں پردہ پوشی سے کام لینے سے انکاری ہیں۔ وہ برملا اس کا اعلان کرتے ہیں کہ ان کے مقاصد کا حصول مروجہ سماجی نظام کو بہ جبر اٹھا پھینکنے ہی سے ممکن ہے۔" [۲۵]

اینجلز نے بڑے فخر کے ساتھ کہا تھا کہ

"امیروں اور غریبوں کی یہ جنگ دنیا کی ساری جنگوں سے زیادہ خون آشام ہوگی۔" [۲۶]

اور مارکس نے یہ تک کہہ کر تشدد کی تبلیغ کی کہ

"لڑائی یا موت، خونی جدوجہد یا تباہی ـــــ اصل سوال لازمی طور پر اسی طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔" [۲۷]

لینن نے انہی ارشادات کی روشنی میں تشدد کی تعلیم دی اور بغاوت کے اصول بیان کئے۔ [۲۸] تشدد اشتراکی انقلاب اور پھر اشتراکی پالیسی کا ایک جزو لاینفک بن گیا ہے۔

مندرجہ بالا بحث سے ہم یہ ناقابل انکار نتائج نکال سکتے ہیں۔

(الف) اشتراکی فکر اور اس کے تحت رونما ہونے والے تمدن میں اصل مرکزی مقام انسان کو حاصل نہیں ہے۔ اس کی حیثیت محض اضافی اور طفیلی ہے

(ب) اشتراکیت کا خالص مادی اور جدلی فلسفہ روح اور شعور کی نفی کرتا ہے اور انسان کو تاریخی قوتوں کے سامنے مجبور محض قرار دیتا ہے

(ج) فرد کے آزاد، مختار اور مؤثر وجود کی نفی کی گئی ہے

(د) انفرادی آزادی کے لئے کوئی حقیقی فلسفیانہ اور اخلاقی بنیاد باقی نہیں رہتی۔

---

[۲۵] Marx Communist Manifesto, ed. Laski, op. cit., p. 160

اس بات کا اظہار مارکس نے اور بھی واضح الفاظ میں کیا ہے ملاحظہ ہو صفحہ ۹۶ مطبوعہ لارنس اینڈ وسہارٹ

[۲۶] Engles, F., Conditions of the Working Class in England, George Allen and Unwin, p. 296.

[۲۷] Marx, K., Poverty of Philosophy, Lawrance and Wishart, p. 147

[۲۸] ملاحظہ ہو لینن کی تحریرات کا مجموعہ (Lenin selected works) مطبوعہ موڈرن کمپس ۱۹۲۹ء خصوصیت سے صفحہ ۵۹۔ ۲۵

(ھ) اخلاقی اور غیر اخلاقی ذرائع میں کوئی تمیز باقی نہیں رہتی اور جبر و تشدد اور قوت کے استعمال کو ایک گو نہ فوقیت حاصل ہوتی ہے۔
(و) صداقت اور سچائی کا کوئی مستقل معیار باقی نہیں رہا ہے۔ اسی طرح عدل اور انصاف کی کوئی مستقل اقدار نہیں پائی جاتیں مصلحت اصل رہنما قوت قرار پاتی ہے۔

یہ تمام نتائج اشتراکی فلسفہ سے فطری اور منطقی طور پر رونما ہوتے ہیں۔ اب دیکھئے کہ اشتراکی سماج میں یہ تمام کیفیات کیسے رونما ہوتی ہیں۔

۱ - جن ممالک میں بھی اشتراکی انقلاب رونما ہوا ہے وہاں ساری توجہ مادی پیداوار کو بڑھانے اور فوجی قوت کو مضبوط تر کرنے پر دی گئی ہے۔ یہی روس کی پالیسی رہی ہے۔ اسی پر مشرقی یورپ کے اشتراکی ممالک کار بند ہیں اور یہی چین کی بنیادی حکمت عملی ہے۔ ہر وہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے جس سے یہ مقصد حاصل ہو سکے خواہ اس کی کیسی ہی قیمت ادا کرنی پڑے۔ درست اور نادرست کا معیار انسان اور اس کی فلاح نہیں، قومی پیداوار اور ملکی قوت کی تعمیر رہے ہیں۔ مغربی تہذیب نے اور اس کے تحت خود سرمایہ داری نے انسان کی یہ تخفیف بڑے گھناؤنے انداز میں کی تھی۔ اشتراکیت نے اس عمل کی تکمیل کر دی۔ اس باب میں سرمایہ داری اور اشتراکیت ایک ہی بنیادی نقطۂ نظر رکھتی ہیں۔ سرمایہ داری نے معاشی نفع کو اصل رہنما قوت بنایا تھا اور اشتراکیت نے پیداواری قوتوں کے اضافہ اور ان کی مخصوص تنظیم کو۔ انسان دونوں کے نظام میں کسی مرکزی اہمیت کا حامل نہیں۔ اس کی حیثیت بھی بس ایک پیداواری قوت (means of production) کی ہے۔ سوشلزم نے یورپ میں جن انسانی مسائل کو اٹھایا تھا اور انسان کی زبوں حالی پر جو ماتم کیا تھا اس کا کوئی اثر اشتراکیت کے عملی نظام پر نہ پڑا۔ وہ تمام چیزیں عوام کی ہمدردیوں کو حاصل کرنے کے لئے تھیں، بنیادی اشتراکی فلسفہ سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جب اصل فلسفہ پر عمل ہوا اور نئی حکمت عملی وضع ہوئی تو جسے سب سے زیادہ نظر انداز کیا گیا وہ انسان ہے! ہم اس کے چند مظاہر کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

لینن نے بر سر اقتدار آنے کے بعد یہ کہا کہ "اشتراکیت نام ہے سوویٹ + برقی قوت کی تعمیر"۔ دوسرے موقع پر اس نے کہا کہ "سوویٹ اور صنعتی ترقی سے سوشلزم عبارت ہے۔" لینن کے یہ جملے روسی اشتراکیت کا بنیادی اصول قرار پائے۔ اس کے بعد کی ساری ترقی اس اصول پر ہے کہ گویا صنعتی ترقی اور پیداوار میں اضافہ اشتراکیت کے ہم معنی ہیں۔ نقطۂ نظر کی یہی وہ تبدیلی ہے جس کی وجہ سے خوب و ناخوب کا معیار اضافۂ پیداوار قرار دیا گیا۔ اب یہ اضافہ کسی بھی قیمت پر ہو، ساری توجہ اس پر صرف ہوتی ہے۔ جب اس ذہن کے ساتھ پورے نظام کو چلایا جائے تو انسان کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے اس کا اندازہ ان چند مثالوں سے کیجئے۔

(ا) زراعت کو اجتماعی کھیتوں میں منظم کرنے کے لئے کسانوں سے ایک مستقل جنگ کرنی پڑی۔ وہ کسی قیمت پر بھی اپنی زمین اور اپنے مویشیوں کو اجتماعی تحویل میں دینے کے لئے تیار نہ تھے لیکن سخت ترین تشدد کے ذریعہ ان سے زمینوں کو حاصل کیا گیا۔ اس خونی عمل میں ایک کروڑ انسانوں کی جانیں ضائع ہوئیں لیکن اس نظام نے اس پر کوئی کسک محسوس نہیں کی۔ یالٹا کانفرنس کے موقع پر خود اسٹالن نے چرچل سے کہا کہ دوسری جنگ میں جانوں کا اتلاف کیا حیثیت رکھتا ہے۔ (واضح رہے کہ دوسری جنگ میں روس نے تقریباً ۴۰-۵۰ لاکھ افراد کی قربانی دی) ہم نے تو زراعت کو اجتماعی کھیتوں میں تبدیل کرتے وقت اس سے

دو گئی" قربانی" دی تھی [۹]

(ii) پیداوار کو بڑھانے کے لئے عورتوں کی محنت کو استعمال کیا گیا اور صرف یہی نہیں کہ انھیں ان کاموں میں لگایا گیا ہو جو کم محنت طلب ہیں، بلکہ بڑی صنعت اور کوئلے اور لوہے کی کانوں میں ان کو استعمال کیا گیا۔ انگلستان میں سرمایہ داروں نے عورت کے ساتھ جو سلوک کیا تھا وہی سلوک پیداوار کو بڑھانے کی خاطر اشتراکیت نے کیا۔ انقلاب سے قبل محنت کار عورتوں کی عظیم اکثریت دو تہائی سے زیادہ [۱۰] ہلکی صنعت میں ملازم تھی۔ ۱۹۳۶ کو کیفیت یہ تھی۔

	کل مزدوروں میں عورتوں کا تناسب
کوئلے کی کانیں	
کوئلے کی کانیں	۲۴.۸ فی صد
لوہے کی کانیں	۲۳.۶ "
لوہے کی صنعت	۲۴.۹ "
مختلف دھاتوں کی صنعت و تجارت	۳۱.۷ "
لکڑی کی صنعت	۴۳.۹ "

سرکاری اخبار پراودا کی ۷ ستمبر ۱۹۴۴ کی اشاعت میں ایک صوبائی کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری کی زبانی یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ "بہت سی کانوں میں عورتیں بنیادی اور فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہیں۔ بہت سے کوئلے کے ٹرسٹوں میں جیسے Kuibagshevugol Sovetskugol Artemugol وغیرہ کل کان کنوں میں عورتوں کا تناسب ۵۰ ـــ ۷۰ فی صد تک ہے۔"

اٹلی کی ٹریڈ یونینوں کی فیڈریشن نے لکھا ہے کہ اس نے ٹھٹھرتی سردی کے زمانے میں چھٹی منزل پر عورتوں کو اینٹیں رکھنے کا کام کرتے ہوئے دیکھا اور یہ سارا کام ان تمام تحفظات کے بغیر انجام دیا جا رہا تھا جو ساری مہذب دنیا میں اس قسم کے کام کے لئے لازمی ہیں ـــ (۵ الف)

کل محنت کاروں میں عورتوں کی محنت کا تناسب کس رفتار سے بڑھا ہے اس کا اندازہ اس سے کیجے۔ [۱۱]

	کل محنت میں عورتوں کا تناسب
۱۹۲۷-۲	۲۷.۰۰ فی صد

---

[۹] یہ چیز تمام اخبارات میں آئی تھی۔ حوالہ کے لئے ملاحظہ ہو:
Lin Yu Tang, *The Secret Name*, Heineman, London, 1958, p. 109-110.

[۱۰] مانیا گورڈن کی کتاب *Workers Before and After Lenin* میں انقلاب سے پہلے کے ۲۵ سال اور انقلاب کے بعد کے ۲۵ سالوں کا بڑا گہرا اور حقیقت پسندانہ مطالعہ کیا گیا ہے۔ ہماری معلومات کا ماخذ سرکاری کتب کے علاوہ یہ کتاب بھی ہے۔ (۵ الف) بحوالہ The Soviet World از لوسا پنیبرد شی صفحہ ۱۱۴

[۱۱] حوالہ کے لئے ملاحظہ ہو: Henry Schwarz, *Labour in the Soviet Union*, p. 75

۱۹۳۱	۳۴.۷ فی صد
۱۹۴۲	۳۹.۳ ″
۱۹۴۷	۴۷.۰ ″

۸ مارچ ۱۹۳۸ء کے Pravda میں اس امر کا اظہار کیا گیا ہے کہ کل اجیروں اور تنخواہ دار ملازموں میں سے ۴۷ فی صد خواتین ہیں ۔

عورتوں کو سخت ترین کام کرنے ہوتے ہیں اور ان کی حیاتیاتی ضرورتوں تک کا پورا خیال نہیں رکھا جاتا ہے ۔ قومی صحت کے کیسا رنے ایک باقاعدہ اعلان کے ذریعہ ڈاکٹروں کو منع کیا کہ " عورتوں کو مخصوص ایام کی وجہ سے کام سے رخصت " کی اجازت نہ دیں ۔ عورتیں بھی کام پر مجبور ہیں کہ وہ کمائے بغیر اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ نہیں پال سکتی ہیں ۔

(iii) بچوں کی محنت گو قانوناً ممنوع ہے ۔ (اور یہ ممانعت زار کے زمانے سے ہے ۱۸۸۲ اور ۱۸۸۵ کے قوانین کے ذریعہ بچوں کی محنت کو روک دیا گیا تھا) لیکن پیداوار کو بڑھانے اور منصوبے کو پورا کرنے کے لئے اس سے بھی گریز نہیں کیا جاتا ۔ نوجوانوں کے لئے سرکاری ترجمان Komsomolskaya Pravda نے اپنی ۴ اگست ۱۹۳۵ کی اشاعت میں اس کا اعتراف کیا کہ بارہ اور چودہ سال کے بچے ۱۲ اور ۱۶ گھنٹے یومیہ تک کھیتوں پر کام کرتے ہیں ۔ پرچے میں اس نوعیت کے متعدد واقعات بیان کئے گئے ہیں ۔ ایسی مثالیں بھی دی گئی ہیں جن میں بارہ بارہ سال کے بچوں نے تین تین دن لگاتار کام کیا ہے اور پھر بے ہوش پڑ گئے ہیں ۔ [۲۵]

(iv) پیداوار کو بڑھانے کے لئے سرمایہ دار اوقات کار کے بعد بھی کام لیتا ہے اور مزدور دو پیسے کمانے کے لئے اپنی صحت اور زندگی کو خطرے میں ڈال کر over-time کام کرتا ہے ۔ روس میں بھی یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے اور اس کا نام سٹاخانوزم (Stakhanovism) رکھا گیا ہے ۔ اسٹاخانو ایک کوئلہ کا کان کن تھا جس نے ایک دن میں ۶ ٹن کی جگہ ۱۰۲ ٹن کوئلہ ایک مقام سے دوسری جگہ منتقل کیا ۔ اس کے بعد یہ رو چل گئی اور ہر فیکٹری میں وہ مزدور رونما ہو گئے جو اصل مقدار سے ۲۰۰ فی صد ، ۵۰۰ فی صد ، ۱۰۰۰ فی صد حتیٰ کہ ۲۰۰۰ فی صد تک پیداوار کرنے لگے اور ان کو اجرت بھی دوسروں سے زیادہ دی جانے لگی ۔ اسٹاخانوزدانٹ مزدور کو عام مزدور سے کئی گنا زیادہ اجرت دی جاتی ہے ۔ اس طرح ایک مزدور کی قوت کی آخری رمق بھی نچوڑ لی جاتی ہے ۔ یہاں بھی انسان نہیں پیداوار اصل چیز قرار پاتی ہے ۔

(v) پھر پیداوار میں بھی ان چیزوں کو اولیت دی جاتی ہے جو نظام کے لئے ضروری ہیں ، خواہ انسان کی ضرورتیں وہ پوری کریں

---

[۲۵] روسی اخبارات کے حوالہ سے متعدد مثالیں مانیا گورڈن کی مذکورہ بالا کتاب میں منقول ہیں ۔ ایک طرف یہ مثالیں ہیں اور دوسری طرف اٹھارویں اور انیسویں صدی کے انگلستان کے واقعات سامنے رکھئے ۔ وہی واقعات جنھیں مارکس نے " سرمایہ " میں بیان کیا ہے اور جن کی تفصیل Ashlay Hammonds Webb کی کتابوں میں چارلس ڈکنس کے ناولوں میں ملتی ہیں ۔ انسان کے استحصال کی حیثیت دونوں جگہ ایک ہی ہے ، صرف مقامات کے نام بدلے ہوتے ہیں ۔

یا نہ کریں۔ تمام اشتراکی ممالک میں بھاری صنعت کو اولیت دی گئی ہے اور عام استعمال کی چیزیں نظرانداز کی گئی ہیں۔ ترجیحات کا یہ نظام اسی ذہن کی پیداوار ہے۔ روس میں اشتراکی انقلاب کو اب پچاس سال ہو رہے ہیں۔ لیکن معاشی پالیسی اسی بنیاد پر ہی ہے اور آج تک اشیائے صرف کی قلت ہے۔ پھر کسانوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ خواہ ان کی ضرورت پوری ہو یا نہ ہو۔ پیداوار کا ایک خاص حصہ ایک خاص قیمت پر حکومت کو دیدیں۔ حکومت کے حصہ کے تعین میں اس کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا کہ پیداکار خود اپنی ضرورت بھی پوری کر سکیں گے یا نہیں، اور قیمت مقرر کرنے میں اس بات کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا کہ وہ کم ازکم مصارف پیداوار کو تو پورا کرے۔ اس کے ثبوت کے لئے کسی اور کی نہیں خروشیف کی شہادت پیش کی جاسکتی ہے جس نے ۹ دسمبر ۱۹۶۳ کو کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے سامنے ایک تقریر میں اسٹالن اور مولوٹوف کے بارے میں کہا کہ وہ غلہ ملک سے برآمد کرتے تھے جب کہ ملک میں لوگ بھوک سے مر رہے ہوتے تھے۔ صرف دوسری جنگ سے قبل ہی نہیں، اس کے بعد بھی۔

"ہاں کامریڈز! یہ ایک حقیقت ہے کہ ۱۹۴۷ میں بہت سے علاقوں میں، مثلاً کرسک (Kursk) کے علاقے میں عوام بھوک سے مر رہے تھے۔ اور عین اس وقت یہ لوگ ملک سے باہر ہمارا پیدا کردہ غلہ بیچ رہے تھے۔"

قیمتوں کے لاگت سے بھی کم ہونے کا اعتراف بھی سرکاری طور پر کیا جاچکا ہے۔ گذشتہ چالیس سال سے اس ظالمانہ اور غیر انسانی پالیسی پر عمل کیا جارہا تھا۔ یکم جون ۱۹۶۲ کو حکومت نے اس غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے قیمتیں بڑھائیں۔ جملہ اقسام کے گوشت کی قیمت اوسطاً ۲۹ فی صدی اور مویشیوں سے حاصل کی جانے والی دوسری اشیاء کی قیمتوں میں ۲۵ فی صدی کا اضافہ کیا گیا لیکن روسی معاشیات کے ماہرین کا خیال ہے کہ متعدد قیمتیں اب بھی لاگت سے کم ہیں۔ مثلاً مویشیوں کے گوشت کی قیمت ۸۲٫۹ روبل فی کوئنٹل ہے جب کہ لاگت ۸۸٫۵ روبل آتی ہے۔ اسی طرح مرغی کی قیمت ۱۲۴٫۲ روبل ہے فی کوئنٹل جب کہ لاگت ۱۳۲٫۵ روبل آتی ہے۔[۵۴] یہ صرف چند مثالیں ہیں ورنہ زراعت کے بارے میں عمومی پالیسی اسی ظلم و استحصال پر مبنی ہے۔

(۷) پھر مزدور کو وہ حقوق حاصل نہیں ہیں جو اسے سرمایہ دارانہ ممالک تک میں حاصل ہو چکے ہیں۔ مثلاً مزدوروں کی تنظیمیں (ٹریڈ یونین) ان کے حقوق کے لئے جدوجہد کرنے کی بجائے حکومت کی منشاء کی تعمیل کرانے والا ادارہ بن گئی ہیں۔ ۱۹۲۰ میں نویں پارٹی کانگریس میں طے کیا گیا کہ

"ٹریڈ یونین کی طرف سے سوویٹ حکومت کے ادارہ کی مخالفت کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا اس قسم کی مخالفت دراصل

---

۵۳ Vide, Luca Pietromarchi *The Soviet World*, Allen and Unwin, London, 1965, p. 162n.

اس کتاب کا مصنف روس میں اٹلی کا سفیر تھا اور موصوف نے بڑی محنت اور دیدہ ریزی کے ساتھ متوازن انداز میں یہ کتاب لکھی ہے، اور پوری کتاب روسی ماخذ پر مبنی ہے۔

۵۴ Naum Jasny, "Ten Years After", *Survey*, London, No. 47, April 1963, p. 96.

روس میں ٹریڈ یونین کا کام مزدور کے مطالبات اور اس کی تکالیف کو پیش کرنا نہیں، انتظامیہ کے ہاتھ مضبوط کرنا ہے۔ اب مزدوروں کے نمائندے خود مطالبہ کرتے ہیں کہ ہمیں زیادہ اجرت نہ دی جائے اور جو زیادہ اجرت چاہتے ہیں ان کو رجعت پسند اور حریص کہا جاتا ہے۔

"جب اجتماعی معاہدات کی تجدید کا وقت آتا ہے تو رجعت پسند گروہ، جن کو دائیں بازو کے موقع پرست عناصر خلاف انقلاب ٹراٹسکی پرست کو لیک لوازافراد اور رنجولی کرنے والے لوگ شہ دیتے ہیں، اپنے غیر پرولتاری اور حریصانہ مطالبات پیش کرنا شروع کر دیتے ہیں۔"

یہ الفاظ دو کارخانوں کے مزدوروں کے نمائندوں کے ہیں جو ۲۲ راکتوبر ۱۹۲۹ء کے پرودا میں شائع ہوئے ہیں۔ اب مساوات اور خوش حالی بورژوائی نعرے بن جاتے ہیں اور مزدوروں کو ان سے محفوظ رکھنے کی کوششیں ہوتی ہیں۔ ٹریڈ یونین کے مجلہ Voprosy Truda (نومبر، دسمبر ۱۹۳۲ء) کی اشاعت میں کہا جاتا ہے کہ

"ٹریڈ یونین اور کمیسار آف لیبر میں موقع پرستوں کی وجہ سے ۱۹۲۷-۲۸ کی اجرتوں کی اصلاح کوششیں نیم بورژوا فلاحیت (egalitarianism)[۵۵] کے لئے ہمہ گیر کام کا نقطۂ آغاز بن گئیں۔"

نویں ٹریڈ یونین کنونشن کے سامنے مرکزی ٹریڈ یونین نے جو رپورٹ پیش کی اس میں کہا گیا کہ

"بھلا ہو کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی اور کامریڈ اسٹالن کی براہ راست ذاتی مداخلت کا کہ ان کے زیر اثر اب ٹریڈ یونینیں اس لائق ہوگئی ہیں کہ پرانے نظام کو مٹادیں اور فلاحیت سے اپنے کو پاک کریں (expunge equilitarianism)"

اب جو لوگ اجرت بڑھانے اور مزدوروں کے لئے سہولتیں حاصل کرنے کی بات کرتے ہیں وہ مزدوروں کے دشمن ہیں! اب اجرت کا تعین بھی انتظامیہ کا کام ہے، مزدوروں کو اس میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ مرکزی ٹریڈ یونین کونسل کے سکریٹری نے پلینری سیشن کے سامنے (۸ر جولائی ۱۹۳۳) اشتراکی نظام میں ٹریڈ یونین کے وظیفہ کے بارے میں کہا:

"اجرتوں کے نظام کے تعین اور کارکردگی کے معیار کے مقرر کرنے کا کام ٹھیک اسی وقت ہو سکتا ہے جب اس کی کل ذمہ داری فیکٹری کی انتظامیہ اور فن مینجروں پر ہو۔ بجز انتظامیہ کے کوئی اس بات کا مجاز نہیں ہوگا کہ فنی معیار، اجرت، کام کا کوٹہ، شرح ادائیگی وغیرہ کا تعین کرے۔ آج بھی فیکٹریوں میں کچھ کامریڈ ایسے ہیں جو یہ رائے رکھتے ہیں کہ اجرت کے تعین میں ٹریڈ یونین کو بھی اتنا ہی دخل ہونا چاہیے جتنا انتظامیہ کا ہے۔ یہ تصور بنیادی طور پر غلط ہے۔ اس کے تو معنی یہ ہوتے کہ یونین انتظامیہ کی جگہ لے لے۔ یہ ایک بائیں بازو کی

---

[۵۵] فلاحیت (egalitarianism) جدید معاشیات کی ایک اصطلاح ہے جس کے معنی خوش حالی، عدم مساوات میں کمی، معیار زندگی کو بلند کرنے کی کوشش اور سماجی انصاف کا حصول ہے۔

موقع پرستانہ تحریف ہے۔ اس کے نتیجہ میں یک نفری انتظامیہ کمزور ہو جائے گی اور انتظامیہ کے فرائض منصبی کی ادائیگی میں بے جا مداخلت ہو گی۔ اس کو لازماً ختم ہونا چاہیے۔"

اور کسارا اور جبنس کی شائع کردہ کتاب Soviet Labour Law حتمی طور پر یہ اعلان کرتی ہے کہ روس کے قانون کی رو سے

"اجتماعی معاہدات میں اب ایسی کوئی دفعہ شامل نہیں کی جائے گی جو تنخواہ پانے والوں یا اجیروں کو موجودہ قانونی تحفظات کے سوا کسی اور حق یا سہولت اور منفعت کی ضمانت دلائے۔" [۵۶]

(vii) مزدور کو ہڑتال کا حق نہیں ہے۔ اشتراکی نظام میں ہڑتال ایک قانونی جرم ہے۔ پیداوار کو بڑھانے کی کوشش کرنا ایک جرم ہے۔ دیر سے آنا قابل سزا ہے۔ کام چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے۔ کام تبدیل کرنا نہایت مشکل ہے۔ خروشیف نے ویانا میں ٹریڈ یونین کے نمائندوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اشتراکی نظام میں ہڑتال کا حق نہیں دیا جا سکتا اور پرودا کی ۲۶ دسمبر ۱۹۵۸ء کی اشاعت میں یہ قانون شائع ہوا ہے کہ اسٹرائک کرنے والوں کو ۵ اسال کی سزائے قید تک دی جا سکتی ہے۔ روس ہی نہیں ساری اشتراکی دنیا میں یہی پالیسی اختیار کی جاتی ہے۔ مشرقی برلن میں، پولینڈ اور ہنگری میں مزدوروں کے مظاہروں کو جس طرح پولیس اور فوج سے کچلا گیا ہے وہ ایک اندوہناک داستان ہے۔ پولینڈ میں ہڑتال ممنوع کی جا چکی ہے اور مشرقی جرمنی بھی اس نوعیت کی قانون سازی کر چکی ہے۔ [۵۷]

اب مزدور اپنے تمام حقوق سے دست بردار ہو کر صرف پیداوار بڑھانے کے کام میں مصروف ہو جاتا ہے [۵۸]

(viii) اسی استفاع اور استحصال کا ایک بدترین پہلو جبری محنت تھی۔ اب یہ بات ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ روس میں اسٹالن کے زمانے میں جبری محنت رائج تھی اور بڑے پیمانے پر رائج تھی۔ جبری محنت کے کیمپوں کے مکینوں کی داستانوں سے لے کر اقوام متحدہ کے ایڈہاک کمیشن آف فورسڈ لیبر کی رپورٹ [۵۹] تک ہر ایک اس پر شاہد ہے۔ پھر

---

[۵۶] مزدوروں اور ٹریڈ یونین کے سلسلہ کے یہ سارے حوالے اصل روسی ماخذ سے ہیں اور ان کو چینی فلسفی لن یوٹانگ کی کتاب The Secret Name سے لیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۸۸ تا ۹۱۔

[۵۷] ملاحظہ ہو "دی سویٹ ورلڈ" صفحہ ۲۱۴۔

[۵۸] ملاحظہ ہو روس کی مرکزی ٹریڈ یونین کمیٹی کے صدر V. V. Grishin کی رپورٹ ۲۲ ویں اشتراکی کانگریس کے لئے ان کا ارشاد ہے "وہ اصل کام جس پر روسی ٹریڈ یونینیں اپنی توتیں صرف کر رہی ہیں یہ ہے کہ پیداواری وسائل کو مزید ترقی دی جائے" بحوالہ دی سویٹ ورلڈ۔ صفحہ ۵-۴۰۴

[۵۹] Report of the Ad Hoc Commission on Forced Labour, United Nations and International Labour Office. 1953.

اس میں پوری دنیا کا جائزہ لیا گیا ہے اور روس کی جبری محنت پر ایک مفصل حصہ ہے۔

اس کا ثبوت خود روس کے منصوبہ بندی کمیشن کی رپورٹوں سے ملتا ہے جن میں کل محنت کا ۱۰ سے بارہ فی صدی تک حصہ وہاں کی خفیہ پولیس کے محکمہ کی طرف سے فراہم کردہ دکھایا گیا ہے۔ اقوام متحدہ کی مذکورہ بالا رپورٹ میں Large Soviet Encyclopaedia سے یہ حوالہ بھی دیا گیا ہے کہ

"تمام محاذوں پر اشتراکیت کی عظیم کامیابیوں نے یہ ممکن کر دکھایا کہ قیدیوں کی محنت کو اشتراکیت کی تعمیر کے عمومی کام میں استعمال کیا جائے۔ [60]

جبری محنت کے اس نظام کا اعتراف خروشیف کی اس تاریخی تقریر میں بھی ملتا ہے جس میں اسٹالن کو بے نقاب کیا گیا ہے اس میں ایک ایک رات میں ہزاروں افراد کو سائبیریا منتقل کرنے کا اعتراف ہے۔ یہی وہ بدنصیب انسان تھے جن سے جبری محنت لی جاتی تھی۔ ویسے تو اشتراکیت نے تمام ہی مزدوروں کی عمومی آزادی کو باقی نہیں رکھا ہے لیکن لاکھوں افراد سے جبری محنت کے کیمپوں میں برسوں کام لے کر ظلم اور انسان کشی کی جو شرمناک مثال اس نے قائم کی ہے اس کی نظیر فرعونوں کے مصر کے بعد نہیں ملتی۔[61]

۲۔ اسی خالص معاشی اور مادی نقطہ نظر کا تقاضا ہے کہ اشتراکی انقلاب کو برپا کرنا اور اس انقلاب کی حفاظت کرنا اعلیٰ ترین قدر قرار پاتی ہے اور اس کے لئے باقی جو کچھ بھی قربان کر دیا جائے وہ کم ہے۔

سیاسی، تمدنی اور ثقافتی زندگی میں کسی اخلاقی قدر کو باقی نہیں چھوڑا گیا ہے اور ہر چیز کو نام نہاد انقلاب کی بارگاہ پر بھینٹ چڑھا دیا گیا ہے۔ اس کے لئے کیا کچھ ہوا ہے اس پر بھی نگاہ رکھنا ضروری ہے۔

(۱) انسانوں کے درمیان محبت اور مودت کے تعلقات پیدا کرنے کی بجائے اشتراکیت کا اصل سرمایہ کار نفرت کے جذبات ہیں وہ "وصل" نہیں "فصل" برپا کرنا چاہتی ہے۔ وہ انسانوں کو انسانوں سے لڑانا چاہتی ہے اور طبقاتی نزاع کو گہرا تر کرنا چاہتی ہے۔ اس کی روش منفی ہے۔ برٹرینڈ رسل جیسا سوشلسٹ بھی اشتراکی فکر کی اس کمزوری کا اعتراف کرتا ہے کہ

"نفرت .... معاشیات کے سائنسی مطالعہ کے لئے کوئی اچھی بنیاد نہ تھی اور نہ ہی اس نظام کے مثبت نظریے کے لئے کوئی صحیح اساس تھی جسے سرمایہ کی جگہ لینا تھی ..... نفرت سے اپیل ایک لڑائی جیتنے کے لئے اچھا نفسیاتی

---

[60] رپورٹ مذکورہ بالا صفحہ ۸، ۴۔

[61] اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل لٹریچر کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

Slave Labour in Russia, 1949, Report presented to U. N. by American Federation of Labonr; Dallin, D. D., *Forced Labour in Soviet Russia;* Orlov, Alexender, *Secret History of Stalin's Crimes;* Trostsky, *The Revolution Betrayed;* Tchernavin, Vladimir V., *I Speak for the Silent;* Koestler, Arther, *Darkness at Noon;* Averbakh, *From Crime to Labour*.

حربہ ہوسکتا ہے اور سارشہ ہی جنگ آزماؤں نے ۱۹۱۴ سے ۱۹۱۸ تک اس کو استعمال کیا ہے لیکن بعد میں حقیقی تعمیر کے لئے یہ صحیح نفسیات نہیں ہے۔ مارکس کا کردار کوئی بہت ہی خوش کن کردار نہ تھا۔ ان کی تحریرات نفرت اور حسد اور غیظ و غضب سے پُر ہیں۔ یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ اس کی شخصیت میں جو چیزیں ناپسندیدہ تھیں ان میں سے اکثر و بیشتر اس کے پیرووں میں سرایت کرگئیں۔ ایک بے لاگ مبصر یہ کہنے پر مجبور ہے وہ لڑائی جو اس جذبہ سے لڑی جائے اگر کامیاب بھی ہوئی تو اس کے نتیجہ میں ویسا ہی تباہ کن امن قائم ہوسکتا ہے جیسا معاہدہ ورسائلز کے تحت قائم ہوا۔ نفرت جب حد سے بڑھ جائے تو ایک عادت بن جاتی ہے اور یہ عادت ہمیشہ نئے نئے شکار تلاش کرتی رہتی ہے۔[۶۲]

اشتراکیت نے نفرت کے جذبات کو بھڑکایا ہے اور اسی ناپاک مال کی تجارت کی ہے۔ نتیجتاً انسانی تاریخ میں نفرت اور غیظ و غضب اور حسد و رقابت کے جذبات کو جس درجہ اس نے استعمال کیا ہے کسی دوسری اجتماعی تحریک نے نہیں کیا۔ اس تحریک کے نتیجے میں انسانیت کی جھولی میں کڑوے کسیلے پھل ہی آسکتے ہیں، اس کا دامن کانٹوں ہی سے تارتار ہوسکتا ہے، اور اس کی قسمت میں آگ اور خون ہی آسکتے ہیں، خیر و برکت نہیں۔

(ii) اشتراکیت کی بنیادی تیکنیک ہی یہ ہے کہ حالات کو اصلاح یاب نہ ہونے دیا جائے اور ان کو زیادہ سے زیادہ بگاڑا جائے تاکہ بحران شدید ہو اور انقلاب کا راستہ آسان ہوجائے۔ پیرس کمیون پر تنقید کرتے ہوئے مارکس نے کہا تھا انقلاب کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ برسراقتدار طبقہ کا قلع قمع کرنے کی بجائے سماجی انصاف کے خواب کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش ہونے لگی۔ نیز یہ کہ مزدور طبقہ نے عالی ظرفی کا مظاہرہ کیا "اپنے مخالفین کو نیست و نابود کرنے کی بجائے وہ ان پر اخلاقی اثرات ڈالنے کے چکر میں پڑ گئے۔"[۶۳]

اس ذہن کا نتیجہ یہ ہے کہ اصلاح کی کوششوں کو ناپسند کیا جاتا ہے، بحران کو شدید تر بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، خونی انقلاب کے لئے راستہ ہموار کیا جاتا ہے، انقلاب میں جبر و تشدد اور ظلم و غارت گری سے کام لیا جاتا ہے اور پھر انقلاب کے بعد بھی تشدد اور مخالفین کا قلع قمع کیا جاتا رہتا ہے۔ نتیجتاً خوف، جبر اور تشدد اس نظام کا لازمی جزو اور مستقل فیچر رہتے ہیں۔ پھر انسانی خون ہر شے سے ارزاں ہوجاتا ہے اور توڑ پھوڑ اور غارت گری میں انسان لذت لینے لگتا ہے۔ اشتراکی انقلاب دنیا میں جہاں بھی آیا ہے

---

[۶۲] Russel, Bertrand, *Freedom and Organization*, Allen & Unwin, 1949, pp. 251-52.

[۶۳] Marx, *The Civil War in France*, New York, 1933, p. 80.
The State and Revolution

انہی خیالات کا اظہار لینن نے *The State and Revolution,* میں (صفحہ ۹) اسٹالن نے *The Foundations of Leninism* میں (صفحہ ۱۵) اور عالمگیر اشتراکی پارٹی نے *Programme of the Communist International* مطبوعہ نیویارک ۱۹۳۶ میں (صفحہ ۳۴، ۳۶) کیا ہے۔

اس نے انسانی خون سے اپنی پیاس بجھائی ہے - اور منہ کو ایک بار اس کا مزہ لگ جانے کے بعد یہ انقلابی قوت مستقلاً آدم خور بن جاتی ہے ۔لینن نے پرولتاریہ کی آمریت کی تعریف ۱۹۲۰ میں یہ کی تھی کہ

"ڈکٹیٹر شپ کے معنی اس کے سائنسی تصور کی رو سے نہ اس سے کچھ زیادہ ہیں اور نہ کم کہ وہ نام ہے اس غیر محدود قوت کا جو تشدد پر مبنی ہے، نہ کوئی چیز اس کی حد بندی کرتی ہے، نہ کوئی قانون اس پر گرفت کرنے کے لئے ہے اور نہ کوئی حتمی اور کلی قانون یا اصول۔"

یہی وجہ ہے کہ لینن کی خفیہ پولیس (Cheka) کے سربراہ (Felix Dzerhinsky) نے اپنے پہلے ہی خطاب میں صاف صاف کہا تھا کہ "یہ نہ سمجھ لینا کہ میں انقلابی انصاف کی کسی شکل کی تلاش میں ہوں ہمیں اب انصاف کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔"[۶۴]

جب تشدد و جبر کو تقدس کا یہ مقام حاصل ہو جائے اور اقتدار کے لئے کوئی حد اور پابندی باقی نہ رہے تو انسانوں پر جو بھی مظالم ہوں کم ہیں ۔مشہور روسی ماہر عمرانیات اور فلسفی پروفیسر پٹی رم سوروکن انقلاب روس اور انقلاب فرانس کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ :

"انقلاب فرانس (۱۷۸۸) میں انقلابی عدالتوں کے ذریعہ کل ۱۷ ہزار افراد کو سولی پر چڑھایا گیا اور کوئی ۳۵ سے ۴۰ ہزار افراد انقلابی جنون کا شکار ہوئے ..... جو لوگ اشتراکی انقلاب کے سرخ کوڑے (۱۹۱۸ -- ۲۲) کے بلاواسطہ شکار ہوئے ان کی تعداد زیادہ سے زیادہ محتاط اندازوں کے مطابق ۶ لاکھ ہے - ایک لاکھ فی سال سے بھی زیادہ! اس میں خانہ جنگی (؟) (سفید غضب کے) کی نذر ہونے والے افراد اور انقلاب کے بالواسطہ ہدف بننے والے لوگ شامل نہیں ہیں ۔اگر ان تمام صورتوں کو شامل کر لیا جائے تو ایک کروڑ ۵۰ لاکھ سے لے کر ایک کروڑ ۷۰ لاکھ افراد کی جانیں انقلاب کے بت پر بھینٹ چڑھا دی گئیں ..... انسانی زندگی اپنی قدر و قیمت کھو چکی ہے ۔جیتے جاگتے انسانوں کو ضمیر کی کسی خلش اور ندامت کے کسی احساس کے بغیر پاؤں تلے روندا جارہا ہے ۔عمل تطہیر شب و روز کا عمل بن گیا ہے اور قتل و خون روز مرہ کا معمول ہے۔"[۶۵]

اشتراکیت کس طرح ایک آلۂ ظلم بن گئی، اسے ایک دوسرے ماہر عمرانیات اور مورخ کی زبانی سنئے۔ لوئی ممفورڈ لکھتا ہے:

"عین کامیابی کے لمحہ میں جب کہ اشتراکیوں نے اقتدار پر قبضہ کیا ایک رجعی عمل رونما ہوا۔ سوشلزم کا انسان پرستی کا چہرہ، اس کا مادی خوشحالی اور جمہوری اخوت کا خواب، جنگ اور استبداد کے آہنی خود کے پیچھے چھپ گیا۔ بالشویکیوں پر جنگ مسلط کی گئی تھی لیکن سوشلزم کا استبدادی پہلو مارکس کا بلاواسطہ ورثہ تھا۔ لینن نے، مارکس کے نظریہ کو مکمل وفاداری

---

[۶۴] یوانہ لنا پوٹانگ The Secret Name صفحہ ۲۱-۲۲

[۶۵] Sorokin, Pitirim A.. *The Crisis of our Age*, E. P. Dutton & Co., New York, 1951, pp. 229-230.

کے ساتھ بروئے عمل لاتے ہوئے ان تمام گروہوں اور تنظیموں کا صفایا کر دیا جو کسی طرح بھی ریاست میں اقتدار کے شریک ہو سکتے تھے اور اس طرح اس کے منقسم ہونے کا باعث ہوتے ـــــ اور جو چیزیں نیست و نابود نہ کی جا سکیں انھیں ریاست کا جزو بنا لیا گیا۔ جاسوسی، بلا کھلا مقدمہ چلائے سزائیں دینا، دور و دراز کے انسانی باڑوں (concetration camps) میں مخفی طور پر انسانوں کو قید کر دینا یا مخفی طور پر انھیں موت کی نیند سلا دینا، جبری محنت، آزادی تقریر کو ختم کر دینا، سیاسی تبدیلی اور عقلی طور پر تلاش کیے جانے والے متبادل سیاسی حلقوں کے امکانات کا خاتمہ، ایک ایسے نئے حکمراں طبقہ کا ظہور جو عوام سے اتنا ہی دور ہے جتنا پرانا سرمایہ دار طبقہ اور بیوروکریٹس جن کی جگہ اس نے لی اور معاشی قوت کا مکمل ارتکاز ـــــ اشتراکیت کے ان تمام نئے خصائل نے اس کے اصل عزائم کو خاک میں ملانے کا کام انجام دیا۔ اور بالآخر خود ان لوگوں کی اکثریت جن کے ہاتھوں انقلاب برپا ہوا تھا غنڈے قرار دی گئی اور انھیں غداروں کی حیثیت سے سزا دی گئی۔ جس طرح انھوں نے اپنے سے اختلاف کرنے والے سماجی انقلابیوں اور جمہوریت پرستوں سے معاملہ کیا تھا بالکل اسی طرح کا معاملہ ان کے ساتھ ان کے اپنے دوستوں کے ہاتھوں کیا گیا۔ اگر ان انقلابیوں پر جو الزامات لگائے گئے وہ درست تھے تو یہ امر خود انقلاب اور اس کے نقطۂ آغاز پر ایک بدنما داغ ہے، اور اگر ملزمین معصوم اور بے گناہ تھے تو خود ان کے بنائے ہوتے نظام اور اس صورت حال کے جو ان کی کوششوں سے رونما ہوئی قبیح اور بدنما ہونے کی دلیل ہے۔" ۶۶

(iii) صرف انقلاب ہی کی داستان خون سے آلودہ نہیں ہے، تشدد اور استبداد اس نظام کا خاصہ بن گئے ہیں۔ نفرت کے بیج سے جو درخت نکلا اور انسانی خون سے جس کو سیراب کیا گیا اس کا پھل بڑا ہی کڑوا اور تلخ نکلا اور اس کی بُو نے پوری فضا کو متعفن کر دیا۔ سازشوں، مظالم اور زیادتیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ لینن نے اپنے دشمنوں کو صفحۂ ہستی کے مٹانے کا کام انجام دیا اور اسٹالن نے اس لے کو اتنا بڑھایا کہ صرف دشمنوں ہی کو نہیں دوستوں کو بھی تہ تیغ کر ڈالا۔ انقلاب کی ڈائن نے اپنے ہی بچوں کو کھانا شروع کر دیا اور یہ سلسلہ ختم ہونے کو نہیں آتا۔ صرف روس ہی میں نہیں ہر اشتراکی ملک کا مقدر اندرونی کشمکشیں اور خون خرابا ہے۔ صرف چند حقائق:

"ایک نئی زبان ایجاد ہوئی اور اس کا طرۂ امتیاز گالیاں، سب و شتم اور دشنام تھا۔ اس زبان کی چند خاص اصطلاحیں یہ ہیں "سازشی" "سفید محافظ بالشتئے" ("White Guard Pigmies") "کیڑے مکوڑے" (insects) "درندے" "fiend" "فسطائیوں کے قابل نفرت دم چھلے" (Contemptible Fascists) "انسانیت کی تلچھٹ" (scums of humanity) "غدار" (traitors) "بیرونی ممالک کے ایجنٹ" "امپریلزم کے کاسہ لیس" "دشمن کے تنخواہ دار" "غنڈے اور ناسور" (scales) وغیرہ۔ ۶۷

---

۶۶ Mumford, Lewis, *The Condition of Man*, Martin Secker & Warburg, London, 1944, pp. 340-41.

۶۷ یہ ساری مقدس گالیاں (*Short Course of the History of the All Union Communist Party*) مطبوعہ ماسکو سے ماخوذ ہیں۔

یہ وہ زبان ہے جسے اشتراکیت نے رواج دیا، اور جسے آج بھی ہر ملک کے اشتراکیوں کی تحریرات میں دیکھا جا سکتا ہے۔

* ★ لینن نے اپنے دور میں

- غیر بالشویک سوشلسٹ لیڈروں کو گرفتار کیا اور قتل کرایا
- نہتے مزدوروں پر گولی چلائی (۱۹ر جنوری ۱۹۱۸ء)
- مزدوروں اور جہاز رانوں کی بغاوت کو کچلا (۱۹۲۱)
- کرونسٹاڈ (Krousted) بغاوت (۱۹۲۱) کے موقع پر باغیوں کے خاندانوں کو یرغمال کے طور پر رکھنے کے اصول پر عمل کیا۔
- پارٹی کے اندر مخالف عنصر کے وجود کو مٹانے کی کوشش کی۔
- قتل کے ساتھ ساتھ مخالفین کو سائبیریا منتقل کرنے اور ان سے جبری محنت لینے کا آغاز کیا۔

★★ اسٹالن کے اس نظام ظلم کو اس کی انتہا تک پہنچایا۔ اس کے زمانے میں عالم یہ ہو گیا کہ

• • • پارٹی کانگریس جو محض ایک دکھاوے کی چیز تھی اس کا اجلاس بھی باقاعدگی سے نہیں بلایا گیا۔ پندرھویں اور سولھویں کانگریس میں ۳ سال، سولھویں اور سترھویں میں ۴ سال، سترھویں اور اٹھارویں میں ۵ سال اور اٹھارویں اور انیسویں کانگریس میں ۱۳ سال کا فصل ہے۔

• • • مقدمات کا ڈھونگ رچاکر بڑے پیمانے پر پارٹی میں تطہیر (purge) کی گئی اور اشتراکی نظام کے بانیوں تک کو غدار اور سرمایہ داری کا ایجنٹ قرار دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

—— لینن کے پولیٹ بیورو کا تقریباً ہر رکن ختم کر دیا گیا۔ لینن کی موت کے وقت سات رکن زندہ تھے۔ ان میں سے اسٹالن کے سوا ہر ایک غدار قرار دیا گیا اور مجرم ٹھہرا۔

—— پرانے بالشویکوں میں سے کوئی غداری اور ملک دشمنی کے الزام سے نہ بچا۔

—— ۱۹۳۴ کی جنگی کونسل کے اسی کے اسی (۸۰) رکن قتل کر دیے گئے یا گرفتار۔

—— سترھویں کانگریس کے ۱۹۶۶ مندوبین میں سے ۱۱۰۸ (تقریباً دو تہائی) پارٹی سے نکالے گئے اور یا مار دیے گئے یا کیمپوں میں بھیج دیے گئے۔ اسی موقع کی مرکزی کمیٹی کے ۱۳۹ ارکان میں سے ۹۸ بعد میں گرفتار کیے گئے اور قتل کر دیے گئے۔

—— جون ۱۹۳۷ء کی تطہیر میں ۹ جرنیل اور ۳۰ ہزار فوجی افسر مارے گئے۔

اسی طرح جو لوگ مزید جاسوس اور غدار قرار دیے گئے اور انھیں گولی ماری گئی ان میں یہ بھی تھے۔

—— ۱۹۳۶ کی مرکزی کابینہ کے ۱۱ میں سے ۹ وزیر۔

—— مرکزی انتظامی کمیٹی جو ۱۹۳۶ کے دستور کے آنے تک مرکزی پارلیمنٹ کی حیثیت رکھتی تھی، کے ، میں سے ۵ صدر۔

— کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی تنظیم کے ۵۳ سیکریٹریوں میں سے ۴۳۔

— صوبائی تنظیم کے تقریباً تمام سیکریٹری۔

— ۱۹۳۶ کے دستور کا مسودہ تیار کرنے والے ۲۰ چوٹی کے اشتراکی قائدین میں سے ۱۵۔

— روسی فوج کے ۵ مارشلوں میں سے ۳۔

— فوج کے جرنیلوں میں سے ۶۰ فی صدی۔

— ٹریڈ یونین کے سیکریٹریوں میں سے ۸۰ فی صدی۔

— پارٹی کے ممبروں میں سے پندرہ اور بیس لاکھ کے درمیان ارکان کا اخراج کیا گیا۔

پہلی تطہیر (۱۹۲۱) ۵ لاکھ ۸۵ ہزار ارکان میں سے ایک لاکھ ۷۵ ہزار کا اخراج ہوا۔

دوسری تطہیر (۱۹۲۸) ۱۳ لاکھ ارکان میں سے ۲ لاکھ ۷۰ ہزار کا اخراج ہوا۔

تیسری تطہیر (۱۹۳۳-۳۹) تقریباً ۲ لاکھ ارکان کا ہر سال اخراج ہوا۔[66]

اس طرح ۱۹۳۹ میں روس میں کمیونسٹ پارٹی کے ارکان کی تعداد ۲۵ لاکھ اور خارج شدہ ارکان کی تعداد ۳۰ لاکھ تھی۔

ان حقائق کا اعتراف اب خروشیف نے بھی کر لیا ہے۔ لیکن کیا یہ سب کچھ محض اسٹالن کے جرائم تھے؟ ہماری نگاہ میں صرف اسٹالن کو مورد الزام ٹھہرانا درست نہیں۔ بلاشبہ اس پر بلاواسطہ ذمہ داری آتی ہے لیکن اصل چیز وہ کلیت پسند استبدادی نظام ہے جو اشتراکیت نے قائم کیا، جس میں اسٹالن ایک ایسا جابر حکمران بن سکا، جس تمدن نے یہ سب کچھ ظلم گوارا کیا۔ اسٹالن کی موت کے بعد کچھ تبدیلیاں ضرور آئی ہیں۔ لیکن وہ بنیادی نظام بدستور قائم ہے۔ جو تبدیلیاں بھی آئی ہیں اسی نظام کے اندر ہیں، اس کی بنیادوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کے حالات، نسبتاً بہتر ہوتے ہوئے بھی کسی جوہری فرق کا پتہ نہیں دیتے۔

• • • اسٹالن کے بعد اقتدار ایک سہ رکنی کمیٹی کے ہاتھوں میں آیا۔ میلنکوف، بیریا اور مولوٹوف، ۴ ماہ کے اندر اندر بیریا غدار قرار دیا گیا اور ختم کر دیا گیا۔ اس کے بعد میلنکوف اور مالوٹوف بھی اقتدار سے ہٹا دیئے گئے۔

• • • خروشیف کے دور میں صورت یہ رہی ہے۔

	خروشیف کے دست راست	خروشیف کا شکار
۱۹۵۳	میلنکوف	بیریا
۱۹۵۵	مولوٹوف، کاگانوذچ	میلنکوف

---

[66] یہ تمام معلومات روس کی کمیونسٹ پارٹی کی سرکاری تاریخ سے ماخوذ ہیں۔ اس سلسلہ میں Michael Padev کی What Happens to Communists کا مطالعہ بھی مفید ہوگا جس نے تمام اعداد و شمار کا خلاصہ مرتب کر دیا ہے۔ مطبوعہ لندن ۱۹۵۳ء

۱۹۵۷	(موسم گرما) ذوخوف	مولوٹوف، کاگانوویچ
	(موسم بہار) بلگانن	ذوخوف
۱۹۵۸	خروشیف (ایک نفری قیادت)	بلگانن

•• خروشیف نے اسٹالن پر جو تنقید کی اور بیسویں اور اکیسویں کانگریس میں جو کچھ اقدامات کئے ان کو بھی اس طرح خاموشی سے قبول کر لیا گیا جس طرح پہلے کی کانفرنسوں میں اسٹالن کے دور میں ہوتا رہا ہے۔

••• خود خروشیف کو بھی اسٹیج سے ہٹا دیا گیا۔اب پتہ نہیں یہ توفیق کسے حاصل ہوتی ہے کہ خروشیف کے دار پر سے پردہ اٹھائے۔

ایک اور اہم چیز جو قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ سازشوں، مقدموں، تطہیر، گرفتاریوں اور گولی سے اڑانے کا یہ سلسلہ صرف روس ہی میں نہیں ہے بلکہ جہاں جہاں اشتراکی نظام قائم ہوا ہے۔ان میں سے ہر ملک میں یہ موجود ہے۔صرف چند مثالیں

—— مشرقی یورپ کے چھیوں اشتراکی ممالک (البانیہ، بلغاریہ، زیکو سلاویکیہ، ہنگری، پولینڈ اور رومانیہ) میں برابر عمل تطہیر جاری ہے اور پہلے ۸ سالوں میں جو لوگ لقمہ اجل بن چکے ہیں ان میں یہ لوگ شامل ہیں۔

- دو نائب وزرائے اعظم
- ایک سربراہ مملکت
- وزراء میں سے تقریباً۔(تقریباً تمام وزرائے خارجہ نکالے جا چکے ہیں)
- اہم سرکاری عہدہ داروں اور کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹریوں میں سے تقریباً ۱۰۰۰
- پارٹی کے کل ارکان کا تقریباً ۲۵ فی صدی۔۸۰ لاکھ ارکان میں سے ۲ سے ۲۵ لاکھ ارکان نکالے جا چکے ہیں۔

—— چین میں ثقافتی انقلاب کے نام پر جو ڈرامہ ہو رہا ہے اس کی تہ میں بھی یہی کشمکش کارفرما ہے۔غرض اشتراکیت جہاں بھی آئی ہے اس نے اپنوں اور غیروں سب سے خون کی ہولی کھیلی ہے۔انسانی نقطۂ نظر سے اشتراکیت نے کتنی بڑی قیمت وصول کی ہے، اس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

(۱۷) پھر تشدد کی صرف یہی صورت نہیں ہے۔ملزموں سے اعترافات حاصل کرنے کے لئے جبر اور ظلم کے جو حربے اختیار کئے جاتے ہیں وہ انتہائی شرمناک ہیں۔ان میں سے کچھ کی تفصیل خود خروشیف نے اپنی تاریخی تقریر میں بیان کی ہے۔صرف ایک جملہ

"اور یہ کس طرح ممکن ہوا کہ ایک شخص ان جرائم کا اعتراف کر لیتا ہے جن کا اس سے صدور نہیں ہوا؟ یہ صرف ایک ہی وجہ سے ممکن ہوا —— اس پر جسمانی ایذا اور تعذیب کے طریقوں کا استعمال، مارپیٹ، اسے تعذیب سے بے ہوش کر دینا، اس کی عقل کو ماؤف کر دینا، انسانی عزت اور شرف کو ختم کر دینا، بے حرمتی — یہ ہیں وہ ذرائع جن سے اعترافات حاصل کئے گئے۔"

پھر صرف ملزمین ہی کو مظالم کا نشانہ نہیں بنایا گیا، ان کی اولاد، اعزہ اور دوستوں کو بھی مشق ستم بنایا گیا، بچوں کو اذیتیں پہنچا کر والدین سے اعترافات حاصل کئے گئے۔مارچ اور اپریل ۱۹۳۵ کے قانون کے ذریعہ ۱۲ سال کے بچوں کو بھی انہی سزاؤں کا

مستحق قرار دیا گیا جو بالغوں کے لئے تھیں اور سرکاری املاک کی چوری پر موت تک کی سزا نافذ کی گئی۔ بارہ سال کے بچوں کو فوجداری کے معاملات میں بالغوں کی سزا کا مستحق قرار دینا دنیا کی تاریخ ظلم میں ایک نادر چیز ہے۔ الیگزنڈر کارین کی ۱۳ سال کی لڑکی کو اس طرح بے سہارا کیا گیا کہ وہ دیوانہ وار گلیوں میں پھرتی تھی اور کوئی اس کی بات تک نہ سنتا تھا۔ لینن کی بیوی جس کی حیثیت "اشتراکیت کی پہلی خاتون" کی تھی، وہ بھی مظالم سے نہ بچ سکی۔ اور اب خود اسٹالن کی بیٹی کو امریکہ میں پناہ لینی پڑی ہے:

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟

پھر اس کی نظیر بھی صرف اشتراکی روس ہی پیش کر سکتا ہے کہ سزا صرف مجرموں ہی کو نہیں، ان کو بھی ملتی ہے جو جرم کے بارے میں کوئی علم بھی نہیں رکھتے۔ ۸ رجون ۱۹۳۴ کے قانون کی رو سے جو فوجی ملک سے بھاگ جائے اس کے ساتھ رہنے والے تمام اعزہ۔ بیوی، اولاد وغیرہ۔ کو آزادی سے محروم کر دیا جائے گا اور سائبیریا کے دور دراز علاقوں میں بھیج دیا جائے گا۔ اگر ان کو اس کے جرم کا علم ہو تو ۵ سال سے دس سال کی مدت کے لئے اور ان کی تمام املاک ضبط کر لی جائیں گی اور اگر ان کو علم نہ ہو تو ۵ سال کے لئے سائبیریا بھیجا جائے گا (ازوستیا۔ ۹ رجون ۱۹۳۴) اس کے صرف یہ معنیٰ ہی نہیں ہیں کہ وہ جو کسی جرم کا کوئی علم بھی نہیں رکھتے ان معصوموں کو بھی سزا دی جا رہی ہے بلکہ اس کے نتیجہ میں یہ بہیمانہ نظام قائم کرنا پیش نظر ہے کہ بیوی شوہر پر اور اولاد والدین پر جاسوسی کریں ورنہ اپنی چمڑی محفوظ نہ رکھ سکیں گے۔

سوال یہ ہے کہ جو نظام اس درجہ بے اعتمادی پر مبنی ہو، جس میں ہر طرف "غدار سازی" کے کارخانے کام کر رہے ہوں، جس کو جبر و تشدد کے ذریعہ چلایا جا رہا ہے، اس کو ایک صحت مند نظام کیسے کہا جا سکتا ہے۔ پھر اگر ہم مارکس کے اس نظریہ کو مان لیں کہ انسان اپنے ماحول کی پیداوار ہے، تو اس ماحول کے بارے میں کیا رائے قائم کی جائے گی جو خود اشتراکیت کے بہترین سپوتوں کو غدار، پاگل اور ملک دشمن بنائے ڈال رہا ہو! پھر بات یہ بھی نہیں ہے کہ یہ سب کچھ سیاسی کمزوری کی وجہ سے ہو، یہ نظام جتنا مضبوط ہوتا جاتا ہے، اس کی سخت گیری اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے۔ ۱۹۲۹ تک اخبارات میں اختلافی رائے چھپتی تھی، لینن کی بیوی کی یادداشتیں آخر روس ہی میں چھپی تھیں، لیکن اس کے بعد جب ملک مضبوط ہو گیا تو یہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ عدل کے کمیسار کو ییلنکو نے ایک بار کہا تھا کہ:

> ہر زمانے کے موقع پرستوں کا یہ قول ہے کہ ایک ملک جتنا مضبوط ہوگا، اپنے مخالفین سے اس کا رویہ اتنا ہی نرم ہوگا، نہیں، ہرگز نہیں! ملک جتنا مضبوط ہوگا، جتنا طاقتور ہوگا، پارٹی اور حکومت کا رشتہ عوام کے ساتھ جتنا مضبوط اور گہرا ہوگا، اتنا ہی سوشلسٹ تعمیر کو متاثر کرنے والے دشمنوں کے خلاف ہمارا غصہ سخت تر ہوگا اور ہم ان کے خلاف اتنے ہی سخت تر اقدام کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔ (بحوالہ ازویستیا فروری ۱۲، ۱۹۳۶ء)
>
> یہ ہے اشتراکیت کا ذہن! کمزور ہوں تو بقا کے لئے تشدد ضروری ہے، مضبوط ہوں تو مخالفین کے خلاف غصہ کے اظہار کے لئے تشدد لازمی ہے۔ تشدد اس نظام کی روح ہے، اس کا مزاج ہے، اس کا طریق کار ہے۔ یہ انسانوں سے انسانوں کی طرح معاملہ نہیں کرتا، درندوں کی طرح کرتا ہے اور دوست و دشمن ہر کوئی اس کا نشانۂ ستم بنتا ہے۔

۳۔ انسانی نقطۂ نظر سے اشتراکی سماج کا جائزہ لیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس نے جو سیاسی نظام بنایا ہے وہ آزادی

اور جمہوری اقدار سے محروم ہے۔ فرد کے آزاد وجود کو یہ نظام گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ نہ سے نظریہ اور ملک کی آزادی ہے، نہ اختلاف اور اعتراض کا حق ہے، نہ پیشہ اور روزگار کی آزادی ہے، نہ تنظیم بندی کی آزادی ہے، نہ نقل و حرکت کی مکمل آزادی ہے، نہ بے لاگ انصاف کے حصول کا حق ہے، نہ نظام حکومت کو اپنی مرضی کے مطابق بنانے اور تبدیل کرنے کا اختیار اور موقع ہے اشتراکی نظام ایک کلیت پسند آمرانہ اور استبدادی نظام ہے جس میں آزادی اور جمہوری حقوق کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ ان کو ایک سامان تعیش قرار دیا گیا ہے جس کی کھپت بورژوا نظام میں تو ہو سکتی ہے، پرولتاری دنیا میں نہیں!

حقیقت یہ ہے کہ معاشی بگاڑ سے زیادہ بنیادی مسئلہ انسانی آزادی کا مسئلہ ہے۔ انسان صرف روٹی سے نہیں جیتا۔ اس کو باقی حیوانوں سے جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ اس کی آزادی ہی ہے۔ اگر دنیا کی تمام سہولتیں اس کو حاصل ہو جائیں لیکن انسانی خودی مجروح ہو جائے اور اسے آزادی سے محروم کر دیا جائے تو یہ نعمتیں نہیں مصیبتیں ہیں۔ علامہ اقبال نے بہت صحیح کہا تھا کہ

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو، پرواز میں کوتاہی

اشتراکی نظام میں انسان کو مشین کے بے جان پرزوں کی سطح پر اتار دیا گیا ہے۔ وہ اپنی سیاسی اور تہذیبی قسمت کا مالک نہیں رہا ہے بلکہ اقتدار کے ہاتھوں میں بے جان مہروں کی مانند ہے۔ یہ محض کچھ افراد کا نہیں، پوری انسانیت کا المیہ ہے۔

ملک کے سارے اختیارات ایک پارٹی کے ہاتھوں میں ہیں جس کے کل ارکان کی تعداد آبادی کے ۴ فی صدی سے بھی کم ہے۔ کسی دوسری پارٹی کا کوئی وجود نہیں۔ یہی پارٹی انتخابات کے لئے اپنے نمائندے کھڑے کرتی ہے، کوئی ان کے مقابلے پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی دنیا کا ایک عجوبہ ہے کہ انتخاب میں صرف ایک نمائندہ ہوتا ہے اور پھر اس الیکشن کو رائے شماری کہا جاتا ہے! برطانیہ کے سوشلسٹ وزیر اعظم ایٹلی نے روسی انتخابات کو ایسی گھوڑ دوڑ سے تشبیہ دی تھی جس میں صرف ایک ہی گھوڑا شریک دوڑ ہو!

پورے ملک میں صرف دو اخبارات ہیں۔ پرودا اور ازوستا۔ ایک پارٹی کا ترجمان ہے اور دوسرا حکومت کا۔ تمام ملک کے سب سرکاری اخبارات ازویستیا (Izvestia) کا اداریہ چھاپتے ہیں اور تمام پارٹی کے ترجمان پراودا (Pravda) کا۔ صرف ایک نیوز ایجنسی ہے۔ طاس (Tass) مقامی خبریں صرف سرکاری ہینڈ آؤٹ ہوتی ہیں۔ اس طرح خبروں پر مکمل کنٹرول ہے اور کوئی خبر چھاپی نہیں جا سکتی۔ حد یہ ہے کہ ۳۳-۱۹۳۲ کے یوکرین قحط کی کوئی خبر پورے روس میں شائع نہیں ہوئی حالانکہ اس میں ۶۰ لاکھ کے قریب افراد بھوکوں مرے۔ اب اس قحط کا کھلے بندوں اعتراف کیا جاتا ہے۔

عدالت اور قانون انفرادی آزادی کے محافظ ہوتے لیکن ان کا بھی کوئی آزاد وجود نہیں ہے۔ قانون کو اشتراکی نظام کا ایک آلہ کار بنایا گیا ہے۔ نظام عدل بھی انہی اشتراکی مقاصد کے تابع کیا جا چکا ہے۔ بنیادی حقوق کی تنفیذ کا کوئی حق نہیں پایا جاتا۔ جج سرکاری وکیل کا رول ادا کرتے ہیں۔ عدالت کا کوئی آزاد ضابطہ نہیں ہے۔ ۵۰ سال میں تمام عدالتوں میں کوئی ایک فیصلہ بھی حکومت وقت کے خلاف نہیں ہوا ہے۔ اینڈری وائی شنسکی (Andrey Vyshinsky) جو سرکاری وکیل اور ماہر قانون کی حیثیت رکھتا ہے اپنی کتاب میں کہتا ہے۔[59]

---

[59] ملاحظہ ہو: The Law of the Soviet State

"ایک اشتراکی عدالت کا کام یہ ہے کہ عوام کے دشمنوں کو خواہ وہ اشتراکیت کے خلاف اپنی چیرہ دستیوں کا اظہار کسی بھی صورت میں کریں ذرہ برابر ہمدردی کے بغیر نیست و نابود کر دے۔"

"تمام عدالتیں طبقاتی پالیسی کا آلہ کار ہیں۔"

"اشتراکی انصاف مزدور طبقہ کے ہاتھوں میں جبر و تشدد کا ایک ہتھیار ہے۔"

"ایک اشتراکی جج کا منتہا محض قانونی منطق نہیں ہے۔ اسے ہمیشہ یہ حقیقت اپنے سامنے رکھنی چاہیے کہ قانون پارٹی کی پالیسی کے منشار کے اظہار کے سوا اور کوئی وجود نہیں رکھتا۔"

"اگر قانون اور پارٹی کی دی ہوئی لائن میں تصادم ہو تو ایک اشتراکی جج کو بلا تکلف قانون کے لفظی اطلاق کو ترک کر دینا چاہیے تاکہ وہ پارٹی کی ہدایات کی مکمل اطاعت کر سکے اس لئے کہ پارٹی کی ہدایات اس کے لئے ایک بالاتر قانون کی حیثیت رکھتی ہیں۔"

اس کے بعد قانون کی حکمرانی کے کیا معنیٰ باقی رہتے ہیں۔ نشہ

۴۔ اشتراکیت نے جو سماجی نظام بنایا ہے اس میں بھی انسان کو نظر انداز کرنے کی وہی پالیسی کارفرما ہے جسے ہم معاشی اور سیاسی دائرے میں دیکھ چکے ہیں۔ خاندان کا نظام، جو ہمیشہ سے تہذیب کا گہوارہ رہا ہے، متضاد اور متناقض پالیسیوں کا نشانہ بنتا رہا ہے۔ اس نظام میں کوئی چیز محترم باقی نہیں رہی ہے۔ نہ فرد کی شخصیت، نہ قریب ترین رشتے، نہ عائلی ادارے اور تعلقات۔ ہر چیز اضافی ہے اور وقت کے بدلنے کے ساتھ ساتھ اپنا مقام بدلتی رہتی ہے۔ اولاد پر والدین کے حقوق باقی نہیں رہے ہیں، ریاست کے مفاد میں بچوں کو جس طرح چاہے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مذہب اور اخلاق نے سماجی زندگی کی حد بندی کی تھی اسے توڑ دیا گیا ہے۔ نکاح اور طلاق کا نظام وقت کی ضرورتوں کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔ جائز اور ناجائز رشتے میں کوئی فرق باقی نہیں رہا ہے۔ انقلاب کے فوراً بعد جنسی آزادی دی گئی، خاندان کے نظام کا مذاق اڑایا گیا، نکاح کی مذہبی تقدیس کو ختم کر دیا گیا، طلاق کا دروازہ چوپٹ کھول دیا گیا۔ یہاں تک کہ ایک زمانے میں صرف پوسٹ کارڈ سے اطلاع دینا کافی قرار دیا گیا۔ پھر جب حالات خراب ہوئے اور قابو سے باہر ہو گئے تو اس جنسی آزادی پر پابندیاں عائد کی جانے لگیں، طلاق کو مشکل تر بنا دیا گیا۔ طلاق کی فیس کو ۵۰ روبل سے بڑھا کر ۲ ہزار روبل تک پہنچا دیا گیا (دفعہ ۲۷ قانون طلاق جولائی ۱۹۴۴) کنواروں پر ٹیکس عائد کر دیا گیا۔ اسقاط حمل کو قانونی جرم قرار دیا گیا۔ لشہ بچوں کی تعداد پر ماں کو اعزاز دیا جانے لگا۔ غرض کسی ایک کیفیت کو بھی معاشرے میں حقیقی قدر و تقدس حاصل نہیں، محض وقتی مصلحت کی بنیاد پر ایک انتہا سے دوسری انتہا تک معاشرہ ٹھوکریں کھاتا رہتا ہے۔

نشہ مزید مطالعہ کے لئے ملاحظہ ہو "قانون کا اشتراکی تصور" از ابن نذیر۔ چراغ راہ "اسلامی قانون نمبر" جلد اول

لشہ اسقاط کا قانون روس کی تاریخ میں وہ واحد قانون ہے جس کے بارے میں عوامی مرضی معلوم کرنے کے لئے فیکٹریوں سے رجوع کیا گیا۔ استصواب رائے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ لیکن جب آنے والی آرار کی اکثریت حکومت کے مجوزہ قانون کے خلاف معلوم ہوئیں تو استصواب کو روک دیا گیا اور ۲۷ دسمبر ۱۹۳۶ کو ممانعت کا قانون نافذ کر دیا گیا۔

اس کا نتیجہ ہے کہ وہ تمام اخلاقی مفاسد جو مغربی تہذیب میں رونما ہوتے ہیں اشتراکی سماج میں رونما ہو رہے ہیں۔ چوری اور سبوتاج وہاں عام ہے۔ زنا اور دوسرے جنسی جرائم بے پناہ ہیں۔ ماسکو کی گلیوں میں قحبہ گری اسی طرح ہوتی ہے جس طرح لندن اور نیویارک میں شراب نوشی عام ہے اور نقص امن عامہ کے ہر دس واقعات میں سے نو وہ ہوتے ہیں جن کے مرتکب شراب کے نشے میں مست ہوتے ہیں[۴۲ه] ۱۹۶۵ء میں صرف لینن گریڈ کے ایک محلہ میں دو ہزار سے زیادہ نوجوان شراب نوشی کے جرم میں گرفتار ہوئے[۴۳ه] شراب نوشی کا یہ عالم ہے کہ ہر چھٹی کے بعد کے دن مزدوروں کی پیداآوری نمایاں طور پر کم ہو جاتی ہے۔ طلاقوں میں سے نصف اس وجہ سے ہیں کہ شوہر شراب نوشی میں حد سے گذر جاتے ہیں۔ اطفال اور نوجوانوں کے جرائم بڑھ رہے ہیں۔ کج روی (Delinquency) کا رجحان اسی طرح رونما ہو رہا ہے جس طرح مغربی ممالک میں۔ نوجوانوں کے غول وہاں بھی رونما ہو گئے ہیں اور مختلف سماج دشمن سرگرمیوں میں مبتلا ہیں۔ فرد معاشرہ سے کٹا ہوا ہے اور شدید مغائرت (alienation) محسوس کرتا ہے۔[۴۴ه]

۵ ـ اشتراکی نظام کا یہ بہت ہی عظیم المیہ ہے کہ اس میں حق' انصاف' خیر اور صداقت کے کوئی مستقل معنی نہیں ہیں بمصلحت پرستی وہاں کا چلن ہے اور ہر وہ چیز جو مقصد براری کا ذریعہ بنے قابل قبول ہے۔ اقدار کی اس اضافیت نے انسان کو وہ نقصان پہنچایا ہے جو اس سے پہلے کسی نظام تہذیب نے نہیں پہنچایا تھا۔ خروشیف نے اسٹالن کو جس طرح بے نقاب کیا ہے اس نے اسٹالن کے بارے میں تو ہماری معلومات میں کچھ زیادہ اضافہ نہیں کیا البتہ اس نظام کی اس بنیادی کمزوری پر سے مزور پردہ ہٹا دیا ہے۔ اس نظام میں خوب و ناخوب کا معیار اس طرح بدلتا رہتا ہے جس طرح صحرا میں ریت کے ٹیلے۔ دوستی اور دشمنی کا بھی کوئی مستقل اصول موجود نہیں ہے۔ یہاں آسمان ہر لحظہ رنگ بدلتا رہتا ہے۔ مدعا کی وضاحت کے لئے ہم صرف چند مثالیں دیتے ہیں۔

(i) پہلی جنگ کے بعد اشتراکیت نے جنگی تاوان (reparations) کی بڑھ چڑھ کر مخالفت کی۔ لیکن دوسری جنگ کے بعد جنگی تاوان وصول کرنے پر اصرار کیا۔

(ii) فاشزم کی مخالفت کی اور اسے سرمایہ داری کی بدترین شکل قرار دیا لیکن پھر ہٹلر کے ساتھ صلح کا معاہدہ کر لیا اور تھوڑی سا زمین حاصل کرنے کے لئے پولینڈ پر ہٹلر کے حق کو تسلیم کر لیا۔ جب جرمنی سے دوستی ہوئی تو نہ صرف یہ کہ فاشزم پر تنقید بند ہو گئی بلکہ ہٹلر کے قومی ترانے تک کو روسی نوچ نے گایا۔ لیکن پھر جلد ہی قلا بازی کھائی اور روس جرمنی کے خلاف برسر جنگ ہو گیا۔ اب سرمایہ دارانہ ممالک سے دوستی شروع ہو گئی اور انھیں خوش کرنے کے لئے اشتراکیت کی بین الاقوامی تنظیم (کومنٹرن)

۴۲ه Vide CDSP, December 8, 1965.

۴۳ه See: Hollander, Paul, "The Homelessness''' *Survey*, July 1966.

۴۴ه See: Chalasinski, Jozef, "The Homelessness of 'Universal Man', *Survey*, January, 1967, p. 163.

تک کو توڑ دیا۔ جنگ کے فوراً بعد جنگ کے زمانے کے اپنی حلیفوں کے خلاف برسرپیکار ہوگیا۔

(iii) اشتراکیت کے قائدین کے بارے میں جو متضاد باتیں سامنے آتی ہیں وہ سخت حیران کن ہیں۔ جب اسٹالن برسر اقتدار تھا تو عالم یہ تھا کہ از دستیا ہیں. ۲۰ سطروں میں اسٹالن کا نام ۱۸ بار آتا تھا اور ہر بار کئی لا تنوں کی تعریفوں کے ساتھ اور پراودا میں یہ "حمد" شائع ہوئی تھی کہ[۵۵]

اے عظیم اسٹالن! اے عوام کے راہنما

تو وہ ہے جس نے انسان کو وجود بخشا

تو وہ ہے جو زمین کو بار آور کرتا ہے

تو وہ ہے جس سے صدیوں کی زندگی عبارت ہے

تو وہ ہے جو بہاروں کو جوبن عطا کرتا ہے

تو میری بہاروں کا مرکز ہے

سورج کی مانند، جو لاکھوں دلوں پر جلوہ فگن ہے۔

اور پھر اب عالم یہ ہے کہ اس عظیم اسٹالن کی لاش تک مقبرہ سے نکال کر کسی گم نام جگہ دفن کر دی گئی ہے اور اب اس کی قبر کا بھی کسی کو علم نہیں۔ اسے زاروں سے زیادہ بڑا ظالم ثابت کیا جا رہا ہے اور کوئی اس کے حق میں ایک کلمہ تک نہیں کہہ سکتا۔

بیریا کو لیجے۔ پراودا اسے "اسٹالن کا وفادار دست راست اور شاگرد رشید" لکھتا تھا اور سوویٹ انسائیکلوپیڈیا (۱۹۵۰ ایڈیشن) اسے "سوویٹ کمیونسٹ پارٹی اور حکومت کے نمایاں ترین قائدین میں سے ایک" قرار دیتا تھا۔ لیکن تین ہی سال بعد روسی ریڈیو اور پریس نے اس کی جو تصویر کشی کی وہ یہ تھی:

"ذلیل اور بے وفا، کم ظرف دشمن، ملعون دشمن، قابل نفرت غدار، موقع پرست، لٹیرا، چالاک غدار، بدمعاش غدار، ذلیل غدار، بورژوائی بدکردار، سامراجی ایجنٹ، باولا کتا، تیز ہنگامہ پرست، نظریاتی بکاؤ مال۔"

بلغاریہ کے کامریڈ کوشوو کا حشر بھی اس سے مختلف نہ ہوا۔ اس کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے اس کا قصیدہ یوں پڑھا تھا۔

"کامریڈ کوشوو۔ تمھاری خدمات عظیم ہیں، تم پارٹی کے معمار اور پارٹی کے ارکان کے استاد اور معلم ہو۔ تمھاری قیادت میں اور تمھاری سنہری مثال سے متاثر ہو کر ہزاروں ارکان نے پارٹی کی مکمل اطاعت کی تعلیم و تربیت حاصل کی۔۔۔ مارکسزم لینزم کے بارے میں تمہاری معلومات بڑی گہری ہیں، تمہاری ثقافت عظیم، محنت اور استقلال میں تمہاری مثال بڑی اونچی ہے۔ تمہاری شرافت معاملات بڑی گہری ہیں، تمھاری ثقافت عظیم، محنت اور استقلال میں تمھاری مثال بڑی اونچی ہے۔ تمھاری شرافت تمھارا آہنی ارادہ، پارٹی اور مزدور طبقہ کے لئے تمھاری بے لوث وفاداری وہ درخشاں بالشوی کی صفات ہیں جو تمھاری

---

[۵۵] پراودا۔ اگست ۲۸ر ۱۹۳۶ء۔

پوری حرکت اور جدوجہد سے بھرپور زندگی کو اور بھی حسین بنا دیتی ہیں۔ تم آج ہماری پارٹی کے محبوب ترین قائدوں میں سے ایک ہو — ایک عظیم مدبر اور نئے بلغاریہ کے معمار ؟"

اور دو سال بعد یہی کوسٹو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا تھا اور اسے سزائے موت دی گئی۔ سرکاری اخبار نے لکھا کہ

"کٹہرے میں کوسٹو کھڑا تھا — وہ پرانا چالاک دوغلا، جانا بوجھا بائیں بازو کا فرقہ پرست اور پھوٹ ڈلوانے والا تجربہ کار ایجنٹ جو بلغاریہ کی شاہی اور فسطائی پولیس کا تنخواہ دار تھا، برطانیہ کے نظام جاسوسی کا نمائندہ، ٹیٹو جیسے جاسوس اور غدار کا قریب ترین ساتھی، قابل نفرت مجرم، وہ زمین کی غلاظت جس نے اپنے تحریری اعتراف نامہ کو ماننے سے انکار کر دیا ؟"

جس نظام میں اصولوں، نظاموں، اداروں اور افراد کے بارے میں آرا اس طرح بدلتی ہوں، جس میں نہ کوئی اصول مستقل ہو اور نہ کوئی قدر دائمی، جہاں حق وانصاف اور صداقت کا کوئی معروضی وجود نہ ہوں، وہ نظام انسانیت کے لئے ایک رحمت ہو سکتا ہے یا لعنت!

اشتراکیت پر انسانی نقطۂ نظر سے جتنا بھی غور کیا جائے گا اس کے سوا کوئی دوسرا نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا کہ یہ ایک انسان دشمن نظام ہے، جس میں بدن کی سیوا تو کی گئی ہے لیکن روح کو مسخ کر دیا گیا ہے اور انسانیت کو اس کے ہر شرف سے محروم کر دیا گیا ہے۔ ہم بحث کے اس حصہ کو ایک اشتراکی اور ایک غیر اشتراکی مفکر کی رائے پیش کر کے مکمل کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے مشہور سوشلسٹ اہل قلم جارج برنارڈ شا کی رائے کا مطالعہ کیجئے۔ شا نے ایک مدت پہلے روس کے دورے کے بعد اپنی اس رائے کا اظہار کیا تھا اور اسے پراودا نے بھی بلا تبصرہ شائع کیا تھا۔

"(روس) نے فرد اور ریاست کے درمیان ایک نیا رشتہ تعمیر کر لیا ہے۔ اس نئے تصور میں انسانی زندگی کی حقیقی اور اندرونی قدر وقیمت کے جھوٹے اور خیالی نظریہ کی جگہ حیات انسانی کے بارے میں ایک حقیقت پسندانہ اور افادی رویہ اختیار کیا گیا ہے۔ ۔ ۔ روسی اشتراکیت کی کامیابی میں بہت بڑا دخل اس حقیقت کو ہے جسے ہر روسی شہری جانتا ہے کہ اگر وہ اپنی زندگی کو اپنے ملک کے لئے کارآمد نہیں بناتا تو امکان غالب ہے کہ وہ اس سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ خفیہ پولیس کا کوئی ایجنٹ اسے شانے سے تھامے گا اور اسے اس مشہور و معروف جگہ پہ لے جائے گا جہاں پہنچنے کے بعد اس کی داستانِ حیات ختم ہو جائے گی۔ اس کے سارے اعزہ کو نرمی سے مطلع کر دیا جائے گا۔ کہ انھیں اس کے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ وہ اب گھر واپس نہیں آئے گا ؟"

برنارڈ شا نے اپنے مخصوص انداز میں بڑے پتہ کی بات کہی ہے۔ اشتراکی نظام میں انسان بحیثیت انسان محترم نہیں ہے۔ حیات انسان کی خود کوئی قدر وقیمت نہیں ہے۔ اگر یہ زندگی ملک اور نظام کے لئے مفید نہیں ہے تو اس کی بقا کا کوئی جواز نہیں ہے۔ یہ مادہ پرستانہ ذہن کی بالکل صحیح عکاسی ہے ——— البتہ دوسرے مادہ پرستانہ نظاموں میں ایسے انسان کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے لیکن اشتراکیت مادہ پرستی کو اس کے منطقی نتائج تک لے جاتی ہے۔ وہ ایسے انسان کو جو نظام کے لئے افادیت نہ رکھتا ہو، گوارا بھی نہیں کرتی۔ وہ اسے ٹھکانے لگانے کا مناسب بندوبست کر دیتی ہے!

دوسرا مفکر جس کی رائے ہم پیش کرنا چاہتے ہیں وہ چینی فلسفی ڈاکٹر لن یوتانگ ہے۔ وہ اشتراکیت پر اپنے پورے غور وفکر کا

پکوڑا س طرح بیان کرتا ہے کہ

"میں اپنے آپ کو ایک نفری عدالت میں تبدیل کر لیتا ہوں اور اپنے ضمیر کی تنہائیوں میں حقائق کو اشتباہات، غلط مبحث اور توڑنے مروڑنے کے عمل سے جدا کرکے ان پر غور کرتا ہوں۔ میں ساری شہادتوں کو زیر غور لاتا ہوں اور اپنے سے سوال کرتا ہوں، کیا انسان اور انسانی تمدن کی قسمت میں یہی کچھ لکھا ہے؟ اور میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ (اشتراکیت کا) یہ پورا تجربہ اس لائق نہ تھا کہ اسے کیا جاتا ...... میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ فنی ترقی کے تمام دعووں کے باوجود، ایک بچے کی زندگی کو بچالینا، سائبیریا سے ایک ماں کا اپنے بچے کے پاس بھیج دیا جانا، ایک غلام کو اس کی زنجیروں سے آزادی دلادینا، فضاؤں میں اسپوٹنک اڑانے سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ ایک انسان کا انسانی سطح سے پست زندگی گزارنا اور اس کا تھکن اور کم خوراکی سے چور ہو کر برف پر مردہ گر پڑنا، ایک قیدی کا اپنی کال کوٹھڑی سے اپنی بے گناہی کی دل خراش پکار لگانا اور لیتھوانیا کے علاقہ میں ایک بچے کا آدھی رات کو سیکیورٹی پولیس کے ہاتھوں اپنی ماں کی گرفتاری اور روانگی کا منظر دیکھنا ——— یہ ساری چیزیں ان اسپوٹنکوں سے حتمی طور پر کہیں زیادہ اہم ہیں۔ اور یہ سارے امور خود ہم سے متعلق ہیں، اس لئے کہ بیسویں صدی میں ان کو گوارا کر رہے ہیں۔" [۵۷]

اشتراکیت انسانوں کے مسئلہ کو محض حیوانوں کی سطح پر حل کرنا چاہتی ہے اور وہ اسے کبھی حل نہیں کرسکتی انسان کی روح اس مادی ترقی کے باوجود یہ حاصل کرلیتی ہے بےچین اور مضطرب رہتی ہے۔ وہی ترقی انسان کی ترقی ہوسکتی ہے جس میں انسان سے بحیثیت انسان معاملہ کیا گیا ہے۔ اگر مقام انسانیت ہی باقی نہ رہے تو پھر کوئی چیز بھی مفید نہیں ہوسکتی۔ یہی اشتراکیت کا المیہ ہے۔ سب کچھ پانے کے بعد بھی انسان اپنے کو خالی ہاتھ محسوس کرتا ہے۔ اس کے دل و دماغ کی نگری اجاڑ رہتی ہے۔ اس کی شخصیت ایک سایہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ وہ زندہ ہوتے ہوئے زندگی کو ترستا ہے، سانس کی آمد و رفت کے باوجود اپنے کو زندہ محسوس نہیں کرتا، ساری صلاحیتیں رکھنے کے باوجود مجبور محض ہوجاتا ہے۔ چند معاشی سہولتوں کے بدلے انسانیت کے پورے سرمایہ کی قیمت ادا کرکے وہ محسوس کرتا ہے کہ اسے لوٹ لیا گیا۔ یہ سودا اسے بڑا ہی مہنگا پڑتا ہے۔ روسی ادیب پاسٹرنک [۵۸] کے الفاظ میں اس کی کیفیت اس کسان کی سی ہوتی ہے جو محسوس کرتا ہے کہ:

"جب انقلاب آیا تھا اور اس نے اسے بیدار کیا تھا تو وہ سمجھا تھا کہ اب اس کا خواب شرمندہ تعبیر ہونے کو ہے۔ اس کا پرانا خواب کہ وہ زمین پر اپنے ہاتھوں کی محنت سے بے قید زندگی گزارے، پوری طرح آزاد ہو کسی کا کچھ بھی

---

[۵۷] بحوالہ لن یوٹانٹ، کتاب مذکورہ بالا۔ صفحہ

برٹرینڈ رسل نے بھی ایک جگہ کہا ہے کہ "میں مجبور ہوں کہ بالشوزم کو دو وجوہ سے رد کردوں۔ پہلا یہ کہ انسانیت کو اشتراکیت کو بالشوی طریقوں سے حاصل کرنے کی جو قیمت ادا کرنی پڑتی ہے وہ ہولناک ہے اور دوسرے اس لئے کہ اتنی بھاری قیمت ادا کرنے کے بعد بھی میں سمجھتا ہوں کہ جو نتیجہ حاصل ہوگا وہ، وہ نہیں ہوگا جس کا دعویٰ بالشوی کرتے ہیں۔ [۵۸] ڈاکٹر ژواگو از بورس پاسٹرنک

دینداری ہو، لیکن اس کے برعکس اُس نے محسوس کیا کہ اس نے صرف آقا بدل لئے ہیں پرانے زاری ریاست کے نظام ظلم وتشدد کی جگہ نئی انقلابی بالا ریاست کا زیادہ وزنی اور سخت گیر جوا اس کے کندھوں پر ہے "

اشتراکیت کے اس المیہ کو پولینڈ کے شاعر آدم وازیک[1] نے بڑی سچائی اور دردمندی کے ساتھ پیش کیا ہے ۔

یہاں انسان ہیں جو کام سے تھک گئے ہیں ۔
پولینڈ کے سیب ہیں جن کو پولینڈ کے سپوت حاصل نہیں کرسکتے
یہاں بچے ہیں جنھیں مجرم ڈاکٹر غصہ کی نظر سے دیکھتے ہیں
یہاں معصوم بچے ہیں جن کو جھوٹ بولنے پر مجبور کیا جاتا ہے
یہاں معصوم بچیاں ہیں جن کو غلط بیانی پر مجبور کیا جاتا ہے
یہاں انسان ہیں جو انصاف کے منتظر ہیں
یہاں لوگ ہیں جو ایک مدت سے انتظار کررہے ہیں
اس زمین پر ہم اپیل کرتے ہیں
انسانوں کے نام پر اپیل کرتے ہیں
ان انسانوں کے نام پر جو کام سے تھک چکے ہیں
ہم ان تالوں کے خواہش مند ہیں جو ہمارے دروازوں پر لگ سکیں
ان کمروں کے طالب ہیں جن میں کھڑکیاں ہوں
ان دیواروں کے جو خستہ وخراب نہ ہوں
ہاں، اس لئے کہ انسانوں کی طرح وقت گزارا جاسکے

فرانس کی سوشلسٹ پارٹی کے سیکریٹری پیرے کامن نے سرخ جنت کی زیارت کے بعد بہت ٹھیک کہا تھا کہ "ہمیں یہ احساس ہے کہ انقلاب انسانوں کو فائدہ پہنچانے اور اس کی عزت اور اس کے وقار میں اضافہ کرنے کا باعث نہیں ہوا ہے، بلکہ یہ انسان کو محض ایک آلہ بنانے میں کامیاب ہوا ہے "

اشتراکی تہذیب میں انسان کا جو انجام ہوا ہے اس کی بہترین عکاسی روس کے انقلاب کے بعد کے دور کے ایک چوٹی کے شاعر کی زندگی میں ہوتی ہے ۔

(yessenin) یے سینین — صرف تیس سال کی عمر میں وہ اپنی شہرت کے نصف النہار پر تھا لیکن اس کی روح بے چین و مضطرب تھی۔ وہ اپنے سے کہتا ہے کہ

"اے میرے سر! تیری تیزی مجھے کہاں لے آئی ہے ؟

---

[1] Adam Vazyk, in *Nowa Kultura*, Warsaw, August 12, 1955.

میں بے آبرو ہوں! میں نے عزت کا کوئی پاس نہیں کیا! میں بدمعاش ہوں!
۔ آہ یہ سب کچھ اور صرف اس لئے کہ اور بھی تیزی کے ساتھ، اور بھی شدت سے جلوں "
اس نے اپنی کیفیت کو اپنے اخلاقی ابتلا کو ۔ پورے اشتراکی سماج کے اخلاقی ابتلا کو ۔ یوں پیش کیا ہے۔

" میں اپنے ہی وطن میں اجنبی ہوں
میں خود ہی راستے پر کھڑا ہوں
میں کوئی نیا انسان نہیں ہوں، میرا ایک پاؤں ماضی میں ہے ۔ اور پھر بھی میں فولاد کی دنیا میں شریک ہونا چاہتا ہوں ۔ ہاں گو میں لنگڑا رہا ہوں اور لڑکھڑا رہا ہوں ۔ لیکن چاہتا یہی ہوں "

عزت، شہرت، دولت اس کی روح کو تسکین نہ دے سکے ۔ اس نے خودکشی کرلی اور موت کے وقت جو اس کی لکھی ہوئی تحریر ملی وہ پورے اشتراکی نظام پر ایک بھرپور طنز بھی ہے اور اس کی حقیقی کیفیت پر ایک حتمی فیصلہ بھی۔

"اے میرے دوست! اے میرے دوست!
اس زندگی میں مرجانے میں کوئی نئی بات نہیں ہے
لیکن
بلا شبہ زندہ رہنے میں بھی کوئی بات نئی نہیں!"

جب بھی انسانی بنیادوں سے ہٹ کر اور انسانی حقائق کو نظرانداز کرکے کوئی سماج قائم ہوگا اس میں انسان کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔ پھر وہ اپنے ہی وطن میں اجنبی، اپنے ہی گھر میں غیر، انسانوں کے درمیان تنہا، اور اپنے ہی ماحول میں بے سہارا ہوگا۔ پھر نہ موت میں کوئی نئی بات ہوگی اور نہ زندگی میں کوئی نئی چیز۔ زندگی اور موت کا فرق مٹ جائے گا، اس لئے کہ یہ فرق پیدا ہی ہوتا ہے اخلاق کے احساس سے! اشتراکیت نے ایک ایسا غیرانسانی سماج قائم کیا ہے کہ اس میں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی انسان کے لئے کچھ نہیں یہی وہ مقام ہے جہاں نہ موت کا خوف ہوتا ہے اور نہ زندگی کی امنگ! انسان اس تھکا دینے والے ہیجان سے پناہ حاصل کرنے کے لئے خودکشی کی طرف بڑھتا ہے ۔ ے سینین نے اپنی شہرت کے عروج کے وقت اس زندگی سے تنگ آکر خودکشی کرلی۔ یہ صرف ے سینین کی خودکشی نہیں، انسانیت کی خودکشی ہے! اور یہی ہے اشتراکیت کی سب سے بڑی ناکامی۔

(۶)

اشتراکیت اور معاشی مسئلہ

انسانی نقطۂ نظر سے

اشتراکیت کے مجموعی نظام کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نظریۂ حیات کو اس کے اپنے دیئے ہوئے محدود معیار پر بھی جانچنے کی کوشش کریں گے اشتراکیت کا سب سے اہم اور مرکزی دعویٰ یہ ہے کہ وہ انسان کے معاشی مسئلہ کو حل کرتی ہے اشتراکیت کی نگاہ میں تہذیب انسانی کی اصل کنجی اقتصاد ہے ۔ تہذیب و تمدن کی ہر چیز کا انحصار اسی بنیادی حقیقت پر ہے۔ یہ سنور جائے تو ساری دنیا سنور جاتی ہے ۔ یہ بگاڑ کا شکار ہو تو پور

تہذیب بگاڑ میں مبتلا رہتی ہے۔ اوپر کی بحث میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس یک رخے اور بیمار ذہن سے جو تہذیب بنتی ہے اس میں کس کس پہلو سے فساد رونما ہوتا ہے اور بالآخر انسان پر کیا گزرتی ہے۔ لیکن اب ہم صرف معاشی بنیاد پر اشتراکیت کا مطالعہ کریں گے اور خود اس کے دیئے ہوئے معیار پر اسے پرکھ کر دیکھیں گے کہ کیا وہ فی الحقیقت انسان کے معاشی مسئلہ کو حل کر دیتی ہے یا کر سکتی ہے؟ گو ہماری نگاہ میں کسی نظام کو جانچنے کا یہ کوئی صحیح معیار نہیں ہے اور جب تک پورے مسئلہ کو خالص انسانی نقطۂ نظر سے اور اس کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر مطالعہ نہ کیا جائے کوئی صحیح نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا لیکن دو وجوہ سے اس محدود معیار پر اشتراکیت کو جانچنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

(i) اشتراکیت کا مرکزی خیال اور بنیادی فکر یہی ہے۔ اس لئے اگر اپنے مقرر کردہ معیار کے علاوہ ہم خود اس کے دیئے ہوئے معیار پر بھی اس کو جانچیں تو یہ علمی دیانت سے اقرب ہوگا۔ نیز اشتراکیت کے بارے میں کوئی نتیجہ خیز فیصلہ کرنے میں یہ مطالعہ ممد و معاون تو بہرصورت ہوگا۔

(ii) یہ اشتراکیت کی خوش قسمتی اور انسانیت کی بدبختی ہے کہ دورِ جدید نے جو ذہن پیدا کیا ہے وہ چیزوں کو خالص مادی نتائج سے جانچنے کا عادی ہو گیا ہے۔ اس دور میں 'غیر محسوس' پر 'محسوس' کو ایک فضیلت حاصل رہی ہے، عظمت کو ماپنے کے لئے گزوں اور انچوں یا ٹنوں اور منوں کے پیمانے استعمال کئے جانے لگے ہیں۔ آج علم کی قدر بھی اس کی 'افادیت' اور سائنس کی اہمیت اس کی 'فنیت' (technology) سے عبارت ہے۔ اخلاق اور روحانی پیمانوں کو غیر اہم بلکہ غیر ضروری اور بیکار (irrelevant) تصور کیا جا رہا ہے اور صرف مادی نتائج پر حسن و قبح کا فیصلہ کیا جا رہا ہے۔[ف۴] یہ ایک عمومی مرض ہے جس میں سرمایہ داری اور اشتراکیت، جمہوریت اور آمریت، امریکہ اور روس سب ہی مبتلا ہیں۔ اس فسادِ عام میں اشتراکیت کے محدود معیار کو قبولیت کا ایک مقام حاصل ہو گیا ہے اور اچھے خاصے سمجھدار لوگ بھی کہتے ہیں کہ اصل مسئلہ تو معاشی مسئلہ ہے۔ ان حالات میں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خالص معاشی نقطۂ نظر سے بھی اشتراکیت کے دعوی کو اچھی طرح پرکھا جائے۔ ہم اس حصہ میں مختصراً یہی کوشش کریں گے۔ [ف۵]

کیا اشتراکیت کوئی معاشی پروگرام دیتی ہے؟

۱۔ سب سے پہلا مسئلہ جس پر غور ہونا چاہئے، یہ ہے کہ کیا فی الحقیقت اشتراکیت نے کوئی واضح اور مفصل معاشی پروگرام دیا ہے؟ کچھ لوگ ہمارے اس سوال پر شاید چونک جائیں۔ اشتراکی پروپیگنڈے نے جو عمومی فضا بنا رکھی ہے وہ یہ ہے کہ گویا معاشی پروگرام تو صرف اشتراکیت ہی کے پاس ہے باقی سب لوگ اس پہلو سے تہی دامن ہیں۔ ہر تحریک اور جماعت پر ان کا پہلا اعتراض یہی ہوتا ہے کہ ان کے پاس کوئی معاشی پروگرام نہیں ہے لیکن یہ سب پروپیگنڈے کی کرامت ہے۔ علمی اور تحقیقی سطح پر اشتراکیت کے مؤید اپنے مدمقابل

ف۴ اکبر الہ آبادی نے اپنے خصوصی انداز میں اس عمومی بیماری کی بڑی صحیح نشان دہی کی تھی کہ ؎

نہیں اس کی کوئی پرسش کہ یاد اللہ کتنی ہے　　یہی سب پوچھتے ہیں آپ کی تنخواہ کتنی ہے

ف۵ اسی خاص نمبر میں رفیق عزیز جناب حسین خاں صاحب کا مضمون "اشتراکیت اور معاشی ترقی" دیا جا رہا ہے۔ اشتراکیت کے معاشی پروگرام اور اس کے نتائج کو سمجھنے کے لئے اس کا مطالعہ بھی بے حد مفید ہوگا۔

سے مشکل ہی سے آنکھیں چار کر سکتے ہیں۔ اور ہم جانتے ہیں کہ محض پروپیگنڈے کا طلسم زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ لنکن نے سچ ہی کہا تھا کہ "تم سب انسانوں کو کچھ عرصہ کے لئے یا کچھ انسانوں کو ہمیشہ کے لئے بے وقوف بنا سکتے ہو لیکن سب انسانوں کو ہمیشہ کے لئے بے وقوف نہیں بنا سکتے" جھوٹ کا پول ایک دن کھل کر رہتا ہے!

ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اشتراکیت کے بانیوں کی تحریرات سے کوئی واضح اور مثبت معاشی پروگرام پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اشتراکی مفکرین نے ایک فلسفہ تو دیا، سماج کا ایک تصور بھی دیا، طبقاتی نزاع کی ایک کیفیت بھی بیان کی، سرمایہ داری کی خامیوں کو تفصیل سے بے نقاب کیا، اور لوگوں میں انقلاب کا ایک ولولہ اور امنگ پیدا کی، لیکن کوئی مفصل معاشی پروگرام نہیں دیا۔ جن لوگوں نے مارکس، اینجلز اور لینن کا صرف نام سنا ہے وہ شاید یہ سمجھتے ہوں کہ ان معماران اشتراکیت نے کوئی معاشی پروگرام ضرور دیا ہوگا لیکن جن کی نگاہ ان کی تحریرات پر ہے وہ جانتے ہیں کہ اس پورے "انقلابی" لٹریچر میں کوئی معاشی پروگرام موجود نہیں۔ بنیادی معاشی مسائل کو مثبت طور پر کس طرح حل کیا جائے گا۔ اس میں کوئی بحث نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ کسی مثبت معاشی پروگرام کو بیان کرنا کم از کم مارکس کی بنیادی اپروچ سے مطابقت ہی نہیں رکھتا۔ اس کی توجہ کا اصل مرکز نظام سرمایہ اور سرمایہ پرستی تھی۔ اس نے اس نظام کے بروئے کار آنے اور فنا ہونے کے قوانین بیان کئے ہیں۔ وہ کہتا تھا کہ فطری تاریخی قانون کے نتیجہ میں اس کے بطن سے اشتراکی نظام رونما ہوگا۔ اصل چیز انقلاب ہے اور اس کے بعد وسائل پیداوار کی قومی ملکیت ــ باقی تمام چیزیں اس کے فطری نتائج کے طور پر اسی طرح رونما ہوں گی جس طرح بیج سے درخت نکل آتا ہے۔ مارکس نے پروگرام مانگنے والوں کا مذاق اڑایا ہے اور کبھی اشتراکی پروگرام کی تفصیلات کو بیان نہیں کیا۔ اشتراکیت کا سارا لٹریچر "سرمایہ داری کا علم" (science of capitalism) ہے، اشتراکیت کا نہیں۔ کیپٹال (capital) میں جزوی اور ضمنی طور پر اشتراکیت کی چند خصوصیات کا ذکر آ گیا ہے اور وہ بھی سرمایہ داری سے اختلاف کو ظاہر کرتے ہوئے یا اس کے تضادات پر روشنی ڈالتے ہوئے۔ مارکس کی صرف ایک تحریر ایسی ہے جس میں کچھ عملی باتیں آئی ہیں اور وہ ہے "پروگرام پر تنقید"۔ کسی اور جگہ اشتراکی پروگرام کا کوئی نقشہ بیان نہیں کیا گیا۔ اور اس تحریر میں بھی سماجی اشتراکیوں پر تنقید کرکے بتایا گیا ہے کہ جو پروگرام تم پیش کر رہے ہو وہ اشتراکیت کا پروگرام نہیں ہے۔ اشتراکیت کا اصل پروگرام تو انقلاب ہے، اسے برپا کرو، پھر سب کچھ خود بخود ہو جائے گا۔ [۴۸ الف]

چیلنج کرنا راقم کے مزاج کے خلاف ہے لیکن کیا کوئی اشتراکی اہل قلم دلیل کے ساتھ اور اصل اشتراکی لٹریچر کے حوالوں کے ساتھ اس دعویٰ کی تردید کر سکتا ہے۔

البتہ جو بات اشتراکیت کے مقابلہ میں کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ چونکہ اس کا بنیادی نقطۂ نظر ہی یہ ہے کہ پورے سماج اور پوری معیشت میں اصل چیز وسائل کی پیداوار کی ملکیت ہے اور چونکہ سرمایہ دارانہ نظام میں پیداواری قوتوں میں جو فرق واقع ہو گیا ہے وہ اس نظام کے مقرر کردہ پیداواری تعلقات سے متصادم ہے۔ اس لئے وسائل کی ملکیت ہی اصل معاشی پروگرام ہے اور یہ باقی تمام امور کو آپ سے آپ حل کر دے گا تو ہم اس پر اندرونی تضاد کا الزام نہیں لگائیں گے لیکن معاشیات کا کوئی طالب علم اس ایک نعرہ (SLOGAN) کو معاشی پروگرام قرار نہیں دے سکتا ہر معاشی نظام کو ان بنیادی سوالوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور کوئی معاشی پروگرام ان کا جواب دئے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔

۴۸ الف ڈینیل بیل "نظریہ کے خاتمہ" کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"حقیقت یہ ہے کہ مارکس کبھی بھی محض معاشیات میں بحیثیت معاشیات دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ دراصل اس کے لئے معاشیات فلسفہ کا عملی پہلو تھی"

۴۸ Quoted in *Survey*, No: 62,

(الف) انسانوں کی احتیاجات کیا ہیں ؟ ان کو پورا کرنے کے لئے کن اشیاء و خدمات کی ضرورت ہے ؟ احتیاجات اور مطلوبہ اشیاء و خدمات کا تعین کیسے کیا جائے گا اور متعین مقداروں میں ان کا اظہار کیسے ہوگا ؟

(ب) ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے کیا وسائل موجود ہیں ؟ ان وسائل کی تنظیم کیسے واقع ہوگی ؟ مختلف مدات میں ان کی تقسیم بہترین اور معقول ترین انداز (rational allocation of resources) میں کیسے واقع ہوگی ۔ اس کے لئے کن صلاحیتوں کی اور کن ادارات کی ضرورت ہوگی ۔ ان کا باہم ربط کیسے قائم ہوگا اور تناسب استعمال کی صورت کیا بنے گی ؟

(ج) اشیاء و خدمات کی تقسیم (distribution) کیسے واقع ہوگی — افراد، اداروں اور معاشی اکائیوں کو ان کا حصہ کیسے پہنچے گا ؟

(د) معیشت میں انسانی اور مادی وسائل کا مکمل استعمال (full employment) کیونکر واقع ہو سکے گا ؟ پھر یہ استعمال بہترین (most efficient) کیسے ہو سکے گا ؟ نظام میں لچک اور تغیر پذیری کا حصول کیونکر ہوگا ۔

(ہ) معاشی وسائل، معاشی مساعی اور معاشی فلاح میں کیا تعلق ہوگا ؟ معاشی جدوجہد کا اصل مقصد کیا ہوگا اور پوری معاشی زندگی کی اعلیٰ ترین کارکردگی کو کیسے حاصل کیا جا سکے گا ؟

(و) نیز ان تمام دائروں میں کون کون سے معاشی قوانین کارفرما ہوں گے اور کس طرح ان سب کے تقاضے پورے کئے جا سکیں گے ؟

اشتراکی معاشیات اس پہلو سے بڑی کمزور رہی ہے کہ اس نے ایک معاشی نظام کے بنیادی مسائل کو اپنے نقطۂ نظر کے مطابق علمی انداز سے بیان نہیں کیا[٥٠] بلکہ قومی ملکیت کو "کھل سم سم" قسم کی ایک چیز قرار دیا جس کے روبکار آنے کے بعد سارے بند دروازے آپ سے آپ کھل جائیں گے ۔ خود یہ بات کہ وسائل کو قومی ملکیت میں کس طرح لایا جائے گا ؟ کس ترتیب سے لایا جائے گا ؟ متبادل انتظام کیا ہوگا ؟ قیمتوں کا تعین کس طرح کیا جائے گا ؟ طلب و رسد کی کیفیت کیا ہوگی ؟ کارکردگی کو جانچنے کا معیار کیا ہوگا ؟ مرکزیت اور لامرکزیت (decentralisation) کے بارے میں کیا رویہ ہوگا ؟ کارکردگی کے لئے کون سے محرکات استعمال ہوں گے اور کس حد تک ؟ نظام میں لچک کیسے پیدا کی جائے ؟ نتائج کو جانچنے اور پیداواری طریقوں کو تبدیل کرنے کا راستہ کیا ہوگا ؟ یہ تمام سوالات وہ ہیں جن سے کلاسیکی اشتراکیت نے کوئی بحث نہیں کی ۔ بلکہ ان کے شعور کو بھی انقلابی ولولہ کے خلاف سمجھا گیا ۔ ان مسائل پر باقاعدہ غور و فکر اس وقت شروع ہوا جب مخالفین نے اشتراکی ماہرین معاشیات کو آڑے ہاتھوں لیا اور بنیادی معاشی سوالات کے بارے میں ان کو چیلنج کیا ۔

پہلی جنگ کے فوراً بعد جرمن ماہر معاشیات لڈوگ فون مائزیز (Ludwing Von Mises) نے یہ اعتراض کیا کہ اشتراکی نظام میں کسی معاشی بنیاد پر قیمتوں کا تعین ممکن نہیں ہے ۔ آزاد بازار اور طلب و رسد کی قوتوں کو قومی ملکیت کے

---

٥٠ پروفیسر جارج ہام لکھتا ہے : "معاشی مارکسزم سرمایہ داری پر ایک تنقید ہے لیکن اس کے پاس اجتماعی معیشت (collectivist economy) کی ہیئت اور اس کے نظام کا رنیز اس کے کارفرما اصولوں کے بارے میں کہنے کے لئے عملاً کچھ بھی نہیں ہے :"

Halm, George N.. *Economic System: A Comparative Analysis.*

ذریعہ ختم کر دینے کے بعد وسائل کی صحیح تقسیم کے لئے کوئی اصول باقی نہیں رہے گا۔ اشتراکیت کے معاشی نظریہ کا ارتقاء اس اعتراض کے بعد ہوا ہے اور سوشلسٹ ماہرین معاشیات نے معاشی حساب کاری (economic calulation) کے بارے میں مختلف تصورات پیش کئے۔ یہاں ہمارے پیش نظر ان نظریات سے بحث نہیں ہے، بلکہ ہم صرف اس حقیقت پر توجہ مرکوز کرانا چاہتے ہیں کہ روسی تجربہ کے فاصلے آگے بڑھ جانے تک اشتراکیت کے پاس کوئی معاشی نظریہ اور واضح پروگرام نہ تھا اور اس کا اعتراف علمی اور عملی دونوں سطح پر کیا گیا ہے۔ علمی سطح پر مشہور سوشلسٹ مفکر اسکار لانگے نے اشتراکی معیشت میں قدر اندازی کے مسئلہ کا حل تجویز کرتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ

"سوشلسٹ بوجوہ پروفیسر مائیزیز کے بے حد شکرگذار ہیں .... اس لئے کہ یہ ان کا پیش کردہ مفید چیلنج تھا جس نے انھیں مجبور کیا کہ اشتراکی معیشت میں وسائل کی تقسیم کاری کے لئے معاشی حساب کاری کے مناسب نظام کے مسئلہ کی اہمیت کو محسوس کریں۔"

لانگے مزید تجویز کرتا ہے کہ:

"پروفیسر موصوف کی خدمات کے اعتراف کے طور پر اور خود اصل مسئلہ (یعنی معاشی حساب کاری) کی بنیادی اہمیت کو تسلیم کرنے کے لئے پروفیسر مائیزیز کا ایک مجسمہ سوشلسٹ ریاست کے مرکزی منصوبہ بندی کے ادارہ یا وزارت اجتماعیت کے بڑے ہال میں ایک محترم مقام پر آویزاں ہونا چاہیے۔"[۸۳]

اور مشہور مارکسی اہل قلم اوٹو لیشٹر (Otto Leichter) نے ۱۹۲۳ء میں لکھا تھا کہ:

"یہ اعزاز میکس ویبر اور لڈوگ مائیزیز کو جاتا ہے کہ انھوں نے اتنی قوت کے ساتھ سوشلسٹوں کی توجہ اس مسئلہ کی طرف مبذول کرائی۔ خواہ اس تنقید سے ان کا منشا یہ نہ ہو کہ وہ سوشلسٹ نظریہ اور عمل کے مثبت ارتقا کا باعث ہوں گے۔ لیکن پھر بھی عزت واحترام اور اعزاز اس کے مستحق کو جانے چاہئیں۔"[۸۴]

روس میں اشتراکی تجربہ کا آغاز جس تحدی کے ساتھ کیا گیا وہ مارکس اور اینجلز (خصوصیت سے ثانی الذکر) کا یہ احساس تھا کہ قومی ملکیت کے بعد ساری 'بورژوا معاشیات' آپ سے آپ ختم ہو جائے گی۔ قدر بندی (valuation) کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ اینجلز کا استدلال یہ تھا کہ

"قدر کے جس تصور سے معاشیات آشنا ہے وہ اشیاء کی قدر ہے۔ اشیا کیا ہیں؟ مصنوعات جو ایک ایسے معاشرے میں پیدا ہوں جس میں انفرادی پیداکار ہوں اور جو تبادلہ کے ذریعہ اجتماعی استعمال میں آتی ہیں۔ لیکن جس لمحہ وسائل پیداوار کی ملکیت سوسائٹی کی طرف منتقل ہو جاتی ہے اس لمحہ تعلقات کی نوعیت میں بنیادی تبدیلی واقع ہوتی

---

۸۳ Lange, *On the Economic Theory os Socialism*, op. cit., p. 57-58.

۸۴ 84 Quoted, Hoff, T. J. B., *Economic Calculation in the Socialist Society*, op. cit., p. 3.

ہے۔ اب اجتماعی محنت کو زر یا قدر کے پیمانوں سے نہیں ناپا جاتا بلکہ اس کی پیمائش کا فطری، حقیقی اور مناسب اور مطلق پیمانہ وقت (پیداوار میں صرف ہونے والا وقت) ہوتا ہے۔ اب لوگ اپنے معاملات کو مشہور زمانہ تصور قدر کی مداخلت کے بغیر بڑی آسانی سے منظم کر لیں گے۔" [85]

روس کے ماہر معاشیات پلیخانوف (Plekhanov) نے اسی بنیاد پر پورے علم معیشت کے دم توڑ دینے کی خبر سنائی۔ اشتراکی انقلابی کونسل کے دماغ بخارن (Bukharin) نے اپنی کتاب Economics of the transition Period میں جو ۱۹۲۰ میں آئی یہاں تک کہہ دیا کہ:

"معاشیات ایک غیر منظم قومی معیشت کے علم کا نام ہے۔ صرف ایک ایسے معاشرہ میں جس میں پیداوار کا نظام مزاج پر مبنی ہو، سماجی زندگی کے قوانین فطری، اور آزاد اور آپ سے آپ رو نما ہونے والے قوانین محسوس ہوتے ہیں۔ ایسے قوانین جو افراد اور گروہوں کی مرضی سے آزاد ہوں اور اس طرح ضرورت کی پیداوار ہوں، جیسے قوانین ثقل۔ حقیقت یہ ہے کہ جونہی ہم ایک منظم قومی معیشت کا مطالعہ کرتے ہیں تو علم معاشیات کے تمام بنیادی مسائل مثلاً قیمت، قدر، نفع وغیرہ پارہ پارہ ہو جاتے ہیں۔ اب انسانوں کے درمیان تعلقات کے اظہار کی یہ صورت نہیں ہوتی کہ وہ "اشیاء کے درمیان تعلقات" ہیں۔ اس لئے کہ یہاں معیشت کی ضابطہ بندی منڈی اور مسابقت کی اندھی قوتوں کے ہاتھوں نہیں ہو رہی، بلکہ شعوری طور پر ایک منصوبہ کے ذریعہ ہو رہی ہے۔ سرمایہ دارانہ اشیاء کا خاتمہ دراصل اس حقیقت کا مظہر ہے کہ معاشیات کا خاتمہ ہو گیا۔" [85 الف]

گو لینن نے نئی معاشی پالیسی کے آغاز کے وقت معاشیات کے تلخ حقائق کو محسوس کر لیا تھا اور اس نے اس امر کا اعتراف بھی کیا تھا کہ یہ "ناممکن ہے کہ ایک عرصہ تک سوشلسٹ حساب کاری اور کنٹرول سے گزرے بغیر اشتراکیت کے ادنیٰ ترین مرحلہ تک بھی پہنچا جا سکے گا۔" [85 ب] لیکن اسٹالن نے پھر معاشیات کے خاتمہ کی بات کو اٹھایا۔ ایک مشہور مضمون میں ۱۹۴۳ میں اس بات کا اعادہ کیا گیا جو مصنف کے نام کے بغیر Pod Znamenem Marksizma میں شائع ہوا تھا اور جس کے بارے میں محققین کا خیال ہے کہ اسٹالن ہی کا لکھا ہوا تھا۔ اس پورے دور میں معاشی تجزیہ، معاشی مسائل کا فنی اور علمی مطالعہ اور حقیقی مشکلات کے احساس کا فقدان

---

[85] Angels, *Anti-Duhring*, pp. 339-340.

[85 الف] 85-A. *Ekonomike Perekhodnovs periode*, Moscow, 1920, Translation quoted by Alam Kanfman, "The Origin of the Political Economy of Socialism", *Soviet Survey*, January 1953, pp. 273.

[85 ب] Quoted , Halm *Economic Systems*, op. cit., p. 161.

جاتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۵۴ء تک معاشیات کی کوئی نصابی کتاب تک روس میں شائع نہ ہوئی۔ محض قومی ملکیت، اجتماعی کھیت اور منصوبہ بندی کے راگ الاپے جاتے رہے۔ معاشی پروگرام اور سائنسی تجزیہ تو بعد کی چیزیں ہیں، ابتدائی امور کا بھی کوئی شعور اس زمانے میں نظر نہیں آتا۔ اشتراکی معاشیات "پر جو بھی کام ہو رہا تھا وہ سرمایہ دارانہ ممالک کے سوشلسٹ کر رہے تھے۔ روس میں جو باتیں ہو رہی تھیں وہ یہ تھیں کہ اب کوئی معاشی مسئلہ باقی ہی نہیں رہا۔ اسٹالن کی موت کے بعد اس خوش فہمی کو ختم کرنے کی کوشش ہوئی۔ انسٹی ٹیوٹ آف ایکونومکس کے ڈائرکٹر وی۔ ڈایا خنکو (V. Dyachenkvo) نے ۱۹۵۵ء میں لکھا کہ ہم صرف اقتباسات سے کھیلتے رہے ہیں اور ان پر حاشیہ چڑھانے کے مرض میں مبتلا رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ

"معاشیات کے کلیدی مسائل کی تشریح و توضیح کے میدان میں بہت پس ماندہ ہیں۔ برسوں سے اس میدان میں کوئی ایک بھی ٹھوس علمی کتاب پیش نہیں کی گئی ہے۔"

موصوف نے یہاں تک لکھا ہے کہ

"۱۹۵۱ء کے معاشی مباحث کے بعد سے بس یہ فیشن ہو گیا ہے کہ ہر تحریر میں یہ کہہ دیا جائے کہ سوشلزم کے معاشی قوانین اپنا معروضی وجود رکھتے ہیں لیکن کوئی ایک بھی تحریر ایسی نہیں ہے جس میں اس سے بحث کی گئی ہو کہ اس یا اُس قانون کے معروضی وجود کا اظہار کس شکل میں ہوتا ہے، اس کے لوازمات کیسے پورے ہوتے ہیں اور ان لوازمات کی خلاف ورزیوں اور ان سے انحرافات کی تشخیص کیسے کی جا سکتی ہے۔" [۵۵]

یہ ہے اشتراکی معاشیات کی حالت اور یہ تھا ۱۹۵۵ء تک اشتراکی دنیا میں معاشی فکر کا افلاس۔

یہ سب ناقابلِ انکار حقائق ہیں لیکن عام اشتراکی ان سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اشتراکیت کے پاس کوئی مثبت معاشی نظریہ اور پروگرام موجود ہے۔ لیکن اشتراکی لٹریچر ایسی ہر چیز سے پاک ہے اور اس پر ایک واضح پروگرام پیش کرنے کی تہمت تک نہیں لگائی جا سکتی!

کیا اشتراکیت کی عملی مثال کوئی نمونہ بن سکتی ہے؟

۲ - یہ تو تھا نظری پہلو۔ آیئے اب اشتراکیت کی عملی مثال کے تجزیہ سے اس کی معاشی حکمت عملی کا سراغ لگانے کی کوشش کریں۔ اس سلسلہ میں پہلی بات جو سامنے رہنی چاہیے۔ وہ یہ ہے کہ تمام اشتراکی ممالک معاشی اعتبار سے ایک سطح پر نہیں ہیں، اور نہ ہی سب نے اشتراکیت کی طرف اپنے سفر کا آغاز ایک ہی مقام سے کیا۔ اس لئے ان کے اختیار کردہ راستوں میں فرق بالکل فطری چیز ہے۔ تاریخ نے مارکس کے اس دعوے کی تردید کر دی ہے کہ اشتراکیت سرمایہ داری کی پختہ سالی کے بعد رونما ہو گی اور یہ اس کی تکمیل کے بعد کا لازمی مرحلہ ہے۔ جن ممالک میں سرمایہ داری اپنی پختگی کو پہنچی، وہاں اشتراکیت قدم نہ جما سکی اور جہاں

---

[۵۵] Vop. Ekon., No. 10/1955 pp. 3-4. vide Alec Nove. *The Soviet Economy*, Allen & Unwin. London, 1961, p. 271-2.

وہ ابھی اپنے اولیں ادوار میں تھی وہاں وہ کامیاب ہوگئی۔ لیکن اس پہلو سے بھی اشتراکیت کی طرف آنے کے وقت روس جس مقام پر تھا چین اپنے انقلاب کے وقت اس مقام سے بہت پیچھے تھا۔ اسی طرح مشرقی یورپ میں پولینڈ، زیکوسلاویکیہ، مشرقی جرمنی اور یوگوسلاویہ صنعتی اعتبار سے آپس میں بھی مختلف تھے اور رومانیہ، البانیہ اور بلغاریہ سے تو بہت ہی آگے تھے۔ اس لئے ان تمام ممالک کی معاشی حکمت عملی میں بنیادی حقائق کے اختلاف کی وجہ سے مکمل یکسانی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

روس میں اشتراکیت کو پھلنے پھولنے کا سب سے زیادہ موقع ملا ہے اور اب اس نے اپنے پہلے پچاس سال پورے کرلئے ہیں لیکن وہاں بھی معاشی حکمت عملی میں بنیادی تغیرات آتے رہے ہیں۔ ان میں سے کسے اصل اشتراکی پروگرام کہا جائے؟ مثلاً

پہلے تین سال اشتراکیت کی طرف چھلانگ لگانے کی کوشش کی گئی۔ تمام صنعتوں کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا۔ زمینوں کو بڑے زمینداروں سے چھین لیا گیا اور کسانوں اور چھوٹے زمینداروں کی تحویل میں دے دیا گیا، بیرونی سرمایہ اور ماہرین کو بے دخل کردیا گیا۔ صنعت کا کنٹرول عملاً مزدوروں کی طرف منتقل کرنے کی کوشش ہوئی۔ زر کو ختم کرنے کے منصوبے بنائے گئے۔ لیکن جلد ہی اس پالیسی کو ترک کردیا گیا۔

دوسرے دور میں اصل توجہ پیداوار کو بڑھانے پر صرف کی گئی۔ اس کے لئے نجی سرمایہ اور نجی کاروبار کو جزوی طور پر بحال کیا گیا منصوبہ بندی کمیشن تو قائم ہوا لیکن باقاعدہ منصوبہ بندی کا کوئی نہج قائم نہ ہوسکا۔ بنکاری، زر اور اعتبار کو دوبارہ شروع کردیا گیا، بیرونی سرمایہ اور ماہرین کو واپس بلایا گیا۔ مالی اور معاشی محرکات کو استعمال کیا جانے لگا یہ پالیسی ۱۹۲۱ سے ۱۹۲۷ تک جاری رہی۔ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ اشتراکیت سے مراجعت کی پالیسی تھی لیکن اس کا مصنف خود لینن تھا اور اسٹالین نے بھی اپنے اقتدار کے پہلے چار سال اس پر مکمل عمل کیا۔ اور بعد کے ادوار میں بھی اس کے کچھ پہلو باقی رکھے گئے اور آج تک موجود ہیں۔

۱۹۲۸ء سے منصوبہ بندی اور قومی ملکیت کا دور شروع ہوا۔

اور اس زمانے میں اشتراکیت کے بنیادی اصول۔ وسائل پیداوار کی قومی ملکیت۔ پر عمل ہوا اور ایک ملک میں اشتراکیت کی تعمیر کی کوشش ہوئی، لیکن نئی معاشی پالیسی کے قائم کئے ہوئے چند اصولوں میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ مثلاً زر و بنکاری، اعتبار اور سود، عدم مساوات، معاشی محرکات کا استعمال وغیرہ۔ البتہ اس دور میں مرکزیت میں اضافہ کرنے کی ہر ممکن کوشش ہوئی اور سارا رجحان مضبوط مرکز کے قیام اور ایک مرکزی مقام سے پوری معیشت کے انتظام و انصرام کا تھا۔ لیکن تیس سال کے تجربے کے بعد اب اس مرکزیت کو کم کیا جارہا ہے اور لامرکزیت (decentralization) کی روش زور پکڑ رہی ہے[۵۶]
روس نے بھاری صنعت کی ترقی، زمین کی اجتماعی اور مشینی کاشت اور فوجی قوت کی تعمیر کو اصل اہمیت دی۔ چین نے ایک

---

۵۶ پروفیسر پال سویزی جیسا کٹر مارکسی بھی اس کا اعتراف کرتا ہے کہ روس کی مثال کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ سوشلزم میں وسائل پیداوار کی ملکیت کی مختلف شکلیں ہوسکتی ہیں (یعنی محض قومی ملکیت نہیں)، اور دوسرے یہ کہ وسائل کی نجی ملکیت کی شکل میں اس کے استعمال کی حدبندی کی جاسکتی ہے۔ ملکیت کو ختم کرنا ضروری نہیں ہے۔ اس چیز کو موصوف نے روسی اشتراکیت کی خصوصیت کے طور پر پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو سوشلزم۔ از سویزی صفحہ ۲۳۔

مدت تک اسی طریقہ کو اختیار کیا لیکن پھر اس سے ہٹ کر معیشت کو زراعت کی اولیت کی بنیاد پر منظم کرنے کا تجربہ شروع کر دیا جو سات آٹھ سال کی کوشش کے باوجود ابھی نہ کوئی واضح شکل اختیار کر سکا ہے اور نہ ہی کوئی مفید نتائج نکال سکا ہے مشرقی یورپ کے اشتراکی ممالک بھی روس کی مثال پر عمل نہ کر سکے اور انھوں نے اولیں تجربات کی ناکامی کے بعد اپنے اپنے حالات کے مطابق معاشی حکمت عملی میں نبیادی تغیرات کئے ہیں۔ یوگوسلاویہ نے تو بڑے پیمانے پر امریکی امداد تک کو حاصل کیا ہے۔ پولینڈ نے منڈی کے نظام کو نہ صرف برقرار رکھا ہے بلکہ اسے اشتراکی معیشت کا ایک جزو لازم بنا لیا ہے۔ تقریباً سب ہی ممالک نے زراعت کی اجتماعی کاشت کا ایک محدود پیمانے پر تجربہ کر کے اس سلسلہ کو زیادہ آگے نہیں بڑھایا ہے۔ نتیجۃً ان کے یہاں خالص اشتراکی معیشت کی جگہ مخلوط معیشت قائم ہے البتہ ان میں سرخ رنگ کی جھلک غیر اشتراکی مخلوط معیشتوں کے مقابلہ میں کچھ زیادہ ہے۔

اگر یورپ کے ان ممالک کی مثال کو دیکھا جائے جن میں کچھ عرصہ کے لئے یا خاصے لمبے عرصے کے لئے جمہوری سوشلسٹ برسراقتدار رہے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ ان ممالک میں (مثلاً سویڈن ناروے، اور کچھ مدت کے لئے جرمنی اور انگلستان) نبیادی معاشی نظام (economic structure) کو بدلنے کی کوئی کوشش نہیں ہوئی۔ انھوں نے سرمایہ داری کے نظام ہی کو نبیاد مان لیا اور اس میں کچھ اصلاحات کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح نہ یہ کوئی انقلابی پروگرام پیش کر سکے اور نہ اس پر عمل کر سکے۔ (۱۰۶ الف)

اشتراکی ممالک کو معاشی حکمت عملی میں اتنا تنوع، اور اختلاف پایا جاتا ہے کہ کسی ایک چیز کو متعین طور پر اشتراکیت کا واضح، مثبت اور مفصل معاشی پروگرام نہیں کہا جا سکتا۔

ان حقائق کی روشنی میں اشتراکیت کی عملی مثال بھی ہماری زیادہ رہنمائی نہیں کرتی۔ ایک کی چیز کو دوسرا ماننے کو تیار نہیں ہے۔ یوگوسلاویہ کو پوری اشتراکی برادری نے جدت پسندی کے الزام میں نکال باہر کیا تھا۔ پولینڈ پر سخت تنقید کی گئی تھی۔ آج چین البانیہ اور رومانیہ کا روس پر اعتراض ہے کہ وہ ایک سرمایہ دارانہ ملک بنتا جا رہا ہے اور اس کی معیشت اور سیاست کو اصل اشتراکیت سے کوئی علاقہ باقی نہیں ہے!

آخر وہ کونسی چیز ہے جسے اشتراکی اپنا مثبت معاشی پروگرام کہہ سکتے ہیں؟

---

۱۰۶ (الف) ایک بین الاقوامی مبصر اور سفارتی نمائندہ رقم طراز ہے:

"برطانیہ میں پانچویں لیبر حکومت جو ۱۹۶۴ میں برسراقتدار آئی اپنے پیش روؤں ہی کی پالیسی پر عمل کا ارادہ رکھتی ہے۔ یعنی یہ کہ سرمایہ دارانہ معاشی نظام کو باقی رکھا جائے البتہ اس میں اشتراکیت کی آمیزش کو کچھ اور پھیلا دیا جائے۔"

Hevesy, Paul de, *The Unification of the World: Proposals of a Diplomatist*, Pergamon Press, Oxford, 1966, p. 60.

روس کی معاشی ترقی: اشتراکی نقطہ نظر

۳۔ روس کی معاشی ترقی ایک ایسی چیز ہے جسے اشتراکیت کے حامی اپنے حق میں پیش کرتے ہیں۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ اس کا بھی مختصراً جائزہ لے کر دیکھیں کہ اس سلسلہ میں اصل حقائق کیا ہیں؟ اشتراکیت کی کامیابیوں اور اس کے شاندار معاشی ریکارڈ کے بارے میں اشتراکیت کے بہترین وکیل جو باتیں پیش کرتے ہیں [۵۵] مختصراً یہ ہیں:-

(۱) روسی اشتراکیت نے دوسری عالمی جنگ میں جرمنی کو شکست دی اور اس وقت اس کا مقابلہ کیا جب بیشتر یورپ جرمنی کے قبضہ میں تھا۔ اس فتح نے یہ ثابت کر دیا کہ "سوشلزم فی الحقیقت کامیابی سے چل رہا ہے" اور یہ واقعہ تاریخ میں اتنا ہی اہم ہے جتنا انقلاب روس۔ [۵۶]

(۲) اشتراکیت کے بحیثیت ایک نظریہ کامیابی کا ثبوت "ایک طرف صنعت کی ترقی اور دوسری طرف زراعت کی اجتماعی کاشت ہے" ۱۹۱۷ء کے انقلاب نے پرانی حکمراں قوتوں کا استیصال کیا اور دوسرے انقلاب (اجتماعیت گری) نے اس عمل کی تکمیل کر دی۔ مزدوروں کی تعداد دو گنی سے زیادہ ہو چکی ہے۔ کسان ایک اجتماعی فارم میں جڑ چکا ہے اور طلبا اور فوج کی تعداد ۱۹۳۰ تک دو گنی ہو گئی تھی۔ یہ سماجی تبدیلی ہے جو واقع ہوئی ہے۔

---

[۵۵] ہم یہ نکات اشتراکیت کے ایک بہترین وکیل پروفیسر پال سویزی کی کتاب سے پیش کر رہے ہیں اور اس سلسلہ میں جو کچھ دعویٰ موصوف نے کیا ہے اسے بلا کم و کاست اپنے قارئین کے سامنے رکھ رہے ہیں۔ ملاحظہ ہو سویزی "سوشلزم" صفحہ ۲۹ تا ۴۳۔ تمام روسی لٹریچر اور مغربی ممالک سے شائع ہونے والا اشتراکی لٹریچر انہی نکات کی شرح ہوتا ہے، بنیادی طور پر وہ ان میں کوئی اضافہ نہیں کرتا۔ اشتراکی نقطہ نظر اور اس کے تنقیدی جائزہ کے تفصیلی مطالعہ کے لئے ملاحظہ ہو۔

Baykov, Alexender, *The Developmeat of the Soviet Economic System*, Cambridge University Press, London, 1946; Webb, Sidney and Beatrice, *Soviet Communism: A New Civilization*, *op. cit.*, Dobb, Maurice, *Soviet Economic Development Since 1917*, Rodtledge & Kegan Paul, London, 1951; Nove, Alec, *The Soviet Economy*, Allen & Unwin, London, 1965; Shaffer, Harry G. (ed.), *The Soviet Economy*, Methuen & Co., London, 1964; Schwartz, Harry, *Russia's Soviet Economy*, Prentice-Hall, 1953; Bergeon, Abram (ed.), *Soviet Economic Growth*, Row, Peterson & Co., 1953; Zebot, *The Economics of Competitive Co-Existence*, *op. cit.*

[۵۶] سویزی کا صفحہ ۲۹

(۱۵) معاشی ترقی کی رفتار غیر معمولی طور پر زیادہ رہی ہے۔ دنیا کے کسی ملک میں اس تیز رفتاری سے ترقی واقع نہیں ہوئی۔ بے کوو (Baykov) کے فراہم کردہ اعداد و شمار کی روشنی میں انجینیرنگ کی صنعت کا اشاریہ ۱۹۱۳ کے مقابلہ میں ۱۹۴۰ میں ۳۲۵.۴ تھا، ٹرکول کا ۲۲۳، بجلی کی قوت کا ۴۰۸.۲، کوئلہ کا ۵۷۴، تیل کا ۳۵.۰، لوہے کا ۳۴۸.۴، سوتی کپڑے کا ۱۵۰ اور گرم کپڑے کا ۱۲.۱۔
زرعی پیداوار کا اشاریہ ۲۹۶ ، غلہ کا ۱۱۲ اور شکر کا ۲۰۸ تھا۔[۸۹] اگر روس کے سرکاری اعداد و شمار لئے جائیں تو ۱۹۲۸ اور ۱۹۶۳ کے درمیان مشینوں اور اوزاروں کی پیداوار میں ۹۶ گنا، بجلی کی قوت میں ۴۲ گنا، سیمنٹ میں ۴۳ گنا، فولاد میں ۱۹ گنا، پیٹرول میں ۱۸ گنا، کوئلہ میں ۱۵ گنا، اور مال برداری میں ۱۹ گنا اضافہ ہوا ہے۔[۹۰]
مجموعی رفتار ترقی کے بارے میں روسی حکومت کا دعویٰ ہے کہ ۱۹۲۸ اور ۱۹۳۷ میں قومی آمدنی میں ۳۰۸۵ گنا اضافہ ہوا جس کے معنی یہ ہیں کہ سالانہ رفتار اضافہ ۱۶ فی صدی کا رہا۔
یہ تمام اعداد و شمار متحیر کن ہیں۔ اور ان کو سن کر آدمی اس رفتار ترقی سے مرعوب ہو جاتا ہے۔
(۱۶) صرف معاشی ترقی ہی واقع نہیں ہوئی ہے بلکہ تعلیم و ثقافت کے میدان میں بھی غیر معمولی ترقی رونما ہوئی ہے۔ انقلاب کے وقت خواندگی کا معیار ۲۰ فی صدی (کچھ دوسرے اندازوں کے مطابق ۳۰) تھا۔ لیکن ۱۹۳۹ تک خواندگی کا معیار ۹۵ فی صدی ہو گیا۔ اشتراکی پارٹی کی اٹھارویں کانگریس (۱۹۳۹) میں پیش کی ہوئی رپورٹ سے ایک صوبہ میں تعلیمی تبدیلی کی یہ کیفیت سامنے آتی ہے۔[۹۱]

	۱۹۱۳	۱۹۳۷
ابتدائی اور ثانوی اسکول	۳۰۰۰	۲۴،۰۰۰
ماہرین طبیعات	۲۶۴	۹۴۱
طبی امداد دینے والے افراد	۶۳۴	۲۳۵۷
زرعی ماہرین	۷۰	۲۲۷۹
مذہبی رہنما	۳۱۸۹	۸۵۹

[۸۹] سوئیزی صفحہ ۱۳۰۔ بے کوو صفحہ ۳۰۰ و ۳۲۵

[۹۰] Vide: Oxenfeldt. Alfred and Holubuychy. Vesevolod, *Economic Systems in Actiun*. Holt, Riehart and Winston. New York. 1965, p. 150-152.

واضح رہے کہ مصنفین روس کے مداح اور سوشلزم کے مبلغ ہیں اور انھوں نے سارا مواد روسی ماخذ سے دیا ہے۔ ہم عام قارئین کے لئے روسی زبان کی اجنبیت کی خاطر وہ حوالے نہیں دے رہے ہیں۔

[۹۱] *The Land of Socialism Today and Tomorrow*, Moscow, 1939, p. 150.

ثقافتی اور سماجی میدانوں میں مزید اصلاحات کی گئ ہیں۔ صحت کا معیار بلند ہے، تھیٹر اور سینما میں اضافہ ہوا ہے۔ اور ادبی سرگرمیاں بڑھی ہیں۔ اس طرح سماجی فلاح قائم کیا گیا ہے۔ اور اسے اشتراکیت اپنی ایک بہت بڑی کامیابی قرار دیتی ہے۔

(۷) ایک اور نہایت اہم دعوٰی یہ ہے کہ روس میں بے روزگاری کا خاتمہ کر دیا گیا ہے اب وہاں محنت کی کمی ہے، زیادتی نہیں۔ ہر شخص برسرکار ہے۔ ۱۹۳۰ تک بے روزگاروں کے اعداد و شمار شائع ہوتے تھے اور ان کی تعداد اوسطاً ۱۰ لاکھ سالانہ تھی۔ لیکن اس کے بعد یہ سلسلہ بند کر دیا گیا اور بے روزگاری کے خاتمہ کا سرکاری اعلان ہوگیا۔

یہ ہیں روسی اشتراکیت کی کل فتوحات۔ اب ہم ان کا تنقیدی جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔

کچھ روسی اعداد و شمار کے بارے میں

۴۔ سب سے پہلا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ روسی شماریات (statistics) کہاں تک قابل اعتماد ہیں۔ دنیا کے دوسرے ممالک کے بارے میں جو بھی معلومات درکار ہوں وہ ایک نہیں مختلف ذرائع سے مل جاتی ہیں اور ایک ذریعہ سے حاصل کی ہوئی معلومات میں جو سقم ہو وہ دوسرے ذرائع سے حاصل کردہ معلومات سے دور کیا جا سکتا ہے۔ بہت سے آزاد ادارے اعداد و شمار جمع کرتے ہیں، دوسروں کی فراہم کردہ شماریات کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں اور ایک طالب علم کے لئے یہ ممکن ہے کہ ان تمام معلومات کو سامنے رکھ کر حقیقت حال کو سمجھ لے۔ روس کے نظام کی سب سے بنیادی کمزوری یہ ہے کہ اس میں شماریات کا کوئی آزاد ادارہ نہیں ہے۔ صرف حکومت ہی اعداد و شمار شائع کرتی ہے۔ عام آدمیوں یا اداروں کے لئے یہ چیز قانوناً جرم ہے کہ اعداد و شمار یا معلومات دوسروں کو دیں۔ خود حکومت جو اعداد و شمار جاری کرتی ہے وہ فنی اعتبار سے بہت نامکمل اور ناکافی ہیں[۹۲] جو اعداد و شمار جاری کئے جاتے ہیں وہ پورے طور پر قابل اعتماد نہیں۔ ان میں اتنے خلاء چھوڑ دیے جاتے ہیں کہ علمی جرح و تعدیل مشکل ہوجاتی ہے۔ پوری معلومات دینے کی بجائے صرف اوسطیں دیدی جاتی ہیں۔ مثلاً اجرت اوسطاً اجرت دی جاتی ہے اور خرچ کی حدود کو بیان نہیں کیا جاتا۔ قومی آمدنی کے لئے جو بنیادی سال اختیار کیا گیا ہے وہ فنی اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔ مختلف اشیاء کی قیمتوں کو جو اوزان اور ترجیحات (weights)

---

[۹۲] ایک نقاد لکھتا ہے کہ "روس میں قیمتوں، منڈی، کرنسی، سکونت، معیار زندگی اور متعدد دوسرے اہم امور کے بارے میں کوئی اعداد و شمار جاری ہی نہیں کئے جاتے حالانکہ یہ تمام معلومات کسی بھی معاشی نظام کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے لئے ناگزیر ہیں"۔

Hubbard. Leonard E., *Soviet Trade and Distribution*, p. 368

اسٹیفن کنگ ہال (Stephen King-Hall) راوی ہے کہ اہم اشیاء کی پیداوار کے اعداد و شمار بجز اشاریہ اور کے نہیں دیے جاتے۔ ۱۹۲۷ کے بعد سے اشیائے صرف کے استعمال کی شماریات نہیں دی گئی ہیں۔ آبادی کی شماریات مفقود ہیں۔ بیماریوں کے بارے میں کوئی معلومات نہیں دی جاتی اور بین الاقوامی Drug Control کے ادارے کو بھی کوئی معلومات نہیں دی جاتی، ملاحظہ ہو The Communist Conspiracy مطبوعہ لندن ۱۹۵۳ صفحہ ۱۴۶ - ۱۴۷۔

دیئے گئے ہیں انھوں نے تمام نتائج کو بڑا غلط رنگ دیدیا ہے۔ پھر روس میں حکومت اور اشتراکی پارٹی دونوں کی یہ اعلانیہ پالیسی رہی ہے کہ اعداد و شمار کو نظریاتی مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ۱۹۳۲ میں کیمونسٹ پارٹی نے جب اس وقت کے اعداد و شمار کے بیوریو میں تطہیر کی ہے تو اس کا برملا اعلان کیا تھا کہ "اعداد و شمار اشتراکیت کے لئے جنگ میں ایک ہتھیار کی حیثیت رکھتے ہیں" اس کے بعد ان کے جانب دارانہ ہونے میں کیا شک ہوسکتا ہے۔

جن اہل علم نے اشتراکی اعداد و شمار کا علمی تجزیہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان میں دو راستوں سے خرابی آئی ہے۔

(الف) مبالغہ، غلط بیانی، تضاد اور ناموافقت۔ جو کبھی بد دیانتی کا نتیجہ ہوتا ہے اور کبھی اشتراکیت کو بہتر نظام ثابت کرنے کے لئے۔

(ب) شماریاتی طریق کار کی کمزوریاں اور نقائص۔ جہاں جان بوجھ کر یہ کام نہیں کیا گیا وہاں بھی غلط طریقوں کی وجہ سے نتائج گمراہ کن ہوجاتے ہیں۔ دونوں نوعیت کی خرابیوں کی بے شمار مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ لیکن ان کے بارے میں کچھ عرض کرنے سے پہلے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ حکومت کے ایک فرمان (decree) کا ذکر کردیں جو ۸ رجون ۱۹۴۷ کو نافذ کی گئی اور جو اپنی نوعیت کی منفرد چیز ہے۔ اس کا عنوان ہے!

"سرکاری راز افشا کرنے اور ان دستاویزات کو جن میں سرکاری راز ہوں گم کردینے کی ذمہ داری کے بارے میں"

اس قانون کی رو سے مندرجہ ذیل رازوں کو افشا کرنے کی سزا ۸ سے ۱۲ سال تک قید ہے۔

- "صنعت بحیثیت مجموعی اور اس کی مختلف شاخیں"
- "زراعت، تجارت اور وسائل رسل و رسائل"
- "مالی محفوظات کی حالت"
- "موجود الوقت میزانیہ ادائیگی اور روس کے مالی معاملات کے منصوبے"
- "سرکاری محفوظات، کرنسی اور مبادلہ خارجہ کے رکھنے کا طریقہ، جگہ اور منتقلی کی صورتیں"
- "مختلف قسم کی اشیاء کی درآمد اور برآمد کے منصوبے یا تجاویز"

دنیا کے ہر ملک میں یہ معلومات علمی کام کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہیں اور بلا روک ٹوک شائع ہوتی ہیں۔ صرف حکومتیں ہی شائع نہیں کرتیں بلکہ آزاد ادارے بھی شائع کرتے ہیں۔ لیکن روس میں ان سب کی حیثیت "سرکاری رازوں" کی ہے، جس کا بیان جرم ہے اور اس جرم کی سزا ۸ سے ۱۲ سال قید ہے!

جب ان معاملات میں یہ سرکاری رویہ ہو تو صحیح اعداد و شمار کیسے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ یہ قانون بیسویں صدی میں دوسری جنگ کے بعد، ایک متمدن ملک میں نافذ کیا گیا ہے اور نافذ ہے!

اب ہم نہایت اختصار کے ساتھ روسی شماریات کے ان دونوں امراض کے بارے میں جن کی نشان دہی ہم نے اوپر کی ہے چند باتیں عرض کریں گے۔ پہلی خرابی کے بارے میں عرض ہے۔

(۱) سرکاری رپورٹوں اور کیمونسٹ پارٹی کی کانفرنسوں میں کی ہوئی تقریروں میں سینکڑوں مقامات پر اس کا اعتراف موجود ہے کہ فیکٹری ڈائرکٹر، کھیتوں کے صدر اور مقامی پارٹی کے افسران وغیرہ اعداد و شمار کے معاملہ میں غلط بیانیوں سے کام لیتے

ہیں۔ اسٹاک کم دکھاتے ہیں، پیداوار بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ اس کا اعتراف خروشیف نے بھی کیا ہے۔

(ii) اسٹالن کے دور پر خروشیف کے تبصرے میں یہ بات بھی آتی ہے کہ اس زمانے میں دی ہوئی سرکاری معلومات میں جھوٹ اور غلط بیانی اور حقائق کو چھپانے کا بڑا دخل تھا۔ مثلاً آبادی کے اعداد و شمار بالکل دبا دیئے گئے۔ قحط میں جو لاکھوں افراد لقمہ اجل ہوئے ان تمام اعداد و شمار کو کبھی منظر عام پر نہیں آنے دیا گیا۔ جبری انتقال آبادی کے تمام اعداد و شمار دبا دیئے گئے۔ وغیرہ۔ پھر اعترافات کی جو داستانیں اس میں بیان کی گئی ہیں۔ ان کے بعد سرکاری بیانات کا قابل اعتماد رہنا سخت محل نظر ہے۔

(iii) اعداد و شمار کو حسب منشا بیان کرنے کی مثالیں متعدد حضرات نے پیش کی ہیں۔ پنجاب میڈیکل ایسوسی ایشن کے صدر ڈاکٹر ریاض علی شاہ نے اپنے دورے کے بعد لکھا تھا کہ ہر جگہ ہمیں مختلف اعداد و شمار دیئے گئے۔ کہیں کہا گیا کہ پورے ملک میں ہر ۷۰۰ افراد پر ایک ڈاکٹر ہے اور کہیں یہ تعداد بڑھ کر ۲ ہزار افراد ہوگئی اور کہیں ۸ ہزار[۹۳]! یہ تو پھر بھی غیر کی شہادت ہے۔ مرکزی پارٹی کے سکریٹری میلنکوف نے ۱۹۵۲ میں جو رپورٹ پیش کی تھی اس رپورٹ کے صفحہ ۳۳ پر لکھا ہے کہ "۱۹۵۱ میں کپڑے کی صنعت کی پیداوار قبل جنگ کے (۱۹۴۰) معیار پر پہنچ گئی تھی"۔ اس رپورٹ کے صفحہ ۳۶ پر لکھا ہے کہ "۱۹۵۱ میں ۱۹۴۰ کے مقابلہ میں کپڑے کی پیداوار ۲۰ فی صد زیادہ تھی"[۹۴]۔

(iv) زراعت کے بارے میں اعداد و شمار کو بار بار بدلا گیا ہے۔ مثلاً ۱۹۵۲ میں غلہ کی فصل کے بارے میں اعلان کیا گیا کہ ۱۳ کروڑ ٹن ہوئی ہے۔ لیکن پھر سرکاری طور پر ہی اعلان ہوا کہ پیداوار صرف ۹ کروڑ ٹن تھی۔

(v) ۱۹۳۹ کے شمار آبادی (census) کی رپورٹ کو تیار کئے جانے کے بعد دبا دیا گیا اور شماریاتی افسروں کو سبوتاژ کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔

ایسی بے شمار مثالیں دی جاسکتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ روس میں شماریات کے ساتھ کھلا کھلا مذاق تک ہوتا ہے اور وہاں کے سرکاری اعداد و شمار کو غور و فکر اور تحلیل و تجزیہ کے بغیر قبول نہیں کیا جا سکتا۔

پھر صرف جان بوجھ کر ہی شماریات کو متاثر کرنے کی کوشش نہیں ہوتی بلکہ جو فنی طریقے اختیار کئے گئے ہیں وہ بہت ہی خام ہیں اور ان کی وجہ سے ایک خاص قسم کے نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ اس کے بھی ہم صرف چند پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

(i) ۱۹۵۰ تک پیداوار کے اشاریے ۲۷-۱۹۲۶ء کی قیمتوں کی شکل میں تیار ہوتے تھے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ فیکٹری

---

۹۳ Shah, Dr. Riaz Ali, *A Doctor's Looks at Russia,*

۹۴ *Report of the Central Committee of the C.P.S.U. (B)* to the Nineteenth Party Congress by G. M. Malenkov, Secretary, Central Committee, C.P.S.U. (B), October 5, 1952, pp. 33-36.

کی اہم کڑیوں کو اونچی قیمت لگانے کا موقع مل جاتا ہے۔ بلکہ جن مصنوعات کی پیداوار بعد میں شروع ہوئی ان کی قیمتیں بھی مصنوعی طور پر اونچی رہتی ہیں اور اشاریہ اصل پیداوار سے زیادہ ظاہر کرتا ہے۔ ۱۹۵۰ کے بعد ۱۹۵۲ء اور پھر ۱۹۵۵ء کی قیمتوں کو استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن ۱۹۵۰ء سے پہلے کے اشاریہ کو اس تبدیلی سے ہم آہنگ نہیں کیا گیا۔ اشاریہ کو جو اوزان (weights) دیئے گئے ہیں وہ بھی بلا کسی ضابطہ کے ہیں اور ان کا نتیجہ یہ ہے کہ چند ہی تیزی سے بڑھنے والی مصنوعات کی وجہ سے مجموعی اشاریہ بہت اونچا ہو جاتا ہے اسی طرح صنعت کی تنظیم میں تبدیلی پیداواری اشاریہ میں تغیر کا باعث ہوتی ہے۔ ان کی وجہ سے کل صنعتی پیداوار کے اعداد شمار خاصے مشتبہ ہو جاتے ہیں۔[۹۵]

(ii) روسی شماریات میں ایک ہی چیز کو دو اور اس سے بھی زیادہ بار جمع کرنے (doubie-counting) کی بھی ہوتی ہے۔ خصوصیت سے کے درمیانی مراحل (intermediate goods) میں جب کہ وہ ایک صنعت سے دوسری صنعت کو جاتے ہیں لیکن ہر جگہ کل پیداوار میں شامل کر لئے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خود ایک روسی مطالعہ میں اعتراف کیا گیا ہے کہ ۱۹۶۰ میں کل صنعتی پیداوار ۶۔۹ فی صد بڑھی لیکن اگر مغربی شماریات کے "اضافہ قدر" کے اصول پر اس کا حساب کیا جائے تو یہ اضافہ ۰ فی صد کا ہوگا۔[۹۶]

(iii) زراعت میں "حیاتیاتی پیداوار" Biological yield لینے کا طریقہ رائج تھا۔ جس کی وجہ سے اصل پیداوار کی جگہ صرف

---

[۹۵] ہم اس مضمون میں دقیق فنی مباحث اور مخصوص علمی اصطلاحات کے استعمال سے احتراز ہی کر رہے ہیں لیکن اظہار مدعا کے لئے اتنی بات کا بیان ناگزیر تھا۔ جو حضرات اس موضوع کا باقاعدہ مطالعہ کرنا چاہیں وہ مندرجہ ذیل مباحث ملاحظہ کریں۔

Clark, Colin, *A Critique of Russian Statistics*, London, 1939; Grassman G., *Soviet Statistics of Physical Output of Industrial Commodities*, Princeton, 1960; Nove, Alec, *The Soviet Economy* London, 1961, (Appendix); Jasny, N., "Some Thoughts on Soviet Statistics", *International Affairs*, January, 1959; Symposium on "Reliability and Usability of Soviet Statistics", *The American Statistician*, 1953; Shaffer, Harry G. (ed.), *The Soviet Economy*, London, 1963, Sections 1 to 3.

اس آخر الذکر کتاب میں ہر مسئلہ پر روس کے اہم ترین ماہرین معاشیات اور مغربی ماہرین کے مضامین ساتھ ساتھ دیئے گئے ہیں۔ تاکہ بیک وقت دونوں نقطہائے نظر سامنے آجائیں۔

[۹۶] *The National Economy of U. S. S. R.*, 1960.

ظاہری پیداوار بے نی جاتی تھی اور اس طرح صحیح صورت حال کا علم ہی نہیں ہو پاتا تھا۔ اس طریقہ کے غلط ہونے کا اعتراف خود میلنکوف نے اپنی اگست ۱۹۵۳ء کی اس تقریر میں کیا ہے جو اس نے سپریم سوویٹ میں کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۵۵ء تک روسی شماریات بس ایک کھیل اور پارٹی کے مقاصد کو حاصل کرنے اور لوگوں کو مرعوب کرنے کا ایک ذریعہ تھیں۔

ہم اپنی اس بحث کو روسی معیشت کے ایک غیر جانب دار انگریز ماہر الیک نوو کے پیش کردہ نتائج اور ایک روسی ماہر کے تبصرہ پر ختم کرتے ہیں جو اس نے روسی شماریات کے تنقیدی مطالعہ کے بعد پیش کئے ہیں۔

(الف) صنعتی پیداوار کے بارے میں اعداد و شمار جہاں تک مقدار کو پیش کرتے ہیں وہ بڑی حد تک قابل اعتماد ہیں۔ لیکن جو اعداد و شمار روبل میں پیش کئے جاتے ہیں وہ خاصے گمراہ کن ہیں۔ لیکن اس سلسلہ کے مواد کو بہ نظر احتیاط لینا چاہئے۔ مکمل بے اعتمادی سے نہیں۔

(ب) زرعی اعداد و شمار متعدد وجوہ کی بنا پر بہت کم قابل اعتماد ہیں۔ اس میدان میں اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کے لئے حکومت نے اعداد و شمار کے ساتھ بہت مذاق کیا ہے۔

(ج) صنعتی اور زرعی پیداوار اور قومی آمدنی کے اشارئے (Indices) سب سے زیادہ ناقابل اعتماد ہیں۔ گو ہم ان کو محض ذہن کی اختراع تو نہیں کہہ سکتے ہیں لیکن متعدد وجوہ کی بنا پر ان میں غلط بیانی یا مبالغہ سب سے زیادہ ہے۔[۹۵]

اس لئے ضروری ہے کہ روسی اشتراکیت کے فراہم کردہ اعداد و شمار کو آنکھیں بند کر کے قبول نہ کیا جائے، بلکہ انھیں سائنسی معیار پر جانچا جائے اور پھر صحیح نتائج اخذ کئے جائیں۔ یہ بات خوش آئند ہے کہ گذشتہ چند سالوں سے نسبتاً زیادہ روسی شماریات فراہم کی جانے لگی ہیں لیکن کسی مکمل جائزہ کے لئے وہ اب بھی ناکافی ہیں۔ یہ تھی ایک انگریز ماہر کی رائے۔ اب ہم روس کے ماہرین معاشیات میں سے ایک سرکردہ شخصیت ایس۔ جی۔ اسٹرومیلین کے نتائج مطالعہ پیش کرتے ہیں۔[۹۶] موصوف کی ایک کتاب [illegible] میں شائع ہوئی ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ

صنعتی پیداوار کے اشاریہ میں ایک ہی چیز بار بار شامل ہو جاتی ہے۔ مثلاً موٹر کی صنعت میں صرف مشین کی قدر شامل نہیں بلکہ ان پرزوں کی الگ الگ قیمتیں جن پر مشین مشتمل ہے اور اس خام مال کی قیمت جس سے یہ پرزے بنے تھے سب کل قیمت میں شامل کر لئے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ ایک ہی چیز کی قیمت کئی مراحل میں کل قیمت میں آجاتی ہے اور

---

[۹۵] [illegible]

[۹۶] موصوف کی یہ کتاب خود ہماری نگاہ سے نہیں گذری ہے۔ البتہ اس سے جو مواد آملی کے سابق سفیر روس نے اپنی کتاب میں دیا ہے ہم اس سے یہ معلومات پیش کر رہے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔ [illegible]

نتائج مبالغہ آمیز ہو جاتے ہیں۔

پہلے پنچ سالہ منصوبہ کے تجزیہ کے بعد یہ روسی ماہر کہتا ہے کہ اس میں کل صنعتی پیداوار کا اضافہ سرکاری اعداد و شمار میں ۲،۱۵۰ کروڑ روبل کا بتایا گیا ہے جب کہ دو اور تین بار جمع ہو جانے والی قیمتوں کو نکالنے کے بعد یہ اضافہ ۱۹۲۶-۲۷ کی قیمتوں کے مطابق صرف ... کروڑ روبل کا ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں کل اعداد و شمار صرف اس شماریاتی غلطی کی وجہ سے دوگنے سے زیادہ بڑھ گئے۔

اس ماہر کی رائے میں ۱۹۲۸ اور ۱۹۵۶ کے درمیان کل صنعتی پیداوار میں ۵ گنا اضافہ ہوا جب کہ اب تک کے دیئے ہوئے سرکاری اعداد و شمار کی رو سے ۲۳ گنا اضافہ کا دعویٰ کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ صرف ایک شماریاتی مغالطہ ہے۔

اسی ماہر کے نتائج مطالعہ کی روشنی میں ۱۹۴۵ اور ۱۹۵۶ کے درمیان اضافہ صرف تین گنا ہے، جب کہ سرکاری دعویٰ چار گنا اضافہ کا ہے۔

۱۹۵۶ میں حقیقی پیداوار میں اضافہ اصل دعویٰ شدہ اضافہ کا صرف ایک تہائی تھا اور کل قومی آمدنی میں اضافہ ۵ فی صد تھا، نہ ۱۱ فی صد۔

یہ تمام معلومات ایک روسی ماہر کی فراہم کردہ ہیں۔ اور اس کی ضرورت یوں پیش آئی کہ جب ۱۹۵۵ میں شماریات کے کام کو از سرِ نو منظم کیا گیا اور معاشی امور پر بحث و گفتگو کا آغاز کیا گیا تو اب تک کے کام کا جائزہ بھی ضروری ہو گیا۔ مصنف پیٹر وارشی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ اگر سال بہ سال شائع ہونے والی روسی شماریات کو لفظی طور پر مان لیا جائے تو مجموعی پیداوار میں اضافہ اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے جس کا دعویٰ خود سرکاری طور پر کیا جا رہا ہے! اس حساب سے روسی پیداوار کو برسوں سے پہلے امریکی پیداوار سے آگے نکل جانا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روسی ماہرین شماریات کو بار بار اپنے معیار اور اپنے اندازے میں ترمیم کرنی پڑتی ہے۔[۹۹]

روسی شماریات کے بارے میں اپنوں اور غیروں دونوں کی شہادتیں ہم نے پیش کر دیں۔ اب ہر طالب علم اور جویائے حق خود اندازہ کر سکتا ہے کہ ان کے بارے میں کتنی احتیاط کی اور کس درجہ دیدہ ریزی کے ساتھ تحقیق و تنقید کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر حقیقت کو افسانہ سے جدا نہیں کیا جا سکتا اور اصل کامیابیوں اور کارناموں کو ان لن ترانیوں سے ممیز نہیں کیا جا سکتا جو زیب داستان کے لئے شامل کر دی گئی ہیں۔

روس کی رفتارِ ترقی

اب ہم اس امر کا جائزہ لینے کی کوشش کریں گے کہ روس کی حقیقی رفتار ترقی کیا رہی ہے؟ اور دنیا کے دوسرے ممالک کے مقابلہ میں اس کی کیا حیثیت ہے؟

۹۹۔ "The Soviet World, ..."

ہم دیکھ چکے ہیں روسی ماہرین کا دعویٰ ہے کہ ۱۹۲۷ سے ۱۹۴۰ تک قومی آمدنی میں اضافہ کی رفتار ۱۶ فی صدی سالانہ تھی۔ دوسری جنگ کے بعد اضافہ کی رفتار کے بارے میں دعویٰ یہ ہے کہ اس کا اوسط ۱۱ فی صد سالانہ سے زیادہ تھا۔ پانچ سالہ اضافہ کا دعویٰ یہ ہے۔

۵۰-۱۹۴۵	۸۸	فی صد اضافہ
۵۵-۱۹۵۰	۸۴	"
۶۰-۱۹۵۵	۶۴	"
۶۵-۱۹۶۰	۴۸	"
۱۹۷۰ منصوبہ	۶۸	"

یہ اضافہ بہ نظر ظاہر بے حد متاثر کن ہے اور پہلی نگاہ میں ایک عام آدمی ان اعداد و شمار سے بے حد متاثر ہوتا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں نہ صرف یہ کہ روسی شماریات میں بڑی گڑبڑ اور تحریفات پائی جاتی ہیں[۵۷] بلکہ ان کا طریقہ کار بھی بہت خام اور رکمزوریوں سے بھرا ہوا ہے جن کی وجہ سے نتائج گمراہ کن ہوتے ہیں۔

مغربی اہل علم نے روس کی رفتار ترقی کے بارے میں روس ہی کے فراہم کردہ اعداد و شمار کے تجزیہ اور ان کی ترتیب نو سے جو نتائج نکالے ہیں وہ زیادہ قابل اعتماد ہیں اور ان کی بنیاد پر دوسرے ممالک کی رفتار ترقی سے زیادہ بہتر موازنہ ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہم چند اہم معاشی ماہرین کے نتائج تحقیق پیش کرتے ہیں۔

ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ابرام برگسان (Abram Bergson) کی تحقیقات کی روشنی میں کل روسی پیداوار مندرجہ ذیل زمانوں میں اس رفتار سے بڑھی ہے[۵۸]

---

[۵۷] اس کے تازہ ترین ثبوت کے طور پر ہم چند سال پہلے کے ایک قانون کا حوالہ دیں گے جسے خود حکومت کو اعداد و شمار کی صحت کے بارے میں نافذ کرنا پڑا اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہ تھی ابتدائی اداروں سے جو شماریات آرہی تھیں وہ خاصی غلط ہوتی تھیں اور چونکہ خود سرکاری منصوبہ بندی کا انحصار انہی اعداد و شمار پر ہے اس لئے اندرونی تحفظات کے لئے یہ قانون نافذ کرنا پڑا۔ آمرانہ نظاموں کو بھی کبھی کبھی اس کیفیت کا تجربہ ہو جاتا ہے کہ " میں ہوں خود اپنے ہی تیروں کا نشانہ " یہ قانون ۱۹ مئی ۱۹۶۱ء کو روس کی مرکزی مجلس وزراء اور کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے منظور کیا۔ اور اس کا نام دھوکے اور دھاندلی کے طریقوں کو روکنے اور منصوبوں کی تکمیل اور ان کے بارے میں رپورٹوں میں فراہم کردہ معلومات پر حکومت میں گرفت کو بڑھانے اور ان کو زیادہ قابل اعتماد بنانے کے بارے میں "

اس قانون کی رو سے غلط معلومات دینے والوں کو ۳ سال قید کی سزا تک دی جا سکتی ہے۔

[۵۸] [illegible]

۱۹۲۸ - ۳۷	۵.۰۵ تا ۵.۵	فی صد سالانہ
۱۹۵۰ - ۵۵	۷.۰۵ تا ۷.۰۶	فی صد سالانہ

۱۹۲۸ - ۳۷ کے بارے میں متعدد تحقیقی مطالعے موجود ہیں۔ ان کے روسی دعووں اور معاشین کے نتائج تحقیق کے فرق کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

	۱۹۲۸ - ۳۷ کے درمیان قومی آمدنی میں سالانہ رفتار ترقی
روس کا دعویٰ	۱۶ فی صدی
پروفیسر ناوم جاسنی کے نتائج[۲] ۱۹۲۶/۲۷ کی حقیقی قیمتوں کی بنیاد پر)	۹ - ۸ "
۱۹۳۰ کی عاملین کی لاگت کی بنیاد پر	۵ "
پروفیسر کولن کلارک[۳] بین الاقوامی یونٹوں میں۔	۴.۰۵ "
۱۹۲۸ کی برطانوی قیمتوں کی بنیاد پر[۴]	۵.۰۵ "
جولیس وائیلر ۱۹۴۸ کے ڈالروں میں[۵]	۵.۰۶ فی صد

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ روس ہی کے فراہم کردہ اعداد و شمار کو ان سائنسی طریقوں سے مرتب کرنے سے جو یورپ اور امریکہ میں مستعمل ہیں کتنا نمایاں فرق پڑ جاتا ہے۔

۲؎ Jasny Naum, "The Soviet Economy During the Plan Era" Stanford University Press, 1951, P. 95

۳؎ Clark, Colin, "The Conditions of Economic Progress" London, Second Edition, 1951 Chapt. IV

۴؎ Clark, Colin, "A critique of Russian Statistics," London, 1939, PP. 40-41, 68

۵؎ Wyler, Julius, and Crossman, Gregory, "National Income, Soviet Economic Growth", Ed. A. Bergson, 1953. P. 1

امریکہ کے ایک اور مطالعہ کی رو سے دوسری جنگ کے بعد حقیقی رفتار ترقی یہ رہی ہے [۱۰۶]

۱۹۵۰ - ۵۹	۷ فی صدی سالانہ
۱۹۵۹ - ۶۵	۶ فی صدی سالانہ

برگسن اسٹالن کے بعد (۱۹۵۳) سے ۱۹۶۱ تک کے بارے میں لکھتا ہے کہ آزاد محققین کی نگاہ میں اس زمانے میں قومی آمدنی میں سالانہ اضافہ ۶ فی صدی کے لگ بھگ تھا [۱۰۷]

سٹو کے قول کے مطابق بھی ۱۹۵۴ کے بعد رفتار ترقی ۶ فی صد سالانہ رہی ہے [۱۰۸]

اور فرینک او برین نے جو اعداد و شمار پیش کئے ہیں وہ یہ ہیں [۱۰۹]

روس میں کل پیداوار		میں اضافہ کی رفتار
۱۹۵۰ - ۵۸	(اوسط)	۶.۸ فی صدی
۱۹۵۸ - ۶۲		۴.۶ "
۱۹۶۰ - ۶۳		۳.۵ "

مغربی ماہرین کے نتائج کو صحیح مانا جائے تو روس نے بلاشبہ ترقی کی ہے، تیز رفتاری سے ترقی کی ہے، لیکن کسی غیر معمولی برق رفتاری کا ثبوت نہیں دیا ہے۔ اشتراکی پروپیگنڈے سے جو ایک طلسم قائم ہوتا ہے، زیادہ گہرائی میں جانے کے بعد اس کا اثر بہت کم ہو جاتا ہے۔ جس حد تک روس کامیاب ہوا ہے اس کا کھلے دل سے اعتراف ہونا چاہیے لیکن شماریات کا جھوٹا طلسم بہرحال ٹوٹنا چاہیے۔

روس اور دوسرے ممالک کی ترقی: تقابلی مطالعہ

ہم آگے بڑھنے سے پہلے اس غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ روس کی معاشی ترقی ایسی نادر رہی ہے کہ دنیا کے دوسرے

---

۱۰۶ "Comparisons of the United States and Soviet Economies" vide, Lebet, Cyril A: "The Economics of Competitive co-existence"

۱۰۷ Bergson, A; "The Great Economic Race: U.S.S.R. vs U.S.A." "Comparative Economic Systems" ed. Grossman, New Jersey, 64, P. 346

۱۰۸ [illegible] "The stage of Economic Growth" Cambridge, 1960, P. 102.

۱۰۹ O'Brien, Frank, "Crisis in World Communism", N.Y. 1965 P. 65

اشتراکی اہل قلم یہ مبالغہ آمیز دعوے کرتے رہتے ہیں کہ جس رفتار سے روس
ممالک کی معاشی ترقی کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی
یہ بات تاریخی اعتبار سے غیر صحیح ہے۔
نے ترقی کی ہے اس کی نظیر کہیں اور نہیں ملتی۔
اس سلسلہ میں پہلی بات یہ سمجھ لیجئے کہ اشتراکی اہل قلم بالعموم روس اور مغربی ممالک کی رفتار ترقی کا مقابلہ ایک ہی زمانے کے بارے میں کرتے ہیں جب کہ دونوں ترقیاتی نقطۂ نظر سے مختلف مراحل پر تھے۔ مثلاً ۴۰-۱۹۲۸ کے درمیان کا روس اور انگلستان ایک مقام پر نہ تھے۔ انگلستان میں صنعتی انقلاب ۱۷۶۰ میں شروع ہوا۔ ۱۸۳۰ میں مکمل ہوا۔ جب کہ روس میں یہ عمل بہت دیر سے شروع ہوا۔ مقابلہ مساوی زمانوں اور مرحلوں کا ہونا چاہیے "ترقی پذیری" (...) اور "بلوغ" (...) کے دور کا نہیں۔ اس نقطۂ نظر سے اگر موازنہ کیا جائے تو فرق ایسا نمایاں نہیں ہے۔ فرانسیسی مفکر برنارڈ دی جودینال (Bernard ...) صنعتی ترقی کے ستون لوہے کی صنعت کی مثال لے کرتا ہے کہ روس میں ۱۹۲۸ میں لوہے کی پیداوار ۵۰ لاکھ ٹن تھی جو ۱۹۵۴ تک ۴ کروڑ ۱۰ لاکھ ٹن ہوگئی۔ ۲۵ سال میں آٹھ گنا اضافہ۔ اسی زمانے میں امریکہ، برطانیہ اور جرمن میں اضافہ کی رفتار اس سے بہت کم تھی۔ لیکن امریکہ کی لوہے کی صنعت اپنے ترقیاتی دور میں اس سے پیچھے نہ تھی مثلاً ۱۸۹۶ سے ۱۹۱۶ تک اضافہ یہ تھا۔

۱۸۹۶	۵۳ لاکھ ٹن
۱۹۱۶	۴ کروڑ ۲۷ لاکھ ٹن

یعنی ۲۰ سال میں آٹھ گنا اضافہ۔[۱]

تقابلی مطالعہ کے سلسلہ میں کولن کلارک کا تحقیقی کام بڑا قیمتی اور ناقابل تردید ہے۔ موصوف کے مقرر کردہ بین الاقوامی یونٹوں کی شکل میں مختلف ممالک کی رفتار ترقی یہ رہی ہے۔[۲]

فی کس قومی آمدنی میں اضافہ ۱۸۷۰ — ۱۹۳۸

	۱۹۰۹-۱۳	۱۹۲۱-۲۴	۱۹۲۵-۲۸	۱۹۳۰-۴۰	۱۹۳۵-۳۸
نیوزی لینڈ	۴۰۴	۵۱۲	۵۵۰	۵۳۰	۶۱۰
امریکہ	۴۰۴	۵۰۶	۵۹۰	۴۳۸	۵۴۵

---

[۱] Jouvenel, Bernard de: "Some Fundamental Similarities between the Soviet and Capitalistic Economic Systems", The ... 1955. P. 13-15

[۲] Clark, Colin, ... 1960 ... Progress of ... 1951

برطانیہ	[illegible]	۴۰۳	۵۰۳	۴۸۸	۵۸۴
سویڈن	۱۶۵	۲۴۰	۲۷۵	۳۰۱	۳۶۷
جاپان	[illegible]	۷۲	۱۰۲	۱۱۳	۱۳۹
روس	۱۰۲	۵۷	۹۵	۹۰	۱۰۸

اس سے صاف نظر آتا ہے کہ ایک ہی زمانے میں بھی روس کی معاشی ترقی دوسروں کے مقابلہ میں کوئی غیر معمولی یا معجزاتی کیفیت نہیں رکھتی۔ سائمن کزنٹس نے دنیا کی معاشی ترقی کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ ان کے فراہم کردہ مواد سے یہ ضروری حقائق سامنے آتے ہیں[۱۱۳]

		رفتار ترقی (فی کس قومی آمدنی)		سالانہ اضافہ	
امریکہ	(۱۸۷۹ – ۱۹۳۸)	۳۸۱	فی صدی کا اضافہ	۴۰۸	فی صدی
برطانیہ	(۱۸۶۰ – ۱۹۳۹)	۲۳۱	"	۲۰۹	"
سویڈن	(۱۸۶۱ – ۱۹۳۸)	۶۶۱	"	۸۰۵	"

اس طرح صاف نظر آتا ہے کہ سویڈن کی رفتار ترقی پوری صدی پر پھیلانے کے باوجود روس سے زیادہ رہی ہے۔ جاپان کی رفتار ترقی کے بارے میں یہ مواد ملتا ہے۔

فی کس قومی آمدنی میں اضافہ کا اشاریہ

۱۸۷۸ – ۸۲	۱۰۰
۱۸۸۸ – ۹۲	۱۳۷
۱۹۰۸ – ۱۲	۲۲۰
۱۹۲۸ – ۳۲	۴۰۰
۱۹۳۸ – ۴۲	۵۲۶

جس کے معنی یہ ہیں کہ ۷۰ سال تک فی کس آمدنی میں ترقی کی رفتار ۱۰، فی صدی سالانہ تھی جو گذشتہ ۵۰ سال کی روس کی اوسط رفتار ترقی سے کہیں زیادہ ہے۔

اگر اہم اشیاء کو لیا جائے تو اہم ممالک کے ترقیاتی ادوار میں ان کی پیداوار کے اضافہ کی رفتار میں ایک خاص مماثلت اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ محض روس کی ترقی میں کوئی غیر معمولی کیفیت نہیں ہے۔ مثلاً کوئلہ کی پیداوار کو لیا جائے تو کیفیت یہ نظر آتی ہے۔

---

۱۱۳ [illegible], Simon, "Population, [illegible] and [illegible]" [illegible], "[illegible] to Economic [illegible]" [illegible], 1955. [illegible]

انگلستان ۱۸۷۰ ۸.۵ کروڑ ٹن
۱۸۹۰ ۱۸.۷۱ " "
۱۹۰۰ ۲۲.۵۱ " "
۱۹۱۳ ۲۸.۷۴ " "

امریکہ میں ۱۸۷۰ میں صرف ایک کروڑ ۴۴ لاکھ ٹن پیداوار تھی ۱۹۰۰ میں یہ ۲۶ کروڑ ۹ لاکھ ٹن ہو گئی اور ۱۹۲۳ میں ۵۶ کروڑ ۸۰ لاکھ ٹن ۔ روس میں ۱۹۱۳ میں پیداوار ۳ کروڑ ۹ لاکھ ٹن تھی ۔ ۱۹۳۳ میں ۷ کروڑ ۶۳ لاکھ ٹن اور ۱۹۳۸ میں ۱۲ کروڑ ۹۳ لاکھ ٹن ، ۱۹۵۲ میں یہ مقدار ۳۰ کروڑ ٹن اور ۱۹۶۳ میں ۵۳ کروڑ ٹن تھی ۔[113]

یعنی انگلستان میں ۴۳ سال میں ۳½ گنا اضافہ ہوا، امریکہ میں ۶۳ سال میں ۴۵ گنا اضافہ ہوا۔ جب کہ روس میں ۵۰ سال میں اضافہ تقریباً ۱۹ گنا ہے ۔

اس سے معلوم ہوا کہ اپنے اپنے ترقیاتی مرحلہ میں ہر ایک نے تیز رفتاری سے ترقی کی ہے اور کچھ ممالک کی رفتار روس کی رفتار سے تیز تر رہی ہے ۔ یہ دراصل ترقیاتی عمل کے مختلف پہلو ہیں، ان کو ایک خاص حد سے آگے بڑھ کر اشتراکیت کے حق میں استعمال کرنا غلط بحث سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا ۔

ہمارے اس موقف کی تائید دوسری اہم اشیاء کے اعداد و شمار سے بھی ہوتی ہے ۔ مثلاً خام لوہے کی پیداوار کو لیجئے ۔ انگلستان میں ۱۸۰۰ – ۱۸۱۰ کے درمیان اضافہ ۸.۰۱ فی صدی سالانہ تھا ۱۸۱۰ – ۲۰ میں ۸.۰۴ فی صدی سالانہ ۱۸۲۰ – ۳۰ میں ۵.۰۵ فی صدی سالانہ ۱۸۳۰ – ۴۰ میں ۷.۰۵ فی صدی سالانہ ۔ امریکہ میں ۱۸۶۰ – ۷۰ کے درمیان ۳.۷ فی صدی سالانہ ۱۸۷۰ – ۸۰ کے درمیان ۸.۷ فی صدی سالانہ ۱۸۸۰ – ۹۰ کے درمیان ۲.۹ فی صدی سالانہ ۔ کینیڈا میں ۱۸۹۰ – ۱۹۰۰ میں اضافہ کی رفتار ۱۶.۳ فی صدی سالانہ اور ۱۹۰۰ – ۱۹۱۰ کے درمیان ۲۲.۴۳ فی صدی سالانہ تھی ۔

اگر ان اعداد و شمار اور اس رفتار ترقی کا مقابلہ روس کے ترقیاتی دور کی رفتار سے کیا جائے تو اسے کسی پہلو سے غیر معمولی نہیں کہا جا سکتا ۔ مثلاً روس میں ۱۹۱۳ میں لوہے کی پیداوار ۴۲ لاکھ ٹن تھی ۔ ۱۹۲۸ میں بھی یہ پیداوار ۳۴ لاکھ ٹن ہی تھی ۔ ۱۹۶۳ء میں یہ بڑھ کر ۸ کروڑ ٹن ہو گئی ۔ یعنی ۵۰ سال میں تقریباً ۲۰ گنا اضافہ ہے ۔ کینیڈا میں صرف ۲۰ سال میں اضافہ تقریباً ۴۰ گنا تھا ۔ (۱۸۹۰ – ۱۹۱۰) اور امریکہ میں ۱۸۶۰ سے ۱۹۱۰ تک اضافہ ۳۲ گنا تھا ۔ دوسرے ممالک کی بھی یہی کیفیت ہے[114] ان حقائق کی روشنی میں صرف روس کی ترقی کو معجزاتی کیسے کہا جا سکتا ہے اور وہ اشتراکیت کے حق میں ایک دلیل کیسے بن سکتی ہے! اب تک کی بحث سے ہمارے سامنے یہ دو حقائق آئے کہ

(الف) روس کی رفتار ترقی وہ نہیں ہے جس کا اشتراکی دعویٰ کرتے ہیں ۔

---

[113] Vide, "Approaches to Economic Development", P. ...

[114] دوسرے ممالک کے تقابلی مطالعہ کے لئے ملاحظہ ہو بوکانن و ایلیس ۔ کتاب مذکورہ بالا باب ۱۱ ۔

(ب) اور اگر دلیل کی خاطر یہ بھی مان لیا جائے کہ رفتار ترقی وہی ہے تو وہ کوئی محیر العقول شے نہیں ہے۔ بلکہ دنیا کے مختلف ترقی یافتہ ممالک اپنے اپنے ترقیاتی دور میں اسی قسم کی رفتار ترقی حاصل کر چکے ہیں۔ خواہ کل صنعتی پیداوار کو لیا جائے اور خواہ اہم صنعتی مصنوعات کو الگ الگ۔

یہ تو تھا "ترقیاتی دور" کے بارے میں۔ اب اگر ایک ہی زمانہ کے بارے میں موازنہ کیا جائے تب بھی خوش فہمی کی وجہ نہیں ہے۔ ۱۹۲۸-۳۷ کے درمیان روس کی حقیقی آمدنی میں ۳۰ فی صدی کا اضافہ ہوا۔ سویڈن میں صرف ۱۹۳۲-۳۶ کے درمیان یعنی چار سال میں ۲۵ فی صدی اضافہ اور جرمنی میں ۱۹۳۲-۳۷ کے درمیان یعنی ۵ سال میں ۴۰ فی صدی اضافہ ہوا۔

یہی کیفیت دوسری جنگ کے بعد کے حالات کے مطالعہ سے ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس دور میں روس کی رفتار ترقی کے مقابلہ میں متعدد دوسرے ممالک نے زیادہ تیز رفتاری سے ترقی کی ہے حالانکہ وہ بھی دوسری جنگ سے اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ متاثر ہوئے تھے اور ان کے قدرتی اور انسانی وسائل روس سے بدرجہا کم تھے۔

دوسری جنگ کے بعد سے ۱۹۶۵ تک کے بارے میں جو روسی اعداد و شمار شائع کئے گئے ہیں ان میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ رفتار ترقی ۱۲ فی صدی سالانہ سے ۱۰ فی صدی سالانہ تک رہی ہے۔ اور مغربی ماہرین کی رائے ہے کہ اضافہ ۶ فی صدی سالانہ رہا ہے۔ ایک روسی ماہر معاشیات پروفیسر استرومیلین ([illegible] Strumilin) نے روسی شماریات سے اختلاف کیا ہے اور ۱۹۶۰-۶۲ کے بارے میں حساب لگا کر دکھایا ہے کہ اس میں رفتار ترقی ۸ فی صد سے زیادہ نہ تھی۔ یہ خود ایک اشتراکی ماہر معاشیات کی شہادت ہے۔[116]

اب یہ دیکھئے کہ اس زمانے میں دوسرے ممالک کی کیفیت کیا تھی۔

	۱۹۵۰-۵۸		۱۹۵۸-۶۲	
جاپان	۶.۱	فی صد سالانہ	۱۳.۲	فی صد سالانہ
جرمنی (مغربی)	۶.۲	″	۴.۲	″
اٹلی	۵.۶	″	۶.۲	″

---

[115] جاپان کی کل صنعتی پیداوار ۱۸۹۱-۹۵ سے ۱۹۰۱-۱۹۰۵ تک ۶.۱ فی صدی سالانہ بڑھی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

[116] استرومیلین کے مضمون کے نتائج کو پروفیسر ہیری شوارز نے اپنے ایک مضمون میں پیش کیا ہے جو نیویارک ٹائمز میں ۱۵ ستمبر ۱۹۶۳ کو شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں دکھایا گیا کہ روسی ماہر کی رو سے ۱۹۶۰ میں روس کی پیداوار امریکی پیداوار کا ۵۰ فی صدی نہ تھی جیسا کہ سرکاری طور پر دعویٰ کیا گیا ہے بلکہ ۱۹۶۰ میں ۱۸ فی صدی تھی اور ۱۹۶۲ میں یہ بڑھ کر صرف ۶۲ہ۸ ہوئی۔ اس رفتار سے روسی معیشت امریکی معیشت کی برابری ۱۹۷۰ میں (جیسا کہ خرشیف نے کہا تھا) نہیں کر سکتی بلکہ ۲۰۰۰ء کے بعد کر پائے گی۔ یہ نتائج ٹھیک روس میں شائع ہوئے ہیں، مغربی اہل قلم کی اختراع نہیں ہیں۔ ملاحظہ ہو۔ فرینک اوبرائن "Communism [illegible]" صفحہ ۳۲

سوال یہ ہے کہ یہ ممالک اگر اس رفتار، بلکہ اس سے تیز رفتار سے ترقی کر سکتے ہیں جس سے اشتراکی روس نے ترقی کی ہے تو پھر روس کی ترقی اشتراکیت کے حق میں کس طرح ایک دلیل بن سکتی ہے اور ان ممالک کی ترقی نہ ان کی مخلوط معیشت کے حق میں کوئی دلیل ہو سکتی ہے اور نہ اشتراکیت کے "معجزہ" کا کوئی جواب![۱۱۵]

موازنہ کے چند اور پہلو

ان پہلوؤں کے مطالعہ کے بعد ہم اس حقیقت کو سامنے لانا چاہتے ہیں کہ خود روس میں سرکاری اعداد و شمار کی روشنی میں جو نئے رجحانات کارفرما ہیں وہ ہرگز خوش آئند نہیں کہے جا سکتے۔ اشتراکی معیشت بھی ان پیچیدگیوں سے دوچار ہے جن سے بلوغ اور پختگی کے مراحل میں داخل ہونے کے بعد سرمایہ دارانہ معیشت دوچار ہوئی تھی۔ ہم صرف چند پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مجموعی قومی پیداوار کے بارے میں سرکاری اعداد و شمار سے جو صورت حال سامنے آتی ہے اس پر صرف ایک نگاہ ڈال لیجئے[۱۱۶]

زمانہ	سالانہ اضافہ (فی صدی)	پنج سالہ مجموعی اضافہ (فی صدی)
۱۹۴۵ - ۵۰	—	۸۸
۱۹۵۱	۱۶	
۱۹۵۲	۱۲	
۱۹۵۰ - ۵۵		۸۵
۱۹۵۶	۱۱	
۱۹۶۰	۱۰	
۱۹۵۵ - ۶۰		۶۴
۱۹۶۱	۹	
۱۹۶۲	۸٫۵	
۱۹۶۰ - ۶۵		۴۸

یعنی سالانہ اضافہ کی رفتار ۱۲ سال میں نصف رہ گئی ہے۔ اسے اتفاقی چیز بھی نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ ہر سالہ اعداد و شمار

---

۱۱۵ اس سلسلہ میں جرمنی، اٹلی اور فرانس کی مثالوں کے تفصیلی مطالعہ کے لئے ملاحظہ ہو۔
Hennessy, [illegible], "Economic [illegible]" Institute of Economic Affairs, [illegible], [illegible].

۱۱۶ vide, Ingram, David, "The Communist Economic [illegible]", Allen & Unwin, London, [illegible], [illegible].

کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ تنزل کا رجحان کارفرما ہے۔

یہ تو ہے عمومی رجحان۔ اگر سرکاری اعداد و شمار کا مزید تجزیہ کیا جائے ایک ایک صنعت کا مطالعہ کیا جائے تو وہاں بھی یہی رجحان کارفرما نظر آتا ہے۔ اس سلسلہ میں چند اہم صنعتوں کے بارے میں سادی دعوے یہ ہیں۔ (حاشیہ الف)

اشیائے پیداوار	رفتار اضافہ کا رجحان		
	۱۹۴۶-۵۰	۱۹۵۱-۵۵	۱۹۵۶-۵۸
بجلی	۱۶٫۰۶	۱۳٫۲۹	۱۱٫۰۳
کوئلہ اور لگنائٹ	۱۱٫۸۲	۸٫۴۲	۸٫۲۱
لوہا	۱۶٫۲۸	۱۰٫۶۶	۶٫۶۲
سیمنٹ	۴۰٫۷۶	۱۶٫۱۴	۱۳٫۹۹
اشیائے صرف			
کاغذ	۳۰٫۰۲	۹٫۳۲	۵٫۷۰
روئی کا کپڑا	۱۹٫۲۴	۸٫۶۵	-۰٫۹۹
اونی کپڑا	۲۳٫۶۹	۱۰٫۲۱	۶٫۳۰
چمڑے کے جوتے	۲۶٫۳۷	۶٫۱۵	۹٫۰۸
شکر (خام)	۴۰٫۲۵	۶٫۲۵	۱۶٫۴۵

یہ اعداد و شمار اس رجحان کی تائید اور تشریح کرتے ہیں جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ ۲ سال میں روس کی اشتراکی معیشت میں سست روی کا رجحان رونما ہو گیا ہے اور برابر اس میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ۲۱ ویں کانگریس نے اپنی ہدایات میں کہا تھا کہ "پیداوار کے بہت سے دائروں میں نئی سائنسی اور فنیاتی ترقیات و ایجادات کے نافذ کرنے میں برابر تاخیر ہو رہی ہے۔ زراعت، صنعت، رسل و رسائل اور تعمیرات میں میکانیت اور خودکاری کے فروغ کا نظام غیر تسلی بخش ہے۔" (حاشیہ ب)

اور پریذیڈیم کے ایک رکن آرسٹوو (Aristov) نے مرکزی کمیٹی کے اجلاس کے موقع پر اعتراف کیا تھا کہ

"ہماری معیشت میں بہت سی چیزیں ہیں جو پس ماندہ ہیں۔ کبھی کبھی تو اپنی صنعت میں پرانی اور دقیانوسی تکنیکی عمل کو جاری دیکھ کر انسان شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہے۔ اس طرح ہماری محنت کے اصول کو ہاتھ سے جاتے ہوئے دیکھ کر اور پیداوار کی کمی پر نظر کر کے آدمی کٹ کٹ جاتا ہے۔ اس کی ذمہ داری ہماری مشینی صنعت کے مختلف ڈائرکٹروں پر عائد ہوتی ہے۔" (حاشیہ ج)

حاشیہ الف "The Soviet World", op. cit. P. 158

حاشیہ ب ibid, p. 21

حاشیہ ج ibid, p. 21

اس حقیقت کا ایک اور ثبوت فی مزدور پیداوار میں کا مفر مار رجحانات ہیں۔ فی مزدور پیداوار میں بھی جس تناسب سے اضافہ کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ وہ لائق مطالعہ ہے۔ سرکاری اعداد و شمار یہ ہیں۔ [۱۱۹]

سال		سال	
۱۹۵۰	۱۳ فی صدی	۱۹۵۷	۷ فی صدی
۱۹۵۱	۱۰ 〃	۱۹۵۸	۶ 〃
۱۹۵۲	۷ 〃	۱۹۵۹	۷ 〃
۱۹۵۳	۷ 〃		
۱۹۵۴	۸ 〃	۱۹۶۰	۵ 〃
۱۹۵۵	۹ 〃	۱۹۶۱	۴ 〃
۱۹۵۶	۷ 〃	۱۹۶۲	۶ 〃

اس سے معلوم ہوا کہ اگر ۱۹۵۰ میں ہر مزدور کی پیداوار میں ۱۳ فی صدی سالانہ کے اضافہ کا دعویٰ تھا تو ۱۹۶۲ میں یہ صرف ۵ فی صدی سالانہ تھا۔ اس طرح یہاں بھی ترقی کی رفتار سست پڑ گئی ہے۔ اور یہ اس حالت میں ہے جب اس زمانے میں فنی انقلاب آیا ہے اور خودکار مشینوں ([illegible]) کو رواج دیا گیا ہے۔ یہ تمام اعداد و شمار ہوا کا کیا رخ بتا رہے ہیں؟ اسے سمجھنے کے لئے معاشیات میں کسی فنی مہارت کی ضرورت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روس میں سرمایہ کی پیدا آوری برابر کم ہو رہی ہے اور اب ایک خاص تناسب میں اضافہ کے لئے پہلے سے زیادہ سرمایہ کاری کی ضرورت پیش آ رہی ہے۔ [۱۲۰] منصوبے بار بار بن رہے ہیں اور حالات کی چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو رہے ہیں۔ چھٹے پنج سالہ منصوبہ (۶۰-۱۹۵۶) کو ۱۹۵۷ میں معطل کر دیا گیا اور اعتراف کیا گیا کہ اس میں تخمینے بڑے غلط اور ناقابل عمل تھے۔ ۶۵-۱۹۵۹ کے لئے ایک سات سالہ منصوبہ

---

[۱۱۹] حوالہ مذکورہ بالا۔ صفحہ ۴۵

[۱۲۰] روس اور چند دوسرے ممالک میں فی کس قائم سرمایہ کاری ([illegible]) کا جو تناسب فی کس کل پیداوار سے ہے وہ اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے۔

ملک	سرمایہ کاری بطور فی کس پیداوار کے تناسب کے ۱۹۵۰-۶۰	۱۹۶۲
فرانس	۲۰٫۸ فی صدی	۱۶٫۲ فی صدی
جرمن	۲۵٫۴ 〃	۲۵٫۸ 〃
اٹلی	۲۲٫۹ 〃	۲۱٫۱ 〃
انگلستان	۱۶٫۸ 〃	۱۶٫۳ 〃
امریکہ	۱۷٫۷ 〃	۱۵٫۹ 〃
روس	۲۳٫۹ 〃	۳۲٫۲ 〃

(بحوالہ اوبرائن 'عالمی اشتراکیت کا بحران' جدول ۱ کالم ۱۰-۱۱ صفحہ ۷۹)

بتایا گیا لیکن اسے بھی ۱۹۶۲ میں اور پھر ۱۹۶۳ میں بنیادی طور پر بدل دیا گیا۔ بالآخر سات سالہ منصوبوں کے سلسلہ کو ہی ترک کر دیا گیا اور دوبارہ پنج سالہ منصوبے کی طرف مراجعت کی گئی۔

یہ حقائق اس بات کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں کہ اشتراکی دنیا میں بھی معاشی نشیب و فراز اپنا وجود منواتے ہیں!

دوسری اہم چیز روسی معیشت کی پیداآوری اور کارکردگی ہے۔ اصل چیز محض کل پیداوار کا اضافہ نہیں بلکہ معیشت کی حقیقی صلاحیت اور کارکردگی کی ترقی ہے۔ خود لینن نے ایک مقام کی فوقیت کے لئے اس کی کارکردگی کو معیار مانا تھا۔[121] اس پہلو سے روسی معیشت نے کوئی اعلیٰ مثال قائم نہیں کی۔ گو روسی معیشت کی پیداآوری میں برابر اضافہ ہوا ہے لیکن اشتراکیت سے قبل کے ۸۰ سال اور اشتراکیت کے بعد کے ۵۰ سال کی جدوجہد کے باوجود وہ ابھی مغربی معیارات سے بہت پیچھے ہے روسی مصنوعات کی کوالٹی بھی فروتر ہے اور فی کس پیداآوری اور کارکردگی میں کم تر۔ پہلے پیداآوری اور کارکردگی کو لیجئے۔ روس کے ماہرین شماریات کی رو سے ۱۹۶۲ میں روسی صنعت کی پیداآوری امریکہ کے مقابلہ میں ۴۵ سے ۵۰ فی صدی تھی۔[122] مغربی ماہرین کی رائے یہ ہے کہ پیداآوری اس سے بھی کم ہے اور اوسطاً ایک تہائی کے لگ بھگ آتی ہے۔[123] اسی طرح روسی شماریات کے مطابق زراعت میں ۶۲-۱۹۶۰ میں روس کی پیداآوری امریکہ سے ۳ سے ۵ گنا کم ہے۔ ایک من غلہ پیدا کرنے کے لئے روس کے اجتماعی کھیت پر ایک کسان کو ۳ء۷ گنا زیادہ وقت اور محنت صرف کرنی پڑتی ہے اور ایک ٹن گائے کے گوشت کے لئے ۴ء۱۲ گنا زیادہ وقت اور محنت۔[124]

یہ تو تھا روسی ماہرین کا اعتراف۔ اب مغربی معاشیین کی تحقیقات کو لیجئے۔ کولن کلارک کے حساب کے مطابق گو روس کی زرعی آبادی کی گنجائش کم ہے لیکن ۱۹۳۸ میں چین اور ہندوستان کے سوا اس کی زرعی پیداآوری دنیا میں سب سے کم تھی۔ بین الاقوامی اکائیوں میں نیوزی لینڈ کی پیداآوری ۲۲۴۴ یونٹ تھی آسٹریلیا کی ۱۵۲۴ امریکہ کی ۶۶۱ برطانیہ کی ۴۷۵ جاپان کی ۱۲۰ اور روس کی صرف ۸۸۔[125] کیمبرج کے مشہور اشتراکی اہل قلم اور روسی معیشت کے ماہر پروفیسر موریس ڈوب نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے محنت کی پیداآوری منصوبے کے مطابق نہیں بڑھی بلکہ بمشکل اصل ہدف کا ۸۰ فی صدی حاصل کر پائی۔[126]

---

[121] بحوالہ۔ ہیرلڈ مارشی۔ دی سویٹ مڈل۔ صفحہ ۱۳۵ اسی بات کو خروشیف نے اشتراکی پارٹی کے تیسرے پروگرام (۱۹۶۱) کو بیان کرتے ہوئے دہرایا۔

[122] Narodnoe Khozyaistvo SSSR v 1962 godu, p. [illegible], "Economic Systems in Action" p. [illegible]

[123] Schroeder, G.; "Soviet Industrial Labour Productivity" [illegible] Joint Econ. Committee [illegible] Dimensions of Soviet Economic Power [illegible] Washington, U.S. [illegible]

[124] [illegible] Economic Systems in Action [illegible]

[125] Clark, [illegible] Economic Progress [illegible]

[126] Dobb, Soviet Economic Development Since 1917, [illegible]

[127] واضح رہے کہ ایک روبل تقریباً ایک روپیہ ۲۰ پیسے کے برابر، ایک مارک تقریباً ایک روپیہ ۲۰ پیسے کے برابر، ایک ڈالر تقریباً ساڑھے چار روپے کے برابر اور ایک روبل دنیا میں تقریباً چار سو پیسے کے برابر ہوتا ہے۔

پیدا آوری کا اندازہ کرنے کے لئے ایک اہم طریقہ یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ ایک ملک کے مزدور کو ایک خاص چیز کرنے کے لئے دنیا کے مختلف ممالک میں کتنے گھنٹے محنت کرنی پڑتی ہے۔ اس سے کارکردگی کا علم بھی ہو جاتا ہے اور وہاں کے عام آدمی کے معیار زندگی کا بھی۔ اس سلسلہ میں متعدد اہم مطالعے موجود ہیں۔ ہم ایک تازہ ترین مطالعہ کے نتائج پیش کرتے ہیں جسے ایک جرمن مفکر اور سفارتی نمائندہ پال دی ہیوسی نے مرتب کیا ہے[۱۲۷]

اشیاء	فرانس		مغربی جرمنی		امریکہ		روس	
فی گھنٹہ اجرت	۳٫۳۵ فرینک		۳٫۱۸ مارک		۲٫۳۲ ڈالر		۵٫۴۲ روبل	
روٹی	گھنٹہ	منٹ	گھنٹے	منٹ	گھنٹے	منٹ	گھنٹے	منٹ
۵ کلوگرام	—	۱۱	—	۸٫۵	—	۶	—	۹٫۵
دودھ (ایک لیٹر)	—	۱۱	—	۱۳	—	۷	—	۱۳
مکھن ایک کلوگرام	۴	۵۱	۳	۴۷	—	۴۳	۶	۴۰
انڈا ۱۰ عدد	—	۴۸	—	۴۷	—	۱۱	۱	۵۴
گائے کا گوشت ۱ کلوگرام	۱	۱۵	۱	۵۴	—	۴۰	۲	۵۱
آلو ۶	—	۴	—	۹	—	۳	—	۱۴
مردانہ سوٹ ۱	۶۶	۳۷	۴۵	۲۷	۲۳		۴۶۵	
مردانہ قمیص ۱	۶	۱۹	۵	۱۲	۱	۳۵	۳۵	۴۵
مردانہ جوتا ایک جوڑا	۱۶	۱	۱۱	۳۰	۴	۳۱	۴۷	۱۶
نائیلون جراب ایک جوڑا	۲	۳۴	۱	۸	—	۲۹	۷	۹
عورتوں کا لباس ایک سوٹ	۱۸		۱۰	۴	۴	۲۸	۷۹	
عورتوں کا جوتا ایک جوڑا	۱۳	۵۵	۷	—	۵	۱۰	۵۴	۴۵

اس جدول کے مطالعہ سے صاف اندازہ ہو جاتا ہے کہ تقریباً تمام اشیائے ضرورت کی تیاری پر روس میں دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے مقابلہ میں کہیں زیادہ وقت اور محنت درکار ہوتی ہے اور جو اجرت مزدور کو ملتی ہے اس میں اس کے لئے ان چیزوں کا حصول کتنا دشوار ہوتا ہے۔

[۱۲۷] Hovesy, Paul de; "The Unification of the World" [illegible]

یہ ہے اشتراکی معیشت میں کارکردگی کی حیثیت۔ جس وقت اس کا موازنہ دنیا کے دوسرے ممالک سے کیا جاتا ہے، اس وقت صرف پیداوار کے کل حجم (Size) ہی کو دیکھنا کافی نہیں ہے "رفتارترقی" پیداوار کے طویل المدت رجحان اور صنعت اور محنت کی پیداآوری اور کارکردگی کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ اور جب ہم ان تمام حقائق کو سامنے رکھتے ہیں تو اشتراکی معیشت ۵۰ سال کے غیر منقطع تجربہ کے بعد بھی کوئی اعلیٰ معیار پیش کرنے میں ناکام ہے!

اس صورت حال کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ایک مرکزی منصوبہ بند معیشت میں جس میں سارے وسائل پیداوار سرکاری تحویل میں لے لیے گئے ہوں اور سارے معاشی فیصلے ایک مرکزی ادارے کے ذریعے کیے جاتے ہوں وہ لچک "تغیر پذیری اور مطابقت پذیری نہیں ہو سکتی جو معیار کارکردگی کو بڑھانے کے لیے ضروری ہے۔ روسی معیشت کے پچاس سال اس پیچیدگی کا کھلا ثبوت ہیں۔

معاشی ترقی میں اشتراکیت کا حصہ

اب تک ہم نے اس موضوع سے بحث کی ہے کہ اشتراکی تجربہ نے عملاً کیا کچھ حاصل کیا اور آیا اس کی کوئی امتیازی حیثیت ہے یا نہیں۔ حالات کا غیر جانب دارانہ مطالعہ ہمیں اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ روس نے اشتراکیت کے تحت بلاشبہ ترقی کی ہے، لیکن یہ ترقی دنیا کے دوسرے ممالک کے تجربات سے جوہری اعتبار سے بہت مختلف نہیں ہے اور نتائج میں بھی کوئی غیر معمولی شان نہیں ہے لیکن اب ہم ایک اور بنیادی سوال اٹھانا چاہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ جو کچھ حاصل کیا گیا ہے، کیا وہ اشتراکیت کا نتیجہ ہے یا اس کے کچھ اور اسباب بھی ہیں۔ ہم اس سلسلہ کے ضروری نکات اہل نظر کے غور و فکر کے لیے پیش کرتے ہیں اور ان کو دعوت دیتے ہیں کہ ان کی روشنی میں پورے معاملہ کا مطالعہ کریں۔

(۱) کسی ملک کی معاشی ترقی کے مطالعہ میں سب سے پہلے اس بات کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے کہ اس کے پاس قدرتی وسائل اور محنت کی فراوانی ہے یا قلت۔ بلاشبہ شعوری کوشش، منصوبہ بندی اور قومی سعی و جہد کو بڑا اونچا مقام حاصل ہے لیکن قدرتی وسائل کے فرق سے رفتار ترقی غیر معمولی طور پر متاثر ہو جاتی ہے۔ اس پہلو سے روس نہایت خوش نصیب ہے۔ اس کا رقبہ تقریباً ۲ کروڑ ۲۳ لاکھ مربع کلومیٹر ہے۔ اس کے مقابلہ میں امریکہ کا رقبہ جو مغربی ممالک میں سب سے بڑا ہے ۹۳ لاکھ مربع کلومیٹر اور چین کا رقبہ جو روس کے بعد سب سے بڑا ملک ہے ۹۵ لاکھ مربع کلومیٹر ہے۔ بات صرف رقبہ کی نہیں، معدنی دولت کے اعتبار سے روس دنیا کے سارے ممالک کے مقابلہ میں زیادہ امیر ہے[۳۸] قابل کاشت زمین اس کے پاس سب سے زیادہ ہے اور آبادی کے اعتبار سے بھی روس دنیا کا تیسرا بڑا ملک ہے۔ ۱۹۶۲ء میں اس کی آبادی ۲۲ کروڑ تھی۔ اسی طرح صنعتی صلاحیت کے اعتبار سے وہ دنیا کے تمام ممالک پر فوقیت رکھتا ہے۔ ان

[۳۸] ایک اندازے کے مطابق دنیا کے کل کوئلہ کے ذخائر کا ۵۰ فی صدی، پگھلنے والی دھاتوں کے ذخائر کا ۴۰ فی صدی اور جنگلات کا ۳۳ فی صدی روس کے پاس ہے۔
ملاحظہ ہو۔ 'The Soviet World', op. cit. p. 46.

وسائل کو جو نظریہ، جو حکومت اور جو نظام بھی استعمال کرے یہ اس کے خادم ہوں گے۔ اشتراکیت کو اپنے تجربے کے لئے ایک ایسا ملک ملا جو اس پہلو سے مفید ترین تھا۔ لیکن ایک دقیق النظر طالب علم کو قدرتی وسائل کی موزونی اور نظریہ اور نظام کی کارکردگی کے باریک فرق کو اپنے سامنے رکھنا چاہیئے۔

۲۹۔ روس میں اشتراکیت نے جس وقت اپنے کردار کا آغاز کیا ہے اس وقت وہ آج کے پس ماندہ ممالک کی طرح ایک غریب، غیر صنعتی اور پس ماندہ ملک نہ تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ یورپ کے دوسرے ممالک سے پیچھے تھا، یہ بھی صحیح ہے کہ وہاں سرمایہ داری اپنی پختگی (۱۷۶۸ تا ۱۸۲۶ء) کو نہیں پہنچی تھی۔ اور صنعتی انقلاب کا عمل ابھی مکمل نہیں ہوا تھا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ صنعتی ترقی وسط انیسویں صدی سے شروع ہو گئی تھی۔ ۱۸۶۰ کے قانون کی رو سے زمینداری اور جاگیرداری سے نجات حاصل کر لی گئی تھی۔ اور صنعتی ترقی شروع ہو گئی تھی۔ ۱۹۱۳ میں روس صنعتی ممالک کے دائرہ میں داخل ہو گیا تھا۔ ۱۸۵۰ میں ریلوے لائن صرف ۵۰۰ کلومیٹر تھی لیکن ۱۹۱۳ تک یہ ۷۳ ہزار کلومیٹر ہو گئی تھی۔ لوہے کی پیداوار ۴۹ لاکھ ٹن سے متجاوز تھی۔ مینگا نیز کی پیداوار ۱۲½ لاکھ ٹن، کوئلہ کی ۳ کروڑ ٹن تھی۔ روئی کا زیر کاشت رقبہ صرف ۲ سال میں ساڑھے ۷ لاکھ ایکڑ سے ۱۲½ لاکھ ایکڑ ہو گیا تھا۔ ۱۸۰۶ میں روس کی بیرونی تجارت ۹۱½ کروڑ طلائی روبل تھی۔ لیکن ۱۹۱۳ میں یہ ۱۲ ارب ۹۱½ کروڑ روبل تھی۔ نیز ۱۹۱۳ میں برآمدات کا ۳۰ فی صدی صنعتی اور نیم صنعتی مصنوعات پر مشتمل تھا۔ صنعتی پیداوار کے اعتبار سے روس ۱۹۱۳ میں دنیا میں پانچویں نمبر پر تھا۔ ۱۸۹۸ اور ۱۹۱۳ کے درمیان ۱۵ سال میں صنعتی پیداوار میں ۱۰۰ فی صدی کا اضافہ ہوا تھا۔[۱۳۱] ایک تخمینہ کے مطابق قبل اشتراکیت کے صنعتی دور میں قومی پیداوار میں سالانہ رفتار ترقی یہ تھی۔[۱۳۲]

۱۸۸۵—۱۸۸۹	۶٫۱۰	فی صدی سالانہ
۱۸۹۰—۱۸۹۹	۸٫۰۳	"
۱۹۰۰—۱۹۰۶	۱٫۴۳	"
۱۹۰۷—۱۹۱۳	۶٫۲۵	"

امریکی ماہر معاشیات ہیری شوارز کا خیال ہے کہ ۱۸۸۵ — ۸۹ اور ۱۹۰۷ — ۱۳ کے درمیان پیداوار میں اوسط سالانہ اضافہ ۸ فی صدی سے زیادہ رہا ہے۔ جو اس وقت کے امریکہ، برطانیہ اور جرمنی تینوں کی رفتار ترقی سے زیادہ تھا۔[۱۳۳]

۱۳۱۔ See: De Costa, *The Economic Progress of Russia op. cit.*, pp. 5-6; Buchamin and Ellis, *Approaches to Economic Development, op. cit.*, pp. 190-193; Hevesy, *The Unification of the World, op. cit.*, p. 97:

۱۳۲۔ Gerschenkron, Alexender, "The Rate of Industrial Growth in Russia Since 1875", *Jaurnal of Economic History*, Supplement VII, 1947, pp. 145-46.

۱۳۳۔ Russian Soviet Economy, 94, P. 65.

اشتراکی اہل علم اس معاشی پس منظر کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ وہ یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ روس کی خارجی صنعتی ترقی اشتراکیت کی کامیابی کے بعد ہوئی ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اشتراکیت کو ایک قیمتی اثاثہ ورثہ میں ملا، اور اس نے اس نامکمل تعمیر پر مزید اضافہ کا کام انجام دیا۔ جو کچھ اشتراکیت کے دور میں حاصل ہوا ہے اس کا اعتراف ضروری ہے، لیکن جس بنیاد پر اس نے کام شروع کیا اسے کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟ اور جو کچھ اشتراکیت سے پہلے حاصل کیا جا چکا تھا اسے اشتراکیت کے حساب میں کیسے جمع کیا جا سکتا ہے؟

(۱۱۱) یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پس ماندگی کے جہاں نقصانات ہیں، وہاں اس کے کچھ روشن پہلو بھی ہیں، اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایک ملک میں جس درجہ میں پس ماندگی پائی جاتی ہے، اتنے ہی ترقی کے امکانات پوشیدہ ہیں۔ پس ماندگی سے پختگی کی طرف زیادہ تیز رفتاری سے جایا جا سکتا ہے۔ جب کہ پختگی کے حصول کے بعد رفتار ترقی کو تیز تر رکھنا زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ اس کی مثال پودے کی سی ہے۔ پودا اپنی اصل قامت تک زیادہ تیز رفتاری سے پہنچے گا، لیکن ایک بار وہ قامت حاصل کرنے کے بعد پھر اس کے بڑھنے کی رفتار کم ہوگی۔ جس طرح ایک بچہ بلوغ تک پہنچتے پہنچتے تیزی سے بڑھتا ہے اور اس کے بعد اس کے قد و قامت میں اضافہ نہیں ہوتا اور وہ ارتقاء کی دوسری راہیں تلاش کرتا ہے، اس طرح ایک پس ماندہ معیشت کے لئے بھی ایک خاص دور میں زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ مراحل ترقی طے کرنا ممکن ہوتا ہے۔ روس نے بھی اب تک پس ماندگی کے ان امکانات سے فائدہ اٹھایا ہے اور آئندہ اس کے لئے رفتار ترقی کو قائم رکھنا مشکل ہو رہا ہے۔

(۱۷) اسی طرح معاشی دوڑ میں بعد میں شریک ہونے کا یہ فائدہ ہے کہ معلوم ٹیکنالوجی سے وہ ملک پورا پورا فائدہ اٹھا سکتا ہے اور جس راستے کو اوروں نے صدیوں میں طے کیا تھا اسے وہ برسوں میں طے کر سکتا ہے۔ وہ علم و تحقیق اور ایجاد و اختراع کے پکے پھلوں سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور جہاں دوسروں نے ٹھوکریں کھائی تھیں ان مقامات سے پیشگی آگہی حاصل کر کے زیادہ آسانی سے راستہ طے کر سکتا ہے۔ روس کو بھی یہ فائدہ حاصل رہا ہے اور اس کا سہرا اشتراکیت کے سر نہیں باندھا جا سکتا۔ ہر وہ ملک جو اس دوڑ میں بعد میں شرکت کرے گا اپنے پیش روؤں کے تجربات سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ اور جرمنی کی کارکردگی انگلستان سے بہتر تھی۔ جاپان نے ان مراحل کو اور بھی سبک رفتاری سے طے کیا۔ آج کے پس ماندہ ممالک تازہ ترین مشینوں سے استفادہ کر رہے ہیں۔ اور اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کے پلانٹ لگا رہے ہیں۔ روس نے بھی اپنے دور کے دوسرے ترقی یافتہ ممالک سے پورا پورا استفادہ کیا اور ہر سفر کو از سرِ نو شروع نہیں کیا۔ یہ پہلو بھی ایسا ہے کہ اس سے حاصل کئے ہوئے فوائد کو اشتراکیت کے حساب میں جمع نہیں کیا جا سکتا۔

(۷) اشتراکیت کے تحت جو معاشی ترقی ہوئی ہے اگر اس کے اسباب اور محرکات کا زیادہ گہرائی میں جا کر مطالعہ کیا جائے تو بڑے حیران کن نتائج سامنے آتے ہیں۔ روسی اشتراکیت نے معاشی ترقی کے میدان میں ان بنیادی اصولوں اور عوامل (processes) سے کوئی بنیادی انحراف نہیں کیا جو سرمایہ دارانہ ممالک میں کارفرما نظر آتے ہیں خصوصیت سے پیداوار اور ترقیات (development) کے دائروں میں اشتراکیت کا اپنا مخصوص کارنامہ بہت ہی محدود ہے۔ اشتراکیت نے جو کچھ کیا وہ یہ تھا:

(الف) معیشت کو ایک مرکزیت عطا کی اور اس مرکزیت میں ایک نظریہ کو کم از کم زبانی حد تک مرکزی اہمیت دی۔
(ب) وسائل پیداوار میں سے بیشتر کو آہستہ آہستہ قومی ملکیت میں لے لیا۔
(ج) تنظیمی اعتبار سے بنیادی تغیرات کئے اور ساری معاشی سرگرمی کو مرکزی منصوبہ کا پابند بنایا۔
(د) جو معاشی حکمت عملی اختیار کی وہ یہ تھی۔
— صنعت، تجارت اور بنکاری کی قومی ملکیت
— زراعت کو اجتماعی کاشت کے نظام میں منظم کرنا
— منصوبہ بندی
— بھاری صنعت کو اولیت دینا اور پوری معیشت کو اس کی ترقی سے وابستہ کر دینا

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ساری تبدیلیاں تنظیمی اور ہئیتی نوعیت (structural) کی ہیں۔ لیکن ترقی کے لئے جو بنیادی عوامل اور اصول اختیار کئے گئے وہ سرمایہ دارانہ نظام کے طریقوں سے مختلف نہ تھے، جو فرق پڑا وہ صرف یہ تھا سرمایہ داری میں یہ کام بہت سے سرمایہ دار کرتے ہیں اور اشتراکیت میں ایک بہت بڑا سرمایہ دار۔ حالانکہ اشتراکیت کا دعویٰ تھا کہ علم معاشیات اشتراکی نظام میں ختم ہو جائے گا۔ ہم صرف چند اہم پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

(۱) نظام سرمایہ داری میں، اور سرمایہ دارانہ معاشیات میں، ترقی کا بنیادی عامل سرمایہ کاری (investment) کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کل پیداوار میں سے ایک قابلِ ذکر حصہ صرف سے بچایا جائے گا اور اسے سرمایہ کی شکل دے کر مزید پیداوار کے لئے استعمال کیا جائے گا۔ جتنا زیادہ سرمایہ ہوگا اتنی ہی تیز رفتاری سے ترقی کی جا سکے گی۔ بلاشبہ اور عاملین پیداوار بھی ہوں گے۔ لیکن سرمایہ کاری کی مقدار اور معاشی ترقی میں ایک مثبت ہم مطابقت (positive corelation) ہے۔ اس لئے نظام سرمایہ داری میں عدم مساوات کو پسند کیا جاتا ہے، کہ یہ بچت اور سرمایہ کاری میں معاون ہوتی ہے۔ اجرتوں کو کم رکھنے کی کوشش ہوتی ہے تاکہ سرمایہ کاری کے لئے زیادہ وسائل بچ سکیں۔ عام صرفہ کو بھی کچھ خاص حدود میں رکھنا پسند کیا جاتا ہے تاکہ صرف اور سرمایہ کاری کا توازن نہ بگڑے۔ لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود سرمایہ دار کو ان امور پر کلی اختیار نہیں ہوتا۔ وہ مجبور ہوتا ہے کہ عوام کی خواہشات کا خیال رکھے۔ معاشی محرکات، سیاسی دباؤ، قانونی رکاوٹیں سب اپنا اپنا حصہ ادا کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ کوشش کے باوجود سرمایہ کاری کو ایک خاص حد سے زیادہ نہیں بڑھایا جا سکتا۔ صرفہ پر اس سے زیادہ گرفت سماجی بحران اور سیاسی خلفشار پیدا کر دیتی ہے۔ روس کی معیشت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ترقی کا انحصار بھی سرمایہ کاری پر رہا ہے اور چونکہ وہاں حکومت کی گرفت عوام پر بہت سخت تھی، اس لئے سرمایہ کاری کا

تناسب سرمایہ دارانہ ممالک سے بھی کہیں زیادہ رہا ہے[۱۳۳] اس سلسلہ میں ہم طلبا اشتراکیت کو روس اور دوسرے ممالک میں سرمایہ کاری اور کل پیداوار کے تناسب کے مطالعہ کی دعوت دیتے ہیں۔ ۱۹۵۵ میں صورت حال یہ تھی۔

ملک	کل قومی پیداوار سرمایہ کاری کا تناسب	
برطانیہ	۱۶٫۳	فی صدی
فرانس	۱۸٫۵	"
اٹلی	۱۹٫۰	"
امریکہ	۲۰٫۳	"
روس	۲۵٫۲	"

روس کے اشتراکی دور میں قومی دولت کا ۲۵ سے ۳۰ فی صدی سرمایہ کاری کے لئے صرف ہوا ہے۔ اگر سرمایہ کاری کے اعداد و شمار کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ پیداوار میں اضافہ کے اعداد و شمار سے بھی زیادہ متحیر کن ہیں۔ ۱۹۱۸۔۲۸ میں صرف ۱٫۴ ارب روبل (نئے) کی سرمایہ کاری ملتی ہے۔ ان دس سالوں کے مقابلہ میں پہلے پنجسالہ منصوبہ کے ۵ سال میں ۴٫۶ ارب روبل بطور سرمایہ لگائے گئے۔ دوسرے پنج سالہ منصوبے کے دوران یہ مقدار ۱۷٫۸ ارب روبل ہوگئی۔ تیسرے منصوبے کے دوران یہ رقم ۱۷٫۶ ارب روبل تھی۔ واضح رہے کہ جنگ کی وجہ سے اس منصوبہ پر صرف تین سال کام ہوسکا تھا۔ جنگ کے زمانے میں (یکم جولائی ۱۹۴۱ تا ۱۹۴۵) سرمایہ کاری ۷۰٫۱۱ ارب روبل تھی۔ اس کے بعد کی کیفیت یہ رہی ہے۔

۱۹۴۶-۵۰	۴۲٫۰ ارب روبل
۱۹۵۱-۵۵	۷۹٫۲ "
۱۹۵۶	۲۳٫۹ "
۱۹۵۷	۲۵٫۸ "
۱۹۵۸	۳۰٫۰ "

---

[۱۳۳] جب ہم معاشی ترقیات کے مسئلہ پر ایک مسلمان کے ذہن سے غور کرتے ہیں تو ہمیں سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کے اس تصور میں کہ سرمایہ کاری کے تناسب کو زیادہ سے زیادہ بڑھایا جائے ایک بنیادی سقم نظر آتا ہے۔ ان دونوں میں معاشی ترقی میں موثر اور کارفرما عامل 'سرمایہ' ہے جب کہ ایک منصفانہ اور فلاحی معیشت میں اصل عامل 'انسان' کو ہونا چاہیئے۔ نقطۂ نظر کی اس غلطی کو ایک خاص حد تک اب مغرب کے کچھ معاشی مفکر بھی محسوس کرنے لگے ہیں اور اس وقت جو کام انسانی سرمایہ کاری (formation of human capital) کے موضوع پر ہو رہا ہے وہ اس کا ثبوت ہے۔ لیکن یہ صحیح طریقے کی طرف صرف ایک قدم ہے۔ اب بھی ناپنے کے پیمانے غیر انسانی ہی ہیں۔ اصل تبدیلی اس اخلاقی انقلاب کے بغیر نہیں آسکتی جو اسلام لانا چاہتا ہے

۱۹۵۹ء	۰ ، ۴ ۳ ارب روبل
۱۹۶۰ء	۳۶۲ ،، ،،

یہ تمام اعداد وشمار روس کے مرکزی شعبہ شماریات نے ۱۹۶۲ء میں جاری کئے تھے[۱۳۵] ان سے معلوم ہوتا ہے کہ روس میں اشتراکی دور میں ۲۰۴۳۳ ارب روبل کی سرمایہ کاری ہوچکی ہے ۶۰ - ۱۹۵۱ کے درمیان روس میں سرمایہ کاری میں اضافہ ۲۳۰ فی صدی کا ہوا جب کہ اسی زمانہ میں امریکہ میں اضافہ ۲۱ فی صدی، برطانیہ میں ۴۶ فی صدی اور فرانس میں ۶۳ فی صدی کا تھا۔ اگر سرمایہ کاری میں اس اضافہ اور پیداوار کے اضافہ کو ساتھ ساتھ دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ

- روس کی ترقی کی رفتار سرمایہ کاری کی مناسبت سے سست رہی ہے۔ اور
- اشتراکیت کی ترقی بھی انہی بنیادی معاشی قوتوں کی رہین منت ہے جن کی سرمایہ دارانہ ممالک کی ترقی۔

(۲) مغربی ممالک کی معاشی ترقیات میں ایک اور بڑا اہم عامل معاشی نفع کا محرک رہا ہے۔ اشتراکیت کا دعوٰی تھا کہ وہ ذاتی نفع ونقصان کے محرکات کو ختم کردے گی اور سماجی محرکات (social incentives) کے ذریعہ معاشی زندگی کا تانا بانا تیار کرے گی۔ لیکن پہلے تین سال کے تجربے نے اس اصول کے غیر حقیقی ہونے کو ثابت کردیا۔ ۱۹۳۱ء سے اجرتوں کے فرق اور معاشی محرک کے اصول کو عملاً اختیار کرلیا گیا لیکن پہلے دس سال کچھ شرم و جھجک باقی تھی اس لئے مساوات کو مقصد ضرور قرار دیا گیا۔ اور ۱۹۳۱ء سے اسے بحیثیت ایک اصول بھی ترک کردیا گیا۔ اور اس وقت سے آج تک عدم مساوات اور دوسرے معاشی محرکات کو کھلے بندوں زندگی کی ہر سطح پر استعمال کیا گیا ہے۔ اپنی روح کے اعتبار سے یہ وہی اصول ہے جسے سرمایہ داری نے استعمال کیا ہے اور جس کے سہارے اس کی ساری رونق قائم ہے۔

سب سے پہلے اسٹالن نے بآواز بلند کہ اشتراکیت مساوات کی علمبردار نہیں ہے اور جو لوگ یہ نعرہ بلند کرتے ہیں وہ مارکسزم کے دشمن ہیں۔ اس نے کہا۔

"مارکسزم مساوات پرستی کا دشمن ہے"۔[۱۳۶]

میکویان نے ایک انٹرویو میں عدم مساوات اور معاشی محرک کے احیاء کا پورا فلسفہ بیان کیا ہے۔

"یہ فرق بالکل فطری ہے اس لئے کہ ایک نئی معیشت کی تربیت یافتہ ماہرین اور پڑھے لکھے طبقہ کو تشکیل کرنا تھا۔ اہل افراد کے جدوجہد کرنے اور سیکھنے اور ابھرنے کے لئے بڑے تفاوت (big gap) کی ضرورت ہے۔ یہ ضروری بھی تھا اور صحیح تھا۔ دوسری جنگ کے بعد یہ فرق اور بھی بڑھا۔ دوسری جنگ اور اس کے فوراً بعد کارخانوں اور صنعتوں نے ان کاموں کے لئے جن کے لئے عام طور پر آدمی نہ ملتے تھے بڑے اونچے اونچے معاوضے رکھے۔ بھاری صنعت

---

[۱۳۵] Vide. *The Soviet World*, op. cit., pp. 163-64.

[۱۳۶] Stalin. J., *Problems of Leninism*, Moscow, 1945, p. 503.

اصل الفاظ یہ ہیں:

میں انھوں نے ڈائرکٹروں، تربیت یافتہ کارکنوں اور انجینیروں کی تنخواہیں بہت بڑھا دیں۔" [۱۳۷]

خروشیف نے بھی اس پالیسی کا برملا اعلان کیا ہے۔ اس نے ۵ مئی ۱۹۶۰ کو سپریم سوویٹ کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:

"ہم اجرتوں میں فرق کو مٹانے کی ہر تحریک کے سختی سے مخالف ہیں۔ ہم اجرتوں میں مساوات قائم کرنے اور ان کو ایک سطح پر لانے کے کھلے بندوں مخالف ہیں۔ یہ لینن کی تعلیم ہے، اس لئے کہ اس کی تعلیم یہ تھی کہ سوشلسٹ سماج میں مادی محرکات کا پورا لحاظ کیا جائے گا۔" [۱۳۸]

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اشتراکی روس میں عدم مساوات اور اسں کے فرق کے تقریباً وہی اصول کارفرما ہیں جو سرمایہ دارانہ ممالک میں ہیں۔ [۱۳۹]

ایک اشتراکی اہل قلم ایم۔ وائی یون نے ۱۹۳۷ میں فرق کی یہ کیفیت بیان کی تھی۔ [۱۴۰]

عام مزدور۔	۱۱۰ سے ۴۰۰ روبل ماہانہ	عموماً ۱۵۰ - ۲۵۰
درمیانہ افسر	۳۰۰ سے ۱۰۰۰ روبل ماہانہ	
اونچے افسر	۱۵۰۰ سے ۱۰,۰۰۰ روبل۔	
چوٹی کے لوگ۔	۲۰,۰۰۰ سے ۳۰,۰۰۰ روبل ماہانہ	

روسی پرچے Trud کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں ایک کان (Donet Basin Mim) میں جس میں ۱۵۲۵ افراد ملازم تھے کیفیت یہ تھی۔ [۱۴۱]

۱۰۰۰ افراد ۱۲۵ روبل ماہانہ

---

[۱۳۷] . Perlo, Victor. *How the Soviet Economy Works: An Interview with A. I. Mikoyan*, p. 48.

[۱۳۸] بحوالہ سوویٹ ورلڈ۔ صفحہ ۲۴۳۔ خروشیف صاحب شاید یہ بھول گئے کہ لینن نے "اسٹیٹ اینڈ ریوولیوشن" میں برملا کہا تھا کہ اشتراکی سماج میں اجرتوں میں مساوات ہوگی اور دوسری ٹریڈ یونین کانفرنس منعقدہ جنوری ۱۹۱۹ کے موقع پر کہا گیا تھا کہ اجرتوں کا زیادہ سے زیادہ فرق ۱ اور ۱۰۰۵ کا ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ برسر اقتدار آ کر اور ۳ سال کے ناکام تجربات کے بعد نئی معاشی پالیسی میں اسے اجرتوں کے عدم مساوات اور معاشی محرکات کے اصول کو بحال کرنا پڑا۔

[۱۳۹] اس کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو:
Bergson Abram. *The Structure of Soviet Wages*, Harvard University Press, Cambridge, Mass. 1946, p. 208.

[۱۴۰] Yuon M., L'URSS, telle q'uelle est: p. 215-18, Vide, Yu Tang, Lin, *The Secret Name*, op. cit., p. 131,

[۱۴۱] 141 *Trud* January 20, 1936

۴۰۰ افراد ۵۰۰ سے ۸۰۰ روبل ماہانہ

۵۰ " ۸۰۰ سے ۱۰۰۰ روبل "

[illegible] " ۱۰۰۰ سے ۲۵۰۰۰ روبل ماہانہ

پانے والوں میں سے ایک مطالعہ کی روشنی میں یہ نتائج بیان کئے تھے کہ کل تنخواہ

اناطولے شب نے اکتوبر ۱۹۳۴ء کے ایک مطالعہ کی روشنی میں یہ نتائج بیان کئے تھے کہ کل تنخواہ پانے والوں میں سے ایک

صرف ۲ فی صدی کو ۵۰۰ روبل یا اس سے زیادہ ملتے ہیں اور ۹۰ فی صدی وہ ہیں جن کو ۲۴۰ روبل سے کم ملتے ہیں ان میں سے ایک

تہائی وہ ہیں جن کو ۱۲۰ روبل سے کم ملتے ہیں۔ [۱۴۲]

ڈائرکٹر زفنڈ ایک مستقل فنڈ ہے جس میں کل پلان کے حاصلات کا ۴ فی صدی اور پلان سے زیادہ پیداوار پا مدنی کا ۵۰ فی صدی

کے علاقہ میں اس فنڈ کی تقسیم اس طرح تھی۔ ڈائرکٹر کا حصہ ۲۶.۲ فی صدی (۱۹۳۶ء میں

جاتا ہے۔ خارکوو (Kharkov) ۱۶.۲ فی صدی (یعنی اس وقت ۹۰ ہزار) پیداواری آفس کا

مطالعہ کے وقت ایک سال میں یہ حصہ ۲۲ ہزار روبل تھا) پارٹی سکریٹری کا حصہ ۱۲.۶ فی صدی [۱۴۳]

سربراہ ۱۳.۲ فی صدی انتظامی عملہ کا سربراہ ۱۰ فی صدی یونین کا سربراہ ۶.۲ فی صدی، باقی تمام مزدور ۱۶.۱ فی صدی

روسی فوج میں ۱۹۴۳ء میں ایک سپاہی کو صرف ۱۰ روبل ملتے تھے جب کہ لفٹیننٹ کو ۱۰۰۰ روبل اور کرنل کو ۲۴۰۰ روبل ملتے تھے۔ [۱۴۴]

لیون سیڈو لکھتا ہے کہ

"شاید ہی کوئی ترقی یافتہ سرمایہ دار ملک ایسا ہو جہاں مزدوروں کی اجرتوں میں اتنا تفاوت ہو جتنا روس میں ہے

سیڈو نے مثالوں سے ثابت کیا ہے کہ عام اداروں میں فرق ایک اور ۲ کا ہے اور اگر تربیت یافتہ انجنیر اور اعلیٰ حکام کو لیا جائے تو ایک

اور ۸۰ اور ایک اور ۱۰۰ کا ہے۔ [۱۴۵]

اسٹیخونووائٹ تحریک عدم مساوات کو مستحکم کرنے کا ایک ذریعہ ثابت ہوئی۔

اجرتوں میں فرق ایک اور تیس سے لے کر ایک اور سو تک جا پہنچا۔ ڈائرکٹروں، چیف انجنیروں اور منتظمہ کے معاوضوں

کو لیا جائے تو فرق ایک اور ۳۰۰ تک کا پایا جاتا ہے۔ [۱۴۶] ۱۹۴۳ء میں روس کے اخبارات میں پہلے اشتراکی بلند پرواز یہ لکھ پتی

(Berdyebekov) کی دھوم مچی اور یہ اعزاز ایک کھیت کے سربراہ کامریڈ بردائی جی کوف (Proletarian millionaire)

کو حاصل ہوا اس کے بعد سے ایسے ایسے لکھ پتیوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ ایک نامہ نگار نے

---

[۱۴۲] Shub, Anatob, *Labour in the Soviet Orbit*, p. 24.

[۱۴۳] Yu Tang, *The Secret Name*, p. 134.

[۱۴۴] *The Economist*, London. July, 3, 1943.

[۱۴۵] *New International*, February 1936

[۱۴۶] Koestler, Arther, *The Yogi and the Commisar*, Jonathan Cape. London, 1947, p. 163

۱۹۵۲ء میں لکھا تھا کہ سوویٹ چیمبر آف کامرس کے صدر کو ۱۶ ہزار روبل ماہانہ ملتے ہیں جب کہ وزراء کی تنخواہ ۲۰ ہزار روبل اور اکیڈیمی آف سائنسز کے صدر کی تنخواہ ۲۰ ہزار روبل ماہانہ ہے۔[۱۴۷] کوئی اہم ایجاد کرنے والے کو ۲ ہزار روبل ملتے ہیں اور جو لوگ اسٹالن پرائز حاصل کرتے ہیں ان کو ۲ لاکھ روبل انعام ملتا ہے۔

یہ سب آخر کیا ہے؟ جس وقت تک اس خالص سرمایہ دارانہ اصول کو استعمال نہ کیا گیا معاشی ترقی رونما نہ ہو سکی۔ روس پر چین کا ایک بنیادی الزام یہ بھی ہے کہ اس کی ترقی اشتراکیت کے بنیادی اصولوں کی مرہون منت نہیں ہے بلکہ اس نے ان سے انحراف کیا ہے۔ پیکنگ ریڈیو لکھتا ہے۔

"بونس کے محرک کی پالیسی کے نتیجہ میں آمدنیوں میں تفاوت — ایک طرف عام مزدوروں، کسانوں اور پڑھے لکھے طبقے کی آمدنیاں اور دوسری طرف ایک اقلیت کی، خوش نصیبوں کے ایک گروہ کی — ان دونوں میں فرق بڑھ رہا ہے کم نہیں ہوا ہے۔ صاحب مفاد طبقہ کے لوگوں کی تنخواہیں عام مزدور اور کسان کی آمدنی سے ۱۰ گنا زیادہ تک ہیں۔"[۱۴۸]

امریکہ کے بارے میں روسی اعداد و شمار یہ ہیں کہ وہاں فرق ایک اور اکتیس (۱:۳۱) کا ہے۔ روسی سرکاری اعداد و شمار کے مطابق وہاں صرف ماہانہ تنخواہوں میں ایک اور تیس (۱:۳۰) کا فرق موجود ہے اور بونس اور دوسری آمدنیاں شامل کرنے کے بعد یہ فرق اور بھی بڑھ جاتا ہے۔[۱۴۹] ڈی کوسٹا نے جو اعداد و شمار دیئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ روس میں آمدنی کا ۵۰ فیصدی آبادی کے اوپر کے ۱۱ یا ۱۲ فی صدی کو جاتا ہے جب کہ امریکہ میں اوپر کی ۱۰ فی صدی آبادی کا حصہ ۳۵ فی صدی سے زیادہ نہیں ہے۔[۱۵۰] اشتراکیت میں پایا جانے والا تفاوت حیران کن ہے۔ جبھی تو جارج آرول نے کہا تھا کہ "سب جانور برابر ہوتے ہیں لیکن کچھ جانور کچھ زیادہ ہی برابر ہوتے ہیں"۔[۱۵۱] برطانوی سوشلسٹ ڈگلس جے نے لکھا ہے کہ

"اس وقت روسی سماج میں حقیقی آمدنی (کمائی ہوئی) میں ٹیکس کے بعد اوپر اور نیچے کی حدوں میں فرق برطانیہ اور اسکنڈی نیویا کے ممالک سے زیادہ اور اغلباً امریکہ میں پائے جانے والے تفاوت کے برابر ہے۔"[۱۵۲]

---

[۱۴۷] *Economic Weekly*, Delhi, vide, Banerji, Jayanta, *Aspects of Soviet Economy*, Calcutta, 1954, p. 21.

[۱۴۸] "On Khrushchev's Phoney Communism" *Peking Review*, Peking, July 17, 1964, pp. 14-15.

[۱۴۹] See *Economic Systems in Action*, *op. cit.*, pp. 133-136.

[۱۵۰] De Coste, *The Economic Progress in Russia*, *op. cit.*, p. 68

[۱۵۱] Orwel, George, *The Animal Farm*.

[۱۵۲] Jay, Douglas, *Socialism in the New Soviet*, Longmans, London, 1962, p. 16—see also pp. 17-18.

یہی وہ بات ہے جسے سنڈنی اور بیئٹرس ویب نے بھی تفصیل سے بیان کیا تھا۔ [۱۵۳ھ] اس کا انکار کسی بڑے سے بڑے نقاد کے لئے ممکن نہیں۔

پھر اس عدم مساوات کے بھی متعدد پہلو ہیں۔

(الف) زرعی آبادی اور شہری آبادی کے درمیان عدم مساوات۔ سارا نظام صنعتی شہری آبادی کے حق میں اور دیہی آبادی کے خلاف ہے جو آبادی کا ۵۰ فی صدی کے قریب ہے۔

(ب) مختلف علاقوں کے درمیان تفاوت۔

(ج) روس کی قومیتوں میں، روسی اور غیر روسی کے درمیان فرق۔

(د) مختلف گروہوں اور کام کرنے والوں کے درمیان شدید فرق۔

(ہ) بالکل بلا محنت کمانے والے افراد کے لئے نہ صرف یہ کہ دروازہ کھل گیا ہے بلکہ وہ بڑی رقمیں کما رہے ہیں۔

آمدنیوں کی عدم مساوات کو دور کرنے والی چیز انکم ٹیکس ہے۔ لیکن وہ روس میں غیر موثر ہے۔ مدرلیس ڈوب نے بھی اعتراف کیا ہے کہ "روس میں انکم ٹیکس کا آمدنیوں کی عدم مساوات پر بہت ہی معمولی اثر پڑتا ہے"۔ [۱۵۴ھ] زیادہ سے زیادہ شرح ٹیکس ۱۳ فی صدی سالانہ ہے۔ اس طرح جن کی آمدنیاں زیادہ ہیں وہ ٹیکس کے اثر سے بچ جاتے ہیں جب کہ اشیائے صرف پر غیر معمولی ٹیکس ہیں اور ان کا سارا بار عوام پر پڑتا ہے۔ اسی لئے روس کے مالیاتی نظام کو تمام محققین رجعی کہتے ہیں۔

دوسری چیز جو عدم مساوات کے برے اثرات کو کم کر سکتی تھی، "راشننگ" ہے۔ جنگ کے بعد اس نظام کو آہستہ آہستہ ختم کر دیا گیا اور اب ہر شخص کو ایک ہی بازار سے اپنی ضرورت کی چیزیں خریدنا پڑتی ہیں۔ اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے پہلے دو قسم کی قیمتیں ہوتی تھیں، کم اجرت والے لوگوں کے لئے کم قیمتیں اور باقی لوگوں کے لئے زیادہ۔ لیکن سرکاری قیمتوں کو اب ختم کر دیا گیا ہے۔

عدم مساوات کو کم کرنے والی چیز تعلیم بھی ہے۔ تعلیم روس میں مفت ہے اور اسے بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دوسری جنگ کے بعد کچھ خاص شعبوں میں تعلیم پر فیس بھی لگا دی گئی۔ [۱۵۵ھ] اور اس طرح یہ دروازہ بھی اب بند ہو رہا ہے۔ ۱۹۴۰ء میں (۲ اکتوبر) یہ فیسیں عائد کی گئی ہیں۔ اس کے نتیجہ میں ایک ماہ کے اندر اندر ۶ لاکھ طلبہ اسکول چھوڑنے پر مجبور ہو گئے کہ وہ فیس نہیں دے سکتے تھے۔ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں جسمانی محنت کرنے والوں مزدوروں کی اولاد برابر کم جا رہی ہے اور اونچے طبقے کے لوگوں کی اولاد پر آسانی جا رہی ہے۔ مزدوروں کی اولاد کے داخلوں میں کمی کی رفتار یہ ہے۔

	۱۹۳۳	۱۹۳۵	۱۹۳۸
یونیورسٹی	۵۰/۳ فی صدی	۴۵/۰ فی صدی	۳۳/۹ فی صدی
سکنڈری اسکول	۴۱/۵ "	۳۱/۰ "	۲۰/۱ "

۱۵۳ھ Webb, *Soviet Communism: A New Civilization*, op. cit., Pp. 966-67

۱۵۴ھ Dobb, *Soviet Economic Development* op. cit.,

۱۵۵ھ Koestler, *The Yogi and the Communism*, op. cit. p. 156/

صنعتی کالجوں میں داخلہ لینے والوں کی تعداد کا ۴۳ء۵ فی صدی اسکالر اور ماہرین کے لڑکے تھے ۔ ملٹری اکیڈیمیوں میں اونچے طبقے کے لوگوں کو داخلہ کی سہولتیں حاصل ہیں [156] یہ تمام حقائق عدم مساوات کی بڑی تکلیف دہ صورت حال کو سامنے لاتے ہیں ۔

یہاں بھی صاف نظر آتا ہے کہ روس کی ترقی میں اشتراکیت سے زیادہ حصہ معاشی محرکات کے چابک دستی کے ساتھ استعمال کو حاصل رہا ہے ۔

(۳) سرمایہ داری میں معاشی ترقی کے حصول کے لئے ایک اور حربہ یہ استعمال کیا گیا کہ ایک مدت تک مزدور کو اس کے حق سے محروم رکھا گیا ۔ مزدوروں سے بیگار لی گئی ، اوقات کار نہایت طویل رکھے گئے ' ان سے زبردستی کام لیا جاتا تھا ' بچوں اور عورتوں تک سے مزدوری لی جاتی تھی ' تنظیم بندی کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی جاتی تھیں ۔ اجرتیں کم رکھی جاتی تھیں اور اس طرح مزدور کی قیمت پر معاشی ترقی کا سامان کیا گیا تھا ۔ اشتراکیت نے بھی بالکل یہی راستہ اختیار کیا ہے ' اس فرق کے ساتھ کہ مزدور کے ساتھ ساتھ اس نے کسان کا استحصال بھی کیا اور مزدور سے کچھ زیادہ کیا اور اس تجزی کے ساتھ کہ یہ سب کچھ بیسویں صدی میں کیا اور مزدور کے نام پر کیا ۔ حقائق صاف بتاتے ہیں کہ جس طرح سرمایہ دارانہ نظام میں معاشی ترقی کا انحصار استحصال (exploitation) پر رہا ہے ' اسی طرح اشتراکیت میں بھی رہا ہے ۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ گذشتہ ۵۰ سال سے روس میں مسلسل کسانوں کو ان کے حق سے محروم کیا جا رہا ہے ۔ اور ان کے گرم خون سے داد عیش کا سامان فراہم کیا گیا ہے ۔ معاشی ترقی کے لئے کثیر وسائل زراعت سے منتقل کئے گئے ہیں اور زراعت کے سنوارنے اور کسانوں کے معیار زندگی کو بہتر بنانے کے لئے کوئی مساوی کوشش نہیں ہوئی ہے ۔ اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ ایک اجتماعی فارم سے کل پیداوار کا ۳۱ فی صدی ریاست کے لئے لیا جاتا ہے اور ۳۲ء۷ فی صدی ریاست کو بیج اور چارہ وغیرہ کے نام پر لازماً واپس کرنا پڑتا ہے ۔ اس کے بعد کاشت کار کو جو حصہ ملتا ہے وہ کل مجموعی پیداوار کا صرف ۲۶ء۹ فی صدی ہے [157] اس طرح معاشی ترقی کے لئے کسانوں سے جبری طور پر وسائل حاصل کئے جاتے ہیں اور ان کو نہایت خراب حال میں چھوڑ دیا جاتا ہے ۔

زراعت کی اجتماعیت پسندی نے جو اصل کارنامہ انجام دیا وہ یہی تھا کہ پوری زراعت کو حکومت کی پالیسیوں کا تابع کر دیا اور ان وسائل کو جبری طور پر معاشی ترقی کے لئے استعمال کرنے کا موقع فراہم کر دیا ۔ سارس ڈوب بھی اعتراف کرتا ہے کہ

"پہلے پانچ سالہ منصوبہ کے سخت مشکل حالات میں زراعت کی اجتماعیت بندی نے جو کارنامہ انجام دیا وہ یہ تھا کہ اس کے ذریعہ زرعی پیداوار کا قابل فروخت زائدہ (surplus) حاصل ہوگیا ۔ یہ حصہ غلہ اور آلو کے سلسلہ میں ۴ سال قبل کے مقابلہ میں دوگنا تھا اور روئی ' فلیکس اور اون کے سلسلہ میں دوگنے سے بھی زیادہ ' [158]

---

[156] ibid., p. 156.

[157] *Economic System.*

[158] Dobb, *Soviet Economic Development Since 1917*

پیداوار "اس وقت حاصل کیا جارہا تھا جب کسان بھوک سے مر رہے تھے اور اسے مشنیری درآمد کرنے کے لئے برآمد کیا جارہا تھا۔[۱۳۹] جس وقت زرعی پیداوار گر رہی تھی اور ملک میں قحط کی کیفیت تھی، اس وقت "بقول بے کوف، غلہ کی برآمد ندرون پر تھی۔"[۱۴۰]

	غلہ کی برآمد ۔	کل فصل کا حصہ
۱۹۲۹		
۱۹۲۹	۲۱٫۲	فی صدی
۱۹۳۰	۳۱٫۶	"
۱۹۳۱	۳۵٫۲	"
۱۹۳۲	۲۲٫۵	"

یہ تھا وہ استحصالی ذہن جو روس کی ترقی کا ذمہ دار تھا۔ ان حالات کو دیکھئے اور پھر اٹھارویں انیسویں صدی کے انگلستان کے کسانوں اور مزدوروں کے حالات کو پڑھئے۔ آپ کو دونوں میں بڑی مماثلت ملے گی :

پھر حکومت کاشت کاروں سے جس قیمت پر زرعی پیداوار خریدتی ہے وہ کم رکھی گئی ہیں۔ جب کہ وہ اشیا تے صرف جو کاشت کار استعمال کرتا ہے بہت مہنگی ہیں اور ان پر بکری ٹیکس (Sales Tax) بھی لگایا گیا ہے۔ یہ بکری ٹیکس قومی مالیات کا تقریباً ۵۰ فی صدی فراہم کرتا ہے اور اس کا سارا بار کسان اور عام صارفین پر، جن میں مزدور بھی شامل ہے پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روس کا معیار زندگی پست اور مزدوروں اور کسانوں کے حالات زندگی غیر تسلی بخش ہیں۔ بلکہ جیسا کہ ہم آئندہ دیکھیں گے ان کی حقیقی آمدنی میں اضافہ کی بجائے کمی واقع ہوتی ہے۔

اس معاشی ترقی کے لئے مزدوروں کو جو قیمت دینی پڑی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی اجرتیں قیمتوں کے مقابلہ میں کم رہی ہیں، حالات کار ان کے ناموافق رہے ہیں، آزاد تنظیم بندی کے حق سے انھیں دست بردار ہونا پڑا ہے، ٹریڈ یونین انتظامیہ کے دست و بازو بن گئی ہیں اور مزدوروں کے حقوق کے لئے جدوجہد ختم ہو گئی ہے، آزادی روزگار باقی نہیں رہی ہے، ایک کاروبار کو چھوڑ کر دوسرے کو اختیار کرنے پر مختلف قسم کی پابندیاں رہیں، کھیتوں میں بچوں سے نہ صرف یہ کہ کام لیا جاتا ہے بلکہ قانونی طور پر ۱۲ سال تک کے بچوں کی محنت کو استعمال کرنے کی اجازت موجود ہے۔ اور کم از کم ۱۹۵۵ تک جبری محنت کا نظام جاری رہا ہے جس کے تحت سیاسی قیدیوں کی فوج ظفر موج سے سخت ترین محنت لی گئی اور کم سے کم مزد پری گئی۔ ہم اس سے پہلے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ جبری محنت کی کیا کیفیت تھی یہاں صرف روس کے ملکی قانون سے دو ایک اقتباسات پیش کرتے ہیں جن سے معلوم ہو گا کہ کس طرح جبری محنت کو نظام پیداوار کا ایک جزو بنا یا گیا اور اسے معاشی ترقی کے ایک وسیلہ کی حیثیت سے استعمال کیا گیا۔ ہمارے سامنے ماسکو کا مطبوعہ قانون تعزیرات کا مجموعہ

---

[۱۳۹] اس کا اعتراف خود شیف بھی کر چکا ہے۔ حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے۔

[۱۴۰] Baykov, A., *Soviet Economic System*, p. 76.

ہے۔[158] اس کی دفعہ ۲۰ میں لکھا ہے۔

"سماجی دفاع کے عدالتی طریقوں میں یہ شامل ہیں۔۔۔۔ (ب) آزادی سے محروم کرکے روس کے دور دراز علاقوں (remote areas of U. S. S. R.) میں قائم اصلاحی محنت کے کیمپوں میں بھیجنا۔"

اس دفعہ کے نیچے ایک فٹ نوٹ میں یہ صراحت موجود ہے کہ آئندہ سے ماضی میں استعمال ہونے والی اصطلاح "جبری محنت" کی جگہ "اصلاحی محنت" (corrective labour) کا لفظ استعمال کیا جائے اور قانون میں جہاں جہاں "جبری محنت" کا لفظ ہوا سے "اصلاحی محنت" سے بدل لیا جائے![159]

ان "اصلاحی محنت کے کیمپوں" کی نگرانی خفیہ پولیس کے محکمہ کے پاس تھی[160] اور ریاست کے منصوبہ میں ۱۹۴۱ کے بجٹ کی رو سے خفیہ پولیس کی ذمہ داری تھی کہ ۶ ارب روبل (پرانے) کی مالیت کی معاشی پیداوار حاصل کرے۔ یہ حصہ کل بجٹ کا ۱۴ فی صدی ہوتا ہے۔ سرکاری منصوبہ برائے ۱۹۴۱ میں جو خفیہ ضمیمہ نمبر ۱۲۸ میں شائع ہوا ہے۔ ساتھ میں نمبر پر N. K. V. D: (خفیہ پولیس کا ادارہ جو مرکزی وزارت داخلہ کے تحت تھا) کے ذمہ ۶ ارب ۱۳ کروڑ روپے کی تعمیرات اور پیداوار مندرج ہیں![161] پروفیسر نادم جاسنی کا تخمینہ ہے کہ ۱۹۴۱ میں ان کیمپوں میں ۲۵ لاکھ سے ۳۵ لاکھ افراد تھے۔

اس طرح روس کو دنیا کی سستی ترین محنت حاصل رہی ہے اور اس سے وہ اپنی معاشی ترقی کی دیواریں بلند کرتا رہا ہے۔ ایک قیدی پر جو خرچ آتا تھا وہ عام مزدور کی مزدوری کا ایک تہائی تھا۔ اتنی کم لاگت پر معاشی پیداوار کا رنگ نہ نکھرے تو کیا ہو؟

---

[158] Criminal Code of the Russian Soviet Federated Socialist Republic, State Publishing House of Juridical Literature, Moscow, 1950.

[159] دیکھئے بلی تھیلے سے باہر آگئی ہے! "اصلاحی محنت" دراصل "جبری محنت" کا نیا نام ہے۔

[160] فرمان نمبر ۳۶، ۱۹ جولائی ۱۹۳۴ اور فرمان نمبر ۱۱ بتاریخ ۶ مارچ ۱۹۳۵۔ ان قوانین کا متن حکومت کے شائع کردہ مجموعہ "The Collection of Laws of the Government of the U. S. S. R" میں موجود ہے۔

[161]

کروم کی پیداوار	ایک لاکھ ۵ ہزار میٹرک ٹن	(منفعت کی کل پیداوار کا ۰۵.۴۰ فی صدی)
کوئلہ	۳۵ لاکھ ۲۵ میٹرک ٹن	(کل کا ۸.۲ فی صدی)
تجارتی اور جلانے کی لکڑی	۳ کروڑ ۴۰ لاکھ ۳ ہزار کیوبک میٹر	(کل کی ۱۱.۹ فی صدی)
تجارتی لکڑی کی ترسیل جہازوں کے لئے	۱۵ کروڑ ۱۵ لاکھ ۹۰ ہزار کیوبک میٹر	
فرنیچر	۱۸ کروڑ ۳۹ لاکھ روبل	(۱۳.۴۹ فی صدی)
چمڑے کے جوتے	ایک کروڑ ۴۰ لاکھ جوڑے	(۲.۱ فی صدی)
ٹائیاں	ایک کروڑ ۵ لاکھ	(۲۲.۲۸ فی صدی)

واضح رہے کہ اس اصلاحی کیمپوں کی پیداوار کے منصوبہ کی جو تفصیل وہاں دی گئی وہ یہ ہے۔

اس طرح اشتراکیت نے نہ صرف یہ کہ سرمایہ داری کی طرح استحصال کو ذریعہ ترقی بنایا بلکہ سماجی محرکات کی جگہ ان دونوں قسم کے
محرکات کو استعمال کیا جو سرمایہ داری میں کیے جاتے ہیں۔ یعنی ذاتی نفع اور اجرت کی عدم مساوات اور فقر و فاقہ کا خطرہ اور جبر۔
(۳) سرمایہ دارانہ ممالک کی ترقی میں استحصال کا ایک یہ پہلو بھی نمایاں رہا ہے کہ انھوں نے اپنی ترقی کی خاطر دوسری قوموں کو لوٹا
ہے اور ان کی دولت سے اپنے بام و در کی رونق بڑھائی ہے۔ اس پہلو سے بھی روس کی معاشی ترقی اور سرمایہ دارانہ ممالک
کی راہ ترقی میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے۔
روس کی معاشی ترقی میں دوسرے ممالک کا تعاون اور ان سے حاصل کیے ہوئے وسائل اور افراد کار کا حصہ بھی رہا ہے اور دوسروں
کی دولت کے جبری حصول کا بھی۔ یعنی سرمایہ داری کی ترقی میں جو حصہ سامراج اور تجارت میں سامراجی طریقوں نے ادا کیا ہے۔
روس کی ترقی میں بھی اس استحصال نے تقریباً وہی حصہ ادا کیا ہے
(الف) بیرونی سرمایہ، فنی ماہرین اور پیداواری تکنیک سے جو فائدہ روس نے اٹھایا ہے اسے اشتراکیت کے کھاتہ میں جمع نہیں کیا جا سکتا
بلکہ خالص مارکسی نقطہ نظر سے اس کی حیثیت سرمایہ داری اور امپیریلزم سے تعاون کی تھی۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ وہاں
کی معاشی ترقی میں ان عوامل کا حصہ معمولی اور غیر موثر نہیں قرار دیا جا سکتا۔
دوسری جنگ تک روس کی صنعتی ترقی میں استعمال کی جانے والی مشینری، انجینیرنگ کی معلومات اور اس کے ماہرین اور دوسرے
ٹکنالوجی میں سے ایک چوتھائی مغرب سے درآمد شدہ تھی۔[۱۶۲] برطانیہ، جرمنی اور خصوصیت سے امریکہ سے انجینیر اور فنی ماہرین بلائے
گئے اور غیر معمولی معاوضوں پر بلائے گئے۔[۱۶۳] خود مدریس ڈوب نے اعتراف کیا ہے کہ[۱۶۴] پہلے منصوبے کے موقع پر نصف سے زیادہ فنی
مناصب پر نا اہل یا کم تربیت یافتہ افراد تھے اور جو بھی کچھ اہم مقامات تھے وہاں بیرونی ماہرین کام کر رہے تھے۔ برطانوی سوشلسٹ
آرتھر لیوس نے تفصیل سے بتایا ہے کہ بیرونی ماہرین نے کتنا اہم کردار ادا کیا۔[۱۶۵] بلاشبہ ان کی حیثیت بھاڑے کے ٹٹوؤں
(mercenaries) کی تھی لیکن ان کے بغیر خود اشتراکیت کی گاڑی اپنے اولیں دور میں نہ چل پاتی۔ اسٹالن نے ۱۹۳۰
میں اس کا اعتراف اس انداز میں کیا تھا کہ
"ہم اس حقیقت کو چھپانا نہیں چاہتے کہ جہاں تک ٹیکنالوجی کا تعلق ہے ہم شاگرد ہیں: جرمنوں، فرانسیسیوں،
انگریزوں، اطالویوں اور اولیں اور مرکزی حیثیت سے امریکیوں کے۔"

۱۶۲ھ See, *Economic Systems in Action*,

۱۶۳ھ ۹ راکتوبر ۱۹۲۸ء کو حکومت روس اور جنرل الیکٹرک سپلائی کمپنی میں انجینیر اور ماہرین فراہم کرنے کا معاہدہ ہوا۔ ایسے ہی معاہدے دوسرے
مغربی اداروں سے بھی ہوئے۔ لوئی فشر نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ پہلے پنج سالہ منصوبہ کے دوران روس میں "فورڈزم" اور "ٹائیلرزم"
کا زور شور تھا۔ ملاحظہ ہو۔ جلد دوئم۔

۱۶۴ھ ڈوب: روس کی معاشی ترقی ۱۹۱۷ کے بعد. Dobb, *Soviet, Economic Development Since 1917*.

۱۶۵ھ: Lewis, *Economic Survey*,

حقیقت یہ ہے کہ ابتدائی میں اس بیرونی مدد کا خاصا اہم حصہ ادا کیا ہے۔ اس اولین تحریک کے بعد روس نے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش کی، اس کا تعلیمی نظام اس درجہ ترقی کر گیا کہ اپنی ضرورت کے ماہرین تیار کرنے لگا اور سائنس کے دائرہ میں خصوصیت سے فلکیات اور برقیات کے کچھ میدانوں میں تو روس دوسرے مغربی ممالک سے، جو اس کے پیش رو تھے آگے نکل گیا۔ اس کامیابی کے اعتراف کے ساتھ ساتھ اس کو بروئے کار لانے والے اسباب میں مغربی ممالک اور مغربی سائنس اور ٹیکنالوجی کی مدد (خواہ وہ جب انسانیت کے جذبہ کے تحت نہ دی گئی ہو اور محض دولت کمانے کے لئے فراہم کی گئی ہو) کو بھی ایک خاص مقام حاصل ہے۔

یہ تو وہ مدد ہے جو ہر ملک دوسرے سے لیتا ہے اور اس طرح انسانیت کی مشترک میراث سے اپنا حصہ حاصل کرتا ہے۔ لیکن روس نے اس کے ساتھ ساتھ استحصال اور ظلم و زیادتی کے ذریعہ دوسروں سے ناجائز فائدہ بھی اٹھایا اور اس طرح معاشی ترقی کے استعماری طریقے کو استعمال کیا۔ اس سلسلہ میں ہم صرف دو تین چیزوں کی طرف اشارہ کریں گے۔

(ب) سب سے زیادہ ظلم کسانوں پر اور دیہی آبادی پر ہوا۔ غضب یہ ہے کہ خوراک پیدا کرنے والے فاقوں مر رہے تھے اور بیرونی درآمدات کو بڑھانے کے لئے غلہ کو برآمد کیا جا رہا تھا۔[۲۲] ترقیات کے لئے مبادلہ خارجہ کمانے کا یہ بڑا ہی ظالمانہ طریقہ تھا۔ معاشی ترقیات کی سب سے زیادہ قیمت انہی کو ادا کرنی پڑی اور اس کے فوائد سے شہری آبادی متمتع ہوئی۔[۲۳]

(ج) روس میں ۱۶ ریاستیں ہیں۔ ان میں سے سب ایک سی معاشی حالت پر نہیں ہیں۔ اور نہ ہی سب کو ترقی کے مساوی مواقع حاصل رہے ہیں۔ ان میں سے چند ریاستوں کو، خصوصیت سے وسطی ایشیائی مسلمان اکثریت والی ریاستوں کو اور یوکرین کو استحصال کا ہدف بنایا گیا۔ ان کے وسائل سے دوسرے علاقوں کو ترقی دی گئی۔ حال ہی میں یوکرینین

---

[۲۲] بیکو کے فراہم کردہ اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں جب فصل خراب تھی، اجتماعی کھیت بندی کی وجہ سے پیداوار بہت زیادہ گر گئی تھی اور بڑے پیمانے پر فاقہ کی نوبت آ گئی تھی جس میں ۲۵ لاکھ افراد بھوکوں مرے، اس وقت غلہ کی کل پیداوار کا ۳۱ سے ۳۵ فی صدی (۳۱-۱۹۳۰) برآمد کیا جا رہا تھا۔ (بیکو صفحہ ۴۷)

[۲۳] ملان جیلاس (Milan Djilas) جو یوگو سلاویہ کی کمیونسٹ پارٹی کا سکریٹری جنرل اور وہاں کا نائب صدر تھا۔ اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ اس نئے طبقہ کا طریقہ یہ ہے کہ یہ مزدور اور کسان دونوں کا خون چوستا ہے۔ مزدور کے سلسلہ میں حالت یہ ہے کہ "اشتراکی نظام کی ایک لازمی اور دائمی خصوصیت جبری محنت ہے" (صفحہ ۱۰۶) مزدور اپنے کو اس حال میں پاتا ہے کہ اسے نہ صرف اپنی محنت بیچنا، بلکہ ان حالات میں بیچنا ہے جن پر اسے کوئی قابو حاصل نہیں، اس لئے کہ وہ دوسرا اور بہتر مستاجر (employer) تلاش نہیں کر سکتا" (صفحہ ۱۰۷) اسی طرح کسان کی حالت بڑی خستہ ہے۔ اس نئے طبقہ نے "کم اجرت اور جبری فصل خرید کے ذریعہ کسانوں کو لوٹا ہے" (صفحہ ۱۱۶) اس نئے طبقہ کو یہ گوارا نہ تھا کہ زمین کے سلسلہ میں اس کا کوئی بھی حریف ہو۔ اس نے دیہات اور زرعی کھیت پر بھی اپنا تسلط مستحکم کیا اور "یہ نیا طبقہ کسانوں کو غلام بنانے اور ان کی آمدنی میں سے بڑا حصہ ہڑپ کر جانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ (صفحہ ۶۳)

ریپبلک کے منصوبہ بندی کمیشن نے اس پر سخت شکایت کی ہے کہ ان کے وسائل دوسروں کی ترقی کے لئے۔ ناروا طور پر استعمال ہو
رہے ہیں۔ منصوبہ کمیشن کے تخمینے کے مطابق یوکرین میں حاصل ہونے والے بکری ٹیکس اور پیداواری منافع سے تشکیل پانے والے سرمایہ
کا ۲۰ فی صدی یوکرین سے منتقل کر دیا جاتا ہے اور روس کے دوسرے علاقوں مثلاً سائیریا، کازاخستان وغیرہ پر صرف ہوتا ہے ان
کا اعتراض ہے کہ ان مقامات پر اس سرمایہ کاری کے مفید نتائج نہیں نکل رہے اور پیداوار میں اس رفتار سے اضافہ نہیں ہو رہا
جتنا ان وسائل کے یوکرین میں صرف ہونے سے رونما ہوگا۔ اس طرح یوکرین کو بھی نقصان ہو رہا ہے اور بحیثیت مجموعی اور پورے
ملک کو بھی [۱۶۸]

اشتراکیت کے سامراجی جغرافیہ کا مطالعہ بڑا آنکھیں کھولنے والا ہے۔ روس کے ۲ کروڑ ۲۰ لاکھ مربع میل رقبہ میں سے
صرف ۴۰ لاکھ مربع میل وہ ہے جس پر روسی آباد ہیں۔ باقی ایک کروڑ ۸۰ لاکھ مربع میل کا علاقہ (جو امریکہ کے کل رقبہ سے زیادہ
ہے) غیر روسی علاقہ ہے اور اسے قوت اور فوج کشی کے زور سے روسی اقتدار کے تابع کیا گیا ہے۔ اس طرح روس کی کل
آبادی (۲۲ کروڑ) میں سے صرف ۱۰ کروڑ لوگ روسی ہیں باقی ۱۲ کروڑ دوسری قوموں سے متعلق ہیں اور ان کو ان کے حق خود
اختیاری سے محروم کیا ہوا ہے [۱۶۹] ان ۱۲ کروڑ میں سے مسلمانوں کے بارے میں جو اندازے پائے جاتے ہیں وہ ۳ کروڑ سے
۵ کروڑ تک کے ہیں۔ یہ تمام علاقے اور یہ تمام افراد روس کی معاشی تعمیر کے لئے استعمال کئے جا رہے ہیں۔ جس طرح یورپ کی
سامراجی طاقتوں نے اپنے اپنے دور میں دوسروں کی محنت اور ان کی دولت سے اپنے در و دیوار کی رونق بڑھائی یہی طریقہ روس کا
بھی ہے۔ سامراجی استحصال دونوں کی معاشی ترقی کا ایک اہم ذریعہ تھا۔ اس سلسلہ میں کھلی کھلی لوٹ کھسوٹ بھی کی گئی ہے۔ جنگ میں
مفتوحہ ممالک سے تاوان جنگ بھی وصول کیا گیا ہے اور تجارت میں اپنے زیر اثر ممالک کی اشیاء سستے داموں پر خریدی گئی ہیں اور
اپنی مصنوعات ان کی منڈیوں میں عام بین الاقوامی قیمتوں کے مقابلے میں زیادہ مہنگی فروخت کی گئی ہیں۔ ہم صرف چند اہم چیزوں
کی طرف اشارہ کریں گے۔

(۱) روس میں خالص جمہوریہ روس کے سوا جو دوسری قومیں آباد ہیں انھیں معاشی ضرورتوں کے تحت خالص استعماری انداز
میں ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل کیا گیا ہے۔ جسمانی محنت کرنے کے لئے دوسری قومیتوں کے لوگوں کو ملک بھر
میں پھیلایا گیا ہے اور اعلیٰ کاموں کے لئے ہر جگہ خالص روسیوں کو تعینات کیا گیا ہے۔ خود خروشیف نے اعتراف کیا
ہے کہ لاٹویا (Latvia) کے علاقہ میں روسی فوجوں کے داخلہ کے بعد آبادی کا پانچواں حصہ یا تو مار دیا گیا یا اس
کے دوسرے حصوں میں منتقل کر دیا گیا۔ صرف ایک رات میں پندرہ ہزار افراد کو سائیریا منتقل کر دیا گیا۔ اسی طرح ایتھونیا

۱۶۸

۱۶۹ Hevesay, *The Unification of the World*, *op.cit.*, p.106-7; also see: King-Hall, *The Communist Conspiracy*, *op.cit.*, pp.76-80; Kolarz, Victor, *Communism and Colonialism*.

کی آبادی کے بڑے حصے کو دوسرے مقامات پر معاشی محنت کے لئے منتقل کیا گیا[۶۶۰] قازقستان کے بارے میں پرودا کی رپورٹ کے مطابق روسی غلبہ کا حال یہ ہے کہ سرکاری مناصب پر غیر قازقستانیوں کو عظیم اکثریت حاصل رہی ہے اور "ریاست کے سیاہ و سفید کے مالک بنے ہوئے ہیں۔ وزارت صنعت میں اصل قازقستانیوں کا تناسب صرف ۴٫۱ فی صدی ہے "وزارت زراعت میں ۱۰ فی صدی" وزارت صحت میں ۸ فی صدی اور وزارت صنعت (مقامی) میں ۲ فی صدی[۶۶۱] دوسری طرف قازقستان کی ۱۹۳۹ اور ۱۹۲۶ کی شمار آبادی (census) کا اگر موازنہ کیا جائے تو آبادی میں سے ۸ لاکھ افراد کم ہوگئے ہیں یہی کیفیت دوسرے غیر روسی علاقوں کی' خصوصیت سے غیر یورپی روس کے علاقوں کی ہے۔ محنت کا یوں استعمال استعمار کا ایک خاص حربہ رہا ہے۔

(۱۱) جن جن ممالک پر روس کا قبضہ ہوا ہے وہاں سے بھی اس نے محنت حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ چونکہ روس کے پاس زمین اور وسائل بے پناہ ہیں اور اسے دوسرے ممالک سے محنت کی ضرورت ہے (جس طرح امریکہ کو تھی) اس لئے اس نے اپنے مقبوضہ علاقوں سے محنت کو منتقل کیا ہے۔ اس کی اہم ترین مثال مشرقی یورپ کے ممالک میں پولینڈ کی ہے۔ پولینڈ پر روسی اقتدار نازیوں سے معاہدہ کے ذریعہ قائم ہوا تھا۔ اس کے فوراً بعد وہاں سے پیمانۂ کبیر پر آبادی کی منتقلی شروع ہوئی۔ یہ سارا کام ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا گیا۔ اسی طرح جس طرح کبھی غلاموں کی تجارت کا کام ہوتا تھا۔ مشرقی پولینڈ کی ۱۳ ملین آبادی میں سے ۳ سے ۴ ملین تک لوگوں کو منتقل کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔ عملاً ۱۵ لاکھ کو منتقل کر دیا گیا۔[۶۶۲] سرکاری منصوبہ کا اندازہ حکومت کے فرامین اور قوانین سے بھی کیا جا سکتا ہے۔[۶۶۳]

(۱۱۱) خالص استعماری انداز میں چین اور مشرقی یورپ کے ممالک سے معاشی فائدہ اٹھانا۔ ان کے خام مال کو سستے داموں پر خریدا گیا۔ ان کو اپنا فاضل مال مہنگے داموں پر دیا گیا۔ ان کی فصلوں کو وہاں کے عوام کی ضروریات کے باوجود روس منتقل کر دیا گیا۔ روسی ماہرین کے لئے روزگار فراہم کیا گیا اور اونچے اونچے مقامات پر ان کو تعینات کیا گیا۔ ناقابل تردید حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۴۴ سے ۱۹۵۶ تک روس نے مشرقی یورپ کے ممالک سے ۲۰ سے ۲۵ ارب ڈالر کی مالیت کا سرمایہ اپنی

---

[۶۶۰] Khruscheve. Vide, *The Soviet World*, op.cit., p.423-24

[۶۶۱] **Kazakhstenskaya Pravda, 13th August, 1946**

[۶۶۲] واضح رہے کہ ۳۰ جون ۱۹۴۱ میں پولینڈ اور روس کے درمیان لندن میں ایک معاہدہ ہوا جس میں سرکاری طور پر تسلیم کیا گیا کہ ان منتقل شدہ آبادیوں کو واپس کیا جائے گا۔ ریڈ کراس ان میں سے صرف ۵ لاکھ افراد کو واپس کرا سکی باقی ۱۰ لاکھ کی اسے کوئی خبر نہ مل سکی۔

[۶۶۳] مثلاً ملاحظہ ہو سویٹ لیتھوانیا کی وزارت داخلہ کا فرمان نمبر ۰۰۲۴ مورخہ ۲۸ نومبر ۱۹۴۰ بحوالہ آرتھر کوئسلر۔ یوگی اینڈ دی کیسار۔ صفحہ ۲۰۷۔

طرف منتقل کیا۔ ۱۶۲ اس طرح روس نے ان ممالک کا کھلا کھلا استحصال کیا اور ان کے ذریعہ اپنی معاشی ترقی کا سامان فراہم کیا۔ اس کے بعد ۱۹۵۶ سے ۱۹۶۱ تک جو کل مالی امداد روس نے ان ممالک کو دی (اور اس کا دو تہائی ۱۹۵۶ کے بعد دیا گیا اور خصوصیت سے مشرقی جرمنی، پولینڈ اور ہنگری کے ہنگاموں کے بعد حالات کو قابو میں لانے کے لیے کیا گیا) وہ ۲ ۱/۲ ارب ڈالر کے متجاوز نہیں بلطف کی بات یہ ہے کہ ایک طرف تو امداد کا ڈھونگ رچایا جا رہا تھا اور دوسری طرف اس سے ، گنا زیادہ مالیت کا سرمایہ ان ممالک سے منتقل کر لیا گیا!

پھر استحصال کا ایک اور اہم طریقہ قیمتوں کا کھیل رہا ہے۔ روس نے مشرقی ممالک سے مال سستا خریدا اور ان کے ہاتھوں اپنا مال مہنگا بیچا۔ ایک تحقیقی مطالعہ کی رو سے ۱۹۵۵-۶۱ کے درمیان جو مال روس نے مشرقی یورپ کو برآمد کیا۔ اس پر جو قیمتیں چارج کی گئیں وہ ان سے زیادہ تھیں جن پر یہ مال یورپ کے دوسرے غیر اشتراکی ممالک کو فروخت کیا گیا۔ اس طرح جو فاضل قیمت وصول کی گئی ۵ ارب ۴۰ کروڑ روبل (تقریباً ایک ارب ۴۰ کروڑ) تھی۔ ۱۶۳ اس کا سب سے زیادہ بار ہنگری پر پڑا۔ جس نے ۱۰ فی صدی قیمتیں زیادہ ادا کیں۔ زیکوسلوویکیہ اور مشرقی جرمنی سے علی الترتیب ۴.۸ فی صدی اور ۰.۸ فی صدی زیادہ قیمتیں وصول کی گئیں۔ بجز یوگو سلاویہ اور منگولیہ کے کوئی دوسرا ملک اس امتیازی سلوک سے نہ بچا۔ ۱۶۴ اس سلسلہ میں فریڈرک پرائی یور (Fredrich Pryor) نے جو تحقیقی مطالعہ کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرقی یورپ کے ممالک کی تجارت کا جو تاریخی رخ تھا اسے مصنوعی طور پر تبدیل کیا گیا۔ ان ممالک کو روسی معیشت سے منسلک کرنے کے لئے ۱۹۴۹ میں کومی کون (Comecon) کا قیام عمل میں آیا۔ ایک مدت تک ان ممالک کی معیشتوں پر روس کی گرفت بڑی سخت رہی اور قیمتوں کے امتیاز کے ذریعہ ان کو مسلسل لوٹا گیا۔ موصوف نے شرائط تجارت کے موازنہ سے ثابت کیا ہے کہ روس نے مشرقی یورپ سے مال سستا خریدا اور اسے اپنی مصنوعات مہنگی بیچیں۔ ۱۶۵ اس استحصال کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرقی یورپ میں اس کے خلاف غیظ و غضب اور نفرت کے جذبات رونما ہوئے۔ ۱۶۶

---

۱۶۳ Wszelaki, Jan, *Cbmmunist Economic Strategy*, The Role of, *East-Central Europe*, National Planning Association, Weshington 1959.

(Dimensions of Soviet Economic Powei)

پینی لوپ سٹنبرگ نے میں ۱۹۶۲ میں لکھا تھا کہ "جنگ کے بعد کے پہلے دس سالوں میں روس نے مشرقی یورپ سے سرمایہ منتقل کیا وہ دسیوں ارب ڈالر تھا" صفحہ ۴۲۔

۱۶۴ vide Wochen bericht No.33, Munich, quoted by Havesay, *The Unification of the World*, op.cit., p.78-79.

۱۶۵ idib., p.79.

۱۶۶ see, Pryor, Fredric L.. *The Communist Foreign Trade System*. M.I.T., Cambridge, Mass, 1963; pp,144-152.

۱۶۷ اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ بلغاریہ کے مشہور کمیونسٹ کوسٹو (Costo) کو اس جرم میں سزا دی گئی (باقی آئندہ صفحہ پر)

۱۹۵۶ کے بعد سے کومی کون کے خلاف بغاوتیں شروع ہوئیں۔ رومانیہ نے اپنے کو منقطع کیا۔ چین نے اپنا رشتہ توڑا، البانیہ نے قطع تعلق کیا اور ہنگری اور پولینڈ نے بھی تجارت کی شرائط تبدیل کرلیں۔

روس کی معاشی ترقی کے سلسلہ میں ایک اور قابل لحاظ پہلو یہ ہے کہ اس پورے زمانے میں محنت کی رسد میں کس رفتار سے اضافہ ہوا ہے۔ اگر اس کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ محنت کی سپلائی بہت تیزی سے بڑھی ہے۔ ۱۹۲۶ اور ۱۹۳۹ کے درمیان کل آبادی میں صرف ۱۶ فی صدی کا اضافہ ہے لیکن شہری آبادی میں اضافہ ۱۰۰ فی صدی کا ہے۔ دوسری جنگ کے بعد کی ترقی کی رفتار اور محنت کاروں کی تعداد میں اضافہ کو اگر ساتھ ساتھ دیکھا جائے تو بڑے اہم نتائج نکلتے ہیں۔ جنگ کے بعد کے سالوں میں صنعتی پیداوار میں اضافہ کا اوسط ۱۱ فی صدی بتایا جاتا ہے اور اس زمانہ میں محنت کی قوت میں اضافہ کا اوسط ۵۔۸ فی صدی تھا۔ سات سالہ منصوبہ کے دوران بھی محنت میں ۳ فی صدی سالانہ کا اضافہ متوقع تھا۔ کام کرنے والے ہاتھوں کی تعداد کا بڑھنا بھی پیداوار کے اضافے کا سبب ہے۔ (بحوالہ ۱۶۱ (The Soviet World, p.161)

اوپر کی گذارشات سے یہ نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔

** روس کی معاشی ترقی بہت سے عوامل کا نتیجہ ہے۔ اس میں اشتراکیت کا بحیثیت ایک نظریہ کے ایک خاص حصہ تو ضرور ہے لیکن یہ ترقی صرف اشتراکی نظریہ کی پیداوار نہیں ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے بہت سے عامل کارفرما رہے ہیں جو نظریاتی اعتبار سے غیر جانب دار ہیں۔ اور ترقی میں ان کا حصہ اہم اور فیصلہ کن رہا ہے۔ اس حصہ کو اشتراکیت کے حساب میں جمع نہیں کیا جا سکتا۔

** معاشی ترقی کے سلسلہ میں روسی اشتراکیت نے بھی متعدد میدانوں میں وہی بنیادی طریق کار اختیار کیا ہے جو سرمایہ دارانہ ممالک نے اپنے اپنے دور میں اختیار کیا تھا۔ یہاں بھی سرمایہ، معاشی محرکات، محنت کے استحصال اور سامراجی امتیازات نے ویسا ہی پارٹ ادا کیا ہے جیسا سرمایہ دارانہ ممالک میں۔ اشتراکیت معاشی ترقی کے عاملین کی اسی طرح محتاج رہی ہے جس طرح دوسرے ممالک۔ وہ معاشی قوانین کی بھی ویسی ہی تابع رہی ہے۔ جیسی مغرب کی معیشتیں۔ فرق تنظیم کے میدان میں ہے۔ ترقیاتی حکمت عملی کا اگر گہرائی میں جا کر موازنہ کیا جائے تو دونوں نظاموں میں بڑی یکسانی پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ

(بقیہ ۱۱۵ کا حاشیہ صفحہ گذشتہ سے آگے)

کہ روس کے ساتھ تجارتی معاہدات کرتے وقت اس نے "تقریباً ہر قدم پر دلیل بازی کی مثلاً روبل کی شرح تبادلہ کے بارے میں، جرمنی کے اثاثوں کے بارے میں، بلغاریہ کے مال کی قیمتوں کو بڑھانے اور روسی مال کی قیمتوں کو کم کرنے کے بارے میں، اور روس کے ۱۹۴۸ میں روبل کی قیمت کو کم کر دینے کے بعد بلغاریہ کی کرنسی کی تخفیف قدر سے انکار کر دینے کے بارے میں"

شہادت بورس ہیرسٹوو Boris Hristov) (Kistov) در مقدمہ کوسٹوو۔ الزامات خود ثابت کر دیتے ہیں کہ روس ان ممالک کے بارے میں کس پالیسی پر چل رہا تھا۔

ہے کہ اشتراکی اہل قلم کی ایک معتبر تعداد روسی اشتراکیت کو ریاستی سرمایہ داری کہتی ہے۔ اور یہ اس نظام کا بڑا نامناسب نام ہے[۱۷۸]

۵۔ معاشی ترقی کی قیمت

اوپر کی بحث میں روسی اشتراکیت کی ترقی کے جائزہ کے ساتھ ساتھ اس کے کچھ دوسرے پہلو بھی زیر بحث آگئے ہیں اور ان سے اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اس ملک کو ترقی کی کیا قیمت دینی پڑی ہے۔ اب ہم اس سلسلہ کے چند دوسرے امور کی طرف اشارہ کریں گے۔[۱۷۹]

(۱) اشتراکیت کے معاشی نظام کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس میں انفرادی آزادی۔ معاشی، سیاسی اور تمدنی۔ باقی نہیں رہتی ہے۔ اس نظام میں کلیت پسندی، جبر و تشدد اور من مانی کرنے کا رجحان غالب ہے۔ اس میں کسی بھی آمر کے لئے یہ موقع موجود ہے کہ وہ پوری معیشت کو ظلم کی چکی میں تبدیل کر دے۔ سیاسی اور معاشی قوت کا چند ہاتھوں میں ارتکاز اجارہ کی بدترین شکل کو جنم دیتا ہے۔ اور اس عظیم قوت کے ٹھیک ٹھیک استعمال کئے جانے کی کوئی ضمانت باقی نہیں رہتی ہے۔ کوئی منظم حزب اختلاف نہیں ہوتی جو انحراف کی راہوں پر تنقید کر سکے۔ مختلف سیاسی اور معاشی قوتیں بیک وقت کارفرما نہیں ہوتیں کہ بے اعتدالیوں کا مداوا کیا جا سکے۔ اس کے نتیجہ میں معاشی ظلم بھی رونما ہوتا ہے اور سیاسی استبداد بھی۔ اور یہ اشتراکیت کی سب سے بڑی قیمت ہے جو انسانیت کو ادا کرنی پڑتی ہے۔[۱۸۰]

---

[۱۷۸] see, Yugoff Aron *Economic Trends in Soviet Russia*, London, 1929; Gorter, Herman, "The World Revolution," Worker's Dreadnought, 9, 16, 23February, 11, 15, 29March, 10May 1924; Forest. F., "The Nature of the Russian Economy." *The New International*, New York' December, 1942, pp.52-58. December 1946 pp.313-18 and January 1947, pp.97-30: Djilas, Milovan, *The New Class*, New York, 1948.

[۱۷۹] یہاں تک یہ مضمون لکھنے کے بعد محسوس ہوا کہ اگر باقی مباحث کو مختصر تفصیل کے ساتھ بھی لیا جائے تب بھی چراغ راہ کی اس اشاعت خاص کا دامن اس کے لئے تنگ ہوگا۔ اس لئے مجبوراً باقی کے مباحث کا صرف خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے اور حوالہ جات بھی کم سے کم تر کر دیئے گئے ہیں۔ اگر کبھی اس مضمون کو کتابی شکل میں لانے کا موقع ملا تو اس حصہ کو مکمل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

[۱۸۰] اس سلسلہ میں صرف ایک غیر روسی مثال پیش کی جاتی ہے۔ ہنگری کے وزیر خارجہ راجک (Rajk) کو ۱۹۴۹ میں غداری سرمایہ داروں سے ساز باز، ملک دشمنی اور نظریہ سے بے وفائی کے الزام میں پھانسی کی سزا دی گئی تھی۔ راجک نے اپنے ان تمام "جرائم" کا صاف صاف اعتراف بھی کر لیا تھا بلکہ اس نے خود ہی اپنے لئے سزائے موت کا مطالبہ کیا تھا کہ مجھ جیسے انسان کو (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(۲) معاشی فیصلے سیاسی مصلحتوں کے اس درجہ تابع ہو جاتے ہیں کہ محض حالات اور حقائق کی بنیاد پر کوئی معاملہ طے نہیں کیا جاسکتا یہ صحیح ہے کہ سارے فیصلے صرف معاشی بنیادوں پر نہیں کئے جا سکتے' لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ اگر معاشی نظام کو سیاست کا اس درجہ تابع کردیا جائے کہ حکومت کے سوا کوئی معاشی اکائی باقی نہ رہے اور اس ایک قوت پر بھی نہ کوئی پابندی ہو اور نہ ہی اس کے محاسبہ کا کوئی نظام تو پھر معاشی حقائق کو نظرانداز کرکے سیاسی مقاصد اور ذاتی مفادات کے لئے پالیسیاں بنتی اور بگڑتی ہیں اور بحیثیت مجموعی معاشرے اور معیشت کو اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔

(۳) اشتراکیت کے معاشی نظام میں ارادہ اور اختیار کی جگہ جبر اور کلی منصوبہ بندی لے لیتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں محنت کی صف بندی کی جاتی ہے۔ مزدور تنظیموں کو بے اثر کر دیا جاتا ہے۔ جبری محنت تک لی جاتی ہے' پیشہ کی آزادی باقی نہیں رہتی۔ یہ چیز پورے نظام میں ایک شدید قسم کی جکڑ بندی (regimentation) پیدا کردیتی ہے۔

(۴) روسی اشتراکیت' اور پھر چین اور مشرقی یورپ کے ممالک نے جو بنیادی معاشی حکمت عملی وضع کی ہے اس میں بھاری صنعت کو صارفین کی صنعتوں پر اس درجہ فوقیت دی گئی ہے کہ عام انسانوں کے استعمال کی عام اشیاء کی شدید قلت رونما ہو گئی ہے۔ معاشی اور سیاسی آزادی تو گئی ہی تھی' اشیاء صرف کی بھی کمیابی رونما ہو گئی اور عوام کا معیار زندگی بڑھنے کی بجائے کم ہونے لگا یا اگر اس میں اضافہ ہوا تو بڑی معمولی حد تک۔ پوری صنعتی ترقی میں بھاری صنعت کا رنگ غالب رہا ہے (Heavy industry complex) یہ چیز عوام کے مفاد اور عام فلاحی تصورات کے منافی اور اشتراکیت کے مزاج کے عین مطابق تھی۔ اس لئے کہ اشتراکیت کی اصل توجہ پیداوار کو بڑھانے' بڑے سے بڑے ادارے قائم کرنے' زیادہ سے زیادہ مزدور تیار کرنے اور جلد از جلد مغربی ممالک کو کل پیداوار کی مقدار میں پیچھے چھوڑ دینے پر تھی۔ اس کی قیمت عام صارفین کو ادا کرنی پڑی اور وہ ضرورت کی بنیادی چیزوں کو بھی ترستے رہے اور اگر انھیں حاصل کرسکے تو اونچی قیمتوں پر۔ اس چیز کو وہاں کے نظام محصول نے اور بھی پیچیدہ کردیا اور قیمتوں کے بارے میں سرکاری پالیسی نے اس کی تلخی کو اور بڑھا دیا۔ عام آدمیوں کی اجرتیں کم رکھی گئی ہیں اور قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ غرض عام آدمی کے لئے یہ معاشی ترقی بور کے لڈو ثابت ہوئی:

روس میں حقیقی معیار زندگی کا کیا حال ہے؟ اس کے بارے میں چند ضروری حقائق پیش کئے جاتے ہیں۔ برطانوی سوشلسٹ آرتھر لیوس لکھتا ہے کہ

"یہ ماننے کے لئے کوئی دلیل موجود نہیں ہے کہ روسی مزدور اپنی محنت سے پیداکردہ اشیاء میں سے اس سے کچھ زیادہ ہی حصہ پا رہا ہے جو ایک مزدور کسی دوسرے ملک میں حاصل کرتا ہے۔ زیادہ صحیح یہ ہے کہ روس میں اس کا حصہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) زندہ رہنے کا حق نہیں۔ اس سب کے باوجود اس کو پھانسی دینے کے ۶ سال بعد ۱۹۵۶ء میں حکومت نے اعلان کیا کہ جو کچھ راجک کے ساتھ کیا گیا وہ غلط تھا' تمام الزامات جھوٹے اور اختراعی تھے' محض وہ سیاسی انتقام کا نشانہ بنا اور اب اس کے بے گناہ ہونے کا اعلان کیا جاتا ہے!

سیاسی اور معاشی آمریت کے گٹھ جوڑ میں انسانوں کا یہی حشر ہوتا ہے اور داد رسی کا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا۔

دوسروں سے کچھ کم ہی ہے: "[۱۸۱]

کولن کلارک کے حساب کے مطابق فی کس حقیقی آمدنی میں اولیں دور میں کمی ہی ہوئی۔ ۱۹۰۰ میں فی کس حقیقی آمدنی ۵۰،۵ تھی، ۱۹۱۳ سے ۱۹۳۷ء تک اس کی کیفیت یہ تھی [۱۸۲]

	فی کس حقیقی آمدنی
۱۹۱۳	۵۸،۵
۱۹۲۱	۲۲،۴
۱۹۲۸	۵۵،۵
۱۹۳۴	۵۱.۵
۱۹۳۷	۷۲،۳

ڈاکٹر شوارنز کے نتائج تحقیق سے معلوم ہوتا ہے ۱۹۲۸ اور ۱۹۴۸ کے درمیان حقیقی قوت خرید میں ۴۰ فی صدی کی کمی آگئی تھی۔ لیوس نے تو دوسری جنگ تک کے حالات کے جائزہ کو اس آخری جملہ پر ختم کیا ہے کہ "اتنے لوگوں پر اتنے کم عرصے میں اتنی زیادہ مصیبتیں شاذ ہی نازل ہوئی ہوں گی۔" [۱۸۳]

ڈوب نے اعتراف کیا ہے کہ اشیائے صرف کے استعمال میں روس بہت پیچھے ہے [۱۸۴] اس سلسلہ میں غالباً سب سے زیادہ دقیقہ ریزی کے ساتھ جس محقق نے کام کیا ہے وہ چیپ مین ہے۔ اس کے پیش کردہ نتائج کا خلاصہ یہ ہے کہ روس میں حقیقی اجرت ۱۹۳۷ میں ۱۹۲۸ کے مقابلہ میں ۵، فی صدی کم تھی، ۱۹۴۸ میں وہ ۱۹۲۸ کے مقابلہ میں ۴۵ فی صدی کم تھی اور ۱۹۵۴ میں بھی، خاصے اضافے کے باوجود، وہ ۱۹۲۸ کی سطح کے مقابلہ میں ۱۲ فی صدی کم تھی [۱۸۵] زرعی آبادی کی فی کس حقیقی آمدنی کی حالت اس سے بھی خراب تھی۔ [۱۸۶] اگر روس کی آبادی کے بارے میں عام اشیاء کے استعمال کی کیفیت کو معلوم کیا جائے تو اندازہ

۱۸۱ھ Lewie, W. Arther, *Economic Survey*' 1919-39, Unwin University Books. 1966, London, p.134.

۱۸۲ھ Clark, Colin, Critique of Russian Statistics, op.cit..

۱۸۳ھ Lewies, *Economic Survey*, p.135.

۱۸۴ھ Dobb, *Soviet Economic Development Since 1917*, p.288-89

۱۸۵ھ Chapman, Janet G., *Real Wages in Soviet Russia since 1928*, Harward University Press, Cambriege, Mass, 1963.

۱۸۶ھ Jasny Naum, *Essays on the Soviet Economy*, Institute for the Study of the USSR- Munich, 1162,p.93.

ہوتا ہے کہ آٹے اور آلو کو چھوڑ کر ہر چیز میں وہ مغربی ممالک [illegible] سے بھی پیچھے ہیں۔ یہ وہ چیزیں وہ ہیں جن سے کہ ایک عام آدمی اپنا پیٹ بھرتا ہے۔ باقی تمام ضروری چیزیں مثلاً گوشت، انڈا، مرغی، دودھ، دہی، مچھلی، شکر وغیرہ میں اس کا معیار ترقی یافتہ ممالک کے معیار سے بہت کم، بلکہ نصف اور ایک تہائی تک ہے۔[۱۱۷] دیرپا اشیائے صرف (کار، ریڈیو، ٹیلیویژن، ریفریجریٹر، کپڑا دھونے کی مشین وغیرہ) کے سلسلہ میں روس کی حالت اور بھی ابتر ہے[۱۱۸]

ایک اور پہلو کے مطالعہ سے بھی یہی حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ایک بڑی تعداد کا خون چوس کر ایک محدود طبقہ کو زندگی کی سہولتیں پہنچائی گئی ہیں اور صنعتی ترقی کے مراحل کو طے کیا گیا ہے۔ عوام کی بڑی تعداد پر مصیبتوں کے پہاڑ توڑے گئے ہیں۔ تب کہیں جا کر یہ ملیں اور یہ فیکٹریاں اپنا سر بلند کر سکی ہیں۔ ان کی بنیاد میں کسانوں کی ہڈیاں اور جبری محنت کا روں کا خون اور پسینہ ہے۔ لن یوٹانگ کے فراہم کردہ اعداد و شمار کی روشنی میں سرکاری ملازمین، جو کل آبادی کا ۱۴ء ۱۲ فی صدی ہیں۔ کل قومی آمدنی کا ۳۵۔۳۰ فی صدی لے جاتے ہیں صنعتی مزدور کو بھی اپنی تعداد (۲۲۔۲۰ فی صدی) کے مقابلہ میں زیادہ حصہ ہی ملتا ہے۔ (یعنی ۳۳ فی صدی) لیکن کسان جو آبادی کا ۵۳ فی صدی تھے آمدنی کا صرف ۲۹ فی صدی پاتے ہیں اور جبری محنت کے مجبور انسان جو آبادی کا ۳ فی صدی تھے ان کو صرف ۲ فی صدی آمدنی جاتی ہے۔

روس کی معاشی ترقی میں بھی کچھ کا خون چوسا گیا ہے اور کچھ دوسری کی فربہی کا بندوبست کیا گیا ہے۔

(۵) روسی مصنوعات کا معیار پست ہے۔ کیفیت (quality) کے اعتبار سے وہ کوئی اعلیٰ مثال قائم نہیں کر سکا ہے۔ اسی طرح نفاست اور خوش ذوقی کا بھی خیال نہیں رکھا جاتا۔ شاید یہ سب چیزیں بورژوائی ذہن سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کا روس میں کیا کام؟[۱۱۹] روسی نظام میں ساری اہمیت پیداوار کو بڑھانے کو دی گئی۔ اس کا فکری نتیجہ تھا کہ کمیت کو کیفیت پر فوقیت حاصل ہو گئی۔ پھر کامیابی کے جو معیارات مقرر کئے گئے ان میں بھی اصل چیز پیداوار کا اضافہ، ہدف کی تکمیل بلکہ اس سے آگے نکل جانا تھا۔ یہ کام کیفیت کو قربان کر کے ہی ہو سکتا تھا۔ پھر یہ چیز آہستہ آہستہ معیشت کا مزاج بن گئی اور اب کیفیت کی خرابی (poor quality) پوری معیشت کے لئے ایک دردِ سر بن گئی ہے۔ روسی اخبارات میں اس کا اعتراف کیا جا رہا ہے کہ ہماری مصنوعات نہایت پست کوالٹی کی ہیں۔ مثلاً پراودا میں لکھا گیا ہے کہ

---

[۱۱۷] Bergson A, and Kuznets S.. (Ed.), *Economic Trends in the Soviet Union*, p.252. See, *Economic Systems in Action*, p.155-56.

[۱۱۸]

[۱۱۹] لیکن یہ نتیجہ صحیح نہیں ہوگا! اس لئے کہ نئے حکمران طبقہ کے لئے تعیش کی چیزوں کو فراہم کیا جا رہا ہے۔ ۳۲-۱۹۳۲ اور ۳۷-۱۹۳۶ کے درمیان جو نہایت سخت زمانہ تھا اور جس میں عام اشیائے صرف کی پیداوار کو اقل حد تک کم کر دیا گیا تھا اور جب قحط سالی اور بھوک کی کیفیت تھی، جب کاشتکار اپنے جانور کاٹ کاٹ کر پیٹ کی آگ بجھا رہا تھا اس وقت بھی ان اشیاء تعیش کی پیداوار میں اس رفتار سے اضافہ ہوا۔

عطر اور سینٹ	۲۷۰ فی صدی	گراموفون	۵۰۰ فی صدی
کپڑے	۱۷۵۰ ″	اعلیٰ ریشمی کپڑا	۴۴۰ ″
اور عام سوتی کپڑا	۴۴ ″	(بحوالہ لن یوٹانگ۔ صفحہ ۳۵-۳۰)	

"اعلیٰ قسم کی جدید اشیاء کے ساتھ ہم بہت سی چیزیں ایسی تیار کرتے ہیں جو صارف کو مطمئن کرنے میں ناکام ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ آسانی سے نہیں بکتیں۔ یہ مال جو گوداموں اور دوکانوں میں پڑا ہوا ہے معیشت کے لئے ایک بار ہے"[190]

پراودا ہی میں ایک دوسرے مضمون میں کہا گیا ہے کہ

"روس میں بجلی کے قمقموں اور دوسری گھریلو استعمال کی ضروری چیزوں کی کمی ہے"[191]

اور ایک مضمون میں یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ کیلیابنک (Chelyabinsk) فیکٹری میں تیار کردہ فرنیچر اتنا ناقص ہے کہ وہ ناقابل استعمال ہے اور اس کی بہت سی چیزوں کو ردی کے پھینکنا پڑا ہے۔[192]

ایک دوسرے فرنیچر کے کارخانے (Kuybyslev) کے بارے میں خبر آئی ہے کہ ۱۹۶۱ میں اس کی کل پیداوار کے ۵۴ فی صدی کو فیکٹری ہی میں ناکارہ قرار دیدیا گیا اور باقی کے ۴۶ فی صدی کو تجارتی ادارہ نے رد کر دیا۔ ایسی ہزاروں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روس میں اس وقت جو مسئلہ معاشین کے لئے دردِ سر بنا ہوا ہے وہ کوالٹی کا مسئلہ ہے اور لائبرمین نے جو انقلابی اصلاحات تجویز کی ہیں ان کی پشت پر کام کرنے والا محرک بھی روس کی اشتراکی منصوبہ بند معیشت کی یہ بنیادی خرابی ہے۔

(۶) روس کا ٹیکس کا نظام بھی اس مخصوص معاشی حکمت عملی کے مطابق ڈھالا گیا ہے لیکن اس بنا پر وہ بے حد غیر منصفانہ ہو گیا ہے۔ روس میں انکم ٹیکس سے کل سرکاری مالیات کا صرف ۷،۷ فی صدی حاصل ہوتا ہے جب کہ بکری ٹیکس سے ۴۲،۵ فی صدی۔ یہ ٹیکس ایک بالواسطہ ٹیکس ہے جو اشیاء کی قیمتوں پر عائد کیا جاتا ہے اور جس کا بار عوام پر صارفین پر اور نچلے طبقوں پر زیادہ پڑتا ہے۔ مارکس کے نظام فکر میں یہ ایک حربہ استحصال کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کو روس میں سب سے زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔ پھر غضب یہ ہے کہ عام استعمال کی حتیٰ کہ بنیادی ضروریات حیات بھی اس ٹیکس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ چائے پر اس کی شرح ۱۰ سے ۱۲ فی صدی ہے۔ روٹی پر ۲۰۔۴۴ فی صدی شکر، میدہ، دالیں، بناسپتی گھی وغیرہ پر ۴۹ سے ۷۰ فی صدی تک۔ بجلی اور گیس پر ۱۸ سے ۶۵ فی صدی تک، چمڑے کے سامان (جوتوں) وغیرہ پر ۵۰ سے ۷۷ فی صدی، باورچی خانہ اور گھریلو استعمال کے سامان پر ۳۳ سے ۷۶ فی صدی اور مستقل اشیائے صرف پر ۲ سے ۵۷ فی صدی تک۔[193] اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ نظام کتنا غیر منصفانہ ہے اور کس طرح عام آدمی کو ساری ترقیات اور حکومت کے سارے مصارف کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ ہر روٹی جو کھائی جاتی ہے اس پر بھی ایک مستقل محصول ادا کیا جاتا ہے۔

(۷) اشتراکیت کی معاشی حکمت عملی کا سب سے کمزور پہلو زراعت ہے۔ دنیا کے کسی بھی ملک میں زراعت کے میدان میں اشتراکیت کامیاب نہیں ہو سکی۔ اشتراکیت نے اپنی زرعی پالیسی کو بالعموم دو مراحل میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے مرحلے میں تو اصل ہدف

---

[190] پراودا۔ ۹ جولائی ۱۹۶۴

[191] پراودا۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۶۴

[192] پراودا۔ مارچ ۱۹۶۵

[193] یہ اعداد و شمار روس کے سرکاری ذرائع سے ماخوذ ہیں۔ حوالہ کے لئے ملاحظہ ہو Economic Systems in Action

زمیندار طبقہ ہوتا ہے اور زرعی اصلاحات کے ذریعہ اس سے زمین چھیننے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کام کے لئے بالعموم عوامی موجود ہوتی ہے اور کسان بھی اس پر خوش ہوتا ہے لیکن دوسرے مرحلہ میں زمینداروں سے حاصل کی ہوئی زمینوں کو سرکاری ملکیت میں لایا جاتا ہے اور کاشت کار کی حیثیت بس ایک مزدور کی سی ہو جاتی ہے۔ پہلے مرحلے میں وہ یہ خواب دیکھا رہتا ہے کہ اب زمین اس کے تصرف میں ہوگی لیکن جب زراعت کو اجتماعی کھیتوں میں منظم کر دیا جاتا ہے تو وہ خالی ہاتھ ملتے رہ جاتا ہے۔ آقا بدل جاتے ہیں، اقتدار اس کی طرف منتقل نہیں ہوتا۔ اس کے نتیجہ میں اس کی دلچسپی کم سے کم تر ہوتی جاتی ہے اور زراعت میں مستقل بحرانی کیفیت رہتی ہے۔ اور ہمہ جہتی کوششوں کے باوجود زراعت کی دنیا سنور نہیں پاتی۔ روس کے تجربہ سے جو صورت سامنے آتی ہے اس سے محسوس ہوتا ہے کہ

(الف) اشتراکیت کے پاس زراعت کے میدان کے لئے کوئی اسکیم موجود نہیں ہے۔ وہ اس سے بھی بالکل صنعت کی طرح معاملہ کرتی ہے اور اس کے نتائج نہایت تباہ کن ہوتے ہیں

(ب) اشتراکیت کا اصل انہماک صنعت کے ساتھ ہے، جس کے نتیجہ میں زراعت کے بارے میں غفلت برتی جاتی ہے اور زراعت کی قیمت پر صنعت کو ترقی دی جاتی ہے۔ چونکہ آبادی کی اکثریت زراعت سے وابستہ ہوتی ہے۔ اس لئے اسے بڑی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اور ترقی کے ثمرات سے وہ محروم رہتے ہیں اور جو طبقہ کچھ فائدہ اٹھاتا ہے وہ شہری آبادی سے متعلق ہوتا ہے۔

یہ بات صرف روس ہی کے لئے صادق نہیں بلکہ جہاں بھی اشتراکی تجربہ ہوا ہے یہی نتائج نکلے ہیں۔ آج زراعت کا بحران عالمی اشتراکیت کے لئے ایک پریشان کن مسئلہ بن چکا ہے اور دنیا کے پس ماندہ ممالک کی نگاہوں میں اشتراکیت کے چہرے کو داغ دار کرنے میں سب سے زیادہ دخل اسی پہلو کا ہے۔

روس میں سب سے مظلوم طبقہ کاشت کاروں کا طبقہ ہے۔ اسے عام سہولتوں سے محروم رکھا گیا ہے۔ زمین پر اس کے اقتدار کو ختم کر کے اسے اجیر (wage-earner) کے مقام پر لے آیا گیا ہے۔ زرعی پیداوار کی قیمتوں کو حد درجہ کم رکھا گیا ہے، حتی کہ کچھ اشیاء کے سلسلہ میں تو لاگت سے بھی کم رکھا گیا ہے۔ پھر کسان اور اجتماعی کھیت مجبور ہیں کہ انہی کم داموں پر ایک خاص مقدار حکومت کے ہاتھوں لازماً فروخت کریں۔ دیہی آبادی کو قحط اور فاقہ تک کا سامنا کرنا پڑا ہے جبکہ سرکاری وصولیاں اسی طرح جاری رکھی گئی ہیں اور اشیائے خوردونوش کی برآمد تک کی جاتی رہی ہے۔ کسان مجبور ہوئے ہیں کہ جانوروں کو ذبح کریں اور اس کا نتیجہ ہے کہ کل جانوروں (livestock) کی تعداد میں نہ صرف یہ کہ خاطر خواہ اضافہ نہیں ہو سکا ہے بلکہ پہلی جنگ کے معیار کے مقابلہ میں پیداوار کی حقیقی سطح کم رہی ہے۔ تقریباً تمام سرکاری منصوبوں میں اس کا اعتراف موجود ہے کہ زراعت میں اشتراکی پالیسی ناکام رہی ہے۔ خروشیف نے اپنے پیش روؤں کی اس کوتاہی پر گرفت کی تھی۔ لیکن خود خروشیف کا زرعی منصوبہ بھی ناکام رہا اور اس کی ناکامی خود خروشیف کو لے ڈوبی۔

روس میں اشتراکی زرعی پالیسی کی ناکامی کا سب سے اہم ثبوت پیداوار کے سرکاری اعداد و شمار سے فراہم ہوتا ہے۔ روس کے کل زیر کاشت رقبہ کا ۹۶ء۶ فی صدی اجتماعی تحویل میں ہے اور صرف ۳ء۴ فی صدی ذاتی ملکیت میں۔ کسانوں کو آدھ

اور تین چوتھائی ایکڑ کے کھیت نجی ملکیت میں رکھنے کی اجازت ہے۔ اجتماعی کونسل میں جو ۹۸٫۶ فی صدی علاقہ ہے اس میں سے ۴۹٫۵ فی صدی سرکاری کھیتوں کی شکل میں ہے اور ۴۹٫۱ فی صدی اجتماعی کھیتوں کی صورت میں۔ لیکن اگر پیداوار کو دیکھا جائے تو حیران کن نتائج سامنے آتے ہیں۔

	اجتماعی دائرہ (سرکاری کھیت + اجتماعی کھیت)	نجی دائرہ (انفرادی ملکیت)
رقبہ	۹۸٫۶ فی صدی	۱٫۴ فی صدی
زرعی پیداوار	۶۸ فی صدی	۳۲ فی صدی
حیوانات	۵۳ "	۴۷ "

دوسرے الفاظ میں کل زیرکاشت رقبہ کا صرف "ڈیڑھ فی صدی انفرادی ملکیت میں ہے لیکن پیداوار کا ۳۲ فی صدی اور حیوانات کی فراہمی کا ۴۷ فی صدی اس ۱٫۴ فی صدی رقبہ سے حاصل ہوتا ہے۔ جب کہ اشتراکی دائرہ میں زمین زیادہ اور پیداوار بہت کم ہے۔ یہ چیز اشتراکی طرز پر منظم کھیتوں کی ناکامی اور زراعت میں انفرادی ملکیت کی کامیابی کا بین ثبوت ہے۔ یہی چیز مشرقی یورپ کے تمام ممالک میں رونما ہوئی ہے اور اسی کے نتیجہ میں اب وہاں زراعت میں تیزی کے ساتھ انفرادی ملکیت کا احیاء کیا جارہا ہے۔ چین میں بھی "لمبی چھلانگ" کے تجربے تک بھی یہی نتائج سامنے آئے۔ یہی وجہ ہے کہ سارے اشتراکی ممالک میں ریولینڈ کو چھوڑ کر جس نے اجتماعیت بندی کو آگے بڑھانے کی زیادہ کوشش ہی نہیں کی زرعی پیداوار میں مناسب ترقی نہیں ہوسکی ہے[۱۹۴] اور ان ممالک کو باہر سے غلہ درآمد کرنا پڑا۔ روس اور چین دونوں نے ۱۹۶۳ اور ۱۹۶۴ میں مغربی اور دوسرے ممالک سے غلہ حاصل کیا[۱۹۵] اور یہ سب بھی اس حالت میں کہ روس میں زراعت پر کام کرنے والی محنت دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔ یعنی زیادہ زمین، زیادہ محنت، زیادہ خرچ اور کم پیداوار وہ تمام مظالم اس پر مستزاد جو اشتراکیت نے کسانوں پر کئے ہیں۔

(۴) اشتراکیت نے سرمایہ دار طبقہ کو تو ضرور مٹا دیا لیکن اس کی جگہ ایک نئے طبقہ نے لی اور وہ ہے بیوروکریسی۔ طبقاتی تقسیم اسی طرح موجود ہے۔ بلکہ اس سے شدید تر شکل میں ہے۔ سیاسی اور معاشی اقتدار ایک مخصوص گروہ کے ہاتھوں میں ہے

---

[۱۹۴] زراعت میں اجتماعیت بندی کا آغاز ۱۹۲۸ میں ہوا۔ ۱۹۲۹ اور ۱۹۵۵ کے درمیان کل زرعی پیداوار میں سرکاری اعلان کے مطابق اضافہ ۳۰ فی صدی کا ہوا ہے جب کہ آبادی میں اضافہ ۴۵ فی صدی کا ہوا۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ فی کس زرعی پیداوار ۱۹۵۵ میں ۱۹۲۹ کے مقابلہ میں کم تھی۔ (بحوالہ دی سویٹ ورلڈ صفحہ ۲۰۸)

خروشچیف نے ایک تقریر میں کہا "تمھاری کالی زمین ملک کے بہترین علاقوں میں سے تھی۔ کامریڈز۔ مجھے بتاؤ کہ تمھاری پیداوار کم کیوں ہوگئی؟ گوشت تم اب کم پیدا کر رہے ہو۔ یہ بڑھنے کے بجائے کم کیوں ہوگیا۔ ایک ڈائرکٹر ایک ہیکٹر سے ۱۰ یا ۱۲ ہنڈرڈویٹ سے زیادہ ۱۱ کوئنٹل گندم لے کر کیسے مطمئن ہوجاتا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اس طرح تم اشتراکیت کی منزل تک پہنچ سکو گے۔ (بحوالہ مذکورہ بالا صفحہ ۲۱۰)

[۱۹۵] بحوالہ: دی سویٹ ورلڈ۔ صفحہ ۲۰۹

اور وہ جس طرح چاہتا ہے معاملات کو انجام دیتا ہے۔ اشتراکیت کی بنیادی خامی یہ رہی ہے کہ اس نے اصل اہمیت ملکیت کو دی اور یہ بھول گئی کہ ملکیت کو اجتماعی کرنے کے باوجود بھی افراد اور گروہ کو تصرف کے غیر محدود اختیارات حاصل رہ سکتے ہیں اور تصرف کے اس اختیار میں بھی وہی طبقاتی کیفیت رونما ہو سکتی ہے۔ جہاں جہاں اشتراکیت کامیاب ہوئی ہے وہاں ایسا ہی ہوا ہے۔ میلان جیلاس کی کتاب "نیا طبقہ" The New Class. اشتراکیت کے اس پہلو کا بہترین مطالعہ ہے۔ اس حکمراں طبقہ کو وہ ساری مراعات حاصل ہیں جو سرمایہ داروں کو حاصل ہوتی ہیں اور اس کے اختیارات سرمایہ داروں سے کہیں زیادہ ہیں۔ اور یہ طبقہ سرمایہ دارانہ ممالک کی انتظامیہ کے مقابلہ میں تعداد میں بھی کم ہے[۱۹۶]

یہ ہے وہ قیمت جو انسانیت کو اشتراکیت کی اس معاشی ترقی کی ادا کرنی پڑی جو اشتراکیت کے بغیر بھی حاصل کی جا سکتی ہے اور زیادہ اچھے انداز میں اور اچھی رفتار سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

معاشی استحکام اور سماجی فلاح

معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ اشتراکیت کا ایک دعویٰ یہ بھی ہے کہ اس نے سماجی فلاح، معاشی انصاف اور صنعتی استحکام قائم کیا ہے۔ بہ نظر ظاہر یہ دعویٰ خاصا متاثر کن معلوم ہوتا ہے لیکن حالات کا زیادہ گہرائی میں جا کر مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی اشتراکیت کے کارنامے کو کسی پہلو سے بھی غیر معمولی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس سلسلہ میں قابل غور نکات یہ ہیں۔

(۱) اشتراکیت کا سرمایہ داری پر ایک بہت ہی اہم اور قوی اعتراض یہ تھا کہ اس میں اضاعت (wastage) اور عدم استحکام (instability) پایا جاتا ہے۔ وسائل کا ایک معقول حصہ ضائع ہوتا ہے، انسانوں کی کھیپ کی کھیپ بے روزگار رہتی ہے اور معیشت ایک نہ ختم ہونے والے تجارتی چکر میں گرفتار رہتی ہے۔ سرمایہ داری پر یہ تمام تنقید بالکل بجا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اشتراکیت ان مسائل پر قابو پا سکی ہے؟ اور کیا اس کا قائم کیا ہوا نظام

---

[۱۹۶] گرانک نے روس اور امریکہ میں "سفید کالر والے طبقہ" کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کے تخمینے کے مطابق امریکہ میں صنعت اور معدنیات کے میدانوں میں کل محنت کاروں میں سے ۲۹ فی صدی وہ ہیں جنھیں "سفید کالر" والے کہا جا سکتا ہے جب کہ روس میں یہ تناسب ۷ فی صدی ہے (۱۹۵۵-۵۶)۔ اسی طرح فیکٹری کی طرح پر امریکہ میں سفید کالر والے ملازمین کی تعداد ۲ فی صدی ہے جب کہ روس میں یہ تناسب صرف ۱۵ فی صدی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

Granick, G., "*Soviet-American Management Comparisons,*" *Comparisons of the United States and Soviet Economics,* Washington, 1959.

ہمارا دیا ہوا مواد صفحہ ۱۴۹ سے ماخوذ ہے لیکن پورے مضمون کا مطالعہ مفید ہے۔ ایک دوسرے مطالعہ میں جو مشین بنانے کی صنعت کے بارے میں ہے جو نتائج سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں کہ روس میں انتظامیہ کل عملہ کا صرف ۳ فی صدی ہے (۱۹۵۵-۵۶) جبکہ امریکہ میں اس کا حصہ ۱۴ فی ہے۔

Boretsky, M., *The Soviet Challenge to U.S. Machine Building.*

ان برائیوں سے پاک ہے؟

روس میں ایک رجحان یہ کارفرما رہا ہے کہ بڑے سے بڑا کارخانہ قائم کیا جائے، بڑے سے بڑا اسٹیڈیم اور ہوٹل ہو، بڑے سے بڑا پلانٹ لگایا جائے، بڑے سے بڑا پشتہ (dam) تعمیر کیا جائے۔ عرضی حجم کی بڑائی پر روسی اشتراکیت فریفتہ رہی ہے اور اس کو سرمایہ دارانہ نظام پر اپنی فوقیت کی ایک علامت سمجھتی رہی ہے[۱۹۷] حالانکہ یہ فوقیت کی نہیں اندرونی بیماری کی علامت ہے۔ بڑے ادارے قائم کرنے کا یہ فائدہ تو ضرور ہے کہ ان پر فرد واحد کا کنٹرول بہ آسانی قائم ہو جاتا ہے لیکن اس کے نتیجہ میں بڑی اہم مشکلات اور پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایسے اداروں کو ان کی پوری صلاحیت کارکردگی تک استعمال نہیں کیا جا سکتا اور اسی طرح اضاعت رونما ہوتی ہے جیسے سرمایہ داری میں۔ مثلاً جب ذہنوں میں یہ سمایا کہ برقی قوت + سوویٹ = سوشلزم تو بجلی کے بڑے بڑے کارخانے قائم کئے جانے لگے بلا لحاظ اس کے کہ ان کو استعمال کرنے کے مواقع موجود ہیں یا نہیں۔ ڈنیپر پیٹروسٹرائے (Dnieproprestroy) کا عظیم بجلی گھر اس کی بہترین مثال ہے۔ بجلی کا یہ ایک اسٹیشن ۸۰ لاکھ کی آبادی کی ضروریات پوری کر سکتا تھا اور اپنی تعمیر کے دس سال بعد بھی اپنی صلاحیت سے کہیں کم پیدا کر رہا تھا۔ پھر اس کا نتیجہ ہے کہ روسی اشتراکیت کا سب سے پیچیدہ مسئلہ اشیاء کی تیز رفتار گردش اور نقل و حرکت کا مسئلہ ہے۔ مناسب مقدار میں مال کی رسد اس نظام کے کمزور ترین پہلوؤں میں سے ایک ہے۔ اسی طرح مال کی تقسیم کے سلسلہ میں نقل و حمل کے مصارف (transport costs) بہت زیادہ آتے ہیں۔ ایسی مثالیں بھی ہیں جہاں کوئلہ کی کانوں سے کوئلہ سپلائی کرنے میں کل پیداوار کا نصف خرچ ہو جاتے۔ منڈیوں کا حال یہ ہے کہ ان میں ایک طرف غیر فروخت شدہ اموال کے انبار ہیں اور دوسری طرف غیر تسکین یافتہ اختیاجات[۱۹۸] مثلاً پٹرول کی پیداوار ضرورت سے کہیں زیادہ ہے اور روس اس فاضل پیداوار کو خالص سرمایہ داروں کی طرح سستے داموں پر دینے (dumping) کے لئے کوشاں۔ غیر فروخت شدہ اسٹاک بڑھتے جا رہے ہیں[۱۹۹] اور منڈی کا یہ عدم استحکام بھی ان اسباب میں سے ایک ہے جن کی وجہ سے روس میں محدود مارکیٹ میکانزم کے احیاء کی کوشش کی جا رہی ہے۔ کوسیجن اور لابرمین کی تجاویز کی پشت پر اس مسئلہ کا شعور موجود ہے۔ صرف روس ہی میں نہیں دوسرے اشتراکی ممالک میں بھی ایسے ہی حالات

---

[۱۹۷] اس سلسلہ میں یہ بات سامنے رہے کہ ہر وہ تہذیب جو صرف مادی بنیادوں پر قائم ہوئی حجم کی بڑائی اور وسعت کو غیر معمولی اہمیت دیتی رہی ہے۔ مغربی تہذیب کا بھی یہی حال ہے۔ اس سے پہلے بھی جتنے حسی تمدن قائم ہوتے ہیں مثلاً یونان اور روم ان کا مرض بھی یہی تھا۔ مشہور فلسفی تاریخ اور ماہر عمرانیات پروفیسر پٹرم سوروکن نے اسے تہذیبوں کا ایک مرض قرار دیتا ہے۔ اور ان کی تباہی کے اسباب میں شمار کیا ہے اسے مخصوص بیماری قرار دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ سوروکن۔ *The Crisis of Our Age*

social and cultural dynamics

[۱۹۸] نامور سوشلسٹ برنارڈ شا کا مشہور جملہ ہے کہ سرمایہ داری کے نظام میں شہر کے ایک کونے پر اعلیٰ کھانوں کی ریل پیل ہوتی ہے اور بھوک مفقود اور دوسرے پر بھوک کی فراوانی ہے اور اشیائے خورد و نوش ناپید!

[۱۹۹] see, *Prodlems of Communism*, Dec. 1965, pp.29-30,

دوز پیش ہیں۔ زیکو سلاویکیہ کے بارے میں وہاں کے صدر ریاست نے خود اعتراف کیا ہے کہ مال ہے مگر اس کے لئے کوئی طلب موجود نہیں ہے۔

اسی طرح پیداوار کے لئے جو مادی ہدف مقرر کئے جاتے ہیں اور ان کو پورا کرنے پر جو انعام واکرام دیا جاتا ہے وہ بھی اضاعت کا ایک بہت بڑا سبب ہے۔ جن چیزوں کی پیداوار آسان ہے ان کی طرف وسائل کا بہاؤ بڑھ جاتا ہے۔ بیشتر بھی ہدف سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن چند چیزوں کی پیداوار تو غیر معمولی طور پر بڑھ جاتی ہے۔ لیکن باقی تمام اشیاء کی جن کے بغیر وہ چیزیں اپنی آخری شکل میں مکمل نہیں ہو سکتیں بہت کم ہوتی ہیں۔ عام معاشی محرکات کو چھوڑ کر جو محرکات اشتراکیت نے اختیار کئے وہ پیداوار کو بڑھانے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکے اور اس کو مناسب طریقے پر تقسیم کرنے میں بھی کچھ چیزیں بہت زیادہ ہیں اور کچھ بہت کم۔ اپنے نتائج کے اعتبار سے یہ وہی چیز ہے جو سرمایہ داری میں پائی جاتی ہے۔ وہاں اس کا نام تجارتی چکر ہے اور یہاں ہم اسے "اشتراکی چکر" کہہ سکتے ہیں۔

ایک اور اہم مسئلہ بے روزگاری کا ہے۔ روس نے دعویٰ کیا ہے کہ دوسرے پنج سالہ منصوبہ کے وقت بے روزگاری ختم ہو گئی اور اس کے بعد سے اس سلسلہ کے اعداد و شمار شائع کرنا بند کر دیئے۔ لیکن کیا اعداد و شمار کی اشاعت بند کرنے کے معنی یہ بھی ہیں کہ فی الحقیقت مسئلہ حل ہو گیا۔ بلا شبہ روس میں مزدوروں کے لئے بڑی تعداد میں روزگار فراہم کئے گئے ہیں۔ لیکن کیا اب فاضل محنت (surplus labour) موجود نہیں ہے؟ کولن کلارک کے اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۲۸ء میں روسی زراعت میں فاضل محنت کاروں کی تعداد دو ڈھائی کروڑ سے متجاوز تھی۔ اگر یہ صحیح ہے کہ روس نے بے روزگاری کے اس حقیقی مسئلہ یعنی فاضل محنت کے مناسب استعمال کو ابھی تک حل نہیں کیا ہے۔ پھر سوال مخفی بے روزگاری (disguised unemployment) کا ہے۔ جو آج بھی خاصی موجود ہے۔

ان حالات کی موجودگی میں معاشی استحکام کا دعویٰ خاصہ محل نظر ہے۔ اور اب تو لائبرمین نے جن خامیوں کی طرف نشان دہی کی ہے ان میں سے بیشتر باتوں کو سرکاری طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے! پلاننگ کا وہ طلسم اب خود روس میں بھی کہاں باقی ہے؟

(ii) سماجی انصاف کا مسئلہ بھی خاصا غور طلب ہے۔ اس کے بے شمار پہلو ہیں لیکن ہم صرف چند اہم پہلوؤں کی طرف اشارہ کریں گے۔

(الف) روسی اشتراکیت نے سماجی انصاف کے تصور کو ان اخلاقی بنیادوں سے الگ کر دیا ہے جن میں آج تک اس کی جڑیں اتری ہوئی ہیں اور جن کے بغیر یہ تصور بہت ہی غیر تسلی بخش اور arbitrary ہو جاتا ہے۔

(ب) سماجی انصاف کے تصور کو اس کے محدود معاشی معنی میں بھی پیش کرنے میں اشتراکیت کو اولیت حاصل نہیں ہے۔ اسلام نے تو ساڑھے تیرہ سو برس پہلے اس بنیاد پر ایک پورا معاشی نظام قائم کیا تھا اور اس کے اثرات استیلا کے غلبہ کے دور تک ہماری تاریخ پر باقی رہے۔ یورپ میں بھی سماجی فلاح اور اجتماعی ضمانت (social security) کا نظام بیسویں صدی کے اوائل ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ انگلستان میں صحت کی انشورنس کا آغاز ۱۹۰۸ء میں

ہوگیا تھا۔ بے روزگاری کے خلاف انشورنس کا آغاز ۱۹۱۱ء میں محدود پیمانہ پر ہوگیا تھا۔ مغربی یورپ کے بیشتر ممالک میں عالمی بحران (۳۳-۱۹۲۹ء) کے بعد کسی نہ کسی شکل میں اجتماعی ضمانت کا پروگرام شروع ہوگیا تھا۔ اسی طرح مزدوروں کے لئے اوقاتِ کار کا تعین، معقول اجرت کی ادائیگی اور دوسری سہولتوں کی فراہمی کے سلسلہ میں ۱۸۰۲ سے قانونی اور دوسری کارروائیاں ہوتی رہیں اور آج مغربی ممالک میں مزدوروں کی عام حالت بہت بہتر ہے۔ کم از کم روس اور دوسرے اشتراکی ممالک کے مقابلہ میں ان کی حالت بدرجہا بہتر ہے۔ اس لئے اس دائرہ میں اولیت کا دعویٰ اشتراکیت نہیں کرسکتی۔

(ج) اشتراکیت کے تحت سماجی انصاف اور اجتماعی بہبود کے جن پہلوؤں کو اہمیت دی گئی ہے۔ ان میں تعلیم، روزگار کی ضمانت اور صحت وغیرہ کی سہولتیں اہمیت رکھتی ہیں۔ اس سلسلہ میں اشتراکیت نے جو کچھ کیا ہے ہم اس کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن اس سلسلہ میں چند باتیں ملحوظ خاطر رہنی چاہئیں۔

اولاً سماجی فلاح کے سلسلہ میں جو کچھ کیا گیا ہے اس کی حیثیت افادی (utilitarian) ہے۔ یعنی جو چیزیں پیداوار کو بڑھانے اور اشتراکی منصوبوں کو بروئے کار لانے میں معاون ہوسکتی تھیں ان کو اہمیت دی گئی اور سماجی فلاح کے وہ تمام پہلو جو اس میں زیادہ معاون نہ تھے لیکن انسانی نقطۂ نظر سے بے حد اہم تھے، ان کو بلا تکلف نظر انداز کردیا گیا۔ مثلاً طبی سہولتوں کو فراہم کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن رہائش کی سہولت کی طرف سے مجرمانہ غفلت برتی گئی۔ حتیٰ کہ رہائش کا مسئلہ عام آدمیوں کے لئے پیچیدہ ترین مسئلہ بن گیا۔ آج بھی عمارتوں پر آبادی کا دباؤ (overcrowdi-g) بے حد زیادہ ہے۔ روس کے سرکاری ذرائع کی رو سے ۱۹۱۳ء میں فی کس شہری مکانی جگہ (per capita urbanohusing space) ۷ر۲۲ مربع میٹر تھی اور ۱۹۲۶ء میں یہ ۸ر۲ مربع میٹر تھی۔ اس کے مقابلہ میں ۱۹۵۰ء میں یہ ۲ر۷ اور ۱۹۵۷ء میں ۷ر۷ تھی۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر کمرہ میں اوسطاً کم از کم تین افراد رہتے تھے۔[200] قانوناً ایک شخص رہنے کے لئے جتنی جگہ حاصل کرسکتا ہے وہ صرف ۷ مربع میٹر ہے، یہ جگہ اس سے کچھ ہی زیادہ ہے جو ہمارے ملک میں ہر قیدی کو جیل خانہ میں دی جاتی ہے۔ اور روسی اکنومسٹ پروکوپووچ کے الفاظ میں اس جگہ سے دوگنی ہے جتنی ایک شخص کو قبر میں حاصل ہوتی ہے۔[201] یہ روس کا اپنا دعویٰ ہے ورنہ مغربی اہل قلم کا خیال ہے کہ اب فی کس جگہ کا اوسط ۴ مربع میٹر ہے۔[202] ۱۹۶۱ء میں خروشیف نے اعتراف کیا تھا کہ "رہائش کی جگہ کی قلت

---

[200] Figurvov, S.P, *Real 'naya zarabotnaya platalpod'yem material'nogo blogosostoyantye trudyashchakhsya V USSR*, Moscow, p,109, vide, *Economic Systems in Action*, p.154.

[201] بحوالہ۔ دی سویٹ ورلڈ، صفحہ ۲۷۱۔ واضح رہے کہ Economic Survey of Europe (مطبوعہ جنیوا، ۱۹۵۰ء) کی رو سے مغربی ممالک میں فی کس جگہ کا اوسط یہ تھا: بلجیم ۱۵ مربع میٹر، ڈنمارک ۱۴ مربع میٹر، فرانس ۲۳ مربع میٹر، سویڈن ۲۴ مربع میٹر، اور برطانیہ ۲۵ مربع میٹر۔

[202] Jasny, Naum, The New Economic Couse in the U.S.S.R, *Problems of Communsim*, quoted *Aspects of Soviet Economy*, p.15.

کا مسئلہ آج بھی شدید شکل میں موجود ہے :: رہائش کا یہ مسئلہ اتفاقی نہیں ہے بلکہ منصوبہ بندی میں اسے پیچھے رکھا گیا اس لئے کہ یہ عام پیداوار میں اضافہ کے مقاصد سے ہم آہنگ نہ تھا۔ اگر سماجی فلاح کا کوئی حقیقی تصور موجود ہوتا تو اس پہلو کو کبھی نظر انداز نہ کیا جاتا۔ آخر منصوبہ بندی میں اس پہلو کو اہمیت کیوں نہیں دی گئی؟ کیا منصوبہ کار یہ نہیں جانتے تھے کہ ۱۹۲۸ اور ۱۹۳۹ کے درمیان شہری آبادی میں تین گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ رہائش میں اس زمانہ میں صرف ۲۰ فی صدی اضافہ کیا گیا۔ اگر یہ عدم توازن جان بوجھ کر پیدا کیا گیا تو ہم کیسے مان لیں کہ اشتراکیت کو سماجی فلاح عزیز تھا۔ اور یہ کہ اشتراکی منصوبہ بند مغربی سرمایہ دار سے کچھ بھی مختلف ہے۔ سرمایہ دار بھی اپنے منافع کو بڑھانے کے لئے سماجی بہبود کو نظر انداز کرتا ہے اور اشتراکی منصوبہ کار بھی پیداوار کو بڑھانے کے لئے معیشت کے دوسرے حصوں کو بنیادی رسد سے بھی محروم کر دیتا ہے۔ اور اگر یہ چیز غیر اختیاری تھی تو ماننا پڑے گا کہ محض منصوبہ بندی کے ذریعہ توازن آپ سے آپ قائم نہیں ہوگا اور اس نظام میں بھی شدید بے اعتدالیاں اور ناہمواریاں (disharmonies) موجود رہتی ہیں۔

اسی طرح کپڑے کی پیداوار کا مسئلہ ہے۔ کپڑے کی صنعت کو برابر نظر انداز کیا گیا۔ حالانکہ لباس انسان کی بنیادی ضرورت ہے اور سماجی فلاح کے کسی ایسے نظام کا تصور نہیں کیا جا سکتا جس میں لباس کے مسئلے کو حل نہ کیا گیا ہو۔

انسان کی تیسری اور سب سے بنیادی ضرورت خوراک ہے۔ اس کے بارے میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ زراعت کے میدان میں اشتراکیت سب سے زیادہ ناکام رہی ہے۔ فی کس صرف روس میں بے حد کم ہے۔ خوراک کا معیار پست اور غیر تسلی بخش ہے۔ ایک عام آدمی کو اپنی آمدنی کا بڑا حصہ محض خوراک پر خرچ کر دینا پڑتا ہے۔ ماہرین شماریات کے بقول روس میں ایک عام صارف کو اپنی آمدنی کا ۵۰ فی صدی سے زیادہ خوراک پر خرچ کرنا پڑتا ہے جب کہ انگلستان میں یہ حصہ صرف ۲۷ فی صدی ہے۔ پھر روسی صارف کے خوراک کے خرچ کا بڑا حصہ روٹی اور آلو پر صرف ہو جاتا ہے۔ گوشت، انڈے، دودھ وغیرہ پر اس کا صرف بہت ہی کم ہے۔ یہ چیزیں اسے شاذ شاذ ہی میسر آتی ہیں۔[۳۳]

ان حقائق کی روشنی میں ہم یہ کیسے باور کریں کہ اشتراکیت نے فی الحقیقت سماجی انصاف کے قیام میں حقیقی دلچسپی لی ہے۔ ثانیاً سماجی انصاف کے معنی یہ نہیں ہیں کہ صرف بنیادی ضرورتوں کو اقل حد تک فراہم کر دیا جائے بلکہ یہ ایک ہمہ گیر تصور ہے جس میں محنت کی عزت و توقیر سے لے کر سماجی اور معاشرتی مساوات تک ہر چیز شامل ہے۔ پورے اشتراکی تجربہ کے بغور مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے وہ اس تصور کو چھو تک نہیں سکی ہے۔ اس نے ایک طرف سماجی انصاف کا نام لیا ہے اور دوسری طرف لوگوں کو بدترین مظالم کا نشانہ بنایا ہے، تعلیم کے فروغ میں دلچسپی لی ہے لیکن فکری آزادی پر پہرے بٹھائے ہیں اور تعلیم کے بھی ان شعبوں کو فروغ دیا ہے جو پیداوار کے بڑھانے، فوجی قوت کی تشکیل اور پروپیگنڈے کے لئے درکار تھے اور اس میں بھی بڑے اور چھوٹے اور امیر اور غریب کی تفریق کی ہے۔ اس لئے ہم اس کے سماجی فلاح کے کارناموں سے کوئی مثبت تصور اخذ نہیں کر سکتے۔

ثالثاً ایک طرف سماجی فلاح کے مختلف پروگراموں کو فروغ دیا گیا ہے اور دوسری طرف ایسی پالیسیاں اختیار کی گئی ہیں جن کے نتیجہ میں افراط زر کی کیفیت رونما ہوئی۔ عام قیمتیں زرعی پیداوار کی بنیادی قیمتوں کو چھوڑ کر اوپر چڑھنے لگیں۔ افراط زر کا ناقابل

---

۳۳ Hevsy, *The Unification of the World*, op. cit., p.290-91.

تحریر شدہ مقدار زر میں اضافہ[۲۰۳] قیمتوں کا مسلسل اضافہ، صرف کی اشیاء کی شدید کمی، وسائل پیداوار اور اشیائے صرف کی قلت، کینچی نما کمیاں، کم اجرت، مینیجروں کی تیرہ دستی اور غیر قانونی کارستانیاں اور بلیک مارکٹ کا وجود ہیں۔ افراط زر کی پالیسی سماجی فلاح کی پالیسی کی عین ضد ہے۔ لیکن روس نے اس پر عمل کیا ہے اور تمام اہم محقق اس رائے کے حامل ہیں کہ روس میں افراط زر اور مخفی افراط زر شدید شکل میں موجود رہے ہیں اور اب بھی ہیں۔[۲۰۴]

ثانیاً سماجی فلاح کے تصور کو بھی محض فلاح و بہبود سے کاٹ کر پیداآوری اور کارکردگی سے جوڑ دیا گیا ہے اور سماجی انشورنس کے پروگراموں کو سرکاری پالیسی کی تنفیذ کے لئے ایک حربے کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس نے اس پوری اسکیم کو بالکل دوسرا رنگ دیدیا ہے۔ ہم اس سلسلہ میں چند بنیادی باتیں عرض کرتے ہیں۔ سماجی انشورنس کی اسکیم روس کی پوری آبادی کے تقریباً نصف پر لاگو ہی نہیں ہوتی۔ سوویٹ لیبر کوڈ کی دفعہ ۱۷۵ کی رو سے "سوشل انشورنس ان تمام افراد کا احاطہ کرتی ہے جو اجیر ہیں"۔ اس میں کھیت پر کام کرنے والے حتیٰ کہ اجتماعی کھیت پر کام کرنے والے بھی شامل نہیں ہیں۔ ان کی تعداد ۳ر۴ کروڑ ہے جب کہ صنعتی مزدوروں کی تعداد ۱ر۴ کروڑ ہے۔

سرکاری طور پر یہ اعلان کیا گیا ہے کہ

> "سوشل انشورنس کا پورا نظام اس طرح تبدیل ہونا چاہیے کہ ہنگامہ خیز مزدوروں (Shock Workers) اور لمبی مدت ملازمت رکھنے والے مزدوروں کو ترجیحی مقام حاصل ہو۔ ہمیں سوشل انشورنس کے ہتھیاروں کو اس طرح استعمال کرنا چاہیے کہ مزدور کی وابستگی اپنی جائے ملازمت سے بڑھے۔"[۲۰۶]

اگر کوئی مزدور ایک مقام کو چھوڑ کر دوسری جگہ چلا جاتا ہے تو اس کی انشورنس اور دوسری سہولتیں از سر نو شروع ہوتی ہیں۔ پہلے ایک شہر کو چھوڑ کر دوسرے شہر میں نہیں جا سکتے تھے۔ اب کچھ آزادی ملی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی پابندی بھی لگا دی گئی ہے کہ اگر مزدور اپنی مرضی سے کسی فیکٹری کو چھوڑے گا۔ تو اسے ایک قلیل مدت کے بعد بے روزگاری کی انشورنس اور دوسری سہولتوں سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ حد یہ ہے کہ مزدوروں کے لئے جو ریسٹ ہاؤس بنائے گئے ہیں وہ بھی مزدوروں کو نہیں ملتے۔ ۱۹۴۸ میں اس سلسلہ میں جو سرکاری پالیسی طے کی گئی تھی وہ یہ تھی کہ ۱۰ اور ۲۰ فی صدی "ٹکٹ پارٹی" کی قیادت جاری کرنے والے "زیادہ کام کرنے والے" ڈسپلن کے پابند اور اسٹیخنو وائسٹ مزدوروں کا استحقاق زیادہ ہے۔[۲۰۷]

---

[۲۰۳] ۱۹۲۹ میں نوٹ اور سکے جو گردش میں تھے ۲٫۰ ارب تھے لیکن ۱۹۳۶ تک یہ بڑھ کر ۱۱٫۳ ارب ہو چکے تھے۔ قیمتیں بھی برابر بڑھ رہی تھیں۔

[۲۰۵] see: Zebot, *The Economics of Competetive Co-existence*. op, cit., pp.122-130; Lewis, *Economic Suruey*, op.cit., pp.126-130.

[۲۰۶] *Questiions of Insurance*, Nos,7-8, 1933, p.12

[۲۰۷] A.U,C.C.T.U., May 29. 1948,

ان حالات کی روشنی میں خود سماجی انصاف کے حصول کے وعدے کے بارے میں کافی غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اشتراکیت کا دعویٰ اپنے ساتھ بہت سے تلخ حقائق بھی رکھتا ہے۔ اگرچہ چند چراغ روشن ہیں تو زمین کے بڑے حصے پر تاریکیوں کے مہیب سائے مسلط ہیں۔

اشتراکیت اور آج کی پس ماندہ دنیا

۷ - ہم نے اوپر کے صفحات میں معاشی مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔ ابھی اس سلسلہ کا ایک اہم سوال اور باقی ہے اور وہ یہ کہ کیا آج کی پس ماندہ اور غیر ترقی یافتہ دنیا اشتراکیت کے ذریعہ معاشی ترقی حاصل کر سکتی ہے اور کیا ترقی کی خاطر — تیز رفتار ترقی کی خاطر پس ماندہ ممالک کو اس راستہ کو اختیار کرنا چاہیے؟

ہماری نگاہ میں اس کا جواب نفی میں ہے۔ پس ماندہ ممالک کو معاشی ترقی کی اشتراکی راہ سے گریز کرنا چاہیے اور اس کے مقابلہ میں کوئی ایسا راستہ اختیار کرنا چاہیے جو ان کے حالات سے زیادہ سے زیادہ مناسبت رکھتا ہو اور جو بہتر سے بہتر نتائج دے سکے۔ اس سلسلہ میں اصل بحث پر آنے سے پہلے دو باتوں کی وضاحت ضروری ہے۔

(الف) معاشی ترقی کا عمل محض ایک معاشی عمل نہیں ہے۔ یہ ایک ہمہ گیر عمل ہے جس کے ذریعہ ایک معیشت کی مجموعی ساخت اور اس کے کل نظام میں ایسی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں جن کے نتیجہ میں اس کی قومی دولت اور فی کس آمدنی میں مسلسل اور پیہم اضافہ اور قرار واقعی اضافہ ہوتا ہے جو لمبے عرصے تک جاری رہتا ہے، معیشت کے تمام پہلوؤں کو متاثر کرتا ہے اور نظام پیداوار کی صلاحیت اور کارکردگی میں اضافہ کے نتیجہ پر رونما ہوتا ہے۔ اس پورے عمل کی تہ میں جو چیز کارفرما ہے وہ خلاقیت (creativity) کا فروغ ہے۔ پس ماندہ ممالک کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ انھوں نے یا تو یہ سمجھ لیا ہے کہ معاشی ترقی بس ایک میکانکی عمل ہے جو سرمایہ کاری میں اضافہ کے نتیجہ کے طور پر آپ سے آپ رونما ہو جائے گی۔ یا وہ اس غلط فہمی کا شکار رہیں کہ معاشی ترقی بھی کوئی ایسی چیز ہے جو درآمد کی جا سکتی ہے اور محض بیرونی امداد کے ذریعہ سے اس کا قصر تعمیر ہو سکتا ہے۔ یا وہ اس مغالطہ کا شکار رہیں کہ معاشی ترقی سیاسی انقلاب کا فطری اور لازمی نتیجہ ہے[۲۰۵] ان اور دوسری غلط فہمیوں اور مغالطوں کا نتیجہ ہے کہ وہ معاشی ترقی کے سلسلہ میں اس تخلیقی ردعمل کا اظہار نہیں کر پا رہی ہیں جس کے بغیر ترقیاتی دور کا آغاز نہیں ہو سکتا۔ ان کے لئے اندھی نقالی سب سے زیادہ مضر چیز ہے۔ خواہ وہ مغربی

---

[۲۰۵] اشتراکی اہل قلم نے یہ احساس پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نقطہ نظر کو سب سے پہلے خود اسٹالن نے پیش کیا ملاحظہ ہو: *Colonialism and the National Question*

Bone, Alfred, *Studies in Economic Development*, London, 1958, Ch.1. and Baran, Paul A., *The Political Economy of Growth*, New York, 1957.

سرمایہ داری کی جدیا سدی اشتراکیت کی۔ انھیں اپنے حالات کے مطابق اپنے مخصوص تمدنی کوائف کی روشنی میں اور اپنے قومی اور
حق مقاصد کی تکمیل کے لئے اپنی ترقیاتی حکمت عملی وضع کرنی ہوگی اور نقالی کے بجائے تخلیقی اور تجدیدی انداز میں یہ کام انجام
دینا ہوگا۔ مکھی پر مکھی مارنے سے یہ گاڑی نہ چل سکے گی۔ ہمیں ترقیاتی عمل کو بڑی گہرائی میں جاکر سمجھنا ہے اور اپنے حالات کے
مطابق ایک راستہ تجویز کرنا ہے۔ اس کے بغیر ہم نئے دور کے دروازے پر دستک نہ دے سکیں گے۔

(ب) دوسری بنیادی بات یہ ہے ہمیں ترقی کے وہ خدوخال بھی واضح طور پر متعین کرلینے چاہئیں جو اشتراکیت نے اختیار کی
ہے۔ اس کے بغیر ہم صحیح طور پر محاکمہ نہیں کرسکیں گے۔ ہماری نگاہ میں اشتراکیت کی ترقیاتی حکمت عملی یہ رہی ہے۔

(i) صنعت، تجارت، زرد بنکاری اور ذرائع رسل ورسائل کی قومی ملکیت اور زراعت کی اجتماعیت بندی (collectivisation)

(ii) سرمایہ کاری کی بہت بلند شرح — اس کے لئے صرف کی تحدید، اجرتوں کو کم رکھنا، افراط زر، بے حد ضرورت اشیائے صرف پر بھاری محصولات، ثمرات ترقی کی بلا واسطہ عوام تک رسائی کو موخر کرنا اور انھیں مزید سرمایہ کاری کے لیے استعمال کرنا۔

(iii) معیشت کی لمبے عرصہ کی مرکزی اور کلی وہمہ گیر منصوبہ بندی
آزادی کی تحدید اور محنت کو انتظامی شکنجہ میں کسنا۔

(iv) زراعت کو صنعت کی ضروریات کے تابع کرنا اور صنعت میں بھاری صنعت کو غیر معمولی اولیت وفوقیت دینا۔

(v) کچھ خاص دائروں میں جبر و تشدد کے طریقے اختیار کرنا، بہت بڑے پیمانے پر نشر واشاعت اور مہم کاری (campaigning) کا راستہ اختیار کرنا، سماجی محرکات کو حرکت میں لانا اور اگر یہ غیر موثر رہیں تو اجرتوں کے فرق، آمدنیوں کے تفاوت اور معاملات کی عدم مساوات کے ذریعہ تحریکات فراہم کرنا یا سماجی اور مالی ومعاشی محرکات کو بیک وقت اختیار کرنا۔

(vi) سماجی فلاح کی ان چیزوں کی طرف توجہ دینا جو اس ترقیاتی عمل میں مفید ومعاون ہیں۔ مثلاً تعلیم و تربیت، پنشن، وغیرہ۔

اس حکمت عملی میں بجز وسائل پیداوار کی قومی ملکیت کے کوئی چیز بھی بنیادی طور پر سرمایہ داری کے مزاج سے مختلف نہیں ہے۔ فرق یہ ہے کہ اشتراکیت میں ریاست کے ہاتھوں میں اتنا غیر معمولی اقتدار اور معاشی قوت ہوتی ہے کہ وہ سرمایہ کاری کو اتنی اونچی سطح پر لے جاتی ہے جتنی کسی آزاد معاشرہ میں نہیں لے جائی جاسکتی۔ وہ زراعت کو جبر کے ذریعہ صنعتی مقاصد کے تابع کرسکتی ہے اور صرف کو ناقابل یقین حد تک کم کرسکتی ہے۔ ہمہ گیر منصوبہ بندی اس کو وہ ہتھیار فراہم کرتی ہے جن کے ذریعہ یہ کام انجام پاسکتا ہے۔ اس حکمت عملی میں کچھ فوائد بھی ہیں اور نقصانات بھی۔ لیکن پس ماندہ ممالک کو اس کے اس مخصوص مزاج کو سامنے رکھکر اس کے بارے میں فیصلہ کرنا چاہیے۔ یہ راستہ سرمایہ داری کے راستہ سے جس پہلو سے مختلف ہے وہ معیشت میں ریاست کا حصہ ہے۔ اسی وجہ سے معاشی ماہرین کی ایک قابل لحاظ تعداد نے اس راستہ کو ریاستی سرمایہ داری

کا راستہ قرار دیا ہے۔ فرق یہ نہیں ہے۔ سرمایہ داری کا تکنیک (technque) کچھ اور ہے۔ اور اشتراکیت کا کچھ اور۔ فرق یہ ہے کہ سرمایہ داری یہ سب کچھ انفرادی سرمایہ داروں کے ہاتھوں کراتی ہے اور اشتراکیت ایک سرمایہ دار ریاست کے ہاتھوں۔

ان حقائق کو سامنے رکھ کر اب ہم اشتراکیت کے طریقہ کی مناسبت یا عدم مناسبت کے بارے میں غور و فکر کے لئے چند اہم نکات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

(۱) اصولی اعتبار سے اشتراکی حکمت عملی کی نقالی بھی اتنا ہی غیر تخلیقی عمل ہوگا جتنا مغربی ممالک کی نقالی۔ ہم ترقی کے لئے نقالی کو سم قاتل سمجھتے ہیں اور خلاقیت کو شرط لازم۔

(۲) اشتراکیت کے معاشی تجربہ کے بارے میں جو کچھ ہم اس مضمون میں پیش کر چکے ہیں وہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ اس کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ انسانی اور تہذیبی نقطۂ نظر سے بھی اور خالص معاشی نقطۂ نظر سے بھی۔ اس قیمت پہ یہ سودا انسانیت کے لئے خصوصیت سے پس ماندہ ممالک کے لئے بہت مہنگا ہے۔ اسے کسی پہلو سے بھی ایک کامیاب تجربہ نہیں کہا جا سکتا۔ انسانیت کو ایک تیسرے راستے کی ضرورت ہے جو قیمت کے اعتبار سے ہلکا اور نتائج کے اعتبار سے بہتر ہو۔

(۳) پس ماندہ ممالک اور روس کے حالات کا موازنہ کیا جائے تب بھی چند بیّن فرق سامنے آتے ہیں جنہیں نظر انداز کر کے کوئی صحیح فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً

(i) روس کے پاس وسیع رقبہ، کم آبادی اور غیر معمولی اور ایک حد تک غیر محدود معدنی وسائل تھے۔ لیکن آج کے پس ماندہ ممالک میں اور خصوصیت سے پاکستان میں صورت حال اس سے مختلف ہے۔ ان ممالک میں بالعموم معلوم معدنی وسائل محدود اور آبادی زیادہ ہے۔

(ii) انقلاب کے وقت روس میں بنیادی معاشی ترقی ہو چکی تھی اور بقول معاشی مورخین خود خیز ترقی (self-sustained growth) کے مرحلہ تک وہ پہنچ چکا تھا۔ لیکن آج کے پس ماندہ ممالک اس مقام سے بہت پیچھے ہیں۔ اشتراکیت صنعت کی پیداوار اور صنعتیت کا شخص ہے۔ لیکن یہ ممالک ابھی صنعتیت سے بہت دور ہیں۔ اس پہلو سے اشتراکیت ابھی ان کے حالات سے مناسبت نہیں رکھتی۔

(۴) پس ماندہ ممالک کا سب سے بنیادی مسئلہ زراعت ہے۔ زراعت کی صورت پر ان کی ترقی کا انحصار ہے اور زراعت کی خرابی سے ان کی تباہی ہے۔ لیکن زراعت ہی اشتراکیت کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ روس میں زراعت کے میدان میں اشتراکیت ناکام رہی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ صنعتیت (...dustrialism) میں محویت کی وجہ سے اس نے نہ صرف یہ کہ زراعت کو نظر انداز کیا بلکہ اسے صنعتی ترقی کے لئے قربانی کا بکرا بنایا۔ نظریاتی طور پر اشتراکیت زراعت سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔ اس کی اصل دلچسپی صنعت، صنعتی مزدور (proletariate) و صنعتی ہیئت سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صرف روس ہی میں نہیں بلکہ چین اور مشرقی یورپ کے تمام اشتراکی ممالک میں اس کی زرعی پالیسی ناکام رہی ہے اور اس میدان میں ملے

بار بار صرف شکست ہی کا اعتراف نہیں کرنا پڑا بلکہ نئی مراعات بھی دینی پڑی ہیں۔ اشتراکی دنیا میں پولینڈ زرعی اعتبار سے سب سے بہتر ہے لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں اجتماعیت بندی (collectivism) سب سے کم رہی ہے اور آزاد کاشت کا سب سے زیادہ رواج ہے۔ اس پہلو سے پس ماندہ ممالک کے لئے اشتراکیت مہلک ہوگی وہ ان کے بنیادی زرعی مسئلہ کو حل نہیں کر سکتی اور غیر فطری طور پر صنعتی انقلاب کی جو کوشش وہ کرے گی وہ پورے معاشرے کو شدید بحران کا شکار کر دے گی۔

(۵) پلاننگ کے طریقے اور آلات (techniques) اس وقت کامیاب ہو سکتے ہیں جب ایک ملک میں شماریات کا نظام ترقی یافتہ ہو، نقل پذیری (mobility) موجود ہو اور علاقائی بعد (Regional Separation) موجود نہ ہو یا ترقی یافتہ ذرائع نقل و حرکت کی وجہ سے کم سے کم تر ہو گیا ہو، انتظامیہ مضبوط اور ترقیاتی رجحانات لئے ہوئے ہو۔ لیکن ان میں سے ہر معیار پر پس ماندہ ممالک بہت پیچھے ہیں۔ ان حالات میں ان پر اشتراکیت کے طریقوں کو مسلط کرنے کا نتیجہ پیچیدگیوں اور کشاکش (tension) میں اضافہ ہی ہوگا اور ہر ملک ایک عجیب مخمصہ میں گرفتہ ہو جائے گا۔ معیشت میں ترقیاتی کوششوں کا جوابی عمل (response) پیدا نہیں ہوگا اور تناؤ اور جمود رونما ہو جائے گا۔[310]

(۶) اشتراکیت کے طریقہ کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ حکومت کا نظام مضبوط ہو، اس کی کارکردگی کا معیار نہایت اعلیٰ ہو، انتظامیہ (administration) بہت اہل اور منظم ہو اور سرکاری حلقے بدعنوانیوں (coruption) سے محفوظ ہوں۔ ان میں سے کسی چیز کی بھی کمی پلاننگ کے نظام کو سبوتاژ کرنے کے لئے کافی ہے۔ پس ماندہ ممالک میں اس پہلو سے بے حد کمزوریاں ہیں اور ان حالات میں وہاں اگر اشتراکی طریقے کو اختیار کیا جائے تو وہ ناکارہ اور بدعنوان حکمران کو دائمی تسلط عطا کرنے کا باعث ہوگا اور کرپشن کی وجہ سے معیشت کی ترقی کی جگہ صرف ان کی ذاتی ترقی واقع ہوگی وہ ممالک کے حالات میں تو اقتدار کی تقسیم اور قومی محاسبہ کی مضبوطی ترقی کے ضامن ہو سکتے ہیں اور ان دونوں کی اشتراکی طریقہ میں کوئی گنجائش نہیں۔

(۷) اشتراکیت کے معاشی راستہ کا خلاصہ یہ ہے کہ تیزی سے صنعتی بنانے کی کوشش کی جائے اور اس نظریہ کو بہ جبر و قوت مسلط کر دیا جائے۔ ایک لوزونے اسے industrialising ideology کا تسلط قرار دیا ہے[311] اس کا اثر صرف کاشتکار ہی نہیں ہوتا بلکہ دستی صنعت کار، گھریلو صنعت، چھوٹا تاجر اور بیوپاری وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔ ان تمام گروہوں کو قوت کے ذریعہ بے اثر کیا جاتا ہے اور اس طرح عوام کی معاشی حالت خراب تر ہو جاتی ہے۔ نئی قوتیں اپنا اثر قائم کرنے میں بڑا وقت لیتی ہیں لیکن زراعت کی اور چھوٹے کاروبار اور صنعت کی کمر توڑ دینے کے اثرات فوراً رونما ہوتے ہیں اور بگاڑ کو بڑھانے کا باعث ہوتے ہیں۔

---

[310] مصر اور شام کے حالیہ تجربات اس کا ثبوت ہیں۔

[311] See. Yugoff Aron Economic Trends in Soviet Russia.

(۸) نیز معاشیات کے بنیادی قوانین کو نظرانداز کرنے (مثلاً مارکیٹ کے نظام اور معاشی حساب کاری) کے نتائج طویل مدت میں اچھے نہیں نکلتے۔ محض جوش اور جذبہ اور مہم کاری اور پروپیگنڈے کے ذریعہ کام چلایا تو جا سکتا ہے۔ لیکن ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نہیں۔ اس کے نتیجہ میں جو اضاعت رونما ہوتی ہے پس ماندہ ممالک اسے انگیز نہیں کر سکتے۔

ان نکات کی روشنی میں ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ روسی تجربہ آج کے پس ماندہ ممالک کے لئے مشعل راہ نہیں بن سکتا۔ یہ سیاسی استبداد اور معاشی الجھنیں پیدا کرنے کا باعث ہوگا۔ غیروں کی غلامی سے نکل کر یہ ممالک اپنوں کی غلامی میں مبتلا ہو جائیں گے اور معاشی مسئلہ بھی حل نہ ہو سکے گا۔ ان کی حالت یہ ہوگی کہ

جس کو غربت راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا!

حقیقت یہ ہے کہ نہ تو خالص امریکی اور برطانوی راستوں کی پیروی کر کے معاشی ترقی سے ہم کنار ہو سکتے ہیں اور نہ اشتراکی طریقے کو اختیار کر کے۔ انھیں ایک اور ہی راستہ اختیار کرنا ہوگا جو ان کے حالات سے مطابقت رکھتا ہو، ان کے عوام میں حقیقی حرکت پیدا کر سکتا ہو، سیاسی ظلم اور استبداد سے پاک ہو اور ترقی اور انصاف کے حصول پر منتج ہو۔ ہماری نگاہ میں یہ راستہ اسلام کا راستہ ہے جو سرمایہ داری اور اشتراکیت ہر دو سے مختلف ہے۔ لیکن ابھی اس پر گفتگو قبل از وقت ہے۔ فی الحال تو ہم اس نتیجہ سے صرف نظر نہیں کر سکتے کہ اشتراکیت ہمارے مسائل کا حل نہیں ہو سکتی۔

(۷)

مارکسی اشتراکیت اور روسی اشتراکیت

اشتراکیت کو جانچنے کا ایک اور معیار یہ ہے کہ اسے خود اس کے نظری معیار پر پرکھا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ جن اصولوں کو اس نے پیش کیا تھا ان پر کس حد تک عمل کیا ہے۔ اس پہلو سے روسی اشتراکیت کا مطالعہ بڑا معنی خیز اور عبرت انگیز ہے۔ روس کی

۳۱؎ آزاد معیشت کا طریقہ ان ممالک کی اکثر کچھ بھی رہنمائی نہیں کرتا اور کلیت پسند مادی منصوبہ بندی کا راستہ اس کام کی انجام دہی ٹھیک طرح نہیں کر سکتا: Higgins, Benjamin, *Econom.c Development*. Norton & Co. New

اس موضوع پر دونوں طرف کے نقطہ نظر کے مطالعہ کے لئے مندرجہ بالا کتاب کے علاوہ ملاحظہ ہو۔

see Nove, Alec. *The Soviet Economy*, op.cit., p.304

Hiechman, Albert O.. *The Strategy of Economic Developm nt*. Yale University Press, New Haven, 1958 Barer P U ited *States Aid and Indian Economic Development* Washi gton 1959; Nove, Alec. "The Soviet Model and Under-developed countries" *International Affairs*, London January, 1961.

تاریخ میں اشتراکیت کے ارتقاء اور اس سے انحراف کی طویل داستان ہے۔ خالص مذہبی نقطۂ نظر سے روسی اشتراکیت کے بے شمار
حالات کی کرید کر جیب کا نہیں جا سکتی بلکہ یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ روس جو کچھ کر سکا اس میں اشتراکیت کے اصولوں پر عمل کا اتنا حصہ
ہے جتنا ان کو ترک کرنے اور ان سے انحراف کرنے کا ہے۔ اشتراکیت کا ایک غیر متعصب طالب علم جب روسی اشتراکیت کے
پچاس سالوں پر ایک نگاہ ڈالتا ہے تو وہ بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ

جام ہے توبہ شکن، اور توبہ مری جام شکن
دور تک ڈھیر ہے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کا

ہم اختصار کے ساتھ صرف چند ضروری پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

(۱) اشتراکی فلسفۂ تاریخ کی رو سے اشتراکیت سرمایہ داری کی پختگی اور اس کے عروج و زوال کے بعد رونما ہوتی ہے۔
لیکن روس میں اشتراکی انقلاب سرمایہ داری کے دور کی تکمیل کے بغیر ہی رونما ہو گیا۔ ابھی وہاں سرمایہ دارانہ نظام
رو بہ فروغ تھا، صنعتی انقلاب اپنے ابتدائی مراحل سے گزر رہا تھا اور مزدوروں کا طبقہ تشکیلی دور سے گزر رہا تھا۔ ان حالات
میں اشتراکی انقلاب رونما ہوا۔ اس نے ایک طرف مارکس کے نظریہ تاریخ و انقلاب کی تردید کی اور دوسری طرف اس
پورے عمل کو غلط کر دیا جس سے اس کے خیال میں اشتراکیت کو گزرنا تھا۔ یہ روس میں اشتراکیت کا "پہلا گناہ" ہے اور
نہ معلوم کب تک روسی اشتراکیت اس کی تلافی کرتی اور کفارہ ادا کرتی رہے گی۔[212]

(۲) اشتراکی نظریہ کی رو سے انقلاب کا ذریعہ مزدوروں کا طبقہ ہے۔ جب وہ اتنا مضبوط ہو جائے گا کہ سرمایہ داری کے اندرونی
تناقضات سے پورا پورا فائدہ اٹھائے اور سرمایہ داری کا انحطاط اس کی بغاوت اور ایک آخری ضرب کے لئے مناسب
موقع فراہم کر دے تو پھر مزدوروں کے ہاتھوں تبدیلی رونما ہوگی اور وہ حکمران قوت کی حیثیت سے ابھر آئیں گے۔ اسی وجہ
سے مارکس نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ انگلستان میں اشتراکی انقلاب سب سے پہلے رونما ہوگا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں صنعتی
انقلاب سب سے پہلے رونما ہوا، سرمایہ داری اپنی تکمیل کو سب سے پہلے پہنچی اور مزدوروں کی قوت اور تعداد سب سے
زیادہ مؤثر تھی۔ لیکن یہ تاریخ کا ایک عجیب و غریب طنز (irony) ہے کہ جہاں بھی اشتراکی انقلاب رونما ہوا ہے
وہاں مزدوروں کے ہاتھوں نہیں فوج کے ہاتھوں یا اس کی مدد سے رونما ہوا ہے۔ روس میں پہلی جنگ کے آخری زمانے میں
فوجی بغاوتوں نے اشتراکی انقلاب کی راہ ہموار کی اور "جنگی اشتراکیت" (war communism) کے پردے

---

۲۱۲ 212 See: Carew Hunt, R.N., *The Theory and Practice of Communism*, op.cit., Part III; Rauch, George Von, *A History of Soviet Russia*, F.A. Praeger, New York, 1961, Prologue and Ch.I.; Plamenatz, John, *German Marxism and Russian Communism*, Longmans, Green & Co., London, 1954. Part II.

دور میں جو داخل ۱۹۱۸ سے ۱۹۲۲ تک پھیلا ہوا ہے روس کے بیشتر علاقے فوجی تسخیر کے ذریعہ داخل اشتراکیت کئے گئے۔ چین کا انقلاب دو فوجوں کی جنگ کے نتیجہ میں برپا ہوا۔ مشرقی یورپ کے تمام اشتراکی ممالک میں تبدیلی روسی فوج کی فتوحات کے زیر سایہ رونما ہوئی۔ اشتراکی اصول انقلاب یہاں بھی ناکام رہا اور خود اشتراکیت کو اپنے نظریہ میں کم از کم ظاہری طور پر یہ تبدیلی کرنی پڑی کہ روس اور چین دونوں جگہ انھوں نے بطور انقلابی قوت کے مزدوروں اور کسانوں سے کام لیا اور روسی دستور میں بھی کسانوں کا ذکر شامل کیا گیا حالانکہ مارکس کی فکر میں کسان کا کوئی مقام نہیں ہے اور وہ انھیں ایک انقلابی قوت تسلیم نہیں کرتا۔

(۳) اشتراکیت کا سب سے بنیادی اصول قومی ملکیت ہے۔ اشیائے صرف میں نجی ملکیت کو عبوری دور کے لئے اشتراکی نظریہ قبول کرتا ہے۔ لیکن وسائل پیداوار کی نجی ملکیت کے لئے اس نظریہ میں قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکی پروگرام کا اول و آخر "قومی ملکیت" کو قرار دیا گیا ہے۔ لیکن اس پہلو سے روس نے کیا کیا۔ سمجھوتے کئے ہیں؟ اس کی داستان بڑی عبرت انگیز ہے۔ ہم صرف چند ضروری پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

(i) روس کا دستور نجی ملکیت کا اسی طرح تحفظ کرتا ہے جس طرح امریکہ کا دستور۔ اس فرق کے ساتھ کہ روس میں نجی ملکیت پر اجرت پر کام نہیں لیا جا سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں روس میں صرف اشیائے صرف (Consumers' goods) ہی کی نجی ملکیت نہیں ہو سکتی بلکہ وسائل پیداوار کی بھی ہو سکتی ہے بشرطیکہ ان پر دوسروں کی محنت سے کام نہ ہو۔ ایک شخص اور اس کا خاندان وسائل پیداوار اپنی تحویل میں رکھ سکتا ہے، اس پر کام کر سکتا ہے، حاصل پیداوار کو اپنے استعمال میں لا سکتا ہے اور فروخت بھی کر سکتا ہے۔ یہ تمام چیزیں قانوناً ممنوع نہیں ہیں، البتہ ان پر ٹیکس عائد کیا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ محض ذاتی ملکیت یا وسائل پیداوار کی ذاتی ملکیت ممنوع نہیں ہے صرف وہ ذاتی ملکیت ممنوع ہے جو محنت کے استحصال (exploitation of labour) پر منتج ہو۔

(ii) زراعت میں نجی کھیت موجود ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں ان کی تعداد ۲ کروڑ ۵۰ لاکھ تھی اور گو وہ کل زیر کاشت رقبہ کا صرف ۴ فی صد تھے لیکن کل زرعی پیداوار کا ۳۲ فی صدی ان نجی کھیتوں سے حاصل ہو رہا تھا۔ آلو کی پیداوار کا ۶۰ فی صدی ان کھیتوں سے حاصل ہو رہا تھا۔ دودھ کا ۵۰ فی صدی یہ فراہم کر رہے تھے اور انڈوں کا ۸۰ فی صدی[۳۵]

(iii) اشتراکی پارٹی کی بائیسویں کانفرنس (۱۹۶۱) کے موقع پر جو نیا قانون نافذ ہوا ہے اس کی رو سے ایک شادی شدہ جوڑا اپنا ذاتی مکان رکھ سکتا ہے۔ ہر شہری ایک خاص تعداد جانوروں کی رکھ سکتا ہے۔ اسی طرح کار، بلکہ بجلی کی مشینیں وغیرہ

---

۳۵ See: *Crisis in World Communism*, op.cit.: p 42. Newth, J.M., "The Private Sector of Soviet Agriculture", *Soviet Studies*. October 1961 and April 1962: Vigor, P.H., *A Guide to Marxism and Its Effects on Soviet Development*. Faber and Faber, London.

کپڑا، فرنیچر، گھڑی کی مشینیں اور اس نوعیت کی دیرپا اشیاء (durable goods) بھی ذاتی ملکیت میں رکھے جا سکتے ہیں۔

(۴) بات صرف ذاتی ملکیت ہی تک نہیں بلکہ اب یہ ذاتی ملک قانون وراثت کی رو سے ورثاء کی طرف منتقل بھی کی جا سکتی ہے۔ وراثت کو انقلاب کے فوراً بعد ختم کر دیا گیا تھا۔ ۲۷ اپریل ۱۹۱۸ کے قانون کی رو سے[۲۱۳] وراثت — خواہ بذریعہ قانون ہو یا بذریعہ وصیت — منسوخ کر دی گئی تھی اور ایک شخص کی موت پر اس کا تمام ترکہ حکومت کی ملک میں آ جاتا تھا البتہ سماجی فلاح کے قانون کے نفاذ تک یہ گنجائش رکھی گئی تھی کہ میت کے قریبی [illegible] کو ترکہ میں سے اعانت ملتی رہے گی۔ پھر ۱۹۱۹ میں[۲۱۴] زندگی، سرمایہ اور آمدنی کا بیمہ (insurance) ختم کر دیا گیا لیکن ۱۹۳۶ کے دستور میں (دفعہ ۱۰) وراثت کے قانون کو بحال کر دیا گیا اور آخری وصیت کے ذریعہ ہر شہری کو غیر محدود املاک کی وصیت کا حق دے دیا گیا۔ زندگی کا بیمہ بھی شروع کر دیا گیا اور سرکاری بیمہ ٹرسٹ (GOSSTRAKH) کی طرف سے پرچوں میں بیمہ کی ترغیب کے لئے اشتہارات بھی آنے لگے۔ اس بیمہ میں اب کم سے کم رقم (Premium) ۵ ہزار روبل رکھی گئی ہے اور شخص متعلقہ کی موت پر یہ رقم اس کے ورثاء کو ادا کی جائے گی۔[۲۱۵] اب بڑے لوگوں اور امیر کارندوں کی اولاد اسی طرح سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوتی ہے جس طرح امریکہ اور برطانیہ میں۔ وراثت کے ذریعہ اولاد کو (اور بہت ہی محدود دائرہ میں) بڑی بڑی رقوم ملتی ہیں۔

(۵) اشتراکیت غیر کسبی آمدنی (unearned income) کی شدید مخالفت ہے اور اسے تمام استحصال کی جڑ قرار دیتی ہے اسی لئے وہ وسائل پیداوار کی نجی ملکیت کو ختم کرنا چاہتی ہے تاکہ سرمایہ پر سود یا منافع اور زمین پر لگان ختم ہو جائے اور ہر شخص صرف محنت کے ذریعہ اپنی مزدوری کمائے۔ لیکن روسی اشتراکیت نے اس اصول کو بھی بہت سخت اور مشکل العمل پایا اور بالآخر غیر کسبی آمدنی کے بے شمار دروازے کھول دیئے۔ صرف چند مثالیں

(۱) وراثت کے ذریعہ ملنے والی رقوم اور مال غیر کسبی ہوتا ہے اور اسے روسی اشتراکیت نے جائز کر دیا ہے۔

(۲) بڑے لوگوں کی موت پر ان کی اولاد کے لئے خصوصی امداد کا طریقہ رائج کیا گیا ہے۔ ایک عام مزدور کے ورثاء کو قانون کے ذریعہ ۲۰ سے ۴۰ روبل ماہانہ بطور اعانت ملتے ہیں[۲۱۶] اور بڑے آدمیوں کی اولاد کو ۳ اور ۴ ہزار روبل

---

[۲۱۳] Decree of April 27th (14) 1918 V. Ts.I.K.—All Union Central Executive Committee

[۲۱۴] Decree of November 18th 1919, Code of Laws, 56-542.

[۲۱۵] مثال کے طور پر ملاحظہ ہو بیمہ کا اشتہار Litrerature Isskustvo. مورخہ ۹ اکتوبر ۱۹۴۴۔

[۲۱۶] ۸ جنوری ۱۹۳۰ کے فرمان (بحوالہ مجموعہ قوانین ۱۹۳۰ نمبر ۱۔۱) کی رو سے معدنی صنعت میں کام کرنے والے ایک عام مزدور کے خاندان کو اگر ایک بچہ ہے تو ۳۰ روبل ماہانہ اور اگر دو یا زیادہ بچے ہیں تو ۴۰ روبل ماہانہ پنشن ملے گی۔ خطرناک جگہوں پر کام کرنے والے مزدوروں کے خاندان کو ۶۰ روبل اور ۷۰ روبل علی الترتیب ملیں گے۔

ماہانہ اور لاکھوں روبل کی یک مشت امانت۔ آفرالذکر کی وضاحت کے لئے صرف ایک سرکاری اعلان کا متن ہم دیتے ہیں:
"ہوائی جہاز ڈیزائن کرنے والے کامریڈ این۔ ایم۔ پولی کرپود (Polikarpov) کی موت پر
جو مزدور طبقہ محنت کا ہیرو اور سپریم سوویٹ کا رکن تھا حکومت نے طے کیا ہے کہ اس کی بیوی اور بچی کو ایک لاکھ
روبل کی رقم دے۔ اس کی بیوی کو تمام عمر کے لئے ایک ہزار روبل ماہانہ، اس کی بچی کو ۵۰۰ روبل ماہانہ اس
وقت تک کے لئے جب تک وہ اپنی تعلیم مکمل نہ کرلے اور اس کی بہن کو تمام عمر کے لئے ۴۰۰ روبل ماہانہ دیگی۔"[۲۱۸]
اس کے معنی یہ ہیں کہ ننھی مس پولی کرپود جس خاندان میں پلے گی اس کے پاس نزکر کے علاوہ ایک لاکھ روبل کا سرمایہ اور
۲ ہزار روبل ماہانہ کی آمدنی ہوگی۔ اور اشتراکی نظریہ کی روسے یہ سب غیر کسبی آمدنی ہے!

(iii) اپنی ذاتی بچت کو ہر شخص بنک میں رکھ سکتا ہے اور اس پر ۳ فی صدی سود وصول کر سکتا ہے سرمایہ کو سرکاری بونڈ
اور تمسکات کی شکل میں رکھا جاسکتا ہے اور اس پر بھی مستقل آمدنی ہوتی ہے۔ حکومت اشتہار دے کر لوگوں
کو اس سرمایہ کاری کی ترغیب دیتی ہے اور سود کی ضمانت دیتی ہے۔ یہ رقم مرکزی بنک کی ۲۹ ہزار شاخوں میں
رکھی جاسکتی ہے۔ ایسے لوگ بھی ہزاروں کی تعداد میں ہیں جن کے پاس لاکھوں روبل کی مالیت کے تمسکات ہیں۔
۱۹۴۳ میں روسی اخبارات میں پہلے "پرولتاری لکھ پتی" (proletarian Millionaife) کی خبریں
شائع ہوئیں اور اسے بھی ایک قومی ہیرو کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ یہ اعزاز قازقستان کے ایک سرکاری کھیت
کے ڈائرکٹر کامریڈ بردائی بیکوف (Berdyebekov) کو حاصل ہوا تھا۔ اس کے بعد اب بہت
سے لکھ پتی موجود ہیں جن کا لاکھوں اور کروڑوں روبل حکومت کے پاس بطور قرض تمسکات کی شکل میں ہے اور
جن کو اس پر لاکھوں روبل سود کے مل چکے ہیں۔[۲۱۹]
غیر کسبی آمدنی کا ظہور اور اس کا فروغ اصل اشتراکیت کی موت ہے۔

(۶) اشتراکیت کا ایک اور بنیادی اصول دوسروں کی محنت سے فائدہ اٹھانے کی ممانعت ہے۔ ان کی استحصال کی کلاسیکی
تعریف ہی یہ ہے کہ "ایک آدمی دوسرے کو اس طرح اپنے تصرف میں نہ لائے کہ اس کی محنت سے خود فائدہ اٹھائے" گو

---

۲۱۸ 218 Soviet War News, August 2, 1944

۲۱۹ 9 See; Koestler; *The Yogi and the Commissar*, op.cit., p.159-166; Arnold, Arther Z., *Banks, Credit and Money in Soviet Russia*, Columbia University Press, New York. 1937; Hardt, John., "Industrial Investment in the USSR", *Comparisons of United States and Soviet Economies*, op.cit., Landauer, Carl, *Contemporary Economic Systems*, Lippincott Co., Philadelphia, 1964, pp.239-345.

روس میں بقاعدتاً محنت کا استحصال ممنوع ہے لیکن قانون ہی کی رو سے نہ صرف اہل خاندان کی محنت سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے
ایک خاندان کی محنت سے حاصل کی ہوئی پیداوار کو بازار میں فروخت کرنے کی اجازت ہے بلکہ شوفر، باورچی اور گھریلو خادم،
انّا اور مالی وغیرہ کو بطور ملازم بھی رکھا جاسکتا ہے۔[۲۲۹]

اس کو کس نام سے پکاریں ہم
آج تک یہ بھی فیصلہ نہ ہوا!

(۷) اشتراکیت ایک غیر طبقاتی معاشرہ قائم کرنے کی مدعی ہے۔ بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں وہ اشتراکیت کے اولیں دور میں ایک طبقاتی اور آخری دور میں غیر طبقاتی معاشرہ قائم کرنا چاہتی ہے۔ لیکن روس میں طبقاتی تقسیم کو ختم نہیں کیا جاسکا۔ نظری طور پر بھی وہاں دو طبقات کا سرکاری طور پر اعتراف کیا جاتا ہے! اشتراکی پارٹی کے حالیہ پروگرام میں اس امکا اعتراف ہے کہ "سویٹ یونین میں اب دو دوست طبقات (friendly classes) پائے جاتے ہیں۔ مزدور اور کسان"[۲۳۰] اسی طرح وہاں کا شعبہ شماریات سویٹ معاشرہ کی طبقاتی تقسیم کے ذیل میں بھی دو جداگانہ طبقات۔ مزدور اور کسان کا تذکرہ کرتا ہے[۲۳۱] یہ تو تھی سرکاری اور نظری پوزیشن۔ اس کی رو سے ایک طبقہ کا استحصال دوسرے طبقے کے ہاتھوں ممکن ہے۔ کم از کم اشتراکی فلسفہ سازی کی رو سے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں "طبقات" دوست طبقات نہیں بلکہ فی الحقیقت متحارب طبقات ہیں۔ روس کے کسانوں نے وہاں کی صنعتی ترقی کی قیمت ادا کی ہے جو وہاں کی سماجی فلاح کی اسکیم کے ثمرات سے محروم ہیں ان کو پنشن کے حقوق حاصل نہیں۔ روس کے شہروں میں رہنے کے لئے جن شناختی کاغذات کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان کو آسانی نہیں ملتے اور اگر ملتے بھی ہیں تو ان کو شہریوں کے برابر نہیں سمجھا جاتا، بلکہ برابر انہیں امتیازات کا نشانہ بنایا جاتا ہے نیز تنخواہوں اور دوسری سہولتوں اور مراعات کے باب میں ان کو ثانوی درجہ دیا جاتا ہے۔ اس طرح حقیقت یہ ہے کہ جن گروہوں کو سرکاری طور پر دو طبقات مانا گیا ہے ان میں سے ایک دوسرے کا استحصال کر رہا ہے۔

پھر استحصال کی صرف یہی صورت نہیں ہے، قومیتوں (Nationalities) کا استحصال بھی بہت بڑے پیمانے پر کیا جا رہا ہے اور پھر سب سے بڑھ کر حکران گروہ اور پارٹی خود ایک طبقہ بن گئے ہیں جن کے مقابلے میں باقی تمام آبادی بے بس اور مجبور ہے۔ کوئی نہیں جو کھلے بندوں اس طبقہ کو چیلنج کر سکے۔ اس کا سیاسی، معاشی اور معاشرتی اقتدار مغربی دنیا کے سرمایہ داروں سے کم نہیں، زیادہ ہی ہے۔ اشتراکیت یہ سمجھتی تھی کہ ملکیت تبدیل ہونے کے بعد استحصال ختم ہو جائے گا حالانکہ ملکیت تبدیل ہونے

---

[۲۲۹] Vide. Vigor, *A Guide to Marxism*, op.cit., p.191-92.

[۲۳۰] Programme of the Communist Party of the Soviet Union.

[۲۳۱] See, for instance, Narodnoye Khazyaistvo USSR 1961, Moscow 1961, p.27 vide Vigor, op.cit. p.192.

کے باوجود تصرف کا کل اختیار ایک مخصوص گروہ کو حاصل رہا اور اس کے ہاتھوں دوسروں کا، خود مزدور طبقہ کا استحصال بڑے پیمانے پر جاری رہا ہے۔

(۸) اسی طرح بالواسطہ ٹیکس کو لیجئے۔ مارکس کی فکر میں اس کے لئے کوئی مقام نہیں ہو سکتا۔ لینن نے صاف الفاظ میں کہا تھا کہ "بالواسطہ محصول دراصل غرباء پر محصول ہوتے ہیں"[۲۲۳] لیکن روس میں سرکاری بجٹ کا ۸۰ فی صدی سے بھی زیادہ بالواسطہ محصول کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کا بار عوام پر اور خصوصیت سے مزدوروں، کسانوں اور دیہی آبادی پر پڑتا ہے۔

(۹) اشتراکیت معاشی اور مالی محرکات کی مخالف تھی اور یہ سمجھتی تھی کہ آمدنیوں کی مساوات معاشرتی عدل کے لئے ضروری ہے نیز سماجی اور اجتماعی محرکات جذبۂ عمل اور تفریق کار کے لئے کافی ہوں گے۔ لینن نے انقلاب سے قبل کہا تھا انتظامیہ کے اونچے سے اونچے فرد اور ایک معمولی تربیت یافتہ کارکن کی تنخواہ میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔ لیکن اس کی جو تفسیر روس کے نظام میں کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ بقول اسٹالن اجرتوں کی مساوات کا مطالبہ کرنا بورژوائی مطالبہ اور اشتراکیت دشمنی ہے۔ ان تمام چوٹی کے اشتراکیوں کو جو مساوات کے قائل تھے ایک ایک کر کے ختم کر دیا گیا اور جو نظام قائم کیا گیا اس میں اتنی ہی عدم مساوات ہے جتنی برطانیہ اور دوسرے سرمایہ دارانہ ممالک میں[۲۲۴] اس سلسلہ کی کچھ تفصیل ہم پچھلے صفحات میں دے چکے ہیں جس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

(۱۰) معاشی محرکات کے علاوہ اشتراکیت نے تجربہ سے یہ بھی محسوس کر لیا ہے کہ اسے آزمائش کے لمحہ میں قومیت کے جذبات کی ضرورت ہے۔ "ایک ملک میں انقلاب" سے جو تحریک شروع ہوئی تھی وہ جنگ عظیم ثانی کے دور میں خالص قوم پرستی

---

۲۲۳ Collected Works, Vol.II, 3rd edition, p.225

۲۲۴ مشہور برطانوی سوشلسٹ ڈگلس جے لکھتا ہے کہ "سویت روس ایک امتیاز پرست ریاست (meritocracy) ہے۔ سویٹ سماج میں حقیقی کسبی آمدنی میں (ٹیکس کے بعد) زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم کے درمیان فرق و تفاوت بلاشبہ اس سے زیادہ ہے جو انگلستان اور اسکنڈینیویا کے ممالک میں پایا جاتا ہے اور ممکن ہے کہ اس کے برابر ہو جو امریکہ میں رائج ہے۔۔
۔۔۔۔۔ سویت روس کے قائد یہ سمجھتے ہیں کہ جو چیز سب سے زیادہ اہم ہے وہ مادی محرکات ہیں اس لئے انھوں نے ایک محرکات سے بھری ہوئی ریاست (Incentive State) بنائی ہے اور بلاواسطہ محصول کے ذریعہ اس کے نتائج میں ترمیم کے بھی حق میں نہیں ہیں۔ انھوں نے بلا شبہ یہ ثابت کر دیا ہے کہ عدم مساوات صرف انفرادی ملکیت ہی کی پیدا کردہ نہیں ہوتی۔ یہ میرا اپنا یقین ہے اور معلوم شماریات اور چشم دید گواہوں کی شہادت یہ ہے کہ مفت تعلیم، پیرانہ سالی کی پنشن (زراعت کے سوا) اور دوسری سماجی خدمات کے باوجود وہاں عدم مساوات کو ان حدود سے بہت دور تک بڑھا دیا گیا ہے جو ایک ملک کے شہریوں کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے ضروری ہیں۔

Jay, Douglas. S…idum. in the New Society, Longmans, London, 1962, pp.16-17.

پر منتج ہوئی اور سارا اقتراب ۔۔۔ قومیت پسندی ۔۔۔ ہوا ہوگیا۔ اس سلسلہ میں اشتراکیت کی موت پرستی اور قومیت کے آگے شکست کی صرف چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

(i) اشتراکیت کی بین الاقوامی تنظیم کو مغربی ممالک کے اثر کے تحت باقاعدہ طور پر ختم کیا گیا۔ یہ گویا ایک عالمگیر تحریک کے تصور سے مراجعت اور قوم پرستی کے لئے زمین ہموار کرنے والا پہلا قدم تھا۔

(ii) جنگ کے زمانہ میں جرمنی کے نسل پرستانہ نعروں کے مقابلہ میں روس نے سلیو نسل کا نعرہ بلند کیا۔ ۱۹۴۱ سے تقریباً ہر سال روس میں All-Slav Conference کانگریس منعقد کی جانے لگی۔ "دنیا کے مزدوروں کی سرزمین" اب "سلیو نسل کی قائد" بن گئی تھی اور اس کی فوج "سلیو اقوام کی دائمی فوج" قرار دی گئی!

(iii) فوج کا عہد بھی تبدیل کر دیا گیا ۱۹۳۹ سے پہلے فوجیوں کا عہد یہ تھا

"میں عہد کرتا ہوں کہ اپنے قول و عمل سے مزدوروں کی ترقی کے عظیم مقصد کے لئے کوشاں رہوں گا اور میں عہد کرتا ہوں کہ سوویٹ یونین، سوشلزم اور تمام انسانوں کی اخوت کے لئے لڑوں گا۔"

۱۹۳۹ کے بعد نیا عہد صرف یہ تھا

"میں اپنے آخری سانس تک اپنے مادر وطن اور حکومت کی خدمت کروں گا۔"[۲۲۵]

(iv) ۱۵ مارچ ۱۹۴۴ کو بین الاقوامی ترانہ ترک کر دیا گیا "عظیم روس" کی بڑائی اور عظمت کے بیان میں ایک نیا ترانہ اختیار کر لیا گیا۔

(v) قبل انقلاب کے دور کے زار روس کے فوجی جرنیلوں کی شان میں قصیدہ گوئی کا از سر نو آغاز ہوا۔ انھیں قومی ہیرو کی حیثیت سے پھر پیش کیا جانے لگا۔ جنھیں کل تک سامراجی اور دور غلامی کے بھاڑے کے ٹٹو (mercenaries) کہا جاتا تھا اب ان کے نام کے اعزازات جاری کئے جانے لگے۔ ۲۹ جولائی ۱۹۴۲ کو زاروں کے دور کے جرنیل سوفورف (Suvorov) کیوٹوزوو (Kutuzov) اور الیگزینڈر نیوسکی Nevsky کے ناموں کے اعزازات جاری کئے گئے اور بالآخر ۶ جنوری ۱۹۴۳ کو فوجی افسروں نے ان جھبوں (epaulettes) کا از سر نو استعمال شروع کر دیا جو وہ زاروں کے دور میں اپنے کندھوں پر لگاتے تھے۔

(vi) شروع کے دور میں جس مورخ کا طوطی بولتا تھا اور جس کی کتب نصاب میں شامل تھیں وہ پوکرووسکی (Pokrovsky) تھا۔ اس نے شخصیت پرستی کی جگہ خالص مارکسی انداز میں پوری تاریخ کو پیش کیا تھا۔ ۱۹۳۴ میں اس کو ہٹا دیا گیا اور اس کی جگہ شیستاخوف (Shestakov) نے لے لی۔ جس کی تاریخ ۱۹۳۷ میں داخل نصاب ہوئی اور جس کا امتیازی نشان یہ تھا کہ "ہم اپنے وطن سے محبت کرتے ہیں، ہمیں اس کی عظیم تاریخ سے واقف ہونا چاہئے۔" پوری تاریخ کو دوبارہ قومیت اور اقتدار پرستی کے رنگ میں بیان کیا گیا اور اس میں یہاں تک پہنچ کر

---

۲۲۵ 225 Vid., Koestler, *The Yogi and the Commisar*, op.cit., p.196.

سترھویں اور اٹھارویں صدی کے وہ مزدور لیڈر جنھیں آج تک انقلاب کا ہراول دستہ کہا گیا تھا[۲۲۱] اب ان کی اہمیت باقی نہیں رہی بلکہ وہ قابل ذکر سیاست داں بھی نہ رہے اس لئے کہ "ان کی تحریکات میں لیٹرے بھی شامل تھے"۔

(۱۷) اس زمانہ میں جو نئے ہیرو قوم کے سامنے پیش کئے گئے ان میں نہ مارکس کا نام تھا نہ اینجلز کا، نہ لینن کا۔ اسٹالن کی ۷ نومبر ۱۹۴۱ کی یوم انقلاب کی تقریر یوں شروع ہوتی ہے[۲۲۲]

"تم اس جنگ میں ہمارے عظیم پیش رو الیگزینڈر نیوسکی، ڈمیٹری دونسکوئی، کوزما مینین دمیٹری پوزارسکی، الیگزینڈر سوورو‌وف اور میکائیل کوٹوزوف کے ناموں سے ہمت اور رہنمائی حاصل کروگے"۔

یہ چھ شخصیتیں زمانۂ جنگ میں اصل ہیرو بنے۔ ان میں سے چار شہزادے تھے، ایک پادری تھا اور ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو نام نہاد ترقی پسندی کا کسی درجہ میں بھی حامی رہا ہو، لیکن نئے خدا ایسے ہی قرار پاتے۔ حالانکہ یہی وہ لوگ تھے جن کی ماضی میں ذرا سی تعریف بھی ایک کتاب کی ضبطی کے لئے کافی تھی[۲۲۳]

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

(۱۷) یہی قوم پرستانہ رجحان ادب و ثقافت کے دائرے میں رونما ہوا۔ ۱۹۴۳ کے چار اسٹالن پرائز پانے والے ناول یہ تھے: بورودن کی شہزادہ دمیٹری دونسکوئی کی سوانح، انتونوسکی کی کتاب عظیم موراوی۔ ریورجیا کا ایک قومی ہیرو)، یان کی "چنگیز خان"۔ اور اہیرن برگ کی "سقوط پیرس"۔ نظم کے لئے اسٹالن پرائز گوسیو کو گیا جس کی مشہور ترین نظم یوں شروع ہوتی ہے۔

" میں ایک روسی جوان ہوں، ماسکو کا سپوت، عظمت روس کا وارث"

قوم کو ہر قدم پر روسی قومیت کی شراب پلائی جارہی ہے اور اشتراکیت کی جگہ روس کی عظمت کے گیت گائے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک نصابی کتاب سے جو اساتذہ کے تربیتی اداروں میں پڑھائی جاتی ہے یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

" روسی عوام کی خدمات غیر معمولی طور پر عظیم ہیں۔ صرف سوویٹ یونین کے عوام ہی کے لئے نہیں بلکہ پوری

---

[۲۲۱] مثلاً Emelyan Pugachov اور Stenka Rezin Bulavin.

[۲۲۲] Speech on 24th Anniversary, vide Koestler, p.197.

[۲۲۳] واضح رہے کہ کوزما مینین وہ ہستی ہے جس کے بارے میں سوویٹ انسائیکلو پیڈیا (۱۹۳۴) یہ لکھ چکی تھی کہ "اس کو نمائندہ مورخین نے مقدس مادرِ روس کے لئے لڑنے والا اولیک فوجی ہیرو بنانے کی کوشش کی تھی"۔ شہزادہ پوزارسکی نے پولینڈ کے خلاف ۱۶۱۲ میں فوجی رہنمائی کی تھی، شہزادہ سوورووف نے انقلاب فرانس سے ٹکر لی تھی اور مزدوروں کی بغاوت کو کچلا تھا، شہزادہ کوٹوزوف وہ ہے جس نے کسانوں کی بغاوت کو ختم کیا تھا اور شہزادہ دونسکوائی منگولوں سے لڑا تھا اور پرانی روسی چرچ کا ایک سینٹ تھا۔

انسانیت کے لئے۔ روسی عوام کی تاریخ ان کی سیاسی سوجھ بوجھ، عسکری جرأت اور عبقریت کا بیّن ثبوت ہے

ہمارے جرأت مند عوام کی تاریخ سے اس حقائق کو طلبا کے سامنے بڑی حرارت کے ساتھ پیش کیا جانا چاہئیے تاکہ ان کے دلوں میں ان انقلابی اور ترقی پسند چیزوں کے بارے میں جذبہ افتخار پیدا ہو جن سے ہماری تاریخ مالا مال ہے۔"[۲۹]

یہ ہے وہ المیہ جس سے اشتراکی بین الاقوامیت اور عالمگیریت دوچار ہوئی۔ بین الاقوامی تحریک ماند پڑ گئی اور قومیت کے عفریت نے سر اٹھا لیا۔ یہی وہ بنیادی روگ ہے جو عالمی اشتراکیت کو گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے۔ پہلے روس میں قومیت نے رنگ جمایا۔ دوسری جنگ کے بعد دوبارہ اس تحریک کو کچھ عالمگیر رنگ دینے کی کوشش کی گئی لیکن سب سے پہلے یوگوسلاویہ نے بغاوت کی اور اپنے قومی وجود کو منوایا۔ یہ اشتراکی پروٹسٹنٹزم کی ابتدا تھی۔ پھر چین، رومانیہ اور البانیہ نے یہی راہ اختیار کی۔ آج روس اور امریکہ میں ہاٹ لائن ہے اور بین الاقوامی امور میں باہمی تعاون — لیکن چین اور روس ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں اور دونوں کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابلہ پر کھڑی ہیں۔ چین کا الزام ہے کہ روس بورژوا ہو گیا ہے اور اشتراکیت کو ترک کر چکا ہے۔ وہ سامراجی عزائم اپنے سینے میں پال رہا ہے اور سامراجیوں سے تعاون کر رہا ہے۔ پچاس سال کے اندر اندر ایک نظریہ کا یوں ابھرنا اور پھر اسی طرح اپنی ہر چیز کو ترک کر دینا اشتراکیت کا سب سے بڑا سانحہ ہے۔ اشتراکی آج جن باتوں کو دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہیں اپنی سرخ جنت میں وہ ان میں ایک ایک کو آزما کر رد کر چکے ہیں۔

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

(۱۱) یہی معاملہ مذہب کے ساتھ رہا۔ جنگ کے زمانے میں چونکہ عوام کو اپنی جان قربان کرنے کی ترغیب دینی تھی اس لئے مذہب کی شدید ترین مخالفت اور اس کو افیون قرار دینے کے باوجود اس کو ... میں مختلف مراعات (concession) دیئے گئے۔

(۱۲) سیاسی تعلقات میں بھی کسی اصول پرستی کا مظاہرہ نہیں کیا گیا۔ پہلی جنگ میں اشتراکیوں نے تاوان جنگ (War reparations) کو ایک سامراجی ظلم کہا تھا اور ان کی سختی سے مخالفت کی تھی۔ دوسری جنگ کے بعد روس نے خود تاوان جنگ وصول کیا۔ جرمنی فاشزم کی شدید ترین انداز میں مخالفت کی گئی اور اسے سرمایہ داری کی آخری اور بدترین شکل کہا گیا لیکن جب مفاد نے تقاضا کیا تو اس جرمنی سے معاہدہ کیا گیا۔ روس کا قومی ترانہ ماسکو کے ہوائی اڈہ پر گایا گیا اور جنگ کے پہلے دو سال اس سے پورا پورا تعاون کیا گیا اور اس تعاون کے ذریعہ لیتھوانیہ پر اپنا حق منوایا گیا۔ بین الاقوامی معاہدات کے بارے میں بھی روس کا رویہ نہایت موقع پرستانہ رہا ہے۔

---

[۲۹] Yesipov and Goncharov *Pedagogy*, Moscow, 3rd edition, 1946, VIP. King Hall *op cit*, p 49.

(۱۳) اس سلسلہ کی تازہ ترین چیز وہ بنیادی معاشی اصلاحات ہیں جو اس وقت روس میں اور پورے مشرقی یورپ میں ہو رہی ہیں۔ ان اصلاحات کی پشت پر کام کرنے والی چیز یہ ہے کہ مارکٹ کے نظام کو ختم کرنے کے بعد اشتراکیت کے پاس معاشی حساب کاری کا کوئی معروضی طریقہ باقی نہیں رہا تھا منصوبہ بندی کے ذریعہ وسائل کی تقسیم کا کام انجام دیا گیا لیکن ایک مدت کے تجربہ نے بتایا کہ رسد اور طلب کی فطری قوتیں اپنا لوہا منواتی ہیں مصنوعی قیمتیں ایک حد تک تو کام دیتی ہیں لیکن اس کے بعد نئی پیچیدگیوں کو جنم دینے لگتی ہیں۔ قلت کا مسئلہ بھی رونما ہوتا ہے اور وسائل اور پیداوار میں عدم آہنگی کا بھی۔ اجرتوں کے فرق کے باوجود معاشی محرکات کا مسئلہ پورے طور پر حل نہیں ہو پاتا۔ مختلف عاملین پیداوار کی کارکردگی کے تعین کا کوئی اصول باقی نہیں رہتا ہے۔ ان تمام پیچیدگیوں سے نکلنے کے لئے اس وقت اشتراکی دنیا میں ایک غیر معمولی اہمیت کا تجربہ ہو رہا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے پولینڈ نے قدم اٹھایا اور اسکار لانگے کی رہنمائی میں سوشلسٹ معیشت کے framework میں مارکٹ کے نظام کو قائم کرنے کی کوشش کی گئی۔ روس نے اس کی سخت مخالفت کی اور "پولش موڈل" کے مطالعہ کو ممنوع کر دیا۔ لیکن جب منصوبہ بند معیشت کی اندرونی پیچیدگیاں حد سے بڑھ گئیں تو خود روسی معاشی ماہرین نے اس کے لئے راہ ہموار کی۔ پروفیسر ایل. وی. کانٹرووچ (L. V. Kantorovich) اور پروفیسر ای لائبرمین (Evsei Liberman) نے اس سلسلہ میں بنیادی کام کیا ہے۔ کانٹرووچ نے مارکس کے نظریہ قدر سے ہٹ کر قدر کے مسئلہ پر غور و فکر کی بنیاد ڈالی اور لائبرمین نے تعین قدر کے ایک نئے نظام کا خاکہ پیش کیا۔ کوسیجن اور بریزنیف اس نئے نظام کے مداح ہیں اور اب اس کا تجربہ کر رہے ہیں۔ [۲۳]

---

[۲۳] اس موضوع پر مطالعہ کے لئے مندرجہ ذیل چیزوں کا مشورہ دیا جا سکتا ہے۔ ہم مجبور ہیں کہ جگہ کی قلت کے باعث ان اصلاحات کی طرف صرف اشارہ کریں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی حیثیت انقلابی ہے اور اشتراکی نظام سے اتنا بڑا انحراف اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ لائبرمین کے مضامین میں شائع ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ کا سب سے مفصل مضمون ۷ ستمبر ۱۹۶۲ کے شمارہ میں شائع ہوا ہے۔ لائبرمین نے ایک مختصر مضمون لندن اکونومسٹ میں بھی لکھا ہے۔

Vigor; *A Guide to Marxism*, oq.cit., pp.207-212; Zauberman, Alfred, "Breakthrough to Economics", *Survey*, July 1965, pp.118-124; Nove, Alec, "The Liberman Proposals" *Survey*, April 1963. pp.112-118; Hevesay, *The Unification of the World*, op.cit., pp.70-77; Somlinski, Leon, "What Next in Soviet planning", *Foreign Affairs*, July 1964; and Goldman, Marshall I., "Economic Controversy in the Soviet Union" *Foreign Affairs*, April 1963 and "Economic Revolution in the Soviet Union", *Foreign Affairs*, January, 1967.

ستمبر ۱۹۶۲ء میں لائبرمین نے ایک مضمون کے ذریعہ منصوبہ بندی کی کچھ پیچیدگیوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اس کے بعد چار سال تک ماہرین معاشیات کے درمیان بحث و مجادلہ کی کیفیت رہی۔ اب دو ڈھائی سال سے نئے نظام پر عمل ہو رہا ہے۔ اور وزیر اعظم روس جناب کوسیجن نے یہ کہہ کر دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ہے ۱۹۶۸ء کے آخیر تک پوری صنعت نئے اصولوں پر منظم ہو جائے گی۔

اس تجربہ کا پس منظر ۱۹۵۹-۶۵ کے سات سالہ منصوبہ کی ناکامی ہے۔ پھر روس کے معاشی کوائف سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ گذشتہ دس سال سے صنعت کی پیدا آوری برابر کم ہو رہی ہے۔ اس سے یہ بنیادی سوال پیدا ہوا کہ کیا قانون تقلیل حاصل نے اپنا عمل شروع کر دیا ہے اور اب لمبے عرصے کی سست روی (Slackenning) رونما ہو گئی ہے۔ دوسری بنیادی چیز جس نے معاشی ماہرین کو پریشان کر رکھا تھا وہ حد سے بڑھتی ہوئی مرکزیت اور اس کے نتیجہ میں رونما ہونے والی پیچیدگیاں اور الجھنیں ہیں۔ تیسری چیز نظام محرکات (incentive system) کا مطلوبہ حد تک موثر نہ ہونا تھا۔ چوتھی چیز کمیت کے مقابلہ میں کیفیت سے غفلت اور اختراع اور تجدید کی کمی تھی۔ پانچویں چیز نظام میں تغیر پذیری اور مطابقت پذیری (flexibility and adaptability) کی کمی تھی۔ ان سب پر مستزاد قیمتوں کا غیر حقیقی ہونا ہے جس کا اعتراف خود کوسیجن نے کیا کہ ہماری قیمتیں حقیقی لاگت کی آئینہ دار نہیں ہیں۔ ان تمام خرابیوں کا اعتراف حالیہ معاشی مناظرہ میں صاف طور پر کیا گیا ہے۔ لائبرمین نے جو نیا ذہن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے وہ یہ ہے کہ

"مجوزہ اسکیم کے ذریعہ مرکزی منصوبہ بندی کا ادارہ تمام اداروں کی تفصیلی نگرانی کے کام سے فارغ ہو جائے گا۔ اسی طرح پیداوار کو معاشی ذرائع کی بجائے انتظامی ذرائع کی مداخلت سے متاثر کرنے کا مہنگا عمل بھی باقی نہیں رہے گا۔ ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ تنظیم ہی اس بات کا بہتر فیصلہ کر سکتی ہے کہ اس کی بہترین امکانی صلاحیت کیا ہے۔" [۲۳۱]

حکومت نے جو نئی اصلاحات نافذ کی ہیں ان کا تجربہ سب سے پہلے ماسکو کی ایک مردانہ لباس بنانے والی فیکٹری Maiak Bolshevichka میں اور گورکی کی ایک زنانہ لباس بنانے والی فیکٹری Maiak میں مئی ۱۹۶۴ء میں ہوا تھا۔ جنوری ۱۹۶۵ میں یوکرین کی بھاری صنعت نے اس اصول پر کام شروع کر دیا اور ۱۹۶۵ء کے آخر تک اشیا صرف تیار کرنے والی ۴۰۰ کمپنیاں اور پرچون فروشی کی ۲۰۰۰ دکانوں کو نئے نظام کے مطابق ڈھالا جا چکا تھا۔ جنوری ۱۹۶۷ء تک پوری صنعت کی ایک تہائی نئے اصولوں پر منظم ہو چکی تھی اور توقع ہے کہ دسمبر ۱۹۶۸ء تک پوری صنعتی معیشت اس پر منتقل ہو جائے گی۔ ان اصلاحات کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) پہلے ... کاروباری محرکات کے پرانے نظام کو تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اب ہر کام مرکز سے کئے جانے کی بجائے ہر ہر [illegible] صنعت کو آزادی دی جا رہی ہے اور وہ اپنا معاشی پروگرام خود بناتی ہے۔

---

[۲۳۱] vide. Nove. Alec, "The Liberman Proposals". *Survey*, April, 1963. p.114

(ii) معاشی فیصلے بڑی حد تک معاشی اصولوں کو سامنے رکھ کر کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اصل مقصد یہ ہے کہ ایسی قیمتیں مقرر ہوں جو ایک طرف کل پیداوار کی نکاسی کا باعث ہوں اور دوسری طرف ایسی چیزیں تیار کی جائیں جو صارفین کی ضروریات پوری کریں۔

(iii) اس کے لئے قیمت کے تعین میں عاملین پیداوار کا معاوضہ شامل کیا جا رہا ہے۔ زمین پر لگان لیا جائے گا، سرمایہ پر مصارف سرمایہ (capital charges) ۶ فی صدی کے حساب سے لگائے جائیں گے۔ بنکوں سے حاصل کئے ہوئے قرضوں پر ۵ ½ سے ۲ فی صدی تک سود لگایا جائے گا۔ اس طرح قیمتوں کو معاشی حقائق سے زیادہ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ نیز ان مصارف کے بعد فیکٹری منیجر فیکٹری کا نفع بھی رکھے گا جسے اوپر سے متعین نہیں کیا جائے گا۔

(iv) ملک بھر میں ایک چیز کی ایک ہی قیمت نہیں ہوگی۔ ہر فیکٹری اپنی مصنوعات کی قیمت خود مقرر کرے گی۔ اور اس میں جدت (Novelty) اعلیٰ کوالٹی اور بہتر کارکردگی کی مناسبت سے قیمت اونچی رکھی جا سکتی ہے۔[۱۳۲]

(v) رسد کا بھی نیا نظام اختیار کیا جائے گا۔ ہر فیکٹری یا ادارہ اپنی خرید اور فروخت خود کرے گا۔ وہ کاروباری گماشتے (salesmen) رکھ سکتا ہے۔ تجارتی میلوں میں شرکت کر سکتا ہے۔ منڈی کی ریسرچ پر روپیہ صرف کر سکتا ہے اور حد یہ ہے کہ اخباروں میں اپنی خاص مصنوعات کا اشتہار دے سکتا ہے۔ اس طرح مرکزی طور پر وسائل کی تقسیم کی بجائے اس محدود قسم کی آزاد رسد اور طلب سے یہ کام لیا جائے گا

(vi) کاروبار کی کامیابی کا معیار پیداوار کی بجائے نفع آوری ہوگی جس کی تعریف لائبرمین نے یہ کی ہے "کل پیداواری فنڈ کی مالیت کی نفع سے نسبت" (the ratio profit to the value of the production fund)

اب وہ صنعتیں اور کمپنیاں جن کی کارکردگی اچھی ہے اور جن کی مصنوعات کے لئے طلب زیادہ ہے اونچا نفع کمائیں گی اور

۱۳۲؎ ان اصلاحات کا جائزہ مارکسی لٹریچر کی روشنی میں لینے کے لئے تفصیلی مضمون کی ضرورت ہے۔ ان میں ہر اصول اشتراکیت سے متصادم ہے۔ ان عوامل کی بنا پر اشیاء کا نکی "سماجی قدر" Social value سے ادھر اشتراکی دنیا میں فروخت کیا جانا مارکس کا تمسخر اڑانے کے مترادف ہے۔ اس سے اشتراکی پلاننگ کا پورا نظام اپنی اصل بنیادوں سے ہٹ جاتا ہے اور لائبرمین پر تنقید کرتے ہوئے ایک روسی ماہر معاشیات نے اس اسکیم پر عمل سے پہلے ! لکھا تھا کہ "لائبرمین کی تجاویز قومی منصوبہ بندی کے نظام کو درہم برہم کر دینے کا باعث ہوں گی۔ پلاننگ انقلاب اکتوبر کا ایک عظیم کارنامہ ہے اسے یوں کیوں ترک کیا جائے؟" نیز یہ کہ "اگر ہم مرکزی طور پر اجرتوں کے فنڈ، محنت کی کارکردگی، لاگت، نفع، سرمایہ کاری وغیرہ کی منصوبہ بندی نہیں کرتے تو ہم دراصل اہم اور بنیادی معاشی روابط کی مرکزی منصوبہ بندی کو ترک کر دیتے ہیں۔ فی الحقیقت یہ قومی منصوبہ بندی ہی کو ترک کر دینے کے مترادف ہے"۔ روسی اکنومسٹ اے۔ زیویریو (A. Zverev) اور کے پوٹنی کوف (K. Plotnikov) اقتباسات ۱۷ اکتوبر ۱۹۶۲ اور ۲ نومبر ۱۹۶۲ کے Ekonomicheskaya Gazeta سے ماخوذ ہیں بحوالہ ایلک نو۔ حوالہ مذکورہ بالا صفحہ ۱۱۵۔

دوسری ان سے پیچھے رہ جاتی ہے کہ نظام سرمایہ داری کے منافع سے خواہ اس میں ابھی کتنا ہی فرق باقی ہو لیکن مرکزی منصوبہ بندی
اور اشتراکی محرکات سے یہ ایک جوہری انحراف ہے۔

(vii) یہ نفع فیکٹری منیجر کی تحویل میں ہوگا اور ہر ادارہ اسے خود استعمال کر سکے گا۔ اس کے استعمال کے لئے تین فنڈ ہوں گے۔
ایک محرکات کا فنڈ، دوسرا تمدنی اور رہائشی فنڈ اور تیسرا ترقیاتی فنڈ۔ ان میں سے ہر فنڈ بن جانے والی رقم کا انحصار کل منافع
پر ہوگا۔ اس طرح منیجر اور مزدوروں کو معلوم ہوگا کہ اگر منافع زیادہ ہوا تو ان کو بھی زیادہ ملے گا۔ اتفاقی امور بھی زیادہ فعال
ہوگا اور خود کاروبار کے فروغ کے لئے بھی زیادہ رقم مل سکے گی۔ ترقیاتی فنڈ ایک بالکل نئی چیز ہے اور توقع کی جاتی ہے
کہ اس سے ایجاد و اختراع کو خصوصی تحریک حاصل ہوگی۔

یہ تمام اصلاحات روس کے اشتراکی معاشی نظام میں انقلابی تبدیلیوں کا باعث ہوں گی اور اس نظام کو سرمایہ دارانہ معیشت
اور معاشی اصولوں سے کچھ اور قریب لے آئیں گی۔

ہم نے اوپر کے صفحات میں جو بحث کی ہے اس سے دو نتائج بہت صاف طور پر نکلتے ہیں :

(الف) روس میں اشتراکی نظریہ سے مسلسل انحراف کی ایک رو پائی جاتی ہے اور آہستہ آہستہ اس کے ایک ایک بنیادی اصول
کو ترک کیا جا رہا ہے۔

(ب) تبدیلی کے اس عمل کے نتیجہ کے طور پر روسی اشتراکیت بہت سے پہلوؤں سے مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام سے قریب تر
آتی جا رہی ہے اور اب معاشی ماہرین اور فلاسفہ میں ان کی ایک قابل ذکر تعداد اس امر کا اظہار کر رہی ہے کہ یہ دونوں
نظام ایک دوسرے میں ضم ہو رہے ہیں، ان کے اختلاف کے پہلو برابر کم سے کم تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اور ان کی مماثلت
کے پہلو بڑھتے جا رہے ہیں۔

ان دونوں نکات کی تائید و توثیق کے لئے ہم چند شہادتوں کی طرف مزید اشارہ کیا کرتے ہیں۔ روس میں صنعتی انقلاب
کے جلو میں اب ایک صنعتی تہذیب جلوہ گر ہو رہی ہے۔ روس میں ابھی معاشی ترقی اپنی انتہا کو نہیں پہنچی ہے۔ وہاں قلت کے
مسائل ہنوز درپیش ہیں اور عوامی صرف کا معیار زیادہ بلند نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ وسٹو کی High mass consumption
economy یا گالبریتھ کی affluent society سے ابھی بہت دور ہے لیکن اس کے باوجود صنعتی معاشرہ کے
تمام پہلو اس میں رونما ہونے لگے ہیں اور ایک فرانسیسی مفکر ریمونڈ ایرون (Raymond Aron) کے الفاظ
میں "کار، ریفریجریٹر اور ٹیلی ویژن انقلاب کی روح کو فنا کئے دے رہے ہیں"!

روس کے نوجوان اشتراکیت میں وہ حرارت محسوس نہیں کرتے جو انقلابی دور کے نوجوان محسوس کرتے تھے۔ ان میں
بے راہ روی کی وہ تمام صورتیں رونما ہو رہی ہیں جو مغرب میں رائج ہے: چوری، شراب نوشی، اچھی چیزوں کو تباہ کرنا (vendalism)
زنا اور دوسرے جنسی جرائم، تعلیم میں شدید نظریاتی رنگ کے باوجود نوجوانوں کی اپنے نظریہ میں
دلچسپی کم ہو رہی ہے۔ نوجوانوں کی اشتراکی تنظیم کا ترجمان برابر یہ شکایات شائع کر رہا ہے کہ نوجوان پارٹی کے اجتماعات
میں کم آ رہے ہیں۔ ممبریت اختیار کرنے کے بعد بھی پارٹی کی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کرتے۔ جو کہانیاں وہاں کے نوجوانوں کے

سالوں مثلاً yeomost (نوجوان) میں شائع ہو رہی ہیں وہ اعلیٰ درس کی غماز ہیں۔ ان میں جو موضوعات (themes) تسلسل کے ساتھ آ رہے ہیں وہ نوجوانوں کی خود رفتگی اور بیگانگی (alienation) کا پتہ دیتے ہیں۔ اسکول سے بھاگنا، گھر سے بھاگنا، ڈسپلن سے لاپرواہی، فرض سے غفلت افسانوں اور کہانیوں کے عام موضوع ہیں۔ روسی امور کا ایک ماہر بجا طور پر لکھتا ہے کہ

> " روس کی عام زندگی کے قبیح پہلوؤں پر سے پردہ اٹھانے کے مقابلے میں روس کے اس ادب کا مطالعہ زیادہ مفید اور آنکھیں کھولنے والا ہے، جب ایک نوجوان ہیرو کہتا ہے کہ " ہمارے پاس کوئی نظریات نہیں ہیں " جب ایک نوجوان ماہر طبیعیات ایک دوسرے ناول میں بڑی حقارت اور نفرت کے ساتھ کہتا ہے کہ " یہ سب اونچے اونچے بے معنی الفاظ کیا ہیں " یا یہ کہتا ہے کہ یہ سب زبانی جمع خرچ ہے، لفظ پرستی اور " الفاظ کے fetishism " یہ تمام اظہارات اس نظام کے لئے ایک چیلنج کا درجہ رکھتے ہیں جو لوگوں کو نظریاتی بندھنوں میں جکڑتا ہے "[۲۳۳]

معیشت میں دونوں جگہ سرکاری مداخلت اور بیوروکریسی کی بالادستی نظر آتی ہے۔ سیاست میں فرد کی اہمیت کم ہو رہی ہے۔ معاشرت میں خاندانی نظام تہ و بالا ہو رہا ہے۔ روس میں مغربی میوزک برابر مقبول ہو رہا ہے۔ حد یہ ہے کہ نوجوانوں میں جاز (Jazz) سے رغبت بڑھتی جا رہی ہے۔

علمی میدان میں بھی اہم تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ سائنس اور جدلی مادیت کا تصادم اب نمایاں تر ہوتا جا رہا ہے اور اس سلسلہ میں جدلی مادیت پر اصرار باقی نہیں رہا۔ سائنسی علوم میں نسبتاً زیادہ آزادی دی جا رہی ہے۔ معاشیات میں مارکس کے نظریہ قدر کو تقریباً ترک کر دیا گیا ہے۔ یہ ساری علامتیں اور اوپر جو حقائق پیش کئے گئے ہیں وہ اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ روس میں اشتراکی نظریہ انتشار اور فرسودگی کا شکار ہے اور آہستہ آہستہ وہ بنیادیں منتشر ہو رہی ہیں جن پہ انقلاب برپا کیا گیا تھا۔ اس کی جگہ سرمایہ دارانہ ذہن برابر ابھر کر سامنے آ رہا ہے اور یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوتی جا رہی ہے کہ روسی اشتراکیت اور مغربی سرمایہ داری دراصل ایک ہی تہذیب — مغرب کی مادی حسی تہذیب — کے دو روپ ہیں اور آج یہ دونوں نظام ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں پٹیرم سوروکن کا حالیہ مطالعہ بڑا دلچسپ اور معنی خیز ہے۔ مصنف موصوف نے اپنی تازہ کتاب " ہمارے دور کے بنیادی رجحانات "[۲۳۴] میں دونوں نظاموں کے قرب اور ایک دوسرے میں مدغم ہونے کے رجحان کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ فکر و فلسفہ سے لے کر سائنس اور ٹیکنالوجی اور تنظیم اور بیوروکریسی تک کے ہر میدان میں ایک دوسرے سے قریب آ گئے ہیں موصوف کے نتائج مطالعہ یہ ہیں۔

---

۲۳۳ Alexander Gerschenkron quoted in *Survey*, April 1963, p. 66.

۲۳۴ Sorokin, Pitirim A., *The Basic Trends of Our Times*, New Haven, Conn., 1964, Chapter III, pp. 78-130.

"اولاً اپنی اصلی اور انتہائی شکلوں میں اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں بہت ناقص ہیں اور انسانیت کے لئے ایک اعلیٰ نکھری ہوئی اور تخلیقی زندگی کی تشکیل نہیں کر سکتے۔

ثانیاً دونوں نظام کچھ مخصوص حالات میں کچھ مخصوص زمانوں کے لئے مفید مطلب ہو سکتے ہیں۔ بدلے ہوئے حالات میں دونوں غیر مفید اور غیر ضروری ہو جاتے ہیں۔

ثالثاً اقوام کے یورپی اور سوویٹ دونوں دائروں میں بتدریج یہ دونوں نظام اپنی اصلی خصوصیات کو تیزی کے ساتھ کھو رہے ہیں اور ایک دوسرے کی خصوصیات کو قبول کر رہے ہیں اور اپنے نظام میں ضم کرتے جا رہے ہیں۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ دونوں کی اصلی شکل آہستہ آہستہ بدل رہی ہے اور دونوں ہر اعتبار سے ایک دوسرے کے مشابہ تر ہوتے جا رہے ہیں — کلچر میں، سماجی ادارات میں، نظام اقدار میں، نظریہ حیات میں۔"[۲۲۵ھ]

یہ ایک ماہر عمرانیات کی رائے تھی۔ اسی کی تائید ڈپلومیٹ ہیوے سی کی رائے سے ہوتی ہے۔ جس کا خیال ہے کہ دونوں نظاموں کے درمیان تصادم کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اب ان دونوں کے مختلف اجزاء پر مشتمل ایک تیسرا نظام رونما ہو رہا ہے۔[۲۲۶ھ] ایک دوسرا ڈپلومیٹ روس کے بارے میں لکھتا ہے کہ

"جدید تبدیلیوں اور اجتہادات سے سارا نظریاتی محل تاشوں کے گھروندوں کی طرح ہل گیا ہے۔"[۲۲۷ھ]

ماہرین معاشیات میں سائیرل زیبوٹ کا خیال ہے کہ

"ان بڑے بڑے اختلافات کے باوجود جو مختلف معاشی نظاموں کے درمیان موجود ہیں، آج کی دنیا کے مختلف نظام اپنے بنیادی وظائف اور کارکردگی میں ایک دوسرے سے قریب اور مشابہ ہوتے چلے جا رہے ہیں۔"[۲۲۸ھ]

سورانی انگر اور ٹمبرگن جیسے عالمی شہرت کے معاشی ماہرین نے بھی اسی رائے کا اظہار کیا ہے اور ان کا خیال ہے کہ سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان کشمکش کا دور ختم ہو گیا اب یہ نظام ایک دوسرے میں مدغم ہو رہے ہیں اور ایک دوسرے سے قریب تر آتے چلے جا رہے ہیں۔[۲۲۹ھ] اشتراکیت کی سرخی اب بہت کم ہو گئی ہے اور سرمایہ داری کے چہرے پر غازہ اتنا بڑھ گیا

۲۲۵ھ *ibid.*, p. 79.

۲۲۶ھ Hevesy. *The Unification of the World.*

۲۲۷ھ The Soviet World, *op. cit.*, p. 24?

۲۲۸ھ Zebot, Cyril A., *The Economics of Competitive Co-existence*, Praeger, New York, 1964, p. (vii).

۲۲۹ھ See Timbergen, Jan. 'Do Communist and Free Economies Show a Converging Pattern *Comparative Economic Systems; Models and Cases* ed by Morris Bornstein, Richard D. Irwin, Homewood, Illinois. 19?5; pp. 455-464; and Suranyi-Unger, Theo. *Comparative Economic Systems*, McGraw Hill, New York, 1952, Capters III to V; See also *Survey*. April 1963, pp. 59-70.

ہے کہ وہ اپنی اصل سفیدی کو کھو چکا ہے۔ مغربی تہذیب کے یہ دونوں سپوت آج ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے ہیں۔
اس حصہ کا مطالعہ ہمیں اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ خود خالص اشتراکی اصولوں کے نقطۂ نظر سے بھی اشتراکیت کا عملی تجربہ بڑا مایوس کن ہے۔

(۸)

اشتراکیت اور اسلام

ہم نے مختلف معیارات پر اشتراکیت کا بے لاگ محاکمہ کیا ہے اور حقائق ہمیں جس نتیجہ پر پہنچاتے ہیں وہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی معیار پر بھی وہ پوری نہیں اترتی۔ اب صرف ایک پہلو ایسا ہے جس پر مزید غور و فکر کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ کیا اسلام اور اشتراکیت میں کوئی مفاہمت یا اشتراک ہو سکتا ہے؟ کیا یہ دونوں ایک جگہ جمع ہو سکتے ہیں اور ایک دوسرے کے لئے ممد و معاون بن سکتے ہیں؟ اگر دونوں کا یہ اجتماع ممکن ہے تو کیا یہ مفید بھی ہوگا؟ اب ہم اسی پہلو پر مختصر روشنی ڈالیں گے۔

نئے۲۳ اسی نوعیت کی کوششوں کا ایک مظہر "اسلامی سوشلزم" کا نعرہ ہے۔ یہ ترکیب بہت سے کانوں کے لئے اجنبی ہے اور فتنہ انگیز بھی۔ اگر اس کے پیچھے کام کرنے والے ذہن کا تجزیہ کیا جائے تو یہ صورتیں سامنے آتی ہیں۔

(i) سوشلزم اور اسلام ایک دوسرے سے متصادم نہیں ہیں۔ انھیں ایک ساتھ جمع کیا جا سکتا ہے۔

(ii) جمع کرنے کی صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہوں۔ اس صورت میں ماننا پڑے گا کہ اسلام نامکمل ہے اور اس کی تکمیل سوشلزم کے ذریعہ ضروری ہے۔

(iii) جمع کرنے کا ایک اور مفہوم توصیفی یا توضیحی ہو سکتا ہے۔ یعنی اسلام کی اس خصوصیت کو پیش کرنا کہ وہ اشتراکیت کا علمبردار ہے۔ لیکن اس صورت میں بھی (i) میں اٹھائے ہوئے سوال کے علاوہ یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسلام اس طرح قابلِ تقسیم ہے کہ اس کے کسی ایک حصہ کو دوسروں سے نمایاں کرکے نکالا جائے اور اس کے بعد بھی دین متین کا وہ توازن اور ہم آہنگی باقی رہے۔ نیز یہ کہ اس صورت میں ترکیب "سوشلزمی اسلام" ہونی چاہئیے نہ کہ "اسلامی سوشلزم"۔

ہماری نگاہ میں یہ اصطلاح سخت گمراہ کن ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اس کو استعمال کرنے والے سب لوگ بدیانت ہیں لیکن وہ غلط بحث کے مرتکب ضرور ہو رہے ہیں۔ یہ آواز چند گروہوں کی طرف سے اٹھ رہی ہے اور وہ گروہ مختصراً یہ ہیں۔

(i) وہ کمیونسٹ جو جانتے ہیں کہ وہ اسلامی ممالک میں اشتراکیت کی کڑوی گولی کو اس پر اسلام کی شکر لگائے بغیر لوگوں کے حلق میں نہیں اتار سکتے۔ یہ دونوں نظاموں کے فرق کو سمجھتے ہیں مگر لینن کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے اپنی کامیابی کے لئے دھوکہ کی یہ تجارت ضروری سمجھتے ہیں۔

(ii) وہ لوگ جو مذہب کے محدود تصور پر ذہناً قانع ہو چکے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مذہب تو صرف انفرادی زندگی سے متعلق ہے، اجتماعی معاملات میں وقت کے کسی بھی نظام کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ تصور کسی اور مذہب (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہم شروع میں اشتراکیت کے معنی و مفہوم کے سلسلہ میں جو بحث کر چکے ہیں اس سے اشتراکیت کا تاریخی ارتقا، اس کا تہذیبی مزاج، اساس نے عناصر ترکیبی سامنے آ چکے ہیں۔ ان پر گہری نظر ڈالنے کے بعد کوئی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ یہ نظام اسلام کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ

جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

پھر بھی ہم فرق کے چند اہم اور نمایاں پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔[۲۴۱]

اسلام	اشتراکیت
۱۔ اسلام زندگی کے مادہ پرستانہ تصور کی بغاوت پر مبنی ہے اور وہ انسانیت کو انبیائے کرام کے بتائے ہوئے طریقے کی طرف دعوت دیتا ہے۔	۱۔ اشتراکیت مغرب کی مادہ پرستانہ تہذیب کی پیداوار ہے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس مادہ پرستی کی تکمیل کرتی ہے۔ جس قافلہ کے رہنما انبیائے کرام ہیں اس سے اسے کوئی نسبت اور تعلق نہیں۔
۲۔ اسلام کی نگاہ میں کائنات کی سب سے اہم اور بنیادی حقیقت توحید ہے۔ خدا کا وجود، اس کی وحدت، اور اس کی حاکمیت و ربوبیت۔ اسلام کا پورا نظام انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعی معاملات تک۔ خدا کی بندگی سے عبارت ہے اور اس کی حاکمیت کے تابع ہے۔	۲۔ اشتراکیت وجود باری تعالیٰ کی منکر ہے اور مادہ کو اولیت اور قدامت کا مقام دیتی ہے۔ وہ نیچر کے پیچھے کسی قوت کی قائل نہیں ہے۔ وہ کسی بالاتر ہستی کو ماننے کے لئے تیار نہیں اور نہ اپنے پورے نظام میں اس کا کوئی پرتو قبول کر سکتی ہے۔[۲۴۲]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کے ماننے والوں کا ہو سکتا ہے، اسلام کے پیروؤں کا نہیں ہو سکتا۔

(۳) وہ مخلص لوگ جنھوں نے اسلام کا گہرائی میں جا کر مطالعہ کیا ہے اور نہ اشتراکیت کا۔ وہ اشتراکیت کے عوام دوست نعروں اور انصاف پسندانہ دعووں سے مرعوب ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ چونکہ اسلام بھی انصاف کا علمبردار ہے۔ اس لئے یہ دونوں جمع ہو سکتے ہیں۔ ان کا اخلاص اپنی جگہ، لیکن خلوص خواہ کتنی ہی بڑی مقدار میں ہو علم اور حقیقت پسندی کا بدل نہیں ہو سکتا۔

(۴) وہ حضرات جنھیں اشتراکیت سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ اسلام سے۔ لیکن چونکہ اشتراکیت کے ذریعہ ان کے ہاتھوں میں سیاسی اور معاشی قوت کا ارتکاز ہو جاتا ہے اس لئے وہ اپنے سیاسی استبداد کو قائم رکھنے اور مضبوط کرنے کے لئے اس کا سہارا لیتے ہیں ۔۔۔۔۔ ان چاروں میں سے صورت جو بھی ہو، وہ غلط اور مبنی بر باطل ہے اور اس سے کبھی صحیح نتائج نہیں نکل سکتے۔

[۲۴۱] اس سلسلہ میں مزید مطالعہ کے لئے ملاحظہ ہوں۔ محترم مولانا معین صاحب کا مضمون "اسلام اور سوشلزم" محترم نعیم صدیقی صاحب کا مضمون "اسلامی سوشلزم" اور محترم اے۔ کے بروہی کا مضمون "اقبال، اجتہاد اور اسلامی سوشلزم" یہ تینوں مضامین اسی اشاعت خاص میں شائع ہو رہے ہیں۔

[۲۴۲] ہم اس مسئلہ پر مضمون کے شروع میں گفتگو کر چکے ہیں اور ضروری حوالے بھی دے چکے ہیں۔

۳ ۔ اسلام کا بنیادی نقطۂ نظر اخلاقی ہے۔ وہ ہر قول و فعل کو خیر و شر کی اس میزان پر پرکھتا ہے جسے خدا نے اپنی شریعت میں بیان کیا ہے اور جسے انسانیت کے اجتماعی ضمیر نے بحیثیت مجموعی اپنا لیا ہے۔

۳ ۔ اشتراکیت اخلاق کو مخصوص طبقاتی حالات کی پیداوار مانتی ہے اور کسی مستقل قدر یا اصول کی قائل نہیں۔ وہ ہر بات کو طبقاتی تصادم کی عینک سے دیکھتی ہے۔ اخلاق کی اولیت اور اخلاقی نشو و ارتقاء کی فوقیت تو درکنار وہ اسے کوئی مستقل اہمیت نہیں دیتی۔ اس کی نگاہ میں اخلاق اضافی اور محض طبقہ وارانہ حالات کی پیداوار ہیں۔[۴۲۲]

۴ ۔ اسلام کی نگاہ میں زندگی گزارنے کا راستہ پیدا کرنے والے نے طے کر دیا ہے۔ مذہب وہ راستہ ہے۔ اس راستہ کی تفاصیل کو محض عقل اور تجربہ کے ذریعہ دریافت نہیں کیا جا سکتا۔ اس راستہ کی نشان دہی خدا کی شریعت میں کی جاتی ہے اور شریعت ہی خیر و شر اور حسن و قبح کا اصل معیار ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کامیابی کی زندگی وہ ہے جو مذہب کے مطابق گزاری جائے اور زندگی کے سارے معاملات — خواہ ان کا تعلق انفرادی امور سے ہو یا اجتماعی معاملات سے، معاشرت سے ہو یا سیاست سے، معیشت سے ہو یا عدالت سے، امن سے ہو یا جنگ سے، ملکی معاملات سے ہو یا خارجہ تعلقات سے، انھیں مذہب اور خدا کی شریعت کے مطابق طے کیا جائے۔ اس سے ہٹ کر جو راستہ بھی اختیار کیا جائے گا وہ دنیا میں گمراہی اور آخرت میں خسارہ کا راستہ ہوگا۔

۴ ۔ اشتراکیت کی نگاہ میں عقل خود برے بھلے میں تمیز کر سکتی ہے۔ اور اسے کسی بیرونی رہنما کی حاجت نہیں۔ پھر اس کے خیال میں مذہب ایک افیون کی حیثیت رکھتا ہے جو حقیقت سے فرار کا درس دیتا ہے، استحصال کرنے والے طبقات کا آلۂ کار بنتا ہے، ظلم پر قناعت سکھاتا ہے، بے عملی پیدا کرتا ہے، ایک مخصوص پیداواری نظام کا محافظ بنتا ہے اور ضمیر کو موت کی نیند سلا کر مخصوص مفادات کا تحفظ کرتا ہے۔ اسے ختم کیے بغیر کوئی اصلاح ممکن نہیں۔[۴۲۳]

۵ ۔ اسلام فرد کی انفرادی حیثیت کو تسلیم کرتا ہے۔ اس کے بنیادی حقوق کی حفاظت کرتا ہے، اجتماعی نظام کو مستحکم ضرور کرتا ہے لیکن فرد کی نفی کے ذریعہ نہیں بلکہ فرد کی شخصیت کو

۵ ۔ اشتراکیت نے فرد کو اجتماع کا ایک جزو قرار دیا ہے۔ اس کی نگاہ میں فرد کو اجتماعی مفاد کی خاطر کام کرنا چاہیے۔ اجتماعی مفاد اس درجہ غالب ہے کہ فرد کی کلی نفی کر کے بھی اسے حاصل کیا ہے۔[۴۲۴]

---

۴۲۲ ملاحظہ ہو مارکس کی "اشتراکی منشور"، اینجلز کی "روڈیو ہرنگ" اور لینن کی "مذہب"۔

۴۲۳ ملاحظہ ہو مارکس "مقالہ بر فیور باخ"، اینجلز "روڈو ہرنگ"، فیور باخ اور خطوط، لینن "مذہب"، عالمی اشتراکی تحریک "اشتراکی تحریک کا پروگرام"۔

۴۲۴ ملاحظہ ہو پروفیسر عبدالحمید صدیقی صاحب کا مضمون "اشتراکیت کی فکری بنیادیں اور ان کا جائزہ" اصل انگریزی ترجمہ۔ اس مسئلہ کو سمجھنے کے لیے اس کے فلسفۂ تاریخ اور فلسفۂ سماج کا مطالعہ مفید ہوگا۔

نشوونما تک کا پورا موقع دیتے ہوئے اور پھر اس کی نگاہ میں آخرت میں ہر فرد اپنی جواب دہی انفرادی طور پر کریگا۔

۶ - اسلام کا طریق اصلاح یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے فرد کے ایمان کو درست کرتا ہے، پھر تعلیم و تربیت کے ایک عمل کے ذریعہ اس کی زندگی کو بدلتا ہے اور اس طرح حاصل ہونے والی قوت سے اجتماعی نظام کو تبدیل کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن کسی مرحلہ پر بھی اپنے نقطہ نظر کو دوسروں پر جبر و تشدد کے ذریعہ مسلط نہیں کرتا۔ اسی طرح وہ اس کا بھی قائل نہیں ہے کہ محض معاشرہ کو درست کر دینے سے انسان بدل جائیگا۔ اس کی نگاہ میں فرد اور معاشرہ دونوں کی اصلاح بیک وقت ہونی چاہیے اور فرد کی دل کی دنیا کو تبدیل کئے بغیر اس کی باقی دنیا کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتی۔ اس سلسلہ میں اسلام جائز ذرائع کے استعمال کی تلقین کرتا ہے اور ایک تدریجی عمل کے ذریعہ انسانوں کی زندگی کو خدا کی مرضی کے تابع اور اس کے حکم کا پابند بنا دینا چاہتا ہے۔

۶ - اشتراکیت اصلاح کے طریقہ کی مخالف اور خونریز انقلاب کی مدعی ہے۔ وہ تعلیم و تربیت کے مقابلہ میں جبر اور قوت کے طریقوں کو اولیت دیتی ہے اس کی نگاہ میں فرد کو تبدیل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اجتماعی نظام کو بدل دیا جائے اس کے بعد فرد آپ سے آپ بدل جائیگا۔ اس کی فکر کے بڑے حصہ کی نگاہ میں تدریجی اصلاح کا طریقہ غلط اور لاحاصل ہے۔ اصل چیز انقلابی اقدام ہے۔

۷ - اسلام اجتماعی زندگی کے لئے ریاست اور قانون کے اداروں کو ضروری سمجھتا ہے اور ان کو اسلام کے لئے مسخر کرتا ہے۔ پھر وہ حقیقی سیاسی اور معاشرتی مساوات، حقوق کی حفاظت اور شریعت کے مطابق لوگوں کی آزاد مرضی کے ذریعہ حکمرانی کے اصول پیش کرتا ہے اور ان اصولوں پر اس نے ریاست قائم کرکے بھی دکھا دی ہے۔

۷ - اشتراکیت ریاست اور قانون کو آلہ ظلم و استحصال سمجھتی ہے۔ عبوری دور میں وہ ان قوتوں کو آمرانہ انداز میں ایک طبقہ کو ختم کرنے کے لئے استعمال کرنا چاہتی ہے اور اپنے معیاری معاشرہ کے لئے وہ ان اداروں کو ختم کر دینے کی دعوے دار ہے۔ اس کا نظام نہ مساوات پر مبنی ہے، نہ قانون کی حکمرانی پر، اور نہ سیاسی اور معاشرتی جمہوریت پر۔

۸ - معاشرت کے دائرہ میں اسلام خاندانی نظام، عفت و عصمت کی پاسبانی، انسانی مساوات، اخوت اور محبت، تعاون باہمی اور اجتماعی تحفظ و تضامن کے طریقہ کا داعی ہے اور اس کا پورا معاشرتی نظام قرآن و سنت کی دی ہوئی اقدار پر مبنی اور اس ثقافت و تمدن کا

۸ - اشتراکیت طبقاتی نزاع اور تصادم کو زندگی کی سب سے اہم حقیقت قرار دیتی ہے۔ خاندان کا نظام اس کی نگاہ میں انفرادی ملکیت ہی کے اصول کا ایک شاخسانہ ہے اور اس کے ساتھ اسے بھی ختم ہونا چاہیے۔ اولاد معاشرہ کی دولت ہیں۔ والدین کی نہیں تمام اقدار کو طبقاتی تقسیم کی روشنی میں طے کیا جائیگا، ان سے

قائم کرنے والا ہے جس میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نظام جلوہ گر ہو۔

۹۔ معیشت میں اسلام انفرادی ملکیت اور آزادی سعی جہد اور صرف و خرچ کی اجازت دیتا ہے۔ لیکن دولت کو ایک امانت قرار دے کر اس کے استعمالات کو محدود کرتا ہے اور اس پر فرد، معاشرہ اور خدا کے واضح حقوق عائد کر دیتا ہے جنہیں ادا کئے بغیر وہ دولت پاک نہیں ہو[تی]۔ وہ پوری معاشی زندگی کو انصاف کے تقاضے پورا کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے اور کسی جگہ بھی محض معاشی مقاصد کو اخلاقی اور اجتماعی مقاصد پر فوقیت نہیں دیتا۔

ہٹ کر نہیں۔

۹۔ اشتراکیت وسائل پیداوار کی ملکیت سے رونما ہونے والی بنیادی ساخت کو پوری زندگی میں اصل فیصلہ کن قوت قرار دیتی ہے اور ان کو قومی ملکیت میں لے لینے کو ساری بیماریوں کا علاج قرار دیتی ہے۔ اس کی معاشیات حرام و حلال کے تصور سے ناآشنا ہے اور جبریت یہاں بھی اس کی اہم ترین خصوصیت ہے۔ وہ ایک طبقہ کا مکمل استیصال چاہتی ہے۔ لیکن اس کی جدو جہد سرمایہ داروں سے بھی ایک بدتر طبقہ کو جنم دیتی ہے۔

اسی طرح ان کا تصور انسان، تصور تاریخ، نظریہ خیر و شر، تصور قانون و عدالت، نظریہ قومیت، بین الاقوامی تعلقات کے اصول نہ صرف ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ بلکہ متضاد ہیں۔ ان کی منزلیں بھی جدا ہیں، ان کے راستے بھی مختلف ہیں، ان کا مزاج بھی الگ الگ ہے، ان کا طریقہ کار بھی جدا جدا ہے اور یہ دونوں جس قسم کا معاشرہ اور معیشت قائم کرنا چاہتے ہیں وہ بھی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس کے بعد ان کے ایک ساتھ جمع ہونے اور ان کے اشتراک سے کسی مرکب کے تیار کئے جانے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟ اشتراکیت اور اسلام ایک دوسرے سے اتنے ہی مختلف ہیں جتنا اسلام اور الحاد اور لادینیت یا اسلام اور مغربی سرمایہ داری اور فسطائیت۔ ارباب اشتراکیت سے اسلام کے نام لیوا کو یہ بات حقائق اور دلائل کی روشنی میں صاف کہہ دینا چاہتے کہ

لا اعبد ما تعبدون ولا انتم
عابدون ما اعبد ولا انا عابد
ما عبدتم ولا انتم عابدون
ما اعبد لکم دینکم ولی دین۔

جس کی تم عبادت کرتے ہو میں اس کی عبادت نہیں کرتا اور جس کی میں عبادت کرتا ہوں تم اس کی عبادت نہیں کرتے، ہاں! ہاں! جس کی تم عبادت کرتے ہو میں اس کی عبادت نہیں کرتا اور جس کی میں عبادت کرتا ہوں اس کو تم نہیں پوجتے۔ تمہارا دین تمہارے لئے، میرا دین میرے لئے ہے۔

اس سلسلہ میں دو وضاحتوں کی مزید ضرورت ہے۔

ایک یہ کہ کچھ لوگ اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ اگر اشتراکیت میں خدا کے تصور کا اضافہ کر دیا جائے تو وہ اسلام کے مطابق ہو جائے گی۔ یہ ایک شر انگیز تصور ہے۔ اس لئے کہ اشتراکیت کے پورے نظام میں اسلام کے خدا کے لئے کوئی گنجائش نہیں اور اگر اسلام کے خدا کو مان لیا جائے تو پھر یہ ایک تصور انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لئے ایک مکمل نظام عطا کرتا ہے جو اشتراکیت کے نظام سے ہر قدم پر متصادم ہے۔ اس قسم کی پیوندکاری کی باتیں یا غلط فہمی، کم علمی اور ژولیدہ فکری کا نتیجہ ہیں یا شر انگیزی کا۔

دوسری بات یہ ہے کہ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسلام کے پورے نظام کو محفوظ رکھو صرف اس میں سوشلزم کے معاشی پروگرام کو شامل کرلو۔ یہ بات بھی اتنی ہی غلط ہے جتنی اول الذکر بات۔ اشتراکیت کی معاشیات اس کی مابعدالطبیعیات سے اور سماجیات سے الگ نہیں کی جاسکتی اور اگر انھیں الگ کردیا جائے تو کوئی مثبت معاشی پروگرام باقی نہیں رہتا ہے۔ کچھ اشتراکیت کے معاشی نظام میں جو روح کارفرما ہے اور جس ذہنی کیفیت اور جس مزاج کے ساتھ اس پر عمل ہو سکتا ہے وہ ایک مخصوص مزاج ہے۔ جو اسلام کے مزاج، اس کے بنیادی نقطۂ نظر، اس کے اندازِ کار، اس کے طریقِ اصلاح سے متضاد ہے۔۔

پھر اسلام نے اپنا ایک معاشی نظام دیا ہے وہ اس بارے میں خاموش نہیں ہے۔ اور یہ معاشی نظام اشتراکیت کے معاشی نظام سے بالکل مختلف اور اپنے مخصوص فلسفۂ حیات اور نظامِ تمدن سے مربوط ہے۔ اسلام کے نظامِ حیات میں کسی دوسرے متناقض نظام کے معاشی پروگرام کا جوڑ نہیں لگایا جاسکتا۔ ایسی صورت میں دونوں بگڑ جائیں گے اور حاصل کچھ بھی نہ ہوگا۔

اس لئے سوچنے کا صحیح انداز یہ نہیں ہے کہ سوشلزم اور اسلام کو کیسے جوڑا جائے اور ان کا کس طرح مرکب تیار کیا جائے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ زندگی کے مسائل کو ان دونوں نظاموں نے کس طرح حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اگر اشتراکیت کا طریقہ ہمارے لئے ناقابلِ قبول ہے تو اسلام کا طریقہ کیا ہے اور دوسرے نظاموں پر اسے کیا فوقیت حاصل ہے۔

(۹)

سوشلزم یا اسلام

اب تک ہم نے سوشلزم کا ایک علمی اور تنقیدی جائزہ لیا ہے اور اس سلسلہ میں جو بھی معیار ہو سکتے تھے ان سب کو سامنے رکھ کر اس نظامِ تہذیب کو جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ حقائق ہمیں اس نتیجہ پر پہنچاتے ہیں کہ

زمامِ کار اگر "مزدور" کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

اشتراکیت اپنے تجربہ میں ناکام رہی ہے۔ انسانیت کی بھلائی اس کی حقیقی منزل کی طرف نہیں کرسکی۔ اس نے انصاف اور ردِّ استحصال کا نعرہ لگایا تھا لیکن وہ خود ایک استحصالی قوت بن گئی جس نے ہر قدم پر انصاف کا خون کیا اور انسان کے دکھوں میں اضافہ ہی کیا۔ سوال یہ ہے کہ پھر انسان کے لئے مستقبل کا راستہ کونسا ہے؟ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر اشتراکیت کو قبول نہ کیا جائے تو پھر بجز سرمایہ داری کے کوئی راستہ نہیں۔ یہ کوتاہ نظری ہے۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت ایک ہی بنیادی تہذیب کے دو پہلو ہیں ان میں سے کوئی بھی ہمارے مسائل کا حل نہیں۔ دونوں کا مزاج مادہ پرستانہ ہے۔ دونوں انسان کو معاشی عوامل کا غلام بناتے ہیں۔ دونوں استحصال اور انتفاع (exploitation) کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ دونوں کی اخلاقی ضابطے کے پابند نہیں۔ دونوں میں سے کسی کے پاس عدل و انصاف کا کوئی مستقل معیار موجود نہیں ہے۔ دونوں نے استعماری رجحانات کا اظہار کیا ہے۔ ہمارے لئے ان میں سے کوئی بھی قابلِ قبول نہیں۔ ہم سرمایہ داری پر بھی اسی طرح

لعنت بھیج رہی ہیں جس طرح اشتراکیت پر۔ ۔ سیت سے ان دونوں کا تجربہ کرلیا ہے اور وہ دونوں سے مایوس ہو چکی ہے۔ اب اسے ایک تیسرے نظام کی ضرورت ہے جو اس کے تمام مسائل کو (محض چند پہلوؤں کو نہیں) حل کر سکے اور اسے عزت و شرف کا وہ مقام دے سکے جس کا وہ اہل ہے، تاکہ وہ اپنے دیس میں بدیسی اور اپنے گھر میں اجنبی نہ رہے۔ ہماری نگاہ میں یہ راستہ صرف اسلام ہے اور ماضی میں انسان ایک بار نہیں متعدد بار اس کا تجربہ کرکے دیکھ بھی چکا ہے۔ یہ وہ نظام ہے جس نے ہر دور میں انسان کے مسائل کو حل کیا ہے۔ یہ وہ پارس ہے کہ جس نے بھی اس کو چھو لیا ہے وہ سونا بن گیا ہے۔

۱ - اسلام پوری زندگی کا ایک نظام ہے اور انسان کے لئے مکمل ہدایت فراہم کرتا ہے۔ دوسرے تمام نظاموں اور نظریوں میں یہ خامی ہے کہ وہ زندگی کے کسی ایک پہلو سے متعلق ہیں یا اگر سب پہلوؤں کو لیتے بھی ہیں تو کسی ایک محدود زاویہ سے لیتے ہیں۔ پھر ان میں اندرونی وحدت اور یکسانی بھی نہیں پائی جاتی۔ اس لئے کہ وہ اپنے مختلف اجزا مختلف بلکہ متناقض مآخذ سے حاصل کرتے ہیں۔ مثلاً مغربی تہذیب نے اپنا فلسفہ یونان سے، ادب اصنامیات سے، قانون روما سے، سائنس مسلمانوں سے، معاشی جذبہ یہودیوں سے، مذہب عیسائیت سے اخذ کیا۔ خود اشتراکیت جن مآخذ سے نکلی ہے وہ متضاد اور متناقض ہیں، لیکن اسلام کی بات سب سے مختلف ہے۔ اس کا سرچشمہ ایک ہے۔ الہامی ہدایت۔ یہ رہنمائی پوری زندگی سے متعلق ہے اور اسے ایک ناقابل تقسیم اکائی تصور کرتی ہے۔ یہ زندگی کے سارے پہلوؤں کو ایک سررشتہ سے جوڑتی اور اس میں ایک روح جاری و ساری کرتی ہے۔ اس نظام میں جامعیت بھی بھی ہے اور کمال بھی، وسعت بھی ہے اور وحدت بھی۔

۲ - یہ نظام زندگی کائنات کے بنیادی حقائق سے ہم آہنگ ہے۔ یہ فطرت سے بغاوت کا نہیں، اس سے مطابقت کا مدعی ہے۔ اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت توحید ہے۔ یہ تصور کہ اس کائنات کا کوئی خالق، مالک اور آقا ہے اور وہ ایک اور صرف ایک ہے۔ باقی جو کچھ ہے اس کی مخلوق ہے، یہ بات کہ اس کائنات کی ایک عمر متعین ہے اور ایک دن اس نظام کو درہم برہم ہوتا ہے اور اس کی جگہ ایک نئے نظام کو رونما ہونا ہے۔ یہ بات کہ انسان میں فسق و فجور اور بر و تقویٰ دونوں کے داعیات پائے جاتے ہیں لیکن اس کی اصل فطرت نیک اور اچھی ہے اور خیر کی طالب ہے، یہ حقیقت کہ انسان کی ہدایت کے لئے متعدد انتظامات موجود ہیں۔ اس کی عقل، اس کا ضمیر، اس کا وجدان، اس کا تجربہ، اور پھر سب سے بڑھ کر وحی الٰہی، یہ بات کہ فطرت انسانی کو کچل کر، اس کے داعیات کا انکار کرکے اس کے تقاضوں اور مطالبات کو یکسر نظر انداز کرکے کوئی صحت مند زندگی رونما نہیں ہو سکتی، نیز یہ کہ جس طرح یہ افراط غلط ہے اسی طرح صرف لذت پرستی میں کھو جانے کی تفریط بھی غلط ہے، یہ امر کہ اس کائنات میں خدا کا قانون کارفرما ہے اور انسان اس سے مطابقت اس وقت اختیار کر سکتا ہے جب وہ بھی خدا کے قانون کا پابند ہو جائے ——— یہ اور ایسے ہی بنیادی حقائق زندگی میں فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں۔ دنیا کے دوسرے نظام اس لئے ناکام ہیں کہ وہ ان حقائق سے متصادم ہوئے ہیں۔ ان سے ہٹ کر، ان کو نظر انداز کرکے یا بگاڑ کے اپنا راستہ نکالنا چاہتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دو قدم چلتے ہیں اور ٹھوکر کھا کر گر پڑتے ہیں۔ اسلام نے ان حقائق کو تسلیم کیا ہے اور وہ نظام تمدن قائم کیا

ہے جو ان سے ہم آہنگ ہے۔ جس میں انسان وہ چاہتا ہے جس کا تقاضا فطرت کرتی ہے اور ان حدود کا پابند ہوتا ہے جو فطرت کو مسخ ہونے سے بچا لیتی ہیں۔

۳۔ اس نظام میں انسان اصل مرکز و محور ہے۔ اسے زمین پر خدا کا نائب اور خلیفہ قرار دیا گیا ہے۔ اسے ارادہ اور اختیار کی قوت اور فیصلہ کی آزادی دی گئی ہے۔ نہ وہ ایسا مجبور ہے جیسا جبریت پرست فلسفوں اور مذاہب نے اسے قرار دیا تھا اور نہ ایسا مادر پدر آزاد ہے جیسا لادینیت اور مادیت نے اسے سمجھایا۔ اسے آزادی دی گئی ہے۔ حق و باطل میں تمیز کا مادہ دیا گیا ہے۔ اپنے اعمال کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے اور اس کے لئے صحیح راستہ یہ مقرر کیا گیا ہے کہ وہ اپنی آزاد مرضی سے اپنے رب کے بتائے ہوئے طریقہ کا پابند ہو جائے اور دنیوی فلاح اور اخروی نجات حاصل کرے۔ یعنی کیفیت یہ ہے کہ

تم نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے

اس تصور کی رو سے ہر فرد اپنا جداگانہ وجود اور تشخص رکھتا ہے۔ اس کی شخصیت کا تحفظ اور اس کا صحیح نشو و ارتقا یہاں کا نہایت اہم مسئلہ ہے۔ ہر وہ نظام جو فرد کی نفی کرے اسلام کے تصور سے متصادم ہے[۲۲۵] اسلام معاشرہ اور اجتماع کی اصلاح چاہتا ہے اور پورے نظام کو اپنی بنیادوں پر استوار کرنا چاہتا ہے۔ لیکن فرد کو اجتماع کی بھینٹ نہیں چڑھاتا بلکہ فرد اور اجتماع دونوں کو مرضی رب کا پابند بناتا ہے اور دونوں ایک دوسرے کے لئے ممد و معاون ہوتے ہیں۔ یہ اسلام کا بنیادی مزاج ہے اور اس کے تصور خلافت کا لازمی تقاضا ہے۔

پھر اس تصور کی رو سے انسان کے بنیادی حقوق خدا کے عطا کردہ ہیں، محض کسی دنیوی قانون یا حکمرانوں کے خلاف سیاسی جدوجہد کے نتیجہ میں حاصل کئے ہوئے نہیں ہیں جن میں حسب موقع تراش خراش اور قطع و برید ہو سکتی ہو۔ بلاشبہ فرد کو عمومی مفاد کو قربان کرنے کا حق نہیں ہے، لیکن فرد کے اساسی حقوق کو بھی معاشرہ پامال نہیں کر سکتا[۲۲۶] اور یہ بھی اسی تصور کا تقاضا ہے کہ اس میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (نیکی کا حکم دینے اور بدی سے روکنے) کی آزادی اور اختیار لوگوں کو حاصل ہے۔ منصب خلافت اس کے بغیر نا مکمل اور تشنہ ہے۔

---

[۲۲۵] اس سلسلہ میں اسلام کا مزاج اتنا نازک ہے کہ ایسی نقالی تک جو فرد کی شخصیت کو مجروح کردے اس کی نگاہ میں ناجائز ہے۔ اسی لئے ایکٹنگ کو ایک پیشہ کی حیثیت سے اسلام نے ناپسند کیا ہے۔ مردوں کے عورتوں جیسے کپڑے پہننے اور عورتوں کو مردوں جیسے کپڑے پہننے سے منع کیا۔

[۲۲۶] اس موضوع پر اس پہلو سے بہت کم غور ہوا ہے لیکن فقہاء نے جو تقسیم فرض کفایہ اور فرض عین کی کی ہے اس کا فلسفیانہ سطح پر خود حقوق انسانی اور فرد اور اجتماع کے تعلق سے بڑا گہرا ربط ہے۔ فرض عین فرد کی مستقل شخصیت کا اعتراف ہے، اس ذمہ داری کو کوئی دوسرا ادا نہیں کر سکتا۔ جب کہ فرض کفایہ میں فرد اور اجتماع کے تعلق کو ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ ذمہ داری پورے معاشرہ پر ہے، اور اگر اسے چند افراد بھی ادا کردیں تو سب کی طرف سے ادا ہو جاتی ہے اور اگر کوئی بھی ادا نہ کرے تو سب ذمہ دار اور گنہگار رہتے ہیں۔ یہ حسین ربط و تعلق ایک متوازن معاشرہ قائم کرتا ہے۔

پھر اس کے نتیجہ میں انسان کی حیثیت خدا کے بندہ ہونے کی کائنات کی باقی تمام چیزوں کے آقا اور سردار کی قرار پاتی ہے پہاڑ اس سے کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں، بجلی کی قوت کے سامنے وہ بظاہر کیسا ہی مجبور کیوں نہ نظر آئے، پانی کی قوتوں کے سامنے وہ کیسا ہی کمزور محسوس ہو، لیکن ان سب کو اس کی خدمت کے لئے مسخر کیا گیا ہے اور انسانی معاشرہ میں جو بھی ادارہ یا ہیئت تشکیل دی جائے گی، اس کی حیثیت انسان کے خادم کی ہوگی، اس کے آقا کی نہیں۔ یہی وہ چیز ہے جس سے ایک حقیقی انسانی سماج رونما ہوتا ہے اور خود معیشت بھی ایک خالص انسانی معیشت بنتی ہے۔

۴۔ یہ نظام زندگی کے تمام امور کو اخلاقی نقطہ نظر سے دیکھتا اور طے کرتا ہے۔ اس کا اخلاق کا تصور یہ نہیں ہے کہ بس چند معاملات میں کچھ رسمی قسم کی اخلاقیات کو اختیار کر لیا جائے اور زندگی کے باقی تمام معاملات کو محض مفاد اور حرص و ہوس کی بنیاد پر طے کیا جائے۔ وہ ساری زندگی کو۔ خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، خانگی ہو یا تمدنی، سیاسی ہو یا معاشی، روحانی ہو یا مادی۔ اخلاق کا پابند کرتا ہے۔ زندگی کے ہر میدان میں خیر و شر اور حق و باطل میں تصادم کا اعتراف کرتا ہے اور شر کے ترک اور خیر کے اختیار کی تعلیم دیتا ہے۔ اس کی نگاہ میں انسان کی شان امتیاز ہی یہ ہے کہ وہ حرام و حلال میں تمیز کر سکتا ہے اور اس کے لئے صحیح رویہ یہی ہے کہ ہر معاملہ میں یہ دیکھے کہ وہ حلال ہے یا حرام، باعث خیر ہے یا موجب شر، مبنی بر حق ہے یا نتیجہ باطل۔ جب پوری زندگی میں اور خصوصیت سے اجتماعی زندگی میں یہ رویہ اختیار کیا جاتا ہے تو ایک ایسا معاشرہ بنتا ہے جو فساد سے پاک ہو، جس میں ظلم کا نام و نشان نہ پایا جاتا ہو، جس میں انسان سے خطا اور غلطی تو سرزد ہو سکتی ہو لیکن افراد کی کیفیت یہ ہو کہ

ایک بار خطا ہو جاتی ہے، سو بار ندامت ہوتی ہے

اس طرح اس نظام میں صرف صحیح مقاصد ہی نہیں، صحیح ذرائع کے استعمال پر بھی اصرار کیا جاتا ہے اس طرح اسلام نے معاشرے میں بدی کے پھلنے پھولنے کے ایک بہت بڑے راستے کو بند کر دیا ہے

۵۔ اس نظام میں انفرادیت اور اجتماعیت کے درمیان ایک حسین توازن قائم کیا گیا ہے۔ نہ اس نے وہ غلطی کی ہے جس کے مرتکب دوسرے اخلاقی فلسفے، صوفیانہ مسلک اور مذاہب ہوئے تھے کہ صرف فرد کی اصلاح اور اس کی نجات کو اپنا مقصد و منتہی بنائے اور اجتماع کو بالکل نظر انداز کر دے۔ اور نہ اس نے وہ حماقت کی ہے جس میں مغرب کے جدید فلسفے اور نظریے مبتلا رہے ہیں کہ محض ماحول اور اجتماع کو بدل دینے سے انسان بدل جائے گا۔ یہ اصلاح کا آغاز فرد کے دل سے کرتا ہے، اس کی زندگی کو تبدیل کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اجتماعی نظام کو اپنی اسکیم کے مطابق بدلتا ہے تاکہ دونوں ایک ہی مقصد کے لئے کام کریں، ایک ہی جذبہ اور روح دونوں میں جاری و ساری ہو، ایک ہی منزل کی طرف دونوں سرگرم عمل ہوں اور اس جد و جہد میں ایک دوسرے کو تقویت پہنچائیں۔ اسلام میں کمال بھی ہے اور توازن بھی۔ نہ وہ انسان کو شر محض سمجھتا ہے کہ اس سے مایوس ہو جائے اور نہ مجسم خیر کہ اس پر کوئی پابندی ہی عائد نہ کرے۔ وہ دونوں کی اصلاح کرتا ہے اور اس طرح فرد اور معاشرہ دونوں میں ایک اصلاحی انقلاب برپا کر دیتا ہے۔

۔ اسلام کی نگاہ میں زندگی کا بنیادی قانون یہ ہے کہ انسان تقویٰ اور جہاد کی روش اختیار کرے۔ تقویٰ یہ ہے کہ انسان اپنی پوری زندگی کو گناہوں اور آلائشوں سے بچاتے ہوئے مالک کی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی جد و جہد کرتا رہے اور جہاد یہ ہے کہ دینِ حق کو خدا کی اس زمین پر قائم کرنے کی جد و جہد میں مصروف ہو جائے۔ اصول تقویٰ فرد کی زندگی کو سنوارتا ہے اور اصول جہاد تہذیب اور تاریخ کو صحیح سمت عطا کرتا ہے۔ اصول تقویٰ سے انسان کی زندگی میں انضباط رونما ہوتا ہے اور اصول جہاد سے نظام اجتماعی تعمیری اور تخلیقی خدمات انجام دیتا ہے۔ اصول تقویٰ کی بنا پر صرف جسم اور روح اور مادّہ اور اخلاق کی قوتیں ہی جمع نہیں ہوتیں بلکہ انسان اس پوری کائنات سے اور اس کے خالق سے اس طرح جڑ جاتا ہے کہ ان کے درمیان کوئی تصادم اور کشمکش باقی نہیں رہتی، ایسے معاشرہ اور ایسی ہیئت میں کبھی مغائرت (alienation) کا مسئلہ پیدا نہیں ہو سکتا اور اصول جہاد حق پرست گروہ کو باقی تمام انسانیت سے ایک مشن کے رشتہ سے جوڑ دیتا ہے اور پوری انسانی برادری کو دائرہ حق میں شامل کرنے کی جد و جہد میں مصروف ہو جاتا ہے۔ یہ دو اصول ہیں جن کے نتیجہ میں مادّی صحت بھی قائم ہوتی ہے اور روحانی اور اخلاقی صحت بھی خوب تر ہوتی جاتی ہے۔ نیز تہذیب و تمدن میں صحت مندی کے راستے پر گامزن ہو جاتے ہیں۔ و تاریخ بھی اپنی حقیقی منزل کی طرف رواں دواں ہو جاتی ہے۔ یہ دونوں اصول انضمام (principle of integration) بھی ہیں اور اصول اصلاح و ارتقاء بھی۔

۷ ۔ یہ نظام پوری انسانیت کو ایک برادری قرار دیتا ہے۔ یہ رنگ، نسل، جغرافیائی حدود، اور زبان وغیرہ کے تمام جدید اور قدیم بتوں کو توڑ دیتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ نہ گورے کو کالے پر فضیلت حاصل ہے اور نہ کالے کو گورے پر، نہ عرب عجم پر افضل ہے اور نہ عجم عرب پر۔ فضیلت اگر ہے تو صرف تقویٰ کی بنا پر۔ تمام انسان بحیثیت انسان برابر ہیں اس لئے کہ ایک ماں باپ وہ آدم و حوّا کی اولاد ہیں، ایک خالق کے پیدا کردہ ہیں، ایک قانون کے پابند ہیں، اور ایک معیار کے مطابق جانچے جائیں گے، اس کا دروازہ تمام انسانوں کے لئے کھلا ہوا ہے۔ اس طرح صرف ایک انسانی تہذیب ہی قائم نہیں کرتا، بلکہ صرف یہی وہ نظام ہے جو ایک عالمگیر تہذیب بھی قائم کرتا ہے۔

۸ ۔ یہ نظام صرف اکرامِ آدم ہی کا قائل نہیں بلکہ اس کا مزاج سراسر تعمیری، اصلاحی اور تعلیمی ہے۔ یہ جبر و تشدد کے ذریعہ کوئی تبدیلی نہیں لانا چاہتا اور ان راستوں سے لائی ہوئی تبدیلیوں کو غیر فطری قرار دیتا ہے۔ بلاشبہ حق کے لئے تلوار اٹھانا جائز ہی نہیں واجب بھی ہے، لیکن اس نظام کا مزاج منتقمانہ نہیں ہے، یہ نفرت نہیں محبت اور اخوت کی بنیاد پر زندگی کو تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ ظلم اور طاغوتی استحصالی کو مٹانے کے لئے اسے تلوار بھی اٹھانی پڑتی ہے، لیکن وہ صرف مظلوم کی مدد کے لئے اور باطل کی سرکشی کو ختم کرنے کے لئے ہیں، انسانوں پر کوئی عقیدہ یا مسلک ٹھونسنے کے لئے نہیں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں"۔ اسلام کے انقلاب کا پورا مزاج تعلیمی اور تبلیغی اور اصلاحی ہے۔ وہ صرف گردنوں کو جھکانے نہیں، دلوں کو بدلنے آیا ہے۔ اور جب دل میں ایک دنیا وہ تعمیر کر دیتا ہے تو سر بھی برضا و رغبت حق کے آگے جھک جاتے ہیں۔

۹ ۔ اس نظام میں ایک طرف زندگی کے ابدی اصول اور مستقل اقدار بیان کی گئی ہیں تو دوسری طرف زمانہ کے تغیرات اور [illegible]

کے حالات و ضروریات کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس کی تعلیمات کسی انسان کے ذہن کی پیداوار نہیں ہیں کہ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ باسی اور ناکارہ ہو جائیں۔ ان پر زمان و مکان کی تبدیلی کا کوئی اثر نہیں پڑتا اس لئے کہ یہ اس کی بتائی ہوئی ہیں جو خود زمان و مکان کا بھی خالق ہے اور زمانہ کی جان جس کے ہاتھوں میں ہے۔ پھر اس میں مناسب حدود کے اندر تبدیلی اور ارتقاء کی پوری گنجائش موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ہر زمانہ کے چیلنج کا جواب دیتا رہا ہے اور جب بھی جو ضرورت رونما ہوتی ہے، اس کی تکمیل کا سامان اس میں موجود ہوتا ہے۔ ہمارے قدم جتنے آگے بڑھتے جاتے ہیں، اس کی صداقتیں اتنی ہی نمایاں اور روشن ہو کر ہمارے سامنے آتی جاتی ہیں، اور ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اس کی تعلیمات تو آنے والی صبح سے بھی زیادہ تر و تازہ ہیں۔

۱۰ ۔ اس نظام نے معاشی زندگی کی تشکیل و تعمیر کے لئے بھی ضروری ہدایات دی ہیں۔ یہ نہ معاشیات کو باقی زندگی سے کاٹتا ہے اور نہ اس کا رشتہ اخلاق سے منقطع کرتا ہے۔ یہ پورے معاشی مسئلہ کو اخلاقی حقائق اور اقدار کی روشنی میں حل کرتا ہے۔ معاشی جدوجہد کو حلال و حرام کا پابند بناتا ہے اور ظلم و طغیانی سے اسے پاک کرتا ہے۔ اس کی نگاہ میں معاش کے مسئلہ میں بھی مرکزی اہمیت جس چیز کی ہے وہ عدل ہے۔ عدل کا تقاضا ہے کہ فرد کی معاشی ضرورتیں پوری ہوں اور عدل ہی کا مطالبہ ہے کہ معیشت بحیثیت مجموعی ترقی بھی کرے اور اس ترقی کے پھل تمام انسانوں تک پہنچیں۔ ان کے تعلقات انصاف پر مبنی ہوں اور ظلم کا اس کی ہر شکل میں استیصال کر دیا جائے۔ وہ انفرادی ملکیت کی آزادی دیتا ہے، لیکن مالکانہ اختیارات کے استعمال کو کچھ متعین اصولوں کا پابند کرتا ہے۔ اس کی نگاہ میں ملک ایک امانت ہے جسے خدا، خلق، اپنی ذات اور خاندان کی بہتری کے لئے خدا کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق استعمال کیا جائے گا، من مانی کرنے کا حق کسی کو نہ ہوگا۔ وہ ہر فرد کو ذاتی نفع کے حصول کی اجازت دیتا ہے، لیکن ان تمام راستوں کو بند کر دیتا ہے جن میں نفع دوسروں کو نقصان پہنچا کر، یا ان کے استحصال کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ وہ اپنے مال کو خرچ کرنے کی آزادی دیتا ہے، لیکن صرف کے بھی ان تمام راستوں کو بند کر دیتا ہے۔ جو فرد یا معاشرہ کے لئے نقصان دہ ہیں وہ ہر شخص کو معاشی جدوجہد کی آزادی دیتا ہے۔ لیکن یہ ذمہ داری معاشرہ اور ریاست پر ڈالتا ہے کہ ہر شخص کو مناسب مواقع حاصل رہیں اور غیر فطری عدم مساوات کی کوئی ایسی صورت رونما نہ ہونے پائے جس سے کچھ لوگوں کے لئے ترقی کی راہیں مسدود ہو جائیں۔ بلاشبہ آمدنی کا انحصار محنت پر ہے۔ لیکن جو لوگ معاشی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں، یا جو کسی وجہ سے زمین سے اپنا حصہ حاصل نہ کر سکیں۔ ان کی ضروریات کو عزت و وقار کے ساتھ پورا کرنا معاشرہ اور ریاست کی ذمہ داری ہے۔ اسلام کسی فرد کو بھوکا، ننگا، بے گھر، بلا دوا یا بے تعلیم نہیں چھوڑنا چاہتا۔ وہ ان تمام ضرورتوں کی تکمیل کی ضمانت دیتا ہے اور پورے معاشرہ کو ان کے لئے ذمہ دار ٹھیراتا ہے۔ یہ معاشی زندگی کے ہر شعبوں میں توازن، عدل و انصاف، رفق و ہم آہنگی قائم کرنا چاہتا ہے اور تصادم کی جگہ تعاون اور منفی مسابقت کی جگہ مثبت اور تعمیری مسابقت کا نظام قائم کرتا ہے۔ یہ ایک ایسی معیشت ہے جو سرمایہ دارانہ معاشی نظام اور اشتراکی معاشی نظام دونوں کی ضد ہے اور جو پورے معاشی مسئلہ کو اپنی بنیادوں پر، اپنے طریقے سے، اپنے مزاج کے مطابق تیار کئے ہوئے

انسانوں کے ذریعہ حل کرتی ہے۔ اس میں نہ سرمایہ داری کے لئے کوئی گنجائش ہے اور نہ اشتراکیت کے لئے۔ یہ دونوں سے بدرجہا اعلیٰ اور افضل ہے۔

پھر اس میں یہ صلاحیت بھی ہے کہ صرف عام حالات ہی میں نہیں، نہایت بگڑے ہوئے حالات میں بھی اپنے اصلاحی انقلاب کا آغاز کرے اور ایک خاص تدریج سے حالات کو معمول پر لے آئے۔[۳۲۲]

۱۱۔ یہ نظام سرمایہ دارانہ معیشت سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ اس اختلاف کے چند پہلو یہ ہیں۔

(الف) یہ ایک مکمل نظام تہذیب ہے، محض ایک معاشی نظام نہیں۔ جب کہ سرمایہ داری محض ایک معاشی نظام ہے۔

(ب) یہ اخلاقی نقطۂ نظر سے پوری زندگی بشمول معیشت کو سنوارتا ہے سرمایہ داری کا نقطۂ نظر مادہ پرستانہ اور خالص منفعت پرستانہ ہے۔

(ج) اس کا مقصد عدل کا قیام ہے، جب کہ سرمایہ داری کا مقصد" ذاتی نفع کی تکثیر" ہے۔

(د) اس کا تصور ملکیت سرمایہ داری کے تصور سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔

(ھ) یہ منڈی کا نظام تو ضرور قائم کرتا ہے۔ لیکن اسے اخلاقی اصولوں، اور اجتماعی مصلحتوں کا پابند بناتا ہے۔

(و) سرمایہ داری میں اصل اہمیت سرمایہ کی ہے، جب کہ اسلامی نظام معیشت میں مرکزی اہمیت انسان اور انسانی محنت اور اختراع کو حاصل ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ ذہن کو مٹانے کے لئے سود کا، جو سرمایہ داری کا بنیادی ستون ہے، کلی خاتمہ کر دیتا ہے۔

(ز) تقسیم دولت میں اس کا اصول زیادہ سے زیادہ گردش اور پورے معاشرہ میں دولت کی گردش ہے جب کہ سرمایہ دارانہ نظام ارتکاز اور اس سے رونما ہونے والی سرمایہ کاری پر مبنی ہے۔

(ح) سرمایہ اور محنت اور انتظامیہ اور محنت کے باہم تعلق کے بارے میں بھی دونوں کا نظریہ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے۔

(ط) سرمایہ داری اجتماعی کفالت [illegible] کی کوئی ذمہ داری نہیں لیتی جب کہ اسلام کے نظام کی یہ ایک بنیادی خصوصیت ہے۔

---

[۳۲۲] ملاحظہ ہو: اس اشاعت خاص کا آخری حصہ: تیسرا راستہ۔ برادر محترم جناب نعیم صدیقی صاحب کا مضمون "اسلام کا میزانی نظریہ معیشت" اسلام کے بنیادی اصولوں کے مطالعہ کے لئے دیکھئے: نجات اللہ صدیقی صاحب کا مضمون " اسلامی ریاست کی معاشی ذمہ داریاں" مزید مطالعہ کے لئے دیکھئے۔ اسلام کا اقتصادی نظام از حفظ الرحمٰن سیوہاروی۔ "اسلام کے معاشی نظریے" از یوسف الدین احمد" اسلامی معاشیات از مولانا مناظر احسن گیلانی۔ سود اور اسلام اور جدید معاشی نظریات از مولانا مودودی۔ معاشی ناہمواریوں کا اسلامی حل اور اسلام کا فلسفہ ملکیت از نعیم صدیقی "اسلام اور سود" از ڈاکٹر انور اقبال قریشی "اسلام کا نظام محاصل (ترجمہ کتاب الخراج) از امام ابو یوسف، ترجمہ نجات اللہ صدیقی معاشیات اسلام (انگریزی) از محمود احمد

(م) جائز اور مناسب اجرت جس میں کفالت کے تقاضے بھی پورے ہوں اسلام کا ایک بنیادی اصول ہے۔ سرمایہ داری کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ صرف رسد اور طلب (نظری طور پر) کے توازن کی قائل ہے، خواہ اس کے نتیجے میں منصفانہ اجرت رونما ہو یا نہ ہو۔

(ن) اسلام پیداوار، صرف تجارت اور نظام کے بارے میں مناسب حد بندی کا قائل ہے جب کہ سرمایہ داری اس تصور سے خالی ہے۔

غرض جس پہلو سے بھی غور کیا جائے ان دونوں میں بعد المشرقین ہے۔ اسلام جس طرح اشتراکیت کی ضد ہے (اور یہ ہم پہلے دکھا چکے ہیں) اسی طرح سرمایہ داری کی بھی ضد ہے یہ کسی کی بھی خوشہ چینی نہیں کرنا چاہتا۔ اس کا اپنا مخصوص نظام ہے اور یہ اسی کو قائم کرنا چاہتا ہے۔

۱۲ - اب صرف ایک سوال اور باقی رہتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگرچہ اسلام اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں کی ضد ہے۔ لیکن چونکہ وہ ایک نظریاتی ریاست قائم کرتا ہے اور معیشت پر ریاست کی نگرانی اور گرفت قائم کرتا ہے اور چونکہ اسلام کا نظام زندگی کے سارے شعبوں پر محیط ہے تو کیا اسلامی نظام میں بھی ایسی ہی کلیت پسند (totalitarianism) رونما نہیں ہوگی جو اشتراکیت میں ہے۔

(i) ہماری نگاہ میں ایسا نہیں ہوگا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اشتراکیت میں صرف کلیت پسندی ہی نہیں، من مانی اور استبدادی کلیت پسندی (arbitrary and depotic totalitarianism) ہے۔

اسلامی نظام بلاشبہ پوری زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔ لیکن نہ اس میں من مانی کرنے کی گنجائش ہے اور نہ وہ استبدادی ہے وہ فرد اور حکومت دونوں کو خدا کی دی ہوئی شریعت کا پابند بناتا ہے اور ایک ایسا نظام قائم کرتا ہے جس میں سب کے حقوق محفوظ ہوں اور تمام افراد اور ادارے خالق کے بتائے ہوئے طریقے کے مطیع ہو جائیں۔ یہ ذہن کبھی استبدادی نہیں ہو سکتا۔ اس میں آمریت کے لئے کبھی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ اس میں حقوق کی پامالی کا کوئی سوال نہیں پیدا ہو سکتا۔ یہ دراصل ایک پابند دستور و قانون نظام ہوگا اور ایک ہی قانون حکمرانوں اور عام انسانوں پر لاگو ہوگا۔ تاریخ اس امر کا بین ثبوت ہے کہ اسلام نے حقیقی آزادی اور سیاسی اور معاشرتی مساوات اور جمہوریت کے تصورات سے انسانیت کو روشناس کرایا اور ان اصولوں کو عملاً برت کر اور نافذ کرکے دکھایا۔

(ii) اسلام فرد کی شخصیت کا اثبات ہی نہیں کرتا، فرد کو معاشرہ میں ایک بنیادی اور مرکزی مقام دیتا ہے اور کسی ایسی چیز کو جائز نہیں سمجھتا جو اس کی شخصیت کو فنا کر دے۔ وہ بلاشبہ اجتماعی احساس پیدا کرتا ہے اور اپنے نظام زندگی کی حفاظت کی خاطر فرد کو اپنی جان تک قربان کرنے پر اکساتا ہے لیکن حکومت کو قانون شریعت سے ہٹ کر اور حق قانونی کے بغیر کسی فرد پر کسی قسم کا کوئی تصرف کرنے کا اختیار نہیں دیتا۔ یہ انبیائے کرام کا خاص طریق کار ہے اور اس کی بنا پر اسلام کی نظریاتی ریاست کبھی استبدادی کلیت پسندی کا شکار نہیں ہو سکتی۔

(iii) پھر اسلام نے انسان کے حقوق کو خدا کے حق کا درجہ دیا ہے۔ اس نے سیاسی، معاشرتی، معاشی اور انفرادی

حقوق کا تصور اس وقت پیش کیا جب دنیا ان الفاظ سے بھی ناآشنا تھی۔ اس نے معاشرہ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی روح پیدا کی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اسلامی معاشرہ میں ہمیشہ افراد کو اختلاف کا موقع حاصل رہنا چاہیے تاکہ وہ برائیوں کو پھیلنے سے روکیں اور نیکیوں کا حکم دیں۔ یہ چیز آزادی کی بہترین ضمانت ہے اور اس حق شرعی سے کوئی کسی کو محروم نہیں کر سکتا۔

(۱۷) اسلام میں حکومت عوام کے سامنے جواب دہ ہے۔ معاشرہ میں کوئی ایک گروہ بھی ایسا نہیں ہوتا جس کی اجارہ داری قائم ہو جائے اور باقی تمام گروہ ختم کر دیئے جائیں۔ مختلف گروہوں کا وجود آمریت کے خلاف بہترین ضمانت ہے۔

(۷) معیشت میں اسلام کلی قومی ملکیت کے خلاف ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حقیقی ضرورت کی مناسبت سے کسی خاص صنعت یا معاشی دائرہ کو قومی ملکیت میں لیا جا سکتا ہے۔ لیکن معیشت کا عمومی نظام انفرادی ملکیت اور انفرادی آزادی پر مبنی ہوگا۔ روزگار کے تمام مواقع کو حکومت کے ہاتھوں میں دے کر اشتراکیت نے ایک نظام ظلم کو جنم دیا اور اس سے ایک ایسی کلیت پسندی رونما ہوئی جس نے انسانیت کو پیس ڈالا۔ اسلام میں اس کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ان آمریت دوسری وجوہ کی بنا پر ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اعتراض بالکل بے معنی ہے اور اسلامی نظام ان خطرات سے دوچار نہیں ہوگا جو اشتراکیت کو لے ڈوبے۔

ہم نے ان صفحات میں اشتراکیت کا ایک بے لاگ جائزہ پیش کیا ہے۔ ہم نے پروپیگنڈے کی سطح سے بلند ہو کر خالص علمی انداز میں حقائق کا مطالعہ کیا ہے، حالات کا جائزہ لیا ہے اور اپنے حاصل غور و فکر کو ملک و ملت کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ ہم نے جن ماخذ سے اپنی معلومات کو اخذ کیا ہے وہ یا تو روسی ماخذ ہیں، یا روس کے باہر کے چوٹی کے اشتراکی اہل قلم ہیں اور یا بلند پایہ مغربی محققین۔ ہم نے ہر بات کو دلیل کے ساتھ پیش کیا ہے اور ہم اپنے ملک کے سوچنے سمجھنے والے عناصر کو دعوت دیتے ہیں کہ ان حقائق پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور پھر سوچ سمجھ کر یہ طے کریں کہ انھیں کونسا راستہ اختیار کرنا ہے۔ سوشلزم کا راستہ یا اسلام کا راستہ۔ اب سوشلزم ایک معمہ نہیں ہے۔ محض ایک انقلابی نعرہ بھی نہیں ہے، یہ ایک نامعلوم دنیا کا خواب بھی نہیں ہے۔ اس تحریک کو کام کرتے ہوئے سوا سو سال ہو گئے ہیں اور ایسے عمل کے میدان میں اترے ہوئے پچاس سال بیت گئے ہیں۔ اب اس کے نظام کو بچشم سر دیکھا جا سکتا ہے، محض شاعروں کے کلام میں اسے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر سطحی جذباتیت سے بلند ہو کر حقائق کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو تمام صورت حال سامنے آجاتی ہے اور دو الفاظ میں وہ یہ ہے کہ ہماری منزل آزمائش میں ناکام ہونے والی اشتراکیت نہیں، ہر آزمائش میں کامیاب ہونے والا اسلام ہے اور انشاء اللہ بالآخر غلبہ اسی دین حق کو حاصل ہونا ہے۔ جھوٹے خداؤں کا طلسم کچھ عرصہ تو چل جاتا ہے لیکن ہمیشہ نہیں چل سکتا اور پھر جب عصائے موسیٰ بھی میدان میں ہو تو نظر فریب طلسم کب ٹھیر سکتے ہیں۔ آج اسلام ایک اجتماعی قوت کی حیثیت سے میدان کارزار میں قدم رکھ چکا ہے۔ کشمکش اور پیکار بلاشبہ سخت اور صبر آزما ہوگی لیکن کامیابی انشاء اللہ دین قیم ہی کو حاصل ہوگی۔ یہی فطرت کا قانون ہے، یہی عقل کا مطالبہ ہے اور یہی خدا کا وعدہ ہے۔

جاء الحق وزهق الباطل، ان الباطل كان زهوقا۔

حق آگیا اور باطل میدان چھوڑ بھاگا۔ بے شک باطل ہے ہی رفو چکر ہونے والا۔

۲

اشتراکیت کا علمی جائزہ

★

بلا شبہ ایک فاقہ کش آدمی بسا اوقات بھوک کی شدت سے اتنا مغلوب ہو جاتا ہے کہ وہ جیل کی زندگی کو اپنی مصیبت بھری آزادی پر ترجیح دینے لگتا ہے۔ صرف اس لئے کہ وہاں کم از کم دو وقت کی روٹی، تن ڈھانکنے کو کپڑا اور سر چھپانے کو جگہ نصیب ہوگی۔ مگر کیا اب پوری نوع انسانی کیلئے فی الواقع یہ مسئلہ پیدا ہو گیا ہے کہ اسے روٹی اور آزادی دونوں ایک ساتھ نہیں مل سکتیں؟ کیا روٹی ملنے کی اب یہی صورت باقی رہ گئی ہے کہ ساری روئے زمین ایک جیل خانہ ہو اور چند کارندے اس کے جیلر اور وارڈر ہوں؟

ابوالاعلیٰ مودودی

روسی انقلاب اپنے مقصد میں ناکام رہا ہے۔ اس کا دعویٰ تھا کہ ایک نئی اخلاقی فضا میں ایک نیا سماج پیدا کریگا۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکا اور اس ناکامی کی اصل وجہ اس کا انیسویں صدی والا بے جان مادیت کا نظریہ ہے۔ اشتراکیت مجبور ہوئی کہ پرانی انیونوں کی مدد لے اور یہ اس لئے ہوا کہ وہ انسان کی روحانی نشوونما کی ضروریات کی معترف نہ تھی۔

آرتھر کوئسلر

یوگی اینڈ دی کمیسار۔ صفحہ ۲۰۰

اشتراکیت کی فکری بنیادیں

اور ان کا تنقیدی جائزہ

عبد الحمید صدیقی

اشتراکیت کے علمبردار بڑی فنی مہارت اور چابکدستی کے ساتھ عوام کو یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ نظام ایک خاص نوعیت کی معاشی ہیئت ہے جس میں معاشرے کے کمزور اور مفلوک الحال طبقات کو سرمایہ داروں کی لوٹ کھسوٹ سے بچانے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کی ان کے نزدیک آسان ترین صورت یہ ہے کہ ذرائع پیداوار کو، جو ان کی نگاہ میں معاشی استحصال کا سب سے مؤثر ذریعہ ہیں، انفرادی ملکیت سے نکال کر مملکت کی تحویل میں دے دیا جائے۔ اور اس طرح معاشرے کے عام افراد سرمایہ داروں کے ظلم و استبداد سے محفوظ ہو جائیں۔

یہ نقطۂ نظر اشتراکیت کے بڑے ہی سطحی مطالعہ پر مبنی ہے۔ اگر اشتراکیت محض اُمراء کی چیرہ دستیوں اور ریشہ دوانیوں سے بچنے کی تدبیر ہے تو پھر مارکس سے پہلے کئی ایک انسانیت دوست اہلِ فکر نے اس مقصد کے لئے مثبت نظریات اور عملی تدابیر پیش کیں۔ ان میں یوں تو ہر طبقہ اور خیال کے لوگ شامل ہیں مگر مذہب کے علمبرداروں نے اس سلسلے میں بڑی قابلِ قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر بے بسوں اور بیکسوں کو ظالموں کے چنگل سے آزاد کرانا ہی اشتراکیت ہے تو پھر اسی کام کو تو مذہبی راہنماؤں نے نہایت اچھے طریقے سے سرانجام دیا۔ اس میں مارکس کو کونسی امتیازی خصوصیت حاصل ہے۔

اگر اس سلسلے میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مارکس کی سب سے بڑی کامیابی یہ نہیں ہے کہ اس نے غریبوں اور ناداروں کو جباروں اور قہاروں کے ظلم و استبداد سے بچایا بلکہ اس کا اصل کارنامہ (بلا لحاظ اس کے کہ یہ انسانیت کے لئے خیر کا باعث ہوا یا شر کا) یہ کہ اس نے مادیت کی بنیاد پر ایک ایسا نظامِ فکر و عمل پیش کیا جو انسان کے معتقدات، اس کے مابعد الطبعی تصورات، کائنات کے بارے میں اس کے اندازِ فکر اور اس کے اپنے مرتبہ و مقام سے بحث کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ مارکس کی فکری کاوشوں سے مادیت ایک پورے نظامِ حیات کی صورت میں ڈھل گئی۔ اشتراکیت کے فلسفے کو سمجھنے سے پیشتر یہ ضروری ہے کہ سب سے پہلے اس نظامِ فکر کا جائزہ لیا جائے جس کے بطن سے یہ فلسفہ نکلا ہے۔

بنیادی مسئلہ

انسانیت کی طویل تاریخ پر اگر آپ نگاہ ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ انسان کے اندر شروع ہی سے یہ کشمکش چلی آ رہی ہے کہ کیا اسے اپنی حسی خواہشات کو معیار بنا کر ان کے مطالبات کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہیئے یا کسی ایسے اخلاقی نظام کا پابند ہونا چاہیئے جو اس کی حسی خواہشات

کو کسی ضابطے کے اندر رکھ کر اسے بلند تر مقصد کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل کرے. یہ وہ کشمکش ہے جس سے انسان ہمیشہ دوچار رہا ہے آپ اگر چاہیں تو اسے خیر و شر کے مابین کشمکش کہہ لیں. اگر چاہیں تو بھلائی اور برائی کی قوتوں کے درمیان آویزش کہہ لیں. آپ جس نام سے چاہیں اسے پکار لیں مگر انسان کسی دور میں بھی اس سے الگ نہیں رہ سکا. پھر یہ کشمکش ایسی ہمہ گیر ہے کہ انسان کے اندر بھی برپا ہے اور انسان کی خارجی زندگی میں بھی پوری طرح نمایاں ہے.

عام طور پر لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ آخر یہ کشمکش کیوں ہے. اصل میں اس کش مکش سے کامیابی کے ساتھ گذرنے اور حسی خواہشات کو اعلیٰ اقدار کے تابع کرنے ہی میں انسان کی عظمت کا راز پوشیدہ ہے. دوسری مخلوق پر انسان کے تفوق اور برتری کا سارا دار و مدار اس بات پر ہے کہ وہ حسی خواہشات کا غلام بننے کے بجائے انہیں اپنا غلام بنائے اور پھر قوت و طاقت کے ان سرچشموں سے کسی اعلیٰ مقصد کی تکمیل کے لئے فائدہ اٹھائے. انسان کا یہی طرزِ فکر اور طریقِ عمل اسے حیوانوں سے ممیز اور ممتاز کر کے اسے اشرف المخلوقات کے مرتبہ پر فائز کرتا ہے. اگر انسان بھی حیوانوں کی طرح محض خارجی دباؤ کے زور سے یا حسی خواہشات کی تحریک سے زندگی میں سرگرم عمل رہے تو اس میں اور حیوانوں میں فرق ہی کیا رہ جاتا ہے.

انسان کا خارجی دباؤ کے بغیر اپنے ضمیر و وجدان کی تحریک پر کسی اخلاقی ضابطہ کی پابندی کرتے ہوئے بعض ارفع و اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے ہمت آزما رہنا ہی اس کی اصل بڑائی ہے. اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسان کی حقیقی کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنی آزادیٔ رائے اور اختیار سے اپنی حسی خواہشات سے بلند تر ہو کر ایک ایسا طرزِ عمل اختیار کرتا ہے جس میں بسا اوقات ظاہری طور پر مادی مصالح کا نقصان نظر آتا ہے.

آگے بڑھنے سے پیشتر میں یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری سمجھتا ہوں. بار بار حسی خواہشات کا جس انداز سے ذکر آ رہا ہے اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ حسی داعیات بذاتِ خود کوئی ایسے محرکات ہیں جن سے مکمل نجات ہی انسان کی بہتری کی ضمانت ہو سکتی ہے. یہ حسی خواہشات اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتی ہیں. یہ انسان کو سرگرم عمل کرتی ہیں اور اسے اپنے حفظ و بقا کے لئے جد و جہد کرنے کی ترغیب دیتی ہیں. اس لئے ان کا وجود اور ان کی تحریکات اپنی جگہ بڑی اہمیت کی حامل ہیں اور یہ قدرت کے ایک عظیم منصوبہ کا بہت ہی اہم جزو ہیں. ان کے وجود میں کوئی خرابی نہیں. اصل خرابی وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں انہیں انسان فکر و عمل کا واحد یا اہم ترین محرک سمجھ کر ان کے مطالبات اور تقاضوں کو ہی صحیح اور غلط کا معیار سمجھ لیتا ہے. کیونکہ جب انسان یہ موقف اختیار کر کے سرگرم عمل ہوتا ہے تو وہ مادی فوائد و نقصانات سے بلند ہو کر کوئی طرزِ عمل اختیار نہیں کر سکتا. اس صورت میں اس کے نزدیک وحی و الہام، آخرت کی جزا و سزا اوہام بن کر رہ جاتے ہیں.

دوسرے یہ طرزِ فکر انسان کو ہر اس تعلیم سے بے نیاز کر دیتا ہے جو اندر سے انسان کی اصلاح پر زور دیتی ہو. مادی نقطۂ نظر کے مطابق حسی خواہشات سے زیادہ کوئی مؤثر اور طاقتور محرک نہیں ہوتا. یہاں خارجی محرکات کی کوئی مستحسن صورت نظر نہیں آتی اور انفرادی اور اجتماعی زندگی میں تبدیلی کے حالات کو زبردست دباؤ سے بدلا جاتا ہے. یہاں دباؤ کی حیثیت چرواہے کی لاٹھی کی سی ہوتی ہے جس کی مدد سے وہ نہایت مرغوب اور پسندیدہ چیزوں سے بھیڑوں اور بکریوں کو دُور رکھ کر انہیں اپنی مرضی کے مطابق جس طرف چاہتا ہے ہانک کر لے جاتا ہے.

اس ضمن میں ایک بات کو ہمیشہ ذہن نشین رکھنا چاہیئے جو فرد یا قوم حسی اور مادی خواہشات کے علاوہ کسی اعلیٰ و ارفع اخلاقی ضابطے کی پابند

نہ ہوگی۔ اُسے کسی ضابطہ حیات کا پابند بنانے کے لئے بہت جبر سے کام لینا پڑے گا۔ جو جانور ہرے بھرے کھیتوں کی ہریالی سے متاثر اور مرعوب ہو کر اُن کی طرف دیوانہ وار لپک پڑتا ہے اُسے اگر کوئی اُس راہ سے روک کر دوسری طرف لے جانا چاہتا ہو تو اُس کے لئے اسے تشدد اور جبر ہی سے کام لینا پڑے گا۔

آپ پوری تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو آپ کو انسانی فکر و عمل کے دو محرکات ہی ملیں گے۔ ایک مادی محرکات، جن کا مطلب یہ ہے کہ کسی فرد یا انسانوں کے کسی گروہ کو سرگرم عمل کرنے، اُن کی ذہنی اور اخلاقی قوتوں کو کسی راہ پر لگانے کے لئے مادی فوائد و نقصانات ہی سب سے بڑی طاقت ہیں۔ اس فرد یا گروہ کو ان فوائد و نقصانات سے ہٹا کر کسی بڑے اخلاقی فائدے کے حصول کے لئے آمادہ کرنا جان جوکھوں کا کام ہے اور اس راہ میں جب تک غیر معمولی قوت و طاقت سے کام لے کر انہیں جبر کے ساتھ اس کام پر لگا نہ دیا جائے۔ یہ مقصد کبھی حاصل نہ ہوگا۔

مادی محرکات انسان کو بلاشبہ عمل کی قوت عطا کرتے ہیں مگر وہ انسان کو حیوانی سطح پر ہی رکھتے ہیں اور وہ جانوروں کی طرح لاٹھی کے زور ہی سے مختلف سمتوں میں ارباب بست و کشاد کے منشاء و مرضی کے مطابق ہانکا جاتا ہے۔ میں نے اس سلسلے میں جو کچھ عرض کیا ہے اسے مختصر الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ

> اگر عمل کے محرکات صرف مادی اور حسی ہوں تو انسان کسی اخلاقی ضابطے کا پابند نہیں ہوتا اور اُس کے افکار و اعمال کے دھارے کو کسی مخصوص رُخ پر ڈالنے کے لئے جبر کے علاوہ کوئی دوسرا ہتھیار موثر اور کارگر ثابت نہیں ہوتا

اس نقطۂ نظر کے مقابلے میں دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انسانی زندگی میں اگرچہ مادی اور حسی خواہشات بہت بڑا عمل دخل رکھتی ہیں مگر وہ اس کے فکر و عمل کے بنیادی محرکات نہیں۔ اسے اس کرۂ ارضی پر بعض ارفع و اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے اُتارا گیا ہے۔ اس لئے وہ ان حسی خواہشات کا اپنے آپ کو غلام بنانا کبھی پسند نہیں کرتا۔ بلکہ انہیں غلام بنانے کی فطری آرزو رکھتا ہے تاکہ اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کی راہ میں یہ حائل نہ ہونے پائیں۔ ظاہر بات ہے کہ اعلیٰ مقصد سے محبت تعلیم و تربیت کے بغیر تو پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس بنا پر اس نقطۂ نظر کے علمبرداروں کے نزدیک انسان کسی ایسے نظام اخلاق کا طلبگار ہوتا ہے جو انسانی زندگی کو روحانی اقدار کا پابند بنا سکے۔ روحانی اور اخلاقی اقدار کا سرچشمہ حسی خواہشات یا مادی تجربات تو نہیں ہو سکتے۔ ان کے لئے ہمیں لازمی طور پر اُن سرچشموں کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جو مادی دنیا سے نہیں بلکہ کسی ماوراء محسوسات نظام سے پھوٹتے ہیں۔ باری تعالیٰ ان اقدار کا منبع و مصدر ہوتا ہے اور وہ وحی و الہام کے ذریعہ انہیں اپنے خاص بندوں کی طرف منتقل کرتا ہے جو براہ راست خالق کی نگرانی میں انہیں دنیا میں عملاً نافذ کر کے انسانوں کے لئے رشد و ہدایت کا سامان فراہم کرتے ہیں ان مقدس نفوس کو مذہب کی زبان میں حاملین وحی یا انبیاء علیہم السلام کہا جاتا ہے آپ اگر ان کے پورے کام کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس میں تعلیم و تربیت غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہ نیک بندے جو کچھ کہتے ہیں۔ وہ انسانی فطرت کی پکار ہی ہوتی ہے اور دل خود ان کے پیغام کی صحت پر گواہی دیتا ہے لیکن چونکہ ان کے کام کا اصل ہدف عوام کو حسی خواہشات کی بندگی سے نکال کر خالق کی بندگی میں دینا ہوتا ہے اس لئے انہیں عوام کو حیات انسانی کی اعلیٰ و ارفع قدروں کا پابند بنانے کے لئے بہت کچھ محنت کرنا پڑتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ حسی خواہشات انسانی زندگی کو سب سے زیادہ اپیل کرتی ہیں۔ ان کے مقابلے میں روحانی اور اخلاقی اقدار کا دار و مدار چند غیر محسوس حقائق پر ہوتا ہے اس لئے ان کا پابند بنانے کے لئے عوام کو شعوری طور پر کوشش کرنا پڑتی ہے یہی وہ اصل سبب ہے جس کی بنا پر انبیاء علیہم السلام کے پروگرام میں تعلیم و تربیت غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔

اب اگر تعلیم و تربیت کی اہمیت تسلیم کر لی جائے تو ہمیں لامحالہ ان اداروں کی اہمیت کو ماننا پڑے گا جو اس مقصد کے لئے موجود ہیں۔ یہ ادارے کئی قسم کے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ایسے ادارے جو انسانی روح کو مختلف آلائشوں سے پاک کریں۔ جیسے تزکیہ و احسان۔ پھر ایسے ادارے جو انسانوں کو ان اخلاقی اقدار اور حسی خواہشات کے بارے میں صحیح انداز فکر عطا کریں۔ مثلاً تعلیم و تربیت کا نظام۔ ان کے علاوہ معاشرتی، سیاسی اور معاشی ادارے جو انسان کو ایک صحیح اخلاقی نظام کے تحت زندگی گذارنے کی سہولتیں اور ماحول بہم پہنچاتے ہیں۔ اس روحانی اور اخلاقی نظام کو مؤثر بنانے کا انداز حسی نظام سے یکسر جداگانہ ہوتا ہے۔ حسی نظام میں لوگوں کو اپنی مادی خواہشات کے تحت زندگی بسر کرنے کی تو آزادی ہوتی ہے البتہ اُن کی تنظیم کے لئے اُن پر ایک انتہائی سخت اور جابرانہ نظام مسلط کرنا پڑتا ہے تاکہ اگر اجتماعی مفاد کے لئے انہیں اس ایک مادی نفع کے محرک کے علاوہ کسی دوسرے مقصد کے لئے استعمال کرنا مقصود ہو تو قوت کے بل بوتے پر اُن سے کام لیا جائے۔ اس نظام کے برعکس روحانی اور اخلاقی نظام کے مؤثر ہونے کا زیادہ تر دارومدار فرد کے اپنے ایمان اور افراد کی تعلیم و تربیت پر ہوتا ہے۔ اس میں انسان کو خارجی دباؤ کے تحت نہیں بلکہ ترغیب و تلقین کے ذریعہ اندر سے بدل کر ایک ذہنی اخلاقی طرز عمل کا پابند بنانے کی کوشش کی جاتی ہے اس مقصد کے لئے سب سے پہلے اس کے دل و دماغ میں ایک خاص طرزِ فکر کا نقش بٹھایا جاتا ہے جسے مذہبی اصطلاح میں عقیدہ یا ایمان کہا جاتا ہے۔ پھر اس عقیدہ یا ایمان کی اساس پر اُس کی تہذیب و تربیت کی جاتی ہے اور اس کے فکر و نگاہ کے زاویوں کو ایسے سانچوں میں ڈھالا جاتا ہے جو اس کے دل میں مادی نفع و نقصان کے مقابلے میں اخلاقی اور روحانی فوائد کی اہمیت کو بڑھائیں۔ چنانچہ ان انبیا علیہم السلام کی تعلیمات میں مملکت اور معاشرے کی تادیبی کارروائیوں سے کہیں زیادہ کام اصلاح نفس سے لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ایک فرد کو ایک پاکیزہ معاشرتی ماحول میسر کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد حکومت کی باری آتی ہے۔ یہاں بھی حکومت کی ذمہ داری محض جبر کے ذریعہ عوام کو مخصوص طرز عمل اختیار کرنے پر مجبور کرنا نہیں ہوتی بلکہ ایجابی طور پر اس پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ نیکی اور بھلائی کو پروان چڑھانے کے لئے تعلیم و تربیت کا ایک اجتماعی نظام قائم کرے اور معروف کو معاشرے میں پھیلانے اور ترقی دینے کے لئے بھرپور کوشش کرے۔ اس ساری ترغیب و تلقین کے باوجود اگر کچھ لوگ برائی کی روش سے باز نہ آئیں اور لوگوں کے امن و سکون کو غارت کرنے پر مصر رہیں تو پھر انہیں سختی سے روک دیا جائے۔ اگر آپ مندرجہ بالا گذارشات پر غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مادی نظام کے مقابلے میں روحانی اور اخلاقی نظام میں تین چیزیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔

اولاً انسان کو حسی خواہشات سے بلند تر ہو کر سوچنے اور عمل کرنے کے لئے تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے اس بنا پر اس نظام میں ایسے تربیتی اداروں کی اہمیت بڑا بنیادی مقام رکھتی ہے۔

ثانیاً۔ اس نظام میں انسان کو فکر و عمل کی بڑی آزادی حاصل ہوتی ہے اور اسے جبر و استبداد کے ذریعہ ایک خاص نہج پر چلانے کی بجائے تلقین و تربیت کی مدد سے ایک خاص طرز عمل اختیار کرنے پر تیار کیا جاتا ہے۔

ثالثاً۔ معاشرتی، معاشی اور سیاسی اداروں کا کام صرف اسی قدر نہیں ہوتا کہ وہ مختلف قسم کی جکڑ بندیوں کے ذریعہ عوام پر عرصہ حیات تنگ کریں بلکہ اُن پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی فضا اور ایک ایسا ماحول قائم کریں جس میں انسان کو اپنی روحانی اور اخلاقی ترقی کے لئے موزوں اور مناسب مواقع فراہم ہوں۔

جب ہم پوری تاریخ پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ دنیا کی مختلف قوموں نے ان دو متضاد نظریات کو ہی اپنایا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض قوموں نے ان نظریات کو اپنا کر ان کے تقاضوں کو کما حقہ پورا نہ کیا اور اس بنا پر اُن کی زندگیوں میں ان نظریات کی پوری آب و تاب نہیں ملتی لیکن جس قوم نے بھی ان میں سے کسی نظریہ حیات کو جس حد تک بھی اپنایا اُس حد تک اُس کی زندگی کے مختلف گوشوں میں اس کی جھلک بآسانی دیکھی جا سکتی ہے۔

ان نظریات کو پوری حد تک اپنانے اور زندگی کو ان کے مطابق ڈھالنے میں کوتاہی نے ایک دوسرے گروہ کو جنم دیا جس نے انسانیت کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ اُس نے اپنی زندگی تو حسی اور مادی خواہشات کے مطابق ہی بسر کی اور ان کے تقاضوں کو حیاتِ انسانی کے بنیادی مطالبات سمجھ کر کسی فعل کے صحیح اور غلط ہونے کا فیصلہ کیا۔ مگر اس کے ساتھ اجتماعی اداروں کی ضرورت اور اہمیت پر بھی زور دیتا رہا۔ ان اداروں کے قیام کی اُسے کچھ اس وجہ سے ضرورت پیش نہ آئی کہ وہ فی الواقع ان کی اہمیت کا قائل تھا اور انہیں کسی فرد کی روحانی اور اخلاقی ترقی کے لئے ناگزیر سمجھتا تھا بلکہ وہ ان اداروں کی اصلیت پر صرف اس لئے زور دیتا تھا کہ ان کے مقدس نام سے بڑی آسانی کے ساتھ لوگوں کو دھوکہ دیا جا سکتا تھا اس ظالم گروہ نے عملاً جو طرزِ عمل اختیار کیا اُس کے نتیجے میں یہ عجیب و غریب شکل سامنے آئی کہ معاشرے کا یہ نہایت عیار اور چالاک طبقہ خود تو حسی خواہشات کا غلام تھا اور ان کی تکمیل کے علاوہ اُسے کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی اور اس راہ میں وہ کسی اخلاقی اصول اور ضابطے کی پابندی کرنے پر تیار نہ تھا۔ اُس کی زندگی کا واحد مقصد "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" تھا۔ لیکن اُسے یہ خطرہ لاحق تھا کہ اگر سب لوگوں نے اسی مسلک کو اپنا لیا تو انہیں دنیوی فوائد و لذات میں دوسرے انسانوں کو شریک کرنا پڑے گا اور اس طرح اُس کی عیش پرستیوں میں کسی حد تک کمی آجائے گی۔ چنانچہ عوام کو دنیوی لذائذ سے محروم رکھ کر خود اپنے لئے زیادہ سے زیادہ منافع سمیٹنے کی غرض سے اُس نے تربیتی اداروں کی محبت کا دم بھرنا بھی ضروری سمجھا کیونکہ اُس کے نزدیک یہ ادارے دھوکے کا سب سے مؤثر ذریعہ ہیں۔ وہ عوام کو ہمیشہ دنیوی مفادات کا بندہ بننے کی بجائے اخلاقی اقدار کو اپنانے کی تلقین کرتا مگر خود اُس کی زندگی میں دنیاوی مفادات کی محبت کے علاوہ اور کوئی چیز نظر نہ آتی۔ وہ تعلیمی و تربیتی اداروں کی بھی تعریف کرتا اور عوام کو ان سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دیتا مگر خود اُن سے کسی طرح بھی فائدہ اٹھانے کے لئے تیار نہ رہتا۔ عوام کو دوسرے اشغال میں مصروف رکھ کر خود مادی وسائل جمع کرتا رہتا اور اس طرح معاشرے میں قوت و طاقت کے سارے خزانوں پر قبضہ کر لیتا۔ پھر لوگوں کے ذہنوں میں مملکت اور حکومت کی عظمت کا نقش بٹھاتا اور انہیں اس بات کا قائل کرتا کہ ان عظیم اداروں کی طرف سے انہیں جو احکام صادر ہوں اُن کی خوش دلی سے پابندی ہی میں اُن کی فلاح و کامرانی کا راز مضمر ہے۔ وہ انہیں یہ باور کراتا کہ یہ ادارے تمہاری فلاح و بہبود کے لئے ہی معرضِ وجود میں آئے ہیں۔ مگر چونکہ ان اداروں کا انتظام و انصرام عملاً نہایت گھٹیا قسم کے دنیا پرست اور عیار لوگوں کے ہاتھ میں آچکا تھا اس لئے انہوں نے ان سے انسانی فلاح کا کام لینے کی بجائے انہیں عوام پر اپنی خدائی مسلط کرنے کے لئے بطور آلۂ کار استعمال کیا۔ یہ ادارے انسانوں کی اخلاقی اور روحانی تربیت کا تو کوئی انتظام نہ کر سکے البتہ کمزوروں اور غریبوں کو لوٹنے والے طبقوں کے ہاتھ میں جبر و استبداد کا ایک ہتھیار بن کر رہ گئے۔ ان اداروں نے جو قوانین وضع کئے وہ معاشرے میں عدل و انصاف قائم کرنے کے لئے نہ تھے بلکہ طاقتور طبقوں کے ناجائز حقوق کی پشت پناہی اور حفاظت اور کمزور طبقوں کو اُن کے جائز حقوق سے محروم کرنے کے لئے تھے۔ ان قوانین میں طاقت ور جس طرح چاہتا من مانی کارروائیاں کرتا اور مملکت اور حکومت ان کی محافظت کرتی اس کے مقابلے میں کمزوروں اور ناتوانوں کو ہر قسم کے ناجائز استحصال کا ذریعہ بنایا جاتا اور اگر وہ نالہ و فریاد کرتے تو فوج، پولیس اور انتظامیہ انہیں بڑی سختی کے ساتھ دبا دیتی۔

یہ حکومتیں اگرچہ اس بات کی دعویدار تو تھیں کہ اُن کا مقصد اجتماعی عدل کا قیام ہے لیکن اجتماعی عدل سے ان کی مراد طبقۂ امراء کے لئے زیادہ سے زیادہ مراعات کا حصول اور غریبوں اور نادار اوروں کے لئے زیردست آزادی اور محرومی تھا۔

انسانی اداروں کی یہ تیسری صورت جو اُوپر پیش کی گئی ہے کسی الگ طرزِ فکر کی ترجمان نہیں حقیقت میں یہ پہلے نقطۂ نظر ہی کی مظہر ہے لیکن اس میں بڑی چالاکی کے ساتھ دوسرے نقطۂ نظر کی آمیزش کر لی گئی ہے تاکہ عوام کو دھوکا دیا جا سکے۔

مذہبی اور معاشرتی پس منظر

جب ہم اشتراکیت کی فکری بنیادوں کا کھوج لگاتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مادہ پرستوں نے مذہب اور اخلاق کے نام پر جس عیاری اور زبردست آزادی کو جنم دے رکھا تھا اُس نے اشتراکی طرزِ فکر کے لئے سب سے بڑا محرک فراہم کیا۔ اگر مذہب کے علمبردار اسی کو اپنا رہنما بناکر اپنے مسائل حل کرتے یا مادہ پرست دُنیوی فوائد و لذائذ کی اساس پر ہی اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تشکیل کرتے تو آج یہ اشتراکی تحریک دنیا سے ناپید ہوتی۔ مگر ان دونوں گروہوں نے منافقت اور دورنگی کا جو طرزِ عمل اختیار کر رکھا تھا اُس نے دنیا کو عذاب بنا دیا اور اس عذاب سے نجات پانے کے لئے انہوں نے ایک ایسا نظام تجویز کیا جس سے روحانی اور اخلاقی اقدار یکسر خارج ہوں۔ اس تحریک کے پیچھے منافقت کا یہی جذبہ کار فرما تھا کہ انسان فطری طور پر تو حسیات کا غلام ہونے کی وجہ سے ناقابل اعتماد ہے مگر منافقت کی وجہ سے مذہب و اخلاق اور روحانیت کا نام لیتا ہے۔ جب ان خوشنما ناموں کے پیچھے ہم اصل انسان کو دیکھتے ہیں تو ہمیں غیر مادی خواہشات اور تمناؤں اور اُن کی غلامی کے اور کوئی چیز نظر نہیں آتی۔

پھر چونکہ اس کے وجود کا تانا بانا مادی اور حسی خواہشات سے تیار کیا گیا ہے اس لئے وہ فطرت کی مادی قوتوں کے ہاتھ میں بے بس کھلونا ہے چونکہ وہی اُسکی مادی احتیاجات کی تسکین کا ذریعہ بنتی ہیں۔ انسان کی فطری گمراہی اور ماحول کے سامنے بے بسی وہ بنیاد ہے جس پر اشتراکی فلسفے کی پوری عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ آپ جب انسانیت کے بارے میں یہ فرض کر لیتے ہیں کہ داخلی طور پر سوائے مادی خواہشات کے کوئی دوسرا نصب العین یا کوئی دوسرا جذبہ اس کے فکر و عمل کا محرک نہیں ہو سکتا اور خارجی طور پر وہ قدرت کی اندھی بہری قوت کا غلام ہے۔ تو پھر انسان کے متعلق یہی تصور بار بار سامنے آتا ہے کہ وہ ایک چالاک اور عیار حیوان ہے جس نے اپنے آپ کو دوسرے حیوانات سے بلند تر ظاہر کرنے کے لئے اخلاق و روحانیت کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔

مارکس نے بھی ڈارون اور فرائڈ کی طرح انسانیت کی سطح کو بلند کرنے کی بجائے اُسے بلندی سے پستی کی طرف دھکیل دیا۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں یہاں اس امر کی نشان دہی کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ آخر یہ لوگ انسان کو پست ثابت کرنے کے کیوں درپے ہوئے اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کے ہاں انسان کے بارے میں ہزاروں سالوں سے کوئی اعلیٰ تصور آیا ہی نہیں۔ مذہب جو انسان کو رفعت و بلندی کا مقام مقابلہ وہ اہل مغربی قوموں کے نزدیک ہمیشہ کمزور اور بے جان رہا ہے اور اس سے انسان کو دھوکے ہی دیئے جاتے رہے ہیں۔ چنانچہ جب بھی ان مفکرین کے سامنے انسانی افعال و اعمال کے محرکات ڈھونڈتے ہوئے کوئی مادی محرک آیا تو انہوں نے اپنے نظریہ کی تائید کے لئے اسے غیر معمولی اہمیت دینا شروع کی۔ اس معاملے میں انہوں نے ہر قدم پر بڑی تنگ نظری اور جلد بازی کا ثبوت دیا۔ مثلاً ڈارون نے جب دیکھا کہ انسان کسی حد تک اپنے طبیعی ماحول سے متاثر ہوتا ہے تو اس نے فوراً یہ فیصلہ کیا کہ انسان کا ارتقاء اور ترقی اس کے طبیعی ماحول کی رہین منت ہے۔ اور اس نے آج آدمیت کا جو لباس پہن رکھا ہے اُسے طبیعی ماحول ہی نے اس کے لئے تیار کیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ انسان کے اندر صورت و سیرت کے اعتبار سے جو آدمیت نظر آتی ہے وہ طبیعی حالات کا ثمرہ ہے۔

اسی طرح فرائڈ نے محض ایک محدود سے مشاہدہ کو بنیاد بنا کر یہ کہنا شروع کیا کہ انسانی زندگی میں سب سے بڑا محرک صنفی خواہش ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ خواہش انسانی فطرت میں داخل ہے اور بسا اوقات انسان اس سے مغلوب ہو جاتا ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکال لینا کہ زندگی کا محرک صرف یہی جبلت ہے بہت بڑی گمراہی ہے۔ انسان نے اپنی اس خواہش پر بڑی کامیابی کے ساتھ ضبط کیا ہے اور اپنی اس قوت کو بڑے تعمیری کاموں پر لگایا ہے۔ اب اس نظم و ضبط کی قوت کو نظر انداز کر کے محض اس سے مغلوبیت کے چند واقعات کے پیش نظر اسے انسانی زندگی کا بنیادی محرک بنا لینا سخت ناانصافی ہے۔ قریب قریب یہی حال مارکس کا ہے۔

(الف) مذہبی منافقت کا ردِ عمل

مارکس یہودی النسل تھا۔ مسیحیت کا کوئی اچھا پہلو اس کی نگاہ میں نہ تھا۔ اس کے ذہن میں صرف ایک خیال ہی راسخ تھا کہ انسان فطرت کے اعتبار سے گناہگار ہے۔ اس بنا پر بحیثیت فرد اس پر کوئی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ جس ماحول میں اُس نے آنکھیں کھولیں وہ بھی انسانیت کی ارفع قدروں کے لئے بڑا حوصلہ شکن تھا۔ اُس نے اپنے اردگرد پھیلی ہوئی معاشرت میں تضاد کے نہایت گھناؤنے مناظر دیکھے۔ اُس نے یہ دیکھا کہ مذہب کے پرستار انسانی شرف و مساوات کے بڑے بلند بانگ دعوے کرتے ہیں مگر اُن کی اپنی زندگیاں اس دعوے کی کسی طرح بھی تصدیق نہیں کرتیں۔ شخصی حقوق کے نام پر یہ لوگ انسانی شرف کا دم بھرتے ہیں اور ان کے حقوق کو مستقل بنانے کے لئے یہ کہتے ہیں کہ یہ حقوق خالقِ کائنات نے انسان کو دیئے ہیں، لہٰذا کوئی شخص انہیں سلب کرنے کا مجاز نہیں ہو سکتا۔ لیکن انفرادیت کے تحفظ کے نام پر جس طرح معاشرے کے کمزور اور بے بس لوگوں کو ناجائز استحصال کا ذریعہ بنایا جا رہا تھا۔ اُس سے مارکس کے اندر شدید اضطراب پیدا کیا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ انسانی عز و شرف کی بنیاد اخلاقی و روحانی قدروں پر نہیں بلکہ معاشی اقتدار پر ہے چونکہ ناجائز استحصال کا سب سے بڑا ذریعہ مال و دولت تھا اس لئے مارکس نے اپنی ساری توجہ اس پر مرکوز کر دی۔ اُس نے سوچا کہ مال و دولت کے ذریعہ لوگوں کو معاشرے میں سیاسی [illegible]ر حاصل ہوتا ہے اور یہ اقتدار پھر انہیں معاشی نقطہ نظر سے زیادہ مستحکم اور مضبوط بناتا ہے اس کے ساتھ اُس نے پیدائش دولت کے طریقوں پر بھی غور کرنا شروع کیا اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مال و دولت کے اندر معاشرے کے مختلف طبقوں میں جو تفاوت پایا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ امیر طبقے ذرائع پیداوار پر قبضہ جما کر ان کی مدد سے مال و دولت کی بہت بڑی مقدار جمع کر لیتے ہیں مگر ان کے مقابلے میں مزدور پیشہ ذرائع پیداوار سے محروم ہونے کی بنا پر اپنی محنت بیچنے پر مجبور ہوتا ہے، چونکہ محنت تمام تلف ہونے والی چیزوں میں سب سے زیادہ اتلاف پذیر ہوتی ہے اس لئے وہ طاقتور طبقوں سے اپنی محنت کا جائز صلہ نہیں پا سکتے اور اُن کی بے بسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سرمایہ دار اُن کا جس قدر خون نچوڑنا چاہتا ہے، نچوڑ لیتا ہے۔ ان حالات کو سامنے رکھتے ہوئے مارکس اس نتیجہ پر پہنچا کہ فساد کی اصل جڑ ذرائع پیداوار کی ذاتی ملکیت ہے۔

مذہب خصوصاً مسیحیت کا اُس وقت جو حال خود اس کے اپنے پیرؤوں کے ہاتھوں ہو رہا تھا اُس نے بھی مارکس کے طرزِ فکر کو بڑے غلط راستوں پر ڈال دیا۔ اُس نے یہ دیکھا کہ مذہب وقت کے معاشی رجحانات سے میدان میں شکست کھا کر ان کے ساتھ برابر مصالحت کرتا چلا جا رہا ہے اور کسی ایک میدان میں بھی جم کر کھڑا نہیں ہو رہا مثلاً سرمایہ داری کو فروغ دینے کے لئے اگر سود ضروری تھا تو مذہب کے علمبرداروں نے بائیبل کی صریح تصریحات کے علی الرغم اُسے جائز قرار دیا۔ اسی طرح اُس نے اس تلخ حقیقت کا بھی مشاہدہ کیا کہ ضبط ولادت جیسی خلافِ مذہب تحریک جس کے پیچھے ایک مخصوص طبقے کے مفادات کے تحفظ کے علاوہ اور کوئی جذبہ کار فرما نہ تھا، مذہبیت کے علمبرداروں کی تائید کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے تو اُسے اس بات کا یقین ہو گیا کہ وہ قوتیں جو معاشی رجحانات کی صورت گری کرتی ہیں وہی درحقیقت فیصلہ کن اہمیت کی حامل ہیں۔ یہ صرف دو چار

مشاہدات ہی نہ تھے بلکہ اُس نے مذہب کی شکست اور معاشی رجحانات کے سامنے اطاعت گذاری کے کئی ایک واقعات دیکھے۔ اُس نے ریاست کو مذہب کی گرفت سے یکسر آزاد ہوتے دیکھا۔ اُس نے دولت کمانے اور دولت خرچ کرنے کے معاملے میں لوگوں کو مذہب سے یکسر بے نیاز ہوتے ہوئے دیکھا مگر مارکس کو یہ بات ذہن نشین رکھنا چاہیئے تھی کہ نشاۃ ثانیہ کے بعد کے چند واقعات اور وہ بھی صرف یورپ کی حدود میں، پوری انسانی تاریخ تو نہیں بن سکتے اور محض اُن کے مشاہدے سے تو یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ انسانی اقدار کا پورا ڈھانچہ ذرائع پیداوار تیار کرتے ہیں۔

میں مارکس کی فکری لغزشوں پر بعد میں گفتگو کروں گا۔ اس وقت مجھے جو کچھ بتانا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ مارکس کا مشاہدہ بڑا محدود اور اس کا طرز فکر بڑا جانبدارانہ تھا۔ اُس نے اپنے دل پسند افکار و نظریات کی تائید کے لئے تاریخ کے اُن حصوں اور اُن واقعات کو یکسر نظر انداز کر دیا جن سے اس کے خیالات کی تائید نہ ہوتی تھی۔

(ب) تکنیکی انقلاب اور عصری اثرات

معاشی ماحول اور ذرائع پیداوار کی اہمیت بڑھنے کے دو وجوہ اور بھی تھے — ڈارون نے تبدیلی کے محرکات کو انسان کی داخلی زندگی میں تلاش کرنے کی بجائے خارج میں تلاش کیا۔ ڈارون کے ساتھ مارکس متفق تھا کیونکہ اسے تسلیم کئے بغیر کائنات کی میکانکی تشریح ممکن نہ تھی مگر مارکس صرف فطرت کے مظاہر کو تبدیلی کے حقیقی محرکات سمجھ کر مطمئن نہ ہو سکتا تھا۔ اُس نے یہ محسوس کیا کہ انسان کی خارجی زندگی میں تغیرات بڑی سرعت کے ساتھ آ رہے ہیں لیکن فطرت بڑی نرم رفتاری کے ساتھ اپنے سفر کو جاری رکھ رہی ہے۔ اس لئے اُس نے فطرت کی قوتوں کو اجتماعی زندگی کے تغیرات کا براہ راست ذمہ دار ٹھہرانے کی بجائے ذرائع پیداوار کو ان کا ذمہ دار ٹھہرایا کیونکہ ان کی تبدیلی کی رفتار اور اُن کی اثر آفرینی فطرت سے کہیں زیادہ ہے۔ مارکس معاشرتی زندگی کے تغیرات کو جن خارجی عناصر کی طرف منسوب کر سکتا تھا وہ فطری ماحول سے تو فراہم نہ ہو سکتے تھے کیونکہ فطری ماحول کے اثرات بڑے مدھم ہوتے ہیں لیکن یورپ اُس وقت جس نوعیت کے انقلاب سے گذر رہا تھا وہ نہ صرف بڑا ہمہ گیر تھا بلکہ اُس کی رفتار بھی بڑی تیز تھی اس لئے اُس نے ڈارون اور اسی طرز فکر کے دوسرے مفکرین کو چھوڑ کر اپنی ساری توجہ ذرائع پیداوار پر مرکوز کر لی اور انہیں سارے معاشرتی، سیاسی، اور معاشی تغیرات کا بنیادی سبب قرار دیا۔

پھر مارکس نے یہ بھی محسوس کیا کہ جب انسان فطرت کے خارجی مظاہر کو تغیرات کا محرک ٹھہراتا ہے تو اُس کا ذہن کسی نہ کسی طرح اُن حقائق کی طرف پلٹنے لگتا ہے جو ان مظاہر کے پیچھے کارفرما ہیں۔ اُسے قانونِ قدرت کا مطالعہ بعض ماورائے فطرت قوانین کی طرف لے جاتا ہے اور اس طرح خارجی مظاہر اکثر اوقات مابعد طبیعی حقائق کی طرف انسان کی توجہ مبذول کر دیتے ہیں۔ یہ چیز مارکس کو کسی لحاظ سے پسند نہ تھی اس لئے اُس نے فطرت کو چھوڑ کر ذرائع پیداوار کو انفرادی اور اجتماعی زندگی اور اُس کے ضابطوں کی بنیاد قرار دیا۔ مگر اس اختلاف کے باوجود مارکس نے اپنے بہت سے اساسی تصورات ڈارون ہی سے لئے

(ج) ڈارون کے اثرات

ڈارون سے اُس نے جو سب سے پہلا سبق سیکھا وہ یہ تھا کہ عالم محسوسات سے ماوراء کسی اخلاقی اور روحانی نظام کو خیر و شر یا بھلائی اور برائی کا معیار ٹھہرانے سے صریح انکار کیا اور انسان کو امر واقعہ یہ بتایا کہ حقیقت زمان و مکان کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ اور جو چیز یا نظریہ جس وقت ایک غالب قوت کی حیثیت سے موجود ہے وہی صحیح اور برحق ہے۔

پھر اُس نے ڈارون سے کائنات میں جبر کی فرمانروائی کا تصور بھی لیا اور اس بات کو قبول کیا کہ انسان اپنے فطری ماحول سے جو مطابقت پیدا کرتا رہتا ہے۔ اُس میں خود اُس کی اپنی خواہش کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا بلکہ فطرت کا زبردست اور طاقتور ہاتھ قوت کے زور سے انسان اُس

کے مزاج اور اُس کے افکار و نظریات کو مخصوص سانچے میں ڈھالتا ہے۔ یہیں سے اُس نے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا کہ انسانی ارتقاء اور ترقی کسی تعاون کی رہینِ منت نہیں بلکہ کشمکش، پیکار اور تنازع کا ثمرہ ہے۔

(ف) ہیگل کا اثر

ڈارون سے متاثر ہونے کے باوجود مارکس نے اپنا فکری ڈھانچہ ہیگل سے مستعار لیا۔ بعض حلقوں کی طرف سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ آخر مارکس نے ڈارون جیسے واضح اور محسوس مشاہدہ پر انحصار کرنے والے مفکر کی بجائے ہیگل جیسے تصوراتی مفکر کو اپنا رہنما کیوں بنایا۔ یہ سوال الفاظ کے ہیر پھیر کے ساتھ کئی مرتبہ علمی حلقوں میں موضوع بحث بن چکا ہے۔ مختلف لوگوں نے اس کی مختلف وجوہات پیش کی ہیں۔ میں ان سارے مباحث کو سامنے رکھتے ہوئے جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ ڈارون کے افکار و نظریات خواہ مارکس کے لئے کتنے ہی جاذب نظر اور پسندیدہ تھے مگر اُن میں ایک سقم یہ تھا کہ وہاں فطرت کو ایک ناقابلِ تغیر پذیر حقیقت ماننا پڑتا تھا۔ اور بالآخر اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا تھا کہ اگرچہ یہاں کوئی اصول بھی مستقل اور پائیدار نہیں اور ہر شے ارتقائی منازل طے کر رہی ہے مگر فطرت جو ان کے تغیر کا اصل سبب ہے وہ بہرحال اٹل ہے اور ناقابلِ تغیر ہے۔ مگر مارکس کی طبیعت اس اصول کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھی اس لئے اُس نے اِس ایک خاص معاملے میں ڈارون کے بجائے ہیگل کی رہنمائی قبول کی۔

ہیگل کا خیال یہ تھا کہ انسان اپنی روحانی اور جسمانی ضرورت کو دیکھتے ہوئے جو معاشرتی نظام قائم کرتا ہے وہ درحقیقت روح مطلق کا مجسمہ ہوتا ہے۔ روح مطلق کو کبھی بھی کسی ایک مقام پر قرار نصیب نہیں ہوتا بلکہ وہ برابر ارتقاء کی منزلیں طے کرتی چلی جاتی ہے۔ جس وقت یہ روح مطلق ایک قدم آگے بڑھاتی ہے تو پورے معاشرتی نظام میں اختلال اور بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس نظام کے مختلف ہم آہنگ شعبے خود بخود بے ربط ہو جاتے ہیں۔ اس خلفشار کو لوگ بڑی شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں اور پھر روح مطلق کے اشارے پر ایک نئے انداز سے ربط و ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس تعمیرِ نو میں گذشتہ نظام کے صالح اجزا اور نئے نظام کے صحت مند عناصر دونوں شامل ہوتے ہیں۔ چنانچہ پرانا نظام پوری طرح بدل جاتا ہے اور اُس کی جگہ ایک نیا نظام معرض وجود میں آتا ہے جو ہیگل کے بقول نئے اور پرانے نظام کے صالح عناصر پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ نیا نظام سابقہ نظام سے ہر حال میں بہتر اور مکمل تر ہوتا ہے۔ اور اس کے بطن سے جتنے نئے افکار و نظریات نکلتے ہیں وہ پہلے تصورات سے بہتر ہوتے ہیں فلسفے کی نئی پیچیدگیوں سے بچتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہیگل کے نزدیک انسانی تہذیب و تمدن کا ارتقاء دراصل اضداد کے ظہور، تصادم اور امتزاج کا نتیجہ ہے۔ اسی عملی ارتقاء کو ہیگل اپنی مخصوص اصطلاح میں جدلی عمل کہتا ہے۔ اس کے نزدیک عرصہ تاریخ یا میدان دہر میں گویا ایک مسلسل منطقی مناظرہ و مجادلہ ہو رہا ہے اور اسی کی قوت سے انسانیت ترقی کی منازل طے کر رہی ہے۔

مارکس کو اس نقطۂ نظر سے تو ہیگل کا یہ تصور پسند آیا کہ اس میں حقیقت (REALITY) بھی کوئی مستقل اور پائیدار چیز بننے کی بجائے محض ایک تغیر پذیر نظریہ بن کر رہ گئی۔ جب بنیاد ہی کی کوئی پائیدار اور مستقل حیثیت نہ رہی تو اخلاق، اجتماع، قانون کے رفیع الشان محلات خود بخود لرزنے لگے بلکہ ریت کے گھروندوں کی طرح گرنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حیات انسانی کی کوئی ایسی قدر باقی نہ رہی جسے غیر فانی اور مستقل کہا جا سکے ہیگل کا یہ نظریہ جرمنی میں کیوں مقبول تھا۔ اُس کی دو وجوہات ہیں۔ (۱) مارٹن لوتھر کی تحریک نے مذہب کے پرانے نظام پر تو ضرب کاری لگائی اور اس سے وہ منتشر ہو کر رہ گیا۔ مگر اُس کی جگہ مذہب و اخلاق کا کوئی ایسا نیا نظام پیش نہ کیا جا سکا جو اس خلا کو پُر کرتا۔ اس کمی کو عوام بڑی شدت کے ساتھ محسوس کر رہے تھے۔ اُن کی حالت یہ تھی کہ پرانے نظام سے وہ متنفر ہو چکے تھے۔ اور اس بنا پر اُس کی طرف کسی صورت میں بھی پلٹنے پر آمادہ نہ تھے۔ بلکہ دوسری طرف وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ تجدید و اصلاح مذہب کے نام پر اُن کے اندر دنیا پرستی راہ پا رہی ہے۔ وہ یہ سوچتے کہ مذہب کا تو کام یہ ہے کہ انسان

کو حیوانی سطح سے بلند کر کے زندگی کی اعلیٰ و ارفع قدروں کا پابند بنائے مگر یہاں مذہب ان بیش قیمت قدروں کو خود رخصت کر کے اُن کی جگہ مادی قدروں کو مسلط کیا جا رہا ہے۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے اُن کی روحیں اضطراب محسوس کر رہی تھیں۔ ان حالات میں ہیگل کے فلسفے نے اُن کی اس طرح دستگیری کی کہ انہیں یہ باور کرایا کہ اضداد کے درمیان امتزاج کی جو شکل تمہارے سامنے آ رہی ہے وہ اخلاقی اور روحانی انحطاط نہیں۔ بلکہ ترقی اور ارتقاء کی صحیح صورت یہی ہے۔ باقی سارے اوہام اور ناقابل عمل تصورات ہیں۔

دوسرے اخلاقی بندھن ٹوٹنے کے ساتھ جرمنی میں ایک ناقابل برداشت انتشار پیدا ہو رہا تھا۔ ان حالات میں قوم کو ایک سلک میں منسلک رکھنے کے لئے کسی ایسی قوت قاہرہ کی ضرورت تھی جس پر عوام نادم اور بے رحم ہونے کی بجائے ہر لحاظ سے مطمئن ہوں اور خوشدلی کے ساتھ اُسے روح مطلق کی کرم فرمائی سمجھ کر نہ صرف اُس کی عظمت و برتری قبول کریں بلکہ دل و جان سے اُس کی اطاعت بجا لینے کے آرزومند رہیں۔

مارکس کو ہیگل کے اس فلسفے کے یہ دو پہلو بڑے پسند آئے اور اس نے جدلی عمل کے نظریے کو قبول کر لیا۔

مادی تعبیر تاریخ

البتہ اُسے ہیگل کا یہ خیال درست معلوم نہ ہوا کہ فرد ایک تصور کو معاشرتی، معاشی اور سیاسی تغیرات کا براہ راست ذمہ دار ٹھہرایا جائے۔ اُس کے لئے یہ جاننا کسی حد تک مشکل تھا کہ روح مطلق آخر کیوں ارتقاء کی منزلیں طے کرتی ہے۔ اُس نے غیر مرئی اور غیر محسوس تصور کے بجائے ذرائع پیداوار کو سارے انقلابات کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ ہیگل کے نزدیک اگر مؤثر طاقت افکار و نظریات کی ہے تو اس کے نزدیک اصل اور فیصلہ کن قوت ذرائع پیداوار کی ہے۔ ہیگل کے خیال کے مطابق اضداد کی جنگ تصورات کے ایوانوں میں لڑی جاتی تھی اور وہاں اس کا جو فیصلہ ہوتا تھا اُس کے مطابق انسان کی اجتماعی زندگی کی تشکیل ہوتی تھی مگر مارکس یہ سمجھتا ہے کہ زندگی کی اصل رزمگاہ معاشی میدان ہے اور اسی میں انسانیت کی قسمت کے فیصلے ہوتے ہیں۔ ذرائع پیداوار کی نوعیت ہی وہ اصل بنیاد ہے جس پر انسان کے اخلاقی اور مذہبی معتقدات اور اُس کے تمدن اور اس کے علوم و فنون کی بالائی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ پیدائش دولت کے مختلف طریقے ہی کسی دور کی ذہنی اور سیاسی زندگی کا ہیولیٰ تیار کرتے ہیں۔ انسانیت کے ارتقاء کی اُس کے نزدیک یہ صورت ہے کہ پہلے معاشی پیداوار کے طریقوں میں تبدیلی ہوتی ہے۔ اس کا براہ راست اثر اسباب زندگی کی تقسیم اور ملکیتی تعلقات پر پڑتا ہے اور اس سے زندگی کی مادی قدریں از خود بدل جاتی ہیں اور اس طرح ایک نیا نظام وجود میں آتا ہے۔ اب دونوں نظاموں میں ہیگل کے جدلی عمل کی طرح کشمکش شروع ہوتی ہے اور بالآخر وہ مصالحت پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد دونوں مل کر ایک ایسے نظام کی بنیاد رکھتے ہیں جس میں تمام صالح اجزا شامل ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا نظام پہلے نظاموں سے ہر لحاظ سے بہتر ہوتا ہے۔ اسی طریق سے انسانیت کا ارتقاء ہو رہا ہے۔

اشتراکیت کے علمبرداروں کے نزدیک اس نظریہ سے نہ صرف انسانی ارتقاء کی شاہراہ معلوم ہوتی ہے بلکہ اس سے اخلاقی اقدار کا ایک نیا تصور بھی سامنے آیا ہے۔ اس کے مطابق دنیا کی ساری صداقتیں اضافی قرار پاتی ہیں یعنی ہر صداقت جس دور کے معاشی حالات سے وجود پذیر ہوتی ہے اس دور کے ختم ہو جانے پر ساقط الاعتبار ہو جاتی ہے۔ ایسی کوئی صداقت نہیں اور نہ ہو سکتی ہے جو ہر زمانے کے لئے یکساں طور پر صحیح اور ابدی ہونے کی دعویدار ہو۔ لہٰذا ہر دور کا اپنا ایک الگ "قرآن" ہے۔ یہ نیک و بد، محمود و مذموم یا حق و باطل کی تفریق سراسر فریب ہے۔ اگر کسی چیز کا وجود کسی دور کے معاشی تقاضوں کے لئے ناگزیر ہے تو وہ مستحسن اور پسندیدہ ہے لیکن یہی چیز اگر معاشی تقاضوں کے بدل جانے سے بیکار ہو جائے تو وہ باطل ہو جاتی ہے اسی طرح ایک فعل جو ایک خاص ماحول میں نیکی تصور کیا جاتا ہے، معاشی ماحول بدل جانے کی وجہ سے برائی نظر آنے لگتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے تمام انسانی تصورات و تخیلات اور اخلاقی اقدار خارجی احوال و واقعات اور خصوصاً معاشی نظام کے رخ زیبا کا عکس ہوتے ہیں۔ اس نظریے کو مارکس تاریخ کی مادی تعبیر کا نام دیتا ہے اور یہی نظریہ اُس کے فکر کی اساس اور بنیاد ہے۔

طبقاتی نزاع •

تاریخ کی مادی تعبیر ہی سے طبقاتی نزاع کے تصور نے جنم لیا۔ مارکس کے نزدیک ہر معاشی نظام جب ترقی کی ایک خاص منزل پر پہنچ جاتا ہے تو اس کے اندر سے ہی بعض نئی پیداواری قوتیں نمودار ہو کر اپنے زمانے کے حالات پیداوار سے متصادم ہو جاتی ہیں۔ نئی قوتیں اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ مروجہ نظام جس طبقاتی تقسیم پر مبنی ہے اُسے بدل کر طبقوں کی تقسیم از سر نو عمل میں لائی جائے اور وہ ملکیتی نظام بھی تبدیل کر دیا جائے جو افراد معاشرہ کے ملکیتی تعلقات کو منضبط کرتا ہے۔ یہ مطالبہ اُن طبقوں پر بہت شاق گذرتا ہے جنہوں نے نہایت ہی عیاری سے مروجہ معاشی تنظیم اور طبقاتی تقسیم میں دوسرے طبقوں سے زیادہ قوت و اقتدار حاصل کر لیا ہے۔ اقتدار کی محبت اور مال کی ہوس انہیں اپنے حقوق سے خواہ وہ کتنے ہی ناجائز کیوں نہ ہوں دستبردار ہونے نہیں دیتی۔ پھر یہ لوگ دولت کے مالک ہونے کی وجہ سے اقتدار کے مالک بھی ہوتے ہیں اس لئے وہ اپنے مفادات کی پوری طاقت کے ساتھ حفاظت کر سکتے ہیں۔ اس طرح ہر معاشرے میں ناجائز استحصال کرنے والوں کا ایک ایسا طبقہ موجود رہتا ہے، جس کی حکومت پشت پناہ ہوتی ہے اور وہ اپنی اس قوت و طاقت سے دوسرے کے خون گرم سے اپنے لئے سامان عیش مہیا کرتا ہے۔ اس لئے جب کسی معاشی تنظیم میں نئی پیداواری قوتیں ابھر کر مروجہ طبقاتی تقسیم کی بنیادوں کو متزلزل کر دیتی ہیں تو یہ طبقے ان قوتوں کو مٹانے اور دبانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں کیونکہ ان طبقوں کی فتح و کامرانی سے برسر اقتدار طبقوں کے مفادات مٹنے لگتے ہیں۔ دوسری طرف وہ طبقے جنہیں قوت لایموت بھی میسر نہیں ہوتی، جو صرف اس لئے جیتے ہیں کہ اپنے قوائے ذہنی اور جسمانی کو اس مخصوص جماعت کی ضروریات و خواہشات کو پورا کرنے کے لئے کھپا دیں وہ جب نئی پیداواری قوتوں کو آتے دیکھتے ہیں تو اُن میں انہیں صبح آزادی طلوع ہوتی نظر آتی ہے، اس لئے وہ بڑی گرم جوشی کے ساتھ اس کا استقبال کرتے ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان قوتوں کی کامیابی کے ساتھ سارا معاشی اور معاشرتی ڈھانچہ اس انداز سے بدل جائے گا کہ استحصال کی گنجائش باقی نہ رہے گی اور اس طرح ان روندے ہوئے اور بے بس طبقوں کو بہتر اور شاد کام زندگی کے مواقع فراہم ہوں گے۔ یہ ہے کشمکش کا وہ انداز جس کے مطابق غالب و مغلوب اور ظالم و مظلوم باہم برسر پیکار رہ کر انسانیت کو ارتقاء اور ترقی کی راہ پر چلا رہے ہیں۔ مارکس کے نزدیک انسانیت کے تمام اہم فیصلے جو زندگی اور اُس کی قدروں کو بدلنے والے ہوں وہ اسی کشمکش کا نتیجہ ہیں۔ اس جنگ میں غالب معاشی طبقہ مروجہ معاشی نظام کا حامی اور رائج الوقت ملکیتی نظام کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اُس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اس نظام کو خواہ وہ کتنا ہی فرسودہ اور بیکار ہو چکا ہو قائم رکھے۔ اس کے برعکس مظلوم طبقے مروجہ معاشی نظام کی سختیوں اور چیرہ دستیوں کی وجہ سے اسے جلد از جلد بدلنے کے متمنی ہوتے ہیں کیونکہ اس کی تبدیلی کے ساتھ ہی اُن کی حالت کچھ بہتر ہونے لگتی ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ تصادم کے وقت دونوں طبقوں کو اس امر کا پوری طرح شعور ہو کہ وہ کسی معاشی غرض کی خاطر آپس میں برسر پیکار ہیں۔ وہ بظاہر بعض دوسرے مقاصد اور اغراض کی خاطر ایک دوسرے سے دست و گریبان ہوتے ہیں۔ مگر یہ محض فریب نظر ہے جب ان اغراض کے پیچھے پردہ جھانک کر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ اغراض خواہ کتنے حسین و جمیل پردوں میں لپٹی ہوئی ہوں، مگر یہ اپنی اصل نوعیت کے لحاظ سے صرف معاشی ہی ہوتی ہیں۔ چنانچہ مارکس اور اینجلز نے اپنے اشتمالی منشور کا آغاز اس دعوے سے کیا ہے۔

"انسان نے آج تک جتنے معاشرے قائم کئے ہیں ان سب کی تاریخ طبقاتی نزاع کی تاریخ ہے، غلام اور آقا، امراء، جمہور، سرمایہ دار اور مزدور، مختصر یہ کہ ظالم و مظلوم ہمیشہ سے ایک دوسرے کے مخالف اور باہم برسرپیکار رہے ہیں"۔

ـت مارکس کا نظریہ سرمایہ دار ذرائع پیداوار کی مدد سے کس طرح غریبوں اور بیکسوں کا خون چوستا ہے۔

نظریہ قدر زائد "قدر زائد" SURPLUS THEORY OF VALUE کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کا خیال یہ ہے کہ کسی چیز کی اصل قدر صرف اسی وجہ سے ہے کہ اس میں انسانی محنت صرف ہوتی ہے۔ چنانچہ محنت کش کے علاوہ جو دوسرا آدمی بھی اس سے کوئی منافع حاصل کرتا ہے وہ ناجائز استحصال ہے۔

صنعتی انقلاب کے بعد جب اشیاء کی پیداوار بڑی سرعت کے ساتھ کثیر پیمانے پر ہونے لگی تو اس میں محنت کار کی اہمیت گھٹ کر ذرائع پیداوار کی اہمیت غیر معمولی طور پر بڑھ گئی۔ یہ ذرائع چونکہ بے حد قیمتی اور گراں تھے اس بنا پر انہیں سرمایہ دار ہی خرید سکتے تھے۔ چنانچہ سرمایہ داروں کی پوزیشن معاشرے میں مضبوط ہوتی چلی گئی اور محنت کار جو ذرائع پیداوار کے مالک نہ تھے وہ ذرائع پیداوار کے مالکین کے ہاتھ میں غلام بن کر رہ گئے۔ سرمایہ دار ان محنت کشوں کی بے بسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جس طرح چاہتے ان کا خون چوستے اور یہ خاموشی سے اپنی بربادی کا تماشہ دیکھتے۔ اپنی اس بیکسی پر خون کے آنسو بھی بہاتے مگر اپنی قابل رحم حالت پر احتجاج تک بھی کرنے کی ہمت نہ پاتے۔ سرمایہ دار ان کی محنت سے یوں ناجائز افادہ کرتا کہ وہ محنت کاروں کو کم سے کم معاوضہ دیتا اور ان کی محنت کے ثمرات کا بیشتر حصہ خود ہتھیا کر لے جاتا۔ اس طرح ایک مختصر سا طبقہ بے بس مزدوروں کی گاڑھے پسینے کی کمائی سے انتہائی امیر ہو جاتا اور یہ محنت کش بے سہارا ہونے کی وجہ سے دن بدن غریب ہوتے چلے جاتے۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں وہ فکری بنیادیں جن پر اشتراکیت کا محل تعمیر ہوا ہے۔

سرمایہ داری اور اشتراکیت کی مشترک اقدار اشتراکیت کے علمبردار اس انقلاب کا بڑے جوش و خروش سے تذکرہ کرتے ہیں اور انسانیت کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ تحریک فکر و عمل کا کوئی بہت بڑا انقلاب لانے میں کامیاب ہوئی۔ آپ ذرا ٹھنڈے دل سے غور کیجئے کہ اشتراکیت نے سرمایہ داری کے برعکس انسانیت کو کونسی نئی اقدار دی ہیں۔ آپ اس معاملے پر جتنا غور کریں گے آپ کو یہی معلوم ہوگا کہ اشتراکیت سرمایہ داری سے کسی اعتبار سے بھی مختلف نہیں۔ لوگ محض اشتراکیوں کے پراپیگنڈے سے مسحور ہو کر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ نظام سرمایہ دارانہ نظام سے مختلف ہے حالانکہ اگر گہری نظر سے اس کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت خود بخود منکشف ہو جائے گی کہ اشتراکیت سرمایہ داری سے الگ کوئی نظام نہیں اور نہ یہ اس کے خلاف کوئی ردعمل ہے بلکہ یہ سرمایہ داری ہی کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے۔ ایک مغربی مفکر شین (G. SHEEN) نے بڑی صحیح بات کہی ہے کہ جن اقدار کو سرمایہ داری پرچون کے بھاؤ بیچتی ہے انہیں اشتراکی نظام تھوک کے بھاؤ فروخت کرتا ہے۔[1]

آیئے اب ایک نظر ان نظریات پر بھی ڈال لیجئے جو سرمایہ داری اور اشتراکیت میں مشترک اقدار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

(۱) سرمایہ داری کا اساسی اصول یہ ہے کہ کسی شئے کی قدر یا کسی فعل کے صحیح اور غلط ہونے کا اصل مدار یہ ہے کہ وہ شئے یا فعل مادی نقطہ نظر سے کس قدر نفع بخش اور مضرت رساں ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں زندگی کے ہر معاملے کو جیب اور پیٹ سے جانچا جاتا ہے اور یہی حال اشتراکیت کا ہے۔ اشتراکیت سرمایہ داری پر البتہ اس اعتبار سے فوقیت رکھتی ہے کہ اس نے اس منافقت کو ختم کیا ہے جو اس نظام میں پائی جاتی ہے۔ جس

---

1 Fulton J. Sheen: *Communism and the Conscience of the West*
Published by Browne and Nolan Ltd.,
Dublin, 1948.

چونکہ اشتراکیت کے علمبردار سرمایہ داری کے تناقضات کہتے ہیں وہ درحقیقت وہ منافقت و دو رنگی ہے جو سرمایہ دار عوام کو بیوقوف بنا کر اور انہیں اپنے جنگل میں گرفتار رکھ کر اُن کی محنت سے ناجائز استحصال کی غرض سے زندگی کے مختلف معاملات میں دکھاتے ہیں۔ مثلاً سرمایہ دار اخلاق کا اس طرح ذکر کرتے ہیں۔ جیسے کہ وہ سب کچھ اس کی خاطر قربان کرنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن عملاً انہیں اخلاق اور مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ زندگی کے سارے مسائل کو مادی اور دنیوی نقطہ نظر سے حل کرتے ہیں اور اُن کے صحیح اور غلط ہونے کا فیصلہ اس معیار کو سامنے رکھ کر کیا جاتا ہے۔ آپ سرمایہ داروں کی دنیا پرستی کا اندازہ اس ایک امر سے لگا سکتے ہیں کہ ان کی مشنریاں بھی عیسائیت کا پرچار کرنے کی بجائے اپنی اپنی حکومتوں کے استعماری عزائم کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل رہتی ہیں اور حکمران انہیں جن گھٹیا مقاصد کے لئے چاہتے ہیں استعمال کرتے رہتے ہیں۔ مادی تقاضوں کے تحت ان مشنریوں نے مذہب کا اس قدر حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے کہ اب اگر کوئی شخص حضرت مسیح علیہ السلام کی صحیح اور اصل تعلیم جاننے کا خواہشمند ہو تو اُسے اس کا علم نہیں ہو سکتا۔

اشتراکیت نے بھی ہمیں یہی بتایا ہے کہ کسی شے یا فعل کی حقیقی قدر اُس کی مادی افادیت ہے۔ اُس نے البتہ جرأت کے ساتھ اُس منافقت کا پردہ چاک کیا ہے جو سرمایہ داروں نے مذہب اور اخلاق کے بارے میں اختیار کر رکھی تھی۔ اُس نے بڑے واضح الفاظ میں کہا کہ انسان کی اصل ضرورت مادی احتیاجات کی تکمیل ہے اور جن ذرائع سے یہ مقصد حاصل ہوتا ہے وہی معاشرے میں فیصلہ کن اہمیت کے حامل ہیں۔ جب انسان نے دنیوی منفعت کام و دہن کی لذت، حسی خواہشات کی تکمیل کو اپنا گوہر مقصود بنا لیا ہے تو پھر جو چیز اس کی راہ میں حائل ہو وہ باطل اور غلط ہے وہ جتنی جلدی مٹ جائے اتنا ہی فرد اور معاشرے کے لئے بہتر ہے۔ اس بنا پر دنیا میں نہ تو کوئی مذہب ہے اور نہ اخلاق اور نہ کسی مافوق الطبیعی ہستی کا وجود جس کی اطاعت ہم پر فرض ہو۔ اس ضمن میں یہ بات ذہن نشین رہے کہ اشتراکی مسرت و افتخار کے ملے جلے جذبات کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ وہ دن دور نہیں جب ایک غیر طبقاتی سماج معرض وجود میں آئے گا۔ اور پھر حکومت اور ریاست کا بھی وجود باقی نہ رہے گا۔ سطح بین آنکھیں انہیں اشتراکیت کی بہت بڑی کامیابی سمجھتی ہیں۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہ حکومت و مملکت اور اس نوعیت کے دوسرے ادارے اگر اپنے فرائض ٹھیک طور پر سرانجام دیں تو یہ انسان کو حیوانیت سے بلند کر کے اُسے ایک اخلاقی اور روحانی سطح پر لا کر صحیح معنوں میں جوہر انسانیت سے ہمکنار کر سکتے ہیں اور جیسے کہ میں نے آغاز میں ذکر کیا ہے کہ یہی انسان کا اصلی شرف ہے۔ لیکن اس کے برعکس اگر انسان کو محض اپنے حسی تقاضوں کی تکمیل کے لئے زندہ اور سرگرم عمل رہنا ہے اور وہ ان تقاضوں کے علاوہ اپنے سامنے کوئی ارفع و اعلیٰ مقصد نہیں رکھتا تو وہ انسان ہونے کے باوجود حیوانیت کی سطح پر زندہ رہتا ہے۔ اب مملکت و ریاست یا تعلیم و تربیت کے دوسرے اداروں کی اس وقت تو ضرورت پیش آتی ہے جب انسان پھر مذہب، اخلاق یا غیر مادی اقدار کو یکسر نظر انداز کر کے خالص حیوانی محرکات کے تحت زندگی بسر کرنے کے ڈھنگ نہیں سیکھتا لیکن جب وہ اس کا عادی ہو جاتا ہے تو پھر یہ سارے ادارے بالکل بیکار بن کر رہ جاتے ہیں۔ جس چیز کو اشتراکی اپنی بڑی فتح و کامرانی سمجھتے ہیں وہ درحقیقت انسانیت پر حیوانیت کی فتح ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اُس دور میں داخل ہو جانے کے بعد خالص حسی محرکات سے سرگرم عمل ہوگا اور ان کے علاوہ کوئی دوسرا محرک اُس کے لئے اپنے اندر کوئی قوت نہ رکھے گا۔ اگر گھاس کے وسیع و عریض میدان ہوں اور جانوروں کو یہ آزادی ہو کہ وہ جس طرح چاہیں اور جہاں چاہیں جا کر چرچگ لیں تو انہیں کسی چرواہے کی ضرورت نہیں ہوتی جو انہیں ہانکتا پھرے۔ ان کی بھوک اور سبزے کی دلکشی عمل کے صحیح محرکات ہیں۔ اسی طرح اگر انسان بھی صرف ان مادی احتیاجات کی تسکین کے لئے زندہ رہنے کا سبق سیکھ رہے اور باقی ماورائی احتیاجات یا محرکات کو ختم کر دے تو پھر وہ کسی سلطنت، مملکت، اجتماعی نظم یا تربیتی ادارے کا محتاج نہیں رہتا ۔۔۔ ان احتیاجات کا وجود اور ان کی تکمیل کے ذرائع اُسے سرگرم عمل کرنے اور اُس کی صلاحیتوں کو ایک راہ پر لگانے

کے لئے کافی ہیں۔

(۴) سرمایہ دارانہ نظام نے ایک محدود پیمانے پر انسانی آزادی کو سلب کیا۔ یہی رجحان غیر معمولی قوت کے ساتھ ہمیں اشتراکی نظام میں نظر آتا ہے
اور اس رجحان کے تجزیہ سے یہ بات پوری طرح نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ اس کے پیچھے ایک ہی احساس ایک ہی جذبہ اور ایک ہی طرزِ فکر کار فرما ہے۔
کا ترجمان ہے جو مذہبی رجحان کی ضد ہے۔ مذہب
یہ رجحان اجتماعی شعور
نے انسان کے بارے میں جو تصور دیا ہے وہ یہ ہے انسانیت کا ہر فرد ایک ذی روح مخلوق ہونے کی بنا پر اپنی الگ شخصیت کا مالک ہے اور
وہ اچھے بُرے جو اعمال بھی کرتا ہے اُسے آخرت میں بحیثیت فرد جزا و سزا دی جائے گی۔ اُسے اگرچہ اجتماعی زندگی کے منجدھار میں اتارا گیا ہے
لیکن اس معاملے میں مقصد یہی ہے کہ اجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو کر اُس کی انفرادیت مستحکم اور مضبوط ہو۔
اس تصور کے برعکس مادیت نے انسان کے بارے میں یہ تاثر دیا ہے کہ وہ مشین کا محض ایک بے بس پرزہ ہے۔ اُس کی جو کچھ بھی افادیت ہے
وہ اس قدر ہے کہ اجتماعی فوائد کے لئے اُسے استعمال کیا جائے۔ یہاں اصل مقصد اجتماعی مفادات کا حصول ہے اور انسان کا ان کی بھینٹ چڑھ جانا
ہی اُس کی کامیابی و کامرانی ہے آپ اگر انسان کے بارے میں ان دو متضاد تصورات کو دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ سرمایہ داری اور اشتراکیت
دونوں اس معاملے میں ایک دوسرے سے پوری طرح متفق ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام بھی فرد کو اجتماعی مفادات کے حصول کا محض ذریعہ سمجھتا ہے
اور اُسے اجتماعی مشین کے اندر صرف ایک کل پُرزہ سمجھ کر اُس سے معاملہ کرتا ہے۔ وہ نہ صرف مادی مصالح کے پیش نظر اُس کی محنت سے ناجائز فائدہ
اٹھاتا ہے۔ بلکہ اُس کے افکار و نظریات، اُس کے احساسات و جذبات اور اُس کے اخلاق و اطوار کی بھی اپنے مفادات کے نقطہ نظر سے صورت گری کرتا ہے
اس میں کوئی شک نہیں کہ سرمایہ داری کے اندر بعض مقامات پر مذہب اور انفرادیت کا نام لیا جاتا ہے لیکن عملاً ان دونوں چیزوں میں
سے کوئی ایک چیز بھی نہیں ملتی۔ سرمایہ دارانہ نظام میں معاشرے کا گویا مقصود ایک ہی ہوتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اشیاء پیدا کر کے مادی اعتبار
سے لوگوں کو خوشحال بنا دے۔ اب اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک محدود سا طبقہ ذرائع پیداوار پر قابض ہونے کی وجہ سے مزدوروں کی محنت سے
قدر زائد کی بہت بڑی مقدار جمع کر کے بے حد امیر ہو جاتا ہے اور پھر اس امارت سے مزدوروں کو مزید ذرائع پیداوار فراہم کرتا ہے اور
انہیں اس طرح محنت و مشقت کے زیادہ مواقع فراہم ہوتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کے علمبرداروں کی رائے یہ ہے کہ اگر یہ طریق اختیار نہ
کیا جائے تو پھر سرمایہ کی تشکیل (CAPITAL FORMATION) ممکن نہیں ہو سکتی۔ اس کی صورت یہ ہے کہ معاشرے میں چھوٹے
چھوٹے اجتماعی مفادات پیدا کئے جائیں اور پھر ان مفادات کی خاطر لوگوں کو قربانیوں پر آمادہ کیا جائے۔ قوم پرستی کا جنون بھی اسی تصور کا
شاخسانہ ہے۔ قوم پرستی سے مراد قوم کی محبت نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے۔ قومی مفادات کو سامنے رکھتے ہوئے ہی کسی نظریہ یا فعل پر صحیح اور غلط
یا محمود و مذموم کا حکم لگایا جائے جو مسلک قوم کے مادی مفاد کے لئے مفید ہو اُسے جائز قرار دیا جائے اور جس کی زد اس مفاد پر پڑتی ہو اُسے
ناجائز سمجھتے ہوئے مسترد کر دیا جائے۔

آپ سرمایہ دارانہ نظام کے اس پورے طرزِ فکر اور طرزِ عمل کو دیکھیں تو یہ بات خود بخود واضح ہو جائے گی کہ سرمایہ دارانہ نظام میں مذہب
کی بجائے اجتماعی شعور ہی ہوتا ہے اور پروفیسر
کے برعکس اصل چیز انفرادی شعور
ٹائن بی کے الفاظ میں فرد معاشرے سے اُس نوعیت کا تعلق رکھتا ہے جو ایک پتے کو درخت سے ہوتا ہے۔ ایک فرد کے نہ تو اپنے کوئی الگ
مفادات ہیں اور نہ اُس کی اپنی کوئی الگ مستقل حیثیت ہے وہ اینٹ اور پتھر کا ایک ٹکڑا ہے جسے اجتماعیت کا معمار جس طرح چاہتا ہے توڑ پھوڑ

کر استعمال کرتا رہتا ہے۔

اشتراکیت سرمایہ داری ہی کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے۔ سرمایہ داری میں چھوٹے چھوٹے طبقوں کے مفادات اجتماعی صورت اختیار کرکے فرد کی انفرادیت سلب کرتے ہیں اور اشتراکیت میں یہی کام نہایت وسیع پیمانے پر کیا جاتا ہے۔ البتہ اشتراکیت کو ایک امتیاز یہ مزید حاصل ہے کہ وہ کھلے بندوں یہ بات کہتی ہے اجتماعی مفادات کا حصول ہی کسی معاشرے کی حقیقی غرض وغایت ہے اور کسی فرد کے الگ اور مستقل کوئی حقوق نہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں ذرائع پیداوار کے مالکین اپنی قوت وطاقت کی وجہ سے محنت کشوں کی مشقت کے ثمرات کا بیشتر حصہ حاصل کر لیتے ہیں۔ اشتراکیت میں یہ کام خود حکومت سرانجام دیتی ہے۔ وہ محنت کشوں سے جس طرح چاہتی ہے فائدہ اٹھاتی ہے اور وہ جو قدر زائد پیدا کرتے ہیں اسے خود حاصل کرتی ہے۔ اگر سرمایہ دارانہ نظام میں بے بس مزدوروں کی بے بسی سے سرمایہ دار ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں تو اشتراکی نظام میں یہ کام بڑے وسیع پیمانے پر کیا جاتا ہے جہاں نہ صرف اُن کی محنت کے مقابلے میں کم معاوضہ دے کر قدر زائد کا بہت زیادہ حصہ خود حکومت حاصل کرتی ہے بلکہ عوام کی بے بسی کے پیش نظر انہیں بیگار کیمپوں میں بھیج کر جبری محنت بھی لی جاتی ہے۔ روس کے ان کیمپوں میں انسانیت کے ساتھ جو انسانیت سوز مظالم ہوتے ہیں اُن کے تصور سے انسان کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔

پھر سرمایہ دارانہ نظام میں چونکہ معاشرہ چھوٹے چھوٹے طبقات میں منقسم ہوتا ہے اس لئے ان کے ناجائز استحصال کا دائرہ بھی اشتراکیت کے مقابلے میں نسبتاً تنگ ہوتا ہے۔ مگر اشتراکیت میں خود حکومت سرمایہ دار بن کر کمزوروں اور بے بسوں پر وہ سارے مظالم ڈھاتی ہے جو سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ دار طبقے ڈھاتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں سنپولیے لوگوں پر عرصہ حیات تنگ کرتے ہیں اور اُن کا خون چوستے ہیں مگر اشتراکیت میں یہ چھوٹے چھوٹے سانپ مل کر ایک خوفناک اژدھے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جو عوام کا لہو پیتا ہے اور دم مارنے کا بھی موقع نہیں دیتا۔ اشتراکیوں کی یہ منطق ابھی تک سمجھ میں نہیں آئی کہ اگر ذرائع پیداوار کی ملکیت ناجائز استحصال کا ذریعہ ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ حکومت ان کی مالک بن کر یہی ظالمانہ روش اختیار نہ کرے۔

مسند اقتدار کوئی ایسا مقدس اور پاکیزہ مقام تو نہیں کہ جس پر براجمان ہونے کے ساتھ ہی انسان کے اندر سے خود غرضی و شقاوت قلبی بالکل ختم ہو جائے اور انسان ہر غرض سے پاک اور ہر خطا سے مبرا ہو کر لوگوں کے درمیان اجتماعی عدل قائم کرے۔ اگر افراد کے لئے ذرائع پیداوار کی ملکیت بے بسوں کے ناجائز استحصال کا ذریعہ ہے تو حکومت اس معاملے میں زیادہ ظالم اور سفاک ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں عوام اس ظلم کے خلاف ایک محدود پیمانہ پر ہی بہرحال صدائے احتجاج بلند کر سکتے ہیں لیکن اشتراکی نظام میں چونکہ حکومت ہی واحد سرمایہ دار ہوتی ہے اور اس کے معاشی مفادات افراد کے ہر دوسرے مفاد پر غالب ہوتے ہیں اس لئے وہاں ناجائز استحصال، استحصال نہیں رہتا بلکہ قومی خدمت بن جاتا ہے اور جو لوگ اس سے ذرہ برابر بھی گریز کریں وہ قوم اور وطن کے دشمن ہونے کی وجہ سے دار ورسن کے مستحق ہوتے ہیں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ اشتراکی ممالک میں ہر کارکن اور محنت کش کو اس کی محنت کے برابر معاوضہ دیا جاتا ہے تو یہ بالکل غلط ہے۔ وہاں بھی ایک مختصر سا طبقہ بے کسوں کی مشقت کے ثمرات کا بیشتر حصہ خود حاصل کر لیتا ہے۔ فرق جو کچھ ہے وہ صرف اسی قدر ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں قدر زائد کا استحصال سرمایہ دار طبقے کرتے ہیں مگر اشتراکی نظام میں یہ فرض حکومت براہ راست سرانجام دیتی ہے اور اسی وجہ سے اس کا پیمانہ بڑا وسیع ہوتا ہے۔ چنانچہ دیکھئے کہ قدر زائد کے استحصال سے سرمایہ دارانہ ممالک میں جس مقدار اور رفتار سے تشکیل سرمایہ ہوتی ہے اور اس کے نتیجے میں وہاں جتنی مادی ترقی ہوتی ہے، اشتراکی ممالک اس استحصال میں غیر معمولی رفتار کی وجہ سے چند سالوں میں سرمایہ دارانہ ممالک پر سبقت لے گئے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ جس غیر معمولی حد تک

اور استبداد کے ساتھ اور جس منظم طریق سے اشتراکی ممالک میں انسانوں کو بے بس بنا کر اُن کی محنت کا استحصال ممکن ہے وہ سرمایہ دارانہ ممالک میں ممکن نہیں ہوتا کیونکہ ان ممالک میں مختلف طبقات ہونے کی وجہ سے حکومت کی گرفت عوام پر اتنی مضبوط نہیں ہوتی جتنی کہ اشتراکی ممالک میں ہوتی ہے۔

اشتراکیت نے انسانیت کو ایسی کوئی نئی قدر نہیں دی جو ہمیں سرمایہ دارانہ نظام میں نہ ملتی ہو۔ جن مقاصد کی تکمیل کے لئے سرمایہ دارانہ نظام قائم ہے انہیں کے حصول کے لئے اشتراکیت سرگرم عمل ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جن منازل کو سرمایہ دارانہ نظام نے بڑی سست رفتاری کے ساتھ طے کیا ہے اُن منازل کو اشتراکیت برق رفتاری کے ساتھ طے کر رہی ہے۔ چونکہ اُس کی گرفت سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلے میں کہیں زیادہ مضبوط اور اس کا دائرہ اختیار کہیں زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ اس لئے یہ صدیوں کے رچے بسے معتقدات اور راسخ عادات کو بڑی تیزی کے ساتھ اکھاڑ پھینکتی ہے۔ اس کی یلغار بڑی تیز ہے۔ اور جب یہ کسی معاشرے کا رخ کرلیتی ہے تو پھر وہ حیرت انگیز سرعت کے ساتھ مغربی معاشرت کا ایک نمونہ بن جاتا ہے۔ اس حقیقت کا ایک مفکر نے مندرجہ ذیل الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔

"روایات کے علمبردار وہ معاشرے جہاں سرمایہ دارانہ انقلابات کا آنا بے حد ضروری تھا مگر روایت کے بند صنوں نے انہیں آنے نہ دیا وہاں آج بیسویں صدی میں اس نوعیت کے انقلابات کے لئے اشتراکیت سب سے مؤثر حربہ اور سب سے اچھا بدل ہے یہ نظام بے شک ظالمانہ، کلیت پسندانہ ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ اُن رجعت پسندانہ اور پس ماندہ معاشروں کو جو اہم تاریخی تبدیلیوں کے لئے تیار ہی تھے، صنعتی ترقی اور جدید بنانے یا اُنہیں سائنسی، معاشی، تعلیمی اعتبار سے مغربی بنانے کا ایک نہایت کامیاب ہتھیار ہے چونکہ اس نظام میں نہایت گہری روایات کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کی قوت موجود ہے اس بنا پر اس نے نئے صنعتی معاشرے کی تعمیر میں غیر معمولی طاقت فراہم کی ہے اس میں نہ صرف پوری قوم کو سرگرم عمل کرنے کی بے پناہ صلاحیت ہے۔ بلکہ اس نے پورے معاشرے کو زیر و زبر کر دیا ہے اور جو جماعت یا طبقہ اس کی راہ میں حائل ہوا ہے اُس کے دعووں کو سختی کے ساتھ دبا دیا ہے اور اس کے نتیجے میں انسان کو جو مصائب پیش آئے یا اُسے جتنے دکھ اٹھانے پڑے ہیں انہیں وحشیوں کی سی بے حسی کے ساتھ نظر انداز کر دیا ہے۔"

اشتراکیت نے اپنے بطن سے ایک ریاستی سرمایہ داری یا ریاستی بیوروکریسی کو جنم دیا ہے جو مغربی استعداد کار اور صلاحیت کے ساتھ ایک صنعتی معیشت کا خاکہ تیار کرنے، اور پھر اسے اُس کے تقاضوں کے مطابق چلانے میں مہارت رکھتی ہے۔ ریاستی سرمایہ داری کی تخلیق اشتراکیت کی بہت بڑی کامیابی ہے۔ کیونکہ اس کی مدد سے صنعتی انقلاب اور مادی قوت کی فراہمی کے خواب شرمندہ تعبیر ہو سکتے ہیں۔ یہ نیا نظام درحقیقت انیسویں صدی کے اُن کے پرانے سرمایہ دارانہ نظام کی ایک جدید، زیادہ ظالمانہ، زیادہ طاقت ور اور زیادہ مجتمع صورت ہے۔ اس نظام کو چونکہ سرمایہ دارانہ نظام کے اصل کام کو بڑی برق رفتاری کے ساتھ ایسے ممالک میں سرانجام دینا ہے جو اُن حیات آفریں تحریکات سے ناآشنا ہیں جنہوں نے مغرب کے تصور آزادی کے لئے مناسب ماحول فراہم کیا، پھر چونکہ اسے تغیر و تبدل کے ایک ایسے پروگرام کو جسے سرمایہ دارانہ نظام نے صدیوں کی تگ و دو کے بعد پایہ تکمیل تک پہنچایا، مختصر سی مدت میں عملی جامہ پہنانا ہے اس لئے اسے لازمی طور پر جبر و استبداد کا رویہ اختیار کرنا ہوگا۔

اشتراکیت اپنے داخلی عمل میں ایک بڑا متضاد نظام ہے۔ یہ ظلم و استبداد کے خلاف ظالمانہ ہتھکنڈوں سے نبرد آزما ہوتا ہے اس کا مطمح نظر انسانوں کو مغربی اقدار کا پرستار بنانا ہے لیکن یہ بڑی سفاکی کے ساتھ انہیں مغرب سے علیحدہ رکھنے کی بھی کوشش کرتا ہے ...... آغاز میں یہ لوگوں کو دولت سے محروم کر کے دولت جمع کرتا ہے ..... اس کا سب سے بڑا مقصد پوری دنیا کو مغربی معاشرے کے ساتھ ہم رکاب کرنا یا اس کی تقلید اور نقالی

پر آمادہ کرتا ہے لیکن ظاہری طور پر وہ اُس کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہے۔؎

اشتراکیت کے تناقضات

ہم گذشتہ صفحات میں یہ بات وضاحت کے ساتھ بیان کر چکے ہیں کہ اشتراکیت نے انسان کے بارے میں بڑا پست تصور پیش کیا ہے۔ اور اُس کا یہ تصور سرمایہ داری سے کسی طرح بھی مختلف نہیں۔ اس کے عزائم اور مقاصد بھی وہی ہیں جو سرمایہ دارانہ نظام کے ہوتے ہیں۔ یہ نظام بھی سرمایہ داری کی طرح بے بسوں کی محنت کے استحصال سے نشوونما پاتا ہے۔ اس نظام میں بھی لاتعداد تناقضات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً:

۱۔ مارکس اس بات کا دعویدار ہے کہ دنیا میں کوئی نظریہ بھی ایسا نہیں جسے ابدی کہا جا سکے۔ ہر بات ایک مخصوص ماحول کے معاشی حالات کے لئے تو درست ہو سکتی ہے لیکن حالات بدل جانے کی وجہ سے وہ ساقط الاعتبار ہو جاتی ہے۔ اُس کے نزدیک ہر دور کی اپنی انجیل اور ہر عہد کا اپنا "قرآن" ہوتا ہے وہ اس نظریہ کو بڑی شدومد کے ساتھ پیش کرتا ہے اور اس بنا پر ساری صداقتوں کو اضافی چیزیں سمجھ کر ان کی افادیت کو زمان و مکان اور معاشی حالات کے تابع بناتا ہے۔ لیکن وہ اپنے نظریات کو ابدی قرار دیتا ہے اور تاریخ کی مادی تعبیر کو ایک ایسی صداقت کے طور پر پیش کرتا ہے جو ہر دور اور ہر عہد کے لئے سچائی کا واحد معیار ہے اور جو کسی زمانے میں بھی جھٹلائی نہیں جا سکتی۔

۲۔ دوسرے اس کارخانۂ حیات میں انسان کے معاشی تقاضوں کی تکذیب نہیں کی جا سکتی۔ ہر باشعور انسان اُن کی اہمیت کو پوری طرح محسوس کرتا ہے۔ مارکس سے جو کچھ اختلاف ہے وہ صرف یہی کہ کسی دور کے ذرائع پیداوار اُس عہد کے سیاسی، معاشرتی اور مذہبی حالات کا ہیولیٰ تیار کرتے ہیں۔ یہ بات کئی اعتبار سے غلط ہے۔

(۱) اگر آپ یہ مان لیتے ہیں کہ کسی خاص دور کے انسانی شعور کی تشکیل اُس دور کے ذرائع پیداوار کرتے ہیں تو پھر آپ کو لازمی طور پر یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ اُس عہد کے سارے انسانوں کے سیاسی، سماجی اور مذہبی حالات ایک جیسے ہونے چاہئیں۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے درمیان عظیم فرق پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم یہاں صرف ایک پہلو کی نشان دہی کرتے ہیں۔

مارکس نے تاریخ انسانی کو جن مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے اُس کے مطابق رومی اور قرنِ اولیٰ کے مسلمان معیشت کے ایک ہی دور میں تھے۔ یعنی دونوں اقوام میں غلامی کا رواج تھا، پیدائش دولت کے طریق بھی دونوں کے ہاں ایک جیسے تھے۔ مارکس کے نظریہ کے مطابق ان دونوں اقوام کے فکرونگاہ کے زاویئے، اُن کے اخلاقی تصورات، اُن کے سیاسی اور معاشی رجحانات، اُن کے معاشرتی ڈھانچے اور اُن کے عزائم ایک سے ہونے چاہئیں لیکن تاریخ کے اوراق اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ ان دونوں قوموں کے درمیان اخلاقی اور ذہنی ہم آہنگی تو کیا کوئی ایک چیز بھی قدرِ مشترک کی حیثیت نہیں رکھتی۔

(ب) پھر اس نظریہ کا یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ جب مارکس یہ کہتا ہے کہ انسان اپنے معاشی ماحول کے ہاتھ میں بالکل بے بس ہے اور خارجی حالات اُس کے فکرواحساس کے سانچوں کو اپنے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہتے ہیں اور انسان اس معاملے میں بے بس ہے تو پھر اُس کے کسی فعل کو غلط یا صحیح قرار دینا بالکل بے معنی ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سرمایہ داروں نے غریبوں کو لوٹنے اور اُن کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے لئے جن جن مظالم کا ارتکاب کیا اُن میں وہ بالکل حق بجانب تھے کیونکہ انہوں نے جو کچھ کیا وہ سب اُس عہد کے معاشی حالات کا نتیجہ تھا۔ اگر یہ بات درست ہے تو پھر مارکس اور اُس کے متبعین کس منہ سے سرمایہ دارانہ نظام کی چیرہ دستیوں کا ذکر کرتے تھے۔ مارکس کے اس اصول کی رُو سے

؎ صفحہ ۲۲۲ تا ۲۲۵

دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اُس سب کو مبنی بر انصاف ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ سرمایہ دار اپنی معاشی لوٹ کھسوٹ میں، سامراج کے نمائندے
محکوم قوموں پر اپنی نسبت اور اپنے جابرانہ افعال میں اس طرح مجبور ہیں جس طرح اشتراکی حضرات اپنی انقلاب انگیزی میں۔

(ج) تاریخ کی مادی تعبیر پر ایک بہت بڑا اعتراض نفسیاتی نقطہ نظر سے بھی وارد ہوتا ہے۔ مارکس کا دعویٰ یہ ہے کہ ذرائع پیداوار کسی دور کے انسانوں کے ذہنی شعور کی صورت گری کرتے ہیں۔ چلیے ایک لمحے کے لئے مارکس کے اس دعوے کو تسلیم ہی کر لیتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا انسان اپنی پوری زندگی شعور کی سطح پر ہی گذارتا ہے۔ انسانی نفسیات کے مطالعہ سے ہمیں جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کے دماغ کی کیفیت برف کے ایک بہت بڑے تودے کی طرح ہے جس کا دسواں حصہ سطح آب سے باہر ہوتا ہے اور باقی نو حصے اُس کے نیچے چھپے ہوتے ہیں شعور کا جو کچھ تعلق ہے وہ صرف اس حصے سے ہے جو پانی کی سطح پر نمایاں ہے لیکن دماغ کا وہ نوے فیصد حصہ جسے لاشعور اور تحت الشعور کہتے ہیں اُس کے بارے میں مارکس یا اشتراکیت کوئی واضح چیز نہیں کہتی حالانکہ وہ حصہ شعور کے مقابلے میں انسانی زندگی پر کہیں زیادہ گہرے اثرات مترتب کرتا ہے۔

(د) اگر انسان کی معاشرتی سیاسی مذہبی اور اخلاقی زندگی کے ارتقاء کو ذرائع پیداوار کی کرشمہ سازی مان لیا جائے تو پھر پوری انسانی تاریخ غلط ہو جاتی ہے۔ انسان نے جس دن سے فطرت کے راز ہائے سربستہ کا کھوج لگانے کی سعی کی ہے اُسی روز سے وہ ذرائع پیداوار کو بہتر بناتا چلا جاتا ہے۔ پہلے پہل اُس نے ہاتھ سے کام کرنا شروع کیا، پھر مویشیوں کو استعمال کیا، پھر بھاپ کے دیو کو مسخر کر کے اُس سے خدمت اور چاکری لینے کے دور آئے۔ آپ اگر ان ذرائع کی ترقی کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہر نیا دور پہلے سے بہتر ہوتا ہے۔ اب اگر سیاسی، معاشرتی اور مذہبی زندگی ان کی اساس پر تشکیل پاتی ہے تو اس کے ارتقاء کی ایک متعین صورت ہونی چاہیئے۔ لیکن ہم اس کے ارتقاء کا کوئی خاص ڈھب اور وضع دار انداز نہیں دیکھتے۔ اس حقیقت کی وضاحت کے لئے ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ اگر مذہب کو ذرائع پیداوار کا عکس قرار دیا جائے تو اس کے معتقدات اور اس کے ضابطہ اخلاق کو ایک خاص نہج سے بدلنا چاہیئے۔ مثلاً ایک خاص عہد کے معاشی حالات نے متعدد خداؤں کا تصور دیا ہے تو لازمی طور پر ان حالات کی تبدیلی سے خداؤں کی تعداد بھی بدلتی رہنی چاہیئے جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ رومی اور قرن اوّل کے مسلمان ذرائع پیداوار کے اعتبار سے ایک ہی منزل پر تھے۔ لیکن رومیوں کے ہاں لاتعداد دیوتاؤں کی پرستش ہوتی تھی اور ان کے مقابلے میں مسلمانوں کے ہاں توحید کا تصور پوری طرح راسخ تھا۔ مسلمان ان چودہ سو برسوں میں آخر کتنے مختلف معاشی ادوار سے گذرے ہیں اور اُن کے معاشرے نے ذرائع پیداوار کی کتنی ہی تبدیلیاں دیکھی ہیں۔ لیکن ان کا تصور توحید اُسی طرح قائم ہے پھر یہ دیکھئے کہ اگر یہ تصور ایک خاص نوعیت کے معاشی حالات کی پیداوار ہے تو اسلام سے پہلے ادوار میں یہ تصور نہ ہونا چاہیئے تھا مگر ہمیں تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تصور اسلام سے پہلے بھی دنیا کی مختلف قوموں میں موجود رہا اور اب تک موجود ہے کیا یہ سارے شواہد اس حقیقت کے آئینہ دار نہیں کہ ذرائع پیداوار انسان کی معاشرتی، معاشی، سیاسی اور مذہبی زندگی کی صورت گری نہیں کرتے۔ بلکہ ان کی تشکیل میں بعض دوسرے عناصر، جو ان سے کہیں زیادہ قوی ہیں، کارفرما ہوتے ہیں اور ان کی حیثیت بہت سے عوامل میں سے ایک کی ہے۔

(ہ) اس ضمن میں ایک اور چیز بھی سامنے آتی ہے کہ اگر ذرائع پیداوار کی تبدیلی سے زندگی کا سارا نہج بدل جاتا ہے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ذرائع پیداوار کی تبدیلی کن قوتوں کی رہین منت ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جس شعور کو خود ذرائع پیداوار نے جنم دیا ہے وہ تو تبدیلی کا محرک نہیں بن سکتا۔ وہ محرک تو وہی چیز ہو سکتی ہے جو شعور سے بالاتر ہونے کی بنا پر انسانوں کے اندر اس بات کی تحریک پیدا کرے کہ وہ

ذرائع پیداوار میں تبدیلیاں لائیں۔ اشتراکیت کے پورے لٹریچر میں اس سوال کا جواب نہیں ملتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ذرائع پیداوار انسانی زندگی اور اس کے مختلف شعبوں پر اثر انداز ہوتے ہیں مگر اُس کی تشکیل نہیں کرتے۔ اُس کی تشکیل زیادہ تر اُس قوم کے آئیڈیل کی منت کش ہوتی ہے جسے وہ قوم اپنانے کا سچا عزم لے کر اٹھتی ہے اور پھر اس کے حصول کے لئے جدوجہد بھی کرتی ہے۔ جس طرح ایک مصور تصویر کشی میں مختلف رنگوں سے کام لیتا ہے مگر اس سے یہ نتیجہ کبھی نہیں نکالا جا سکتا کہ مصور کے مختلف رنگ ہی اُس کے آرٹ کے خالق ہیں پیدائشی قوتیں اور حالات پیداوار ایک دوسرے پر اسی طرح اثر انداز ہوتے ہیں جس طرح نئے اسلحہ کی ایجاد طریق جنگ کو متاثر کرتی ہے مگر اس سے اگر کوئی یہ سمجھ بیٹھے کہ جنگ کے شعلوں کو بھڑکانے کا سب سے بڑا محرک اسلحہ کی تبدیلی اور فوجی تنظیم میں تغیر ہے اور دنیا کے عسکری ارتقاء کا یہی ایک سبب ہے تو اس سے زیادہ کوتاہ اندیشی اور کیا ہو سکتی ہے۔ اصل میں انسانی زندگی کو محض ایک ہی نوعیت کے خارجی محرکات کا نتیجہ قرار دے دینا بڑی تنگ نظری ہے۔ مارکس نے یہ فلسفہ صرف اس لئے گھڑا کہ اس کی وجہ سے انسانی زندگی کے بارے میں معروضیت (OBJECTIVITY) قائم ہو جائے گی اور پھر اُس کے افکار و نظریات احساسات و جذبات اور افعال و اعمال کی کیفیات کا جائزہ لینا اور اُن کی نوعیت دریافت کرنا علم طبیعیات کے اصولوں کے کھوج لگانے کی طرح آسان ہو جائے گا۔ اور انسان کو اس طرح کسی مافوق الطبعی ہستی کی رہنمائی کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ مارکسی فکر کی سب سے نمایاں خوبی یہ نہیں کہ اس نے انسان کو زندگی کی کوئی حیات آفریں قدریں دیں بلکہ اس کا اصل کام یہ ہے کہ مادیت کے علمبردار مذہب کا نام لینے کی وجہ سے جن فکری انتشار میں مبتلا تھے اُس نے انہیں نجات دلائی خواہ خود انہیں اُن سے زیادہ پریشانیوں میں گرفتار کیا۔

مارکس، لینن کی تصنیفات کے علاوہ جن کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے وہ درج ذیل ہیں۔

(1) FULTON. J. SHEEN: COMMUNISM AND THE CONSCIENCE OF THE WEST. PUBLISHED BY BROWNE AND NOLAN LIMITED, DUBLIN, 1948.

(2) HENRY BAMFORD PARKES: MARXISM AN AUTOPSY PHOEXNIX BOOKS THE UNIVERSITY OF CHICAGO PRESS; CHICAGO & LONDON

(3) JOHN MACMURRAY: THE PHILOSOPHY OF COMMUNISM. LONDON, FABER & FABER LIMITED.

(4) ROBERT V. DANIELS: THE NATURE OF COMMUNISM. NEW YORK 1963.

(5) EUGENE KAMENKA: THE ETHICAL FOUNDATIONS OF MARXISM ROUTLEDGE & KEGAN PAUL. LONDON

اس کتاب پر اشتراکیوں کو بڑا ناز ہے۔ اس میں سب سے دلچسپ بحث وہ ہے جس میں مصنف اشتراکیت کو آزادی کا علمبردار ثابت کرتا ہے۔ میں نے اپنے مضمون میں اس آزادی کی نوعیت پر تفصیل سے بحث کی ہے۔

(6) E. LAMPERT: STUDIES IN REBELLION ROUTLEDGE & KEGAN PAUL LONDON

اس کتاب کا مقدمہ بڑا فکر انگیز ہے۔

(7) HERBERT WILDON CARR: *THE UNIQUE STATUS OF MAN*

MACMILLAN AND CO, LIMITED, 1928.

یہ کتاب پرانی ہونے کے باوجود مطالعہ کے لائق ہے خصوصاً اس کے دو ابواب

THE SCIENTIFIC MATERIALISM

اور

THE PRINCIPAL OF RELATIVITY

(8) SIDNEY HOOK: MARX AND MARXISTS (*THE AMBIGUOUS LEGACY*)

TORINTO, NEW YORK, LONDON.

یہ کتاب اشتراکیت کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے بطور ایک ابتدائی کتاب بڑی مفید ہے ۔

(9) JOHN LEWIS: MARXISM AND THE IRRATIONALISTS

LONDON 1955.

(10) ANDREW GYORGY: ISSUES OF WORLD COMMUNISM.

یہ کتاب اشتراکیت کے جدید مسائل کو سمجھنے کے لئے بے حد ضروری ہے ۔

(11) MAX EASTMEN: REFLECTIONS ON THE FAILURE OF SOCIALISM

NEW YORK 1955.

(12) WOLFGANG LEONHARD: *THE KREMLIN SINCE STALIN.*

یہ کتاب بھی اشتراکیت کے جدید رجحانات پر بحث کرتی ہے ۔

(13) M. CONFORTH: MATERIALISM AND THE DIALECTICAL METHOD

LAWRENCE & WISHART LTD LONDON.

اس کتاب کی تین جلدیں ہیں مادی جدلیت کو سمجھنے کے لئے یہ کتاب اساس کا کام دیتی ہے اشتراکی نقطۂ نظر سے جدید لٹریچر میں اس کی مثال نہیں۔ کتاب کا انداز بیان نکھرا ہوا اور واضح ہے ۔

(14) ISACC DENTNTES: *THE PROPHET UNARMED: TROTSKY: 1921–1929*

LONDON 1959

(15) DOUGLAS HYDE: *THE PEACEFUL ASSAULT*

THE BODLEY HEAD, LONDON 1963.

(16) MAURICE CORNFORTH: PHILOSOPHY FOR SOCIALISM

یہ مختصر سا کتابچہ کتاب نمبر ۱۳ کا خلاصہ ہے ۔

(17) GILLES MARTINET: MARXISM OF OUR TIME
OR
THE CONTRADICTIONS OF SOCIALISM

(18) REYNARD ARON: THE OPIUM OF THE INTELLECTUALS
DOUBLEDAY & CO NEW YORK 1957

(19) JEANE J. KIRK-PATRICK: THE STRATEGY OF DECEPTION
NEW YORK.
یہ کتاب دورِ جدید میں اشتراکیوں کے ہتھکنڈوں کو سمجھنے کے لئے مفید ہے۔

قاضی عبدالقادر

مارکسی نظام میں مغائرت کا تصور

یہ خاصی حیرانی کی بات ہے کہ مارکس کے تصورات کی شرح اور ان پر تنقید کرنے والوں نے مارکس کے ہیگل سے مستعار جدلیاتی طریقے کو تو سامنے رکھا لیکن اس سے پیدا ہونے والے اہم سماجی اور فلسفیانہ تصور "مغائرت" (ALIENATION) کو نظر انداز کر دیا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہو کہ شارحین مارکس کے لئے مارکسی فکر کا محور بڑے سماجی گروہ اور ان کے داخلی معاشی رشتے تھے نہ کہ بین الافرادی تعلقات۔ یوں یہ کہا جا سکتا ہے اور کہا بھی گیا ہے کہ اس نظام میں افراد کے باہمی رشتے معاشی حالات سے متعین ہوتے ہیں لیکن کہنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ معاشی رشتہ کوئی خود توجیہی تصور نہیں اور اس کی تفسیر و توجیہہ بھی تصور مغائرت ہی سے ممکن ہے۔

دوسرا سبب اس تصور کو نظر انداز کرنے کا یہ ہو سکتا ہے کہ خود مارکس نے مغائرت کو سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف استدلال کے طور پر پیش کیا ہے اور اس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ مارکسی نظام میں اس تصور کی حیثیت منفی ہے اور یہ کہ خود یہ نظام مغائرت سے پاک و آزاد ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ ہمارا استدلال یہ ہے کہ اگر مارکسی نظام ہیگلی جدلیت پر استوار ہے تو وہ مغائرت سے عبارت ہے اور اس اعتبار سے وہ سارے اعتراضات، جو مارکس نے سرمایہ داری پر کئے تھے خود اس کے نظام پر وارد ہوتے ہیں اور جس قسم کے "پر مسرت" سماج اور معاشرہ کی مارکس نے توقع کی تھی وہ خواب و خیال ہو جاتا ہے۔

مارکس کے خیال میں ہیگل کے یہاں فرد ایک خود آفریدہ ہستی ہے جو ایک تاریخی عمل میں خودی کی تخلیق و تشکیل کرتی ہے۔ "محنت" اس خود آفرینی کے عمل کی قوت محرکہ ہے۔ محنت یا انسانی عمل و کوشش کی زندگی سماج و معاشرہ میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس محنت و عمل سے ہی فرد کی زندگی عبارت ہے۔ لیکن ہیگل نے اس عمل و کوشش اور فعالیت کو اپنے انتہائی نظام میں فرد سے جدا، غیر اور مافوق الانسانی مقام دے دیا۔ اور اس فوق انسانی اصول کی روشنی میں کائناتی پیمانے پر کھیلے جانے والے عظیم ڈرامے میں انسان کو ایک غیر اہم کردار سمجھ لیا۔ مارکس نے بتایا کہ اس طرح فرد و انسان کی حیثیت دوسرے درجہ کی ہوگئی اور وہ اپنی انفرادیت کھو کر ایک مشینی کل پرزہ بن کر رہ گیا۔

مارکس کے خیال میں سماجی علائق اور رشتوں کو فوق الفطری حیثیت دینا قطعی نامناسب اور نادرست ہے اور ایسا کرنے سے سماجی التباسات انتشار اور مایوسیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس عمل کو مارکس نے مغائرت کہا، جو اس کے مطابق فرد کی قوتوں اور صلاحیتوں کو اس سے جدا ایسی مستقل بالذات ہستی یا ہستیاں سمجھتا ہے جو اس کے فکر و عمل پر تصرف رکھیں اور چاہے وہ ہیگل کا نظام فکر ہو، بورژوائی اور سرمایہ دارانہ طرز معیشت ہو یا روایتی مذہب سب مغائرت سے مملو ہیں۔ اور ان سارے مدارس و مسالک میں فرد کی حیثیت ثانوی ہے۔

فیورباخ اور تصور مغائرت | مارکس نے مغائرت کے اس تصور کی ابتدا فیورباخ کے خیالات سے منسوب کی ہے۔ فیورباخ نے ہیگلی نظام میں مطلق کو

اپنے غیر فطرت میں جلوہ گر ہونے کے عمل کو "مغائیرت" ثابت ہو بتایا ہے کہ یہ چیز مذہبی سطح پر انسانی خیالات و احساسات، خواہشات اور جذبات کی تجسیم میں ظاہر ہوئی ہے۔ وہ ساری ما فوق الفطرت ہستیاں جو ہندی، مصری، یونانی صنمیاتی MYTHOLGICAL مذہبوں میں فوق انسانی مقام اور تقدس رکھتی ہیں، فیور باخ کی نظر میں انسانی احساسات کی کرشمہ سازی اور اس کی تخیلی جلوہ گری قرار دی جاتی ہیں گی۔ مذہبی حقائق کے اس انکار میں فیور باخ کے فلسفہ علم کا یہ عجیب غریب مسئلہ چھپا ہے کہ کسی "موجود" کے بارے میں اثبات اس امر کی دلالت کرتا ہے کہ وہ شے صرف غور و فکر ہی میں نہیں لائی جا سکتی بلکہ وہ محسوس بھی ہو سکتی ہے اور مدرک بھی۔ قطع نظر اس بات کے کہ فیور باخ کے اس فلسفیانہ موقف کو قبول کر لیا جائے تو منطق اور ریاضی کے وجود تک سے انکار کرنا پڑے گا۔ کیونکہ یہ تو بہر حال صحیح ہے کہ منطقی اور ریاضیاتی تصورات اور حقائق محسوسات میں سے نہیں اور نہ ہی ان کا حسی ادراک ممکن ہے۔ جس چیز کی طرف فیور باخ توجہ دلانا چاہتا ہے اور خود جسے مارکس نے قبول کیا وہ ان تصورات اور خیالات کی منطقی اور فلسفیانہ حیثیت کا تعین نہیں بلکہ ان کا انتشار و صدور تجربی اور حسی حقائق سے نہ ہوتا ہو اور ان کے لئے کہا کہ وہ ہماری جولانی فکر کا نتیجہ ہیں۔

اس حد تک تو فیور باخ کو زیادہ اعتراض نہیں۔ البتہ وہ کہتا ہے کہ غلطی اس جگہ ہوتی ہے کہ ہماری متخیلہ کے تراشیدہ اصنام کو ہم صفت وجودی دے دیتے ہیں۔ ان کو وہی مقام دیتے ہیں جو زمان و مکان میں خود ہمیں حاصل ہے۔ اور خیالات و تصورات کو متشخص اور مجسم کر دیتے ہیں۔ بالآخر انسان اپنے ہی ہاتھوں سے تراشے ہوئے ان اصنام کا پجاری بن جاتا ہے۔ یہ اصنام جن کی صورت گری انسان کی جمالیاتی حس اور اس کے صناع ہاتھ کرتے ہیں آخر کار ایسا تقدس حاصل کر لیتے ہیں کہ یہ خیال کیا جانے لگتا ہے کہ انسان کی زندگی اس کے اغراض و مقاصد اور خود اس کا عدم و وجود انہیں مقدس پیکروں پر منحصر ہے۔

اس بت گری کی وجہ فیور باخ کی نگاہ میں ہماری ناآسودہ خواہشوں اور تمناؤں کی تسکین کی خواہش ہے جن کے بارے میں یہ یقین کیا جاتا ہے کہ وہ ہم سے پوری نہیں ہو سکتیں تو وہ کسی اور کی مدد یا واسطہ سے پوری کی جا سکتی ہیں۔ اس طرح مذہبی جذبہ گویا خواہشات و احساسات کو ایک خارجی صورت دینے سے (ENTOUSSERUNG = EXTERNALIZATION) عبارت ہے۔ مارکس نے، جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے، زر و دولت کے بارے میں یہی کچھ کہا ہے۔ بہر حال فیور باخ اسی چیز کو یعنی عام انسانی خواہشوں اور ان کی حقیقی کے بجائے خیالی تسکین و آسودگی کو "خود سے گزر جانا" کہتا ہے۔ انسان کے لئے لازم ہے کہ وہ خود کو اس کیفیت سے آزاد کرے، ورنہ آزادی ان التباسات کو التباس سمجھ کر حقیقت کی دنیا میں قدم رکھنے سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ ان التباسات سے آزادی حاصل کرنے کے عمل میں فرد ان تعصبات سے بھی چھٹکارا حاصل کرے گا جس میں وہ عام طور پر پھنسا رہتا ہے۔

مارکس کا تصور

لیکن انسان کن تعصبات میں پھنسا رہتا ہے اور کن سے آزادی اسے حاصل کرنی ہے۔ اس کی صراحت فیور باخ نے نہیں کی۔ یہ کام مارکس نے اپنے ذمہ لیا۔ فی الحقیقت مارکس کا "مقالہ بر فیور باخ" اس جگہ سے شروع ہوتا ہے جس جگہ فیور باخ کی "عیسائیت کی روح" ختم ہوتی ہے۔ فیور باخ نے مغائیرت اور خارجیت کو مذہبی تصورات کی تحلیل و توجیہہ کے لئے استعمال کیا تھا اور بتایا تھا کہ مغائیرت مذہبی سطح پر عمل کرتی نظر آتی ہے۔ لیکن مارکس نے مذہبی تصورات کو سماجی اور معاشی خاکے میں رکھ کر کل سماجی زندگی کو مغائیرت سے مملو قرار دیا۔ اس طرح مغائیرت کی دوسری اہم صورتیں سامنے لانے کی کوشش کی جن کی طرف فیور باخ کی توجہ نہیں گئی تھی۔ فیور باخ نے مذہب سے آزاد ہونے کے لئے تعقلیت کا سہارا لیا تھا۔ لیکن مارکس نے کل زندگی کو کم از کم وہ زندگی جو سرمایہ دارانہ معیشت پر بنائی جائے مغائیرت میں رنگی ہوئی قرار دیا۔ فیور باخ کے نظریاتی حل کے بجائے عملی اور معاشی حل کی سفارش کی۔ مارکس کا استدلال یہ تھا کہ مذہبی عالم سماج کا آفریدہ ہے اور سماج و سماجی زندگی اساسی طور پر عملی اور معاشی ہے۔ لین دین کے ڈھنگ، محنت کا استعمال اور انسانی صلاحیتوں کی بار آوری ہی وہ حقائق ہیں جن پر سماجی زندگی کا دستور قائم ہے۔ لیکن جب ان کاروباری طریقوں کو انسان کی تعریف و تحدید کے لئے ناگزیر سمجھ لیا جاتا ہے جب یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ ایک فرد کا فرد ہونا اس کے آقا و غلام اور مزدور ہونے میں ہے اور یہی اس کا مقصد

ہے گویا یہ انسانی کوششوں کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے اداروں کو انسان سے زیادہ اہمیت دینے گئے ہیں۔ معاشی رشتے بہرحال انسان ہی کے پیدا کردہ ہیں لیکن انہیں انسان سے اہم سمجھ لیا جاتا ہے۔ وہ ادارے اور اقدار جو انسان کی مرہون منت تھیں اور انسان کے وجود کا مظہر تھیں اب انسان ان کا پابند اور مرہون منت بھی بننے لگتا ہے۔ سماجی زندگی کا یہی وہ مرحلہ ہے جہاں سماج معاشرت میں رنگ جاتا ہے اور معاشرت سماج میں رچ بس جاتی ہے۔ مارکس کے خیال میں اس صورت حال کی واضح ترین مثال سرمایہ دارانہ معیشت میں نظر آتی ہے۔

مارکس کے خیال میں سرمایہ داری معیشت کی ہیئت کا تعین جاگیرداری کی موت میں چھپا ہے۔ جاگیردارانہ نظام آقا و غلام، مالک زمین اور کاشتکار کا نظام ہوتا ہے۔ اس میں کاشتکار کی دوگونہ حیثیت ہوتی ہے۔ ایک طرف تو وہ 'دہ خدا' ہے۔ اس کا لگایا ہوا پودا اس کے خون پسینہ پر پروان چڑھتا ہے، اس کا وجود زمین، پیداواری عمل اور پیداوار کے لئے ناگزیر ہے، دوسری طرف زمین سے کاشتکار کا ناتہ ایسا قدیم اور گہرا ہے کہ وہ اسی کا غلام ہو کر رہ گیا ہے۔ زمین اس کی نہیں، اور کاشتکار اس کا غلام ہو جاتا ہے جس کی زمین ہے۔ لیکن مالک زمین سے کاشتکار کی یہ نسبت تقریباً "فطری" ہے۔ جاگیرداری کی موت سے مزدور کی یہ دوہری حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن مرگ جاگیرداری چاہے کاشتکار اور محنت کش کو اس روایتی غلامی سے آزادی دلائے، وہ ساتھ ہی اسے ایک مستقل تنہائی سے دوچار کر دیتی ہے۔ اب کاشتکار یا محنت کش ایک کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ بھٹکتا ہے جہاں اس کی محنت کی مانگ ہے وہ جاتا ہے۔ جہاں اس کی محنت کی قیمت لگتی ہے وہ پہنچ جاتا ہے اور اس طرح اس کی زندگی محنت اور یافت سے عبارت ہونے لگتی ہے اور یہی سرمایہ داری کی ابتدا ہے۔

اب مزدور کی محنت اپنی نہیں۔ اور پیدائش کے کل نظام سے اس کا تعلق داخلی نہیں خارجی ہو جاتا ہے۔ مزدور اپنی محنت کا سودا کرتا ہے۔ جو زیادہ بولی لگائے گا وہ اپنی محنت اور صلاحیتیں اس کی جھولی میں ڈال دے گا۔ اس طرح محنت اور انسانی صلاحیتیں قابل حصول املاک اور کاروباری اشیا قرار پاتی ہیں۔ گویا انسانی صلاحیتیں انسان سے آزاد اور مستقل حیثیت اختیار کر جاتی ہیں اور اس طرح سرمایہ داری کی معراج معاشی معاشرت میں ظاہر ہوتی ہے۔ بلکہ جیسا کہ مارکس نے کہا ہے کہ معاشی معاشرت سرمایہ داری کے خطوط کا تعین اور ان کی وضاحت کرتی ہے۔ یہ ایک دور فاسد ہے۔ جس طرح ہماری اختراعات ذہنی اصنام خیالی کو جنم دیتی ہیں اور آخر کار یہی اصنام ہماری فکر اور ہمارے عمل کو متعین کرنے لگتے ہیں۔ اسی طرح معاشی معاشرت سرمایہ داری کو جنم دیتی ہے، اس کو پروان چڑھاتی ہے اور بالآخر اس کی ہو کر رہ جاتی ہے۔

مارکس کہتا ہے کہ محنت کش اپنی صلاحیتوں کو جتنا کام میں لاتا ہے یہ معاشی دنیا اتنی ہی طاقتور ہو جاتی ہے اور اسی اعتبار سے مزدور کی داخلی زندگی تہی داماں ہوتی جاتی ہے جس قدر وہ اپنی زندگی اشیاء کو جنم دینے میں لگاتا ہے، اسی قدر خود اپنے آپ سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ جتنی محنت منتشت کرتا ہے، اشیاء پر اس کا تصرف اسی اعتبار سے کم ہوتا جاتا ہے۔ محنت کی یہ معاشرت اسے محنت کش کے مقابلے میں ایک جداگانہ اور "فرد غیر" بنا دیتی ہے۔ یہی صورت "زر" کی ہے جس سے ہر چیز خریدی جا سکتی ہے اور وہ کام جو انسان اپنی صلاحیتوں سے پورا نہیں کر پاتا روپے پیسے سے ہوتا معلوم ہوتا ہے اس طرح انسانی صلاحیتوں کا بدل زر و دولت کو سمجھ لیا جاتا ہے۔ اب انسان کے باہمی رشتے انفرادی صلاحیتوں پر استوار ہونے کی بجائے روپے پیسے پر استوار ہوتے ہیں۔ انسانی رشتوں میں اس خارجی عامل کی آمد ایک مستقل ناسور کی شکل اختیار کر لیتی ہے، جس کا علاج مارکس کے خیال میں ایک ایسا معاشرہ ہے جہاں فرد کی صلاحیتوں کو اپنا مجبر نہ بننے دیا جائے۔ اور یہ معاشرہ سرمایہ داری کی موت میں چھپا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی موت مارکس کے خیال میں ایک یقینی چیز ہے۔ کیونکہ اس کے داخلی تناقضات، افراد کے مابین معاشرت، کام اور کارکن میں غیریت اور سماج کے ہر مزدور رکن اس کے اداروں کے مابین یہ تضاد اور تفائیر آخر کو اس نظام کو ایسی سطح پر لے جاتا ہے جہاں یہ کاروبار خود تباہ ہو کر نئے معاشرہ کی بنا ڈالتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مارکس نے سماجی زندگی کی یہ جو تصویر کھینچی ہے اس کی تصویب کیا ہو سکتی ہے؟ اس جائزہ کے لئے ہمیں مارکسی نظام کی منطق کو سامنے رکھنا ہوگا۔ یہ منطق جدلیاتی ہے۔ یہ بتانے کے لئے اور سمجھنے کے لئے کہ سرمایہ دارانہ معیشت اور سماج کیوں مغائرت میں مبتلا ہیں ہمیں اس حقیقت کو جدلیاتی منطق کے خاکے میں رکھنا ہوگا۔ اس کوشش کے ہمیں جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے تین نتائج نکلتے ہیں:۔

ؤ:۔ اگر جدلیاتی اصول صحیح ہے تو سرمایہ داری کی تحلیل درست ہوگی اور اس اعتبار سے خود مارکس کا مثالی سماج بھی سرمایہ داری سے مختلف نہیں ہوگا۔

ب:۔ اگر جدلیاتی اصول صحیح نہیں تو سرمایہ داری کی تحلیل غلط ہوگی اور معاشرہ مغائرت سے عبارت نہ ہوگا اور تصور مغائرت لغو قرار دیا جائے گا۔

ج:۔ اگر تصور مغائرت ایک جدلیاتی اور منطقی تصور ہے تو وجوبی ہوگا اور زندگی کی ہر منزل پر وجوبی طور پر ظاہر ہوگا، اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو مغائرت منطقی اور جدلیاتی تصور قرار نہیں دیا جائے گا اور اس لحاظ سے سماجی تعامل کی توجیہہ کے لئے یہ تصور ناگزیر نہیں رہے گا۔ اب ہم ان خیالات کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔

مارکس نے سماجی زندگی کی جو تحلیل کی ہے خود اس کے مطابق وہ ہیگل کی "مظہریات روح" اور اس کی جدلیت پر ہوتی ہے۔ معاشرتی زندگی اور خصوصاً سرمایہ دارانہ زندگی کی ابتدا جن خطوط پر ہوتی ہے انہیں خطوط پر اس میں داخلی تناقضات سامنے آتے ہیں اور دراصل کا لیٹلا سی کی طرح یہ نظام اسی شاخ کو کاٹتا ہے جس پر وہ تکیہ کئے ہوئے ہے، انہیں بنیادوں کی بیخ کنی کرتا ہے جن پر اس کی تعمیر ہوئی ہے۔ لیکن سرمایہ دارانہ نظام کے ان داخلی تناقضات کو تم تاریخی سطح پر نہیں سمجھا جا سکتا۔ ان کا علم کائناتی جدلیت کی سطح پر ہوتا ہے۔ یہ زندگی کا وہ مرحلہ ہے جہاں حقائق کو ان کی جزئیت اور قطعیت میں نہیں بلکہ ان کے گزران ان کی حرکیت اور تاریخ میں دیکھا جاتا ہے۔ تاریخیت اور حرکیت کا یہ تصور مارکس نے ہیگل اور نشطے سے لیا ہے۔ وہ بے تکلف ہیگل کے جدلیاتی مسلمہ کو قبول کرتا ہے لیکن ہیگل پر کسی اعتبار سے اضافہ نہیں کرتا۔

مارکس کی رو سے سماجی ادارے از خود وقوع پذیر نہیں ہوتے بلکہ وہ ایک تاریخی سلسلہ کی کڑی کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں اور یہ سلسلہ میکانکی نہیں، جدلیاتی ہے۔ اس طرف فیورباخ اور اس سے قبل ہیگل توجہ دلا ہی چکا تھا۔ ہیگل نے سماجی اداروں کے تغیر پذیر اور ایک دوسرے سے مضاف ہونے کی تفسیر کائناتی حرکیت کے اس تصور سے کی تھی کہ کائنات اپنی انتہائی صورت میں جستہ جستہ اور بسیط عناصر کی مرکب ہے اور اس کے مادی و روحانی، نفسی و فطری "پہلو" ایک دوسرے سے جدا اور علیحدہ نہیں۔ نفس اور فطرت کی "کلیت" مطلق ہے اور مطلق نفس و فطرت سے علیحدہ نہیں بلکہ یہ مطلق کی لامتناہی حرکت و فعلیت کے دو ادوار ہیں۔ فی الحقیقت ہستی مطلق خود نفس و فطرت بن جاتی ہے۔ اسی چیز کو فیورباخ نے مغائرت کہا تھا۔ یہ "خود خارجیانے" کا عمل، یہ جدلیاتی حرکت، مارکس کے خیال میں سرمایہ دارانہ معیشت اور معاشرت کو سمجھنے کی کنجی ہے۔

مغائرت، جیسا کہ مندرجہ بالا سطور میں ہم نے دیکھا، جدلیاتی حقیقت ہے اور جدلیت کا عمل دخل کل کائنات میں ہے، اس سے مفر نہیں، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جدلیت خود کیا ہے؟ دراصل اس سوال کا جواب یہ بتانے میں ہوگا کہ جدلیت کیا نہیں۔ جدلیاتی طریقہ ہندسی اور استخراجی نہیں۔ وہ نہ تو حسابی اور ریاضیاتی ہے اور نہ ہی عصر جدید کی اشاری منطق کے مماثل ہے۔ ان سارے نظامات میں ہم چند اساسی تصورات کو قبول کرنے کے بعد چند تصورات کی تعریف و تحدید کرتے ہیں۔ ان کی مدد سے مزید پیچیدہ تعقلات و تصورات وضع کرتے ہیں۔ لیکن ان نئے تصورات کی تشکیل و تخلیق دراصل اساسی اور بدائی تصورات و تعقلات سے متعین شدہ راہوں ہی میں عمل میں آتی ہے۔ یعنی اگر ہم چاہیں کہ پیچیدہ تصورات کو ان کی اصل میں تحویل کر دیں تو ہم تحلیل سے بدائی تصورات تک پہنچ سکتے ہیں۔ گویا بدائی تصورات سے گزر کر اعلیٰ تصورات تک پہنچنے کے بعد بھی ہم "نئے" تصورات تک نہیں پہنچتے۔ اور اسی وجہ سے ہیگل نے استخراجی اور ریاضیاتی نظامات کو بے جان کہا تھا۔ ان میں غیر متبدل تعین، قطعیت اور تجرید ہوتی ہے اور ایسے نظامات کو ایک مشین بھی وضع کر سکتی ہے۔ وہ ایک کو چھوڑ کر کانٹ سے قبل کا سارا فلسفہ ہیگل کے خیال میں تجریدی زدہ ہے

مارکس کے الفاظ میں "مابعد الطبیعیاتی" تھا۔ ہیگل نے اسے "فلسفہ فہم" کہا تھا اور جیسا کہ لینڈلے نے بتایا ہے کہ عصر حاضر کا برطانوی فلسفہ بھی اسی شمار میں آتا ہے اور اس اعتبار سے وہ بانجھ ہے۔

اس کے برخلاف جدلیاتی سطح پر اصول فہم یعنی جزئیت، قطعیت اور عینیت کا عمل نہیں ہوتا۔ یہاں اصول یہ کام کرتا ہے کہ ہر تصور اپنے طور پر اپنے غیر میں جلوہ گر ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور جدلیت اسی عمل کے ظاہر ہونے کا نام ہے۔ اگر شے یا ہستی کو اپنے طور پر دیکھا جائے تو وہ جزئیت میں رنگ جاتی ہے۔ اسے علائق سے پاک کیا جائے تو وہ عدم محض میں تحویل ہو جاتی ہے۔ بلا تعین ہستی نیستی کے مترادف ہے۔ اور ہستی محض عدم کے برابر ہے ہستی اپنا آپ بھی ہے اور اپنی ضد اور نقیض بھی۔

اب کیونکہ ہستی ہے بھی اور نہیں بھی یعنی بیک وقت عدم اور وجود سے عبارت ہے اس لئے یہ کوئی شے مختلف شے یا ہر شے بن سکتی ہے اور اس طرح ہستی کا داخلی تناقض حدوث یا ارتقا کے تصور میں تحویل ہوتا ہے۔ لیکن حدوث پھر تناقض کا شکار ہوتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر حدوث ہے تو کوئی شے حادث ہوگی۔ کوئی شے یا ہستی ارتقا پذیر ہوگی۔ تغیر پذیری ایک صفت ہے۔ جس میں یہ صفت ہے اس کا یہ صفت تعین کرتی ہے اور تعین کرنا قطعیت میں رنگنا اور دراصل تحدید کرنا ہے۔ اس طرح ہم صفت حادثہ پذیری سے تحدید اور کمیت تک پہنچ جاتے ہیں کیمیت کم میں جلوہ گر ہو جاتا ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس مارکس اس مقام پر ہیگل کی اصطلاحات کو بدل کر کم کا کیف میں ظاہر ہونا بتاتا ہے۔ اس کے مطابق تغیر پذیری ایک ایجابی صفت اسی وقت ہوگی جبکہ تغیر پذیری یعنی کمیتی تبدیلیاں عمل میں آچکی ہوں۔ یعنی کمیتی تغیرات کا اجتماع کیفی تبدیلیاں سامنے لاتا ہے۔ بہرحال تصور یہ ہے کہ ہستی اپنے غیر میں، کیف کم میں یا کم کیف میں جلوہ گر ہوتا ہے۔

ہیگل اور مارکس کے خیال میں جدلیت کا یہ عمل زندگی کے ہر موڑ پر ملتا ہے، کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی تڑپ اور جدلیت کی مثال ہے جس جگہ حرکت اور زندگی ہے اور ہر وہ مقام جہاں کسی شے کا عمل وجود میں آرہا ہے وہاں جدلیت برسرکار ہے۔ لیکن زندگی اور فطرت صرف علم ہی تک محدود نہیں بلکہ عالم افلاک پر گردش کرتے ہوئے سیارے، موسمیاتی تغیرات، نفسیاتی واردات، سماجی اور سیاسی ادارے سب اسی اصول کے جلوہ گر ہیں اور یہ سب عبارت ہیں اسی جدلیاتی اصول اور قانون سے جسے فیورباخ نے خارجیانہ کا عمل کہا ہے اور مارکس اور ہیگل جسے مغائرت کے نام سے پکارتے ہیں۔

اشتراکیت اور مغائرت اگر سرمایہ داری کو ہم اس تناظر سے دیکھیں جو مارکس نے ہیگل سے لیا ہے تو مغائرت وہاں اپنی واضح ترین صورت میں نظر آتی ہے انفرادی تعلقات اور رشتے اس غیریت اور تضاد سے عبارت ہیں۔ یہیں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مغائرت ایک جدلیاتی حقیقت ہے اور جدلیت سے مفر نہیں کیونکہ وہ ایک کائناتی مسلمہ ہے تو کیا سرمایہ داروں کے ختم ہونے پر جدلیاتی حرکت رک جائے گی؟ اور یہ زندگی اس کے بعد بھی رواں دواں رہتی ہے تو کیا یہ نئی زندگی مغائرت سے پاک ہوگی؟ اگر جدلیت کا عمل سرمایہ داری کی موت پر ختم ہو جاتا ہے تو پھر مارکس اس "پر مسرت سماج" کی توقع نہیں کر سکتا جو مغائرت سے پاک ہوگا۔ اور اگر جدلیت مسلسل ہے اور جو سرمایہ داری کی موت کے بعد بھی اشتراکی معاشرہ میں ظاہر ہوگی تو پھر اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر اشتراکی معاشرہ کو بھی مغائرت سے مفر نہ ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ کہنا کس حد تک درست ہے کہ سماج اور افراد سماج کے مابین رشتے اور تعلقات غیریت سے رنگے ہوں گے؟ یہ کہنا کہاں تک مناسب ہوگا کہ سماج کا ہر فرد ہابس کے الفاظ میں دوسرے کی گردن قلم کرنے کے درپے ہوگا؟ مغائرت اگر ایک منطقی اور وجودی حقیقت ہے تو ہمارے علائق محض غیریت اور باہمی نزاع سے عبارت ہوں گے۔ اور اگر ہم ایک مثال بھی ایسی پاتے ہیں جہاں باہمی تعلقات نزاع کے بجائے محبت، یگانگت اور بے لوث خدمت پر مبنی ہوں تو مارکس کا بنیادی مسلمہ غلط قرار پائے گا۔

لیکن یہاں یہ مسئلہ سامنے آتا ہے کہ مارکس بے لوث خلوص پر مبنی معاشرہ میں بھی یقین رکھتا ہے اور مغائرت میں بھی۔ اور یہ باہمی طور پر متضاد تصورات ہیں۔ البتہ مارکس جس پرولتاری معاشرہ کا ذکر کرتا ہے جو سرمایہ داری کی موت کے نتیجہ میں وجود میں آئے گا، وہاں اس کے خیال میں مغائرت کا عمل نہیں ہوگا۔ بلکہ خلوص اور یگانگت کا دور دورہ ہوگا۔ مگر ایسا کیونکر ممکن ہے؟

مارکس کے خیال میں پرولتاری سماجی اخلاق قبل پرولتاری سماج اور اس کے اخلاق سے بہتر ہوگا کیونکہ اب تک جو ایک طبقاتی نزاع جاری تھی اور ہر چیز، ہر واقعہ اور ہر حقیقت اپنے غیر میں جلوہ گر ہوتے، اس پر تصرف حاصل کرتے یا اس سے مغلوب ہو جانے پر مجبور تھی، وہ اب اس جدلیاتی سطح پر ختم ہو جاتی ہے۔ ساری منفی اقدار یعنی غربت اور دوسرے کی حق تلفی وغیرہ طبقات کے مٹ جانے سے ختم ہو جائیں گی۔ اور ان کے ختم ہونے سے وہ نزاع دور ہو جائے گی۔

مارکس کے اس بیان سے جو نتائج نکلتے ہیں انہیں قبول کرنے میں ہمیں تامل ہوتا ہے۔ اس نظام میں اخلاقی قدر و قیمت کا انحصار سماجی بلکہ معاشی اور تکنیکی ترقی پر ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں ذاتی ملکیت کا تصور ایک فرسودہ اخلاق کو جنم دیتا ہے اور جب یہ نظام ٹوٹتا ہے تو ایک طرف صنعتی ترقی ظہور میں آتی ہے اور اسی صنعتی انقلاب سے وابستہ ایک غیر طبقاتی اخلاق وجود میں آئے گا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اخلاقی زندگی راست طور پر صنعتی زندگی سے وابستہ ہے اور صنعتی انقلاب اخلاقی انقلاب میں ظاہر ہوگا اور ہمیں بہرحال صنعت اور اخلاق میں اس قسم کی عینیت قبول کرنے میں تامل ہوگا۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ صنعتی زندگی اخلاقی زندگی سے متعلق ہو سکتی ہے، تو بھی یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ صنعتی انقلاب لازمی طور پر اخلاقی انقلاب میں جلوہ گر ہوگا۔

دراصل اخلاقی ترقی اخلاقی حدود اور معانی ہی میں سمجھی جا سکتی ہے سائنسی، فنی اور صنعتی معنوں میں نہیں۔ یہاں مجھے پروفیسر ایکنگ کی بات یاد آتی ہے جو انھوں نے اپنے ایک لیکچر کے دوران میں کہی تھی کہ مارکس نے عام انسانوں کے خدا کو تو اپنے نظام سے باہر رکھنے کی کوشش کی، لیکن صنعتی عفریت کو اپنے نظام سے باہر نہ رکھ سکا اور یہ عفریت عام انسانوں کے خدا سے زیادہ قہار اور جبار ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ یہ انسان کے اسفل خیالات اور جذبات غیظ و غضب کے 'خارجیانہ' کی مثال ہے اور یہ وہی "مغائرت" ہے جس سے مارکس اپنے نظام کو پاک رکھنا چاہتا تھا۔

اشتراکیت اور مذہب

محمد عثمان رمز ایم اے

سوشلزم کا نظریہ لادینیت کے بطن سے پیدا ہوا ہے۔ سوشلزم اور لادینیت میں فرق اتنا ہے کہ لادینیت ایک فکری تحریک ہے اور سوشلزم ایک عملی تحریک ہے۔ لادینیت کا دائرۂ اثر وسیع تر ہے اور سوشلزم اس لحاظ سے محدود ہے۔ لیکن اختصاص کے نقطۂ نظر سے سوشلزم لادینیت کے مقابلہ میں زیادہ ہمہ گیر ہے۔ ان دونوں کے فرق کو مزید واضح الفاظ میں ہم یوں پیش کر سکتے ہیں کہ سوشلزم ایک مخصوص نظامِ زندگی ہے مگر لادینیت محض ایک طرزِ فکر کا نام ہے۔ سوشلزم کے اجزائے ترکیبی میں لادینی اخلاق و کلچر کے علاوہ قومی معیشت اور سیاسی کلیت پسندی سب سے اہم ہیں۔ اس کی فلسفیانہ بنیادوں میں اصولِ تغیر، قدرِ زائد کا نظریہ، طبقہ وارانہ کشمکش اور جدلی مادیت بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ یہی وہ اجزائے ترکیبی اور فلسفیانہ بنیادیں ہیں جو سوشلزم کو لادینیت کے مقابلہ میں زیادہ محسوس طور پر پیش کرنے میں ممد ثابت ہوئی ہیں۔

کیفیت اور کمیت کے اس فرق کے باوجود لادینیت اور سوشلزم اپنی مذہب دشمنی میں ایک ہیں۔ لادینیت نے پچھلے پانچ چھ سو سال میں مذہب پر فکر و فلسفے کے محاذ سے جو حملے کیے ہیں سوشلزم نے انہیں کو اپنی بنیاد قرار دیا ہے۔ سوشلزم نے ایک طرف اس پورے ورثہ کو اپنایا اور دوسری طرف مذاہب پر جدلی مادیت اور طبقہ وارانہ کشمکش کے نقطۂ نظر سے مسلسل حملے کیے۔ اس طرح اس نے اپنے جارحانہ سریہ کو دو آتشہ کر لیا۔

پچھلے چار سو سال کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ لادینیت نے ایک منصوبہ اور پلان کے تحت مذہب کے زور کو توڑنے کی کوشش کی ہے۔ اس عرصہ میں دنیا کے بیشتر ممالک کو محض دینی جنگیں لڑنی پڑی ہیں۔ اور لادینیت نے ہر ملک میں حملہ آور کا موقف اختیار کیا ہے۔ لادینیت کے حق میں نہ صرف مفکرین، فلاسفہ اور حکماء نے اپنا اپنا زورِ بیان اور زورِ استدلال صرف کیا ہے بلکہ دنیا کی اکثر و بیشتر قومی ریاستوں نے بھی اس کی تبلیغ و اشاعت پر بے پناہ دولت صرف کی ہے۔ ان ریاستوں میں دنیا بھر کے مذاہب پر دو اہم محاذ سے حملے جاری ہیں۔ ایک محاذ تو علم و فکر کا محاذ ہے اور دوسرا محاذ کلچر اور ثقافت کا۔ علم و فکر کے محاذ سے جو حملے کیے جا رہے ہیں وہ اس دعویٰ کے ساتھ ہو رہے ہیں کہ مذہب سائنٹفک استدلال کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا۔ اور مذہب کی تردید میں جو باتیں بھی کہی جا رہی ہیں وہ بربنائے مشاہدہ، تجربہ اور استدلال کہی جا رہی ہیں۔ دوسرے محاذ سے مذہب پر جو حملے ہو رہے ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ انسان دنیا طلبی، عیش و تعیش، دولت پرستی اور جنسی بے راہ روی وغیرہ میں اتنے ڈوب جائیں کہ انہیں اعلیٰ اقدار (values) کا بھولے سے بھی کوئی خیال نہ آئے۔

صحیح ہے کہ پچھلی کوششوں کے نتیجہ میں دنیا کے تمام مذاہب کم یا زیادہ اپنا اثر و نفوذ کھو چکے ہیں اور دنیا کی اکثر و بیشتر لادینی ریاستوں میں مسجد اور مندر یا کلیسا اور معبد میں پناہ تلاش کرنی پڑی ہے۔ لیکن اس پسپائی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان مذہب کو چھوڑ بیٹھا ہے یا انسان نے

مذہب سے بغاوت کا اعلان کر دیا ہے۔ اس لیے کہ انسان پیدائشی طور پر مذہبی ہے۔ اور انسان کو غیر مذہبی بنانے کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں۔ اب بھی دنیا میں عظیم اکثریت نہ صرف مذہب کی قائل ہے بلکہ رسم و رواج، لین دین اور معاملات زندگی میں دنیا بھر کے عوام مذہب ہی سے رہنمائی حاصل کر رہے ہیں۔ ان کی اقدار اور ان کے معیارات مذہب ہی سے ماخوذ ہیں۔ اب بھی امریکہ، برطانیہ اور فرانس جیسے یورپین ممالک میں عامۃ الناس روز مرہ کی زندگی میں مذہب کے معتقدات کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ یہ محض یورپین اور کچھ دوسرے ممالک میں "دانشوروں" کا محدود طبقہ ہے جو روز بروز لادینیت کی گرفت میں جکڑتا چلا جا رہا ہے۔

لادینیت کے اس بڑھتے ہوئے رجحان کا ایک بہت ہی موثر توڑ یہ ہے کہ جس نے جس سائنٹفک اندازِ بیان کی دہائی دے کر مذہب کو ختم کرنے اور مٹانے کی کوشش کی ہے اسی سائنٹفک اندازِ بیان کی مدد سے مذہب کی از سرِ نو تبلیغ و اشاعت کا کام کیا جائے۔ یہ کام کٹھن ہے مگر ناممکن نہیں۔ لادینی مفکروں نے دنیا بھر کے مذاہب کے خلاف اب تک جو بنیادی اعتراضات پیش کیے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں :-

۱۔ مذہب محض ایک "انفرادی معاملہ" ہے۔ اس لیے کسی مافوق الفطرت ہستی پر اعتقاد ہونے یا نہ ہونے یا اعتقاد رکھنے یا نہ رکھنے کا معاملہ بھی انفرادی ہے۔ مافوق الفطرت ہستی کوئی محسوس شے نہیں۔ اس کا وجود وہمی، ظنی یا خیالی ہے۔

۲۔ مذہب کی ضرورت اُن ادوار میں تھی جبکہ انسان کا ذہن بلوغ کے ابتدائی مرحلوں سے گذر رہا تھا۔ انسان کو اس بات کی ضرورت تھی کہ وہ فطرت کی ستم ظریفیوں، جنگل کے جانوروں اور وبائی امراض وغیرہ کا مقابلہ کرنے کے لیے متحد ہو۔ اتحاد کے لیے ایک متفق علیہ شے کی ضرورت تھی، اور ایسی ایک مطلوبہ شے کو انہوں نے اپنے وہم و خیال سے پیدا کردہ دیوتاؤں، دیویوں اور چھوٹے بڑے خداؤں کی شکل میں حاصل کر لیا۔ اب جبکہ انسان کا ذہن بالغ ہو چکا ہے، جبکہ اس نے اپنی مدافعت کے راستے اپنی قوتِ بازو سے تیار کر لیے ہیں اور جبکہ وہ نظامِ فطرت پر غلبہ اور تسلط حاصل کر چکا ہے، مذہب اور مذہبی معتقدات کی چنداں ضرورت نہیں رہ جاتی۔

۳۔ دنیا بھر کے مذاہب کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ مذہب کی ایک قسم وہ ہے جس میں اب بھی فعالیت اور حرکت (Vitalism) پائی جاتی ہے۔ اُن کی دوسری قسم وہ ہے جو بالکل ہی جمود و تعطل کا شکار ہو چکے ہیں۔ اس موقع پر لادینی طرزِ فکر رکھنے والے ماہرینِ عمرانیات کا خیال یہ بھی ہے کہ دوسرے قسم کے جامد و معطل، مذاہب خود اپنی موت مر جائیں گے۔ البتہ پہلے قسم کے مذاہب کے خلاف زیادہ سے زیادہ سائنٹفک انداز میں مہم چلانی چاہیے۔

۴۔ کچھ مؤرخین اور ماہرینِ عمرانیات کا خیال یہ ہے کہ دنیا کے اکثر مذاہب محض سیاسی بازی گری کے نتیجہ میں پیدا ہوئے، نیز یہ کہ اکثر مذاہب نے اکثر ادوار میں بادشاہوں، سلاطین اور امراء کے سیاسی اقتدار کو بحال رکھنے کی خدمات انجام دی ہیں۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ سے پہلے مذہب بادشاہوں اور جاگیردار امراء کے اشاروں پر کام کر رہا تھا۔

۵۔ کچھ اور مؤرخین اور ماہرینِ عمرانیات نے یہ بھی "ثابت" کیا ہے کہ مذہبی ادارے دراصل معاشی استحصال کے اداروں میں بدل چکے تھے۔ پوپ، پادری، برہمن اور ملا، شہنشاہوں اور جاگیرداروں کے شانہ بشانہ عوام کو لوٹ رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے بعد شہنشاہیت اور جاگیردارانہ نظام کے ساتھ ساتھ پاپائیت اور مذہبی اداروں کا بھی زوال واقع ہوا۔

۶۔ مذہب دنیوی ترقی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

سوشلزم نے دنیا بھر کے مذاہب کے خلاف مذکورہ بالا تصورات اور اعتراضات کو اختیار کیا اور ان میں مندرجہ ذیل نکات کا اضافہ [illegible] اضافے جدلی مادیت اور طبقہ وارانہ کشمکش کے لازمی نتائج ہیں۔ یہ اضافے مارکس، اینجلز اور لینن نے کئے ہیں۔ پھر انہیں کے مرتب کردہ نقوش [illegible]

لیکن اشتراکی مفکرین نے الفاظ کے الٹ پھیر کے ساتھ ان کو بار بار دہرایا ہے:

۱۔ "مذہب پر تنقید علم تنقید کا مبداء ہے۔" مارکس

۲۔ "مذہب عوام کے حق میں افیون کا اثر رکھتی ہے۔" مارکس

۳۔ "سوشلسٹ عالموں کی تحلیل نفسی اور ان کے تجزیۂ تاریخ کے مطابق خوف نے خدا کو پیدا کیا ہے۔ سرمایہ کی اندھی قوت کا خوف...... اندھی اس لیے کہ اس کا عمل عوام کی نگاہوں سے مخفی ہے۔ ایسی قوت جو مزدوروں اور چھوٹے تاجروں کے لیے ہر قدم پر ناگہانی اور غیر متوقع تباہی کا سبب بن کر ان کے سروں پر گداگری، فاقہ کشی اور عصمت فروشی تک کی لعنت مسلط کر سکتی ہے...... یہ ہے موجودہ مذہب کی بنیاد جسے ہر مادہ پرست کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اگر وہ مادہ پرستی کی ابجد سے آگے بڑھنا چاہتا ہے۔"

۴۔ "مذہب کے اصول ازمنۂ قدیم کے نظام غلامی کی بازگشت ہیں۔ مذہب عہد غلامی کی عظمت اور تقدیس کا قائل ہے۔ ان کے اصول جب کبھی ان کو موقع ملتا ہے اور ضرورت لاحق ہوتی ہے تو بورژوا مظالم کی مدافعت سے نہیں چوکتے۔" (کمیونسٹ مینی فسٹو کی تشریح دفعہ ۵ از ریبز نوف)

۵۔ "مذہبی اصول حکمران اور محکوم کی طبقہ وارانہ تمیز و تقسیم کی تائید کرتے ہیں اور اس کے وجود کو ضروری قرار دیتے ہیں۔" (ایضاً)

۶۔ "مسیحیت کی معاشرتی تعلیم بزدلی، فروتنی، ذلت نفس، تسلیم و رضا اور منکسر المزاجی کی تعلیم ہے۔ لیکن اس کے برعکس مزدور طبقہ کو خود اعتمادی، حوصلہ، عزت نفس اور شخصی وقار و آزادہ روی کے اصولوں کی ضرورت ہے۔" (ایضاً)

۷۔ "مذہب ان روحانی مصیبتوں کا نام ہے جو دوسرے کے آرام کی خاطر محنت مزدوری کرنے والے فاقہ کش غریبوں پر چھائی رہتی ہے۔ مظلوم جب ظالم کے خلاف جد و جہد میں ناکامی کا منہ دیکھتا ہے تو خواہ مخواہ اس کے دل میں موت کے بعد زندگی کا تخیل نشو و نما پانے لگتا ہے۔ مذہب ان تمام غریبوں اور محنت کش طبقوں کو جو اس دنیا میں تکلیف کی زندگی بسر کرتے ہیں قناعت اور صبر کی تعلیم دیتا ہے اور جنت میں انعام و اکرام کے وعدے یاد دلا دلا کر ان کی تسکین و تسلی کرنا چاہتا ہے۔ رہے وہ جو دوسروں کی محنت پر گل چھرّے اڑاتے ہیں تو انہیں یہی مذہب صدقات و خیرات کی تلقین کرتا ہے۔ اس طرح ظلم و تعدی کی ایک صورت نکل آتی ہے اور ساتھ ساتھ جنت کا سستا ٹکٹ بھی مل جاتا ہے۔" (ایضاً)

۸۔ "وہ ضابطۂ اخلاق جو انسانی سماج کے باہر لیا گیا ہے ہمارے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتا...... یہ ایک ڈھکوسلہ ہے۔ ہمارا ضابطۂ اخلاق طبقاتی تصادم کے مفاد کے تابع ہے۔" لینن

مذہب سے متعلق دونوں قسم کے تصورات اور اعتراضات کی فہرستوں میں ایک ہی بنیادی جذبہ کام کر رہا ہے کہ مذہب دنیوی زندگی ——— بالخصوص اجتماعی زندگی ——— کے لیے اپنی افادیت کھو چکا ہے۔ دونوں مدرسۂ فکر کے نمائندے مذہب کو سیاسی، عمرانی، معیشی اور معاشرتی زندگی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ لیکن سوشلزم کا تجزیہ بہت بے لاگ ہے۔ لادینیت کے محاذ سے جو تجزیئے کئے گئے ہیں۔ ان پر تکلفات کے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں۔ جبکہ اشتراکیت کا حملہ زیادہ دو ٹوک ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سوشلزم خود ایک وسیع نظام زندگی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، یہی دعویٰ اس کی کھلی کھلی مذہب دشمنی کا محرک ہے۔ یہ کسی دوسرے نظام زندگی کو ایک لمحہ کے لیے بھی گوارا کرنے کو تیار نہیں۔ اسی لیے مارکس نے سوشلزم کو دوسرے نظریات اور نظام ہائے زندگی پر غالب کرنے کے لیے ایک سہ نکاتی طریق کار بھی تجویز کیا:

اول یہ کہ سوشلزم کو سرمایہ داری کے خلاف محض ایک ردعمل سے منتج کرنے کے بجائے اسے براہ راست ایک الگ نظریہ کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا۔

۲۔ دوسرا کام مارکس نے یہ کیا کہ مستقبل میں قائم ہونے والی اشتراکی ریاست کے معاشی اداروں، ان کی ہیئت اور ان کے اعمال و وظائف کا کوئی خاص ذکر نہیں کیا۔ اس لیے کہ تفصیلی بحث کرنے سے نہ صرف اس کے اپنے فکری الجھاؤ اور تضاد کے نمایاں ہوجانے کا خطرہ بڑھ جاتے کا پورا پورا امکان تھا بلکہ ساتھ ساتھ اشتراکی ریاست کے اصل خدوخال کے بے نقاب ہوجانے کے بھی مواقع تھے۔

۳۔ مارکس نے اپنے تمام پیش رو مفکرین کے علی الرغم اور ان سے الگ ہٹ کر سوشلزم کو ہر طرح کے مذہبی اثرات سے پاک کرنے کی کوشش کی۔ اور اس کی کامیابی کے لیے اس نے مذہب کی مخالفت کو شرط لازم قرار دیا۔

اس سہ نکاتی پروگرام کے تیسرے نکتہ کی وضاحت کے لیے اور اس کی توثیق و تائید میں ذیل میں کچھ اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں۔

"مارکسیت مادیت کا دوسرا نام ہے اور اس لحاظ سے یہ مذہب کی سخت ترین دشمن ہے...... مارکسیت کی الف بے یہ ہے کہ انسان کو مذہب سے لڑنا چاہیے مگر مارکسیت چھوٹی موٹی مادیت نہیں ہے کہ صرف الف بے پر ہی اکتفا کر کے بیٹھ جائے یہ اس سے آگے قدم بڑھاتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ انسانیت کو صرف مذہب کے خلاف لڑنا ہی نہیں بلکہ اپنے آپ کو اس لڑائی کے لیے اہل بھی بنانا ہے (لینن on Religion ص ۱۲)

کمیونسٹ پارٹی کا ممبر" اس شخص کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا جو صدق دل سے صاف صاف اس بات کا اعلان نہ کردے کہ وہ دہریہ ہے (ماسٹ کمیونزم از ویب ص ۱۴۸)

"پرولتاری سوشلسٹ پارٹی کے لیے مذہب خانگی معاملہ کی حیثیت نہیں رکھتا۔ ہماری پارٹی طبقہ وارانہ شعور رکھتی ہے۔ اور مزدوروں کی آزادی کے لئے جدوجہد کرتی ہے۔ ایسی جماعت مذہبی اعتقادات کی پیدا کردہ جہالت سے غفلت نہیں برت سکتی...... ہماری پارٹی کا ایک بنیادی مقصد مزدور کی مذہبی فریب خوردگی کا دور کرنا بھی ہے۔" (اینجلز ص ۱۵)

۱۹۲۲ء میں مزدوروں کو "مذہبی فریب خوردگی" سے نجات دلانے کی غرض سے مخالف الوہیت (Godless) سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس سوسائٹی کا مقصد اس کے اپنے الفاظ میں یہ تھا:

"آسمانی زاروں کو ان کے عرش سے اتار پھینکنا ہے جس طرح اس دنیا کے زاروں کو اتار پھینکا ہے۔"

(حاشیہ اشتراکیت اور اسلام از مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم ص ۷۰)

یہاں بالشویک انقلاب کے لاتے ہوئے ان انسانیت کش، اخلاق سوز اور دشمن مذہب "کارناموں" کا ذکر محض تحصیل حاصل ہوگا جن کو سوویٹ یونین کے گلی کوچوں میں، مسجد اور معبد میں، خانقاہوں اور مدارس میں نام نہاد انقلاب کے بعد دہرایا گیا[ؒ]

اپنی اس تمام مذہب دشمنی کے باوجود اشتراکی مفکرین اور "مجاہدین" کو قلابازی کھانے میں دیر نہیں لگتی۔ قلابازی کھانے اور ابن الوقتی اختیار کر لینے کو وہ باعث فخر اور اپنے طریق کار کا جز تصور کرتے ہیں۔ ۱۸۵۰ء سے ۱۸۷۰ء تک یورپ کی سیاسی مزدور جماعتوں میں الحاد کے جراثیم تیزی سے پھیل رہے تھے۔ ۱۸۷۴ء میں اینجلز لکھتا ہے کہ "یورپ کی مزدور جماعتوں میں الحاد ایک مانی ہوئی حقیقت ہے۔" مگر جرمنی کی سوشل ڈیموکریٹ پارٹی نے

[ؒ] ان بربریت آمیز اور شقاوت سے بھرپور کارناموں کی تفصیل اگر کوئی صاحب ملاحظہ کرنا چاہیں تو وہ ذکی علی مصری کی کتاب (Islam in the world) اور مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کی اسلام اور اشتراکیت اور نذر محمد خالد صاحب کی اشتراکیت، مذہب اور اخلاق جیسی کتابوں کا مطالعہ بہت ہی مفید رہے گا۔

جب ۱۸۷۷ء میں حکومتِ وقت کے سامنے یہ مطالبہ رکھا کہ "ریاست اور تعلیم گاہوں کو کلیسا سے الگ کر دیا جائے"۔ اور جب ۱۸۷۵ء میں سوشلسٹ لیبر پارٹی نے اپنے گوتھا پروگرام میں یہ فیصلہ کیا کہ "مذہب یقیناً ایک انفرادی معاملہ زندگی ہے"۔ تو اس پر مارکس نے تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کیا کہ "مزدور جماعت کو اس سے کچھ اور آگے قدم بڑھا کر انسانی ضمیر کو مذہب کے پنجۂ اقتدار سے آزاد کرانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ لیکن یہ لوگ (یعنی سوشلسٹ لیبر پارٹی والے) مہاجنوں اور سرمایہ داروں سے آگے قدم بڑھانا پسند نہیں کرتے"۔ لیکن دوسری طرف بالشویک انقلاب کے عملی تجربوں کے بعد لینن یہ کہتا ہے کہ "ہم کبھی واضح طور پر الحاد کا اعلان نہیں کرتے نہ ہم محنت کشوں کی مذہبیت کے براہ راست حریف بنتے ہیں"۔ وہ ایک جگہ یہ بھی کہتا ہے کہ "مذہب کے خلاف کسی سیاسی جنگ کا آغاز کرنا ایک انارکسٹ طریقۂ کار ہے"۔ پھر لینن سند کے طور پر یہ بھی لکھتا ہے کہ "مذہب کے خلاف نہ صرف سیاسی تشدد اور حکومت کے کھلم کھلا دباؤ کو اینجلز نے ناپسند کیا ہے بلکہ اس نے ہر اشتراکی مفکر کو اپنی تقریر و تحریر میں محتاط رویہ اختیار کرنے کی تلقین کی ہے"۔

اب بھی وہ طریق کار ہے جس پر دنیا بھر کے اشتراکی کارکن عمل پیرا ہیں۔ نو آزاد مملکتوں میں اشتراکی کارکن اسی "احتیاط" کے ساتھ کام کر رہے ہیں بلکہ جیلیبس کی بغاوت کے بعد ۱۶۲۵ء میں منظیرد Muenzer نے جو پرولتاریوں کی مذہبی آمریت قائم کرنے کی کوشش کی تھی غالباً اسی قسم کی پرولتاریہ مذہبی آمریت قائم کرنے کے خواب بھی دیکھے جا رہے ہیں،

منظیر کی پرولتاریہ پر اینجلز اور مارکس دونوں نے تنقیدیں کی تھیں لیکن ہم خود اپنے معاشرہ میں یہ دیکھ رہے ہیں کہ یہاں ایک طبقہ ایسا ہے جو "اسلامی سوشلزم" کا نعرہ لگا رہا ہے۔ بعض مسلمان ریاستوں کے ذمہ دار حضرات بھی یہی سمجھتے ہیں کہ اسلام بذات خود کافی نہیں بلکہ اس کی تکمیل کے لیے سوشلزم کی ضرورت ہے۔ ایسے لوگ یا تو اتنے سادہ لوح ہیں کہ انہوں نے اسلام اور سوشلزم کے فرق کو سمجھنے کی زحمت تک گوارا نہیں کی یا پھر وہ اتنے چالاک بنتے ہیں کہ پوری قوم کو دھوکا دے سکیں گے۔!

کسی سائل نے مرحوم علامہ اقبال سے سوال کیا تھا کہ کیا سوشلزم + God اسلام کے برابر ہیں تو مرحوم نے اس سوال کے جواب میں یہی فرمایا تھا کہ دراصل اسلام میں خدا کا تصور ہی تو اصل اہمیت کا حامل ہے۔ اگر خدا کے بارے میں ہمارے تصورات واضح ہو جائیں تو ہماری تمام فکری اور عملی دشواریاں دور ہو سکتی ہیں۔ یہی تو وہ بنیاد اور اساس ہے جس پر اسلامی نظامِ زندگی کی عمارت تیار ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ رسالت اور آخرت کو بھی اسلامی نظام زندگی کی تشکیل اور صورت گری میں بڑی اہمیت حاصل ہے مگر ترتیب کے لحاظ سے ان کا مقام دوسرے اور تیسرے نمبر پر ہی آتا ہے!

اشتراکیت اور معاشی ترقی

حسین نقی

اس آدمی کی حسرت اور مایوسی کا اندازہ کوئی کیا لگا سکتا ہے۔ جو کسی لق و دق صحرا میں دیوانہ وار دوڑتا پھرتا رہا کہ شدت پیاس سے پیدا شدہ اپنے حلق کی خشکی پر پانی کی چند بوندیں کسی طرح ٹپکا سکے اور اس عالم میں اسے دور کوئی چشمہ نظر آئے اور جب وہ ہانپتا کانپتا پہنچے تو پتہ چلے کہ اس نے جو کچھ دیکھا تھا وہ محض ایک سراب تھا۔ یہی حال معاشیات کے ہر اس طالب علم کا ہوتا ہے، جو مزدور، کسان اور پرولتاری طبقے کے حامی کمیونسٹوں کو دیکھتا ہے کہ وہ سوسائٹی کے اس محروم طبقے کی خاطر تو آزاد ممالک میں ہر جگہ اپنے آپ کو قید و بند کی صعوبتوں کے لئے پیش کرتے ہیں۔ ہر سنجیدہ آدمی کے ذہن میں فطری طور پر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اشتراکیت کے ان علمبرداروں کے پاس ضرور کوئی ٹھوس اور مثبت معاشی پروگرام ہوگا۔ جس کے ذریعہ سے سوسائٹی کے پس ماندہ طبقہ کے مسائل حل ہو سکیں گے۔ پھر اس خیال کو مزید تقویت اس بات سے پہنچتی ہے کہ طبقہ کی حمایت اور حق میں اشتراکیت کے ایک یہودی پیغمبر کارل مارکس نے معاشیات کی فنی زبان اور اصطلاحات میں نہایت گہرائی اور باریکی کے ساتھ جو ضخیم کتب بھی تصنیف کی ہیں کہ جن کو پورے طور پر سمجھنا ہر کس و ناکس کے بس کا روگ نہیں اور چونکہ خود کارل مارکس کے اپنے پیروؤں میں خصوصیت سے پس ماندہ ممالک میں زیادہ تر ایسے ہی لوگ ہیں۔ اس لئے خود ان میں بھی کارل مارکس کی شہرۂ آفاق کتاب "سرمایہ" کی تینوں جلدوں کا مطالعہ کرکے اور اسے سمجھ کر اشتراکیت کے معاشی پروگرام پر ایمان لانے والے شاذ و نادر ہی ہیں۔ لیکن اس ایمان کو "اندھے ایمان" میں تبدیل کرنے والا عنصر کمیونسٹوں کی قربانیوں یا مارکس کی موٹی موٹی کتابوں سے زیادہ چین اور روس کی معاشی ترقی کی رفتار ہے۔ جس کی چمک دمک معاشی ترقی کی منزل کی طرف دیکھنے والے پس ماندہ ممالک کے دانشوروں کی نگاہوں کو خیرہ کرنے کا بہت بڑا سبب ہے۔ چین اور روس کی معاشی ترقی کی حقیقت کیا ہے؟ اور اس میں اشتراکیت کے معاشی پروگرام کا دخل کس حد تک ہے اور دوسرے عوامل کا کس حد تک؟ تو یہ اس مضمون کا اصل موضوع نہیں ہے۔ لیکن ضمناً ہم اس سلسلہ میں بعد میں کچھ ضروری اشارے کریں گے۔

اشتراکیت کے معاشی پروگرام کے نظریاتی پہلو کے متعلق جو بات سب سے پہلے توجہ طلب ہے وہ یہ ہے کہ اشتراکیت کے معاشی پروگرام کا اثباتی پہلو اس سے زیادہ کچھ اور نہیں ہے کہ کسی طرح اقتدار حاصل کرکے تمام صنعتوں کو قومیانے (nationalisation) اور زراعت کو اجتماعی کھیتوں میں تبدیل کرنے کی کوئی متعین شکل اختیار کی جائے۔ اشتراکیت کا معاشی پروگرام صرف اسی "قومیانے" کے نتائج و عواقب کے گرد گھومتا ہے کہ اس کے کیا اچھے یا برے نتائج برآمد ہوں گے اور اس سلسلہ کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے طریقے کیا ہوں گے۔ اس سے بڑھ کر اشتراکیت کے معاشی پروگرام میں مثبت طور پر کچھ نہیں۔ کارل مارکس کی کتابوں کو پڑھے بغیر جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کارل مارکس نے اشتراکیت کے مقدمہ کو پرزور استدلال کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ مارکس نے اپنی کتاب کا نام "سرمایہ" رکھا ہے نہ کہ "اشتراکیت" اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اپنے نزدیک پوری وضاحت کے ساتھ "سرمایہ" یعنی سرمایہ دارانہ نظام میں پائے جانے والے "سرمایہ" کو اپنا موضوع بحث

بتایا ہے۔ مارکس کی تحریر کا بیشتر حصہ سرمایہ دارانہ نظام کے تجزیہ پر مشتمل ہے۔ اس کی ساری تنقیدوں کا ہدف سرمایہ دار طبقہ ہے جسے وہ بورژوا طبقہ کہتا ہے۔ یہ ایک منفی پہلو ہے۔ اس میں مثبت پہلو اگر کچھ ہے تو صرف اس حد تک کہ سرمایہ دار سے سب کچھ چھین کر حکومت کے حوالے کر دیا جائے جو کسی مرکزی منصوبہ کے تحت ملک کی معاشی ترقی کا نقشہ بنائے۔ یا پھر مارکس نے بہت زیادہ تفصیل سے کسی بات پر بحث کی ہے تو وہ اس کا "نظریہ قدر" ہے اور اس ساری بحث کا خلاصہ اور نتیجہ بھی یہی ہے کہ سارے حقوق محنت کار یا مزدور کے ہیں اور سرمایہ دار کو کسی بات کا کوئی حق نہیں، بلکہ اس طبقہ کا وجود ہی سرے سے ناقابل برداشت ہے۔ لہٰذا سرمایہ داروں سے سب کچھ چھین کر حکومت کو دے دو اور یہ فرض کر لو کہ ایسی جو حکومت بھی ہوگی وہ مزدوروں کی ہوگی۔ پھر مارکس کی "تاریخ کی مادی تعبیر" کا نظریہ بھی اپنے جدلیاتی عمل (dialectice Process) کے ذریعہ یہی خدمت انجام دے گا کہ سرمایہ دار کے ناپاک وجود کو صفحۂ ہستی سے ختم کر دے مطلب یہ کہ سرمایہ دار یا بورژوا طبقہ چاہے یا نہ چاہے تاریخ کی قوتیں، جو مارکس کی تعبیر تاریخ کی تابع فرمان ہیں، اس طبقہ کو خود بخود مٹا دیں گی۔ اس لئے اشتراکیت کے معاشی پروگرام کی تلاش میں کوئی طالب علم مارکس کے سارے صفحات چھان ڈالے تو اس کو سوائے اس کے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا کہ "سرمایہ دار کا وجود ختم کر دو، حکومت پر قبضہ کرو اور ہر چیز کو قومیا لو تو خود بخود سرخ جنت میں پہنچ جاؤ گے۔"

کارل مارکس کے بعد اشتراکیت کے متعدد ایڈیشن رونما ہوئے ہیں۔ اس کی مختلف شکلیں بنی اور بگڑی ہیں اور یہ ایک دوسرے سے خاصی مختلف بھی رہی ہیں، لیکن ان سب نے اپنے کو "اشتراکیت" سے اس بنا پر موسوم کیا کہ ان میں قدر مشترک یہ رہی ہے کہ یہ سب کسی نہ کسی درجہ میں "قومیانے" کے قائل ہیں اور وہ بھی کسی "منصوبہ بندی" کے تحت۔ اس طرح قومی ملکیت اور معاشی منصوبہ بندی اشتراکیت کے سارے معاشی پروگرام کا نچوڑ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس مشترکہ یا متفقہ مثبت پہلو کو روزمرہ کی معاشی زندگی میں کس طرح بروئے کار لایا جائے؟ اس سلسلہ میں مارکس اور اس کے پیرووں نے جو خدمات انجام دی ہیں پروفیسر بنجامن ای لپن کاٹ (Benjamin E. Lippincott) کی زبان سے سنئے جو خود اشتراکیت کی ایک مخصوص شکل کے علمبردار ہیں۔

"مارکسی معاشیین، مارکس کے بعد سے بالعموم اس کے "نظریہ قدر" ہی میں زیادہ تر الجھے رہے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے ان معاشی ہتھیاروں سے بالکل کوئی فائدہ نہ اٹھایا جنہیں قدیم معاشیین نے صیقل کیا تھا ....

.... اشتراکیت کی معاشیات کو روزمرہ کی زندگی میں عملاً بروئے کار لانے کا طریقہ بتانے میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی ذمہ داری اگرچہ کہ مارکسی معاشیین ہی پر بڑی حد تک عائد ہوتی ہے لیکن معاشیین کے علاوہ دوسرے سوشلسٹ اہل علم بھی اس میں کسی حد تک شریک ہیں۔ تاریخ، عمرانیات اور سیاسیات کے ویبز (Webbs) ٹاونی (Tawney) لاسکی (Laski) جیسے اہل علم نے ایک سوشلسٹ ریاست کے اداروں کی تشکیل کے سلسلہ میں قابل تعریف کام کئے ہیں لیکن ان لوگوں نے ایک ایسی سوشلسٹ ریاست کی "معاشیات" کی تحقیق کی ضرورت کا بھی اظہار نہیں کیا۔ ان لوگوں نے اس بات پر پوری طرح غور نہیں کیا کہ وہ معاشی شرائط جن کی تکمیل ایک اشتراکی ریاست کے قیام کے لئے ضروری ہے اور جو معیار زندگی تشکیل پاتا ہے، آیا وہ سرمایہ دارانہ نظام کے عطا کردہ نظام زندگی کے برابر ہے یا اس سے بہتر۔ اور نہ ہی انہوں نے فنی اعتبار سے سرمایہ داری کے مقابلہ میں اشتراکیت کے معاشی فوائد اور نقصانات کے مسئلہ پر ہی مناسب توجہ دی ہے۔ لیکن جب تک کہ وہ خود ایک اشتراکی ریاست کی معاشیات کا کوئی تصور نہ رکھتے ہوں اور جب تک کہ وہ اشتراکی ریاست کے تصور کو معاشی

بنیادوں پر بھی پیش نہ کر سکیں، اس وقت تک، خواہ وہ کتنے ہی اچھے مورخ اور علم سیاست کے ماہر کیوں نہ ہوں وہ کم ہی اس بات کی امید رکھیں کہ عوام الناس ان کے اس (یعنی اشتراکی) تصور ریاست کی طرف مائل ہونگے جسے وہ پرزور طریقے سے پیش کرتے ہیں[1]۔

اشتراکیت کے ایک ہمدرد کی طرف سے یہ اس بات کا صاف اعتراف ہے کہ اشتراکی ریاست کو تاریخی اور سیاسی بنیادوں پر تو پیش کیا گیا ہے۔ لیکن مثبت معاشی بنیادوں پر اس ریاست کے تصور کو نہ تو کارل مارکس ہی نے پیش کیا ہے اور نہ ہی اس کے بعد کے لکھنے والوں نے۔ مارکس سے سو تی صدی اتفاق نہ کرنے والے اشتراکی لکھنے والوں کے ذہن پر بھی اشتراکیت کے معاشی پہلو سے زیادہ اس کا سماجی پہلو غالب رہا ہے۔ اب مسئلہ دردوں، کسانوں اور پرولتاری طبقے کے حق میں نعرہ لگانے والوں سے اگر یہ سوال کیا جائے کہ معاشی بے انصافی، جس کے خلاف وہ زبانی جہاد میں مصروف ہیں، کا مثبت حل خود ان کے یہودی پیغمبر اور اس کے بعد کے مفکرین نے کیا پیش کیا ہے؟ اشتراکیت نے جس نعرہ کو بلند کیا ہے وہ "معاش" کے مسئلہ، روٹی اور کپڑے کے مسئلہ سے عبارت ہے۔ لیکن جو مثبت حل وہ پیش کرتی ہے: وہ معاشی مسئلہ کا نہیں، بلکہ اسکی حقیقت سماجی یا سیاسی ہے۔ تو معاشی مسئلہ کا اصل حل ان کے پاس صرف یہ ہے کہ وہ اقتدار پر قبضہ کریں۔ اسی بات کو اشتراکیت کے ہمدرد پروفیسر لے پن کوٹ آگے چل کر ان الفاظ میں پیش کرتا ہے۔

"تقریباً تمام سوشلسٹ، مارکس کے اس تصور سے کسی نہ کسی حد تک ضرور متاثر ہوئے ہیں کہ ایک اشتراکی معیشت کی عملی تشکیل کا مسئلہ اس وقت تک حل نہیں ہو سکتا، جب تک کہ سوشلسٹ خود اقتدار پر قبضہ نہ کر لیں"۔ ....[2]

کارل مارکس کی رو سے گویا اشتراکیت کا معاشی پروگرام یہ ہے کہ پہلے اقتدار پر قبضہ کرو۔ پھر سر جوڑ کر بیٹھو اور سوچو کہ اب ہمارا معاشی پروگرام کیا ہونا چاہیے اور جو بھی حکومت وقت یا اشتراکیوں کا مسند اقتدار پر مسلط طبقہ یا "اشتراکی بورڈ" طے کر دے وہی "اشتراکیت کا معاشی پروگرام" ہوگا۔ اشتراکی فکر منفی پہلو میں جس قدر مضبوط ہے، مثبت پہلو میں اسی قدر کمزور ہے۔ ہم اس بحث کو پروفیسر لی پن کوٹ کے اس آخری اقتباس پر ختم کرتے ہیں جس میں انہوں نے یہ بتایا ہے کہ اشتراکیوں نے اپنی ساری توجہ صرف سیاسی سرگرمیوں پر صرف کی ہے، اور اشتراکی معیشت کے مسائل کو حل کرنے کا توں آئندہ کے لئے اٹھا رکھا ہے، اور اس غفلت کا بنیادی سبب مارکس کے تصور تاریخ کو قرار دیا ہے جس کے تحت سوشلسٹ یہ یقین رکھتے ہیں کہ اشتراکیت کا آنا بہر حال ناگزیر ہے۔ اس لئے جب وہ آئے گی تب اس کی معاشیات سوچ لیں گے اور فی الحال تو اصل کام صرف سیاسی سرگرمیوں کے ذریعہ اقتدار پر قبضہ کی کوشش کرنا ہے۔

"........ بہت سے سوشلسٹوں نے مارکس کی تاریخ کے جدلیاتی نقطہ نظر سے "تن بہ تقدیر" والا انداز اختیار کیا ہے۔ کیونکہ اس تصور تاریخ کے تحت انہوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ سوشلزم کا آنا تو بہر حال ناگزیر ہے اس لئے اشتراکی معیشت کا مسئلہ اس وقت اپنے آپ حل ہو جائے گا۔ دوسرے سوشلسٹ جو اشتراکیت کو ناگزیر تو سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے "تن بہ تقدیر" والے انداز کے بجائے یہ سمجھتے ہیں کہ اشتراکیت کو ناگزیر بنانے کے لئے ان کی اپنی سعی و جہد بھی ضروری ہے

ان لوگوں نے اگر سیاسی وجہ کی بنا پر اپنی سعی و جہد کا مرکز و محور صرف سیاسی سرگرمیوں کو بنایا ہے اور معاشی پروگرام کو آئندہ کسی مناسب وقت کے لئے چھوڑ رکھا ہے۔[ے]

قومی ملکیت کے نتائج

صنعت و حرفت اور تجارت کو قومی ملکیت کے تحت چلانا، اشتراکیت کے معاشی پروگرام کی اصل بنیاد ہے۔ اسی اصل سے اشتراکی معیشت کی ساری شاخیں پھوٹتی ہیں۔ اس لئے ہم سب سے پہلے اس کے نتائج کا تفصیلی جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

پیداواری وسائل کی تقسیم و تعین کا مسئلہ

مارکیٹ میکانزم کا فقدان

صنعت و تجارت کو قومی ملکیت میں لینے کا سب سے پہلا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک ایسی معیشت وجود میں آتی ہے، جس میں آزاد مارکیٹ نہیں ہوتی۔ خرید و فروخت کے بازار تو انسانوں کی ہر بستی میں ہوتے ہیں، لیکن منڈی کے نظام (Market Mechanism) وجود نہیں ہوتا۔ ایک آزاد مارکیٹ میں خریداروں کی مانگ یا طلب کا اندازہ لگا کر ایک دکاندار اسی طرح کی چیزیں اپنی دوکان میں رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنی دوکان میں صرف ایسی ہی چیزیں رکھنے کی کوشش کرتا ہے جو خریداروں کے ذوق کے مطابق بھی ہوں اور جنہیں خریدار، خریدنے کی قوت بھی رکھتے ہوں۔ پھر خریدار کی اسی مانگ کا اندازہ لگا کر ایک آزاد معیشت میں کارخانہ دار ایسی ہی چیزوں کا کارخانہ لگاتا ہے۔ جو اس کے خیال میں آسانی سے اور معقول منافع پر بک جائیں۔ اگر کارخانہ دار یہ دیکھتا ہے کہ اس طرح کے کئی کارخانے وجود رکھتے ہیں اور اگر وہ بھی اسی شے کا کارخانہ لگائے گا تو معقول نفع نہیں ملے گا۔ بلکہ شاید اس کی تیار کردہ اشیاء کا فروخت ہونا ہی مشکل ہو تو پھر وہ کسی دوسری ایسی چیز کا کارخانہ لگانے کی کوشش کرتا ہے، جس کے زیادہ کارخانے مارکیٹ میں ابھی نہ لگے ہوں، اور جس کے لئے ابھی خریداروں میں مانگ موجود ہو۔ اس طرح ایک آزاد مارکیٹ والی معیشت میں صرف اتنے ہی کارخانے لگتے ہیں، جن کا وجود کسی نہ کسی حد تک نفع آور ہو۔ اس خاص حد کے بعد اس شے کے کارخانے مزید نہیں لگتے۔ اس خاص شے کے بنانے کے لئے جتنے معاشی وسائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے زائد پیدا آوری وسائل اسی شے کے بنانے میں ضائع نہیں ہوتے۔ کارخانہ دار نقصان اٹھانے کے لئے کارخانہ نہیں لگاتا۔ دوسرے الفاظ میں ملک کے معاشی وسائل بھی ضائع ہونے سے بچتے ہیں۔ کارخانہ دار محض اپنے آپ کو ہی نقصان سے نہیں بچاتا، بلکہ اپنے ساتھ ساتھ ملک کے پیدا آوری وسائل کو بھی بچاتا ہے۔ اب یہ بچے ہوئے پیدا آوری وسائل کسی دوسری شے کے کارخانہ میں استعمال ہوتے ہیں اور صرف اسی حد تک استعمال ہوتے ہیں۔ جس حد تک کہ وہ دوسری شے نفع آور رہتی ہے۔ جس حد پر جا کر وہ دوسری شے مارکیٹ میں نفع بخش نہیں رہتی۔ ٹھیک اسی حد پر ملک کے پیدا آوری وسائل کا استعمال بھی رک جاتا ہے۔ پھر ان پیدا آوری وسائل کا استعمال کسی ایسی تیسری شے کے کارخانہ میں ہوتا ہے، جو کہ مارکیٹ میں نفع آور ہو۔ غرض اس طرح ایک آزاد مارکیٹ والی معیشت میں کسی ملک کے تمام پیدا آوری وسائل کی تقسیم مجموعی طور پر اس طرح ہوتی ہے کہ

ے ایضاً صفحہ ۵

یہ وسائل کہیں بھی ضائع نہیں ہوتے بلکہ ہمیشہ کسی نفع بخش کام میں استعمال ہوتے رہتے ہیں۔ غیر معمولی یا ہنگامی حالات میں وسائل کی یہ تقسیم وقتی طور پر متاثر بھی ہوتی ہو تو آزاد مارکیٹ میں اس طرح کا رجحان کم از کم ضرور موجود رہتا ہے کہ وسائل ضائع نہیں ہوتے یا کم سے کم ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ مارکیٹ میکانزم کے فطری عمل یا قانون کے تحت ہوتا ہے۔ بشرطیکہ معیشت آزاد ہو اور دوسری قوتیں مثلاً حکومت وغیرہ اس میں کوئی مداخلت نہ کرے۔ اس میکانزم کے ذریعہ وسائل کی بہترین اور معقول تقسیم فطری طور پر ہوتی ہے۔

مارکیٹ کی یہی وہ میکانزم ہے جو ایک اشتراکی معیشت میں نہیں ہو سکتی۔ اشتراکی معیشت میں پیداآوری وسائل کی تقسیم مارکیٹ یا خریداروں کے رجحانات یا مانگ کی بنیاد پر نہیں ہوتی۔ وہاں تو خریدار اشتراکی حکومت کے رحم وکرم پر ہوتے ہیں کہ اشتراکی حکومت جو شئے بھی مارکیٹ میں فراہم کرے، صرف وہی شئے وہ خرید سکتے ہیں۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ اس رسد کی مقدار بھی خریداروں کی مانگ کے مطابق ہو۔ بعض اشیاء کی رسد خریداروں کی مانگ سے زیادہ ہوگی اور بعض کی کم۔ اشتراکی حکومت اپنی بے شمار مصلحتوں کو سامنے رکھ کر ملک میں کارخانے لگائے گی ان کارخانوں میں جو پیداآوری وسائل استعمال ہوں گے ان کی حد بندی کرنے کے لئے اشتراکی معیشت میں کیا بنیادیں ہوں گی؟ یہ بنیادیں مرکزی منصوبہ بندی بورڈ طے کرے گا نہ کہ مارکیٹ میکانزم کا فطری عمل۔

ایک اشتراکی معیشت میں طلب و رسد کے قانون کے تحت نہ قیمتوں کا تعین ہوتا ہے نہ ملک کے مجموعی پیداآوری وسائل کی تقسیم کا۔ بلکہ اشتراکی معیشت میں طلب و رسد کا قانون کام ہی نہیں کرتا۔ وہاں قیمتوں کا تعین بھی مانگ اور رسد کی کمی یا زیادتی کی بنیاد پر نہیں بلکہ مرکزی منصوبہ بندی بورڈ کے طے کردہ اصولوں کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ خواہ ایسی قیمتیں ایک خریدار کے نقطہ نظر سے معقول ہوں یا غیر معقول۔ خریدار کو یہ مہنگی لگیں یا سستی وہ مجبور ہے کہ ہر شئے کو اس قیمت پر خریدے جو حکومت نے اس کے لئے مقرر کر رکھی ہے۔ اس نکتہ کی تشریح پروفیسر پگو (Pigou) نے ان الفاظ میں کی ہے۔

> "۔۔۔۔۔۔ صاف ظاہر ہے کہ (ایک اشتراکی معیشت میں) مجموعی پیداوار ایک مرکزی منصوبہ کے تحت طے کی جاتی ہے اور اسی لئے تمام اقسام کی اشیاء صرف کے مجموعی صرف کا تعین بھی اسی مرکزی منصوبہ کے تحت ہوتا ہے۔ اس کا مطلب ہرگز نہیں ہے کہ روٹی جوتے اور اسی طرح کی دیگر اشیاء صرف جو ہر سال بنائی جاتی ہیں ان کی تعداد یا مقدار کا تعین صارفین کی عمومی مرضی، خواہش یا ضرورت کا خیال رکھے بغیر کیا جاتا ہے۔ صارفین کی ضرورتیں اس وقت ضرور سامنے رکھی گئی ہوں گی جب کہ پیداآوری وسائل کی تقسیم کی منصوبہ بندی کی گئی تھی۔ لیکن مختلف صارفین کی انفرادی پسند یا ذوق کے اختلاف کو لازماً پس پشت ڈالنا ہوتا ہے۔ ہر آدمی کے لئے جوتے، کپڑے اور روٹیوں کی کوئی خاص تعداد مقرر کر کے ہی کارپردازان حکومت کوئی راشن بندی (مرکزی منصوبہ کے تحت) کر سکتے ہیں۔ اس لئے کسی کے لئے اس بات کی آزادی باقی نہیں رہتی کہ وہ اپنے حصہ کے ایک ویسں کوٹ کے بدلے میں جوتوں کا کوئی زائد جوڑا مانگ سکے[1]"

اشتراکیت کے حامی یہ کہتے ہیں کہ تمام اشیائے صرف پر راشن بندی ضروری نہیں۔ یہ صحیح ہے۔ لیکن یہاں جو بات ہم سامنے لانا چاہتے ہیں وہ راشن بندی کا مسئلہ نہیں۔ بلکہ یہ کہ منصوبہ بندی کے کارپرداز ہر شئے صرف کا کوئی تخمینہ لگا کر صرف اسی مقدار یا تعداد میں اشیائے صرف مارکیٹ میں

---

[1] Socialism Versus Capitalism by A. C. Pigou P. 105

پائیں گے۔ اور اپنی طرف سے طے کردہ کسی خاص قیمت پر لائیں گے۔ پھر اس میں انفرادی ذوق کے اختلاف کو بھی زیادہ ملحوظ نہیں رکھ سکیں گے۔ منصوبہ بنانے والے صارفین کا کتنا ہی خیال رکھیں، پھر بھی صارفین کا انفرادی نقطۂ نظر (ضرورت، پسند اور خواہش) منصوبہ بنانے والوں سے کسی نہ کسی حد تک مختلف ضرور ہو گی۔ اس لئے ایسی اشتراکی مارکیٹ میں بہت سی اشیاء بلا فروخت مارکیٹ میں پڑی رہیں گی اور بہت سی اشیاء جن کی مانگ ہے وہ فراہم نہیں ہو سکیں گی۔ اس کے برعکس آزاد مارکیٹ میں ہر اس شے کے کارخانے لگ جاتے ہیں۔ جن کی مانگ زیادہ ہے اور رسد کم۔ اور ایسی آزاد مارکیٹ میں مسابقت کے سبب ہر کارخانہ دار صارف کی پسند اور ذوق کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھنے پر مجبور ہے تاکہ اس کے کارخانہ کی تیار کردہ اشیاء زیادہ سے زیادہ بکیں۔ لیکن منصوبہ بندی کرنے والے افراد کو ایسی کوئی مجبوری اشتراکی معیشت میں لاحق نہیں ہوتی۔ موجودہ اشتراکی روس میں خود کوسیگن صاحب نے کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے سامنے یہ مسئلہ رکھا ہے کہ بہت سی اشیاء فاضل پڑی ہیں جو ساری کوشش کے باوجود فروخت نہیں ہو رہی ہیں۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۶۵ء کے بعد کارخانوں کے منیجروں پر یہ پابندی بھی لگائی گئی ہے کہ وہ پیداوار کا ہدف پورا کرنے کے ساتھ ساتھ اس کو بیچنے کے بھی ذمہ دار ہیں۔ دوسری طرف بہت سی اشیائے صرف ایسی ہیں جو لوگ خریدنا چاہتے ہیں لیکن روس کی خارجہ پالیسی کی مصلحتیں اجازت نہیں دیتیں کہ اشیائے صرف، مانگ کے مطابق تیار کی جائیں۔ اشیائے صرف کے بجائے دفاعی اور ویت نام کے لئے جنگی پیداوار پر وسائل خرچ کرنے پڑ رہے ہیں اور جو تھوڑے بہت وسائل اشیائے صرف بنانے کے لئے مختص کئے گئے ہیں، اس میں ایسی چیزیں بن رہی ہیں، جن کے خریدار حکومت کے اندازے کے برعکس بہت کم نکلے اور وہ اشیاء فاضل پڑی ہیں اور جو اشیاء لوگ چاہتے ہیں حکومت ان کی مانگ کا اندازہ نہیں لگا سکی۔ اس طرح وہ اشیاء کہ جو زائد از ضرورت تیار ہوئیں، ان کی تیاری میں ملک کے جو پیداآوری وسائل صرف ہوئے وہ گویا سب ضائع ہوئے۔ پھر دوسری اشیاء مانگ کے باوجود کم سپلائی کی گئیں یعنی ملک کے پیداآوری وسائل کو ان اشیاء پر صرف نہیں کیا گیا، جن کی صارفین کو ضرورت تھی۔ اس طرح اشتراکی معیشت میں مارکیٹ میکانزم کی جگہ منصوبہ بندی بورڈ لیتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پیداآوری وسائل کی تقسیم یا تعین صحیح طور پر نہیں ہو پاتی۔ نہ صارفین کی مانگ کا اندازہ کرنے کا کوئی پیمانہ ہے اور نہ سپلائی کی مقدار کو طے کرنے کا۔ منصوبہ بندی بورڈ جو کچھ تخمینے لگاتا ہے۔ علاوہ وہ سب غلط ثابت ہوتے ہیں، کیونکہ تخمینہ کرنے کی کوئی ٹھوس بنیاد ہی نہیں ہے۔ زیادہ تر تخمینے الل ٹپ ثابت ہوتے ہیں۔ اسی لئے ناقابل فروخت اشیاء کے ڈھیر لگے رہتے ہیں۔

اشتراکیت میں "معاشیات کا فقدان" یہی وجہ ہے کہ اشتراکیت پر "معاشیات کے فقدان" کا الزام لگایا جاتا ہے۔ اس میں چونکہ کوئی آزاد مارکیٹ نہیں ہوتی، اور مارکیٹ کے طلب و رسد، آمدنی، سرمایہ کاری سے متعلق کوئی فیصلہ مارکیٹ کی اونچ نیچ دیکھ کر، اس کے فطری عمل کو ملحوظ رکھ کر نہیں کیا جاتا اس لئے ایسے نظام کی معاشیات میں کارفرما قوتیں بھی کوئی نہیں ہوتیں اگر کوئی کارفرما قوت ہوتی ہے تو وہ بس حکومت کی قوت ہوتی ہے جو کسی مارکیٹ میکانزم کے تابع نہیں، بلکہ ملک کی پوری معیشت کو ریاستی قوت کے تابع رکھتی ہے اور مارکیٹ کے فطری عمل کی جگہ اپنے مصنوعی (mechanism) عمل کو کارفرما کرتی ہے۔ اس مصنوعی عمل سے ایسی بے شمار پیچیدگیاں اور مسائل پیدا ہوتے ہیں کہ ان پیچیدگیوں اور مسائل کے حل کی کوششوں کو اشتراکیت کی معاشیات سمجھا جانے لگتا ہے۔

علم معاشیات کو وجود میں لانے والی دو حقیقتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ انسان کی ضروریات اور خواہشات غیر محدود ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کی تکمیل کرنے والے وسائل محدود ہیں۔ اس لئے اس علم کی ضرورت پیش آئی کہ ان محدود وسائل کا بہترین استعمال کیا اور کیسے ہو سکتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ انسانوں کی زیادہ سے زیادہ ضروریات کی تسکین ان محدود وسائل کے ذریعہ کی جا سکے۔ یہ معاشیات کا سب سے بنیادی مسئلہ ہے۔ آج

مسئلہ کی تحقیق نے اس علم کو جنم دیا ہے۔ لیکن اشتراکیت وہ نظام ہے جو اپنا بنیادی مقصد پورا کرنے میں قطعاً ناکام رہا ہے۔ نہ صرف یہ کہ اس بنیادی مسئلہ کے حل کرنے میں اشتراکیت سب سے زیادہ کمزور رہی ہے بلکہ اس کے بانی کارل مارکس کے متعلق اکثر معاشیین کی رائے یہ ہے کہ وہ اس کو بنیادی مسئلہ ہی سرے سے تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے۔ کیلیفورنیا یونیورسٹی کے پروفیسر (Howard J. Sherman) لکھتے ہیں کہ:

"...... آنجہانی اوسکر لانگے (Oscar Lange) جیسے مارکسی معاشیین کھلم کھلا یہ کہتے ہیں کہ وسائل کی تقسیم و تعیین کا کوئی نظریہ اشتراکیت کے منصوبہ بندی کے مسائل سے زیادہ قریب اور متعلق ہے" بہ نسبت سرمایہ دارانہ نظام کے ان مسائل کے کہ جن میں مارکس کو دلچسپی تھی۔ بلاشبہ مارکس کبھی یہ ماننے کے لئے تیار نہ ہوتا کہ محدود وسائل کی معقول تقسیم ہی سرمایہ داری کا اصل مسئلہ ہے۔ اس سے زیادہ وہ مجموعی پیداوار کی طبقاتی تقسیم اور اس سے متعلقہ سرمایہ داری کے ارتقائی رجحانات کی تحقیق کرنا چاہتا تھا۔ گویا مارکس بنیادی طور پر معاشیات سے نہیں بلکہ سیاسی معیشت (Political economy) سے دلچسپی رکھتا تھا۔[5]

مارکسی معاشیین پولینڈ کے پروفیسر اوسکر لانگے، جن کا اوپر تذکرہ آیا ہے۔ اشتراکیت کی تاریخ میں پہلے شخص ہیں، جنہوں نے کم از کم نظریاتی طور پر محدود وسائل کی تقسیم و تعیین کے مسئلہ کا اشتراکی حل پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن دوسرے کٹر اشتراکی معاشیین نے ان کے لئے اور ان جیسا نقطہ نظر رکھنے والے سوشلسٹوں کے لئے ایک گالی وضع کی ہے یعنی تجدد پسند یا مارکس اور اس کے پیرو خود تو اشتراکی معاشیات کا کوئی خاکہ پیش نہیں کرتے۔ مارکس کی تحریر کے تقریباً ۶۰ سال بعد تک یہ میدان خالی پڑا رہا ہے اور ۶۰ سال بعد ۲۵، ۱۹۲۴ء کے لگ بھگ لانگے نے اس طرح کی کوشش کی تو سارے وفادار مارکسی مخالفت میں صف باندھ کر کھڑے ہوگئے اور یہ کہنے لگے کہ یہ تو تجدد پسند (Revisionist) ہیں، مارکس کی جائز تعبیر کرنے والے تو ہم ہیں نہ کہ لانگے اور اس کے ساتھی۔

وینا کے مشہور معاشی مفکر پروفیسر فون میسز (Von Mises) نے ۱۹۲۰ء میں پہلی مرتبہ تمام اشتراکیوں کو چیلنج کیا کہ ایک اشتراکی نظام میں وسائل کی معقول تقسیم و تعیین ناممکن ہے۔ پروفیسر میسز کی اس تنقید کی بنیاد یہ تھی کہ ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت میں لینے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسی معیشت میں مارکیٹ کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ اشیائے صرف کے لئے تو پھر بازار ہوتا ہے کہ جہاں صارفین اپنی ضرورت کی اشیاء خریدتے ہیں اگرچہ وہاں بھی مارکیٹ میکانزم نہیں ہوتا۔ لیکن اشیائے پیداوار کے معاملہ میں مارکیٹ میکانزم تو کجا برائے نام بھی بازار نہیں ہوتا۔ یعنی ایسی اشیاء جو صارفین کے کام کی نہ ہوں، بلکہ جن سے صرف کارخانے لگائے جا سکتے ہوں یا جو صرف صنعت و حرفت ہی میں استعمال ہو سکتی ہوں، جیسے مختلف قسم کی مشینیں، لوہا یا مختلف آلات و اوزار وغیرہ کے لئے تو سرے سے کوئی مارکیٹ ہی نہیں ہوتی۔ کیونکہ ایسی چیزیں تو کوئی کارخانہ دار ہی خرید سکتا ہے۔ چونکہ کسی شخص کو ذاتی کاروبار یا ذاتی کارخانہ لگانے کی اجازت اشتراکیت کے نظام میں نہیں دی جاتی۔ اس لئے وسائل پیداوار کا کوئی خریدار ملک میں نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کی سے کوئی مارکیٹ ہوتی ہے۔ اور چونکہ ان کی کوئی مارکیٹ ہی نہیں ہوتی۔ اس لئے ایسی اشیاء کی قیمتوں کا معقول تعین کرنا بھی ممکن نہیں ہوتا۔ اور قیمتیں ہی وہ ذریعہ ہوتی ہیں، جن سے عوامل پیداوار کی تقابلی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس لئے قیمتوں کی عدم موجودگی میں کوئی معاشی تخمینہ یا حساب بالکل نہیں لگایا جا سکتا ہے۔ یعنی پیداآوری وسائل کی اہمیت یا ان کے استعمال کے عمل کو جاننے کے لئے کوئی پیمانہ ہی نہیں ہوتا (کیونکہ ان کی قیمتوں کا تعین ناممکن ہے) اس لئے اشتراکی نظام میں محدود وسائل کی معقول تقسیم بالکل ناممکن ہے۔ اپنی اس تنقید کو پیش کرتے ہوئے

---

5 Marxist Economics and Soviet Planing by Howard J Sherman P170-171

پیدا کیے جا سکتے ہیں

"معاشی تخمینہ کے بغیر کوئی معیشت، معیشت نہیں کہلائی جا سکتی۔ اس لئے ایک اشتراکی ریاست کی کوئی معاشیات نہیں ہو سکتی کیونکہ اس ریاست میں معاشی تخمینہ ناممکن ہے۔ .... ایسی ریاست میں، یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ وسائل کی کونسی تقسیم "معقول" ہے۔ اس لئے صاف ظاہر ہے کہ ایسی ریاست میں پیداوار معاشی بنیادوں پر یا معاشی نظریات کی بنا پر نہیں کی جا سکے گی۔ .... گویا جس میدان میں معقول رویہ (یعنی معاشی بنیادوں پر) اختیار کیا جانا چاہئے ٹھیک اسی میدان میں معقول رویہ اختیار نہ کیا جا سکے گا۔"[1]

پروفیسر میزیز کے اس چیلنج کے جواب میں اشتراکیوں کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ اس کا جواب ان کے اعتراض کرنے سے پہلے ہی ۱۹۰۸ء میں اٹلی کے معیشت دان بارون (Barone) نے اپنی کتاب "اشتراکی ریاست میں وزارت پیداوار" میں دے دیا ہے۔ جس میں بارون نے یہ ثابت کیا ہے کہ ایک آزاد معیشت میں جو مارکیٹ کے ذریعہ قیمتیں متعین ہوتی ہیں اسی طرح کی قیمتیں ایک اشتراکی معیشت میں فرض کی جا سکتی ہیں، جنہیں "حسابی قیمتیں" کہا جا سکتا ہے۔ بارون نے اٹلی کے دوسرے معیشت دان پریٹو (Pareto) کی تجاویز کے مطابق ریاضی کی (Simal-taneous Equations) استعمال کر کے اپنے نظریہ کو ثابت کیا۔ اشتراکیت میں وسائل کی معقول تقسیم کے امکان کو پریٹو نے پہلی مرتبہ ثابت کیا اور بارون نے اسی کو ریاضیاتی جامہ پہنایا اور یہ سب کچھ، اشتراکیوں کے کہنے کے مطابق پروفیسر فون میزیز کے چیلنج سے پہلے ہی ثابت کیا جا چکا ہے۔ بارون کی ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اشتراکیت کے مخالف معاشیین نے نظری طور پر تو یہ مان لیا ہے کہ "حسابی قیمتوں" کے ذریعہ اشتراکیت میں وسائل کی معقول تقسیم ہو سکتی ہے۔ لیکن عملاً یہ ممکن نہیں۔ چنانچہ لندن اسکول آف اکنامکس کے پروفیسر ہائیک (Hayek) اور رونبز (Robbins) نے بھی پوزیشن اختیار کی ہے کہ عملاً یہ "حسابی قیمتوں" والا اصول چل نہیں سکتا۔ یہ دونوں پروفیسر بھی یہی کہتے ہیں کہ اشتراکیت، معاشیات کے بنیادی مسئلہ یعنی وسائل کی معقول تقسیم کے سلسلہ میں عملاً اب تک ناکام رہی ہے۔ اس لئے اشتراکیت میں "معاشیات کے فقدان" کا الزام ابھی تک قائم ہے اس کو عملاً کسی اشتراکی ریاست نے آج تک کر کے نہیں دکھایا کہ جس چیز کو ان کا ایک گروہ نظری طور پر ممکن سمجھتا ہے۔ اس پر اس حقیقی دنیا میں عمل کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ نظری طور پر اس کو ممکن بتاتے ہیں ان کو کمیونسٹ معاشیین مارکس کا جائز وارث تسلیم نہیں کرتے بلکہ ان پر نجہ و بند کی پھبتی کستے ہیں۔

۲۔ لاگت اور قیمت کا اُلٹ پُلٹ تعین

اشتراکیت معاشی معاملات میں جو بے شمار پیچیدگیاں پیدا کرتی ہے ان میں سب سے اہم اور لاینحل مسئلہ لاگت اور قیمت کے تعین کا ہے۔ ایک آزاد مسابقت والی معیشت میں بے شمار خریدار اور بے شمار فروخت کنندہ یعنی بیچنے والے ہوتے ہیں۔ ان کے درمیان مسابقت کے سبب قیمت کا تعین بالآخر اس بات پر ہوتا ہے کہ کسی شے کی مانگ کتنی ہے اور اس کی بازار میں رسد کتنی۔ اگر طلب زیادہ اور رسد کم ہو تو زیادہ قیمت ملے گی۔ اور اگر مانگ کم اور رسد زیادہ ہو تو قیمت کم ملے گی۔ یہ طلب و رسد کا قانون ایک ایسی ہی معیشت میں چل سکتا ہے۔ جہاں آزاد مسابقت ممکن ہو لیکن ایک اشتراکی معیشت میں، جیسا کہ ہم پہلے واضح کر چکے ہیں، مارکیٹ نہیں ہوتی۔ اس لئے آزاد مسابقت کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ آزاد مسابقت کی جگہ بیچنے اور کارخانے لگانے کے اختیارات

---

1. F.A. Von Hayek, ed., "Collectivist Economic Planning" London 1935 Chapter by Von Mises P. 105.

حکومتی اداروں کے علاوہ اور کسی کو نہیں ہوتے۔ یعنی رسد کا منبع ایک ہی ہوتا ہے۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں اجارہ داری ہوتی ہے۔ صارف جس طرح سرمایہ داری میں اجارہ دار کے سامنے بے بس ہوتا ہے، اسی طرح اشتراکی نظام میں بھی بے بس ہوتا ہے، فرق یہ ہے کہ سرمایہ داری میں بعض اشیاء ایسی بھی ہوتی ہیں۔ جن کی رسد پر کسی کا کوئی اجارہ نہیں ہوتا اور کسی حد تک آزاد مسابقت کا موقع ہو سکتا ہے لیکن اشتراکیت میں اس کا کوئی موقع نہیں ہو سکتا۔ تمام اشیاء پر حکومتی اداروں کا اجارہ لازماً ہوتا ہے۔ گویا سرمایہ دارانہ نظام میں صارف کسی حد تک بے بس ہوتا ہے تو اشتراکی نظام میں سو فی صد بے بس ہوتا ہے۔ سیاسی آزادی کا تو خیر کیا سوال ہو سکتا ہے۔ معاشی طور پر بھی روٹی اور کپڑے کے لئے بھی سو فی صدی حکومت پر انحصار کرنا ہوتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے کئی سرمایہ داروں کے چنگل سے نکل کر اشتراکیت کے واحد لاشریک لہٗ سرمایہ دار کے چنگل میں جا پھنسنے کا نام کمیونسٹ ڈکشنری میں حقیقی "آزادی" ہے۔

طلب و رسد کے قانون میں اب تک ہم رسد کے پہلو پر گفتگو کر رہے تھے۔ اب طلب یا مانگ کے پہلو کو دیکھئے۔ اس کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک تو اشیائے صرف کی مانگ اور دوسرے پیدا آوری اشیاء کی مانگ۔ اپنی بات کو واضح کرنے کے لئے فی الحال ہم صرف پیدا آوری اشیاء کی مانگ کے معاملہ کو سامنے لانا چاہتے ہیں۔ ایک اشتراکی نظام میں ان کی مانگ عوام کو نہیں بلکہ حکومت ہی کو ہوتی ہے۔ کیونکہ کوئی فرد ذاتی کارخانہ نہیں لگا سکتا، بلکہ سارے کارخانے صرف حکومت ہی لگا سکتی ہے۔ یعنی پیدا آوری اشیاء کی سپلائی کرنے والی بھی حکومت اور ان کی مانگ پیدا کرنیوالی بھی حکومت۔ اگر طلب و رسد کے قانون کے تحت قیمتوں کا تعین کرنے کی کوشش کی بھی جائے تو ایک اشتراکی نظام میں یہ کیونکر ہو سکتی ہے؟ یہاں جو طلب کرنے والا ہے وہی سپلائی کرنے والا بھی ہے۔ اس لئے قیمت مقرر کرنے والی کوئی اور قوت کیسے ہو سکتی ہے۔ قیمت بھی خود مقرر کرنی ہوگی جب قیمت کا تعین کرانیوالی کوئی بیرونی قوت موجود نہ ہو تو پھر قیمت کے تعین کا پیمانہ، خود اپنے ہی لئے، کیا مقرر کیا جائے؟ خود حکومت ہی کو یہ بات جاننے کی ضرورت ہوتی ہے کہ جو کارخانہ بھی وہ لگائے گی اس کی لاگت کیا ہوگی، اس لاگت کو معلوم کرنے کے لئے اس کارخانہ میں استعمال ہونیوالی پیدا آوری اشیاء کی قیمت کا معلوم ہونا ضروری ہے۔ لیکن پیدا آوری اشیاء کی قیمت متعین کرنے کا کوئی پیمانہ، کوئی اصول، کوئی قانون موجود نہیں ہے۔ اشتراکیت میں یہ ایک ایسی پیچیدگی ہے کہ جس کا کوئی تسلی بخش حل آج تک سامنے نہیں آ سکا۔ ایسی صورت حال میں اشتراکی ادارے مجبور ہیں کہ وہ ان قیمتوں کا تعین الل ٹپ ([illegible]) کریں۔ لہٰذا اس پر کارخانہ کی لاگت کا اندازہ بھی الل ٹپ ہوگا۔

سرمایہ دارانہ نظام میں اجارہ دار کے پاس قیمت کے تعین کا ایک اصول ضرور موجود ہے۔ وہ ہے اس کی ذاتی منفعت۔ یہ اصول برا ہے لیکن کوئی بنیاد تو ہے جس پر وہ قیمت متعین کر سکتا ہے۔ لیکن اشتراکی حکومت پیدا آوری اشیاء پر کس سے منافع لے گی؟ اپنے آپ ہی سے؟

اب اشیائے صرف کی لاگت کا معاملہ لیجئے۔ اشیائے صرف تیار کرنے کے جتنے کارخانے بھی ہوں گے۔ ان کو لگانے کے لئے مشینیں اور ایسی ہی لاگتی چیزیں لگیں گی جنہیں پیدا آوری اشیاء کہا جاتا ہے۔ اس طرح تیار کی ہوئی اشیائے صرف عوام کو بیچنے سے قبل ان پر کچھ منافع اور ٹیکس لیا جاتا ہے لیکن یہ منافع اور ٹیکس اس شے کی لاگت پہلے معلوم کرکے اس لاگت پر منافع اور ٹیکس لگا کر شے کی قیمت فروخت طے کی جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ لاگت کیسے معلوم ہو؟ کارخانہ میں استعمال ہونے والی پیدا آوری اشیاء کی قیمت سے۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ پیدا آوری اشیاء کی قیمت مقرر کرنے کا پیمانہ "الل ٹپ" ہے اس لئے اشیائے صرف کے کارخانوں میں استعمال ہونے والی ان پیدا آوری اشیاء کی الل ٹپ قیمت کی بنیاد پر اشیائے صرف کی جو لاگت بھی دریافت کی جائے گی وہ بھی "الل ٹپ" قرار پائے گی۔ ایک ایسے نظام کو جو بلا کسی معقول معاشی اصول کے چل رہا ہو اپنے سارے دکھوں کا مداوا سمجھنے سے پہلے انسان کو ہوش و حواس کو رخصت دینی پڑتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ پھر ہر ملک میں ایسے رنگ کیوں پلٹ جاتے

ہیں۔ جو اس نظام کے پشتو ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ اشتراکی نظام کے بہت پہلو سے زیادہ سرمایہ داری کو فنا کرنے کے منفی پہلو میں زیادہ اپیل محسوس کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ سب لوگ سرمایہ دارانہ نظام کی معاشی لوٹ کھسوٹ سے دل جلے ہوتے ہیں۔ ان کے لئے نجات کا مذہب یہ ہے وہ مشرق میں اور جن کے پاس شمع ہدایت ہے وہ پڑے سو رہے ہیں اور خود نہیں جانتے کہ ان کے پاس کوئی شمع ہے!

اشتراکیوں کے جواب

اشتراکیوں نے اپنے نظام پر اس اعتراض کے جواب میں کردہ "حل" پیش کیا ہے جو ابھی پیش کی ہیں ان کو تین بڑی قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اب ہم انہی جوابات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

پہلا جواب۔ ریاضیاتی حل

اس کو "ریاضیاتی حل" بھی کہا جاتا ہے۔ یہ پروفیسر فرڈ ایم ٹیلر (Fred M. Taylor) اور اوسکر لانگے کی کتاب (On The Economic Theory of Socialism) میں یہ جواب پیش کیا گیا ہے اصل جواب تو لانگے نے دیا ہے۔ لیکن لانگے نے اپنے خیالات کی بنیاد امریکہ کے پروفیسر ٹیلر کے ایک پرانے مقالہ "ایک اشتراکی ریاست میں پیداوار کی رہنمائی" پر رکھی ہے۔ یہ کتاب سب سے پہلے ۱۹۳۸ء میں چھپی تھی یعنی کارل مارکس کے "سرمایہ" کے تقریباً ۷۰ سال بعد۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ خود اشتراکی حلقوں میں اس کو کوئی نمائندہ جواب نہیں سمجھا جاتا بلکہ لانگے کو اپنے ان خیالات کی بناء پر جدید پرست کہا جاتا ہے۔ لیکن ان کٹر اشتراکیوں کے پاس اس سے بہتر کوئی دوسرا جواب بھی نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ مارکس کے ۷۰ سال بعد لے دے کر جو کچھ بھی کوئی مدلل جواب دینے کی کوشش کی گئی تو وہ اشتراکیت کے اصولوں سے انحراف کر کے۔ اشتراکیت کے اصل اصولوں کی نئی تعبیر اور تشریح کر کے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس تنقید کا کوئی جواب یا اس پیچیدگی کا کوئی حل اگر پیش بھی کیا جا سکتا ہے۔ تو وہ بھی اشتراکیت کے اصل اور مارکسی اصولوں سے ہٹنے کے بعد۔

اس جواب میں پہلے تو یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ اشتراکی نظام میں قیمتوں کے تعین کرنے والا ادارہ حسب ذیل مواد یا اعداد و شمار معلوم کر سکے گا۔ (۱) طلب کی جدولیں۔ یعنی صارفین کی طرف سے یہ معلومات کہ کتنی قیمت پر کسی شئے کی کتنی مقدار وہ خریدنے کو تیار ہیں۔ اگر قیمت بدلے تو ان کی خریداری کیسے بدلے گی اور ان کا یہ فیصلہ کس شئے کے معاملہ میں کیا ہوگا۔ یہ سب کچھ محض کوئی اندازہ اور تخمینہ نہیں بلکہ متعین اعداد و شمار معلوم ہونے چاہئیں کہ جن کی مدد سے حکومتی ادارہ طلب کی جدولیں تیار کر سکے۔

۲۔ متبادل اشیاء پیش کرنے کی مدود "کی جدولیں مثلاً کوئلہ استعمال کر کے بھاپ کی طاقت یا تیل یا بجلی کی طاقت، ان تینوں میں سے کس کے استعمال سے کیا فرق پڑے گا، اس کی معلومات۔ یا یہ کہ روٹی اور چاول میں سے کس کی کتنی مقدار ایک دوسرے کی نعم البدل ہو سکتی ہے۔ ہر شئے کے بدلے میں دوسری کون سی شئے استعمال ہو سکتی ہے اور دوسری شئے کے استعمال کی صورت میں دونوں کی مقداروں میں کیا تناسب ہونا چاہیئے کہ ایک کی کس مقدار کے بدلے میں دوسرے کی کتنی مقدار افادیت کے لحاظ سے برابر ہو سکتی ہے۔ اس طرح معیشت میں پائی جانے والی یا مذکور ہر شئے کے تمام ممکنہ نعم البدل اور ان کی ضروری مقداروں کی جدولیں تیار کرنی ہوں گی (۳) ہر شئے کی اور ہر پیداآوری عامل کے ہر قسم کی موجود لمحہ قابل استعمال مقداروں کی جدولیں۔

یہ ساری جدولیں موجود ہوں تو ریاضی کی مساواتیں (Equations) بنائی جا سکتی ہیں جن کی مدد سے تمام اشیاء کی حسابی قیمتیں معلوم کی جا سکتی ہیں۔ ان مساواتوں کو حل کرنے کے لئے تجربہ و خطا (Trial and Error) کے طریقہ پر پہلے کچھ قیمتیں فرض کر لی جائیں اگر اس بنیاد پر یہ ساری مساواتیں حل ہو جائیں تو یہی اصل قیمتیں قرار پائیں۔ ورنہ پھر کچھ دوسری قیمتیں فرض کی جائیں اور انہیں آزما کر دیکھا جائے۔ اس

طرح کئی آزمائشوں کے بعد قیمتیں معلوم کی جائیں کہ کون سی مناسب رہیں گی۔

اگر نظری طور پر یہ مان بھی لیا جائے کہ ایسا کرنے سے قیمتوں کے تعین کا کوئی راستہ نکل آئے گا اور "اِل شپ" عمل سے نجات ملے گی تب بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ جن جدولوں کی بنیاد پر یہ سب کچھ کیا جائے گا۔ ان جدولوں کی تشکیل اور صحت ممکن ہے۔ مثلاً صارفین کی مانگ کی جدولیں بنانا اور مختلف مفروضہ قیمتوں پر مفروضہ مانگ کا اندازہ کرنا اور وہ بھی سال بھر پہلے کہ اگلے سال فلاں فلاں اشیاء فلاں فلاں داموں پر فراہم کی جائیں گی تو فلاں فلاں مقدار میں بک جائیں گی۔ اگر یہ کام اتنا ہی آسان تھا تو مسٹر کوسی گن کیوں اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ بہت سی اشیائے صرف کے ڈھیر پڑے ہیں جو بکتے نہیں اور کتنی ہی مشینیں ہیں کہ جنہیں کام پر نہیں لگایا گیا۔ چنانچہ ۱۹۶۶ تا ۱۹۷۰ کے لئے جو نیا پانچ سالہ منصوبہ تیار کیا گیا ہے اس کی رپورٹ کمیونسٹ پارٹی کی ۲۳ ویں کانگریس میں پیش کرتے ہوئے اس کے مقاصد میں ایک مقصد کوسی گن صاحب نے یہ پیش کیا ہے۔

"اس منصوبہ کے دوسرے اہم مقاصد حسب ذیل ہیں .... بے کار پڑی ہوئی مشینوں کی تعداد اور بکے بغیر پڑی ہوئی اشیاء کے ڈھیر میں کمی کرنا .... ے"

اسی رپورٹ میں دوسری جگہ مسٹر کوسی گن فرماتے ہیں

"بعض اشیاء کی طلب پورے طور پر تکمیل نہیں پا رہی ہے اور بعض جگہوں پر وہ اشیاء کہ جو ڈھیروں پیدا کی جا رہی ہیں ان کی فروخت غیر تسلی بخش ہے۔" ۵

اگر پروفیسر لانگے کے خیال کے مطابق مانگ کی جدولیں تیار کرنا ممکن العمل ہے تو پھر آخر یہ مسٹر کوسی گن کو ان سے بیر کیوں ہو گیا ہے کہ انہوں نے کانگریس میں جو ۲۹ مارچ سے ۸ اپریل ۱۹۶۶ تک ماسکو میں منعقد ہوئی تھی صاف الفاظ میں یہ اعتراف کیا ہے کہ

"ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اشیاء کے ذخائر اور عوام کی طرف سے ان کی مانگ کے درمیان پورا توازن پیدا کریں۔ شعبۂ تجارت میں کام کرنے والے افراد ابھی تک صارفین کی طلب کا تخمینہ لگانے کا نظام منظم کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ سے تجارتی اداروں کے کام میں غلطیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ عوام کو بعض اشیاء کی سپلائی ڈھنگ سے نہیں ہو پا رہی ہے اور دوسری طرف بے شمار مثالیں ایسی ہیں کہ اشیاء کے ذخائر ضرورت سے زیادہ بڑھتے جا رہے ہیں، اور نقصانات بھی بڑے پیمانہ پر ہو رہے ہیں۔" لہ

مارکیٹ کے فطری عمل کو ختم کرنے کے بعد نوبت بایں جا رسید کہ مقامی طور پر بھی صارفین کی طلب کا صحیح اندازہ نہیں ہو پا رہا ہے کجا یہ کہ پورے ملک کی طلب کی جدولیں بنا کر ان کی بنیاد پر ریاضیاتی مساوات حل کر کے قیمتیں طے کی جائیں۔ قیمتوں کے اِل شپ تعین کے اعتراض کے جواب میں جو لمبی چوڑی تشریح انفراکیٹ میں ترمیم و تبدیر کر کے پیش کی گئی تھی اس کا بھی یہ حال ہے کہ حقیقت کی پہلی ہی ٹھوکر پر چور چور ہو گئی۔

ے 23rd Congress of the C.P.S.U.: 1966 Novosti Press Agency Publishing House Moscow P. 185

۵ ایضاً صفحہ ۲۲۳

لہ

اس دیہاتی بل پر اور بھی بہت سے اعتراضات ہیں۔ لیکن ہم اس بحث کو یہیں ختم کر کے اشتراکیوں کے دوسرے جواب پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

دوسرا جواب

لیکن یہ دوسرا جواب دراصل اشتراکیت میں بنیادی ترمیم کا نسخہ پیش کرتا ہے۔ اس لئے اس جواب کی زیادہ وقعت نہیں ہے۔ اگر اشتراکیت کی پیدا کردہ کسی پیچیدگی کا حل یہ پیش کیا جائے کہ اشتراکیت کی اصل روح ہی کو ختم کر دیا جائے تو یہ دراصل جواب نہ ہوا، بلکہ اس بات کا اعتراف ہوا کہ اشتراکیت رہی تو یہ مسئلہ لاینحل ہے۔ اس لئے ہم اس جواب کو نہایت مختصراً پیش کریں گے۔

اس کو "مسابقت کا حل" کہا جاتا ہے۔ اسے زیادہ تفصیل سے برطانیہ کے پروفیسر ڈکنسن (Dickinson) نے "اشتراکیت کی معاشیات" نامی اپنی کتاب ۱۹۳۹ء میں پیش کیا، اس سے ملتی جلتی باتیں مسٹر پال، مسٹر پیگو اور مسٹر بائی وغیرہ نے اپنی مختلف کتابوں میں پیش کی ہیں۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اشتراکیت کے اندر بھی "مسابقت" کو کسی طرح قائم رکھا جائے۔ نیم سرکاری خود مختار ادارے جیسے ہمارے ہاں مشرقی اور مغربی پاکستان کی پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی وغیرہ ہیں، یہ ایک دوسرے سے مسابقت کریں اور قیمتوں کا تعین اس مسابقت کے نتیجے میں طلب و رسد کے قانون کے تحت ہو

یہ جس نوعیت کا حل ہے اسے اشتراکیت سے زیادہ "سرمایہ داری میں منصوبہ بندی کا نظام" کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ خود سرمایہ دارانہ نظام میں بھی جہاں مارکیٹ موجود ہوتی ہے۔ ایسے ادارے کسی حد تک ایک دوسرے سے مسابقت کرتے یا کر سکتے ہیں لیکن ہر شخص بخوبی جانتا ہے بھلا ایسے ادارے اشتراکیت میں کیا خاک مسابقت کر سکیں گے۔

روس کی موجودہ لیڈرشپ مسٹر کوسی گن اور مسٹر بریزنیوف اشتراکیت کی گذشتہ ۵۰ سالہ کوششوں کی ناکامیوں اور تجربات کی روشنی میں اس سے ملتی جلتی شکل اختیار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کا جائزہ ہم انشاء اللہ "نفع کے محرک" کے کسی عنوان کے تحت آگے لیں گے۔

تیسرا جواب

تیسرا جواب جس گروہ کی طرف سے آیا ہے اس کے سرخیل مسٹر ماریس ڈاب ہیں جنہوں نے اپنی کتاب Political Economy and capitalism میں ۱۹۳۷ء میں اپنے ان خیالات کا اظہار کیا تھا۔ ان کے جواب کا نمونہ کچھ اس طرح سے ہے کہ کوئی کام۔ "اگر میں نہیں کرتا تو کیا ہوا تو بھی تو نہیں کرتا۔" یعنی اشتراکیت میں قیمتوں کا الل ٹپ تعین ہوتا ہے تو کیا ہوا سرمایہ داری میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنا سارا زور یہ سمجھانے میں صرف کیا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں صارف اپنی طلب میں کہاں آزادانہ فیصلہ کرتا ہے سرمایہ داری میں صارف کی جہالت یا آمدنی کا تفاوت، پبلسٹی یا اشتہارات کا دباؤ، اور اجارہ داریاں وغیرہ صارف کو آزاد فیصلہ کرنے نہیں دیتیں بلکہ اس کی مانگ ان ہی سب غیر معقول عوامل کے زیر اثر پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے صارف تو بہرحال پٹتا ہی ہے تو سرمایہ داروں سے کیوں پٹے اشتراکی حکومت سے پٹنا انسانی فلاح و بہبود کے لئے زیادہ بہتر ہے۔ اشتراکی حکومت اگر قیمتوں کے الل ٹپ تعین کے ذریعہ انسانی فلاح و بہبود میں اضافہ کرتی ہے تو اس میں کیا حرج ہے۔!

یہ جواب کوئی جواب نہیں ہے بلکہ "الل ٹپ" تعین کی مجبوری کو جائز ثابت کرنے کی کوشش ہے۔ اور مزید یہ کہ چونکہ سرمایہ داری اس سے زیادہ بری ہے۔ اس لئے یہی بہتر ہے۔ سرمایہ داری بری ہے تو ہم بھی اسے برا ہی کہتے ہیں۔ لیکن ایک برائی کو چھوڑ کر دوسری کو اختیار کرنے کے علاوہ کیا انسانی فلاح کا کوئی اور تیسرا راستہ نہیں ہے؟ ہمارے نزدیک یہ دراصل نتیجہ ہے الہامی ہدایت سے بے نیازی کا۔ انسان اگر اس کو چھوڑ دے تو اسے ادھر چین ملتا ہے نہ ادھر۔ کمال انسانیت بس اسی میں رہ جاتی ہے کہ دو برائیوں میں سے کس کو اختیار کرے۔؟

۴۔ اشتراکی منصوبہ بندی کی حقیقت

صنعت و کاروبار ہر چیز کو قومی ملکیت میں لینے کے بعد ملک کی معاشی گاڑی چلانے کا واحد ذریعہ منصوبہ بندی ہی رہ جاتی ہے۔ صرف منصوبہ بندی ہی اگر مقصود ہو تو اس کے لئے قومیانا

ضروری نہیں ہے۔ ایک آزاد معیشت میں بھی منصوبہ بندی کی جا سکتی ہے۔ بھارت، پاکستان دونوں اشتراکی ملک نہیں ہیں۔ لیکن اپنی معاشی ترقی ۵ سالہ منصوبوں کے ذریعہ کر رہے ہیں۔ اس لئے منصوبہ بندی کوئی اشتراکیت کا طرۂ امتیاز نہیں رہی ہے۔ بلکہ آزاد معیشت میں ہونے والی منصوبہ بندی میں، چونکہ مارکیٹ اور اس کا فطری عمل موجود ہوتا ہے اس لئے اس فطری عمل کی روشنی میں مانگ، رسد کا اندازہ لگا کر، آمدنی اور کارخانوں کی ضرورت کا اندازہ لگانا، غرض سارے تخمینے زیادہ آسان اور نسبتاً زیادہ بہتر طریقے پر ہو سکتے ہیں۔ اس کے برعکس اشتراکی منصوبہ بندی نہایت پیچیدہ صورت حال سامنے لاتی ہے۔ جس کی بنیادی وجہ ہر چیز کو قومی معیشت بنا کر مارکیٹ کے فطری وجود کو ختم کرنا ہے۔ منصوبوں کی کاغذی دنیا اور حقیقت کی دنیا کو ملانے والا پل مارکیٹ کی شکل میں موجود نہیں ہوتا۔ اس پل کے نہ ہونے کے سبب منصوبوں کی دنیا اور حقیقت کی دنیا ہمیشہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہی رہتے ہیں۔ اس علیحدگی کے نتائج ہم دکھا چکے ہیں، کچھ اب دکھائیں گے اور باقی اگلے عنوانات کے تحت آئیں گے۔ اشتراکیت میں منصوبہ بندی کے علاوہ کوئی اور ذریعہ سرے سے ہوتا ہی نہیں ہے۔ اس لئے اشتراکیت کے معاشی پروگرام کے متعلق جو کچھ ہم نے اب تک لکھا ہے اور جو کچھ آئندہ لکھیں گے، وہ سارے کا سارا اشتراکی منصوبہ بندی ہی کے تحت آئے گا۔ ہم اسے خواہ اشتراکیت کا معاشی پروگرام کہیں یا قومی ملکیت میں لینے کے نتائج کہیں یا اشتراکی منصوبہ بندی کہیں، الفاظ ضرور مختلف ہیں، لیکن بات ایک ہی ہے۔ یہ تینوں باتیں ایک دوسرے سے اس قدر مربوط اور متعلق ہیں کہ ایک کو دوسرے سے علیحدہ کر کے پیش کرنا ناممکن ہے۔ اشتراکی منصوبہ بندی کا علیحدہ عنوان قائم کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دوسرے عنوانات کے تحت ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ منصوبہ بندی کے نتائج نہیں ہیں۔ یہاں تو صرف چند خصوصیات کی طرف اشارہ کرنا ہی مقصود ہے۔

پروفیسر پیگو کا ماڈل

نظری طور پر خواہ یہ اشتراکی پروپیگنڈا کتنا ہی بھلا لگتا ہو کہ اشتراکی منصوبہ بندی، جو مکمل منصوبہ بندی ہے، ہر اقدام جانچ تول کر کر سکتی ہے اور ملک کی معاشی ترقی بغیر کسی رکاوٹ کے تیز رفتاری سے کر سکتی ہے۔ وغیرہ لیکن پروفیسر پیگو کے الفاظ میں۔

> ”ایک مثالی طور پر مکمل نظام جو ہموار طریقہ پر اچھی طرح چلتا رہتا ہو بہتر ہے بہ نسبت اس نظام کے جو مثالی طور پر اگرچہ برتر ہو لیکن عملاً جس کی مشین بگڑتی اور چرخ چوں کرتی رہتی ہو۔۔۔“ [1]

بہترین منصوبہ بندی کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس کے تحت وسائل و ذرائع کی بہترین تقسیم و تعین ہو۔ منصوبہ بندی کے معنی ہی یہ ہوتے ہیں کہ تمام وسائل و ذرائع کو بہترین طور پر کام میں لایا جائے اور ملک کی ساری دولت کہیں بھی، کسی منزل پر بھی ضائع نہ ہو۔ اور اشتراکی حضرات بھی دعویٰ اسی کا کرتے ہیں کہ اشتراکیت کی مکمل منصوبہ بندی ہی کے ذریعہ سے یہ ممکن ہو سکتا ہے۔ اصل میں نظری طور پر اس سے انکار کرنے کی کوئی وجہ ہمیں بھی نظر نہیں آتی۔ لیکن بات وہی ہے کہ کیا واقعی عملاً ایسا کرنا ممکن ہے۔ اس کے عملی امکان کے متعلق ہم نظری طور پر کسی نتیجہ پر ضرور پہنچ سکتے ہیں۔ اس امکان کو پروفیسر پیگو نے اپنی کتاب ”اشتراکیت بمقابلہ سرمایہ داری“ میں نہایت خوبی سے واضح کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ اشتراکی منصوبہ بندی کے نتیجہ میں وسائل کے صحیح استعمال میں بے شمار غلطیوں کا ہونا ایک لازمی اور فطری امر ہے۔ وسائل و ذرائع [illegible] کے چند پہلو ہم اس مضمون کی ابتداء میں ظاہر کر چکے ہیں اور اب ہم اس منزل پر پہنچ چکے ہیں کہ اس کے دوسرے پہلو بھی پروفیسر پیگو

---

[1] A. C. Pigou, *Socialism versus Capitalism*, University of Cambridge p. 102.

کے ماڈل کی بنیاد پر وضاحت کے ساتھ سامنے لے آئیں۔
یہ ہم پہلے ہی واضح کر چکے ہیں کہ وسائل کی بہترین تقسیم ایک آزاد معیشت ہی میں ہو سکتی ہے۔ ایک آزاد معیشت میں جہاں آزادانہ مسابقت
ممکن ہو۔ اگر وسائل کی "مثالی" تنظیم و تقسیم مقصود ہو تو یہ آزاد مسابقت مکمل طور پر آزاد ہونی چاہیئے۔ یعنی اس آزادی کو کوئی اختیار بازی یا اجارہ داری
متاثر نہ کر سکے۔ اشتراکی یہ کہتے ہیں کہ وہ مکمل منصوبہ بندی کے ذریعہ وسائل کی "مثالی" تنظیم کر سکتے ہیں اور بغیر آزاد مسابقت اور بغیر مارکیٹ کے کر سکتے
ہیں۔ ہم اس منزل پر اسی دعویٰ کا جائزہ لینا چاہتے ہیں کہ کیا واقعی اشتراکی منصوبہ بندی کے پاس کوئی ایسا حربہ ہے کہ بغیر مسابقت اور مارکیٹ کے وہ
جہانگیر منصوبہ بندی کی تنظیمی نوعیت کی بنیاد پر وسائل کی "مثالی" تقسیم کر سکیں۔؟
پیدا آوری وسائل کی مثالی تنظیم یا تقسیم ایک ایسی معیشت میں سمجھی جائے گی۔ جس میں تمام تیار شدہ اشیاء فروخت ہو جائیں اور کوئی غیر ضروری
اشیاء کا ذخیرہ نہ رہے اور یہ فروخت بھی ہوں ایسے دام پر کہ کوئی نقصان نہ ہو۔ کم از کم لاگت اور کچھ تھوڑا سا معقول منافع نکل آئے۔ گویا کہ قیمت فروخت
کم و بیش لاگت کے برابر یا اس سے ذرا سی کچھ زائد ہو۔ ایسی صورت حال جس معیشت میں بھی پیدا ہو۔ ایسی معیشت میں تمام کارخانوں میں استعمال میں لائی
جانے والی پیدا آوری اشیاء گویا خوب کام آئیں۔ ملک کے سارے وسائل جو پیدا آوری اشیاء اور محنت وغیرہ کی صورت میں کارخانوں میں لگے اور ان کارخانوں
کا سارا مال لاگت کے برابر یا کچھ زائد مناسب داموں پر بک گیا اور اسی کو وسائل کی بہترین اور مثالی تقسیم یا تنظیم کہا جائے گا۔ آزاد مسابقت والی معیشت میں
تو مارکیٹ کی قوتیں یہ مثالی تقسیم کرتی ہیں اور اشتراکی منصوبہ بندی کا مقصد بھی یہی ہے کہ وہ اپنی منصوبہ کی تنظیمی طاقت سے ایک ایسی ہی معیشت کو
جنم دینا چاہتی ہے
اس مقصد کا حصول منصوبہ بندی کے ذریعہ نہایت ہی مشکل اور پیچیدہ کام ہے لیکن چونکہ ہمیں بہر صورت اس کا جائزہ لینا ہی ہے اس لئے
سب سے پہلے ہم اس کی آسان ترین صورت کو سامنے رکھنا چاہتے ہیں پھر آہستہ آہستہ دوسری پیچیدگیوں کی طرف جائیں گے۔ اس ماڈل کو سادہ ترین صورت
میں ڈھالنے کے لئے ہم چند مفروضات قائم کرنا چاہتے ہیں
(۱) پہلے تو ہم یہ فرض کئے لیتے ہیں کہ اشتراکی منصوبہ تمام محنت کاروں کے لئے مساوی آمدنی مقرر کرنا چاہتا ہے۔
(۲) پھر یہ فرض کرتے ہیں کہ تمام محنت کار اپنی محنت کی افادیت یا صلاحیت کے اعتبار سے بالکل ایک جیسے ہیں۔
(۳) تیسرا مفروضہ یہ کہ ان کی ہفتہ وار اجرت سب کے لئے مساوی ہے
(۴) محنت کاروں کے علاوہ کوئی اور پیدا آوری وسائل موجود نہیں ہیں (آخری مفروضہ)
اب یہ فرض کیجئے کہ منصوبہ بندی محکمہ کے حکام پہلے تو تمام محنت کاروں کو مختلف قسم کے کارخانوں میں مختلف تعداد میں لگاتے ہیں، جس کے
نتیجہ میں کئی اقسام کی اشیائے صرف مختلف مقداروں میں تیار ہوتی ہیں۔ محنت کاروں کو جو اجرت دی گئی۔ اس سے ہر کارخانہ میں تیار ہونے والی اشیاء کی
لاگت کا پتہ چلایا گیا۔ اب اگر یہ لاگت قیمت فروخت سے زائد نکلی تو مطلب یہ ہوا کہ اس کارخانہ میں ضرورت سے زائد محنت کار لگائے گئے تھے۔ اس
لئے ان زائد محنت کاروں کو اس کارخانہ سے نکال کر دوسرے کسی ایسے کارخانہ میں لگایا جائے گا، جہاں لاگت، قیمت فروخت سے بہت کم ہو یعنی
جہاں اجرت کی مد پر کم خرچ ہو رہا ہو۔ یعنی جہاں محنت کار کم لگائے گئے ہوں۔ اس طرح ملک کے سارے کارخانوں میں محنت کاروں کی تعداد کا
توازن ایسا رکھا جائے گا، کہ ہر کارخانہ میں بننے والی شے کی لاگت، قیمت فروخت کے لگ بھگ برابر ہو۔ جب تمام کارخانوں میں ایسا توازن پیدا
ہو جائے تو گویا اس اسٹیج پر ملک کے سارے وسائل جو ان کارخانوں میں لگے ان سب کی مثالی اور بہترین تنظیم و تقسیم عمل میں آئی۔

اس طرح کئی مفروضات سے گھرے ہوئے اس سادہ ترین ماڈل میں کم از کم صفحۂ قرطاس پر تو یہ بتا دینا آسان ہے کہ اس اس طرح کرنے سے وسائل کی مثالی تنظیم عمل میں آئے گی۔ لیکن پورے ملک کے اندر زائد محنت کاروں کو کن کن کارخانوں سے نکال کر کم محنت کاروں والے کن کن کارخانوں میں لگایا جائے۔ اس کا فیصلہ کرنا اور اس پر عمل درآمد کرنا انتہائی مشکل امر ہے۔ اور اس دوران میں یہ فرض کر لینا کہ صارفین بیٹھے تماشہ دیکھتے رہیں گے یہ بھی بعید از قیاس ہے۔ اس وقفہ کے اندر ہی بعض اشیاء کی زائد اور بعض کی کم رسد کی بنا پر قیمتوں کا اتار چڑھاؤ بھی ہوگا اور بعض اشیاء بک جائیں گی تو بعض کے ذخائر پڑے رہیں گے گویا وسائل کی مثالی تنظیم کا خواب پہلے ہی مرحلہ پر شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ خواہ کتنی ہی اچھی منصوبہ بندی کیوں نہ کر لی جائے۔

اب آگے بڑھ کر اوپر قائم کئے ہوئے مفروضات کو ایک ایک کر کے ختم کر کے اس کے اثر کو دیکھئے جانیے کہ منصوبہ بندی کا کام کر یہ کس قدر مشکل بناتا چلا جاتا ہے۔ کیونکہ عملی دنیا تو ان مفروضات کی دنیا سے مختلف ہوتی ہے۔ اس لئے ہم ایک ایک کر کے اوپر کے مفروضات کو ختم کر کے ہر ایک کے اثر اور نتیجہ کو علیحدہ علیحدہ دیکھنا چاہتے ہیں۔

سب سے پہلے دوسرے مفروضہ کو ختم کر کے دیکھیے۔ یعنی یہ کہ تمام محنت کار ایک سی صلاحیت کے نہیں ہیں۔ بلکہ سب کی صلاحیت اور کارکردگی ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ باقی مفروضات کو فی الحال جوں کا توں رہنے دیجئے تاکہ مفروضہ کا اثر دیکھا جا سکے۔ لیکن جیسے ہم اس مفروضہ کو ختم کرتے ہیں تو اس کے ساتھ ساتھ ہی پہلا اور تیسرا مفروضہ بھی لازماً ختم کرنا پڑتا ہے۔ ۔۔۔ صلاحیت اور کارکردگی محنت ہو تو وہ محنت کار ایک ہی جیسی مساوی اجرت پر کام کرنے کو تیار نہیں ہوں گے اور اگر کریں گے بھی تو یہ وسائل کی بہترین تنظیم نہیں ہوگی۔ اب ان مختلف صلاحیت والے محنت کاروں کو منصوبہ بندی کے ذریعہ ملک کے مختلف کارخانوں پر اس طرح تقسیم کرنا ہے کہ اجرتوں کی اس اونچ نیچ کے نتیجہ میں ہر کارخانہ میں جس رنگ برنگی شئے تیار ہو وہ اسی کے ٹھیک ٹھیک برابر قیمت فروخت پر بک بھی جائے اور نہ ہی اس کے ذخائر پڑے رہیں اور نہ ہی مانگ باقی رہے یہ مقصود نظری طور پر شاید ممکن ہو لیکن عملاً اس کا امکان کس حد تک ہے یا ہو سکتا ہے اس کو اس مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ کسی ریگستان میں ریت کے ذروں کی تعداد کی گنتی کرنا نظری طور پر تو ممکن ہے۔ لیکن عملاً اس میں جتنی مشکل ہے ایسی ہی مشکل اشتراکی منصوبہ بندی کے تحت وسائل کی مثالی تنظیم میں ہوتی ہے۔

اب ایک قدم اور آگے بڑھیے آخری مفروضہ کو بھی ختم کیجیے۔ یعنی یہ کہ پیداآوری وسائل صرف محنت کار نہیں ہیں بلکہ اور بہت سی چیزیں جیسے مشینیں، بجلی، کوئلہ، تیل کی طاقت، لوہا وغیرہ ہیں، پھر ان تمام وسائل کی کچھ قیمتیں فرض کی جائیں اور تمام دوسرے وسائل کو بھی ملک کے تمام کارخانوں پر اس طرح تقسیم کیا جائے کہ ایک طرف تو یہ سب وسائل کام میں آ جائیں کسی کی کوئی مقدار بیکار نہ رہے۔ دوسری طرف ان وسائل کے استعمال سے تیار ہونے والی اشیاء صرف کی جو نئی لاگت مقرر ہو وہ ایسی ہو کہ اس کے ٹھیک ٹھیک قیمت فروخت پر وہ شے پوری بک جائے اس کے نہ تو ذخائر بچے پڑے رہیں اور نہ اس کی مانگ باقی رہے۔ تاکہ وسائل کی مثالی تنظیم و تقسیم کا آئیڈیل منصوبہ بندی کے تحت حاصل ہو سکے۔ یہ کام پہلے ہی کچھ آسان نہ تھا جب کہ وسائل کے معنی صرف محنت کار تھے۔ اب جب کہ وسائل کے اندر محنت کار کے علاوہ پچاس اور چیزیں بھی شامل ہو گئی ہوں تو ان سب کی بہترین تقسیم کا منصوبہ بنانا ــــــ لانا ہے جوئے شیر کا۔

بات صرف اتنے ہی پر ختم نہیں ہوتی، بلکہ ان پیچیدگیوں کو مزید پیچیدہ بنانے والے عوامل مزید موجود ہیں۔ مثلاً یہ کہ محنت کاروں کو مختلف قسم کی تربیت دی گئی ہے جس پر کچھ خرچ بھی ہوا ہے۔ یہاں پر بھی بات کو آسان کرنے کے لئے دو مفروضات قائم کیجیے (۱) ٹریننگ سے پہلے

تمام آدمی برابر صلاحیت کے ہیں اور مختلف قسم کی ٹریننگ نے ہر ایک کو مختلف کاموں کا اہل بنایا ہے (۱) ہر قسم کی تربیت یکساں مشکل ہے (۲) ان پیشوں کا معاوضہ
ہوتی ہے اور وقت بھی مساوی درکار ہوتا ہے۔ یہ منصوبہ بندی کے نظام کا عجوبہ ہے کہ ان تمام محنت کاروں کی ایسی اجرتیں مقرر کریں کہ ان پر جو
دولت صرف ہوتی ہے وہ ملک میں بنتی ہو۔ ورتی شخص بے کار بھی نہ رہے۔ پھر ان اجرتوں کی بنیاد پر جو اشیاء تیار ہوں ان کی لاگت اور قیمت اور جنس
بھی الگ الگ ۔۔۔ اور ان ۔۔۔ پیدا ۔۔۔ مطلب ابھی اس قیمت پر برابر ہو جائے۔ منصوبہ بندی یوں اس طرح کی کوشش کرے بھی تو اس
میں بے شمار غلطیاں ہونا لازمی ہے

لیکن حقیقی دنیا کی دنیا تو اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔ حقیقی دنیا میں اوپر کے دونوں مفروضات قائم نہیں رہتے۔ ہر آدمی کی صلاحیت بھی
مختلف ہے۔ اس لئے اس کو ٹریننگ کی ضرورت بھی مختلف ہے۔ ہر ایک کی ٹریننگ پر خرچ بھی مختلف آئے گا اور وقت بھی مختلف درکار ہوگا۔ اشتراکی
منصوبہ بندی کرنے والے حکام ان تمام باتوں کا خیال رکھ کر منصوبہ بنانے بیٹھے تو ان کا دیوالیہ نکل جائے۔ اس کے برعکس مکمل آزاد مسابقت کے نظام میں یہ
سب کچھ فطری طور پر ہوتا ہے۔ یہاں گول سوراخوں میں چوکھوٹی میخیں نہیں لگائی جاتیں۔

اس کے علاوہ ایک آزاد مسابقت کی معیشت میں صرف اتنی ہی اشیاء کھاتے ہی کارخانے لگیں گے کہ تیار ہونے والی اشیاء کی لاگت قیمت
فروخت کے برابر یا کچھ کم ہو تاکہ کچھ منافع ہو سکے۔ کوئی شخص بھی نقصان پر کوئی شے تیار نہیں کرے گا اور نہ ہی مانگ سے زائد تیار کرے گا۔ اس طرح
آزاد معیشت میں وسائل کا تعین و تقسیم و تنظیم جس قدر آسان اور فطری ہے اشتراکی منصوبہ بندی کے نظام میں یہ اسی قدر مشکل اور پیچیدہ ہے اس
ماڈل کی اس ساری بحث کے بعد آخر میں پروفیسر پیگو لکھتے ہیں:

"........ یہ یاد رہے کہ اوپر کے تجزیہ میں ہم نے ایک مفروضی اور سادہ ماڈل کو سامنے رکھا ہے۔ حقیقی دنیا میں جو بے شمار
پیچیدگیاں ظاہر ہوتی ہیں ان کی مناسب جھلک دکھانے میں ہمارا اوپر کا سارا بیان ناکام رہتا ہے اور اس کا ناکام ہونا لازمی تھا۔[1]

اس سے بعد مزید کچھ پیچیدگیاں جو بین الاقوامی تجارت اور اشتراکی ممالک کے سرمایہ دارانہ ممالک سے مصالحتی تعلقات وغیرہ کی بناء پر
پیدا ہوتی ہیں، ان کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اس منصوبہ بندی میں:

"........ بہت سی غلطیوں اور حماقتوں کا ہونا لازمی ہے۔ الا یہ کہ فوق البشر افراد کی دنیا ہو۔"[2]

ان سب سے صاف ظاہر ہے کہ اشتراکی منصوبہ بندی میں بے شمار وسائل ضائع ہوتے ہیں۔ وسائل صحیح طور پر کام

۴۔ تیز رفتار ترقی کا مسئلہ

نہیں آتے۔ اس قدر بے ترتیبی اور بدنظمی رونما ہوتی ہے کہ ان تمام پر قابو پانا کسی انسانی ادارہ کے بس کا
روگ نہیں ہوتا۔ اس قدر وسائل کو ضائع کرنے کے بعد جو رفتار ترقی کسی اشتراکی ملک کی ہو سکتی ہے اس کو کہا جاتا ہے کہ دنیا کی سب سے تیز
رفتار ترقی صرف اشتراکیت ہی کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔ ساری دنیا کو یہ تو بتایا جاتا ہے کہ روس اور چین نے کتنی ترقی کی ہے۔ لیکن کسی طرح پتہ نہیں
چل پاتا کہ کس قدر وسائل و ذرائع اشتراکی منصوبہ بندی کے ہاتھوں ضائع ہوئے ہیں۔ کسی اور کو کیا بتا سکیں گے خود اشتراکیت کے کارپردازوں
کو اس کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ یعنی پیچیدگیاں اتنی ہوتی ہیں کہ یہی پتہ نہیں چلتا کہ وسائل کون سے کام میں آرہے ہیں اور کون سے ضائع ہو رہے

---

[1] کتاب مذکورہ صفحہ ۱۱۸۔

[2] ایضاً صفحہ ۱۱۹

ہیں۔ اس قدر وسائل ضائع کرنے والے معاشی نظام کی ترقی کو تیز رفتار ترقی کہا جائے تو آزاد معیشت اور آزاد مسابقت والے معاشی نظام میں ہونے والی ترقی کی رفتار مقابلۃً کئی گنا زیادہ تیز ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ چین ۱۹۴۹ء سے اب تک ۱۸ سال میں اپنے وسیع ذرائع و وسائل کے باوجود اتنی ترقی نہیں کر سکا، جتنا بغیر وسائل کا چھوٹا سا جاپان ۱۹۴۵ء میں جنگ سے برباد ہونے کے بعد ترقی کر گیا۔ جہاں تک رفتار ترقی کا تعلق ہے جاپان چین کیا سوویٹ روس سے بھی بہت آگے نکلا ہوا ہے۔ روس کی رفتار ترقی کا اوسط سالانہ ۸ اور ۹ فی صد کی رہا ہے اور جاپان کا ۵ء۱۳ فی صد۔ اگر جاپان کے پاس اتنی ہی سرزمین ہوتی اور اتنے ہی وسائل و معدنیات اور ذخائر ہوتے جو روس کو قدرت نے دے رکھے ہیں تو جاپان جنگ کے بعد کے ۲۰ سال میں اس قدر آگے بڑھ گیا ہوتا کہ روس کو اس مقام تک پہنچنے میں مزید ۵۰ سال درکار ہوتے۔ روس میں اشتراکی انقلاب ۱۹۱۷ء میں آیا ۵۰ سال گذر گئے اور ابھی تک امریکہ جیسے سرمایہ دار ملک کے مقابلہ میں بہت پیچھے ہے۔ روس جس قدر وسیع و عریض رقبہ کا مالک ہے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے امریکہ جیسا وسیع رقبے والا ملک ہی ہو سکتا ہے۔ ورنہ یورپ کے سرمایہ دار ممالک تو روس کے ایک صوبہ سے بھی چھوٹے ہیں۔ لیکن روس کے کسی صوبہ کا جو رقبہ میں یورپ کے کسی ملک کے برابر ہو یورپ کے اس ملک کے ساتھ موازنہ کرکے دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ روس کا یہ صوبہ ابھی ۵۰ برس پیچھے ہے اور اگر محض رفتار ترقی کو دیکھا جائے تو روس جاپان جیسے چھوٹے سے ملک سے بھی مقابلہ کے لائق نہیں ہے۔ محض رفتار ترقی ہی دیکھنی ہو اور مطبوعہ سرکاری اعداد و شمار کی بنیاد پر کرنی ہو تو روس اور جاپان تو کیا چین اور پاکستان کا مقابلہ ہی کرکے دیکھ لیجئے۔ تیسرے پانچسالہ منصوبہ میں پاکستان کی رفتار ترقی ۵ء۶ فی صد توقع کی گئی ہے۔ دوسرے ۵ سالہ منصوبہ میں ۲ء۵ فی صد رہی تھی۔ کمیونسٹ چین کی رفتار ترقی کا اوسط ۱۹۵۵ء تک ۵ اور ۶ فی صد کے درمیان تھا اور پاکستان کی اب بڑھ کر ۶ء۶ فی صد تیسرے پورے منصوبہ کے دوران توقع کی جا رہی ہے۔ یہ تو مجموعی رفتار ترقی ہے اور جہاں تک کہ محض صنعت کے میدان میں ترقی کا معاملہ ہے، پاکستان چین سے آگے نکلا ہوا ہے۔ چنانچہ مسٹر الیگزینڈر ایکس ٹین اپنی ایک حالیہ کتاب میں لکھتے ہیں کہ

> "جنگ کے بعد کے عرصہ میں کمیونسٹ چین کی صنعتی ترقی کی برابری کرنے والے یا اس سے بازی لے جانے والے صرف پاکستان اور جاپان رہے ہیں۔ بلاشبہ پاکستان نے اپنی صنعتی ترقی کا آغاز بالکل صفر سے کیا ہے۔ یعنی ابتدا میں قومی پیداوار کے تناسب سے پاکستان کی صنعتی اساس چین سے بھی چھوٹی رہی ہے .... دوسری طرف جاپان کی جس کی صنعتی اساس پہلے ہی سے اچھی خاصی تھی، پیداوار چین کے مقابلہ میں بہت تیزی کے ساتھ بڑھی ہے[۱۳]"

اصل میں عقلی طور پر کسی طرح یہ ثابت کیا ہی نہیں جا سکتا کہ اشتراکیت میں رفتار ترقی تیز ہو سکتی ہے۔ اگرچہ سرمایہ دارانہ نظام میں بیشمار خرابیاں ہیں اور اس میں مکمل آزاد مسابقت سر دست ممکن نہیں ہوتی۔ اس کے باوجود تاریخ اور اعداد و شمار کا ریکارڈ یہی کہتا ہے کہ ترقی کی رفتار اشتراکی ممالک سے زیادہ تیز سرمایہ دارانہ ممالک ہی میں رہی ہے۔

ترقی کی اصل بنیادیں

ملک کی ترقی میں اصل فیصلہ کن چیز اس ملک کے باشندوں کے بنیادی انسانی اخلاقیات ہوتے ہیں۔ گویا ترقی کی اصل بنیاد افراد اور قوموں کی اخلاقی صفات ہوتی ہیں۔ اگر بنیادی انسانی اخلاقیات کے ساتھ اسلامی اخلاقیات

---

۱۳ Communist China's Economic Growth and Foreign Trade by Alexander Eckstein, New York 1966. P.49

۱۴ ملاحظہ ہو "تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں" از مولانا مودودی

بھی شامل رہیں، تب ہی متوازن ترقی ہو سکتی ہے۔ کسی قوم کی اچھی بنیادی صفات کا مظاہرہ معاشی ترقی کی شکل میں بھی ہوتا ہے۔ دراصل معاشی ترقی ملک کی مجموعی ترقی سے الگ کوئی چیز نہیں ہوتی۔ ہارورڈ اور وہیلین یونیورسٹی کے پروفیسر مینز اور پروفیسر بالڈون لکھتے ہیں کہ

کسی نے ایک دفعہ معاشیین پر یہ چوٹ کی کہ معاشی ترقی اتنا اہم اور سنجیدہ موضوع ہے کہ اسے صرف معاشیین پر چھوڑا نہیں جا سکتا۔ یقینی طور پر یہ سچ ہے کہ یہ موضوع فوراً معاشی تجزیہ کی عمومی چار دیواری کے باہر بھاگنے لگتا ہے۔ جیسا کہ ہر معاشیات کا مورخ خوب جانتا ہے کہ کسی قوم کی معاشی ترقی کی کوششوں کا پورا جائزہ اس قوم کی تہذیب و تمدن کی مکمل تاریخ اپنے اندر سموئے رکھتا ہے .... مارکس اور شومپیٹر نے اس موضوع کی جو خدمات انجام دی ہیں ہم ان پر پہلے ہی گفتگو کر چکے ہیں۔ دوسرے معاشیین بھی ترقی کے موضوع کو ایک وسیع نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایک مثال ماکس ویبر (Max Weber) ہی کی ہے جو مغربی سرمایہ دارانہ نظام میں نفع کے محرک کے ارتقاء میں عیسائی اخلاقیات کے رول پر زور دیتا ہے .... غیر معاشیین میں تہذیبی تبدیلیوں کے اسباب کا مطالعہ کرنے والوں کی کوششوں میں ٹائن بی کا "چیلنج اور قبول" کا نظریہ، سوروکن کی تہذیبی ارتقاء کی تین منازل کی تشریح اور سپینگلر کا تہذیبوں کے عروج و زوال کا نظریہ اس پیچیدہ مسئلہ کو نظریات میں ڈھالنے کی غیر معمولی کوششوں کی نمائندگی کرتی ہیں .... معاشیات کی روایاتی حدود کو وسیع کرنے کی کوششوں کی رفتار بہت آہستہ رہی ہے ؎

ترقی کی اصل بنیادیں کچھ اور ہیں اور انتہائی گہری ہیں۔ کسی بھی معاشی نظام کی محض ظاہری شکل ترقی کی بنیاد نہیں بن سکتی۔ کسی ملک نے معاشی ترقی کی ہے تو اس لئے نہیں کی ہے کہ وہ ملک سرمایہ دارانہ تھا یا اشتراکی۔ ان معاشی نظاموں کو چلانے والی قیادت اور اس قیادت کو سہارا دینے والے اس ملک کے عوام، ان کا آپس کا تعاون یا تصادم اور بحیثیت مجموعی ان سب کا انفرادی و اجتماعی کردار اور اخلاقی صفات وہ بنیادیں ہیں، جن پر کسی ملک کی حقیقی ترقی یا تنزل کا دارومدار ہے۔ اس گہرے معاملہ کو انتہائی سادہ شکل میں یوں پیش کر دینا کہ اشتراکیت اختیار کر دیجئے تو جلد ترقی کر جاؤ گے نہ صرف یہ کہ اشتراکیت کے اپنے معاشی پروگرام کے نتائج کے خلاف ہے۔ بلکہ خود ترقی کے جو اصول اور بنیادیں ہیں ان کے بھی خلاف ہے۔ اس طرح کی باتوں کی حقیقت پس ماندہ ممالک کے عوام کو معاشی ترقی کے خواب دکھا کر اپنے چنگل میں پھنسانے کی کوشش سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

اشتراکی برسر اقتدار طبقہ کا مفاد

اشتراکیت کا معاشی پروگرام، جیسا کہ ہم اوپر واضح کر چکے ہیں انفرادی ملکیت کو ختم کر کے صنعت کو قومیانے اور زراعت کو اجتماعی کھیتوں کی شکل میں منظم کرنے اور اس سے متعلقہ مسائل کو حل کرنے کی کوشش سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اس معاشی پروگرام کی نظریاتی اساس مثبت سے زیادہ منفی بنیادوں پر اٹھائی گئی ہے۔ جس کا لب لباب، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، اقتدار حاصل کر کے سرمایہ داروں کو ختم کرنا ہے۔ اس سے زائد کسی اشتراکی ملک کے معاشی پروگرام میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ اشتراکیت کے نظریہ کے مرہونِ منت نہیں۔ بلکہ کسی خاص ملک کی اس وقت کی لیڈرشپ کے ذہن کی پیداوار ہے جس نے اپنے ملک کے حالات اور اپنے مفادات کی روشنی میں مختلف معاشی پروگرام بنائے ہیں۔ اس لئے چین اور روس جیسے اشتراکی ممالک میں جس

؎ Economic Development, Theory, History, Policy P. 119, 122, 123

معاشی پروگرام پر عمل کیا گیا ہے۔ اس کو اشتراکیت کا معاشی پروگرام کہنے کے بجائے ، چین و روس کے قومی اور برسر اقتدار طبقہ کے مفاد کی حفاظت کا معاشی پروگرام کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کسی غیر اشتراکی ملک میں کوئی طبقہ برسر اقتدار آئے اور وہ اپنے قدم مضبوط جمانے کے لئے کوئی معاشی پروگرام اختیار کرے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ طبقہ اگر قومی ملکیت انتقالِ زراعت کے حربے اختیار کرے تو یہ اشتراکیت کا معاشی پروگرام سمجھا جائے گا۔ ان حربوں کے استعمال سے کسی ملک کی معاشی ترقی پر نظری طور پر کیا اثر پڑا ہے یا پڑنا چاہیئے اور ان سے کس نوعیت کے معاشی مسائل جنم لیتے ہیں یہ علیحدہ مسائل ہیں۔ ہم فی الحال بحیثیت مجموعی اشتراکی بلاک کی معیشت کا آزاد ممالک کی معیشت سے موازنہ پیش کریں گے۔

کمیونسٹ پروپیگنڈہ:۔ اس سلسلہ میں ایک بنیادی بات سامنے رکھنا ضروری ہے۔ صنعتی انقلاب کے بعد سے دنیا ایک نئے دور میں داخل ہوئی ہے۔ اس انقلاب کے بعد ہر آزاد ملک نے اپنی معیشت کو تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کی راہ پر گامزن کیا ہے۔ جو ممالک اس ترقی کی دوڑ میں دیر میں شامل ہوئے ہیں انہیں پہلوں کی غلطیوں اور تجربات سے فائدہ اٹھانے کا موقع بھی ملا ہے اور آگے والوں نے برسوں کی تحقیقات کے بعد جو ایجادات کی تھیں انہیں فوراً اختیار کرنے کا موقع بھی۔ جو ممالک استعماری طاقتوں کے زیر نگیں تھے صرف وہی ہیں، جنہیں اس ترقی کی دوڑ میں شامل ہونے کا موقع بہت دیر میں ملا۔ جو ممالک بھی آزاد تھے وہ بڑی تیزی سے اس راہ پر چل پڑے خواہ وہ اشتراکی ہوں یا غیر اشتراکی۔ اس راہ پر گامزن کرانے والی اصل چیز آزادی تھی نہ کہ اشتراکیت۔ یہ دوسری بات ہے کہ آزادی ملنے کے بعد کسی ملک نے اشتراکیت کے طریقہ پر ترقی کی کوشش کی اور کسی نے سرمایہ داری کے طریقہ پر۔ جس ملک کو بھی اس طرح کا موقع ملا ہے اس نے ترقی ضرور کی ہے خواہ وہ اشتراکی طریق پر کی ہو یا سرمایہ دارانہ طریق پر۔ اس لئے کمیونسٹوں کا یہ پروپیگنڈہ بے معنی ہے کہ نو آزاد ممالک کی ترقی صرف اسی وقت ہو سکتی ہے، جب کہ وہ اشتراکی طریق کار اختیار کریں۔ اگر اشتراکیت کا معاشی پروگرام ہی ترقی کا واحد ذریعہ ہے تو آخر ان سرمایہ دارانہ ممالک نے کیسے ترقی کر لی؟ ان سرمایہ دارانہ ممالک میں چھوٹے ملک بھی ہیں اور بڑے بھی اور سب ہی نے ترقی کی ہے۔ افسوس ہے کہ کسی ملک نے بھی اسلام کے معاشی پروگرام کو بنیاد بنانے کی کوشش نہیں کی ورنہ ہم یہ دکھاتے کہ اس بنیاد پر ہونے والی ترقی اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں سے بہتر ہے۔ موجودہ صورت حال میں ہمارے سامنے موازنہ کرنے کے لئے صرف دو ہی نظام رہ گئے ہیں۔ ہم سرمایہ دارانہ نظام کو نہ تو کوئی آئیڈیل معاشی نظام سمجھتے ہیں اور نہ ہی اس کی خرابیوں پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ ہماری مشکل تو یہ ہے کہ اشتراکی بلاک کی معاشی ترقی کا موازنہ کریں تو کس سے کریں؟ سرمایہ دارانہ ممالک ہی میدان میں رہ جاتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ ممالک اپنی سوسائٹی میں خواہ کیسے ہی اندرونی مسائل پیدا کرتے ہوں لیکن جب ہم ان ممالک کی معاشی ترقی کا موازنہ اشتراکی بلاک کے ممالک سے کرتے ہیں تو سرمایہ دار ممالک ہی آگے نظر آتے ہیں۔ رہے ہر ملک کے اندرونی معاشی مسائل تو وہ دونوں نظاموں میں ہیں صرف نوعیت کسی قدر مختلف ہو سکتی ہے۔ اس مرحلہ پر تو ہم صرف کمیونسٹوں کے اس دعویٰ کا جائزہ لینا چاہتے ہیں کہ صرف اشتراکیت کے معاشی پروگرام ہی سے ترقی کی معراج حاصل ہو سکتی ہے۔ دونوں بلاکوں کا موازنہ خود ہی بتا دے گا کہ حقیقت کیا ہے۔

شکل نمبر ا میں سویٹ روس اور تمام کمیونسٹ ممالک کا موازنہ امریکہ و کینیڈا اور مغربی یورپ سے علیحدہ کیا گیا ہے۔ ۱۹۵۰ء میں پورا اشتراکی بلاک نہ مغربی یورپ سے معاشی طور پر آگے تھا اور نہ ہی امریکہ و کینیڈا سے حالانکہ اشتراکی بلاک اپنے رقبہ کی وسعت کے اعتبار سے نہ صرف امریکہ و کینیڈا بلکہ پورے مغربی یورپ کو بھی اپنے اندر سمو سکتا ہے۔ یعنی رقبہ کے لحاظ سے امریکہ، کینیڈا اور پورے

بشکریہ عالمی معاشی اعداد و شمار (جاپان)
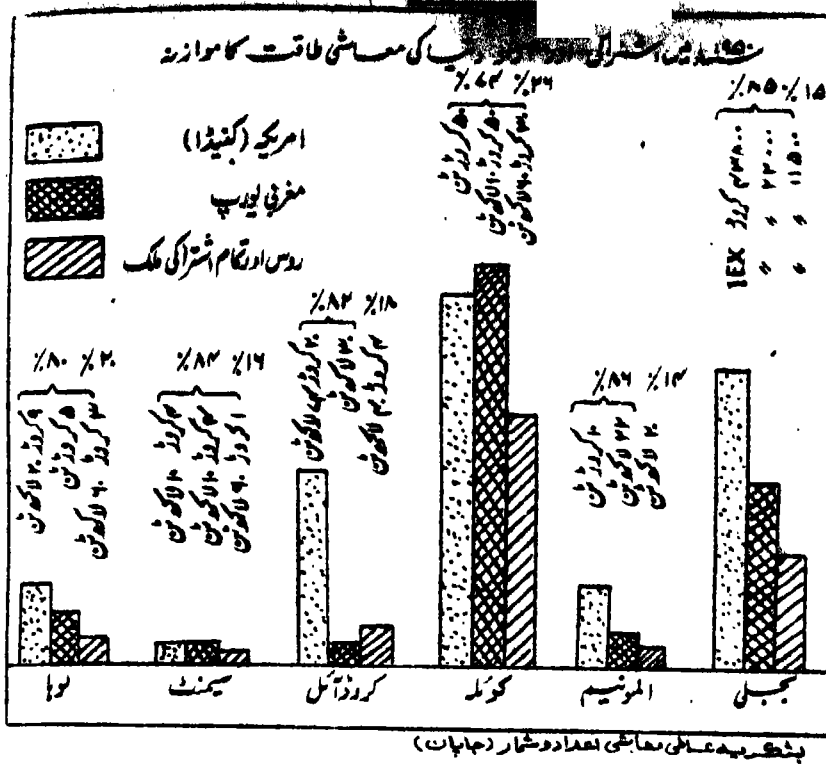
مغربی یورپ کو ملا یا جائے تو یہ سب مل کر بھی اشتراکی بلاک سے چھوٹے ہیں۔ لیکن معاشی طاقت کے اعتبار سے اشتراکی بلاک سے بہت آگے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے مشرقی پاکستان کا چھوٹا سا حصہ پورے بھارت سے معاشی طاقت زیادہ رکھتا ہو۔ اشتراکی بلاک کی وسعت رقبہ کے اعتبار سے امریکہ و کنیڈا اتنے ہی چھوٹے ہیں جیسے کہ بھارت کے مقابلہ میں مشرقی پاکستان کا رقبہ صرف تیل (crude oil) کے معاملہ میں روس مغربی یورپ سے زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے مغربی یورپ میں تیل کے ذخائر ہی نہیں ہیں۔ اشتراکی بلاک میں ذخائر بہت زیادہ ہیں لیکن پیداوار بہت کم ہے۔ بحیثیت مجموعی اشتراکی بلاک مغربی یورپ اور امریکہ و کنیڈا دونوں ہی سے علیحدہ علیحدہ موازنہ میں بھی پسماندہ ہی رہا ہے۔
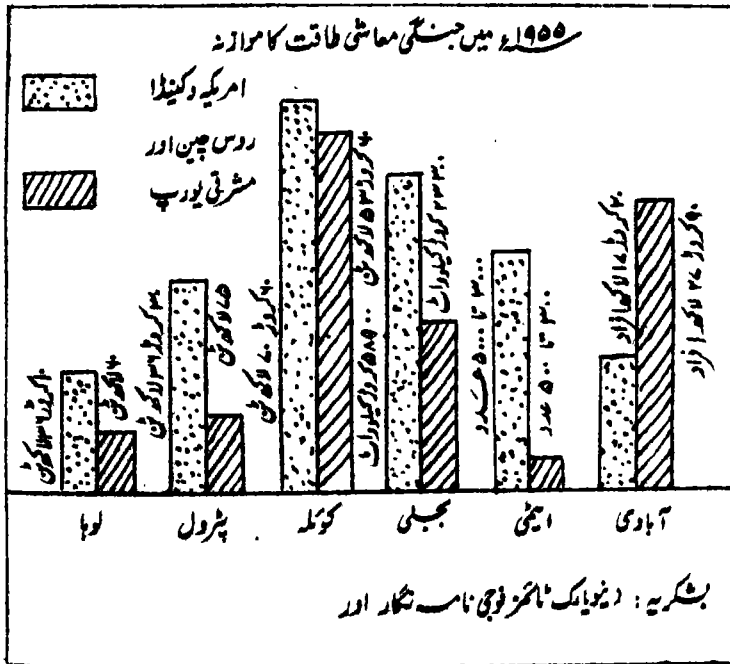
شکل نمبر ۲ میں ۱۹۵۵ء کے اعداد و شمار کے مطابق پورے اشتراکی بلاک کا صرف امریکہ و برطانیہ سے موازنہ کیا گیا ہے۔ درآنحالیکہ اس موازنہ میں امریکہ و برطانیہ کے ساتھ پورے مغربی یورپ اور کنیڈا کو بھی شامل کرنا چاہئے۔ یہ سب شامل ہوتے تب بھی اشتراکی بلاک ان سب

سے بڑا ہوتا ہے۔ لیکن معاشی ترقی کے اعتبار سے ان سب سے ترکیا صرف دو کے مقابلہ کا بھی نہیں۔ معاشی ترقی کے اعتبار سے اشتراکی بلاک کے اس قدر پیچھے ہونے کے باوجود سوشلزم کے حامی نہ معلوم کس بنا پر یہ کہتے ہیں کہ سوشلزم سے معاشی ترقی تیزتر ہو جاتی ہے۔ حالانکہ حقائق (اعداد و شمار) بالکل اس کے برعکس ہیں۔

سوشلزم ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے

ترقی یافتہ ممالک سے اشتراکی بلاک کا موازنہ

اوپر کے دونوں نقشوں سے صاف ظاہر ہے کہ اشتراکی بلاک معاشی ترقی کے معاملہ میں اپنے مقابل سے پیچھے رہ گیا ہے۔ لیکن یہ نتیجہ زیادہ وضاحت کے ساتھ شکل نمبر ۳ سے ظاہر ہے جو جاپانی کتاب "دنیا کے معاشی اعداد و شمار کے نقشہ جات" سے لی گئی ہے جسے پروفیسروں نے مل کر ترتیب دیا ہے۔ یہ نقشہ جات اقوام متحدہ کے اعداد و شمار کی بنیاد پر بنائے گئے ہیں۔ اس نقشہ میں سوشلزم کے اثر کو دیکھنے میں آسانی اس لئے ہے کہ ۱۹۶۳ء میں آزاد دنیا کے ترقی یافتہ ممالک اور پورا اشتراکی بلاک اپنی وسعت کے اعتبار سے تقریباً برابر ہیں۔ یعنی اشتراکی ممالک دنیا کے رقبہ کا ۲۵.۷ فی صد ہیں تو ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ ممالک تقریباً ۲۴.۸ فی صد ہیں۔ اس لئے اس نقشہ میں یہ اندازہ آسان ہے کہ برابر کے بلاک میں ترقی کی رفتار کیا رہتی ہے۔ ان دونوں بلاکوں میں فرق اگر کسی بات میں ہے تو وہ بس معاشی نظام میں ہے۔ اگر ان برابر کے دونوں بلاکوں میں معاشی ترقی برابر کی ہوتی ہوتی تو ہم کہتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام ہو یا سوشلزم ہو ترقی ایک جیسی ہی ہوتی ہے۔ لیکن اگر ترقی ایک میں زیادہ اور دوسرے میں کم ہو تو اس زیادتی یا کمی کا سبب بھی اس سے متعلقہ معاشی نظام کو قرار دیا جائے گا۔ یہ نقشہ ہمیں بتاتا ہے کہ سوشلزم کے علمبردار ممالک میں ترقی کم ہوتی ہے اور سرمایہ دار ممالک میں زیادہ، جب کہ دونوں بلاک بلحاظ رقبہ برابر ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ سرمایہ دارانہ ممالک میں ترقی زیادہ ہوتی ہے تو اس کا سبب ان کا سرمایہ دارانہ نظام ہے۔ اسی طرح سوشلسٹ ممالک میں ترقی کم ہوتی ہے تو اس کا سبب ان کے سوشلزم کے نظام کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ اگر وہی ممالک سوشلزم کو اختیار نہ کرتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ بھی اتنی ہی ترقی نہ کر لیتے جتنی کہ سرمایہ دار ممالک نے کی۔ اس شکل سے یہ بات بالکل کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اشتراکی ممالک ترقی کی دوڑ میں محض اس لئے پیچھے رہے کہ انہوں نے سوشلزم اختیار کر رکھا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا

(ا) رقبہ (۱۹۶۳ء)

٪۲۵.۷
٪۴۹.۵
٪۲۴.۸

اشتراکی بلاک
ترقی یافتہ ممالک
پس ماندہ ممالک

(ب) انرجی یا طاقت کے صرف کی سطح (۱۹۶۳ء)

٪۴.۰
٪۳۴.۳
٪۶۱.۲

شکل (۳)

ہے کہ سوشلزم نیز معاشی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ سوشلزم نے رکاوٹ نہ پیدا کی ہوتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اشتراکی ممالک بحیثیت مجموعی سرمایہ دارانہ ممالک سے پیچھے رہتے۔ [1]

ترقی معکوس:- اور دونوں بلاکوں میں ترقی کا یہ فرق کوئی معمولی نہیں۔ سرمایہ دارانہ ممالک نے اشتراکی ممالک کے بالمقابل کسی قدر کم ہونے کے باوجود ان سے تقریباً دگنی ترقی کی ہے۔ اگر اشتراکی ممالک کا فی صد ۴ء۲۱ ہے تو سرمایہ دارانہ ممالک کا ۹ء۴۱ طاقت کے صرف کی سطح کا مطلب یہ کہ کوئلہ، بجلی یا تیل سے جو طاقت پیدا کی جائے وہ کہاں کتنی زیادہ استعمال ہو رہی ہے۔ اس سے کسی ملک کی ترقی کا دوسرے ملک کی ترقی سے موازنہ کرنے میں بہت سہولت ہوتی ہے۔ جتنا زیادہ کوئی ملک ترقی یافتہ ہوتا ہے اتنے ہی زیادہ اس کے پاس کارخانے اور مشینیں اور اونچا معیار زندگی ہوگا اور ان تمام میں بجلی یا کوئلہ یا تیل ضرور استعمال ہوتا ہے۔ اس طرح گویا جتنی زیادہ کسی ملک میں طاقت کا صرف ہوتا ہے اتنا زیادہ گویا وہ ملک ترقی یافتہ ہے۔ آخر ان دونوں میں اس قدر زیادہ فرق کیوں ہے؟ اشتراکی ممالک، کیوں سرمایہ دارانہ ممالک کے مقابلہ میں بمشکل آدھی ترقی کر سکے ہیں؟ اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ سرمایہ دار ممالک سے مختلف معاشی نظام رکھتے ہیں۔ ہمیں سرمایہ دارانہ نظام سے بھی کوئی لگاؤ نہیں ہے ہم سمجھتے ہیں کہ اس میں بہت سی خرابیاں ہیں۔ ہم تو صرف اسلام کے معاشی نظام کو بہترین سمجھتے ہیں۔ لیکن ہم سوشلزم کے حامیوں سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ آخر کس پہلو سے ان کا مجوزہ نظام اپنے مدمقابل پر ترجیح کا مستحق ہے۔ اگر معاشی ترقی کو معیار مانا جائے تو پھر اشتراکیت کا دعویٰ بہت ہی کمزور اور بودا ہوگا۔

سوویٹ روس کی معاشی ترقی ہم اس کے لئے بھی آمادہ ہیں کہ سارے اشتراکی بلاک کو چھوڑ کر اشتراکیت کو سب سے زیادہ دیر تک یعنی گذشتہ ۵۰ سال سے آزمانے والے ملک سوویٹ روس کی ترقی کا تقابلی جائزہ علیحدہ سے لے کر دیکھیں۔ تمام اشتراکی ممالک میں یہی ایک ملک ہے جو سب سے زیادہ طاقت ور ہے۔ گویا سوشلزم کی معراج کہیں دیکھی جا سکتی ہے تو وہ سوویٹ روس ہے۔ اس لئے ہم آگے کی بحث میں زیادہ تر اسی کو پیش کریں گے اور اب بھی یہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ سوشلزم نے روس کی معاشی ترقی کو مہمیز لگائی ہے یا اس کی رفتار کو اپنی انتہا پر پہنچنے سے روکا ہے۔ سوشلزم روس کی ترقی میں مددگار ثابت ہوا ہے یا رکاوٹ یعنی یہ کہ اگر روس نے سوشلزم اختیار نہ کیا ہوتا تو زیادہ ترقی کرتا یا کم۔ سوشلزم کی افادیت اور اس کی کارفرمائی کا اندازہ لگانے کی یہی ایک شکل ہو سکتی ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ اگر سوشلزم نہ ہوتا تو روس کی معاشی ترقی کی کیا حالت ہوتی؟

روس کے رقبہ کی وسعت کی اہمیت ہر ملک کی معاشی ترقی میں اس بات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے کہ اس ملک کا اپنا رقبہ کیا ہے، ملک کتنا بڑا یا چھوٹا ہے۔ ترقی کی ساری صفات اور خصوصیات ہونے کے باوجود کسی قوم کے پاس خطۂ زمین محدود ہو تو اس جدید دور میں اس کی ترقی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ جاپانی قوم میں ترقی کی بیشمار

---

[1] واضح رہے کہ شکل نمبر۲ میں ترقی یافتہ ممالک سے مراد حسب ذیل ممالک ہیں۔ امریکہ، کینیڈا، جاپان، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جنوبی افریقہ، مغربی یورپ کے تمام ممالک۔ اشتراکی بلاک سے مراد حسب ذیل ممالک ہیں۔ سوویٹ روس، کمیونسٹ چین، پولینڈ، ہنگری، چیکوسلاواکیہ، رومانیہ، بلغاریہ، البانیہ، مشرقی جرمنی، شمالی ویٹ نام، شمالی کوریا، منگولیا اور کیوبا۔

صفات ہیں، دوسری جنگ عظیم دوم کے بعد سے دنیا میں اس کی اوسط رفتار ترقی دنیا میں سب سے تیز رہی ہے۔ لیکن خود جاپان ایک چھوٹا ملک ہے۔ اس کے پاس اپنے وسائل کچھ نہیں ہیں۔ تمام اہم چیزیں، لوہا، تیل، کوئلہ وغیرہ باہر سے درآمد کرنی ہوتی ہیں۔ جاپان کی رفتار ترقی خواہ کتنی ہی تیز ہو اس کی مجموعی پیداوار کبھی بھی سوویت روس جیسے وسیع و عریض ملک کے برابر نہیں ہو سکے گی اور نہ ہی امریکہ کے برابر ہو سکے گی۔

یا ہم اپنی مثال لے لیں، پاکستان کی معاشی حالت بھارت سے خواہ کتنی ہی بہتر ہو اور معاشی ترقی کی رفتار بھی خواہ تیز کیوں نہ ہو، لیکن چونکہ یہ رقبہ میں بھارت کے پانچویں حصے سے بھی کم ہے۔ اس کی مجموعی پیداوار بھارت کی مجموعی پیداوار کے برابر مشکل ہی سے ہو سکے گی۔ الا یہ کہ بھارتی باشندے بالکل ہی ناکارہ ہو جائیں اور پاکستانی اعلیٰ اوصاف کے مالک ہو کر تیزی سے ترقی کرنے لگیں۔ امریکہ کی ترقی میں اس کا وسیع رقبہ ایک اہم عامل ہے۔ اس وسعت سے ایک طرف تو ملک کے اندر وسیع مارکیٹ بنتی ہے جو معاشی سرگرمیوں کو جنم دیتی ہے۔ دوسری طرف خدا کی زمین میں جو وسائل پوشیدہ ہیں وہ آہستہ آہستہ دریافت ہوتے اور کام میں آتے جاتے ہیں

اس پہلو سے سوویت روس دنیا کے سارے ممالک سے بہتر پوزیشن میں ہے۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی مملکت ہے۔ امریکہ اپنی ساری وسعت کے باوجود روس کا آدھا بھی نہیں ہے۔ روس کا رقبہ ۸۶,۰۰,۰۰۰ مربع میل ہے اور امریکہ کا ۳۶,۱۵,۲۱۱ مربع میل (شکل نمبر ۴ دیکھیں) چونکہ روس کی معاشی ترقی کا موازنہ امریکہ اور یورپ کی مشترکہ منڈی کے ممالک سے کیا گیا ہے، اس لئے ہم یہ پہلے بتانا چاہتے ہیں کہ امریکہ اور یورپ کی مشترکہ منڈی مل کر بھی روس سے نہ صرف چھوٹے ہیں بلکہ آدھے سے بھی کم ہیں یعنی اگر امریکہ اور یہ ممالک ایک ملک بھی بن جائیں، تب بھی یہ نیا ملک روس کا آدھا بھی نہ ہو سکے گا۔ بالعموم چھوٹے ممالک کی مجموعی پیداوار بڑے ممالک کی مجموعی پیداوار کے برابر نہیں ہوتی۔ الا یہ کہ بڑا ملک معاشی ترقی نہ کر سکے اور چھوٹے ممالک زیادہ ترقی کر جائیں۔ جیسا کہ شکل نمبر ۴ سے ظاہر ہے معاملہ بالکل الٹا ہے۔ یعنی چھوٹے ممالک کی مجموعی پیداوار اور معاشی ترقی روس جیسے بڑے ملک کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔ آخر کیوں؟ ان چھوٹے ممالک اور روس جیسے بڑے ملک میں فرق کیا ہے؟ یہی کہ ایک جگہ سوشلزم ہے اور دوسری جگہ نہیں ہے۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ روس اپنی ساری وسعت اور وسائل کی کثرت کے باوجود محض اس وجہ سے ترقی نہیں کر سکا کہ وہ سوشلزم کے معاشی پروگرام کے ذریعہ ترقی کرنا چاہ رہا تھا اور یہی چیز اس کی ترقی میں رکاوٹ کا سبب بن گئی اور آج تک روس کی حالت یہ ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا ملک ہونے کے باوجود اکیلے امریکہ سے بھی زیادہ معاشی ترقی نہیں کر سکا۔ یعنی یہ کہ شکل نمبر ۴ میں اگر ہم یورپ کی مشترکہ منڈی والے ممالک کو نکال بھی دیں تب بھی اکیلا امریکہ روس پر بھاری پڑتا ہے۔ حالانکہ امریکہ روس کے آدھے سے بھی کم ہے!

شکل نمبر ۵ پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ روس اپنے رقبہ کی وسعت کے باوجود معاشی ترقی کے معاملہ میں اس قدر زیادہ پیچھے ہے کہ ۱۹۵۰ء میں امریکہ کی جو پیداوار تھی، اس مقام تک روس اپنے سات سالہ منصوبہ کے بعد بھی نہیں پہنچ سکے گا۔ اس سات سال کے دوران امریکہ صرف اسی مقام پر تھوڑا ہی رہے گا جہاں ۱۹۵۰ء میں تھا۔ اس دوران میں امریکہ اور بہت آگے بڑھ چکا ہوگا۔ امریکہ سرمایہ دارانہ نظام والا ملک ہے اور روس سوشلسٹ۔ روس کے اس قدر پیچھے ہونے کا سبب سوشلزم کو نہیں تو اور کس چیز کو قرار دیا جا سکتا ہے۔

روس کیوں امریکہ پر سبقت نہ لے جا سکا؟ کہا یہ جاتا ہے کہ روس چاند تک پہنچنے کے معاملہ میں امریکہ سے بازی لے جائے گا۔ یہ بعید از قیاس نہیں کہ روس چند خاص میدانوں میں کسی

مشترکہ منڈی کے ممالک
امریکہ
روس

	کل قومی پیداوار	قومی پیداوار فی کس	زرمبادلہ	برآمد (F.O.B)
یونٹ	(۱۰۰ کروڑ ڈالر)	(ہزار ڈالر)	(۱۰۰ کروڑ ڈالر)	(۱۰۰ کروڑ ڈالر)
مشترکہ منڈی کے ممالک	۲۱۰	۱۳۲	۱۶۶۲	۳۳۶۳
امریکہ	۵۲۰	۲۶۸	۱۶۶۹	۲۰۶۶
روس	۱۶۸	۶۸		۵۱۹

حاصل کردہ از: دنیا کے معاشی اعداد و شمار کے نقشہ جات

مشترکہ منڈی	رقبہ مربع میل
۱۔ فرانس	۲۱۲،۶۹۵
۲۔ اٹلی	۱۱۶،۳۷۳
۳۔ مغربی جرمنی	۹۵،۷۴۴
۴۔ ہالینڈ	۱۲،۸۹۸
۵۔ بیلجیم	۱۱،۷۷۵
۶۔ لکسمبرگ	۹۹۹
کل مجموعہ	۴۵۰،۴۵۳

	رقبہ مربع میل
۱۔ مشترکہ منڈی کے ممالک (کل)	۴۵۰،۴۵۳
۲۔ امریکہ	۳،۶۱۵،۲۱۱
مشترکہ منڈی اور امریکہ (مجموعہ)	۴،۰۶۵،۶۶۴
۳۔ روس	۸،۵۰۰،۶۰۰

(بشکریہ: "آزاد دنیا و اشتراکی بلاک کی معاشی طاقت اور موازنہ" ایڈیشن ۱۹۵۹ء
از مسٹر میا شیتا . صفحہ ۳۴)

حد تک امریکہ سے آگے بھی نکل سکتا ہے لیکن ہمارا اعتراض یہ ہے کہ روس معاشی حیثیت میں شروع ہی سے، یعنی سوشلزم اختیار کرنے کے بعد سے، امریکہ پر مجموعی حیثیت سے کیوں نہیں سبقت لے گیا؟ روس کے پاس جس قدر وسیع خطۂ زمین ہے اتنے ہی زیادہ پوشیدہ وسائل کے امکانات ہیں اس قدر زیادہ وسائل رکھنے کے باوجود روس کیوں ان وسائل کو پورے طور پر کام میں نہیں لا سکا؟ کیوں ان وسائل کا پتہ نہیں چلایا جا سکا یا اگر چلایا تو انہیں استعمال نہیں کر سکا؟ ہمارے نزدیک یہ سوشلزم کا فطری نتیجہ ہے کہ اس نظام میں جیسا کہ ہم پہلے تفصیل سے بتا چکے ہیں۔ وسائل ضائع ہوتے ہیں اور بڑے پیمانہ پر ضائع ہوتے ہیں۔ اس لئے ایسا ملک اپنے سے چھوٹے ملک سے بھی پیچھے نہ رہے گا تو اور کیا کرے گا۔

کیا روس نے ترقی دیر میں شروع کی؟

اگر اس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ روس ترقی کی دوڑ میں دیر سے شامل ہوا اور امریکہ کو پہلے سے اس کا موقع ملا۔ تو یہ بات بھی روس اور امریکہ کی حالیہ تاریخ کے حقائق کے خلاف ہے۔ مشرق بعید میں دوسرے سب ممالک پس ماندہ اور جاپان اکیلا ترقی یافتہ ملک اس لئے بنا کہ جاپان شروع ہی سے آزاد ملک رہا اور مشرق بعید کے دوسرے ممالک کسی نہ کسی استعماری طاقت کے غلام رہے۔ اس لئے انہیں اس دور غلامی کے سبب معاشی ترقی کا موقع نہیں ملا۔ اب جب سے ایشیائی ممالک کو آزادی ملی ہے تو اس کے بعد سے معاشی ترقی کی دوڑ میں نوآزاد ممالک شامل ہوتے جا رہے ہیں۔ خود ہمیں یعنی پاکستان کو اس دوڑ میں شامل ہونے کا موقع صرف ۲۰ سال پہلے یعنی ۱۹۴۷ء سے ملا ہے۔ لیکن روس کا معاملہ یہ ہے کہ یہ کسی کی غلامی میں نہیں رہا جس طرح جاپان ایک آزاد مملکت رہا ہے۔ اسی طرح روس بھی شروع ہی سے ایک آزاد ملک رہا۔ روس کے برعکس امریکہ جو آج روس سے کئی قدم آگے ہے، وہ شروع ہی سے ایک آزاد ملک نہیں رہا۔ بلکہ یہ اتنا بڑا ملک بھی نہ تھا۔ حالانکہ روس شروع ہی سے ایک وسیع مملکت پر مشتمل رہا۔ جس طرح ہم انگریز کے غلام رہے ہیں اسی طرح امریکہ بھی انگریز کی غلامی کر چکا ہے۔ روس میں جدید تکنیک اور جدید طریقوں کو روشناس کروانے کی کوشش جب کی جا رہی تھی اس وقت

امریکہ دورِ غلامی کے دن گزار رہا تھا۔ امریکی انقلاب ۱۷۷۵ء-۸۳ء میں ہوا جب امریکہ آزاد ہوا اور جارج واشنگٹن کی قیادت میں ایک بڑی ریاست کی شکل اختیار کی۔ روس اس وقت نہ صرف یہ کہ جاپان کی طرح ایک آزاد ملک تھا۔ بلکہ امریکی انقلاب سے بہت پہلے ۱۶۹۶ء میں پیٹر اعظم نے روس میں مغرب کے ترقی یافتہ علم و ہنر کو روشناس کرانا شروع کیا۔ اس مقصد کے لئے اس نے ذاتی طور پر خود مغربی ممالک میں چند برس گزارے اور روس کا بادشاہ ہونے کے باوجود ہالینڈ کی جہازرانی کمپنی میں بحیثیت ایک مزدور بڑھئی کام کر کے تربیت لی حالانکہ اس دوران میں بھی روس کا بادشاہ وہی تھا۔ پھر اس کے بعد روس کی مشہور ملکہ کیتھرائن ثانی نے ۱۷۶۲ء سے ۱۷۹۶ء کے دوران میں روس میں نئی صنعتی اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ اور جب کمیونسٹ انقلاب ۱۹۱۷ء میں آیا تو اس وقت تک روس میں کافی صنعتیں اور کارخانے لگ چکے تھے اور اس سے بہت پہلے ۱۹۰۵ء میں مزدور ہڑتالوں کے ذریعہ حکومت کا ناطقہ بند رکھتے تھے۔ اکتوبر ۱۹۰۵ء میں مزدوروں کی ایک کامیاب ہڑتال کے نتیجہ میں زارِ روس کو مجبور ہونا پڑا کہ وہ اپنے باشندوں کو شہری آزادیاں دے۔ اسی سال چند ماہ پہلے یعنی جنوری ۱۹۰۵ء میں زارِ روس نے ان پرامن مزدوروں پر گولی چلوا دی جو اس کے پاس کچھ مطالبات مودبانہ طریق سے پیش کرنا چاہتے تھے۔ اس واقعہ نے جو "خونی اتوار" کا واقعہ کہلاتا ہے زارِ روس کے خلاف نفرت کی آگ اور تیز تر کر دی اور یہ سب کچھ روس میں اشتراکی انقلاب آنے سے پہلے کے واقعات تھے۔ گویا اشتراکی انقلاب سے بہت پہلے سے روس اس دور میں داخل ہو چکا تھا۔ مقصد یہ کہ اشتراکی انقلاب سے بہت پہلے سے مغرب کے جدید علم و ہنر روس میں آ چکے تھے۔ برطانیہ میں صنعتی انقلاب کے ساتھ ساتھ جیسے اس کے اثرات یورپ کے مختلف ممالک میں پہنچے ۔ ویسے ہی روس بھی پہنچے ؎

امریکہ و روس کی گزشتہ دو صدی کی تاریخ یہ کہتی ہے کہ آج معاشی اعتبار سے روس کو دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہونا چاہیے تھا کیونکہ یہ جاپان کی طرح شروع سے آزاد بھی رہا، ترقی کی دوڑ میں بھی بہت پہلے سے شامل رہا۔ مملکت کی وسعت نے وسائل کی کثرت بھی بخشی تھی۔ ان سارے فوائد کے باوجود روس آج تک کیوں امریکہ سے معاشی طور پر پیچھے ہے۔ جب کہ امریکہ روس کے آدھے کے برابر بھی نہیں ہے۔ شروع سے آزاد بھی نہ تھا اور معاشی ترقی کی دوڑ میں روس کے مقابلہ میں بہت دیر سے شامل ہوا۔ صاف ظاہر ہے کہ روس کو جس چیز نے پیچھے دھکیلا ہے اور اس کی ترقی میں جس چیز نے رکاوٹ ڈالی ہے وہ اس کا سوشلزم کو اختیار کرنا ہے۔ روس اگر سوشلزم اختیار نہ کرتا تو اب سے کئی سال پہلے ہی چاند پر اپنا آدمی بھیج چکا ہوتا اور ساری آزاد دنیا مدد کے لئے اس کی طرف دیکھتی نہ کہ امریکہ کی طرف۔ لیکن سوشلزم اس کے لئے ایسا بوجھ بن گیا کہ نہ صرف امریکہ اس سے آگے نکل گیا بلکہ جاپان جو اب سے ۱۰۰ سال پہلے تک ایک
تھا اور کسی بیرونی جہاز کو جاپان میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی اس نے (Meiji) دور یعنی اب سے صرف ۱۰۰ سال پہلے ترقی کی دوڑ شروع کی۔ جب کہ روس اس سے پہلے سے اس دوڑ میں لگا ہوا تھا۔ اس جیسا چھوٹا سا ملک بھی بہت آگے نکل جاتا اگر اس کے پاس

؎ ۱۹۱۳ء میں روس تانبے کی پیداوار میں دنیا کا پانچواں بڑا ملک تھا۔ بحیثیت مجموعی حیرت خیز ترقی کے مقام پر پہنچ چکا تھا اور صرف اشیاءِ صرف کی ہی صنعت نہیں بلکہ اشیائے پیداوار (capital goods) کی صنعت بھی وہاں ایک خاص مقام تک ترقی کر چکی تھی۔ اشتراکیت کو ایک بالکل پسماندہ روس میں اپنے نظام کا تجربہ نہیں کرنا پڑا، بلکہ صنعتی اعتبار سے ایک اہم ورثہ اس کو ملا۔ اس حیثیت سے روس اور دوسرے مغربی ممالک کا معاشی ترقی کا موازنہ حق بجانب ہوگا۔

روس کا آدھا نہیں بلکہ ایک تہائی بھی زمین کا رقبہ ہوتا۔

سوشلزم سے ترقی میں رکاوٹ کی وجوہ

اوپر کے اعداد و شمار اور تاریخی حقائق سے یہ بالکل واضح ہے کہ تمام اشتراکی بلاک اور ترقی کی معراج پر پہنچنے والے روس کے معاملہ میں سوشلزم ترقی میں مددگار بننے سے زیادہ رکاوٹ بنا رہا ہے۔ اب تک تو ہم صرف ایک حقیقت (Fact) کو سامنے لائے ہیں۔ اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ سوشلزم کے نتیجہ میں ایسا ہونا فطری ہے۔ عقل اور منطق کا تقاضا ہے۔ ایسا نہ ہو تو بڑے تعجب کی بات ہوگی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ سوشلزم جب ساری معاشی زندگی کو، ساری صنعتوں اور سارے کاروبار کو قومی تصرف میں لے لیتا ہے، تو اس کے نتائج جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اتنے پریشان کن ہوتے ہیں کہ ان کی موجودگی میں کسی ملک کا سوشلزم اختیار کرنے کے بعد معاشی ترقی کرنا ایک مشکل امر ہو جاتا ہے۔ عقل کیسے یہ مان سکتی ہے کہ جس ملک کی معیشت میں مارکیٹ کا فطری عمل موجود نہ ہو، جہاں معاشیات کے بنیادی مسئلہ محدود وسائل کی بہترین تنظیم و تقسیم کا کوئی حل نہ ہو، جہاں قیمتوں کا تعین الل ٹپ کیا جاتا ہو، جہاں منصوبہ بندی کی کامیابی جوئے شیر لانے کے مترادف ہو۔ جہاں رفتار ترقی سست ہونے پر مجبور رہو۔ ایسا ملک ترقی کی دوڑ میں دوسروں کو کیسے شکست دے سکتا ہے؟ یہ تو وہ اسباب تھے جن کی ہم اوپر تشریح کر آئے ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی وجوہ ہیں جن کی ہم بعد میں تشریح کریں گے کہ جو اس سوشلزم کے نتائج کے طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ ان اسباب کی موجودگی میں کسی ملک کی معاشی ترقی میں سوشلزم مثبت سے زیادہ صرف منفی رول ہی ادا کر سکتا ہے۔ ہماری بعد کی تشریح میں آپ یہ دیکھیں گے کہ سوشلزم کے نتیجہ میں انسان کے نفع کا محرک ختم ہو جاتا ہے۔ اس محرک کے ختم ہونے سے کارکردگی میں کمی آتی ہے اپنی پیداوار کی قابلیت گر جاتی ہے۔ کام کرنے کی تحریک ختم ہو جاتی ہے۔ لوگ مارے باندھے کا کام کرتے ہیں۔ جس سے اشیاء کی کیفیت اور ان کا معیار گر جاتا ہے۔ اس میں سوشلزم کے سیاسی پہلو کو بھی دخل ہے کہ جب ایک فرد کی معاشی آزادی باقی نہیں رہی تو پھر سیاسی آزادی بھی ممکن نہیں رہتی اور جب سیاسی آزادی نہ ہو تو آدمی اپنے آپ کو قید خانے کی سی زندگی میں محسوس کرتا ہے خواہ اسے اس جیل میں کتنی ہی روٹی اور کپڑا مل جائے۔ آگے چل کر ہم انشاء اللہ مزید یہ بتائیں گے کہ سوشلزم ایک لمبی چوڑی بیوروکریسی کو جنم دیتا ہے۔ جو معاشی ترقی کی راہ میں ممد و معاون ہونے سے زیادہ روڑے اٹکانے کا باعث ہوتی ہے۔ پھر آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ سوشلزم میں فنی ترقی اور جدید رجحانات بہت آہستہ آہستہ اور بڑی دیر میں داخل ہو پاتے ہیں۔ اس لئے سوشلسٹ ممالک، جنگی ساز و سامان کے علاوہ دوسری اشیاء کی تیاری میں جدید طریقوں کو اختیار کرنے میں اور نئی نئی دریافتیں کرنے میں بالعموم اور بحیثیت مجموعی پیچھے ہونے پر مجبور ہوتے ہیں۔ پھر آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ عوام پر ٹیکس کا بہت زیادہ بار ڈالنے کے باوجود اتنا سرمایہ جمع (Capital Formation) نہیں ہو پاتا کہ ہمیشہ کارخانے لگانے اور سرمایہ کاری (Investment) کا کام ڈھنگ سے چلتا رہے پھر یہ نظام اپنے ساتھ انتظامیہ کے کئی مسائل لے کر آتا ہے۔ ہر کارخانہ اور پورا نظام بحیثیت مجموعی جو صرف منیجروں کے ذریعہ چلتا ہے ان تمام کو ایسی صورت حال میں لا ڈالتا ہے کہ وہ ملک کے مجموعی مفاد کو، معاشی ترقی کے آئیڈیل کو پس پشت ڈال کر بہت سے کام اس آئیڈیل کے خلاف صرف اپنی گردن بچانے کے لئے کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ پھر زراعت کے معاملہ میں تو خواہ روس ہو یا چین یا بالعموم اشتراکی ممالک اپنے سوشلزم ہی کی وجہ سے نہ آج تک کامیاب ہوئے ہیں اور نہ آئندہ کامیاب ہونے کی کوئی وجہ نظر آتی ہے پھر سب سے بڑھ کر شامت تو اس غریب مزدور اور کسان کی آتی ہے جس کی ہمدردی میں سوشلزم کا یہ ڈرامہ اسٹیج کیا جاتا ہے۔ سارے کا سارا ملک دو طبقے

تنخواہ دار مزدوروں اور کسانوں کا ملک بنتا ہے، اور ان کو ... جو کپڑا یا تو راشن سے ملتا ہے، یا اتنا مہنگا ملتا ہے کہ وہ اس میں چین سے زندگی نہیں گزار سکتے۔ ملک کی ساری دولت جنگی ساز و سامان پر صرف ہوتی ہے، اور اشیائے صرف ہمیشہ نایاب یا عنقا ہوتی ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک کی صف میں جو اشتراکی یا سرمایہ دار ممالک ہیں، ان میں مقابلۃً معیارِ زندگی اگر کہیں گرا ہوا ہے، اور ہوتا ہے تو وہ صرف اشتراکی ممالک میں ان کے سوشلزم کے نتیجہ میں۔ پھر سرکاری غذائیں اور ہوٹل جو لیے جاتے ہیں، ان میں کہیں ڈھنگ کا کھانا تک نہیں ملتا۔ گرم کھانا دلوانے کے لئے، مسٹر کوسیگن کو منصوبہ بنانا پڑتا ہے کہ مزدور کارخانوں میں ڈھنگ سے کھا پی سکیں۔ یہ حشر قرآن بے چارے عوام کا ہوتا ہے جو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکے جاتے ہیں۔ جس معاشی نظام میں ایسی خوبیاں پائی جائیں جن کا ہم نے اوپر تذکرہ کیا ہے۔ اور جن کی تشریح بعد کے صفحات میں ان شاء اللہ کریں گے، عقل سلیم کیسے یہ باور کر سکتی ہے کہ ایسے معاشی نظام میں کسی ملک کی خاطر خواہ معاشی ترقی ہو سکتی ہے تقابلی طور پر سوشلزم میں معاشی ترقی کا خواب محض ایک خواب ہی رہتا ہے۔ اس کا نعرہ تو بڑا پیارا لگتا ہے۔ اس کی باتیں تو بڑی اونچی اونچی ہوتی ہیں، لیکن عملاً یہ جو کچھ دے سکتا ہے۔ اس کی حقیقت ان مسحور کن نعروں سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ جن کے چکر میں اکثر ترقی کے خواہاں سادہ لوح گرفتار ہو جاتے ہیں۔ آخر میں چل کر دیکھیے تو اک سراب سے زیادہ کچھ نہیں نکلتا۔ نہ کھانے کو ڈھنگ سے ملے، نہ رہنے کو اور یہ آپ کو ایک ایسی سنگین آمریت کے شکنجہ میں پھنسا لیتا ہے کہ جس میں ایک دفعہ پھنسنے کے بعد پھر نکلنے کی کوئی شکل نظر نہیں آتی۔ اگر ایک آمر کو ہٹایا جائے تو اس کی جگہ کوئی دوسرا آمر ہی لے سکتا ہے۔ ایک ڈکٹیٹر کی جگہ اگر دوسرا ڈکٹیٹر لے لیا کرے تو اس سے بھلا عوام کو آزادی کیسے نصیب ہوگی۔ پسماندہ ممالک میں تو جو بھی ڈکٹیٹر بننا چاہے اور اپنے قدم مضبوط جمانا چاہے کہ کوئی مخالفت میں چون و چرا نہ کر سکے تو ایسے تمام ڈکٹیٹروں کے لئے معاشی ترقی کا نام لے کر سوشلزم مسلط کر دینا بہترین طریق کار ہے اور یہی بنیادی سبب ہے کہ اکثر پسماندہ ممالک میں سوشلزم کو قائم کرنے کے خواہشمند حکمران ہیں نہ کہ عوام حالانکہ سوشلزم کا مطالبہ تو مزدوروں اور کسانوں کی طرف سے آنا چاہئے۔ لیکن پسماندہ ممالک میں اس کی ترتیب بالکل الٹ جاتی ہے۔ ایک ایسے نظام میں عوام کی معاشی ترقی یا فلاح و بہبود کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اس میں معاشی فلاح و بہبود اگر کسی کی ہوتی ہے تو وہ صرف ان ڈکٹیٹروں اور ان کے چاپلوسوں کی ہو سکتی ہے جو اس نظام کے نتیجہ میں عوام کی گردنوں پر پیر تسمہ پا بن کر مسلط ہو جاتے ہیں۔ یہ سب سے بڑی وجہ ہے کہ سوشلزم عوام کی بہبود و فلاح اور معاشی ترقی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ بن جاتا ہے۔

سوشلزم جب تمام صنعتوں اور کاروبار کو قومی تصرف میں لے لیتا ہے، تو ظاہر ہے کہ کسی شخص کو بھی انفرادی کاروبار کی اجازت نہیں ہوتی۔ انفرادی کاروبار کی خصوصیت کیا ہے؟ ایک آزاد و مکمل مسابقت والی معیشت میں کاروباری مجبور ہوتا ہے کہ نئی نئی راہیں تلاش کرے۔ ایسے کام میں ہاتھ ڈالے، جسے دوسرے بہت سے لوگ نہ کر رہے ہوں۔ اگر وہ بھی دیکھا دیکھی کارخانے لگانے لگ جائے اور بھیڑ چال کو اپنا اصول بنائے، تو ایسی صنعت والا کاروباری کبھی اوپر نہیں اٹھ سکتا۔ وہ عمر بھر ایک پرچون فروش یا ٹھیلے والے سے آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ کامیاب کاروباری تو وہی ہو سکتا ہے، جو نیا تجربہ کرنے اور خطرہ انگیز کرنے کی ہمت رکھتا ہو۔ سٹہ اور جوئے کا Risk نہیں۔ بلکہ تجارت و صنعت کی کسی نئی راہ پر اپنا سرمایہ لگانے کا Risk۔ جس میں یہ وصف نہیں، وہ کبھی صنعت و تجارت کی بلندیوں پر چڑھ نہیں سکتا۔ پرانے زمانے میں لوگ تجارت کے لئے دور دراز علاقوں کا سفر کرتے تھے۔ اور اس سفر کے سارے خطرات مول لینے کے لئے آمادہ ہوتے تھے۔ ایسی ہی قوموں میں اولوالعزمی کی صفات پیدا ہوتی ہیں جو انہیں بعد میں محض تجارت تک محدود نہیں رکھتیں، بلکہ آہستہ آہستہ دوسری قوموں پر سیاسی، معاشی اور تہذیبی غلبہ بھی عطا کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ احادیث میں اس کی بڑی ہمت افزائی کی گئی ہے۔ ایک سچے سوداگر کو شہید کا ہم مرتبہ

کہا گیا ہے۔ رزق کے دس حصوں میں سے نو حصے تجارت میں رکھنے کی بشارت دی گئی ہے اور اسلام کی تاریخ گواہ ہے کہ آج انڈونیشیا، ملائشیا اور چین میں جو بھی مسلمان نظر آرہے ہیں، یہ سب اللہ کے فضل اور مسلمان تاجروں کی اولوالعزمی کا ثمرہ ہیں خود برطانیہ جیسے چھوٹے سے جزیرہ کی ہندوستان جیسے ملک پر حکومت کا ذریعہ ایسٹ انڈیا کمپنی ہی، جو آئی تھی اپنا مال بیچنے اور ڈیڑھ سو سال تک ہمیں غلام رکھ کر اپنی تہذیب و ثقافت ایسے بیچ گئی کہ ابھی تک اس کا قلادہ ہم اپنی گردنوں سے نہیں اتار سکے، بلکہ اسے پسند کرنے لگے ہیں۔ ع

"خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری"!

"کہ خود..." قوموں کو بنانے والے افراد ہی ہوتے ہیں۔ اپنی گنتی اور تعداد کی کثرت سے نہیں بلکہ اپنے عزم اور ہمت سے۔ آخر اقبال نے یہ جو کہا ہے کہ "افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر" اور "ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ" تو یہ کن معنوں میں کہا ہے؟ یہ افراد کیا اپنی تعداد سے قوم کی تقدیر بناتے ہیں یا اپنے اوصاف سے؟ اب اگر کسی قوم کے افراد کو ٹھیک اس میدان میں داخل ہونے سے روک دیا جائے، جو عزم و ہمت جیسے اوصاف کی پرورش اور تربیت کا میدان ہو، تو ایسی قوم ترقی کے میدان میں اپنے سے چھوٹی قوموں سے بھی پیچھے نہ ہوگی تو اور کیا ہوگی؟ یہی وجہ ہے کہ روس، امریکہ جیسے نسبتاً نہیں۔ کسی کو کیا پڑی ہے کہ وہ نیا درد سر مول لے۔ لیکن ایک انفرادی کاروبار کرنے والے کو اگر کہیں سے ذرا سی بھی ہوا لگ جائے کہ فلاں نیا طریقہ استعمال کرنے سے آمدنی زیادہ ہوگی تو وہ فرد فوراً خطرہ مول لینے کو تیار ہو جائے۔ لیکن سوشلزم میں سب کچھ جانتے بوجھتے بھی کوئی اس خطرہ کو مول لینے کے لئے تیار نہیں۔ انفرادی کاروبار میں تو یہاں تک ہوتا ہے کہ لوگوں کو پورا الیقین نہیں ہوتا کہ ان کے نئے کاروبار میں ضرور منافع ہوگا یا نہیں۔ بلکہ ایسے کام کرنے کے لئے بھی خطرہ مول لیتے ہیں جن کو "ماہرین" "ناقابل عمل اور نقصان دہ" سمجھتے ہیں اور ہنسی اڑاتے ہیں جب کہ سوشلزم میں "ماہرین" کے اس فتوے کے باوجود کہ یہ جدید اکتشافات نفع آور ہیں اور بہتر بھی کوئی ان پر عمل کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ یعنی Risk نہ ہو خطرہ نہ ہو۔ لیکن ان کے لگے بندھے کام سے ذرا سا بھی مختلف ہو تو سوشلسٹ نظام میں اس جدت طرازی کے لئے افراد میں آمادگی پیدا نہیں ہوتی۔ اس بات کو لارڈ میل شیبٹ نے بڑے اچھے الفاظ میں پیش کیا ہے:-

"یہ اب سے کوئی ۵۰ سال پہلے کی بات ہے کہ دو نوجوان کاروبار میں ایک دوسرے سے متعارف ہوئے، اُن دونوں نے اُس تھوڑی سی پونجی سے، جو انہوں نے بچت کی تھی، کوئی نیا کاروبار شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کا سرمایہ انتہائی قلیل تھا۔ لیکن اُن کے عزائم بہت بلند تھے۔ انہوں نے ایک ایسا طریقہ اختیار کیا، جو اس ملک میں بالکل غیر معروف ہے۔ انہوں نے ماہر صنعت کاروں سے گذارش کی کہ وہ ان کا ساتھ دیں۔ لیکن ان کی ہنسی اڑائی گئی۔ بھلا کون ایسا خطرہ مول لینے کے لئے تیار ہوتا، جس کے متعلق تمام تجربہ کار صنعت کاروں کی یہ رائے ہو کہ یہ معاشی خطرہ انتہائی احمقانہ ہے؟........ یہ محض ایک مثال ہے۔ یہ دونوں افراد میرے والد اور آنجہانی سرجان بروڈنیر تھے۔ انہوں نے روزانہ صرف ۸ گھنٹے کام نہیں کیا، بلکہ ۳۶ گھنٹے بغیر رکے کام کیا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے لئے خود کام پیدا کیا۔ انہوں نے ایسا کام پیدا کیا کہ اس کام کے لئے بعد میں ہزاروں افراد کو ملازم رکھنے کی ضرورت پڑی۔ سوشلزم کے بارے میں بہت سی مشکلات میں سے ایک بڑی مشکل میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس

---

(1) "New Methods of Economic Management in U.S.S.R" Moscow P.I.B. Report to the CPSU. Central Committee Sept 27, 1965 by A. Kosygin, Chairman of the Council of Ministers of the USSR

میں کوئی بھی ترقی کیسے ممکن ہے ؟" ۱۵ؔ

چھوٹے ملک سے بھی ابھی تک پیچھے ہے اور جاپان تک رفتار ترقی میں اس سے آگے ہے۔ ایسی پابندی لگانے والا نظام سوشلزم ہے اور اس کے نتائج جو کچھ سامنے آرہے ہیں، وہ ہم آپ کے سامنے مسٹر کوسی گن کے الفاظ میں پیش کرنا چاہتے ہیں :۔

"تحقیقی کام ، سائنس اور انجینیرنگ کے جدید انکشافات کو صنعت و حرفت کے پیدا آوری طریقوں میں استعمال کرنے کے منصوبے مستقلاً ناکام ہی رہے ہیں۔ نئی مشینوں کے ڈیزائن کرنے اور ان کو کثیر تعداد میں تیار کرنے کا کام منظم کرنے کے معاملہ میں صورتِ حال خاص طور پر غیر تسلی بخش ہے"۔ ۱۶ؔ

یعنی ایک طرف تو تحقیقی کام کرنے کے لئے جو منصوبے بنائے جاتے ہیں، وہ پورے نہیں ہو پاتے اور دوسری طرف مارے باندھے کی جو کچھ تحقیق ہوئی ہے اور اس سے جو انکشافات سائنس اور انجینیرنگ کے میدان میں ہوتے ہیں، ان کو صنعت و کاروبار میں استعمال کرنے والا کوئی

ایک آزاد معیشت میں کہاں تو لوگ ایسی راہوں پر اپنی اولوالعزمی اور بلند ہمتی کی بنا پر چل پڑتے ہیں کہ جنہیں ماہرین اور تجربہ کار صنعت کار ہنسی اڑانے کے لائق سمجھتے ہیں اور ان نئی راہوں پر سفر کرنے والے اولوالعزم افراد اپنی کامیابیوں سے ہنسنے والوں کی ہنسی اڑاتے ہیں۔ اور کہاں سوشلزم میں یہ حال ہے کہ جن کارخانوں اور صنعتوں میں مزید پیداوار کی گنجائش اور استعداد ہوتی ہے۔ اسے بھی پورا نہیں کیا جاتا جب کہ ملک میں اس کی شدت سے مانگ بھی موجود ہو۔ چنانچہ اپنی اسی رپورٹ میں جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ وزیراعظم روس مسٹر کوسی گن فرماتے ہیں :۔

" پیداوار بڑھانے کی جتنی نئی گنجائش اور جتنے نئے امکانات کیمیاوی کارخانوں، لوہے اور سٹیل کے کارخانوں، تعمیراتی اشیاء کے کارخانوں اور کاغذ وگودے کے کارخانوں میں ہیں، ان کو بہت ہی کم استعمال کیا گیا ہے۔ . . . .

. . . . . مصنوعی (Synthetic) ربر کے بڑے بڑے کارخانوں کو ان کی پوری گنجائش کے مطابق چلانے میں افسوسناک کمی رہی ہے۔ مثلاً کوئی بیشیوف ، ولشک اور افریموف کے کارخانوں میں نئے اقسام کا مصنوعی ربر تیار کرنے کے بہت امکانات اور گنجائش موجود ہے۔ لیکن اس پوری گنجائش کو کام میں نہیں لایا گیا۔ ہماری قومی معیشت کو ایسے ربر کی بڑی مقداریں نہیں مل رہی ہیں حالانکہ اس کی بڑی سخت ضرورت ہے۔ دوہرے فاسفورس کے اعلیٰ مرکبات (Superphosphates) کی پیداوار کے لئے بھی جتنی گنجائش کارخانوں میں موجود ہے، اتنی پیداوار نہیں ہو رہی ہے۔ اس طرح Voskresensk Chemical Plant میں ۱۹۶۳ء سے جتنی پیداوار کی گنجائش رہی ہے اس کا صرف ۷۰ فیصد کام میں لایا جا رہا ہے اور جتنی پیداوار کی گنجائش ۱۹۶۴ء میں Volkhov Aluminium Plant میں رکھی گئی تھی اس کی صرف ۴۲ فیصد پیداوار ہو رہی ہے"۔ ۱۸ؔ

منصوبہ بنانے والے تو کاغذ پر سارے اچھے اچھے منصوبے بھی بنا ڈالتے ہیں، بلکہ ان منصوبوں کے مطابق کبھی نہ کبھی طرح کارخانے بھی لگا دیئے جاتے ہیں، لیکن اس سے پیداوار بس آدھی پونی ہی ہوتی ہے۔ جب لوگوں میں کوئی دل چسپی باقی نہ ہو تو کارخانہ

۱۵ؔ Industry and Politics P. 312-3 extract of speech in the House of Commons

۱۸ؔ "New Methods of Economic Management in the U.S.S.R" Moscow P16,17

میں خواہ کتنی ہی گنجائش ہو، لوگ کیوں کام کریں گے۔ کہاں تو آزاد معیشت میں لوگ اولوالعزمی سے نئی راہیں دریافت کرتے اور خطرات مول لیتے ہیں اور کہاں سوشلزم میں یہ حال ہے کہ سب کچھ ہونے کے باوجود اس پہلو سے جمود کی کیفیت ہے۔

حکومتی انضباط اور تخلیقی صلاحیتیں

مشہور معیشت دان مارشل کا قول ہے :-

"کاروبار میں حکومتی مداخلت اور کنٹرول سماجی ترقی کے لئے ایک خطرہ ہے۔ کیونکہ صنعت و تجارت میں مسلسل اُپج، جدّت اور زرخیز ذہن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس خطرہ سے اور بھی ڈرنے کی ضرورت اس لئے ہے کہ یہ پُرفریب طریقے اختیار کرتا ہے۔ یہ بدنامی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ حکومتی اور بلدیاتی ادارے، ہزاروں اعلیٰ تنخواہ یافتہ افراد کو انجینئرنگ اور دوسری ترقی یافتہ صنعتوں میں ملازم رکھتے ہیں، پھر بھی ان سے بہت کم ایسی ایجادات ظہور میں آتی ہیں، جو کسی اہمیت کی حامل ہوں۔ اور وہ چند ایجادات بھی

سر ڈبلیو، ایچ پریس جیسی ہستیوں کی طرف سے ہوتی ہیں، جو سرکاری ملازمت میں داخل ہونے سے پہلے آزاد مسابقت کرنے والی پرائیویٹ کمپنیوں میں اچھی خاصی تربیت پاچکے تھے۔ حکومت کم ہی کوئی تخلیق کرتی ہے۔ اگر پرائیویٹ کمپنیوں کی جگہ محض حکومتی کمپنیاں گذشتہ سو سال سے ہوتیں تو یہ سمجھنے کے لئے معقول وجہ موجود ہے کہ آج ہمارے صنعت و حرفت کے طریقے ویسے ہی ہوتے، جیسے آج سے پچاس سال پہلے تھے ...... کوئی حکومت شیکسپیئر کی تحریروں کے مجموعہ کو چھاپ کر ایک اچھا ایڈیشن ضرور نکال سکتی ہے۔ مگر وہ ان کو لکھوا نہیں سکتی .... میونسپلٹی کے بجلی کے نظام کی لاش کا ڈھانچہ اس کے افسران کا مرہونِ منّت ضرور ہے، لیکن اس کی تخلیق و دریافت اور ارتقاء کا سہرا آزاد اداروں کے سر ہے۔"[19]

یہ تو ان اداروں کا حال ہے، جو آزاد معیشت میں حکومتی کنٹرول میں ہوتے ہیں۔ لیکن ایک سوشلسٹ نظام میں تو سارے کے سارے ادارے صرف حکومت ہی کے ہو سکتے ہیں۔ ان اداروں میں فرد کی تخلیقی صلاحیتوں کو پروان چڑھنے کا موقع کیسے مل سکتا ہے؟

۷۔ سوشلزم میں مزدوروں کا ناجائز انتفاع

۱۸۶۵ء میں ۲۰ اور ۲۷ جون کے درمیان کارل مارکس کی کوششوں سے لندن میں فرسٹ انٹرنیشنل First International منعقد ہوئی، جس کا مقصد کمیونسٹ منشور کی بنیاد پر دنیا کے مزدوروں کو ایک کرنا تھا۔ یہ کوشش بہت جلد ناکام ہو گئی لیکن اس میں کارل مارکس نے جو تقریر کی تھی، وہ نہایت سادہ الفاظ میں اس کے بنیادی نظریات کی ترجمانی کرتی ہے۔ یہ تقریر مسٹر ویسٹن کے جواب میں کی گئی تھی۔

---

[19] Memorials of Alfred Marshall P. 338-9

اس زمانہ میں یورپ کے بر اعظم میں مزدوروں کی ہڑتالوں کا سلسلہ چل پڑا تھا جس کے سبب سنجیدہ طرز فکر رکھنے والے سوشلسٹوں پر اس کا گہرا اثر تھا۔ اس میں مسٹر ویسٹن نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اس طرح کی ہڑتالوں سے اگر مزدوروں کی اُجرتوں میں اضافہ ہو بھی جائے تو اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا اور یہ کہ ٹریڈ یونینوں کی اس طرح کی حرکتیں "مضرت رساں" اثرات رکھتی ہیں۔ مارکس کو اس رائے پر بڑا غصہ آیا۔ اور اس کے جواب میں کارل مارکس نے انگریزی میں جو تقریر کی اس کو کمیونسٹ چین نے حال ہی میں Wages, Price and Profit کے نام سے شائع کیا ہے۔ مارکس کو ان ہڑتالوں سے بڑی خوشی تھی۔ کیونکہ یہ کمیونسٹ منشور کی اس ہدایت کے مطابق تھیں کہ

"وہ (مزدور) درآمد شدہ اشیاء کو برباد کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ اشیاء ان کی محنت سے مسابقت کرتی ہیں۔ وہ مشینوں کو توڑ پھوڑ کر چکنا چور کرتے ہیں۔ وہ کارخانوں کو آگ لگاتے ہیں۔ وہ قوت کے بل بوتے پر زور و زبردستی سے اپنے اس کھوئے ہوئے وقار کو بحال کرتے ہیں، جو انہیں قرون وسطیٰ میں حاصل تھا۔" [20]

یہ ہیں اشتراکیت کے انسانِ مطلوب کی چند صفات۔ یہ ہے تہذیب جدید کے عطا کردہ ایک معاشی نظام کے لئے جدوجہد کا طریق کار۔

نظامِ اُجرت کا خاتمہ

یہ سب کچھ مزدور کس لئے کریں؟ یہ کچھ پاپڑ بیلنے کا حاصل کیا ہوگا؟ مارکس کے نظریۂ قدر اور نظریۂ قدر زائد کا لب لباب یہ ہے کہ کسی کارخانہ میں جو اشیاء تیار ہوتی ہیں، ان اشیاء میں قدر پیدا کرنے والا اصل میں تو مزدور اور صرف مزدور ہی ہے لیکن سرمایہ دار مزدور کو اتنی اُجرت نہیں دیتا، جتنی کہ مزدور نے وہ شئے بنا کر پیدا کی ہے۔ سرمایہ دار مزدور کو تھوڑی بہت اُجرت دے کر مزدور کی پیدا کردہ قدر کو جو اس کی اُجرت سے زائد بچ رہتی ہے، اس کو اپنا منافع کہہ کر مزید سرمایہ میں تبدیل کرتا ہے۔ اس طرح گویا سرمایہ کیا ہے اور کہاں سے آتا ہے؟ منافع سے' اور یہ منافع کیا ہے؟ زائد قدر' یعنی مزدور کو اُجرت دینے کے بعد کسی شے میں جو قدر بچ رہتی ہے۔ یہ ساری قدر چونکہ مارکس کے خیال میں صرف مزدور کی پیدا کی ہوئی ہے۔ اس لئے سرمایہ دار کا منافع گویا مزدور کی زائد قدر کا ناجائز انتفاع ہے۔ سرمایہ پیدا ہی اس طرح ہوتا ہے۔ سرمایہ گویا مزدور کی جمع شدہ محنت ہے۔ اس لئے منافع کے نام سے جو حصّہ رکھ لیا جاتا ہے۔ وہ گویا مزدور کا خون اور پسینہ ہے۔ جو سرمایہ دار سرمایہ بنا کے اپنے پاس رکھ لیتا ہے اور مزدور کو صرف اتنی اُجرت دیتا ہے کہ وہ زندہ رہے اور سرمایہ دار کے لئے مزید سرمایہ اپنی محنت سے اشیاء کی قدر پیدا کر کے فراہم کرے۔ اس لئے اس ناجائز انتفاع کو روکنے کے لئے مزدور کو توڑ پھوڑ کرنی چاہیئے۔ تاکہ وہ اس پورے نظام ہی کو ختم کر دے، جس میں اس کی حیثیت صرف ایک اُجرت پانے والے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اس اُجرت کے نظام کو ختم کرنا گویا مزدور کا آخری مقصد ہے، جس کے ذریعہ مزدور اپنے آپ کو سرمایہ دار کے ناجائز انتفاع سے بچا سکتا ہے چنانچہ مارکس نے اپنی اس بات کو فرسٹ انٹرنیشنل کی جنرل کونسل کے سامنے تقریر کرتے ہوئے نہایت وضاحت سے اس طرح پیش کیا ہے:۔

[20] Manifesto of the Communist Party by Karl Marx and F. Engels Moscow 1960 Ed P.52

"اس دقیانوسی مقولہ" پورے دن کی محنت کا بدلہ پورے دن کی اُجرت" کے بجائے انہیں (مزدوروں کو) چاہیئے کہ وہ اپنے جھنڈے پر یہ انقلابی نعرہ بلند کریں: "نظام اُجرت کا خاتمہ"...... ۲۱ ے"

پھر آگے چل کر مارکس ٹریڈیونین کا مقصد یہ پیش کرتا ہے:۔

"ٹریڈیونین کا کام سرمایہ کی دخل اندازیوں کے خلاف مضبوط مرکز بنانا ہے...... (اُن کا کام) محنت کار طبقہ کو آزادی دلانا یعنی اُجرت کے نظام کو بالآخر ختم کرنا ہے۔" ۲۲ ے

گویا مارکس کے نزدیک مزدور کی حقیقی آزادی کا مطلب مزدور کو اُجرت کے نظام سے آزادی دلانا ہے۔ اسی طرح مزدور ناجائز انتفاع سے بچ سکتا ہے

سوشلزم اور کمیونزم میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ کمیونزم سے مراد وہ آخری آئیڈیل منزل ہے کہ جہاں ریاست اور حکومت ختم ہو جائے گی اور سوشلزم اس سے پہلے کا مرحلہ ہے۔ گویا اس منزل پر جانے کے لئے تیاری کا مرحلہ ہے۔ پہلے تو مارکس کے لٹریچر میں اس کی کوئی معقول وضاحت نہیں ہے کہ حکومت خود بخود کس طرح مرجھا جائے گی۔ صرف اتنی بات ہے کہ چونکہ طبقات ختم ہو جائیں گے اس لئے حکومت کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ مارکس کے نزدیک سیاسی طاقت کی ضرورت محض اس لئے ہوتی ہے کہ ایک طبقہ دوسرے کو دبائے اور جب طبقات نہ ہوں تو سیاسی طاقت کی ضرورت اور جواز باقی نہیں رہتا۔ کمیونسٹ منشور کے دوسرے سیکشن "کمیونسٹ اور پرولتاری" کے آخری حصہ میں اس بات کو مارکس اور اینجلس نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے:۔

"جب ترقی کی راہ میں طبقاتی اُونچ نیچ بالکل ختم ہو جاتے اور جب تمام پیداوار پوری قوم کی وسیع تنظیم کے ہاتھ میں آجائے تو پھر حکومت کی طاقت کی سیاسی نوعیت ختم ہو جائے گی۔ سیاسی طاقت جسے کہا جاتا ہے، یہ صرف ایک طبقہ کا دوسرے طبقہ کو دبائے رکھنے کی منظم طاقت ہے......" ۲۳ ے

اس نظریہ پر تفصیلی تنقید ہمارے موضوع سے باہر ہے۔ ہم اس میں فی الحال اس حد تک دلچسپی رکھتے ہیں کہ مارکس نے جس "نظام اُجرت کا خاتمہ" کا نعرہ مزدوروں کو سکھایا تھا، وہ کیا اس سرخ جنت میں ہوگا، جس میں طبقات اور سیاسی طاقت سب ختم ہو جائیں گے یعنی کمیونزم کے آئیڈیل اسٹیج میں یا سوشلزم کے درمیانی اسٹیج میں؟ اگر یہ کہا جائے کہ اُجرتوں کے نظام کا خاتمہ کمیونزم کی آخری منزل پر پہنچنے کے بعد ہوگا تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس منزل پر پہنچنے سے پہلے سوشلزم کے درمیانی اسٹیج پر گویا اُجرتوں کے نظام کا خاتمہ نہیں ہوگا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اس آخری منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی سوشلزم کی منزل پر ہی اُجرتوں کا نظام ختم ہوگا تو یہ حقائق کے خلاف ہے۔ دنیا کے تمام اشتراکی ممالک ابھی تک ابھی کمیونزم کی منزل میں داخل نہیں ہوئے ہیں۔ اور سب کے سب سوشلزم کی منزل سے گذر رہے ہیں اور کسی ایک سوشلسٹ ملک میں بھی اُجرتوں کا نظام ختم نہیں ہوا ہے۔ یعنی بہر صورت یہ طے ہے کہ اُجرتوں کے نظام کا خاتمہ سوشلزم کی منزل میں نہیں ہو سکتا۔ گویا سوشلزم میں بھی مزدوروں کا ناجائز انتفاع EXPLOITATION جاری رہے گا۔ فرق صرف یہ تھا کہ پہلے یہ انتفاع سرمایہ دار کرتا تھا، اب وہ سوشلسٹ

۲۱ے Wages, Price and Profit by Karl Marx P.78 1965 ed Printed in Peoples Republic of China.

۲۲ے ایضاً P 79

۲۳ے منشور اشتراکیت۔ صفحہ ۴۷

حکومت کرے گی۔ کیونکہ مارکس کے نظریۂ قدرِ زائد کی رُو سے اُجرت پر مزدوری کروانا گویا مزدور کا ناجائز استحصال کرنا ہے۔ یہ ناجائز استحصال اگر سوشلسٹ حکومت کرے، تو وہ کس منطق کی رُو سے جائز ہو جاتا ہے؟

مارکس نے مزدوروں کو جو یہ تلقین کی ہے کہ وہ اس دقیانوسی مقولہ "پورے دن کی محنت کے بدلہ پورے دن کی اُجرت" کی جگہ "نظامِ اُجرت کا خاتمہ" کا علم بلند کریں۔ تو آخر مزدوروں کے ساتھ کیا ہوا یہ وعدہ کب وفا ہوگا؟ کیونکہ سوشلزم کی منزل میں تو یہ ختم نہیں ہو سکتا۔ روس میں اشتراکیت کو آئے ہوئے ۵۰ سال گذر چکے ہیں۔ اور ابھی تک سوشلزم قائم ہے اور نہ معلوم کب تک قائم رہے گا اور نہ معلوم کب اور کیسے یہ کمیونزم کی منزل میں داخل ہوگا۔ بہرحال نتیجہ یہ ہے کہ سوشلزم کی وجہ سے ابھی تک نظامِ اُجرت قائم ہے اور ایسا نظامِ اُجرت ہے۔ جو سرمایہ دار ممالک سے بھی بدترین ہے، تو پھر اس نعرہ "نظامِ اُجرت کا خاتمہ" کی حقیقت کیا ہے؟ یہ ایک فریب ہے کہ بیچارے سادہ لوح مزدوروں کو ایک خیالی جنّت دکھا کر انہیں مشینوں کی توڑ پھوڑ اور کارخانوں کو جلانے کے لئے آمادہ کیا جائے۔ اس طرح جب سیاسی طاقت ہاتھ میں آ جائے، تو کیا وہ سیاسی طاقت حکمران طبقہ کی طرف سے مزدوروں کے طبقہ کو دبائے رکھنے کا ذریعہ نہیں ہوگی؟ کیونکہ بقول مارکس سیاسی طبقہ کے معنی ہی ایک طبقہ کی طرف سے دوسرے طبقہ کو دبانا ہے۔ تو پھر سوشلسٹ نظام میں تو "پرولتاری ڈکٹیٹرشپ" کے نام پر سیاسی طاقت ہوتی ہے۔ وہ سیاسی طاقت کمیونزم کی منزل پر پہنچنے سے پہلے تک، مارکس کے اپنے فلسفہ کی رُو سے کس طبقہ کی طرف سے کس طبقہ کو دبانے کے لئے استعمال ہوگی؟ ایک سوشلسٹ نظام میں جب سیاسی طاقت ہے تو ضرور یہ کسی طبقہ کو دبانے ہی کے لئے ہے اور یہ طبقہ صرف مزدوروں ہی کا ہو سکتا ہے، جسے دبانے کے لئے سوشلزم کی سیاسی طاقت استعمال ہو سکتی ہے۔ یہ نتیجہ مارکس ہی کے نظریہ سے نکلتا ہے۔

"ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات"

مزدور، جسے کہا جاتا ہے کہ ہم تم کو سرمایہ دار کے ظلم سے نجات دلانا چاہتے ہیں۔ اس کو سرمایہ دار سے نجات دلانے کی سبیل یہ اختیار کی جاتی ہے کہ اُسے پکڑ کر قومی جیل میں بند کر دیا جاتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص جیل میں جانے کو سرمایہ دار کے ظلم سے نجات سمجھتا ہے تو بے شک ایسے شخص کو سوشلزم ہی اختیار کرنا چاہیئے۔ کوئی شخص اگر اپنی نجات اس میں سمجھتا ہے کہ گڑھے سے نکل کر کنوئیں میں گرے، تو بے شک اس مقصد کے لئے سوشلزم سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے۔ مزدوروں کے لئے پورا ملک ایک جیل خانہ بن جاتا ہے اور جس طرح جیلخانہ کے کارپردازوں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے تمام قیدیوں کو زندہ رکھنے کے لئے بُرا بھلا کچھ نہ کچھ کھانے کو دیں، تاکہ ان سے خوب محنت کرائی جا سکے۔ ایک سوشلسٹ ملک میں بھی کچھ نہ کچھ کھانے کو دیا جاتا ہے۔ لیکن جو روٹی کپڑا دیا جاتا ہے، وہ تمام آزادیوں کو سلب کر کے پورے ملک کو ایک بڑے جیل خانہ میں تبدیل کرنے کے بعد دیا جاتا ہے۔ کیونکہ تمام معاشی معاملات کو قومی تصرّف میں لینے کے بعد انسان بھی قومی تصرّف میں چلا جاتا ہے۔ اشتراکی حکومت جیسے چاہے استعمال کرے۔ پھر ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ ممالک بھی اس معاملہ میں سوشلسٹ ممالک سے بہتر ہیں۔ ان ممالک میں بھی کفالت عامہ (Social Security) کی اسکیمیں رائج ہیں اور سوشل انشورنس ٹائپ کی چیزیں بھی ہیں۔ ان کے تحت اگر کوئی بے روزگار ہو تو اسے روزگار ملنے تک حکومت کی طرف سے اس کا خرچ ادا کیا جاتا ہے۔ برطانیہ میں پسماندہ ممالک سے لوگوں کی آمد پر جو پابندیاں لگائی گئی ہیں، ان کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح جو لوگ آتے ہیں، وہ

اکثر بے روزگار رہوتے ہیں اور حکومت کو انہیں خرچ دینا پڑتا ہے۔ اس طرح حکومت پر بار بڑھتا چلا جارہا ہے۔ اس روٹی کپڑے کی ضمانت تو ہر نظام ہی میں ہے۔ پھر کیوں آدمی اس کے لئے ایک ایسا ہی نظام اختیار کرے، جو اس کی آزادیوں کو سلب کرکے بدترین قسم کی ڈکٹیٹرشپ کو جنم دینے والا ہو۔ اور معاشی طور پر اتنا کچھ بھی نہ دے سکے، جو کہ سرمایہ دارانہ نظام جیسا بُرا نظام دیتا ہے۔

اتنے سب کچھ "پاپڑ بیلنے" کے باوجود آج تک سوویٹ مزدور کی حالت امریکہ کے مزدور سے بہت پیچھے ہے۔ روسی مزدور کی اوسط حقیقی آمدنی سنہ ۱۹۵۰ء میں امریکی مزدور کی آمدنی کی ۱۲ تا ۱۶ فیصد کے برابر تھی۔ اور سنہ ۱۹۵۴ء میں ۱۶ تا ۲۲ فیصد کے برابر۔ [24]

پھر یہ کہ روس میں سارے خاندان کو یعنی گھر کی عورتوں وغیرہ سب کو کام کرنا پڑتا ہے۔ روس کے مزدوروں میں تقریباً آدھی تعداد عورتوں کی ہے۔ روس میں مزدوری کرنے والی عورتیں تمام مزدوروں کا ۴۵ فیصد ہیں، جب کہ امریکہ میں ۳۳ فیصد۔ [25]

ایک پونڈ گوشت کے حصول کے لئے ماسکو کے ایک مزدور کو نیویارک کے ایک مزدور سے ۴ گنا زیادہ کام اور محنت و مزدوری کرنی پڑتی ہے۔ ایک پونڈ روٹی کے لئے ۱½ گنا زیادہ، ایک اونی سوٹ کے لئے ۱۱ گنا زیادہ، عورتوں کے جوتے کے ایک جوڑے کے لئے ۱۱ گنا زیادہ، ایک پاؤ دودھ کے لئے ۴ گنا زیادہ، ایک درجن انڈوں کے لئے ۸ گنا زیادہ اور ۲۰ سگریٹ کے ایک پیکٹ کے لئے ۴ گنا زیادہ.... [26]

غرض اس طرح عام ضروریات زندگی کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے کہ جس کے حصول کے لئے ایک اشتراکی مزدور کو ایک سرمایہ دار ملک کے مزدور سے کئی گنا زیادہ مصیبت اٹھانی نہ پڑتی ہو۔ پھر بات صرف اتنی نہیں کہ مزدوروں کی حالت قابلِ رشک نہیں، بلکہ جس طرح جیل میں مختلف کلاسوں کے قیدی ہوتے ہیں اور ہر کلاس کے قیدی سے اس کے مطابق معاملہ ہوتا ہے۔ ایسی ہی تفریقات اشتراکیت میں بھی قائم کی گئی ہیں۔

سنہ ۱۹۶۶ء کے ۵ سالہ منصوبہ کی رپورٹ جو کمیونسٹ پارٹی کی ۲۳ ویں کانگریس کے سامنے روس کے وزیر اعظم کوسی گن نے پیش کی ہے، اس میں بتایا گیا ہے کہ:۔

"سرکاری مطعموں (Public catering) میں بڑی سنگین کوتاہیاں ہیں۔ اب کینٹین (Canteen) اور ریستوران کے اسٹاف کو اشیاء کی کمی کا بہانہ کرنے کی گنجائش نہیں رہی ہے۔ اس کے باوجود کھانا بالعموم بے مزہ اور بے ذائقہ ہوتا ہے اور سروس بھی معیاری نہیں ہے....... عوام کے لئے کھانے کا بندوبست کرنے کے معاملہ پر مزید توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اگلے ۵ سالہ منصوبہ میں کھانا سپلائی کرنے والی کمپنیوں کی سرگرمیوں پر خرچ ۵۰ فیصدی بڑھایا جائے گا۔ بہت سے نئے ریستوران، کیفے اور کھانے کی جگہیں بنائی جائیں گی۔ تمام کارخانوں، تعمیراتی کاموں کی جگہوں، حکومتی زرعی فارم اور تعلیمی اداروں میں گرم کھانے ملنے چاہئیں۔" [27]

---

[24] Soviet Economic Power by Campbell P. 184 Japanese ed.

[25] ایضاً صفحہ

[26] Business Week July 16, 1960.

[27] 23rd Congress of the CPSU, 1966, Moscow P. 243

اشتراکیت پر عمل کرتے ہوئے ۰ ۵ سال گذر گئے ۔ جیسا کہ اوپر کے اقتباس سے ظاہر ہے لیکن اب تک مزدوروں کو گرم کھانے
ملنے کے تسلی بخش انتظامات نہیں ہو سکے ۔ اگلا ۵ سالہ منصوبہ اگر کامیاب ہوا تو گویا گرم کھانے ملیں گے لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آتا
کہ اگلے ۵ سال بعد بھی کیوں ملیں گے ؟ کیونکہ اسی رپورٹ میں اوپر کہا گیا ہے کہ ساری اشیاء کی فراہمی کے باوجود کینٹین کا اسٹاف
بے ذائقہ کھانے بناتا ہے اور سروس ٹھیک نہیں کرتا ۔ اگلے ۵ سال میں مزید کچھ ریستوران اور کینٹینیں کھول دینے سے کیا ہوگا ۔
ان نئے ہوٹلوں اور کینٹینوں کا اسٹاف بھی ویسے ہی بے ذائقہ کھانے بنائے گا ۔ جیسا کہ پرانی کینٹینوں کا اسٹاف بناتا رہا ہے ۔ بہر حال
مزدوروں کے غم خوار جس روٹی کپڑے کا نعرہ لگاتے ہیں ۔ اس روٹی کو مزدوروں تک گرم گرم پہنچانے کے لئے بھی وزیر اعظم اور
ملک کی سب سے اونچی پارلیمنٹ کو ۵ سالہ منصوبے بنانے پڑتے ہیں ۔ پھر بھی یہ مشکوک ہے کہ یہ مقصد حاصل ہوگا یا نہیں ۔ سوشلزم
بھی کیا خوب معاشی نظام ہے کہ ذرا ذرا سی بات کا تبنگڑ بن جاتا ہے ۔ رائی کا ایسا پربت اور کہاں بنتا ہوگا کہ چھوٹے چھو

امور کے لئے بھی منصوبہ بندی کے محکمہ کا سارا عملہ لگ جاتا ہے ، پانچ سالہ منصوبہ بنایا جاتا ہے اور پھر اس منصوبہ پر ملک کے
سب سے اعلیٰ قانون ساز ادارہ میں بحث و تمحیص کے بعد کہیں جا کر یہ طے ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کو اگلے ۵ سال میں کیسے حل کیا جائے ؟
ایک آزاد معیشت میں ہر تاجر اور کاروباری اپنے طور پر ایسے مسائل فوراً حل کر لیتا ہے ۔ لیکن سوشلزم میں چونکہ سب "مزدور" ہیں
کسی کو کسی معاملہ سے ایسی دل چسپی نہیں ہوتی ۔ جیسا کہ کسی آدمی کو اپنے ذاتی کاروبار سے ہوتی ہے ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ روٹی بھی گرم کھلانی ہو
تو اس کی تدبیریں بھی ملک کے اعلیٰ ترین حکام اور ادارے کریں ۔ جس نظام میں محنت کار کو اپنے کام سے دل چسپی نہ ہو اور وہ مارے
باندھے کا کام کرتا ہو ، اس نظام کا مستقبل کیا ہو سکتا ہے ؟

یہی وجہ ہے کہ پیداآوری گنجائش ہونے کے باوجود سوشلسٹ نظام میں بہت سے کارخانے اپنی پوری گنجائش کے مطابق کام
نہیں کرتے ۔ سوال یہ ہے کہ آخر اپنے کام سے مزدوروں کی دل چسپی کیوں ختم ہو جاتی ہے ؟

مزدور "شے" ہے یا "خام مال" ؟

اس کی ایک سیدھی اور صاف وجہ تو یہ ہے کہ جب ہر چیز کو قومی تصرف میں لے لیا جاتا ہے تو ہر شہری کی حیثیت ایک
مزدور کی سی رہ جاتی ہے ۔ پورا ملک مزدوروں کا ملک بن جاتا ہے ۔ کوئی شخص بھی ملک میں ایسا باقی نہیں رہتا ، جو کسی کام کو اپنا
سمجھ کر کرے ۔ قومیانے کے اس بنیادی سبب کے علاوہ خود یہی قومیانا (Nationalization) ایسی صورت حال پیدا کرتا ہے
کہ مزدور کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکتا ۔ جس کا ثبوت اسٹالن نے اپنے جبری محنت کیمپوں سے فراہم کیا ہے ۔ ان کے ساتھ انصاف
کرنے کی بجائے جبر کیا جاتا ہے ۔ اور جبر بھی ایسا کہ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ :۔

" سوویٹ روس کے علاوہ صنعتی طور پر ترقی یافتہ کوئی اور ملک دنیا میں ایسا نہیں ہے کہ جس نے اپنے محنت کاروں
کو قابو میں کرنے کے لئے اتنے بڑے پیمانہ پر جبری طریقے اختیار کئے ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جبر کے ان گنت طریقے اختیار کئے گئے
جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ اگر کسی نے اپنی نوکری چھوڑی تو اس کو قید میں ڈالا جاتا تھا ۔ اس کے علاوہ اور بھی مختلف قسم کے مادی ،
اخلاقی اور نفسیاتی دباؤ روسی مزدوروں پر سنہ ۱۹۳۰ء اور سنہ ۱۹۴۰ء اور جنگ عظیم دوم کے دوران ڈالے گئے ۔ اور یہ ساری

باتیں اتنی معروف ہو چکی ہیں کہ ان کو دہرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ کسی نہ کسی قسم کا جبر روس کی مزدور پالیسی کی خصوصیت رہا ہے۔ بہر حال یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس طرح کے خوفناک مصائب اور دردناک عذاب پہنچا کر نسبتاً تھوڑے سے عرصہ میں صنعتی مزدوروں کی بڑی تعداد وجود میں لائی گئی۔۔۔۔" ۲۸ھ

مارکس معترض تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام میں مزدور کو انسان کی بجائے خرید و فروخت کی "شئے" کی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ مارکس کے نام لیوا، جو روس میں پیدا ہوئے تو انہوں نے سرمایہ داروں کو بھی اس معاملہ میں مات کر دیا۔ انہوں نے اپنے مقاصد کے لئے مزدوروں کو انسان سمجھنے کی بجائے ان کو اتنی وقعت بھی نہیں دی، جو کسی "شئے" کو دی جاتی ہے۔ بلکہ مزدوروں کو صنعتی پیداوار کا "خام مال" سمجھ کر اس بے دردی سے استعمال کیا جاتا ہے کہ کسی ترقی یافتہ ملک میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ نسبتاً تھوڑے سے عرصہ میں صنعتی مزدوروں کی کھیپ تیار کرنا وہ مقصد تھا، جس کی خاطر مزدور کی انسانی حیثیت کو بھینٹ چڑھایا گیا۔

صرف اسلام کا معاشی نظام ہی دنیا میں وہ نظام ہے، جس میں مزدور نہ سرمایہ دارانہ نظام کی طرح خرید و فروخت کی "شئے" کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور نہ ہی اشتراکی نظام کے "خام مال" کی طرح۔ بلکہ ایک "آزاد انسان" سمجھا جاتا ہے جس کے حقوق سلب کرنے کا اختیار نہ سرمایہ دار کو ہوتا ہے، نہ حکومتِ وقت کو۔!

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم۔!

جبری محنت کی اس پالیسی کے سبب جب روس کی دنیا بھر میں بہت بدنامی ہوئی تو اس کا علاج مسٹر خروشچیف نے یہ نکالا کہ اس کا سارا الزام اسٹالن کے سر ڈال کر اس بدنما داغ کو مٹا ڈالیں اور کچھ ایسی اصلاحات کریں کہ جس سے دنیا پر یہ ظاہر ہو جائے کہ مزدوروں کے بھی خواہ اس سوشلسٹ نظام میں کبھی کبھی مزدوروں کی شنوائی بھی ہوتی ہے۔ اور اس شنوائی کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ مزدور ٹریڈ یونین بنا کر مطالبات پیش کریں اور ہڑتالیں کریں۔ بلکہ بیٹھے انتظار کرتے رہیں کہ "پرولتاریوں کا ڈکٹیٹر" کب مرتا ہے۔ جب تک وہ مرے نہیں مزدوروں کی نجات کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی۔ جب تک اشتراکی حکومت نہیں آجاتی، سوشلزم کے علمبردار شہری آزادیوں اور جمہوریت کا دم بھرتے ہیں۔ تاکہ ان آزادیوں کو استعمال کر کے اپنے آپ کو منظم کریں۔ مزدوروں کی ٹریڈ یونین بنائیں، ان کے مطالبات بنائیں۔ اس کے لئے ہڑتالیں کریں۔ حکومت کو مجبور کریں کہ وہ گولی ضرور چلائے۔ پھر حکومت کے اس ظلم کو بنیاد بنا کر مزید ہڑتالیں کریں۔ پھر جیسا کہ مارکس نے سبق پڑھایا ہے، مشینوں کی توڑ پھوڑ اور کارخانوں کو جلانے کی حد تک معاملات کو پہنچانے کی کوشش کریں اور یہ سب کام ٹریڈ یونین کی معرفت اور اس کا سہارا لے کر کریں۔ جب سوشلزم آجائے تو مزدوروں کے یہ سارے حقوق ختم ہو جاتے ہیں۔ نہ شہری آزادیاں ہوتی ہیں، نہ جمہوریت، نہ ٹریڈ یونین ہوتی ہے، تو اس کو مطالبات کا حق نہیں، ہڑتالوں کا حق نہیں، حکومت گولی چلائے تو اس پر "واہ وا" کریں۔ جبری محنت کے کیمپوں میں بھیجے تو

۲۸ھ "Labour and Wage Reform in the USSR by Margret Dewer published in "Studies on the Soviet Union" Vol I No 3 1960 P 80-91

صبر و استقامت سے کام کریں، حکومت جو اجرت مقرر کرے اس کو کہیں کہ یہی حق ہے، حکومت کہے کہ تم ایک نوکری چھوڑ کر دوسری نہیں کر سکتے تو اس پر آمنّا و صدّقنا کہیں۔ ۲۰ منٹ دیر سے کام پر آنے سے دو سے چار مہینے کے لئے جیل بھیجا جائے تو کہیں کہ یہ انصاف ہے۔ اور اگر پھر بھی ان کے دل مطمئن نہ ہوں تو خدا کو بھی یاد نہ کریں (کیوں کہ سوشلزم کی بنیاد دہریت پر رکھی گئی ہے) بلکہ جس حکومت کے تحت انہیں ایسے "حقوق" اور یہ "انصاف" مل رہا ہے، اس کی تبدیلی کا انتظار کریں۔ اور جس پرولتاری ڈکٹیٹر سے اپنے دل میں نفرت کرتے ہیں، اس کی قدِ آدم تصویر اُٹھائے پھریں کہ یہی ہمارا "مائی باپ" ہے اور بیٹھے انتظار کریں کہ ان کا یہ مائی باپ کب مرتا ہے اور کب اس کی جگہ کوئی دوسرا "مائی باپ" آسمان سے نازل ہوتا ہے کہ وہ آئے اور نجات دہندہ بن کر آئے اور کچھ "اصلاحات" کرے۔ تو ان کی حالت کچھ بہتر ہو۔ سرمایہ دار کے خلاف بھی جنگ کی، خدا کو بھی چھوڑا، پھر بھی حالت بہتر نہ ہوئی۔ بلکہ ایسے ڈکٹیٹر کے چنگل میں پھنس گئے، جس کو ہٹانے کی سکت بھی نہیں۔ کوئی آسمانی عذاب آئے تو وہ ہٹے اور جو نیا نجات دہندہ ڈکٹیٹر کہیں سے ٹپک پڑے تو نہ معلوم وہ کیسی اور کیا "اصلاحات" کرے۔

"اصلاحات" کی حقیقت

۱۔ نوکری بدلنے کی آزادی اس طویل انتظارِ موت کے بعد جب وہ مسیحا خروشچیف کی شکل میں نمودار ہوا تو اس نے ۲۵ اپریل ۱۹۵۶ء کو اپنا حکمنامہ جاری کر کے اسٹالن کے جون ۱۹۴۰ء کے حکمنامہ کو منسوخ کر دیا۔ یعنی مزدور پر سے ایک نوکری چھوڑ کر دوسری اختیار کرنے کی پابندی اٹھالی گئی۔ گویا مزدور کو ۲۷ سال ۲ ماہ بعد یہ آزادی ملی کہ وہ اپنی مرضی کی نوکری کر سکتا ہے۔ یہ آزادی اس لئے نہیں ملی کہ مزدوروں کی ٹریڈ یونین نے مطالبہ کیا تھا، جسے حکومت نے مان لیا ہو، بلکہ محض اس لئے ملی کہ حسنِ اتفاق سے پہلے ڈکٹیٹر کا انتقال ہوا تو دوسرے ڈکٹیٹر نے اپنی پوزیشن مضبوط کرنے اور دُنیا کی نظروں میں اشتراکی مزدوروں کا وقار بحال کر کے سوشلزم کی بدنامی کسی حد تک دور کرنے کے لئے نوکری تبدیل کرنے کی ایک معمولی سی آزادی کے لئے پوری ایک ربع صدی جس نظام میں درکار ہو، اس نظام کو کیسے مزدوروں کا غمخوار نظام کہا جا سکتا ہے۔ اور اس نظام میں مزید بہت سی پابندیاں کیا کچھ نہ ہونگی؟ جن کے لئے شاید مزید ربع صدی یا نصف صدی درکار ہو، یا یہ کہ سوشلزم اپنے اشتراکی قالب میں سرمایہ داری کی روح جذب کرتا چلا جائے۔ جیسا کہ مسٹر برزنیوف اور مسٹر کوسی گن کی تازہ ترین قیادت کے تحت نئی معاشی اصلاحات کے ذریعہ کر رہا ہے؟

بہر حال یہ جو کچھ اصلاح ہوئی، اس میں پہلے تو یہ کہا گیا کہ اگر کوئی مزدور اپنی مرضی سے ایک نوکری چھوڑ کر دوسری اختیار کرے تو اس کے خلاف پہلے کی طرح عدالتی کارروائی نہیں کی جائے گی لیکن اس کی ملازمت کی میعاد منقطع سمجھی جائے گی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اس نے اب تک جو کچھ ملازمت کی تھی، پنشن کے وقت اس کو حساب میں نہیں لایا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ جب تک کہ وہ نئی نوکری پر ۶ ماہ پورے نہ کر لے اس وقت تک وہ کسی سوشل انشورنس کا حق دار نہ ہوگا۔ اس میں ایک سال بعد ۸ فروری ۱۹۵۷ء کو یہ تبدیلی کی گئی کہ اس کا اطلاق ان مزدوروں پر نہیں ہوگا، جنہوں نے بیماری یا کارخانے میں کام کے دوران زخمی ہونے کی بناء پر نوکری چھوڑی ہو۔ پھر مزید تین سال اس ترمیم میں لگ گئے کہ سوشل انشورنس خاص طور پر بیماری کے وقت مدد کی سہولت ہر صورت میں بحال رکھی جائے گی۔ اور اگر وہ ایک نوکری چھوڑ کر دوسری نوکری ایک ماہ کے اندر اختیار نہیں کرے گا تو اُس کی پچھلی ساری ملازمت

پنشن کے وقت حساب میں نہیں لائی جائے گی۔ یعنی اگر کسی نے بیس سال ملازمت کر کے ۲ ماہ کی چھٹی منا کر کوئی نئی ملازمت کرنی چاہی تو اس کی یہ ۲۰ سال کی ملازمت بالکل ضائع ہو گی، جب کہ اس نئی ملازمت کی حیثیت حکومت کے ایک محکمہ کی بجائے دوسرے محکمہ میں کام کرنے کے برابر ہے۔ پچھلی ساری مدتِ ملازمت پنشن کے لئے صرف اسی وقت حساب میں لی جائے گی، جب کہ وہ دوسرے محکمہ میں ایک ماہ کے اندر اندر ملازمت شروع کر دے اور اگر اس کی ایک ماہ میں ساری کوشش کے باوجود اس کو دوسرے محکمہ میں ملازمت نہ ملی تو اس کی ذمہ داری بھی حکومت کے سر نہیں ہو گی۔ بلکہ خود اسی کے سر ہو گی کہ اس نے کیوں پچھلی ملازمت چھوڑی۔ پچھلی نوکری میں اس کے ساتھ جو کچھ بھی ناانصافی ہو رہی تھی، اسے وہ سب کچھ برداشت کرنا چاہیئے تھا۔ غرضیکہ یہ جو ۲۰ سال بعد آزادی ملی ہے، وہ بھی ان سب شرائط سے مشروط ہے۔ گویا یہ کوئی پسندیدہ فعل نہیں ہے۔ بلکہ حکومت نے طوعاً و کرہاً اس کی اجازت دی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ "اصلاحات" کا جو بھی شور مچایا گیا ہے۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ نظامِ جبر ختم ہو گیا ہے۔ کیونکہ مزید اور بہت سی

سختیاں اب بھی ایسی موجود ہیں، جن کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ مثلاً یہ کہ ۲۰ منٹ دیر سے آنے پر ۲ سے ۴ ماہ تک کے لئے جیل بھیجنا وغیرہ۔ چنانچہ اس سلسلہ میں کیمپبل (Campbell) لکھتا ہے کہ:-

"سوویٹ کی مزدور پالیسی میں جبر و تشدد کا عنصر ایک مستقل روایت کے طور پر نظر آتا ہے۔ سوویٹ روس کے تمام مزدوروں کو شناختی کارڈ کی نوٹ بک ہمیشہ رکھنی ہوتی ہے جس میں ان کا نام، پیشہ، تنخواہ وغیرہ سب کچھ لکھا ہوتا ہے۔ جس کارخانہ میں ایک مزدور کام کرتا ہے، اس کے منیجر کو یہ شناختی نوٹ بک دینا ہوتی ہے اور جب تک وہ اس کارخانہ میں ہوتا ہے، یہ نوٹ بک منیجر ہی کے پاس رہتی ہے۔ جب کوئی محنت کار کوئی نئی نوکری کرنی چاہے تو اسے یہ نوٹ بک حاصل کر کے نئے کارخانے کے منیجر کو دینی ہوتی ہے۔ اس میں پچھلے کارخانہ میں اس کی کارکردگی کی ساری تفصیل لکھی ہوتی ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی محنت کار اپنے پچھلے منیجر کی مرضی کے بغیر پرانی نوکری چھوڑ کر نئی نوکری اختیار نہیں کر سکتا۔ اس لئے محنت کار کو نوکری بدلنے کی جو آزادی ملی ہے، وہ شناختی نوٹ بک کے اس سسٹم کی وجہ سے ایک حد تک محدود ہو جاتی ہے مزید یہ کہ دیر سے آنے والے، نشہ کی حالت میں آنے والے، بلا اجازت غیر حاضر ہونے والے مزدوروں کو انتہائی سخت سزائیں دی جاتی ہیں۔ کسی وقت ۲۰ منٹ دیر سے آنے والے کو ۲ ماہ سے ۴ ماہ کے لئے جیل بھیجنے کا رواج بھی رہا ہے۔ کبھی کبھی ایسے مزدوروں کو جبری محنت کے لئے مجبور کرنے کا قاعدہ بھی رہا ہے کہ جس صورت میں ان کی اجرت ۲۵ فیصد گھٹانے کا اصول بھی رہا ہے۔"[۲۹]

۲- **جبری محنت کیمپ ختم کرنے کی وجہ:** بعد ازاں ان لاکھوں افراد کا تذکرہ کرنے کے بعد، جو اسٹالین کی جبری محنت کے کیمپوں میں استعمال کئے گئے، اس نظام کو ختم کرنے کی وجوہ بتاتے ہوئے کیمپبل مزید لکھتا ہے کہ:-

"جبری محنت کیمپ کے مزدوروں کے ذریعہ عمر و کچھ نہ کچھ پیداآوری کام لئے جاتے تھے۔ لیکن یہ دیکھا گیا کہ اس طرح

---

[۲۹] Campbell *Soviet Kizai Nymon*, translated into Japanese by Mr. Ishizawa, p. 180-181.

کی محنت کے تحت میں کارکردگی کا معیار انتہائی نیچے گر جاتا ہے۔ حکومت کے نقطہ نظر سے جبری محنت کے طریقہ میں محنت کی دولت بہت ضائع ہوتی نظر آئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس لئے اسٹالین کی موت کے فوری بعد جبری محنت کے بیشتر تبدیلیوں کو رہا کر دیا گیا"۔ [۳۰]

یہاں یہ پتہ چلتا ہے کہ نام نہاد اصلاحات کی پشت پر اصل جذبہ کیا کارفرما ہے ؟ وہ یہ کہ اگر یہ اصلاحات نہ کی جائیں تو "مزدور" جیسے "خام مال" کی دولت ضائع ہوتی ہے اور اس کا پورا پورا استعمال نہیں ہوتا۔ اور ملک کی مجموعی پیداوار میں کارکردگی کا معیار گرنے کے سبب کمی آ جاتی ہے۔ یعنی جبری محنت کے طریقہ کو ختم کرنے اور مزدور کو نوکری بدلنے کی آزادی دینے وغیرہ اصلاحات کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ مزدور کو انسان سمجھ کر اس پر ہونے والے ظلم وستم کو کم کیا جائے۔ بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو ملک کی پیدا آوری کا معیار گر جائے گا۔ اور مجموعی پیداوار کم ہوگی۔ اصل سوچنے کا انداز یہ ہے کہ کسی "خام مال" کو استعمال کرنے کا بہترین طریقہ کیا ہے؟ اسی مناسبت سے گویا اصلاحات کی جانی چاہئیں اور صرف اسی حد تک کی جانی چاہئیں۔

۴۔ اوقاتِ کار میں کمی اوپر کی بیان کردہ اصلاحات کے علاوہ کچھ اور تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں، جیسے کہ کام کے اوقات میں کمی وغیرہ لیکن وہ بھی اسی وجہ سے کہ یہ دیکھا گیا کہ اوقاتِ کار میں کمی کرنے سے مزدور کی کارکردگی بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ ۲۲ جنوری ۱۹۶۰ء کے روسی اخبار "پراودا" کا حوالہ پیش کرتے ہوئے مسٹر مارگیرٹ ڈیلور یہ اعداد وشمار پیش کرتے ہیں :۔

"۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۱ء میں مزدور کی پیدا آوری (Productivity) علی الترتیب "۵ فیصد سے زائد اور ۴ فیصد سے زائد" ان صنعتوں میں رہی، جہاں اوقاتِ کار کم کر دیئے گئے تھے اور اگر ان کی پیدا آوری کا گھٹے ہوئے نئے اوقاتِ کار کو بنیاد بنا کر حساب لگایا جائے تو پھر یہ اضافہ ۱۹۶۰ء میں ۱۰ فیصد سے زائد اور ۱۹۶۱ء میں ۱۱ فیصد سے زائد رہا ہے"۔ [۳۱]

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اوقاتِ کار میں کمی کرنے کی جو سہولت مزدور کو دی گئی ہے، وہ مزدور کو انسان سمجھ کر اسے آرام دینے کے لئے نہیں، بلکہ یہ دیکھ کر دی گئی ہے کہ اس طرح اس "خام مال" سے زیادہ پیداوار حاصل کی جا سکتی ہے۔

روسی معاشیین مسٹر کاڈانسکی اور آل ایالوزناتے اوقاتِ کار میں کمی کی خصوصیات بتاتے ہوئے صاف لکھتے ہیں کہ :۔

"پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اوقاتِ کار میں کمی اس طرح سے اور ان حالات میں کی گئی کہ اس سے پہلے تک جو کچھ پیداوار حاصل کی گئی تھی اور مزدور کی پیدا آوری جس معیار تک پہنچ چکی تھی، نہ صرف یہ کہ وہ قائم رہے، بلکہ یہ کہ ان دونوں یعنی مجموعی پیداوار اور مزدور کی پیدا آوری صلاحیت میں مزید اضافہ ہو"۔ [۳۲]

یعنی یہ دیکھا جاتا ہے کہ کارخانوں کی پیداوار بڑھانے کے لئے اس میں "مزدور" نام کی جس مشین کو استعمال کیا جاتا ہے، اس کی کارکردگی کن حالات میں کیسے ہوتی ہے۔ اگر اتفاق سے یہ نظر آئے کہ یہ مشین ۸ گھنٹے کی بجائے روزانہ ۷ گھنٹے چلانے سے زیادہ اچھا کام کرتی ہے اور کارخانہ کی پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے تو پھر محض اس وجہ سے اس مشین کو صرف ۷ گھنٹے چلانے کا فیصلہ کیا جاتا

---

۳۰ ایضاً صفحہ ۱۰۲

31 The Soviet Economy : Edited by Harry G. Shaffer, p. 223, 1964 Ed.

۳۲ ایضاً صفحہ ۲۲۸

ہے اور پھر ساری دنیا میں یہ ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے کہ دیکھو! ہم مزدوروں کی خاطر کیا کچھ نہیں کر رہے ہیں۔"

پھر ان اوقات کار میں کمی کی ایک دوسری وجہ یہ ہے کہ جیسے جیسے مشینوں کا اور ان کی کارکردگی کا معیار بڑھتا جاتا ہے۔ اتنی ہی زیادہ انسانی محنت کی ضرورت کم ہوتی جاتی ہے۔ اس کا حل یہی ہو سکتا ہے کہ اوقات کار میں کمی کر دی جائے اور ملک میں بیروزگاری پھیلنے نہ پائے۔ کیونکہ اگر کوئی مزدور بے روزگار ہو تو اس کو بٹھا کر کھلانا پڑتا ہے، چاہے سرمایہ دارانہ ملک ہو یا اشتراکی۔ ترقی یافتہ ملک میں بے روزگاروں کو سوشل انشورنس کے تحت کھانا دینا حکومت کا فرض ہوتا ہے۔ اشتراکی حکومت یہ کیسے گوارا کر سکتی ہے کہ وہ کسی کو بٹھا کر کھلائے۔ اس لئے بہترین حل یہی ہے کہ اوقات کار میں کمی کر کے اس بے روزگاری سے ملک کو بچایا جائے کہ جس صورت میں حکومت پر پڑنے والا بار اس سے کہیں زیادہ ہوگا۔ چنانچہ اوپر جن دو روسی معاشیین کا تذکرہ کیا گیا ہے، انہوں نے محنت کی پیداآوری میں اضافہ کا اصل سبب بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"محنت کی پیداآوری میں اضافہ دراصل مزدوروں کی جگہ مشینوں کے کثرت استعمال اور پیداوار کے طریقوں میں خودکاریت (Automation) وغیرہ کی وجہ سے ہوا ہے۔" ۳۳ے

اس سلسلہ میں مسٹر مارگیرٹ دیور لکھتے ہیں کہ:۔

"دوسرا اہم اقدام دوبارہ ۷ گھنٹے کے دن کا تعین کرنا ہے، جس کی وجہ مسٹر خروشچیف نے پیداآوری صلاحیت کا بڑھنا اور اجتماعی پیداوار میں اضافہ بتائی ہے۔ دنیا میں اوقات کار کا سب سے چھوٹا دن کہہ کر اس کو اچھالا جا رہا ہے۔ یہ ایک سوچنے کی بات ہے کہ اس اقدام کا باعث اس پوشیدہ بے روزگاری کو جذب کرنا ہے جو میکانیت اور آٹو میشن (Automation) کے بڑھنے، صنعت کے بے لگام پھیلاؤ اور زرعی زمینوں سے لوگوں کے بھاگ آنے کے سبب پیدا ہو رہی تھی۔" ۳۴ے

تاریخی طور پر اس کی حقیقت دیکھی جائے تو یہ نکلتی ہے کہ ۱۹۲۷ء میں انقلاب اکتوبر کی یادگار کے موقع پر ۷ گھنٹے کے دن کا وعدہ کیا گیا تھا۔ ۱۹۲۸ء میں کپڑے کے کارخانوں میں اسے رائج کیا گیا۔ جنوری ۱۹۲۹ء میں تمام صنعتوں میں اسے لازمی قرار دے دیا گیا اور اکتوبر ۱۹۳۳ء تک یہ تقریباً تمام صنعتوں میں رائج ہو چکا تھا۔ لیکن اسٹالین نے اسے جون ۱۹۴۰ء میں ختم کر کے دوبارہ ۸ گھنٹے کا دن رائج کر دیا۔ اور جون ۱۹۴۱ء میں روزانہ ۳ گھنٹے مزید محنت Overtime بھی لازمی کر دی گئی۔ یعنی جون ۱۹۴۱ء کے بعد مزدوروں کو روزانہ ۱۱ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا۔ اب اوقات کار کو اسی پرانے معیار پر لایا گیا جو ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۳ء کے درمیان رائج کیا گیا تھا اور جو ۱۹۴۰ء تک چلتا رہا تھا۔ پرانے اوقات کار کے برابر کرنے کو کمی اس لئے کہا جاتا ہے کہ بیچ میں زیادتی کر دی گئی تھی۔ اوقات کار کو ۸ اور ۱۱ گھنٹے تک پہنچا دیا گیا تھا۔ اس زیادتی میں کمی کر کے پہلے کے برابر لایا گیا ہے۔ جس کے متعلق کمی، کمی" کا شور مچایا جا رہا ہے۔

۳۳ے ایضاً صفحہ ۲۳۱

۳۴ے ایضاً صفحہ ۲۱۹

آزاد ٹریڈ یونینز تعمیر کرنے کی بجائے اصلاحات کی جا رہی ہیں۔ ان کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ اسٹالین نے پیداوار بڑھانے کے لئے جبر و تشدد کے جو طریقے اختیار کئے تھے، ان طریقوں کی بجائے دوسرے ایسے طریقے آزمائے جائیں کہ جن سے فاضل پیداوار میں نسبتاً زیادہ اضافہ ہو۔ ان ساری اصلاحات سے سوویٹ یا کسی بھی سوشلسٹ نظام میں مزدور کی بنیادی پوزیشن نہیں بدل سکتی۔ اس بات کو مسٹر مارگیرٹ ولیرنے وضاحت کے ساتھ ان الفاظ میں پیش کیا ہے:۔

" اب دنیا اور سوویٹ روس کے باشندوں کو مسٹر خروشچیف نے یہ بتایا ہے کہ اسٹالین کے زمانہ میں روس میں آزادی اور جمہوریت کا وجود نہیں تھا۔ حالیہ معاشی و سماجی اصلاحات گویا اس بات کا اعتراف ہیں کہ سوویٹ محنت کاروں کے خوش و خرم پھلنے پھولنے اور فلاح و بہبود کی داستان محض ایک دھوکہ تھی۔ اسٹالین کی پالیسیوں کو کتنا ہی کھرچ کھرچ کر مٹانے کی کوشش کیوں نہ کی جائے، اسٹالین کے عہد میں جو بنیادی سسٹم وجود میں آیا تھا، اس کی جڑیں ابھی تک نہیں ہلی ہیں۔ اس لئے معاشی اور مزدور پالیسی کی ان تمام اصلاحات کے باوجود عوام الناس کی حالت بنیادی طور پر ایسی ہی رہتی ہے، جیسی کہ پہلے تھی۔

سوویٹ مزدوروں کی حالت بہتر کرنے کے سلسلہ میں حالیہ سرپرستانہ اقدامات ضرور ترقی پسندانہ ہیں لیکن اس دعوے کو صحیح ثابت کرنے کے لئے کوئی جواز موجود نہیں ہے کہ ایک نیا معاشرہ جنم لے رہا ہے، جو سرمایہ دارانہ معاشرہ سے بہتر و برتر ہے۔ ان حالیہ اقدامات میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے، جو مزدور کے سماجی وقار کے مسئلہ کو چھوتا ہو۔ ان اقدامات نے محنت کار کو وہ ذرائع نہیں دیئے ہیں، جن کے ذریعے سے وہ اپنی امنگوں کو ظاہر کر سکے اور ان کے حصول کے لئے جد و جہد کر سکے، جو سرمایہ دارانہ جمہوریتوں کے محنت کاروں کو حاصل ہیں —— یعنی آزاد ٹریڈ یونینز۔" ۳۵

اُجرتوں میں عدم مساوات

سوشلزم کے دعویدار مساوات کے نعرے بھی بہت لگاتے ہیں۔ لیکن سرمایہ دارانہ ممالک میں جتنی عدم مساوات پائی جاتی ہے اس سے زیادہ سوشلسٹ نظام میں موجود ہے۔ فرق یہ ہے کہ سرمایہ داری میں مزدور اس کے سبب کام کرتے ہیں اور سوشلزم نظام میں نہیں کرتے، وہ اس لئے کہ سرمایہ داری میں ذاتی ملکیت کا حق ہوتا ہے اور سوشلزم میں نہیں ہوتا۔ مارکس کے اقوال اور خود سوشلزم کی بنیادی روح سے انحراف کر کے مزدوروں کو کام پر لگانے کے محرکات کو مضبوط کرنے کے لئے جو عدم مساوات اس وقت روس میں موجود ہے، اس میں ایک اور دس کی نسبت ہے اور یہ ان ساری اصلاحات کے بعد ہے، جو حال ہی میں کی گئی ہیں۔ ان حالیہ اصلاحات سے پہلے تو حالت اس سے بھی زیادہ ابتر تھی۔ گریڈ اول جو کہ بنیادی اور سب سے نچلا گریڈ ہے، میں اُجرت کی دو ہزار مختلف شرحیں موجود تھیں۔ مسٹر [illegible] روسی معیشت دان بتاتے ہیں کہ:۔

" اصلاحات کے بعد گریڈ اول میں چھ [illegible] ہوں گے، جن کے اندر ۳۰ مختلف شرحیں

۳۵ ایضاً صفحہ ۲۲

ہوں گی "۳۶۔

قومی معیشت کے تمام شعبوں میں ان کی بنیاد پر یکسانیت پیدا کی جائے گی۔ اس کے علاوہ جو بونس وغیرہ دیئے جائیں گے وہ اُجرت یا تنخواہ کا ۱۵ یا ۲۰ فیصد تک ہوں گے۔ فورمین کی تنخواہ زیادہ ہوگی۔ لیکن یہ نہیں بتلایا گیا کہ کتنی زیادہ ہوگی؟ البتہ یہ بتایا گیا ہے کہ دوسرے انجنیئر، فنی ماہرین یا ڈائریکٹروں کی تنخواہ بالعموم فورمین کے دو یا تین گنا سے زائد نہیں رکھی جائے گی۔ جب کہ ان اصلاحات سے پہلے تین سے پانچ گنا کے درمیان ہوا کرتی تھی۔ یہ سب کچھ اس لئے کیا جائے گا کہ کم تنخواہ اور زیادہ تنخواہ پانے والوں کے درمیان فرق کو کم کیا جائے۔ یعنی کوئی اونچی تنخواہ والا فورمین کی تنخواہ سے تین گنا سے زائد نہیں ہوگا۔ بظاہر یہ فرق کم نظر آتا ہے۔ لیکن چونکہ فورمین کی تنخواہ خود ایک مزدور سے اچھی خاصی زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے کم تنخواہ پانے والے ایک مزدور کا زیادہ تنخواہ پانے والے ڈائریکٹر سے مقابلہ کیا جائے تو یہ فرق بہت اونچا ہو کر پہنچ جاتا ہے۔ برطانیہ کے مزدوروں کے مسائل کے ماہر مسٹر گریشنی [illegible] نے اس کا تناسب اس طرح پیش کیا ہے۔

"........ ۱۹۶۲ء میں (اصلاحات کے بعد) پورے ملک میں سب سے کم تنخواہ ۴۵-۵۰ روبل ماہوار ہے گی اور بھاری صنعتوں میں گریڈ اوّل کے تحت کم سے کم اجرت ۵۰-۶۰ روبل ہوگی۔ اس گریڈ میں سب سے اونچی تنخواہ ۱:۲ کے تناسب کے حساب سے ۱۰۰-۱۲۰ روبل ہوگی۔ ایک فورمین جس کی تنخواہ گریڈ اوّل میں سب سے اونچی ہوگی تو گویا اس کو کم سے کم ۱۱۰ سے ۱۲۰ روبل کے درمیان کچھ ملے گا اور ایک ڈائریکٹر کی تنخواہ جو اس سے دو یا تین گنا زائد یعنی ۲۲۰ اور ۳۶۰ کے درمیان ہو سکتی ہے۔ جو ابتدائی کم سے کم تنخواہ سے ۷ گنا زیادہ بنتی ہے۔ اگر ہم اس میں بونس کی آخری حد جو ۲۰ فی صد مزدور کے لئے اور ۴۰ فی صد ڈائریکٹر کے لئے ہے۔ جمع کریں تو ہم ۶۰ اور ۵۰۴ روبل کی دو انتہاؤں پر پہنچتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ہمارا حساب صحیح ہے تو فرق کا تناسب ۱:۱۵ قرار پاتا ہے۔"

اب آیئے اس فرق کا موازنہ امریکہ سے کرکے دیکھئے۔ امریکی معیشت دان مسٹر کیمپل لکھتے ہیں کہ:

"(روس میں) اجرت کے فرق کو طبقاتی تفاوت کے اندر دیکھا جائے تو امریکہ کے کارخانوں اور صنعتوں میں پائے جانے والے فرق سے زیادہ ہے .... جسمانی کام کرنے والے ایک ہی کارخانہ کے مزدوروں کی تنخواہ میں اتنا زیادہ فرق امریکہ کی کسی صنعت میں نظر نہیں آتا۔"[۳۸]

یہ ہے عدم مساوات کی وہ انتہا کہ جس کے مقابلے میں امریکہ جیسا سرمایہ دار ملک بھی پیچھے ہے۔ جب سارے اختیارات حکومت کے ہاتھ میں ہوں اور مزدوروں کو آہ کرنے کی بھی آزادی نہ ہو تو ایسی عدم مساوات اور اس سے بڑھ کر بھی جنم لے تو کیا تعجب کی بات ہے۔!

۸- سوشلزم میں کارکردگی کی کمی

تنخواہوں میں اتنا زبردست فرق ابھی تک ایک سوشلسٹ نظام میں کیوں باقی رکھا گیا ہے اس کا مقصد مزدوروں میں محنت سے کام کرنے کا جذبہ پیدا کرنا ہے کہ وہ اوپر ترقی

[۳۶] Pay-Scale "Working Day and Wages in the USSR",
published in Kommunist No. 3, Feb. 1966, pp.22-37.

[۳۷] کتاب مذکور ص ۲۲۳

ترقی کی امید میں کام کریں۔ مگر اوپر والے اور نیچے والے کی تنخواہ برابر ہو اور اوپر پہنچنے کے لئے کوئی کیوں جدوجہد کرے۔ اس مقصد کے لئے مارکس کے اصولوں سے انحراف کر کے یہ عدم مساوات رکھی گئی تو اس میں کامیابی کس حد تک ہوئی ہے۔ اس سے پہلے ہم بتا چکے ہیں کہ سوویٹ روس کے بہت سے کارخانوں میں گنجائش کے باوجود لوگ کام نہیں کرتے۔ جس کے سبب بہت سے کارخانے

زیادہ گنجائش کے باوجود پورا مال تیار نہیں کرتے جس کا اعتراف مسٹر کوسی گن نے اپنی رپورٹ میں کیا ہے۔ پھر یہ کہ ریستوران اور کینٹین میں سامان ہونے کے باوجود اسٹاف و سروس کی پرواہ کرتا ہے نہ ذائقہ کی۔ اسی طرح دیہاتوں کے لوگوں تک اشیاء پہنچانے کے لئے حکومت سب انتظامات کرتی ہے۔ پھر بھی اکثر دیہات کے لوگوں کو خریداری کے لئے بڑے شہروں ہی کو آنا پڑتا ہے۔ اس لئے کہ اشیائے ضرورت بیچنے والی کمپنیوں کے اسٹاف کو اپنی اشیاء بیچنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اشیائے ضرورت کی زبردست مانگ بھی ہے اور تیار شدہ اشیاء بھی ڈھیروں پڑی ہیں، لیکن اس لئے فروخت نہیں ہوتیں کہ بیچنے والی کمپنیوں کو بیچنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور اس طرح کی بے شمار باتوں کا اعتراف کر کے مسٹر کوسی گن نے ۱۹۶۵ء میں معاشی تنظیم کے معاملہ میں بہت سی بنیادی تبدیلیوں کی تجاویز کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی میں پیش کر کے منظور کروائی ہیں جس میں بہت سے طریقے بالکل سرمایہ دارانہ نظام جیسے ہیں۔ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟ تنخواہوں کے اس قدر عظیم تفاوت کے باوجود لوگوں کو کام سے دلچسپی نہیں ہے۔ اس کا سب سے زیادہ اظہار تعمیراتی کام کرنے والے مزدوروں میں ہوتا ہے۔ اکثر عمارات ساری ضروری اشیاء کے باوجود مزدور بے دلی سے ایسی بناتے ہیں کہ کچھ عرصہ بعد ایسی عمارات دھڑام سے گر پڑتی ہیں۔ اس کا علاج حکومت نے یہ نکالا ہے کہ جو مزدور جو عمارت بناتے ہیں۔ اس عمارت میں انہیں رہنے کا کمرہ دینے کا وعدہ کیا جاتا ہے تاکہ وہ دل لگا کر کام کریں۔ رہائش کا مسئلہ روس میں بہت بڑا مسئلہ ہے کے حل کا لالچ دے کر عمارتیں بنوائی جاتی ہیں۔ یا پھر یہ کہ ضرورت سے زیادہ نگرانی کرنی پڑتی ہے پھر یہ کہ کم ہی مزدور ایسے ہیں جو مختلف ہنر سیکھ کر آگے بڑھنے کا جذبہ رکھتے ہوں۔ مزدوروں کی اس حالت کا نقشہ جان گنتھر نے اپنی مشہور کتاب (Inside Russia Today) جس کی سیکڑوں کاپیاں روس میں اسمگل ہوئی ہیں اور روسی زبان میں نہ ہونے کے باوجود یہ کتاب چور بازار میں ۱۰۰ روبل فی کاپی کے دام پر بکی ہے، میں لکھا ہے کہ:

''...... (روس میں) مزدور نہ صرف یہ کہ ہنرمندی میں پیچھے ہیں بلکہ انہیں اپنے کام سے بھی دلچسپی نہیں ہے روس میں نئی عمارتیں جو عام طور پر اس قدر جلد زمین پر آ رہتی ہیں تو اس کا سبب صرف یہی نہیں ہے کہ جن اشیاء سے وہ تیار کی گئی ہیں وہ خراب تھیں، بلکہ اصل سبب ہنرمندی بے لاپرواہی ہے۔ اس معاملہ میں مزدوروں کے اخلاق بلند کرنے کے لئے سوویٹ روس میں جو ترکیب نکالی گئی ہے وہ یہ ہے کہ چند علاقوں میں جو مزدور کسی رہائشی عمارت کے پراجیکٹ پر کام کر رہے ہوں، انہیں اس میں کمرہ الاٹ کرنے میں ترجیح دی جاتی ہے۔''[۶۵]

[۶۴] Soviet Economic Power by Robert W. Campbell, CP 179, Japanese Version, Ed. 1966.

[۶۵] Inside Russia To-day, by John Gunther, 1962 Ed. p. 420.

کام سے عدم دلچسپی کے باعث کہیں بھی مزدور عام طور پر ملازمتی پابندیوں کے باوجود جلد جلد نوکریاں تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ غیر حاضریاں بھی بہت کرتے ہیں اور دیر سے آنے کو بھی معمول بنا رکھا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں موجودہ حالات کے متعلق پروفیسر ولیم لوکس لکھتے ہیں کہ:

"مزدوروں میں نوکریاں بدلنے کا ریکارڈ بہت اونچا رہا ہے، غیر حاضری، دیر سے آنا، کام سے جی چرانا، سستی اور کاہلی سے کام کرنا وغیرہ بہت عام رہا ہے۔ اور مزدور بالعموم تنخواہ کے ساتھ چھٹی اور زچگی کے لئے رخصت طلب کرنے کی سہولتیں حاصل کرنے کے لئے قابل اعتراض اور مشکوک طریقے استعمال کرنے پر اتر آتے ہیں۔ اکثر مثالیں ایسی ہیں کہ جن میں منیجر حضرات ان باتوں کو برداشت کرتے رہے ہیں، بعض اوقات سب کچھ جانتے بوجھتے بھی چشم پوشی برتتے رہے ہیں تاکہ مزدور ان کے کارخانے سے بھاگ نہ جائیں یا یہ کہ اس طرح نئے مزدوروں کو اپنے کارخانہ میں آنے کی ہمت افزائی ہو جب کہ کسی خاص کارخانہ میں مزدوروں کی شدید کمی ہو۔۔" [۱]

اسٹالین نے جبر کے طریقے بھی استعمال کر کے دیکھ لئے۔ بعد والوں نے جبر کی جگہ تنخواہوں میں تفاوت اور دوسرے مادی محرکات کو ترقی دینے کی کوشش کی لیکن اشتراکی مزدور نہ سزا سے ٹھیک ہوئے اور نہ ہی انعام سے رام ہوئے اور ہمارا یہ خیال ہے کہ جب تک قومی ملکیت رہے گی اور لوگوں کو ذاتی ملکیت اور ذاتی نفع کے لئے کاروبار و تجارت اور صنعت و حرفت کی آزادی نہیں ملے گی مزدور دل سے کام نہ کریں گے نتیجہ ملک کی مجموعی پیداوار اور مشینوں اور مزدوروں کی کارکردگی اور پیداآوری صلاحیت گرتی ہی رہے گی اور نئے نئے مسائل کو جنم دیتی رہے گی اور دنیا کو یہ پتہ چلتا رہے گا کہ معاشی ترقی کی راہ میں سوشلزم کے رکاوٹ بننے کا بنیادی سبب کیا ہے!

مزدوروں کی کارکردگی میں کمی

جس نظام میں مزدوروں کی زندگی جیل جیسی ہو، جہاں باتیں تو بلند و بالا اونچی اونچی کی جاتی ہوں، لیکن اجرت اس نظام سے بھی ۸۰ فی صد کم ملتی ہو کہ جسے بدترین (سرمایہ داری) نظام سمجھا جاتا ہو، جہاں کھانے تک کو ڈھنگ سے نہ ملتا ہو، جہاں رہنے کے لئے ایک کمرہ ملنا ایک نعمت عظمیٰ ہو، جہاں مزدور کو انسان کے بجائے "خام مال" کے طور پر استعمال کیا جاتا ہو، جہاں ٹریڈ یونین کے ذریعہ بھی مطالبات پیش کرنے اور ہڑتالوں کی اجازت نہ ہو، جہاں حالات کی بہتری کا واحد طریقہ ڈکٹیٹر حکمران کی موت یا تبدیلی کا انتظار ہو، جہاں نوکری بدلنے کی آزادی بڑی مشکلوں سے ۴۰ سال بعد ملی ہو، جہاں ایک طویل عرصہ تک جبری محنت کیمپ کے ظلم و ستم سہنے پڑے ہوں، جہاں اوقات کار اس لئے اور اس شرح پر کم کئے جاتے ہوں کہ پیداوار بڑھائی جائے، جہاں مزدور کا سماجی وقار کوئی نہ ہو، جہاں ایک ہی کارخانہ کی اجرتوں میں عدم مساوات کی نسبت ایک اور پندرہ جتنی بڑی ہو، وہاں کیسے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ مزدوروں کی کارکردگی بہتر ہوگی۔ وہاں کے بارے میں کون یہ باور کرنے پر تیار ہو سکتا ہے کہ ان مزدوروں کے ذریعہ ہونے والی پیداوار فی کس کا اوسط بہت اونچا ہوگا۔ وہاں کسی مزدور کو کیا پڑی ہے کہ وہ محنت کرے اور جی لگا کے نئے نئے ہنر سیکھے اور اپنے آپ کو زیادہ مفید بنائے۔ جس کسی نے ایسے سماج کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو وہ اس کے علاوہ اور کیا بیان کرے گا کہ:

[۱] Comparative Economic System, p. 503.

«...... اگر ... ہیں اور بہت سوں کو فضول کام پر لگایا گیا ہے۔ سوویٹ کارخانوں میں مزدوروں کی پیداآوری فی کس کا اوسط، سوویٹ کسانوں کی طرح، اسی نوعیت کے ایک امریکی مزدور کے مقابلہ میں بہت ہی زیادہ گرا ہوا ہے۔ خود سوویٹ کے اپنے اعداد و شمار کی رو سے روس کی ایک میل ریلوے لائن پر جتنے مزدور کام کرتے ہیں دنیا کے کسی ملک میں اتنے زیادہ نہیں درکار ہوتے۔...» [٤١]

یہ دنیا کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ اشتراکی ملک کے مزدوروں کی کارکردگی کا عالم ہے کہ یہاں ایک میل ریلوے لائن کی دیکھ بھال کے لئے جتنے مزدور درکار ہوتے ہیں دنیا کا ہر ملک اس سے کم مزدوروں کی تعداد کے ذریعہ اتنے ہی میل ریلوے لائن کی دیکھ بھال کروا لیتا ہے۔ خود روس کے وزیر اعظم نیا پانچسالہ منصوبہ برائے ۱۹۶۶ء تا ۱۹۷۰ء پیش کرنے سے قبل پچھلے معاشی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

«...... دوسری وجہ جو حقیقی آمدنی کی رفتار ترقی میں زوال کا سبب ہی یہ تھی کہ حالیہ چند سالوں میں محنت کی پیداآوری کارکردگی کی رفتار ترقی کچھ گر گئی۔ ۱۹۵۶ء تا ۱۹۶۰ء میں محنت کی پیداآوری کارکردگی سالانہ ۶،۵ فی صد کے اوسط سے بڑھتی رہی لیکن ۱۹۶۱ء تا ۱۹۶۵ء میں ۴،۶ رہی۔ اس کمی کو روکنے یا اس کو پورا کرنے کے لئے ہمیں چاہیئے کہ ہم وہ سب کچھ کریں جو کہ ہمارے امکان میں ہے» [٤٢]

نئے پانچ سالہ منصوبہ میں مزدور کی اس پیداآوری کارکردگی کو بحال کر کے کم از کم ماضی کے برابر یعنی ۶،۵ فی صد تک لانے کی پوری کوشش کی جائے گی۔ یہ تو اس ادنیٰ نتیجے کا تذکرہ ہے جو روس کے اپنے پچھلے اعداد و شمار کے ساتھ موازنہ کے نتیجہ میں نظر آتی ہے۔ یہی موازنہ اگر امریکہ سے کیا جائے تو جو صورت حال سامنے آتی ہے وہ شکل نمبر ۶ سے ظاہر ہے کہ کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے کہ جس میں سوویٹ مزدور کی پیداوار فی کس امریکی مزدور سے زیادہ ہو۔ کیا اسی کا نام اعلیٰ کارکردگی ہے؟

اگلے چند سالوں میں ممکن ہے کہ پیداوار فی کس کا اوسط بڑھ جائے۔ لیکن اس کی وجہ ہرگز یہ نہیں ہو سکتی کہ سوویٹ مزدور کے حالات بہتر ہوں گے تو وہ خوشی سے کام کرے گا۔ بلکہ مزدور کی عدم دلچسپی اور لاپروائی میں کوئی خاص فرق نہ آئے تب بھی اگر مشینوں کا استعمال بڑھ جائے اور مزدور کم لگنے پڑیں تو اس ترکیب سے مزدور کی پیداوار فی کس زیادہ دکھائی جا سکے گی۔ جو فی الحقیقت مزدور کی زیادہ محنت کا نتیجہ نہیں، بلکہ مشین اور اچھی مشین اور اس کے بہتر استعمال کا نتیجہ ہوگی اور جیسا کہ ہم پہلے اقتباس پیش کر چکے ہیں روس کے معروف معیشت داں مسٹر Kazanskii اور مسٹر Ul'ianova جو روس کے مزدور اور اجرت کے اعداد و شمار کے سکیشن کے چیف ہیں نے لکھا ہے کہ:

«......... محنت کی کارکردگی میں اضافہ پیداوار میں میکانیت اور آٹومیشن، مزدوروں کی تربیت بڑھنے پیداوار اور ان کے قدرتی اور فنی معیار کو بلند کرنے کے ذریعہ کیا گیا ہے۔» [٤٣]

٤١ *Inside Russia To-day*, by John Gunther, 1962 Ed. p. 420.

٤٢ *23rd Congress of the Communist Party of Soviet Union*. Moscow p. 175.
(From : *Soviet Keizai Nouman* by Mr. Sekizawa, p. 93)

٤٣ *The Soviet Economy* by H. G. Shaffer, p. 231.

کارکردگی کے معیار کو اتنا کچھ بلند کر سکے [illegible] ۔ جیسا کہ نقشہ نمبر ۶ سے ظاہر ہے ابھی تک روسی مزدور امریکی مزدور سے بہت پیچھے ہے اور سوشلزم جیسے معاشی نظام میں اس سے زیادہ کی توقع کرنا بھی عبث ہے۔ یہ ہے اس نظام کی خوبی کہ جن مزدوروں کی حمایت میں اسے قائم کیا جاتا ہے ان بے چاروں کو اس طرح کس کر نچوڑا جاتا ہے کہ ان میں کارکردگی کی اتنی صلاحیت بھی باقی نہیں رہتی، جتنی کہ سرمایہ دارانہ ممالک میں تھی اور اسکے باوجود نہ انکے مادّی تقاضے ہی پورے ہوتے ہیں نہ روحانی!

نقشہ نمبر ۶ ۔ امریکہ اور روس کے مزدوروں کی پیداوار فی کس

	امریکہ	سوویٹ روس
ریلوے لائن (ٹن)	۹۳۰	۴۳۱
کوئلہ کھدوائی (ٹن)	۱،۱۱۵	[illegible]
پٹرولیم (بیرل)	۲۰،۰۴۷	۸۱۹۷
شکر (ٹن)	۱۶،۱۳	[illegible]
لکڑی (۱۰۰ مکعب فٹ)	۱۲۱۰۸	۱۱۵۰۵
بجلی (۱۰۰۰ کیلو واٹ)	۱۶۰۳	۱۰۰۳
سیمنٹ (barrel)	۸۲۳۸	۴۸۵۵
سوتی کپڑے (گز)	۱۸۰۳	۱۱۰۳
پٹرول کے کنوئیں کی کھدوائی (فیٹ)	۲،۵۱۲	۲۲۲
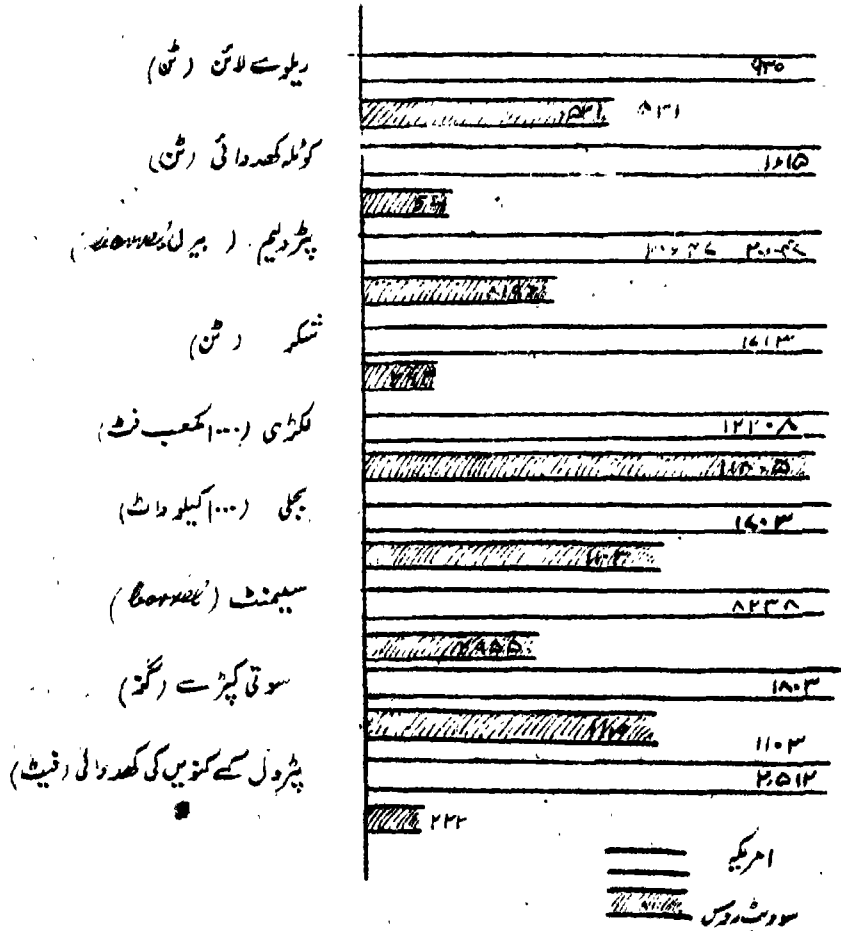
حاصل کردہ از: (From : *Soviet Keizai Noumon* by Mr. Sekizawa, p. 93)

۹۔ اشتراکی بیوروکریسی

ایک ایسے نظام معیشت میں جس میں ہر کمپنی قومی ملکیت میں ہوتی ہے اور اوپر سے منصوبے بن کر مینیجروں کے پاس احکامات کی شکل میں آتے رہتے ہوں، اس میں انتظامی نقطہ نظر

کس قسم کے کیا مسائل پیدا ہوتے ہیں اور ان کو حل کرنے کے لئے اشتراکی منیجروں کو کیا ہتھکنڈے استعمال کرنے پڑتے ہیں ہم ان کا جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔ کیونکہ کسی بھی صنعت و تجارت کو چلانے والی گاڑی کا ایک پہیہ مزدور ہے تو دوسرا منیجر۔ مزدوروں کا حال تو ہم دیکھ چکے اب منیجروں کے مسائل کو لیجئے۔

ان کی پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ انہیں اپنے کام سے کام ہوتا ہے۔ مارکسی اصولوں کی باریکیوں میں یہ نہیں جاتے اسی لئے سوویٹ روس کے اخبارات میں اکثر یہ شکایات چھپتی رہتی ہیں کہ یہ منیجر صاحبان مارکس اور لینن سب کو بالائے طاق رکھ کر صرف اس معاملہ سے دلچسپی رکھتے ہیں کہ ان کے کارخانے میں پیداوار زیادہ سے زیادہ ہو اور نتائج بہتر سے بہتر نکلیں۔

یہاں یہ بات محل نظر رہنی چاہیئے کہ سوشلزم میں مزدور کام پر مشکل آمادہ ہوتے ہیں اور مارے باندھے کرتے ہیں لیکن منتظمین کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس کی وجہ وہی تفاوت ہے جس کا تذکرہ ہم پہلے کر آئے ہیں۔ یہاں پر منیجروں کو مزدوروں کے مقابلہ میں اونچی اونچی تنخواہیں ملتی ہیں اور بہت ساری سہولتیں بھی۔ پھر مزدوروں پر ان کو مکمل اختیارات بھی حاصل ہوتے ہیں۔ روس کا انتظامی اصول روسی زبان میں (Edinonachalge) کہلاتا ہے۔ اس کے معنی ہیں "ایک آدمی کی حکومت" ایک منیجر کو اپنے کے زیر نگین اسٹاف پر سارے اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ اس طرح مذہب اور خدا کو چھوڑنے کے بعد اشتراکی نظام میں مزدوروں کے یہ نئے خدا رونما ہوئے ہیں۔ جب یہ فیکٹری میں گذرتے ہیں تو سارے مزدور اپنی ٹوپی اتار کر ان کے آگے اپنے سر جھکا دیتے ہیں۔ ان خداؤں کو روسی زبان میں (Khozyain) کہا جاتا ہے۔ اور ان کا لباس، وضع قطع، رہن سہن کے انداز، بات چیت اور چلنے پھرنے کا ڈھنگ، ہر چیز پکار پکار کر کہتی ہے کہ یہ کسی دوسری دنیا کے لوگ ہیں اور مزدور کسی اور دنیا کے۔ سرمایہ دار اور مزدور کے طبقات ختم ہو کر منتظمین اور مزدوروں کے نئے طبقات وجود میں آتے ہیں اور مزدور کی حالت دونوں نظاموں میں گئی گذری ہی رہتی ہے۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ اپنی خدائی کا سکہ چلانے والوں کا نام بدل جاتا ہے پہلے یہ لوگ سرمایہ دار کہلاتے تھے تو اب منیجر کہلاتے ہیں اور مزدور کو وہی دو وقت کی روٹی بمشکل ملتی ہے۔ ہاتھ بدل جاتے ہیں۔ ایک کے ہاتھ سے ہو تو ظلم ہے اور دوسرے کے ہاتھ سے ہو تو اس کا نام "اشتراکی مساوات"۔

منیجر بننے کے لئے کسی انتظامی صلاحیت کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ ایک دوسری صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے جسے روسی زبان میں (Samotuenmost) کہا جاتا ہے۔ اس کے معنی ہیں اپنے حاکم اور خدا کے ساتھ اچھے تعلقات اور اسے ہمیشہ خوش رکھنا۔ خواہ اس کے لئے کچھ بھی کیوں نہ کرنا پڑے۔ اپنے سے بالا افسر کو راضی رکھنے کے لئے ہر قیمت ادا کرنے کے لئے تیار رہنا۔ یعنی "ایک آدمی کی حکومت" والے نظام میں خواہ وہ کہیں بھی اور کسی شکل میں پایا جاتا ہو، اوپر چڑھنے کا زینہ ایک جیسا ہی ہے۔ جس طرح ڈکٹیٹروں کے ارد گرد خوشامدیوں اور چاپلوسوں کا ایک حلقہ پیدا ہو جاتا ہے اور ان میں مسابقت ہوتی ہے کہ کون آمر مطلق کی ناک کا بال بن سکتا ہے۔ وہی اصول اشتراکی نظام میں ترقی کے لئے بھی ضروری ہے۔ جب اسٹالین برسر اقتدار رہا تو خروشچیف صاحب اس کے خوشامدیوں اور چاپلوسوں کے گروہ میں شامل رہے اور جب وہ مر گیا تب اپنے دل کا سارا بخار اس کی مردہ لاش پر نکالا کہ اسٹالین نے جمہوریت اور آزادی کا گلا گھونٹ دیا تھا اور شخصیت پرستی بری بات ہے۔ وغیرہ وغیرہ خود منیجروں کی ترقی کا بھی یہی راستہ ہے کہ اپنے سے اوپر والے کو ہر نیت پر خوش رکھیں۔ اس طرح ہر شخص کا ایک حلقہ پیدا

ہو جاتا ہے کہ جیسے وہ خوش رکھنا چاہتا ہے۔ پھر وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان کا فائدہ "ان خدمات" کا کوئی صلہ اسے ملے۔ اس طرح دھڑے بندیاں ہوتی چلی جاتی ہیں، جو ایک دوسرے کے مفادات کے تحفظ اور ان کو پروان چڑھانے کے لئے وجود میں آتی ہیں اس لئے جس کو جہاں موقع ملتا ہے وہ اپنی سرکاری طاقت اور پوزیشن استعمال کر کے اپنے دھڑے کے ممبروں کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس صورت حال کو روسی کیمونسٹ پارٹی کے فرسٹ سیکرٹری برزہنوف Brezhnev جن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ روس کا اصل اقتدار انہی کے ہاتھوں میں ہے فرماتے ہیں کہ

"......بعض مقامات پر مہلک رجحانات جیسے دھڑے بندی پچھلے چند سالوں میں رونما ہوئے ہیں۔ بعض دفعہ یہ اس طرح ہوتا ہے: مثال کے طور پر کسی صوبہ میں یا کسی علاقہ کی معاشی کونسل کے ذریعہ کچھ ایسی اشیاء کی پیداوار ہوتی ہے کہ جن کی سپلائی بہت کم ہے لیکن جب ان کی تقسیم کا معاملہ سامنے آتا ہے تو صرف ان لوگوں کی ضرورت اور طلب کی فکر کی جاتی ہے جو "ان کے اپنے دھڑے" کے لوگ ہیں۔ اور ان صارفین کو کافی مقدار میں سپلائی کی جاتی ہیں اور دوسرے صوبہ یا علاقہ کے صارفین کے لئے مقررہ کوٹہ کو پورا نہ کرنے اور اس طرف کوئی دلچسپی نہ لینے کا راستہ اختیار کیا جاتا ہے۔ ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ کا کوٹہ پورا کرنے کے لئے اشیاء پہنچانے کے انتظامات میں ناکامی کے واقعات سامنے آتے ہیں۔ اے کامریڈو، یہ سب کیا ہے؟ یہ دھڑے بندی کا نقطۂ نظر نہیں تو اور کیا ہے؟ ایک سوشلسٹ مملکت میں یہ ایک انتہائی مہلک صورت حال ہے۔ جس کی کسی حالت میں اجازت نہیں دی جا سکتی"......[1]

مسٹر برزہنوف یہ سمجھتے ہیں کہ پارٹی اور حکومت کے زور سے اس رجحان کو دبا لیں گے۔ لیکن وہ اس پر غور نہیں کرتے کہ ایسا مہلک رجحان سرخ جنت میں کیوں پیدا ہوتا ہے۔ جس نظام میں بھی "ایک فرد کی حکومت" والا اصول کسی نہ کسی شکل میں نمودار ہوگا وہاں دھڑے بندیوں کا وجود میں آنا ایک بالکل نظری امر ہے اسے دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ جب تک کہ اختیارات کو ایک جگہ سمیٹنے والے اصول ہی کو ختم نہ کیا جائے۔ لیکن سوشلزم کے معنی ہی سارے اختیارات کو قومی ملکیت کے نام پر ایک جگہ جمع کرنا ہے پھر سب یہ اوپر سے نیچے کی طرف منتقل ہوں گے تو ہر مرحلہ پر اس نظام کے ہر سربراہ کو ایسے ہی کل اختیارات سونپے پڑتے ہیں کہ ہر اوپر والا نیچے والے کا خدا بنتا چلا جائے اور منیجر خداؤں کے ان اہراموں کی چوٹی پر وہ بڑا خدا نمودار ہو جو "پرولتاریوں کا ڈکٹیٹر" کہلاتا ہے۔

منصوبے اور ہتھکنڈے

کسی منیجر کی اولین ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ وہ منصوبے میں دیئے گئے ہدف کو مزید پورا کرے۔ اگر اس نے اس کے مطابق پوری پیداوار کی یا اس سے زائد کی تو اس کو بونس اور دوسرے بہت سے مادی فوائد حاصل ہوتے ہیں اور اگر وہ اس میں کامیاب نہ ہوا تو پھر اس کو سزا ملتی ہے اور اس کو ناکارہ سمجھا جاتا ہے۔ اس اصول پر کارخانوں اور کمپنیوں کا سارا نظام چلایا جا رہا ہے۔ یہ کہاں تک کامیاب اصول ہے اور پھر گیر منصوبہ بندی والی اشتراکی معیشت کے کیا رجحانات ہوتے ہیں: اس کے متعلق سوویٹ روس کا دورہ کر کے واپس آنے کے بعد پروفیسر Harry Schwartz لکھتے ہیں کہ

"دو سروں کی خوبی دیکھنا چاہتے تو نظام جو امریکی منیجر مل کر نہایت حیرت انگیز اور عجیب نظر آتا ہے۔ بہر حال یہ...

---

[1] "New" Methods of Economic Management in U. S. S. R., p. 94. (published in Moscow) p. 94.

رہا ہے۔ سوویت پیداوار میں خاصا اضافہ ہوا ہے اور مزید ہو رہا ہے۔ لیکن خروشچیف نے اپنے بیانات میں واضح کر دیا ہے کہ یہ سسٹم چل تو ضرور رہا ہے۔ لیکن کئی اندازوں اور کئی پہلوؤں سے یہ نامعقول بھی ہے ......

یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ بظاہر ہموار طریقہ پر چلنے والا یہ نظام بحران کے قریب پہنچ رہا ہے۔ منصوبے ان متعلقہ لوگوں تک بعض دفعہ ہفتوں اور مہینوں تک نہیں پہنچتے۔ اور پھر یہ منصوبے تیزی کے ساتھ تبدیل بھی کئے جاتے رہتے ہیں خام مال اور فاضل اجزاء بالعموم وقت پر نہیں پہنچتے۔ مزدوروں کی تعداد کم ہے۔ روس کی سخت سردیاں بالعموم سارے نظام حمل و نقل کو معطل کر دیتی ہیں اور اس طرح منصوبے جو حساب کتاب اور اندازے سے پہلے کئے جاتے ہیں وہ سب دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بات بھی منصوبہ پورا نہ کرنے کے عذر کے طور پر بالکل تسلیم نہیں کی جاتی ہے[۴۵]

اس لئے سوویت منیجروں نے اپنے تجربہ سے یہی سیکھا ہے کہ وہ تمام پابندیوں اور اصول و قوانین کو بالائے طاق رکھ کر بالکل آزادانہ طور پر وہ سب کچھ کریں جو سرمایہ داری میں کوئی منیجر کر سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ منصوبہ بندی کرنے والوں کی ساری حماقتوں کے باوجود ان منیجروں کی اس طرح کی بے قید اور تجدد پسندانہ حرکتوں ہی کی وجہ سے اشتراکی نظام اب تک چل رہا ہے۔ اگر منیجر حضرات اپنی گردن بچانے کے لئے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال نہ کریں تو ان کا ذاتی مستقبل خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔ یہ نظام جہاں مزدوروں میں کام سے بے دلی پیدا کرتا ہے۔ وہیں یہ منیجروں کو مجبور کرتا ہے کہ وہ سارے اخلاقی اور اشتراکی، غرض ہر اصول و قانون کو نظر انداز کر کے ہر جائز و ناجائز حربہ اختیار کریں اور کسی طرح اپنے اوپر والوں کو یہ باور کرائیں کہ وہ اپنا فرض منصبی ٹھیک سے ادا کر رہے ہیں اور منصوبے ہدف پورے کر رہے ہیں۔

سب سے پہلے انہیں اپنی ساری صلاحیتیں اس وقت صرف کرنی پڑتی ہیں جب کہ منصوبہ بن رہا ہو۔ اس میں ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنے کارخانہ کے لئے کم سے کم ہدف مقرر کروائیں۔ مثلاً ایک تجربہ کار منیجر پہلے یہ اندازہ کرے گا کہ اس کے کارخانے میں ایک سال میں کتنے بال بیرنگ (ball bearing) بن سکتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ وہ سمجھتا ہے کہ دس لاکھ تیار ہو سکتے ہیں۔ تو وہ منصوبہ بنانے والوں کو سات لاکھ کی تجویز پیش کرے گا۔ پھر اس کے بعد اس کے اور منصوبہ بنانے والوں کے درمیان کافی بات چیت اور مول تول (bargaining) کے بعد اس کے کارخانے کے لئے منصوبہ میں آٹھ لاکھ یا نو لاکھ بال بیرنگ طے پائیں گے حالانکہ اس کے کارخانے میں اس سے زیادہ کی گنجائش ہوگی۔ اس کے کارخانہ میں مزید ایک یا دو لاکھ بال بیرنگ کی جو گنجائش ہے وہ اس کو اپنی کارکردگی کے طور پر پیش کرے گا کہ کارخانہ کو الاٹ کئے ہوئے کوٹے سے زیادہ پیداوار اس نے کی۔ اس طرح جو زائد پیداوار ہوتی ہے وہ کہنے کے لئے زائد ضرور ہوتی ہے لیکن فی الحقیقت زیادہ نہیں ہوتی۔ بلکہ کارخانہ کی گنجائش کے عین مطابق ہوتی ہے لیکن اس طرح نہ صرف یہ کہ منیجر کی اپنی کارکردگی ظاہر ہوتی ہے۔ بلکہ چونکہ تمام کارخانوں کے منیجر کم و بیش ایسی ہی حرکتیں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لئے اس کا اثر بحیثیت مجموعی پورے منصوبہ پر یہ پڑتا ہے کہ منصوبہ کے مجموعی ہدف سے زائد پیداوار ہوتی ہے جس کا دنیا بھر میں خصوصاً ایشیا و افریقہ کے پس ماندہ ممالک میں ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے کہ سوشلسٹ نظام کی برکت سے پیداوار میں بے تحاشا اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن یہ "اضافہ" ایک مصنوعی اور بناوٹی "اضافہ" سے زیادہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔

---

[۴۵] Selected Readings in Economics p. 521.

اب اگر کوئی منیجر اپنی نااہلی کے سبب یہ دیکھتا ہے کہ وہ اتنے بال بیرنگ بھی نہیں بنا سکتا جس کی کہ خود اس کے اپنے اندازہ کے مطابق کارخانہ میں گنجائش ہے تو پھر وہ اس کو مزید کم کروانے کے لئے دوڑ دھوپ شروع کر دیتا ہے۔ اس کو روسی زبان میں "بلات" Blat کہتے ہیں جس کا کوئی صحیح ترجمہ صرف ایک لفظ میں کرنا نہ انگریزی میں ممکن ہے نہ اردو میں۔ اس میں رشوت بھی شامل ہے اور دھڑے بندی کی روح بھی۔ یہ اپنی جگہ ہے کہ اس نے ماضی میں کسی کے ساتھ کوئی احسان یا سلوک یا خدمت کی تھی تو اس کا بدلہ اس موقع پر حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔ وہ اس "بلات" کو شروع میں اس وقت بھی استعمال کرتا ہے جب کہ اس کے کارخانہ کے لئے ہدف مقرر کیا جا رہا ہے اور اس وقت بھی استعمال کرتا ہے جب کہ اسے اپنی نااہلی کو چھپانے کے لئے منصوبہ کی مقرر کردہ مقدار کو مزید گھٹوانا ہو چنانچہ اس کے متعلق روس کی کمیونسٹ پارٹی کے فرسٹ سیکرٹری مسٹر برزنیف نے ستمبر ۱۹۶۵ء میں کمیونسٹ پارٹی کے سامنے تقریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"...... ہمارے منصوبوں کی کوتاہیاں اور ہمارے چند منیجروں کا ان کو مکمل نہ کرنے کا غلط رویہ ان بیشمار تبدیلیوں سے ثابت ہوتا ہے جو کسی منصوبہ کی مدت کے دوران مختلف مقررہ کاموں اور اہداف کے سلسلہ میں کرنی پڑتی ہیں اکثر یہ ہوتا ہے کہ کسی کارخانہ کے منیجر کی طرف سے یا مقامی معاشی کونسل کی طرف سے کسی کارخانہ کے لئے طے شدہ مقررہ مقدار پر دوبارہ غور کرنے کا سوال اٹھایا جاتا ہے۔ جس کی وجہ بعض اوقات یہ ہوتی ہے کہ وہ خود اپنی نااہلی کے سبب اس مقررہ مقدار کے مطابق پیداوار نہیں کر سکتے اور بعض کمیونسٹ پارٹی کی مقامی تنظیمیں بھی ایسی ہیں کہ وہ بھی ایسی تجاویز کی تائید و حمایت کرتی ہیں اور ان مقررہ کاموں کو بدلنے کے لئے زور دیتی ہیں"[۲۶]

اشتراکی روس کی سب سے مقتدر ہستی مسٹر برزنیف کا یہ بیان اپنے دامن میں کئی صداقتوں کو لئے ہوئے ہے اور ایک طرف اس میں سوشلسٹ معیشت میں ابھرنے والے خدوخال بڑی وضاحت کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ اس میں یہ اعتراف ہے کہ منیجر اپنی نااہلی کو چھپانے کے لئے مختلف ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ پھر یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ جب منیجر کوئی تبدیلی چاہتا ہے تو صرف وہ اکیلا نہیں چاہتا بلکہ وہ مقامی معاشی کونسل، اور مقامی کمیونسٹ پارٹی کے سربراہوں کو بھی پہلے کسی نہ کسی طرح آمادہ کر لیتا ہے اور یہ سب بھی اس کی تائید کرنے لگتے ہیں۔ جب کہ برزنیف صاحب بتاتے ہیں کہ منیجر کی اس نااہلی پر پردہ ڈالنے یا اس کی حمایت کرنے کا کوئی جواز مقامی معاشی کونسل یا مقامی کمیونسٹ پارٹی کے پاس نہیں ہونا چاہیئے۔ منیجر کا یہی وہ ہتھکنڈا ہے جسے روسی زبان میں "بلات" (Blat) کہا جاتا ہے۔ معاشی کونسل اور کمیونسٹ پارٹی کی جو تنظیمیں اپنے مرکز کی وفادار سمجھی جاتی ہیں اور جن کا مقصد کاموں کی دیکھ بھال اور نگرانی کرنا ہوتا ہے وہ بجائے مرکز کی وفاداری کرنے کے منیجروں کی "بلات" سے متاثر ہو کر ان کی طرفدار بن جاتی ہیں۔ یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ہمیں بھی اپنے ملک میں پتہ ہے کہ جب کسی کو سرکاری دفاتر سے پالا پڑتا ہے تو وہاں اسے سرکاری افسران سے کام لینے کے لئے "بلات" کے کون کون سے حربے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ لیکن پرائیویٹ کمپنیوں میں اس کی ضرورت بالعموم نہیں ہوتی اور اگر ہوتی بھی ہے تو بہت کم۔ مقصد یہ ہے کہ جب بھی معاملات حکومتی کنٹرول میں جائیں گے وہاں یہ سب کچھ ہوگا۔ خواہ وہ روس ہو یا کوئی اور ملک۔ سوشلزم میں

---

۲۶ New Methods of Economic Management in U. S. S R. Moscow, p. 88.

[illegible] ملکیت کے نام پر صرف حکومت ہی کے کنٹرول میں ہوتی ہے۔ اس لئے وہاں کے ہر محکمہ اور ہر ادارہ میں اس "بلاٹ" کا ظہور بالکل فطری بات ہے۔ اس قومیانے کے سبب سوشلزم میں ایک لمبی چوڑی بیوروکریسی کا وجود میں آنا ایک فطری بات ہے۔ اور بیوروکریسی سے کام نکالنے کے لئے ..... فطری طریقہ صرف "بلاٹ" ہی ہو سکتا ہے۔ اس لئے یہ نظام اور اس کی پیدا کردہ بیوروکریسی ہر منیجر کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے کام نکالنے کے لئے "بلاٹ" استعمال کرے۔ کیونکہ اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی اور چارۂ کار باقی نہیں رہتا۔

اشیاء کی قلت دور کرنے کے ہتھکنڈے

جب منصوبہ طے ہو جائے اور اس پر کام شروع ہو جائے تو ایک تجربہ کار منیجر کو پتہ ہوتا ہے کہ اسے اپنے کارخانہ کے لئے جس خام مال کی ضرورت ہے وہ کبھی بھی وقت پر نہیں پہنچے گا اور جو کچھ اس تک پہنچایا جائے گا۔ وہ ضروری نہیں کہ اس کی دی ہوئی صفات (خصوصیات) کے مطابق ہو۔ اس لئے اسے ہر وقت ہنگامی حالت کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار رکھنا ہوتا ہے۔ اس طرح اشیاء اور خام مال کی قلت کسی وقت بھی اس کے کارخانہ میں پیدا ہو جائے تو پھر کارخانہ بند کر کے بیٹھنا پڑے گا۔ جس کے نتیجہ میں پیداوار کم ہوگی، جو اس کی کارکردگی کو متاثر کرے گی اور بحیثیت منیجر اس کا مستقبل خطرہ میں پڑ جائے گا۔ قلت اشیاء کی صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک سوشلسٹ منیجر حسب ذیل ہتھکنڈے استعمال کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

پہلا تو وہی "بلاٹ" ہے جس کی ہم اوپر تشریح کر آئے ہیں۔ مثلاً اسے کسی وقت ایک ٹن تانبہ کی فوری ضرورت پڑ جائے تو وہ پہلے اس دوسرے منیجر کی مدد مانگے گا جس کی اس نے پہلے مدد کی تھی۔ جب اس دوسرے منیجر کو ایک ٹن ایلومینیم کی فوری ضرورت پیش آئی تھی تو اس نے اپنے اسٹاک میں سے اس کی مدد کی تھی۔ اس کے بدلہ میں وہ اس وقت اپنی ضرورت کا ایک ٹن تانبہ اس سے حاصل کرے گا۔ یا پھر دوسری شکل یہ ہو سکتی ہے کہ تانبہ کی تقسیم کرنے والے ادارہ میں اس کا کوئی دوست کام کر رہا ہو جس کے سالے کو منیجر نے اپنے کارخانہ میں اچھے گریڈ پر نوکری دی تھی تو اس دوست سے منیجر گذارش کرے گا کہ اس کی ضرورت پوری کرے۔ اس کا یہ دوست، اس کا پچھلا احسان اتارنے کے لئے کسی دوسرے کارخانہ کے تانبہ کے کوٹہ میں سے ایک ٹن کم کر کے اسے دے دے گا۔ اور دوسرے کارخانہ والے منیجر سے کہے گا کہ جب تانبہ کی مزید پیداوار ہو گی تو اس وقت اس کا کوٹہ پورا کیا جائے گا۔

اگر یہ "بلاٹ" والا حربہ کسی وجہ سے کام نہ آ سکے تو پھر دوسرا ہتھکنڈا "تولکاچ" (Tolkach) کی مدد لینا ہے۔ یہ "تولکاچ" کچھ اس سے ملتی جلتی شخصیت ہے جسے ہمارے ہاں "دلال" یا "ایجنٹ" کہا جاتا ہے۔ اگرچہ قانوناً اس "تولکاچ" کا وجود تسلیم نہیں کیا جاتا۔ لیکن عملی ضرورت نے اس طرح کی شخصیت کو جنم دیا ہے اور عملاً ایک ایسے مرکزی ہمہ گیر منصوبہ بندی کرنے والے نظام میں جہاں ہر چیز حکومتی کنٹرول میں ہو ایسے ایجنٹوں اور دلالوں کا وجود ایک بہت بڑی ضرورت بن جاتا ہے۔ ہمارے ہاں بعض سرکاری افسران رشوت خوری کے لئے اس طرح کے ایجنٹوں کا استعمال کرتے ہیں۔ لیکن سوشلزم میں چونکہ ہر چیز سرکاری ہوتی ہے اس لئے وہاں "تولکاچ" کا دائرہ کار محض رشوت فراہم کرنے سے بہت زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ جب قانونی اور سرکاری طور پر اشیاء کی سپلائی کرنے والے افراد یا ادارے مثلاً دس ٹن ربر یا ضروری و ناگزیر فاضل اجزاء

ں عدم موجودگی پر پریشان کی کتابوں کی قسم کھا لیں اور کسی منیجر سے یہ کہہ دیں کہ یہ چیزیں بالکل اسٹاک میں نہیں ہیں۔ تو ایسے مواقع پر "تولکاچ" کو پتہ ہوتا ہے کہ انہی افراد یا اداروں سے یہ چیزیں کیسے حاصل کی جائیں یا کون سی دوسری جگہ سے یہ چیزیں دستیاب ہو سکتی ہیں۔ "تولکاچ" کو اپنے پوشیدہ ذرائع سے سب پتہ ہوتا ہے کہ کب اور کہاں کن اشیاء کی قلت پیدا ہونے والی ہے۔ راستہ میں کس مقام پر اور کیسے ان کی سپلائی میں تاخیر کی جائے گی، کہاں پر کون سی اشیاء زائد ہیں اور کہاں کن کی کمی ہے۔ اور کون کتنے دام پر کون سی چیز چور بازاری میں بیچنے کو تیار ہے اور کون بیچنے کی بجائے کس چیز کے بدلہ میں کیا چیز دینے کو تیار ہے۔ اس طرح کی معلومات اور اس طرح کے کام کرنے والے افراد کو "تولکاچ" کہا جاتا ہے۔ جب کسی منیجر کو کوئی فوری ضرورت پیش آتی ہے تو وہ اس کی خدمات سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہ سب کچھ غیر قانونی ہے۔ لیکن سوشلزم کی مصنوعی معیشت میں مانگ اور رسد کے فطری قانون کو جب کھلے مارکیٹ میں کام کرنے کی آزادی نہیں ملتی تو پھر یہ قانون فطرت بلیک مارکیٹ میں "تولکاچ" کی مدد سے اپنا عمل دکھانے لگتا ہے اور یہ "تولکاچ" اس طرح سے مانگ اور رسد کے توازن کو غیر قانونی طریقوں سے پورا کرتا ہے۔ سوشلزم اگر شدید بحران سے دوچار نہیں ہوا تو اس کی وجہ سوشلزم کی خوبیاں نہیں، بلکہ اس کا جنم دیا ہوا بلیک مارکیٹ کا نظام ہے۔

چونکہ "بلاٹ" اور "تولکاچ" کے دونوں حربے ناکام ہونے کا اندیشہ بھی ہر وقت لگا رہتا ہے۔ اس لئے ایک تجربہ کار سوشلسٹ منیجر ہمیشہ ہر چیز کا زیادہ سے زیادہ اسٹاک ذخیرہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اصولی طور پر حکومت اس ذخیرہ اندوزی کی بڑی سخت مخالف ہے۔ کیونکہ اس سے ہمہ گیر منصوبہ کا سارا توازن اور حساب کتاب بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ حکومت خام مال اور اشیاء کی کل مقدار مختلف کارخانوں پر تقسیم کرتی ہے۔ لیکن چند منیجر اپنے "بلاٹ" اور "تولکاچ" کے ذریعہ ذخیرہ اندوزی کر لیتے ہیں تو ظاہر ہے کہ دوسرے کارخانے جہاں ان کی واقعی فوری ضرورت ہوتی ہے وہاں قلت پیدا ہو جاتی ہے اور حکومت نے جو منصوبہ بنایا ہوتا ہے وہ صرف کاغذی بن کر رہ جاتا ہے۔ لیکن منیجر کو حکومت کے کل منصوبے سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اسے تو ہر وقت اپنی کھال بچانے کی فکر دامن گیر رہتی ہے۔ اس لئے وہ قطعاً اس کی پرواہ نہیں کرتا کہ سوشلزم جیسی حساب کتاب کی معیشت میں اگر وہ ذخیرہ اندوزی کئے بیٹھا رہے گا تو سارا حساب کتاب غلط ہو کر منصوبہ کا توازن بگڑ جائے گا۔

اس کو روکنے کے لئے روس میں یہ طریقہ نکالا گیا کہ ہر کارخانہ میں ایک "محتسب" (Book Keeper) مقرر کیا جاتا ہے اور تمام اسٹاک اور حساب کتاب کے کاغذات پر اس کے دستخط ضروری ہوتے ہیں۔ یہ بھی نظری طور پر مرکزی ادارہ کا نمائندہ برائے نگرانی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جب پوری پارٹی کی مشینری اور مقامی معاشی کونسل کا ایک منیجر "بلاٹ" کے ذریعہ اپنا حمایتی بنا سکتا ہے تو خود اپنے کارخانے کے محتسب کو "ٹھیک کرنا" ایک منیجر کے لئے کونسی مشکل بات ہے؟[1]

---

[1] اشتراکی روس میں اس سلسلہ میں ایک لطیفہ بہت مشہور ہے۔ ایک منیجر "محتسب" کی ملازمت کے تین امیدواروں کا انٹرویو لے رہا تھا۔ منیجر نے ان سے پوچھا دو اور دو کتنے ہوتے ہیں پہلے امیدوار نے جواب دیا "چار" دوسرے نے جواب دیا "بائیس" اور تیسرے نے جواب دیا کہ "آپ کتنا بنانا چاہتے ہیں؟" تیسرے امیدوار کو نوکری مل گئی۔

وں کو سوشلزم کے تحت قومی ملکیت میں لے لیا۔

۱۰۔ بیوروکریسی اور صنعتوں کی تنظیم — یہ اور یہ سب کی سب ایک ہی مقتدر اعلیٰ ہستی کی ملکیت ہوتی ہیں تو ایک لمبی چوڑی بیوروکریسی وجود میں آتی ہے جو اپنے ساتھ بے شمار انتظامی مسائل لاتی ہے۔ چنانچہ ۱۹۵۷ء سے پہلے تک نظام یہ تھا کہ ہر صنعت کی ایک وزارت ہوا کرتی تھی۔ اس صنعت سے متعلقہ تمام منصوبہ بندی اور سارے فیصلے اس وزارت کی اعلیٰ سطح پہ ہوا کرتے تھے۔ تمام کارخانوں میں منیجروں کو مقرر کرنے اور نکالنے کے سارے اختیارات ماسکو کی اس وزارت کو ہوتے تھے جو دور دور کی ہر صنعت کو ماسکو میں بیٹھ کر کنٹرول کرتی تھی۔ لیکن اس سے جو لمبی چوڑی بیوروکریسی وجود میں آئی اس کی خرابیاں اتنی زیادہ بڑھ گئیں کہ خود خروشچیف نے اس نظام کی خرابیوں کو شدت سے محسوس کیا۔

> "......... اس نے (خروشچیف نے) نہایت افسوس کا اظہار کیا کہ ہر سوویٹ وزارت نے اپنے آپ کو ایک آزاد مملکت کا شہنشاہ جیسا سمجھ کر صرف اپنے ہی کارخانوں کی ضروریات کو پیش نظر رکھنا اور دوسرے کارخانوں کی ضروریات کو پس پشت ڈالنے کا رویہ اختیار کیا۔ اس کے نتیجہ میں ہزاروں میل دور غیر ضروری طور پہ مال بھیجا جاتا تھا۔ حالانکہ کسی دوسری وزارت نے قریب کی کسی جگہ پہ دوہری سہولتیں پیدا کر رکھی تھیں۔ لیکن ان سہولتوں سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ کیونکہ وہ دوسری وزارت کی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہر وزیر کو اپنا منصوبہ پورا کرنا ہوتا تھا اور اس کی تنظیمی سرگرمیاں صرف اسی کے کارخانوں کو اشیاء ٹھیک سے سپلائی کرنے کا لحاظ کرتی تھیں اور اس کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی تھی کہ اس کے اثرات معیشت کے دوسرے حصوں پر کیا پڑیں گے...." [۴۸]

اس کے علاوہ ذرا ذرا سی بات کے لئے ماسکو کی منظوری ضروری تھی۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر معاملہ دیر سے طے ہوتا تھا، اور کبھی کوئی چیز وقت پہ دستیاب نہیں ہوتی تھی۔ جس کے نتیجہ میں "بلاٹ" اور "ٹولکاچ" جیسی چیزیں بڑھتی جا رہی تھیں چونکہ جہاں کہیں بھی بیوروکریسی ہوگی۔ ان سب چیزوں کا پیدا ہونا فطری امر ہے۔ تاہم اس کا علاج یہ نکالا گیا کہ اس نظام کو ۱۹۵۷ء میں ختم کر کے اس کی جگہ "علاقائی معاشی کونسل" کا نظام اختیار کیا گیا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ بیوروکریسی پیدا نہ ہونے پائے اور سب کام تیزی سے اور ڈھنگ سے طے پا سکیں۔ لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ جب ساری چیزیں قومی تصرف میں ہوں تو خواہ صنعتوں کی تنظیم کی کوئی بھی شکل کیوں نہ اختیار کی جائے بیوروکریسی اور اس کی ساری خرابیاں اور مسائل ضرور رونما ہوں گے۔ چنانچہ ۱۹۵۷ء کی اس تنظیم نو کے نتائج کچھ اس طرح رونما ہونے لگے کہ ہر علاقہ نے صرف اپنے علاقہ کے معاملات کو زیادہ اہمیت دینے اور دوسرے علاقہ کے معاملات کو پس پشت ڈالنا شروع کیا۔ جب وزارا جیسے ذمہ دار افراد پچھلے وزارتی نظام میں اس رجحان سے نہیں بچ سکے تو بھلا علاقائی معاشی کونسل کے اندر یہ رجحان کیوں نہ پیدا ہوتا۔ خروشچیف کے زمانہ ہی سے یہ رجحان ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا۔ جس کو خروشچیف نے روسی زبان میں (mestnichestvo) یعنی علاقہ داریت کا نام دیا اور اسے

---

[۴۸] Selected Readings in Economic by C. Lowell Harriss P. 513

دور کرنے کی تلقین کرتا رہا۔ اور جب مسٹر برزنیوف اور مسٹر کوسیگن نے خروشچیف کو ہٹا کر برسر اقتدار آئے تو اس وقت یہ رجحان کافی زور پکڑ چکا تھا۔ چنانچہ کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے اجلاس، جہاں ستمبر ۱۹۶۵ء میں صرف اسی مسئلہ پر سارا یا بیشتر وقت صرف ہوا، میں علاقہ واریت کے خلاف لینن کے اقوال کا حوالہ دینے کے بعد مسٹر برزنیوف نے اپنی تقریر میں کہا کہ

"........ لینن نے پوری قوت سے اس بات پر زور دیا ہے کہ ایک واحد مرکز کو، پورے ملک کے کسی خاص بڑے پیمانہ کی صنعتی پیداوار کے تمام کارخانوں کو براہ راست کنٹرول کرنے کے حق سے محروم کرنا "علاقائی انتشار پسندانہ" (Syndicalism) ہوگا نہ کہ کمیونزم"۔

"عملی تجربہ نے بتا دیا ہے کہ علاقائی معاشی کونسلوں کے ذریعہ صنعتی تنظیم کا نظام، پورے ملک کی ایک واحد معاشی تنظیم کے اہم مطالبات پورے نہیں کر سکتا۔"[۴۹]

پھر آگے اس نظام کی مزید خرابیاں کرتے ہوئے مسٹر برزنیوف فرماتے ہیں کہ:

"........ موجودہ صنعتی تنظیم کی حیثیت میں تحقیق اور ڈیزائین کرنے والے ادارے پیداوار سے بالکل علیحدہ اور غیر متعلق ہو گئے ہیں۔ معاشی کونسلوں، جو صنعتی ترقی کی ذمہ دار ہیں، کے پاس سائنس دان، ڈیزائین کرنے والے اور فنی ماہرین مناسب تعداد میں نہیں ہیں۔ دوسری طرف حکومتی کمیٹیوں کو جو سائنسی اور ڈیزائن کرنے والے اداروں کی سربراہ ہیں، اپنے تحقیقات کے نتائج پیداوار کے کارخانوں میں رائج کرنے کے کوئی اختیارات نہیں ہیں۔ اصولی طور پر ان کی حیثیت بس سفارشات کی سی رہ جاتی ہے جس کی پابندی کسی پر لازم نہیں آتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سائنس و ٹکنالوجی کی نئی دریافتوں اور صنعت کے ترقی یافتہ تجربات کو کارخانوں میں رائج کرنے کا معاملہ بہت پیچھے رہ جاتا ہے....

.... (اس صنعتی تنظیم سے) یہاں دوسرا مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے: ایک ہی قسم کے بیسیوں کارخانے اپنی مصنوعات کو خود آزادانہ منظم اور ڈیزائین کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہمیں اس پر سنجیدگی سے سوچنا ہوگا کہ آیا یہ طریق کار صحیح ہے۔ اس کو واضح کرنے والی ایک مثال یہ ہے۔

خارکوف ٹریکٹر پلانٹ دت۔ ۴۰ ماڈل کا ٹریکٹر بناتا ہے اور ولگوگراد ٹریکٹر پلانٹ دت۔ ۷۵ ماڈل کا ٹریکٹر۔ دونوں کی گنجائش بھی ایک ہے اور دونوں ایک ہی جیسے کام کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے ڈیزائن مختلف ہیں۔ موٹر کار کی صنعت میں بھی یہی دیکھا گیا ہے.............. دونوں قسم کی گاڑیاں ایک ہی مقصد اور ایک ہی گنجائش کی ہیں۔ لیکن ڈیزائن مختلف ہیں۔ ان کے انجن، ریڈی ایٹر، گیئر بکس اور دوسرے اہم اجزاء ایک جیسے نہیں ہیں اس لئے ایک دوسرے کی جگہ نہیں استعمال ہو سکتے۔

یہاں یہ بتانے کی حاجت نہیں ہے کہ یہ صورت حال کس قدر غیر اقتصادی ہے اور یہ ہمارے ٹریکٹروں اور موٹر گاڑیوں کے چلانے [illegible] ہم کس قدر پیچیدہ بنا دیتی ہے۔"

---

[۴۹] New Method of Economic Management in U. S. S. R. Moscow, p. 78.

اس طرح کی غیر ضروری (parallelism) یا متوازیت بہت بڑے پیمانہ پر پھیلی ہوئی ہے یہ ایک ایسی ہی بات نہ تھی کہ جس کے متعلق کامریڈ تاسیل کوف نے ایک چونکا دینے والی مثال پیش کی ہے۔ یعنی یہ کہ مختلف محکموں کے دس ڈیزائن کرنے والے ادارے اس وقت سمندری اور دریائی کشتیاں ڈیزائن کرنے کی ذمہ دار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی گنجائش کی کشتیاں نو مختلف ڈیزائن پر تیار کی جا رہی ہیں"۵

مسٹر برزنیوف کی اس رپورٹ سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟ جس بدانتظامی سے بچنے کے لئے خروشچیف نے مقدار توڑ والا سسٹم ختم کرکے معاشی کونسلوں کا نیا سسٹم جاری کیا تھا۔ ایک وہ بدانتظامی ان معاشی کونسلوں میں بھی نئے نئے روپ دھار کر سامنے آ رہی ہے ایک قسم کی بیوروکریسی سے جان بچانے کی کوشش کی تو دوسری قسم کی بیوروکریسی مسلط ہو گئی۔ چنانچہ مسٹر برزنیوف اس سلسلہ میں یہ فرماتے ہیں کہ

"......... اب تک صنعتی تنظیم کا جو طریقہ رائج رہا ہے۔ جس کے تحت ایک وقت میں ایک ہی نوعیت کے معاملات کو چکانے کے لئے کئی مختلف ادارے (ایک علاقہ کی معاشی کونسل، ایک صوبہ کی معاشی کونسل، پوری یونین کی معاشی کونسل اور سپریم قومی معاشی کونسل) کام کرتے رہے ہیں۔ اس نے ایسے حالات کو جنم دیا کہ جس کے تحت کارکنوں نے اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کو دوسرے محکموں کے سر تھوپنے کی کوشش کی ... ان حالات میں اکثر و بیشتر ذمہ دار منیجر صاحبان میں بھی اپنی براہ راست ذمہ داری کو محسوس کرنے کا رجحان ختم ہو گیا۔

میں اس کی صرف ایک مثال بیان کروں گا۔ تیل کے کنوئیں کھودنے کے کام کو تیز تر کرنے کے لئے والگا کے تیل کا کام کرنے والوں نے یہ فیصلہ کیا کہ .... (تیل نکالنے کا ایک نیا طریقہ استعمال کریں) اس نئے طریقہ کے ذریعہ (کئی گنا محنت) بچ سکتی تھی۔ ہر ایک کو یہ اچھی طرح اور صاف معلوم تھا کہ یہ ایک نہایت اہم معاملہ ہے۔ لیکن اس نئی طرز کے آلات بنانے کے سٹینڈرڈ پر متفق ہونے کے لئے ایک سال کا عرصہ لگا۔ اور بدقسمتی سے آج تک اس پر عمل درآمد اس لئے نہیں ہو سکا کہ اس کے لئے معاشی کونسلوں اور ریاستی کمیٹیوں کے مختلف اداروں کے مختلف نمائندوں کے پندرہ دستخط ضروری ہیں۔ اس سٹینڈرڈ کے لئے ریاستی کمیٹیوں کے چار چیئرمین اور دو صوبائی معاشی کونسلوں کے صدر کی منظوری بھی ضروری ہے۔ لیکن یہیں پر معاملہ ختم نہیں ہو جاتا۔ کامریڈ زاروبیان نے آج ایک دوسری مثال پیش کی ہے۔ جس میں ایک معمولی سی بات پر اتفاق کرنے کے لئے مختلف محکموں کی ۳۰ دستخطوں کی ضرورت ہے۔ اس طرح کے بیوروکریٹک طریقوں کو ختم کیا جانا چاہیئے۔

اس طرح کے اور بہت سے واقعات و حقائق کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ جہاں عملی کام کی جگہ محض ضابطے کی کارروائیوں نے لے لی ہے .... جہاں پر لوگ خود کام نپٹانے کے بجائے معاملہ کو کسی اور کی طرف بڑھا دیتے ہیں حالانکہ وہ خود انہی کے کرنے کا کام ہوتا ہے...۶

۵۔ ایضاً صفحہ P. 78 to 81

۶۔ ایضاً صفحہ P. 83, 84

۴۰ سال تک صنعتی وزارتوں کا جو طریقہ تھا اس کو اسی لئے ختم کیا گیا تھا کہ اس میں بیوروکریسی بہت محسوس کی گئی تھی اس سے تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ۱۹۵۷ء تک جب تک کہ صنعتی وزارتوں کا نظام رائج تھا۔ اس ۱۹۱۷۔۱۹۵۷ء ۴۰ سال کے دوران روس کی اشتراکی معیشت میں بیوروکریسی موجود رہی۔ اس کے بعد ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۵ء تک معاشی کونسلوں کے نظام کو آزمایا گیا تو اس کے اندر بھی کچھ بیوروکریسی پائی گئی وہ مسٹر برزنیف کے اوپر کے طویل اقتباسات سے ظاہر ہے۔ گویا ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۵ء کے ۸ سال کے دوران بھی بیوروکریسی رہی۔ گویا ۱۹۶۵ء تک روس کی اشتراکی معیشت میں بیوروکریسی بطور ایک حقیقت کے موجود رہی جس کو مسٹر خروشیف نے ۱۹۵۷ء میں تسلیم کیا اور مسٹر برزنیف نے ۱۹۶۵ء میں۔ اسی حقیقت کے متعلق ہم یہ کہتے ہیں کہ سوشلزم کا یہ ایک ناگزیر نتیجہ ہے یہ محض کوئی اتفاق نہیں ہے کہ جب سے سوشلزم روس میں رائج ہوا ہے۔ اس وقت سے ۱۹۶۵ء تک اس میں بیوروکریسی خود روسی لیڈروں کے اعترافات کے مطابق موجود رہی۔ یہ ہرگز کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ قومی تصرف میں ہر چیز کو لے لینے کا فطری اور منطقی نتیجہ ہے۔ اور جب تک کہ یہ قومی ملکیت والا سلسلہ قائم ہے اور سوشلزم کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس میں قومی ملکیت ضرور رہے گی، اس وقت تک یہ بیوروکریسی بھی ضرور رہے گی۔ صنعتوں کی تنظیم کا جو بھی نیا طریقہ اختیار کیا جائے گا۔ یہ بیوروکریسی اس نئے طریقہ میں بھی لازماً نمودار ہو گی۔ روسی حکمران تنظیم کی شکلیں بدل بدل کر اس بیوروکریسی سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ مسئلہ محض ظاہری شکل کے بدلنے سے حل نہیں ہو گا۔ کیونکہ سوشلزم (یعنی قومی ملکیت) کی روح میں یہ داخل ہے۔ اس سے نجات پانے کا واحد راستہ اس کی روح کو ختم کرنا ہے نہ کہ ظاہری شکل کو۔ روح کو ختم کرنے کے معنی خود سوشلزم کو ختم کرنا!

معاشی کونسلوں کے ذریعہ صنعتوں کی تنظیم کا طریقہ ناکام ثابت ہونے کے بعد ستمبر ۱۹۶۵ء کے بعد پھر دوبارہ صنعتی وزارتوں کا سسٹم کچھ ترمیم و تخفیف کے ساتھ رائج کیا گیا ہے۔ یعنی جہاں سے چلے تھے پھر واپس وہیں چلے آئے۔ اس کی حیثیت صنعتی تنظیم کے پنڈولیم کی سی ہے۔ جس طرح گھڑی کا پنڈولیم ایک انتہا سے حرکت کر کے دوسری انتہا کو پہنچتا ہے اور پھر دوسری انتہا سے واپس دوبارہ پہلی انتہا کی طرف آتا ہے۔ یہی حال اشتراکی صنعتی تنظیم کا بھی رہا ہے۔ صنعتی وزارتوں کی انتہا سے چلنے، معاشی کونسلوں کی دوسری انتہا اختیار کی۔ اب پھر واپس صنعتی وزارتوں کی انتہا کی طرف جا رہے ہیں۔ سوشلزم میں قومی ملکیت کے بعد کوئی ڈھنگ کی صنعتی تنظیم ہی وجود میں نہیں آ رہی ہے۔ جو سسٹم بھی اختیار کیا جاتا ہے اس میں بیوروکریسی کسی نہ کسی شکل میں اپنے سارے نقصانات، خرابیوں اور مسائل کے ساتھ نمودار ہو جاتی ہے اور صنعتی تنظیم کا معاملہ اس انتہا سے اس انتہا کے درمیان پنڈولیم کی طرح حرکت کرتا رہتا ہے۔ اور کسی صورت میں مسئلہ حل نہیں ہو پاتا۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ ۱۹۶۵ء کے بعد جو صنعتی تنظیم وجود میں لائی گئی ہے وہ سو فی صدی وہی ہے جو ۱۹۵۷ء سے پہلے تھی اس میں ایجنسیوں کا نظام بدل کر رکھ دیا ہے۔ سارے اختیارات محدود رکھنے کی بجائے ہر کارخانہ کے منیجر کو کافی اختیارات دیئے گئے ہیں۔ ہم اس تنظیم نو کی خرابیوں کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے کیونکہ جب اس تنظیم نو کو ۸-۱۰ سال آزمایا جائے گا تو سوویٹ لیڈر خود اعتراف کریں گے کہ بیوروکریسی نے پھر یہاں بھی سر نکالا ہے۔

(۱۱) جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی

کارل مارکس نے اپنے اشتراکی منشور میں کہا ہے کہ اس فیکٹری کو جلا دو جو سرمایہ دار کی ہو۔ اور اقبال نے کہا ہے کہ اس کھیت کا ہر خوشہ

جس سے دہقان کو روٹی میسر آ سکے۔ وہ کون سی ملکیت ہے؟ سوال یہ ہے کہ وہ کون سی ملکیت ہے جس سے دہقان کو روٹی میسر
نہیں آتی؟ یہ ایک معیار ہے۔ جو کھیت ایسا ہو کہ جس پر کام کرنے کے باوجود کسان کی ضروریات زندگی پوری نہ ہوں اور اس کی گذر
اوقات مشکل ہو، اس کھیت کی کوئی وجہ جواز باقی نہیں رہتی، لیکن اس معیار پر کون سی ملکیت اترتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں بھی ایسے کچھ کھیت
ہوتے ہیں، جو اقتصادی پیشی کی ہوتی شرط پوری نہیں کرتے۔ لیکن سوشلزم میں "سارے" ہی کھیت ایسے ہوتے ہیں۔ جو کسان
کے مفاد کے خلاف ہیں۔ اس کی کئی وجوہ ہیں۔ یہاں ان ہی اسباب کا جائزہ لینا مقصود ہے، کہ سوشلزم کیوں کسان کے مفاد کی
حفاظت نہیں کرتا؟ اس کا جواب ایک مشہور سوشلسٹ مسٹر اشوک مہتا کی زبان سے سنیئے۔ جنہوں نے جے پرکاش نارائن کے
ساتھ کانگریس۔ سوشلسٹ تحریک اٹھائی تھی۔ پھر پرجا سوشلسٹ پارٹی کے ڈپٹی لیڈر رہے اور مسز اندرا گاندھی کی کابینہ میں منصوبہ
بندی کے وزیر بھی رہے ہیں، اور سوشلزم سے متعلق کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں

"کسان، سوشلزم کا ایک ایسا موضوع رہا ہے، جس کی طرف کوئی توجہ یا التفات نہیں کیا گیا .... (مارکس کے ایک حوالہ کے بعد) ..... ترقی کے غیر متزلزل قوانین سے یہ امید باندھی گئی ہے کہ وہ خود بخود کسان کے مسئلہ کو حل کر دیں گے ......

انیجلز نے اس مسئلہ کے دو مختلف جواب دیئے ہیں۔ جہاں تک چھوٹے موٹے غریب کسانوں کا معاملہ ہے۔ اس نے کہا ہے کہ چھوٹے کسانوں کی عظیم اکثریت کو ہم جلدی اور آسانی سے اپنی طرف کر سکتے ہیں۔ اگر ہم ان کے ساتھ کچھ وعدے کر لیں۔ ایسے وعدے جن کے لئے ہم صحیح طور پر بدنام ہیں کہ ہم انہیں پورا نہیں کر سکتے .... پہلی بات تو یہ ہے کہ ...... چھوٹے کسانوں کی تباہی ناگزیر ہے۔ جسے ہم شروع ہی سے خوب سمجھتے ہیں۔ لیکن ہمیں کبھی بھی اپنی طرف سے اس ناگزیر تباہی کو قبل از وقت لانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے ....." [۵۲]

مارکس خود تو کسانوں کو ترقی کے قوانین کے رحم و کرم پر چھوڑ کر الگ ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھی انیجلز نے اس طرف کچھ توجہ کی لیکن اس کا مقصد یہ ہے کہ ان سے کچھ جھوٹے وعدے کر کے شروع میں اپنے ساتھ کر لو تاکہ اشتراکی تحریک مضبوط ہو سکے۔ اس کے بعد ان کی تباہی تو بہرحال آنی ہی ہے۔ یعنی یہ کہ ہم نہیں بھی لائیں گے تو کیا ہوا سرمایہ دار تو انہیں تباہ کر ہی رہے ہیں۔ پھر صنعت کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان کا وجود بھی ختم ہوتا ہی جائے گا۔ اس لئے ان سے کئے گئے وعدوں کی پرواہ مت کرو، انہیں خوب سبز باغ دکھائے جاؤ۔ وہ تو ایک مٹنے اور تباہ ہونے والی مخلوق ہے، اس کے ساتھ ہمدردی کی کیا ضرورت ہے۔ چنانچہ چین میں ماؤزے تنگ نے اس اصول پر خوب عمل کیا جب تک حکومت ہاتھ میں نہیں آئی، اس وقت تک تو یہ وعدے کرتے رہے کہ جو ہل جوتتے ہم اسی کو زمین کا مالک بنانا چاہتے ہیں اور جب بے چارے اس دھوکہ میں آ کر ماؤزے تنگ کے لشکر میں شامل ہو کر چیانگ کائی شیک کے خلاف جنگ میں شریک ہوئے اور جب اشتراکی اقتدار آ گیا تو جس کسی کے پاس تھوڑی بہت زمین تھی بھی تو وہ بتدریج چھین کر عملاً حکومت کی ملکیت بنا لی گئی جسے بعد میں collective اور commune میں تبدیل کیا گیا اور غریب کسان بے چارے منہ دیکھتے ہی رہ گئے۔ ان سے کہا گیا کہ اپنی زمین کے مالک بننے کے خواب بھول جاؤ۔ ہل جوتو اور یہ اجرت لو۔ اور اگر یہ پسند نہیں ہے

---

۵۲ Studies in Asian Socialism by Asoka Mehta (Bombay [illegible] Ed.)

زمین چھین کر ختم کر دی گئی۔ جب تک اقتدار حاصل نہیں ہوا تھا تو ماؤزے تنگ کسانوں سے یہ وعدے کرتے تھے کہ ہم زمینداروں سے زمین چھین کر تم میں تقسیم کر دیں گے۔ اور سرخ فوج کو ایسی تربیت دی جاتی تھی کہ ان میں طبقاتی تصور پیدا ہو اور اسے کسانوں کی مدد سے زمیندار طبقہ سے زمینیں چھین کر کسانوں کے طبقہ میں زمین تقسیم کرنے کا فن سکھایا جاتا تھا۔ چنانچہ اقتدار کے حصول سے بہت پہلے ۱۹۲۸ء میں ماؤزے تنگ فرماتے ہیں۔

"سیاسی تربیت حاصل کرنے کے بعد سرخ فوج کے تمام سپاہیوں میں طبقاتی شعور پیدا ہو گیا ہے۔ اور انہوں نے (کسانوں میں) زمین تقسیم کرنے کے سلسلہ کی ساری بنیادی باتیں اچھی طرح سیکھ لی ہیں..."[۲۴]

چنانچہ انیجلز کے خیال کے مطابق اس طرح کے جھوٹے وعدہ سے بہت جلد اور بہت آسانی سے چین کے کسانوں کی عظیم اکثریت ماؤزے تنگ کے ساتھ ہو گئی جس کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے ۱۹۲۷ء میں ماؤزے تنگ لکھتے ہیں کہ:

"......کسان تحریک کی موجودہ روز افزوں ترقی ایک زبردست واقعہ ہے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں چین کے مرکزی، جنوبی اور شمالی صوبوں سے کروڑوں کسان تیز رو آندھی جھکڑ اور طوفان کی طرح اٹھیں گے۔ ایک ایسی تیز اور غضبناک آندھی کہ کوئی بھی بڑی سے بڑی طاقت اس کو روک نہیں سکے گی۔ وہ ان تمام زنجیروں کو توڑ ڈالیں گے جن سے وہ بندھے ہوئے ہیں اور آزادی کی راہ پر دوڑ پڑیں گے۔"[۲۵]

حصول اقتدار کے بعد زمین کو کسانوں سے چھیننے اور اسے قومی ملکیت بنانے nationalization socialization کے لئے پھر اس طرح کی منطق اختیار کی جاتی ہے کہ ہم نے اشتراکی تحریک کی کامیابی اور حصول اقتدار کے لئے جدوجہد کے وقت جو زمین کسانوں میں تقسیم کی تھی اس زمین سے بعض کسان خوشحال اور پیسے والے ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ لوگ اگر اسی طرح خوشحال اور دولت مند ہوتے گئے تو گویا جلدی سوسائٹی میں سرمایہ داروں کا ایک نیا طبقہ وجود میں آ جائے گا۔ جو زمین پر اپنی ملکیت کے سبب روز بروز قوی سے قوی تر ہوتا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ ہم سوشلزم کے اندر ایسے سرمایہ داروں کو پنپنے کی اجازت کیسے دے سکتے ہیں؟ کیونکہ اس طرح کچھ لوگ دوبارہ سرمایہ دار اور کچھ غریب بنتے چلے جائیں گے۔ اور سوشلزم کیسے اس طرح کے طبقات کا وجود برداشت کر سکتا ہے۔ ہم صرف ایک ہی طبقہ کی سوسائٹی بنانا چاہتے ہیں (اور عملاً وہ ایک طبقہ مفلس و قلاش کسانوں کا طبقہ ہی ہو سکتا ہے نہ کہ خوشحال کسانوں کا) لہٰذا ہم نے جو کچھ زمینات پہلے تم میں تقسیم کی تھیں وہ تم سب کی بھلائی کے لئے واپس لے کر ساری زمین کو قومی ملکیت میں تبدیل کریں گے اسے کوآپریٹو یا کمیونس کی شکل دیں گے۔ ہم قسم کھانے کو تیار ہیں کہ ہم تمہاری زمین تم سے اس لئے چھین کر واپس لینا چاہتے ہیں کہ تمہاری فلاح و بہبود اسی میں مضمر ہے۔ جیسے ہی ہم تم سے تمہاری زمین چھین لیں گے، تمہارے مقدر کے ستارے چمک اٹھیں گے۔ اقتدار حاصل کرنے کے ۵، ۱۰ سال بعد کسانوں کو دی گئی زمین ان سے واپس لے کر حکومت کی کوآپریٹو بنانے (یا دوسرے الفاظ میں زمین کو nationalize کرنے) کی منطق اور جواز کو ماؤزے تنگ نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

---

۲۴ The Struggle in the Chinkiang Mountains (Nov. 25, 1928)

۲۵ Report on an Investigation of the Peasant Movement in Hunan (March 1927) Mao Tse Tung : *Selected Works*, Vol. I, p. 23, 24.

"......گذشتہ چند سالوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ سرمایہ داری کی فطری قوتیں تدریجاً ملک (چین) کے دیہی علاقوں میں ابھر رہی ہیں کیونکہ ہر جگہ بعض کسان امیر بنتے اور اپنی امارت میں پھلتے پھولتے جارہے ہیں اور بہت سے خوش حال کسان خود بھی امیر بننے کی تگ و دو کر رہے ہیں۔ دوسری طرف بہت سے غریب کسان ابھی بھی غربت و افلاس کی زندگی گزار رہے ہیں، کیونکہ ان کے پاس ذرائع پیدا وار ناکافی ہیں۔ جس کے سبب بعض مقروض ہوگئے ہیں اور بعض اپنی ذاتی زمینات کو بیچ رہے ہیں یا کرایہ پر دے رہے ہیں۔"

یہ ان زمینات کا تذکرہ ہے جو انقلاب سے پہلے اور اس کے ابتدائی دنوں میں زمینداروں سے چھین کر خود ماؤزے تنگ اور ان کے ساتھیوں نے اپنی دانست میں منصفانہ تقسیم کی تھیں۔ اسی منصفانہ تقسیم کے ۵، ۶ سال کے اندر ہی سوشلسٹ چین میں سرمایہ داری کا خطرہ ابھر آیا۔ بعض کسان اپنی زمین فروخت کرنے یا کرایہ پر دینے تک گئے اور بعض امیر بن گئے۔ اس کی وجہ یا تو یہ ہو سکتی ہے کہ وہ تقسیم منصفانہ نہیں کی گئی تھی۔ اس لئے یہ صورت حال پیدا ہوئی اور اگر تقسیم بالکل منصفانہ تھی تو پھر وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ایک کے علاقہ میں موسم اچھا رہا، دوسرے کے علاقہ میں خراب، یا ایک کو آب پاشی کی سہولت حاصل تھی اور دوسری کو نہیں۔ اگر غریب کسان مقروض ہو رہا ہے اور حالات و موسم کی ناسازگاری کے سبب مقروض ہو رہا ہے۔ تو اس کسانوں کی ہمدرد حکومت کا فرض یہ ہے کہ وہ انہیں بلا سودی قرضے آسان قسطوں پر فراہم کرے (جیساکہ اسلام کے معاشی نظام میں صورت میں کئے جاسکتے ہیں) نہ یہ کہ: غریب سے غریب اور مقروض ہونے کے جرم میں اس کی زمین چھین کر حکومت کی ملکیت بنالی جائے اور کسان صرف مزدور کی حیثیت سے کام کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر کسان بے گار سمجھ کر اجرت کے لئے کام کرتا ہے اور کبھی زرعی پیداوار ترقی نہیں کرسکتی۔ اس لئے دنیا کا تجربہ شاہد ہے کہ جہاں جہاں بھی زمین حکومت کی ملکیت میں لی گئی ہے ان تمام ممالک میں زرعی پیداوار کی ترقی انتہائی غیر تسلی بخش ہے۔ اور خود اشتراکی رہنماؤں کے لئے نہایت پریشان کن مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ صرف ایک اشتراکی ملک پولینڈ میں زرعی ترقی کی رفتار تسلی بخش ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ پولینڈ میں کسانوں سے زمین چھینی نہیں گئی ہے بلکہ ان ہی کی ذاتی ملکیت میں رہنے دی گئی ہے۔ بہرحال فی الحال ہمیں یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ اشتراکی زمینداروں کو کہتے ہیں کہ وہ کسانوں کا ناجائز انتفاع کر رہے ہیں (اور ہمیں بھی ایسے زمینداروں سے کوئی ہمدردی نہیں ہے) لیکن حقیقت یہ ہے کہ خود وہ غریب کسانوں کا ناجائز انتفاع بہت بڑے پیمانہ پر کرتے ہیں۔ پہلے تو انہیں بہلایا پھسلایا جاتا ہے کہ تم ہمارا ساتھ دو تو ہم تم کو زمین دیں گے۔ پھر بعد میں یہی زمین ان سے واپس چھین کر قومی ملکیت بنالی جاتی ہے۔ یہ ہے وہ سلوک جو ان غریب کسانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔!

۱۴۔ زمین کی اجتماعی ملکیت کے نتائج

سوشلزم کے معاشی پروگرام کا مقصد جس طرح صنعت و تجارت کو قومی ملکیت میں لینا ہے۔ اسی طرح زراعت کے بارے میں اس کا بنیادی اصول اینجلز کے الفاظ میں چھوٹے کسانوں کی انفرادی پیداوار اور انفرادی ملکیت کو اجتماعی پیداوار اور اجتماعی ملکیت میں تبدیل

"On the Question of Agricultural Cooperation (July 31, 19۵۵).
3rd Ed. p. 26, 27, by Mao Tse Tung.

کرتا ہے۔ اپنی زمین سے محبت کسان کا فطری خاصہ ہے۔ کبھی بھی کوئی کسان خوشی خوشی زمین پر سے اپنی انفرادی ملکیت چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔ اس لئے جس طرح اسلام نے صنعت و تجارت میں انفرادی ملکیت اور انفرادی کاروبار کی اجازت دی ہے اسی طرح زمین کی انفرادی ملکیت کی اجازت بھی دی ہے۔ اسلام نے ملکیت کو نہیں بلکہ ناجائز انتفاع اور غیر اخلاقی حرکتوں کو روکا ہے۔ تاکہ ملکیت کی اس طاقت کو فرد اپنی صلاحیتوں کی نشو ونما اور سوسائٹی کی مجموعی بہتری اور اجتماعی فلاح و بہبود کے لئے استعمال کر سکے۔

لیکن سوشلزم نے اصل خرابی کی جڑ انفرادی ملکیت کو قرار دیا ہے۔ چونکہ سوشلزم کا یہ اصول انسانی فطرت اور اس کے داعیات کے بالکل خلاف ہے۔ اس لئے اس بنیاد پر سوشلزم جو نظام معیشت تعمیر کرنا چاہتا ہے اس میں جس طرح مزدور کو اپنے کام سے دلچسپی باقی نہیں رہتی اسی طرح کسان کی عدم دلچسپی رونما ہوتی ہے۔ خواہ سوشلسٹ نظام ہو یا کوئی اور مزدور تو بہر حال مزدور ہی رہتا ہے بحیثیت مزدور اس کی اپنی کوئی ملکیت نہیں ہوتی، ملکیت یا تو سرمایہ دار کی ہوگی یا سوشلسٹ حکومت کی۔ دونوں نظاموں میں مزدور بہر حال اجرت لے کر کام کرنے والا ہوتا ہے۔ اس کی مزدوری دینے والا سرمایہ دار ہو۔ یا حکومت اس سے اس کیلئے کیا فرق واقع ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود جیسا کہ ہم اوپر تفصیل سے بتا چکے ہیں۔ مزدور ایک سوشلسٹ نظام میں دل وجان سے کام نہیں کر سکتا کسان کا معاملہ مزدور سے کافی مختلف ہے۔ مزدور کے برعکس کسان کی اپنی انفرادی ملکیت ہوتی ہے۔ مزدور کی انفرادی ملکیت بس اس کی اجرت ہوتی ہے۔ اس اجرت کو وہ ایک خرچ کرنے اور استعمال کرنے کی چیز سمجھتا ہے نہ کہ محبت کرنے کی۔ لیکن کسان کی انفرادی ملکیت اس کی زمین ہوتی ہے اور اس زمین کو محض استعمال کرنے کی چیز ہی نہیں سمجھتا ہے بلکہ اس سے محبت بھی کرتا ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ اس کی اور اس کے خاندان کی زندگی اور مستقبل اس سے وابستہ ہے۔ وہ بار بار اپنی زمین کی طرف دیکھ دیکھ کر یہ سوچتا ہے کہ اس کی زندگی اس سے قائم ہے۔ وہ اس زمین میں کسی، کمی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اگر ممکن ہو تو اس میں اضافہ کرے۔ تاکہ اس کی آنے والی نسلیں زیادہ آرام سے زندگی گزار سکیں۔ لیکن اشتراکیت میں زمین کا یہ تاریخی اور حقیقی تعلق توڑ دیا جاتا ہے۔ اور اس کو اس کی اپنی ہی زمین پر محض ایک مزدور بنا دیا جاتا ہے۔ اس سے اس کی یہ پیاری زمین چھین لی جاتی ہے۔ زمین کو انفرادی ملکیت سے نکال کر اجتماعی ملکیت میں لے آنا۔ اشتراکیت کا بنیادی اصول ہے زمین کے انفرادی ملکیت سے نکل جانے پر جس کسان کے اندر غم و غصہ کے جذبات کا ایک تلاطم برپا ہو۔ وہ کیسے ایسے نظام کے لئے دل وجان سے کام کر سکتا ہے۔ اس کا بس چلے تو وہ اس کے خلاف بغاوت کردے۔

سوشلزم کا یہ ایک اس قدر کمزور پہلو ہے کہ روس کے اشتراکی انقلاب بلکہ دنیا کے پہلے اشتراکی انقلاب کا بانی و ہیرو لینن بھی اس معاملہ میں بے انتہا احتیاط برتنا ضروری سمجھتا تھا۔ لینن کی اپنی خواہش اور سوشلزم کے فطری تقاضے کے باوجود لینن نے اپنی زندگی میں اس سلسلہ میں کوئی مضبوط قدم نہیں اٹھایا اس کے لئے اسٹالین جیسے ظالم و جابر اور سنگ دل حکمران کی ضرورت تھی جو زمین کو کسان کی انفرادی ملکیت سے نکال کر اجتماعی ملکیت میں لانے کے سوشلسٹ خواب کو شرمندہ تعبیر کر سکتا تھا۔ اسٹالین کے علاوہ سارے سوشلسٹ اسے سوشلزم کا نہایت نازک پہلو سمجھ کر اس سمت میں چلنے کی کوشش کرنے والوں کو انتہائی پھونک پھونک کر قدم رکھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ چنانچہ اشتراکی روس کی ماسکو میں چھپی ہوئی سرکاری تاریخ ”سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی تاریخ“ میں ‏[illegible] لکھا ہے کہ

"لینن نے نشاندہی کی کہ کسانوں کو انفرادی، ذاتی زراعت سے بڑے پیمانہ کی اجتماعی زراعت کے مرحلہ کی طرف لے جانے کا مسئلہ اشتراکی تعمیر میں سب سے زیادہ مشکل اور انتہائی پیچیدہ ہے۔ پھر اس حقیقت نے کہ یہ مسئلہ تاریخ میں پہلی مرتبہ (اشتالین کے عہد میں) حل کیا جا رہا تھا، اسے اور بھی مشکل اور دقت طلب بنا دیا۔ اس (لینن) نے اس پر زور دیا تھا کہ اس معاملہ میں انتہائی احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ کسان اپنے گھر گرہستی کے معاملات سے بہت زیادہ وابستگی رکھتا ہے۔ آر۔ سی۔ پی (بی) کی آٹھویں کانگریس کے "متوسط کسانوں کے معاملہ میں طرزِ رویہ" سے متعلق لینن کا تحریر کردہ ریزولیوشن اس بات پر زور دیتا ہے کہ "اس معاملہ میں غیر ضروری جلدی نقصان دہ ہوگی۔ کیونکہ اس سے متوسط کسانوں کا نئی تبدیلیوں کے خلاف تعصب اور مضبوط ہو جائے گا"۔ فریڈرک اینجلز نے بھی اسی طرح اپنے زمانہ میں نشاندہی کی تھی کہ کسانوں کو اجتماعی زراعت کے طرف لے جانے کے معاملہ میں جلدی نہیں ہونی چاہئیے۔"[1]

اینجلز، لینن اور کمیونسٹ پارٹی یہ سب کے سب مل کر اس معاملہ میں "احتیاط"، "احتیاط" کا بگل کیوں بجا رہے ہیں؟ اگر سوشلزم کا اجتماعی زراعت کا اصول حق، انصاف اور فطرت کے داعیات پر مبنی ہے تو اس پر عمل درآمد کرنے میں سوشلسٹ رہنماؤں کو اس قدر ہچکچاہٹ کیوں ہوتی ہے۔ لینن نے اپنی زندگی میں کیوں اس سے نمٹنے کی کوشش نہیں کی۔ ۱۹۱۷ء میں اقتدار پر آنے کے باوجود مزید ۱۲، ۱۳ سال تک اس مسئلہ کو کیوں التواء میں ڈالا گیا اور کیوں صرف اسی پر اکتفاء کیا گیا کہ بڑے زمینداروں سے زمین لے کر کسانوں کو دے دی جائے۔ لیکن کسانوں سے لے کر اجتماعی ملکیت بنانے میں یہ سارا تامل کیا معنی رکھتا ہے؟ اس لئے کہ یہ سارے رہنما اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ یہ کسان کی فطرت کے خلاف ہے۔ اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی اس خصوصیت کے خلاف ہے جو دنیا کے ہر ملک کے کسان میں پائی جاتی ہے۔ اس معاملہ میں سوشلزم کی کسان سے جنگ گویا فطرت سے جنگ ہے۔ جب سوشلزم کی آمرانہ حکومت اقتدار پر آتے ہی آن کی آن میں ساری صنعتوں کو قومی ملکیت میں لے کر بڑے بڑے سرمایہ داروں کا سر توڑ سکتی ہے اور بڑے بڑے زمینداروں سے زمین چھین کر انہیں نیست و نابود کر سکتی ہے تو آخر غریب کسان سے اس قدر مضبوط حکومت کو گھبرانے کی کیا ضرورت ہے؟ اس کی زمین چھیننے میں یہ لیت و لعل کیوں؟ یہ اس لئے کہ اگر کسان نے کام نہ کرنے کی قسم کھائی تو سارے بھوکوں مر جائیں گے۔ اگر مارے باندھے اس سے کام لیا بھی گیا تو وہ کبھی دل سے کام نہیں کرے گا۔ جس کے نتیجہ میں زرعی میدان میں ترقی کی رفتار انتہائی سست پڑ جائے گی اور اگر وہ بغاوت پر اتر آئے تو حکومت کا تختہ ہی الٹ جائے گا۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ اجتماعی ملکیت میں زمین کو لینے کے بعد کی تاریخ، خواہ وہ چین کی ہو یا روس کی، یہی بتاتی ہے کہ زرعی پیداوار کی رفتار ترقی کبھی بھی تسلی بخش نہیں رہی۔ کسان سے زمین چھیننا گویا اس کی فطرت سے کام کرنے کا داعیہ چھین لینا ہے۔ جب کسان میں کام کا داعیہ ہی نہ ہو تو زرعی پیداوار بھی تسلی بخش کیسے ہو سکتی ہے۔ اشتراکیت میں بڑے بڑے اجتماعی فارم بنا کر خواہ کتنی ہی مشینیں استعمال کر لی جائیں، کتنے ہی ٹریکٹر کیوں نہ چلائے جائیں۔ لیکن بقول ایک زرعی معاشیات کے ماہر راے لیرڈ (Royd Laird) کے

---

[1] History of the Communist Party of the Soviet Union, p. 442.
2nd Rev. Ed. Moscow.

ہو مشینوں کے ذریعہ غلہ اور اناج کے پودوں کی تخم ریزی بڑی عمدہ چیز ہے۔ کوئی مشین ایسی نہیں ایجاد ہو سکی کہ جو کسی کھیت کو گھاس پھوس اور غیر ضروری پودوں سے ایسے صاف رکھ سکے۔ جیسے کہ ایک انسان اپنی درانتی سے رکھ سکتا ہے۔ میکانیکی تخم ریزی سے انسانی محنت ضرور بچتی ہے۔ لیکن کوئی مشین اس قدر مستعد اور کارکردگی میں طاق نہیں ہو سکتی جتنا کہ ایک جاپانی کسان جو اپنی زمین کے ایک ایک انچ حصہ پر گھوم پھر کر ہر بچی کچی جگہ پر بیج بوتا جاتا ہے ... ۹۶

یعنی بڑے پیمانہ کی صنعتوں میں تو یہ ممکن ہے کہ خود کار مشینوں کی ایجاد سے مزدوروں کی ضرورت کم سے کم ہوتی چلی جائے۔ لیکن زراعت کی ترقی محض مشینوں کے ذریعہ نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ ان مشینوں کے ساتھ ساتھ کسان بھی اپنا خون پسینہ ایک کرنے کے لئے آمادہ نہ ہو۔ صنعت اور زراعت کی ترقی کا معاملہ بالکل الگ الگ ہے۔ صنعت میں بھی مزدور کی بے دلی سے کام پر اثر ضرور پڑتا ہے۔ لیکن صنعت میں مزدور اتنا ناگزیر نہیں ہوتا جتنا کہ زراعت میں کسان۔ کسان میں اگر کام کرنے کا داعیہ ختم ہو جائے تو زرعی پیداوار میں ترقی بھی زیادہ نہیں ہو سکتی۔ اور ایک سوشلسٹ نظام میں مزدور سے زیادہ کسان ہی وہ عنصر ہے جو بنیادی طور پر مجروح ہوتا ہے۔ نہ صرف اس کے خوابوں کی دنیا منتشر ہو جاتی ہے۔ بلکہ اس کی روزمرہ کی زندگی بھی اس کے لئے اجیرن ہو جاتی ہے۔ اپنے ذاتی کھیت پر کام پر جانے نہ جانے کے اوقات کسان خود اپنی مرضی اور سہولت سے طے کرتا ہے۔ وہ ایک شہری مزدور کی طرح گھڑی دیکھ کر دوڑ کر کھیت پر جانے اور گھڑی دیکھ کر واپس آنے کا عادی نہیں ہوتا۔ لیکن سوشلزم اس کا سب کچھ چھین کر بھی اس سے سب کچھ کروا کے رہتا ہے۔

روس کا تجربہ، زمینداری اور اسلام

سوشلزم کی تاریخ میں روس نے زمینوں کو اجتماعی ملکیت میں لینے کا جو پہلا تجربہ کیا ہے، اس کی روشنی میں ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ زمینوں کو قومی ملکیت میں لینے کے نتائج کیا ہوتے ہیں۔ ۱۹۱۷ء میں برسر اقتدار آتے ہی روس کی اشتراکی حکومت نے ایک طرف صنعتوں اور دوسری طرف ساری زمینوں کو اصولی طور پر قومی ملکیت میں لے لیا، لیکن عملاً ان زمینوں کو کسانوں کی انفرادی ملکیت میں رہنے دیا گیا۔ جو زمینیں چھینی گئیں وہ بڑے بڑے زمینداروں اور امیر و خوشحال کسانوں سے جو (چھوٹے زمیندار) کہلاتے تھے لی گئیں۔ یہ کولاکس روس کے زرعی نظام کی مرکزی ہستی تھے۔ یہ لوگ فن زراعت کے بھی ماہر تھے۔ اور غلہ کی تجارت کے بھی۔ اگرچہ کہ اس وقت تک ان میں سے اکثریت کو زراعت کی جدید ٹکنیک سے زیادہ واقفیت نہ تھی۔ لیکن برسہا برس کے تجربہ سے انہیں یہ پتہ تھا کہ ان کی زمین میں پیداوار کی زیادہ سے زیادہ مقدار حاصل کرنے کے لئے کیا کیا تدابیر اور احتیاطیں کرنی ضروری ہوتی ہیں۔ چنانچہ اشتراکیت نے برسر اقتدار آتے ہی زمینداروں اور کولاکس کو ختم کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ بڑی بڑی زمینداریاں تو فوراً ختم کر دی گئیں اور کولاکس میں سے بھی اکثر و بیشتر کو ختم کر دیا گیا۔

جہاں تک کہ بڑی بڑی زمینداریوں کا تعلق ہے۔ ان کی تاریخ دیکھی جائے۔ تو اکثر اس لئے وجود میں آئی تھیں کہ نادر دوس کی خدمات کے عوض میں کچھ لوگوں کو کسانوں پر حکمران بنا دیا گیا تھا۔ نظام بادشاہت کی خرابیوں میں ایک یہ بھی ہے کہ بادشاہ خود عوام کی گردنوں پر سوار ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے لئے بہادرانہ خدمات انجام دینے والے طبقہ کو بھی عوام کی گردنوں پر مسلط

---

۹۶ Slavic Review, Oct. 1961, pp. 454-65.

کر دیتا ہے۔ جس طرح استعماری طاقتیں اپنے مفاد کے لئے پسماندہ ممالک کے عوام کا ناجائز استحصال کرتی ہیں اسی طرح نظام
بادشاہت میں مصنوعی طور پر بڑے بڑے زمیندار پیدا کئے جاتے ہیں جو مفت میں کچھ لوگوں کی گردنوں پر سوار ہو جاتے ہیں
عوام کو تابع رکھنے کا یہ ایک ایسا حربہ ہے کہ جسے ہندوستان میں خود انگریزوں نے بھی استعمال کیا۔ مشرقی پاکستان میں مسلم
اکثریت کے علاقوں میں ہندوؤں کو لاکر انہیں مسلمان کسانوں کی گردنوں پر اختیارات دے دیئے گئے کہ زمین خواہ کسان کی انفرادی
ملکیت ہو لیکن زمیندار کو ان سے خراج وصول کرنے اور دوسرے بہت سارے حقوق عطا کئے گئے۔ روس میں بھی ایسی زمینداریاں کم
ہی تھیں کہ جن میں ان زمینداروں نے اپنی محنت و جدوجہد اور تجربے سے زمینوں کو استعمال کرکے اور اس سے کمائی ہوئی دولت
سے مزید زمینیں خرید خرید کر اپنی زمینداری کو وسیع کیا ہو۔ اصل میں روس میں زار الیگزنڈر دوم کے زمانہ تک نیم غلامی مسلط
تھی۔ ۱۹ فروری ۱۸۶۱ء میں الیگزنڈر دوم نے اس میں کچھ اصلاحات کیں[۴۶] جس میں کسانوں کو بھی کچھ برائے نام حقوق دیئے
گئے لیکن اس کے باوجود کسانوں میں زمینداروں کے ظلم و ستم کے خلاف تحریک چلی۔ جو طاقت کے زور سے دبا دی گئی۔ اس لئے اس
طرح نظام بادشاہت کے سبب عوام کی گردنوں پر سوار زمینداروں کو ختم کرنے کے عمل کو ہم بہت زیادہ قابل تنقید نہیں سمجھتے
اگر کوئی اسلامی حکومت بھی کہیں بھی آئے گی تو وہ کسی ملک کی موجودہ بڑی بڑی زمینداریوں کی تاریخ کا جائزہ لے گی ان حضرات
کی زمینداریاں کس طرح وجود میں آئی ہیں۔ اکثر و بیشتر بلکہ ۹۹ء۹ فی صد زمیندار ایسے نکلیں گے۔ . . . .
. . . . . . جنھوں نے عوام اور ملک و دطن کے مفادات کے ساتھ غداری کرکے وقت کے برسر اقتدار گروہ کا ساتھ دیا
اس لئے جب بھی کبھی کوئی اسلامی حکومت ایسے ممالک میں آئے گی تو وہ عوام سے دغابازی اور غداری کرکے بیرونی طاقتوں یا
ظالم و جابر ڈکٹیٹروں اور بادشاہوں کا ساتھ دینے والے میر جعفر اور میر صادق جیسے خاندانوں کی زمینداریاں چھین کر ان کی
منصفانہ تقسیم کرے گی۔ اس لئے اگر اشتراکی کسی ملک میں اس طرح کا ایک اچھا کام کرتے ہیں تو وہ اس معاملہ میں بھی اسلام کے
عدل و انصاف پر مبنی معاشی اصولوں سے بازی نہیں لے جا سکتے۔

اسلام، اشتراکیت کی طرح اندھی لاٹھی چلانے کا قائل نہیں۔ وہ زمینداروں اور سرمایہ داروں کو ایک طبقہ فرض کرکے ان
سب کو مٹا ڈالنے کا قائل، نہیں۔ اگر انسانوں کے درمیان کسی نوعیت کے طبقات کے وجود کو اسلام تسلیم کرتا ہے تو وہ امارت
و غربت کی بنیاد پر نہیں بلکہ نیک و بد اعمال کی بنیاد پر۔ نہ کوئی شخص محض امیر ہونے کی بنا پر بڑا ہوتا ہے اور نہ کوئی محض غریب ہونے کی
وجہ سے نیک۔ اچھے اور برے لوگ امیروں میں بھی ہوتے ہیں اور غریبوں میں بھی۔ سارے مزدوروں اور کسانوں کو فرشتہ اور
سارے زمینداروں اور سرمایہ داروں کو شیطان فرض کر لینا انتقام کے سفلے جذبات کی تسکین کے لئے تو ٹھیک ہو سکتا ہے لیکن
ایسا مفروضہ نہ حقائق کی کسوٹی پر صحیح ہے نہ عدل و انصاف کے تقاضے کے نقطۂ نظر سے۔ اسلام میں مجرموں کو سنگین سزائیں دینے
کے قوانین ہیں۔ لیکن یہ سزائیں انتقام کے جذبے سے مغلوب ہو کر نہیں، بلکہ عدل و انصاف کے قانونی تقاضوں کو پورا کرکے دی جا سکتی
ہیں۔ اگر کسی معیشت میں ظالم و جابر، غریبوں کا خون چوسنے والے زمیندار اور سرمایہ دار موجود ہوں تو قانون کے دروازے کھلے

---

[۴۶] A Short History of the U. S. S. R., ed. Moscow, p. 223.

ہیں کہ انہیں قرار واقعی سزائیں دی جائیں خواہ وہ کتنی ہی لائق کیوں نہ ہوں۔ ان کی دولت و ثروت یا امارت انہیں نہیں بچا سکتی وہ اپنی ساری امارت کے باوجود ذلیل، سزا یافتہ مجرم ٹھہریں گے۔

چنانچہ روسی اشتراکیت نے اپنے اس اندھی لاٹھی گھمانے کے اصول پر ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد سارے کولاکس (Kulaks) کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ ان میں ظاہر ہے کہ اچھے اور برے دونوں ہی قسم کے لوگ تھے۔ یہ کولاکس زار روس کی خدمات کے سبب بڑے بڑے زمینداروں کی طرح وجود میں نہیں آئے تھے۔ یہ دراصل غریب کسان ہی تھے، جو اپنی محنت، لیاقت اور جفاکشی سے خوشحال بن گئے تھے۔ ان کی یہی خوشحالی وہ جرم تھی، جس کے سبب وہ اشتراکیت کے غضب کا شکار ہوئے۔

سوشلزم کے اس اصول کو سمجھنے کا ایک دوسرا نقطہ نظر یہ ہو سکتا ہے کہ ایک انجینیر سے اس کی مشینیں اس لئے چھین لی جائیں کہ وہ امیر ہے اور ایک جاہل مستری یا میکانک کو اس لئے دے دی جائیں کہ وہ غریب ہے۔ یا ایک مریض کو مستند ڈاکٹر کے پاس سے اس لئے نکالا جائے کہ ڈاکٹر امیر ہے اور اس مریض کا مرض دور کر کے مزید امیر بن جائے گا۔ اس مریض کو ایک عطائی یا نیم حکیم کے حوالے کر دیا جائے کہ وہ عطائی بے چارہ غریب ہے۔ چنانچہ اشتراکی روس کی کمیونسٹ پارٹی کی تاریخ میں اس کا کھلے بندوں اعتراف کیا گیا ہے کہ ان کولاکس کو ختم کرنے کے نتیجے میں پیداوار بہت گھٹ گئی۔ ۱۹۲۶ء میں اناج کی کل پیداوار اشتراکی انقلاب سے پہلے اور جنگ عظیم اول سے پہلے ۱۹۱۳ء کی پیداوار کے برابر بھی نہ رہی۔ اور اس پر مزید یہ کہ ۱۹۱۳ء میں کل پیداوار کا ۲۶ فی صد حصہ مارکیٹ میں برائے فروخت آتا ہے اور اب ۱۹۲۷ء میں گھٹ کر ۱۳ء۳ فی صد ہو گیا۔ پہلے تو کل پیداوار ہی کم اور اس میں سے بھی شہری ضروریات کے لئے فروخت ہونے والا غلہ اس کا بالکل آدھا ہو جانے جو اشتراکیت کا "بابرکت" نظام آنے سے قبل تھا۔ کیا خوب نظام معیشت ہے کہ جس کے اختیار کرنے سے پیداوار اتنی بھی نہ رہے جو زمینداری کے فرسودہ نظام میں تھی۔ اعتراف کیا جاتا ہے کہ:

"مارکیٹ میں غلہ کی کمی اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ انقلاب اکتوبر (اشتراکی انقلاب) نے ساری زمینداریاں ختم کر دی تھیں اور کولاکس کے کھیتوں کی تعداد میں بھی خاصی کمی کر دی تھی۔ جنگ سے پہلے کولاکس کے کھیت اور زمینداریاں غلہ کی پیداوار کا سب سے بڑا ذریعہ تھیں۔ مارکیٹ کے برائے فروخت غلہ کا ۲۲ فی صد حصہ زمینداریوں سے آتا تھا اور پچاس فی صد حصہ کولاکس کے کھیتوں سے یعنی ۴۵ لاکھ ٹن زمینداریوں سے اور ۱۰۵ لاکھ ٹن کولاکس کے کھیتوں سے لیکن ۱۹۲۷ء میں کولاکس کے کھیتوں سے مارکیٹ میں آنے والا غلہ صرف ۲۰ لاکھ ٹن سے کچھ زائد رہ گیا تھا۔ اشتراکی عہد میں غریب اور متوسط کسانوں کے کھیت غلہ کی پیداوار کا اصل ذریعہ ہیں۔ ۱۹۲۷ء میں ان کی تعداد ۲۶۰ لاکھ تھی۔ جب کہ جنگ عظیم اول سے قبل صرف ۱۰۰ لاکھ تھی۔ لیکن ان کی پیداوار کا صرف ۱۱ فی صد حصہ مارکیٹ میں برائے فروخت آتا تھا۔ اس وقت حکومتی اور اجتماعی ملکیت کے کھیتوں سے صرف ۱۳ لاکھ ٹن غلہ مارکیٹ میں آتا تھا جو بازار میں بکنے والے کل غلہ کا صرف ۶ فی صد تھا۔ اس وقت غلہ کی پیداوار کی یہ حالت ملک کی ضروریات کے لئے ناکافی تھی جو شہری آبادیوں اور محنت کاروں کے بڑھنے کے سبب بڑھتی جا رہی تھی۔[۵۹]

---

۵۹ History of the Communist Party of the Soviet Union, p: 414. (Moscow Ed.)

تری صنعت میں زبردست کامیابی اور زراعت میں یہی کمی اور کوتاہی — یہ تھی وہ معاشی حالت جبکہ (کمیونسٹ) پارٹی کی پندرھویں کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا ...."[۲۱]

کہاں تو کولاکس مارکیٹ کے لئے ۵۰ فی صد غلہ فراہم کرتے تھے اور جب زمین ان سے چھین لی گئی تو انہی زمینوں سے مجموعی پیداوار اور بھی کم ہوئی اور مارکیٹ کے لئے فراہم ہونے والا غلہ بھی گھٹ کر صرف ۱۱ فی صد رہ گیا۔ اس صاف بیانی کے بھی کیا کہنے کہ پیداوار میں کمی بھی مانتے ہیں اور اس کی وجہ بھی مانتے ہیں کہ زمین چھیننے کے سبب یہ کمی ہوئی۔ لیکن اس ہٹ دھرمی کے بھی کیا کہنے کہ زمین چھیننے کو پیداوار میں کمی کا اصل سبب ماننے کے باوجود زمین چھیننے کی اس حرکت کو غلطی ماننے کے لئے تیار نہیں۔ پھر اس علاج کے بھی کیا کہنے کہ پیداوار کی اس کمی کو دور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جو غلطی ایک بار کی تھی اسے اور پکے جاؤ یعنی یہ کہ اور زمین چھین لو۔ اب تک زمیندار کولاکس سے چھینی تھی تو اب اس غریب کسان سے بھی زمین چھین لو۔ یعنی جس شجر ممنوعہ کے چکھنے سے سزا ملی تھی اس سزا سے بچنے کا راستہ یہ ہے کہ اس شجر ممنوعہ کو اور زیادہ کھاؤ۔ اسی الٹی منطق کے نتیجہ میں کمیونسٹ پارٹی کی پندرھویں کانگریس نے فیصلہ کیا کہ اب دوسرے مرحلہ میں داخل ہونا ضروری ہو گیا ہے۔ یعنی پہلے زمیندار سے زمین چھین کر غریب کسان کو دی تھی تو اب اس مرحلہ پر غریب کسان سے بھی چھین کر اجتماعی ملکیت بنا کر سوشلزم کے مقصد کو پورا کیا جائے تاکہ زراعت جو صنعت سے پیچھے رہ گئی تھی اسے آگے بڑھایا جا سکے۔ یہ نہیں سوچا کہ اب تک تو صرف زمیندار اور کولاکس سے چھینی تھی لیکن کسان تو خوش تھے اب اگر ان سے بھی زمین چھین لیں گے تو وہ بھی مخالفت پر اتر آئیں گے اور پیداوار کی کمی دور ہونے کی بجائے مزید شدید تر ہو جائے گی۔ اس کا نتیجہ عملاً یہ ہوا کہ پیداوار تو پیداوار، غلہ اور اناج تو کیا، اچھے خاصے مویشیوں سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ کسانوں نے سوچا کہ ہماری مرغی اور بیل بھی حکومت لے لے گی اور ہمارے ہاتھ سے تو یہ چیزیں جاتی ہی ہیں تو یہ ہم حکومت کو کیوں دیں، ان کو ذبح کر کے جتنا کھا سکتے ہیں کھائیں، بیچیں اور باقی کو مار کر پھینک دیں تاکہ یہ حکومت کے ہاتھ میں نہ جانے پائیں۔ چنانچہ ماسکو کی چھپی ہوئی کمیونسٹ پارٹی کی سرکاری تاریخ کا بیان یہ ہے کہ:

"طبقاتی دشمنوں نے کسانوں کو ورغلایا کہ ان کے کھیت ان سے چھین کر اجتماعی ملکیت (collective) سے تبدیل ہونے سے قبل وہ اپنے سارے مویشیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیں کیونکہ ان میں یہ افواہ پھیلائی گئی کہ ان کے مویشی ان کے ہاتھ سے تو بہرحال چھین ہی لیے جائیں گے۔ کولاکس کے پھیلائے ہوئے اس چکر میں آ کر بہت سے کسانوں نے اپنی گائیں، سور، بھیڑ، بکریاں اور مرغیاں سب مار ڈالیں، ۱۹۲۹-۳۰ء کے معاشی سال میں ملک میں مویشیوں کی تعداد میں ۱۴۶ لاکھ کے قریب کمی آ گئی۔ ملک کے ایک تہائی سور اور ایک چوتھائی بھیڑ بکریاں کم ہو گئیں۔ یہ تمام مویشی ۱۹۳۰ء کے صرف دو مہینوں فروری اور مارچ میں مار ڈالے گئے۔ زمینوں کو اجتماعی ملکیت میں لینے کے سلسلہ میں جو کچھ غلطیاں ہوئیں ان کے نتیجہ میں اور کولاکس اور ان کے چیلے چانٹوں کی مخالفانہ سرگرمیوں کی وجہ سے اشتراکی روس میں مویشیوں کی دولت کا ایسا زبردست نقصان ہوا کہ جس کی تلافی طویل عرصہ تک نہ ہو سکی۔"

شو کی طاقت کے دشمنوں نے یہ سمجھا کہ زمینوں کو اجتماعی ملکیت میں لینے کے سلسلہ میں جو زیادتیاں اور غلطیاں ہوتیں

---

۲۱ ایضاً صفحہ ۴۴۱

۲۲ ایضاً صفحہ ۶۶۴ - ۶۶۵

میں ان سے کسان سخت برہم ہوں گے اور مشتعل ہو کر سوویت کے خلاف عوامی بغاوت کریں گے .... کہیں کہیں وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے کہ کسانوں کو سوویت کے خلاف اقدامات پر اکسائیں۔

دائیں بازو کے موقع پرست عناصر نے بھی اسی طرح ان مشکلات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جو اجتماعی ملکیت کے کھیت قائم کرنے کی تحریک سے پیدا ہوئی تھیں انہوں نے اجتماعی ملکیت کے سلسلہ میں (کمیونسٹ) پارٹی کے اقدامات کو سخت طعنوں کرنے کی کوشش کی اجتماعی ملکیت کے کھیت قائم کرنے میں جو غلطیاں ہوئیں ان سے اجتماعی ملکیت کی تحریک بدنام (قدغن) قرار پانے لگی اور سوشلسٹ تعمیر کے سارے منشا ہی کو کمزور کرنے لگیں۔ ان سے یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ محنت کاروں اور کسانوں کا اتحاد پارہ پارہ ہو جائے اور پرولتاری ڈکٹیٹر شپ کی جڑیں اکھڑ جائیں۔

فروری ۱۹۳۰ء کے اواخر میں اجتماعی ملکیت کی تحریک میں کی گئی غلطیوں کے نتیجے میں کسانوں کی عظیم اکثریت کی طرف سے عوامی سطح پر جس غم و غصہ کا اظہار ہوا اس کی خطرناک علامتیں ملک کے بیشتر علاقوں میں نظر آنے لگیں۔ پارٹی کی مقامی شاخوں کی طرف سے عام کسانوں کے جذبات و احساسات اور رویہ کے متعلق جو رپورٹیں موصول ہوئیں وہ اس قدر چونکا دینے والی تھیں کہ پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے زمین چھین کر اجتماعی ملکیت کے کھیت بنانے کے سلسلہ میں کی گئی غلطیوں کے فوری تدارک کے لئے کئے۔

اس ساری تباہی و بربادی کی وجہ یہ قرار دی گئی کہ "اسٹالین نے کسان کی اس قوت کا صحیح اندازہ نہ لگایا جو اس میں اپنی انفرادی ملکیت کی چھوٹی سی زمین اور اپنے گھرانہ سے لگاؤ کی شدت کی وجہ سے تھی" اور ہم یہ کہتے ہیں کہ صرف اسٹالین نہیں بلکہ ساری سوشلسٹ تحریک اس قوت کو ماننے سے انکار کرتی ہے۔ اسٹالین کا قصور صرف اتنا ہے کہ اس نے اس اشتراکی پروگرام کو سختی اور قوت کے ساتھ نافذ کیا اور اسٹالین ظالم و جابر بنا تو اس لئے کہ سوشلزم کے "پرولتاری ڈکٹیٹر شپ" کے اصول نے اسے ڈکٹیٹر بننے کا موقعہ دیا۔ پھر سوشلزم ہی نے اسے بتایا کہ اگرچہ کسان سے اس کی زمین چھیننا کسان کو ضرور ناگوار ہوگا، لیکن کسان کی ناگواری کی پرواہ کئے بغیر اس کی زمین بہرحال اجتماعی ملکیت میں لینا ہے۔

یہ تھا وہ تجربہ جو روس میں کیا گیا۔ اس کے نتائج کی تصویر مکمل نہ ہوگی۔ اگر ہم یہ بات بھی سامنے نہ لے آئیں کہ جن کسانوں کی ہمدردی کا سوشلزم دم بھرتا ہے انہوں نے شروع ہی سے اشتراکی حکومت کے ساتھ تعاون نہیں کیا۔ جیسے ہی انہیں اجتماعی ملکیت کے تصور کا پتہ چلا، انہوں نے نہ صرف یہ کہ مویشی مار ڈالے۔ بلکہ حکومت کو جس غلہ اور اناج کی سخت ضرورت تھی وہ بھی چھپا کر رکھ لیا اور حکومت کو قیمت لے کر بھی دینے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ چنانچہ روسی کمیونسٹ پارٹی کی اسی تاریخ میں جو سرکاری طور پر لکھی گئی ہے، کہا گیا ہے کہ :۔

> "کولاکس، جنہوں نے "نئی معاشی پالیسی" کے تحت دوبارہ قدم جما لئے تھے اور جن کے پاس غلہ کی وافر مقدار میں موجود تھیں، حکومت کو اس کی مقرر کردہ قیمتوں پر غلہ فروخت کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے ان متوسط کسانوں کو ڈرایا دھمکایا جنہوں نے اپنے غلہ کی مقدار کو حکومت کے ہاتھوں بیچا اور اس طرح انہوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ حکومت کی اجتماعی ملکیت کے فارم بنانے کی کوشش کو زک پہنچائیں۔ انہوں نے اجتماعی ملکیت کے کھیتوں کو سبوتاژ (sabotage) کیا۔ غلہ پہنچانے کے مقامات کو آگ لگا دی، اور پارٹی اور سوویت کے عملہ اور افسران کو قتل

علاقوں میں بے دھڑک قتل کرنے لگے"...[۶۲]

قتل و غارت گری تک نوبت نہ پہنچتی تو اور کیا ہوتا۔ جب کسان کی فطرت سے جنگ کی جائے گی تو یہی نتیجہ سامنے آئے گا۔ کسان سے زمین چھین کر اجتماعی ملکیت میں لینے کا روس کا تجربہ خود سوشلسٹ تحریک کی ساری تاریخ کے آئینہ میں ایک ناکام تجربہ ہے اور اس میں افریقہ اور ایشیا کے کسانوں اور عوام کے لئے کوئی جاذبیت نہیں ہو سکتی۔

چین کا تجربہ اور ثقافتی انقلاب

لیکن اشتراکی چین نے بھی روس کے تجربہ سے کوئی سبق نہیں لیا اور خود بھی اپنے ہاں اسے دہرایا۔ اگر اس سے کوئی سبق لیا بھی تو یہ کہ کسان کی زمین چھین کر اجتماعی ملکیت بنانے کا کام زیادہ ہشیاری اور چابکدستی سے کرنے کا ہے نہ کہ لٹھ چلانے کا چنانچہ مسٹر ایکسٹین لکھتے ہیں کہ اشتراکی چین کی پالیسی بنانے والے سوویٹ روس کی (collectivisation) زمین کی اجتماعی ملکیت کی کوششوں کی ناکامی سے بخوبی واقف تھے اس لئے فکر مند تھے کہ ان کی کوششیں بھی ویسی ہی ناکامی کا منہ نہ دیکھنے پائیں۔ جیسے ہی انہوں نے زرعی اصلاحات کر کے زمینداروں کی زمین کسانوں میں تقسیم کی تو فوراً ہی اس کے ساتھ ساتھ ہی پیداوار کی امداد باہمی کے ادارے مختلف جگہوں پر مختلف اقسام کے تشکیل دیئے ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ ان کسانوں کو (جنہیں نئی نئی زمینیں دی تھیں) اپنی پوزیشن مضبوط کرنے دینا نہیں چاہتے تھے چین کی پالیسی بنانے والوں نے یہ ضروری سمجھا کہ جو زمینیں کسانوں کو دی گئی تھیں انہیں کسی نہ کسی شکل میں جلد واپس لیا جائے۔ قبل اس کے کہ کسانوں کی معاشی حالت ان زمینوں سے اتنی بہتر ہو جائے کہ پھر ان سے چھین کر اجتماعی ملکیت میں لانے کے لئے طاقت کے استعمال کی نوبت آئے۔ اسی وجہ سے اشتراکی لیڈر شروع ہی سے مختلف قسم کی عارضی زرعی تنظیمیں بناتے رہے تاکہ جب ان کی انفرادی ملکیت کی زمینوں کو مکمل طور پر اجتماعی ملکیت میں لینے کا وقت آئے تو اس وقت کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے (اور کسان شروع ہی سے اس کے عادی ہو جائیں)

دیہاتی علاقہ کا وہ واحد طبقہ جو ان اقدامات کی مخالفت کرنے کی قوت اور داعیہ رکھتا تھا، یعنی بڑے زمیندار انہیں پہلے ہی جسمانی طور پر ٹھکانے لگا دیا گیا تھا۔ خاص طور پر اس مہم کے دوران جو ۱۹۵۱ء میں مخالفین انقلاب /counter-revolutionaries/ کے خلاف چلائی گئی۔ پھر کولاکس (Kulaks) کی طرح کسانوں کو خوشحال و امیر بھی بننے نہیں دیا گیا کہ ایسا کوئی طبقہ وجود میں آ سکتا ......حقیقت یہ ہے کہ چینی ترکیبوں کے اثرات کسانوں کے محرکات پر کچھ ایسے رہے کہ کسان خود اس معاملہ میں احتیاط برتتے تھے کہ وہ بہت زیادہ پیداوار نہ کریں، نہ ہی بہت زیادہ مویشی رکھیں اور نہ ہی زراعتی آلات ہی زیادہ رکھیں تاکہ انہیں "امیر کسان" کی صف میں شمار کر کے پکڑ نہ لیا جائے"[۶۳]

ان تمام ترکیبوں کے ساتھ ساتھ پھر کسانوں کو شروع ہی سے یہ دھوکہ دیا گیا کہ ملکیت تو تمہاری ہی ہے۔ لیکن ہم صرف پیداوار بڑھانے کے لئے تمہارے اشتراک عمل و تعاون کے خواہاں ہیں تاکہ بڑا کھیت ہو تو تم سب کے لئے فائدہ مند ہو۔ ظاہر ہے کہ اگر کسان کی اپنی زمین پر ملکیت متاثر نہ ہو رہی تو وہ پیداوار بڑھانے کے لئے کیوں تعاون نہ کرے گا۔ پاکستان میں اگر اسلامی معاشی نظم کو

---

[۶۲]

[۶۳] Communist China's Economic Growth by Alexender Eestein, 1966, p. 78, 79.

ہو تو ہم وہاں کے لئے بھی یہی بہتر سمجھتے ہیں کہ کسانوں کی انفرادی ملکیت کو متاثر کئے بغیر امداد باہمی کے ادارے قائم کئے جائیں تاکہ نسبتاً زیادہ بڑی زمین کے پلاٹ پر جدید مشینوں اور زراعت کے فنی اصولوں کو استعمال کر کے پیداوار بڑھائی جا سکے۔ امداد باہمی کے ادارے فی نفسہٖ اپنے اندر کوئی برائی نہیں رکھتے۔ بلکہ برائی تو اس میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ کسان کی زمین پر اس کی انفرادی ملکیت کو ختم کر کے اسے اجتماعی ملکیت میں لے لیا جائے۔ چنانچہ پولینڈ زرعی طور پر تمام اشتراکی ممالک کے مقابلہ میں محض اسی وجہ سے کامیاب ہے کہ وہاں سوشلزم کے اس اصول پر عمل نہیں کیا گیا کہ زمین کو انفرادی ملکیت سے نکال کر اجتماعی ملکیت میں لے لیا جائے۔ اس طرح سوشلزم کو ترک کر کے اور اسے بالائے طاق رکھ کر اگر کسانوں اور مالکان زمین کے امداد باہمی کے ادارے قائم کئے جائیں تو وہ ضرور کامیاب ہوں گے۔ یہی ادارے اس وقت ناکام ہو جاتے ہیں جب کہ وہ سوشلزم کے سانچے میں ڈھلتے ہیں۔

چین میں اگرچہ کسانوں کو امیر بننے نہیں دیا گیا اور انہیں دھوکہ میں رکھا گیا کہ ان کی انفرادی ملکیت اصولاً ختم نہیں کی جا رہی ہے لیکن مغالطہ بھلا کب تک چل سکتا تھا۔ جیسے جیسے دن گذرتے گئے کسانوں کی آنکھیں کھلتی گئیں۔ اسی وجہ سے اندر ہی اندر ان میں بے چینی بڑھنے اور پھیلنے لگی۔ یہاں تک کہ خود ماؤزے تنگ کی پارٹی کے اعلیٰ احکام کے اندر بھی کسانوں سے ہمدردی کا رجحان پیدا ہوا جسے ماؤزے تنگ نے اس طرح تعبیر کیا کہ ہماری پارٹی میں بھی ایک ایسا گروہ موجود ہے جو سرمایہ دارانہ رجحانات رکھتا ہے۔ سرمایہ دارانہ رجحانات سے مراد کیا ہے اور ان رجحانات کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں؟ انفرادی ملکیت کے وجود کو سوشلسٹ زبان میں سرمائہ داری کہا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ نام نہاد " سرمایہ دارانہ " رجحان اس قدر مضبوط ہو گیا کہ ماؤزے تنگ کو خود اپنی گوشہ نشینی کی زندگی کو چھوڑ کر میدان میں آنا پڑا۔ ماؤزے تنگ نے دیکھا کہ خود اس کی پارٹی کی اکثریت اس کی پالیسی کی بجائے صدر چین liu shao - chi کی پالیسی کو زیادہ صحیح سمجھتی ہے۔ تب ماؤزے تنگ کی آنکھیں کھلیں کہ پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے۔ وہ محض پارٹی کے بل پر اپنی مرضی نہیں چلا سکتے۔ پھر اپنی ہی پارٹی کے مضبوط عناصر کے خلاف جنگ کرنے کی شکل ماؤزے تنگ کے سامنے کیا باقی رہ گئی تھی؟ ماؤزے تنگ کے لئے یہی ایک چارہ کار باقی رہ گیا تھا کہ وہ پارٹی کے ان عناصر کے خلاف نوجوانوں کے جذبات بھڑکا کر انہیں استعمال کرے۔ ماؤزے تنگ کو پتہ تھا کہ اس بے خدا چین کا خدا نوجوانوں کی نظروں میں وہی ہے چنانچہ ماؤزے تنگ نے وہ ڈرامہ کھیلا جسے "ثقافتی انقلاب" کہا جاتا ہے۔

ثقافتی انقلاب کے اس ڈرامہ کی تفصیلات اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ہمارا مقصد ان کا ذکر نہیں بلکہ صرف اس طرف توجہ مبذول کرانا تھا کہ ماؤزے تنگ نے کیوں یہ ڈرامہ کھیلا؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ یہ ڈرامہ اتنا طویل کیوں ہو گیا؟ اس ڈرامہ کو اب تقریباً دو سال ہونے کو آ رہے ہیں پھر بھی یہ قصہ کیوں نہیں ختم ہوتا۔ اس سے یہی ایک نتیجہ نکلتا ہے کہ جس مقصد کے لئے یہ ڈرامہ شروع کیا گیا تھا وہ ابھی تک پورا نہیں ہوا۔ گویا نہ صرف پارٹی بلکہ چین کے طول و عرض میں ابھی تک ایسے لوگ موجود ہیں جو "سرمایہ دارانہ" روش اختیار کرنا چاہتے ہیں جسے ماؤزے تنگ اور ان کے "سرخ محافظ" ختم کرنا چاہتے ہیں۔ صنعت کار تو سارے ختم ہو چکے ہیں۔ ساری صنعتیں اور تجارت قومی ملکیت میں لے لی گئی۔ زمیندار بھی ختم ہو گئے تو پھر اب "سرمایہ دارانہ" راستہ اختیار کرنے کی گنجائش کہاں باقی رہ گئی ہے؟ انفرادی ملکیت کا کہیں کچھ پتہ چلتا ہے تو وہ کسانوں میں۔ تو گویا یہ سرمایہ دارانہ روش اختیار کرنے والے نہ مزدور ہو سکتے ہیں نہ کاروباری نہ صنعت کار نہ زمیندار۔ صرف کسان ہی ایسا طبقہ رہ جاتا ہے جو اپنی زمین سے بے پناہ محبت رکھنے والا طبقہ ہے جو اپنی زمین کو اپنے

ہی پاس رکھنا چاہتا ہے نہ کہ اجتماعی ملکیت میں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہ سرمایہ دارانہ رجحان رکھنے والا طبقہ کسان اور اس کے ہمدردوں کا طبقہ ہی ہو سکتا ہے۔ کیا یہ طبقہ اتنا مضبوط اور اتنا قوی ہو گیا ہے کہ دو سال سے ماؤزے تنگ کے سرخ محافظ دستے ان کا قلع قمع نہ کر سکے اسکول اور تعلیم بند کر کے بھی ان کو دفع نہ کیا جا سکا۔ جتنی طویل یہ مہم چلے گی اتنا ہی ماؤزے تنگ کی کمزوری ظاہر ہوگی اور یہ ظاہر ہوگا کہ جس چیز کا مٹانا اس انقلاب کا مقصود تھا وہ چیز انتہائی قوی اور مضبوط جڑیں رکھتی ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ روس کے تجربہ کی جس ناکامی سے چینی لیڈر بچنا چاہ رہے تھے اس سے وہ وقتی طور پر تو کسانوں کو مغالطہ دینے کے سبب بچ گئے تھے لیکن بالآخر حقیقت چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے۔"

۱۴۔ سوشلزم زرعی ترقی کی راہ میں زبردست رکاوٹ ہے۔

ہم پہلے یہ دکھا چکے ہیں کہ سوشلزم کسی ملک کی معاشی ترقی کی راہ میں کس طرح رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ اس عمومی معاشی ترقی میں سے صرف زرعی ترقی کو الگ کر کے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس معاملہ میں سوشلزم نہ صرف رکاوٹ ہے بلکہ بہت بڑی اور زبردست رکاوٹ ہے۔ اس کی ایک وجہ تو ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ مزدور کے مقابلہ میں اس نظام میں زیادہ بری گت کسان کی بنتی ہے اس لئے کسان کا کام کرنے کا داعیہ کچھ زیادہ ہی متاثر ہوتا ہے جو زرعی ترقی کی رفتار کو سست کرنے کا بہت بڑا سبب بنتا ہے۔ دوسری طرف کسان کی اہمیت زرعی ترقی میں اس سے کچھ زیادہ ہی ہے جتنی کہ مزدور کی صنعت میں۔ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ مشینیں کارخانوں میں مزدوروں کا نعم البدل کسی حد تک ہو سکتی ہیں لیکن کتنی ہی مشینیں استعمال کر لی جائیں زرعی ترقی میں کسان کی انسانی محنت ازبس ضروری ہے۔ کسان کی صرف محنت ہی ضروری نہیں بلکہ اس کی توجہ اور کام سے دلی لگاؤ بھی ضروری ہے۔ کسان کی اس نسبتاً زیادہ ضرورت و اہمیت کی روشنی میں اس کے کام کرنے کے داعیہ میں سوشلزم کے سبب کمی ہو جانا زرعی ترقی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ اور یہ سب زمین کو اجتماعی ملکیت میں لینے سے ہوتا ہے۔

ایک دوسرا پہلو جو زمین کو اجتماعی ملکیت میں لینے کے سبب زرعی معاملات میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ فیصلے کرنے کا اختیار ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں چلا جاتا ہے جن کا زرعی مسائل میں ماہر ہونا ضروری نہیں ہے اور اگر بالفرض ہوں بھی تو مختلف مقامات کے بدلتے ہوئے حالات سے واقفیت بہت مشکل ہے۔ ایک کسان اپنی زمین کو جتنا بہتر طور پر جانتا ہے اور اس میں کس وقت کیا اور کیسے اگانا چاہئے اور کیا کیا ممکن تدابیر اختیار کرنی چاہئیں اس کے مقابلہ میں ایک اجتماعی فارم کا منیجر اپنے سارے عمومی علم کے باوجود کسی خاص مقام کی خاص زمین اور اس کے حالات کے متعلق نسبتاً کم واقفیت رکھتا ہے۔ جاپان کی زرعی ترقی میں یہ ایک بہت بڑا عامل ہے۔ جاہل کسان کے بیٹوں میں سے کوئی ایک بیٹا عام طور پر زرعی کالج کا سند یافتہ اور زرعی معاملات میں خصوصی تعلیم حاصل کر کے شہر میں رہنے کی بجائے اپنے آباؤ اجداد کی زمین پر کام کرتا ہے۔ وہ اپنے کتابی علم کو اپنے والد کے عملی علم و تجربہ کے ساتھ ملا کر خود نئے نئے تجربے کر کر کے دیکھتا ہے کہ وہ اپنی زمین سے زیادہ سے زیادہ پیداوار اور زیادہ سے زیادہ نفع آور پیداوار کس طرح حاصل کر سکتا ہے۔ اس طرح اس زمین سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر وہ نہ صرف اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو فائدہ پہنچاتا ہے بلکہ ملک کی زرعی ترقی اور مجموعی معاشی ترقی میں بہت بڑا رول ادا کرتا ہے۔ اس طرح ایک ایک فرد کے ذریعہ اور ایک ایک انچ زمین کے بہترین استعمال

ہی سے ملک کی مجموعی ترقی کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ سوشلزم میں یہ مسئلہ الٹ جاتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ ایک ایک فرد کام سے جی چرانے والا اور بے گار سمجھ کر مارے باندھے کا کام کرنے والا بنتا چلا جاتا ہے بلکہ ایک ایک انچ زمین بھی اپنی پوری پوری پیداآوری صلاحیت کو بروئے کار نہیں لانے پاتی۔ ایک آزاد نظام میں اپنی زمین کے متعلق فیصلہ کرنے والا اس زمین کا مالک کسان ہوتا ہے جو زمین سے قریب ترین عنصر ہوتا ہے۔ سوشلزم جب زمینوں کو اجتماعی ملکیت میں لے لیتا ہے تو اس عنصر کے فیصلہ کا اختیار تو سو فی صدی ختم ہو جاتا ہے پھر اجتماعی فارم کا منیجر بھی سارے فیصلوں کا مجاز نہیں ہوتا۔ وہ صرف چھوٹے موٹے انتظامی معاملات کے اختیارات رکھتا ہے۔ اس طرح اس سیڑھی پر اوپر چڑھتے چلے جایئے تو اس کے سب سے اونچے زینہ پر موجود افراد اصل پالیسی کے مسائل طے کرتے ہیں۔ نیچے والوں کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اس پالیسی کو اپنے اجتماعی فارم میں نافذ کریں۔ یہ پالیسی مختلف صوبوں، مقامات، دیہاتوں اور فارموں کے لئے بالعموم مختلف نہیں ہوتی بلکہ اس میں زیادہ سے زیادہ یکسانیت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو زمین کپاس کے لئے مناسب ہے اس میں چاول اور جو چاول کے لئے مناسب ہے اس میں کپاس کے بیج بوئے جاتے ہیں۔ ملک میں غلہ کی کمی ہے تو زمینات کے بیشتر حصہ میں غلہ ہی غلہ بویا جائے گا خواہ ان ساری زمینوں کے مقامی حالات غلہ کے لئے مناسب ہوں یا نہ ہوں۔ اس طرح چوٹی کے لوگ جو پالیسی طے کرتے ہیں وہ زرعی مسائل سے واقفیت اور اس کے ماہر ہونے کے سبب نہیں بلکہ کچھ سیاسی اور دیگر مصلحتوں کی بنا پر فیصلے کرتے ہیں۔ اور زمینوں سے کہا جاتا ہے کہ تم ہمارے سیاسی فیصلوں کے مطابق پیداوار کرو۔ زمین کہتی ہے حضور ہم تو اس کام کے لائق نہیں جو آپ ہم سے لینا چاہتے ہیں۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ تم اس لیاقت کو پیدا کرنے کی کوشش کرو ملک وملت کو تم سے یہی توقعات وابستہ ہیں۔ اس وقت ہمیں اس چیز کی شدید ضرورت ہے جس کی لیاقت تم میں نہیں ہے۔ پھر چونکہ بیوروکریسی کا ایک پورا نظام اوپر سے نیچے تک موجود ہوتا ہے اس لئے اشتراکی قیادت کے آسمان سے نازل ہونے والے احکامات زمین تک پہنچتے پہنچتے اپنی اصل صورت، شکل، روح اور اہمیت کھو دیتے ہیں کیونکہ انہیں آسمان سے زمین تک پہنچانے والا صرف ایک ہی فرشتہ جبرئیل نہیں ہوتا بلکہ بیوروکریسی کے پیدا کردہ ہزاروں درمیانی شیاطین جن وانس اپنی روح بھی اس میں پھونکتے چلے جاتے ہیں اور یہی بیوروکریسی اشتراکی ڈنڈے کے شہاب کے نور کو دھندلا کر چکی ہوتی ہے۔

اب ہم روس میں اس کی چند مثالیں پیش کریں گے۔ اسٹالن سے پہلے تو زمینیں اجتماعی ملکیت میں نہیں تھیں اور حکومت کسانوں اور کولاکس (KULAKS) سے غلہ اور اناج خریدا کرتی تھی اور ایسی قیمت مقرر کرتی تھی کہ کوئی بھی حکومت کو بیچنے کے لئے تیار نہ ہوتا تھا اور اس جرم میں اس کا سارا غلہ ہی ضبط کر لیا جاتا تھا۔ اس طرح خریداری کی زحمت سے بھی بچے اور مفت بہت کچھ ہاتھ آ گیا۔ زمین جب تک نہیں چھینی تھی کسانوں کو غیر مطمئن کرنے کا یہ نظام موجود تھا۔ اوپر کے بیوروکریٹ جو قیمت مقرر کرتے وہ نیچے والوں کی ضروریات یا مارکیٹ میں اس کی ممکن قیمت کو ملحوظ رکھ کر نہیں بلکہ وہی ملک وملت کے مفاد کا نسخہ پیش کیا جاتا تھا۔ امریکہ اور جاپان میں تو یہ ہوتا ہے کہ کسان اگر مارکیٹ میں فروخت کریں تو انہیں نقصان ہو، اس لئے حکومت زیادہ قیمت پر خرید کر کسانوں کی حالت بہتر رکھنا چاہتی ہے جسے امداد (SUBSIDY) بھی کہا جاتا ہے اور اشتراکی نظام میں بالکل اس کا الٹ ہوا کرتا تھا کہ مارکیٹ میں کسان بیچتا تو نقصان کم ہوتا اور حکومت کو بیچے تو زیادہ۔ یہ شاید اس لئے کہ اشتراکی نظام میں کسانوں سے کچھ زیادہ ہی "ہمدردی" کی جاتی ہے۔ اتنی زیادہ "ہمدردی" کہ کسان اس سے پناہ مانگتا اور بچنا چاہتے ہیں اور حکومت سے چھپاتے ہیں اور اسے بیچنا نہیں چاہتے۔ پھر حکومت کو ان کی پیداوار ضبط کرنی پڑتی ہے۔ اور "کسان دشمن" امریکہ وجاپان جیسے سرمایہ دارانہ ممالک میں کسان، پریس اور سیاسی جماعتیں اور جلسے

اور مظاہرے حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ کسانوں کی پیداوار خریدے اور انہیں مارکیٹ سے زیادہ دام (۱۵۷ ۵ ۵۴ ۱) دے اور
اس معاملہ میں ذرا سی کوتاہی حکومت کرے تو اس کے خلاف سارے ملک میں شور و ہنگامہ بپا کیا جاتا ہے اور چونکہ اس نام نہاد "کسان
دشمن" حکومت کو اگلے انتخابات میں انہیں سے ووٹ حاصل کرنا ہوتے ہیں اس لئے حکومت اپنی "دشمنی" اس طرح دکھاتی ہے کہ کسان
کی پیداوار زیادہ سے زیادہ قیمت پر خریدتی ہے۔ یہ تو گویا کسان سے سرمایہ دارانہ نظام کی "دشمنی" ہوئی اور جو کچھ اشتراکی نظام میں
ہوتا ہے وہ ہے اصل "ہمدردی"۔ کسان کے حق میں اشتراکی "ہمدردی" سے سرمایہ دارانہ "دشمنی" زیادہ مفید ثابت ہوتی ہے۔ یہی وجہ
ہے کہ اشتراکی اوپر سے پالیسی طے کرکے ٹھونستے ہیں اور کسی آزاد نظام میں نیچے سے حکومت کو مجبور کیا جاتا ہے اور اسے بتایا جاتا
ہے کہ اسے کیا کرنا ہے اور حکومت کا اپنا مفاد نیچے والوں کے ووٹوں سے وابستہ ہوتا ہے۔ اس لئے اگر وہ نیچے والوں سے دشمنی
بھی کرے تو اتنی زیادہ نہیں کرتی کہ نیچے والوں کے ووٹ ہی کھو دے اور اشتراکی نظام میں اوپر سے احکامات نازل ہوتے ہیں کہ
کم سے کم قیمت پر خریدو۔ اوپر سے یہ احکام صوبے والوں کے پاس آتے ہیں۔ یہ صوبہ کے حکام اپنی کارکردگی دکھانے کے لئے مزید
کم قیمت پر خریدنا بہتر سمجھتے ہیں۔ پھر اس کے بعد یہ احکام ضلع، تحصیل، دیہات اور اجتماعی فارم تک پہنچتے ہیں۔ اس طرح اشتراکی عرش
معلیٰ سے ان ساتوں آسمانوں کی منزلوں سے گذر کر جب کسان تک قیمتیں پہنچتی ہیں تو وہ اتنی کم ہو چکی ہوتی ہیں کہ ان سے بچنے کے
لئے کسان طرح طرح کی راہِ فرار ڈھونڈتے ہیں لیکن اس اشتراکی وحی کو قبول نہ کرنے کے بعد اس آسمان و زمین کے درمیان
انہیں کوئی جائے پناہ نصیب نہیں ہوتی۔

لینن کے بعد جب اسٹالن برسر اقتدار آیا تو کچھ عرصہ بعد اس نے اس مسئلہ کا حل یہ نکالا کہ سوشلزم کی تعلیمات کے مطابق
کسان سے انفرادی ملکیت کی زمینیں چھین کر اس قصہ ہی کو ختم کریں۔ چنانچہ اجتماعی ملکیت بنانے کے سلسلہ میں جو واردات پیش آئیں اور
کسانوں نے اس کا جس طرح استقبال کیا اس کی کچھ تفصیل ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ لیکن چونکہ یہی اسٹالن کے نزدیک حق تھا اس کی
خاطر اس نے "باطل" کی ساری قوتوں کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اوپر والوں کو کیا پڑی ہے کہ وہ نیچے والوں کی مرضی کا خیال کریں۔ اسٹالن
ان کسانوں اور کولاکس کے ووٹوں کا محتاج نہیں تھا کہ ان کی بھی کچھ سنے۔ ان کی سننے سے زیادہ اپنی ہی کرنا زیادہ صحیح عمل تھا۔ کیونکہ
حق کا علم تو اوپر والوں کو ہوتا ہے نہ کہ نیچے والوں کو۔ چنانچہ اسٹالن نے زمین کو اجتماعی ملکیت میں دینے کی مخالفت کرنے والے کولاکس
میں سے پچاس لاکھ افراد کو نشانہ ظلم و ستم بنایا۔ انہیں اپنے گھروں سے نکال باہر کیا گیا اور اکثر و بیشتر کو قتل و غارت گری اور سزائے
موت کا مستحق ٹھہرایا گیا۔

اسٹالن کے بعد سب سے بڑے اور زیادہ دیر تک حکومت کرنے والے مسٹر خروشچیف تھے۔ اسٹالن نے اجتماعی فارم کو
مشینری وغیرہ سپلائی کی لیکن ان مشینوں کی قیمت ان سے وصول کرنا مناسب نہ سمجھا۔ کیونکہ پھر کسانوں پر بہت زیادہ بار پڑ جاتا اور
ان کے اپنے کھانے کے لئے کچھ نہ بچتا۔ یہ اسٹالن جیسے ظالم و جابر کے خیالات تھے لیکن خروشچیف صاحب اس سے بھی دو ہاتھ
آگے نکلے۔ خروشچیف نے ان مشینوں کی قیمت اجتماعی فارم سے وصول کی۔

Sovies Keizai Nyumon, tran slated by Mr. Sekizwa, p. 43.

اس کے بعد مسٹر خروشچیف نے سوچا کہ [illegible] پیداوار [illegible] ایک طریقہ یہ ہے کہ جو زمینات ابھی تک زیر کاشت نہیں لائی گئی ہیں انہیں قابل کاشت بنایا جائے۔ بات تو بڑی معقول ہے لیکن چونکہ نظام سوشلزم کا ہے اس لئے ہر معقول بات نامعقولیت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ چنانچہ اوپر سے نازل ہونے والے ان احکامات کی تعمیل نیچے والوں نے اس طرح کی کہ اپنی کارکردگی دکھانے کے لئے کہ ہم نے زیادہ سے زیادہ مربع میل رقبہ کو قابل کاشت بنایا ہے، ہر بنجر اور پیداوار کے لئے بالکل بے کار زمینوں کی بھی صفائی کر کے ان تمام پر بھی ہل چلا دیا۔ چنانچہ ایک روسی ماہر ایلک نود (ALC NOVE) لکھتے ہیں :۔

"..... اور دوسری طرف مستقبل کچھ کم ہی تسلی بخش نظر آتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ زیر کاشت لائی جانے والی چند زمینیں اچھی قسم کی ہیں۔ لیکن دوسری زمینات پر محض اس لئے ہل چلایا گیا کہ اوپر سے احکامات آئے تھے حالانکہ مقامی ماہرین کی رائے اس کے خلاف تھی۔ لیکن ہم یہ نہیں بتا سکتے کہ ان دونوں قسموں کی زمینیں کتنی کتنی رہی ہیں۔ نہ ہی ہمارے پاس ان نقصانات کا تخمینہ کرنے کا کوئی ذریعہ ہے جو طویل (Monoculture) یا (Wind erosion) وغیرہ کی وجہ سے ہوئے ہیں۔ کیونکہ قزاقستان میں جہاں کاشت کے لائق زمینیں بہت ہی کم ہیں ان عوامل کے سبب مسلسل کل پیداوار اور فی ایکڑ پیداوار میں کمی ہوتی جا رہی ہے، شاید زیر کاشت لائی ہوئی ساری زمین کے بعض حصوں پر کاشت کی کوشش بالکل ختم کر دینی ہوگی ...... ایسی زمینات کے لئے کتنی ہی زیادہ کھاد کیوں نہ فراہم کی جائے ان میں رطوبت اور نمی کی کمی کے سبب وہ کھاد بھی زیادہ کارآمد نہ ہو سکے گی (کیونکہ کینیڈا میں

بھی بارش کے کچھ نسبتاً زیادہ ہونے کے باوجود ایسی زمینات کو محض کھاد کے ذریعہ کاشت کے لائق نہیں بنایا جاسکا)..."[٦٥]

اس کے بعد پھر مسٹر خروشچیف کو سوجھی کہ چونکہ ملک میں غلہ کی بہت کمی ہے اس لئے زیادہ سے زیادہ اناج کی پیداوار کی جانی چاہئے چنانچہ یہ بھی بات تو معقول ہے لیکن سوشلزم کی جس بیوروکریسی کے ذریعہ اس پر عمل کیا جاتا ہے اس کے سبب یہی معقول بات نامعقول بن جاتی ہے۔ چنانچہ

"اس طرح بعض علاقوں میں جہاں اناج بحکم سرکار اگایا گیا وہاں پیداوار فی ہیکٹر بہت ہی کم رہی جیسے والگا اور اورال کے علاقہ میں اوسط پیداوار فی ہیکٹر ۵۹-۱۹۵۷ء میں بالترتیب ۵ء۱ اور ۴ء۲ کوئنٹلس (QUINTALS) رہی۔ اس سے زبردست ناکامی کا اظہار ہوتا ہے ..." (کیونکہ دوسرے علاقوں میں اوسط پیداوار فی ہیکٹر ۸ء۱۲ اور ۴ء۲۰ کے درمیان رہی)

"..... مرکز سے بھیجے ہوئے احکامات میں یہ لازم کیا گیا کہ اناج کے پودوں کو "SQUARE CLUSTERS" میں بویا جائے حالانکہ بہت سے مقامی ماہرین نے یہ نشان دہی کرنے اور بتانے کی کوشش کی کہ اس کے بجائے قطاروں میں بونا زیادہ بہتر ہے لیکن ان کی رائے کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی ....."[٦٦]

اگر یہ اوپر سے نزول والا سوشلسٹ طریقہ نہ ہو تو وہی والگا اور اورال کے علاقوں میں کسی اور چیز کی پیداوار کی جاسکتی تھی تاکہ

---

٦٥. Soviet Agriculture Marks Time, published in "Foreign Affairs" July 1962, pp. 576-594.

٦٦. Ibid.

جو زمین جس پیداوار کے لئے زیادہ مناسب ہے وہ اس کام میں استعمال میں لائی جاسکتی۔ اور اگر فیصلے کے اختیارات ان لوگوں پر چھوڑے جاتے جو اپنی زمین کی حالت بہتر جانتے ہیں تو انہیں اگر اناج بونا بھی ہوتا تو قطاروں میں بوتے جو کہ ان کی زمینوں کے لئے خصوصیت سے زیادہ مناسب ہوتا، لیکن اشتراکی نظام کے کام کا طریقہ ہی اندھی لاٹھی چلانا ہوتا ہے۔ اس لئے مقامی حالات و مناسبت سب دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ اس طرح ملک کی مجموعی ترقی کی راہ میں سوشلزم جگہ جگہ رکاوٹیں ڈالتا رہتا ہے۔

اور تو اور اوپر سے یہاں تک طے کیا جاتا ہے کہ کس زمین کے لئے کتنا پیداواری ہدف ہوگا۔ وہ زمین اتنی زیادہ پیداوار کی متحمل ہو یا نہ ہو اس زمین کو کہا جاتا ہے کہ ہم تجھے کبھی معاف نہیں کریں گے تجھے بہرحال اتنی پیداوار کرنا ہی پڑے گی جتنی کہ ہم چاہتے ہیں چنانچہ یوکرین کے تمام صوبوں کی زمینات سے ۱۹۶۱ء میں کہا گیا کہ انہیں فی ہیکٹر پچاس کوئنٹل اناج کی پیداوار کرنی ہی ہوگی۔ حالانکہ امریکہ جیسے ملک میں جہاں پیداوار فی ہیکٹر کا معیار بہت اونچا ہے اور آب و ہوا بھی زیادہ مناسب ہے وہاں بھی زیادہ سے زیادہ پیداوار فی ہیکٹر ۲۲ کوئنٹل حاصل کی گئی ہے۔ ۱۹۶۱ء میں یوکرین میں اگرچہ بہترین فصل ہوئی اور پچھلے سارے ریکارڈ ٹوٹ گئے لیکن کہ جگہ پر ۱۵ کوئنٹل فی ہیکٹر سے زیادہ پیداوار نہیں ہوسکی۔ کہاں تو زمین سے پچاس کا مطالبہ کیا گیا جبکہ اس کی زیادہ سے زیادہ پیداوار صلاحیت ۱۵ کوئنٹل سے زائد نہیں ہوسکی۔

اس طرح کی کئی مثالیں سامنے لائی جاسکتی ہیں کہ سوشلزم میں اجتماعی ملکیت کے کھیتوں کو بنیاد بنا کر اوپر سے احکامات کے ذریعہ بیوروکریٹک طریقوں سے پیداوار بڑھانے کی کوشش میں زمینوں کا پورا صحیح اور بہترین استعمال نہیں ہوسکتا۔ اس امر پر مستزاد ہے کہ کسانوں کا انفرادی داعیہ بھی کمزور پڑ جاتا ہے جس کے سبب کسان مزدور یا زرعی مزدوروں کی پیداآوری کارکردگی بھی بہت زیادہ گر جاتی ہے اور یہ دوسرا اہم سبب بن جاتا ہے جس کی بنا پر سوشلزم زرعی ترقی کی راہ میں اپنے آپ کو ایک بہت بڑی رکاوٹ کے طور پر پیش کرتا ہے۔

جیسا کہ نقشہ نمبر ۷) سے ظاہر ہے کہ سوویت روس کے زرعی مزدوروں کی پیداآوری کارکردگی امریکہ کے زرعی مزدوروں کی بہ نسبت بہت کم ہے۔ مثلاً اناج یا غلہ کے ایک یونٹ پیداوار کے لئے جہاں امریکہ میں تین آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے وہاں روس میں اسکی پیداوار کے لئے ۲۲ مزدور درکار ہوتے ہیں کیونکہ ان کی پیداآوری کارکردگی کا تناسب ۱ : ۲۳۷ ہے۔ امریکہ کا ایک کسان جتنا کام کرتا روس کے سات کسان بھی مل کر اتنا کام نہیں کرتے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ سوشلزم ہے کیونکہ روسی زرعی مزدوروں کے کام داعیہ سوشلزم ختم کر دیتا ہے۔ اس نقشہ سے صاف ظاہر ہے کہ اشتراکی روس کے محنت کار بے دلی کر کام کرتے ہیں۔ اس لئے امریکہ کام کے کرنے کے لئے ایک آدمی درکار ہوتا ہے روس میں اسی کام کے لئے سات آدمی درکار ہوتے ہیں۔

یہ کارکردگی جہاں محنت کاروں کی کام سے عدم دلچسپی ظاہر کرتی ہے اس کے ساتھ ساتھ روس کی زرعی ترقی کی ناگفتہ بہ حالت بھی ظاہر کرتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مشینوں وغیرہ کے استعمال سے اجتماعی فارم میں زیادہ پیداوار ممکن ہے اگر مشینوں سے پیداوار زیادہ ہو جائے اور مزدور کم لگانے پڑیں تب بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ محنت کاروں کی کارکردگی زیادہ ہے لیکن کارکردگی کی یہ کمی جو نقشہ نمبر ۷ سے ظاہر ہوتی ہے کہ کام کرنے کے لئے امریکہ کے مقابلہ میں کئی کئی گنا زیادہ مزدور درکار ہوتے ہیں۔ اس سے یہ دونوں باتیں سامنے آتی ہیں یعنی مزدوروں میں کام کے داعیہ کا فقدان اور فنی اعتبار سے اور مشینوں کے استعمال سے بھی پیداآوری صلاحیت کی کمی یا دونوں اعتبارات سے کمی کی اصل وجہ سوشلزم کے علاوہ اور کیا ہوسکتی ہے۔ اگر یہ ایک بہتر نظام ہوتا اور کم از کم اس فرسودہ سرمایہ دارانہ

نظام ہی سے بہتر ہوتا جس سے بہتر ہونے کا دعویٰ سوشلزم کرتا ہے تو پھر اس کارکردگی کی کمی کی کیا توجیہہ پیش کی جا سکتی ہے۔

نقشہ نمبر(۷) میں اجتماعی فارم اور حکومتی فارم کی کارکردگی علیحدہ علیحدہ دکھائی گئی ہے۔ حکومتی فارم تو خالص حکومت ہی کی ملکیت میں اور اجتماعی فارم وہ ہیں جو کسانوں سے زمین چھین کر بنائے گئے ہیں۔ اور اسی میں کارکردگی بے انتہا گری ہوئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسان اپنی زمین کے چھن جانے کا انتقام ابھی تک لئے جا رہے ہیں۔

شکل نمبر(۷) زرعی پیداوار کے ایک یونٹ کے لئے درکار محنت کاروں کی تعداد کا موازنہ

From Soviet Economic Power. by R.W. Campbell, Japanese Edition, p. 106.
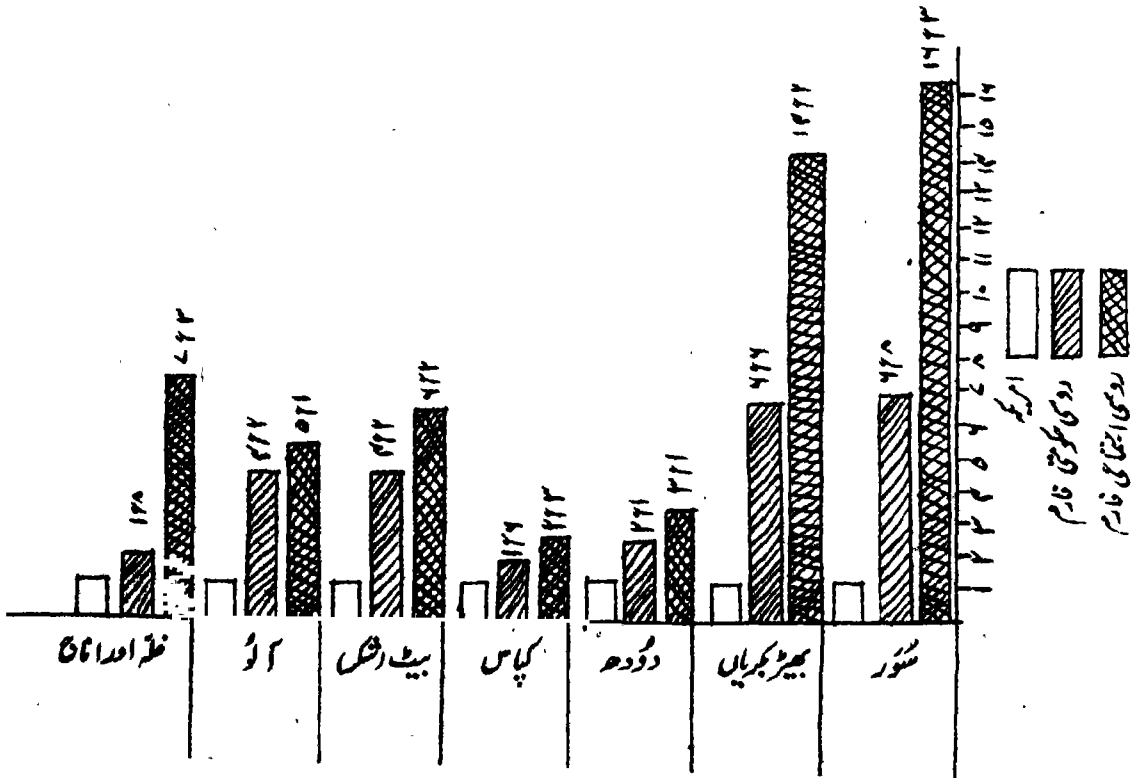
۱۴۔ روس کی زرعی ناکامی کی کہانی۔ سرکاری اعترافات کی زبانی

اب تک ہم زیادہ تر ان اسباب پر روشنی ڈال رہے تھے جن کی بنا پر کسی سوشلسٹ نظام میں زرعی ترقی میں رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ اب یہ دیکھئے کہ سوشلزم کے باعث ان اسباب کی موجودگی میں روس اور چین کی زرعی ترقی پر کیا اثر پڑا ہے۔

روسی کمیونسٹ پارٹی کی سرکاری تاریخ سے ہم پہلے یہ حوالہ دے چکے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ "اشتراکی صنعت میں بڑی کامیابی اور زراعت میں سنگین کوتاہی —— یہ تھی وہ معاشی حالت جبکہ پارٹی کی پندرھویں کانگریس منعقد ہوئی[۶۷]"۔ یہ پندرھویں پارٹی کانگریس ۱۹۲۷ء میں ۲ سے ۱۹ دسمبر کے دوران منعقد ہوئی۔ گویا روس کے اشتراکی انقلاب کے دس سال بعد کی سرکاری رپورٹ یہ ہے کہ زرعی ترقی میں ناکامی رہی ہے۔ اس کے بعد پارٹی کی سولھویں کانگریس میں جو ۲۶ تا ۱۳ جولائی ۱۹۳۰ء کے دوران ہوئی زراعت کی اس ناکامی کو دور کرنے کے لئے "اجتماعی فارم تحریک اور زرعی ترقی" کے نام سے ریزولیوشن پاس کیا گیا[۶۸]۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ ہماری زرعی ترقی اجتماعی فارم ہی کے ذریعہ ہو سکتی ہے اس لئے اس تحریک کو کامیاب بنایا جائے لیکن یہ تحریک کتنی کامیاب رہی، کسانوں نے کتنے مویشی مارے، حکومت سے غلہ چھپایا۔ عوامی بغاوت تک نوبت پہنچ گئی یہ سب تفصیل ہم پہلے بتا چکے ہیں گویا ۱۹۳۰ء کی سولھویں کانگریس کے ریزولیوشن کے نتیجہ میں زرعی حالت بہتر ہونے کی بجائے اور زیادہ بگڑ گئی۔ اس کے بعد پارٹی کی سترھویں کانگریس ۱۹۳۴ء میں ہوئی جس میں زراعت کے متعلق سرکاری طور پر کچھ نہیں بتایا گیا کہ ترقی ہوئی کہ تنزلی[۶۹]۔ اس کے بعد پارٹی کی اٹھارھویں کانگریس ۱۹۳۹ء میں ہوئی۔ اس وقت تک اجتماعی فارم کی "برکات" کھل کر سامنے آ چکی تھیں جن کا تذکرہ اسی سرکاری تاریخ میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے:-

"..... اجتماعی فارم میں کام کرنے والے کسانوں کو اچھے نتائج برآمد کرنے پر مادی فائدہ پہنچانے کے اصول کی طرف سے تغافل برتا گیا۔ اجتماعی ملکیت میں آنے والے ان فارموں کو مزید وسیع کرنے اور انہیں مضبوط بنانے کے اقدامات نہیں کئے گئے۔ ذاتی ملکیت اور خود غرضی کا رجحان رکھنے والے کسانوں کی طرف نرم رویہ اختیار کیا گیا۔

ان تمام کے نتیجہ میں اجتماعی فارم کی ترقی میں بے شمار غلطیاں ہوئیں اور اجتماعی فارم کے ذریعہ ہونے والی پیداوار کی ترقی رک گئی بلکہ اس میں کمی ہونے لگی[۷۰]"

اس میں نہ صرف پیداوار کی کمی کا اعتراف کیا گیا بلکہ اس کا بھی کہ کسانوں کو اجتماعی فارم میں کام کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان کے پاس جو ایک چھوٹا سا پلاٹ اپنی ذاتی ضروریات کے لئے رہنے دیا گیا تھا جسے ان کے پاس چھوڑ کر ان کی دوسری ساری زمینات چھین لی گئی تھیں۔ کسان زیادہ تر اسی سے دلچسپی رکھتے تھے اور اجتماعی فارم میں محض دکھاوے کے لئے کام کرتے تھے

۶۷۔ History of Communist Party of Soviet Union (Moscow) P.414

۶۸۔ ایضاً۔ صفحہ ۴۵۰

۶۹۔ ایضاً۔ صفحہ ۴۸۴

۷۰۔ ایضاً۔ صفحہ ۲۵-۵۲۴

چنانچہ اس سرکاری تاریخ میں کہا گیا ہے کہ

"۔۔۔۔ کسانوں کے پاس اپنے گھرانہ کے استعمال کے لئے جو چھوٹا پلاٹ رہنے دیا گیا تھا اس کی حیثیت ضمنی ہونے کی بجائے اکثر و بیشتر کسان صرف اسی کو اپنا اصل ذریعہ آمدنی بنانے لگے۔ چند اجتماعی فارموں کے اندر تو کسانوں نے ان پلاٹوں کو اپنی ذاتی ملکیت کے طور پر جس طرح چاہا استعمال کرنا شروع کیا۔ اس پلاٹ کو دوسروں کو کرایہ پر دیا یا یہ کہ اجتماعی فارم پر کام نہ کرنے کے باوجود اسے اپنے پاس رکھا۔ اس طرح بہت سے جعلی یا نقلی کسان ابھر آئے جو اجتماعی فارم میں یا تو سرے سے کام ہی نہیں کرتے تھے یا اگر کرتے تھے تو محض دکھاوے کے لئے۔ اپنے وقت کا بیشتر حصہ وہ صرف اپنے گھرانہ کے اس چھوٹے پلاٹ پر صرف کرتے تھے حالانکہ یہ ایک ضمنی کام ہونا چاہئے تھا۔

اس تمام کے نتیجہ میں اجتماعی فارموں میں محنت کاروں کی کارکردگی اور پیداآوری صلاحیت کار کی ترقی رک گئی محنت کاروں کا سارا ڈسپلن ختم ہوگیا اور اجتماعی فارم کی پیداوار میں بدنظمی پیدا ہوگئی۔ بہت سے اجتماعی فارموں میں محنت کاروں کی مصنوعی کمی پیدا ہوئی حالانکہ تعداد میں محنت کار بہت زیادہ تھے[1] ۔۔۔"

گویا روس میں ۱۹۳۹ء تک جو زرعی ترقی ہوئی اس میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ کسان تعداد میں بہت زیادہ ہونے کے باوجود اس قدر کم کام کرتے تھے کہ محنت کاروں کی کمی کی دقت شدت سے پیش آنے لگی حالانکہ فی الحقیقت کوئی کمی نہیں تھی لیکن یہ کمی محنت کاروں نے کام نہ کرنے کی قسم کھا کر مصنوعی طور پر پیدا کی تھی۔ اشتراکیت کے ۲۲ سال بعد بھی روس میں زرعی ترقی کی یہ ناگفتہ بہ حالت خود اشتراکیت کے کارپردازوں کے اپنے اعترافات سے معلوم ہوتی ہے

اس کے بعد روسی کمیونسٹ پارٹی کا ۱۹واں اجلاس ۱۹۵۲ء میں ہوا۔ اس میں بھی اعتراف کیا گیا کہ زراعت نے خاطر خواہ ترقی نہیں کی ہے۔ اس سے قبل ۱۹۴۷ء میں پارٹی کی مرکزی کمیٹی کی میٹنگ ہوئی جس میں :۔

" اجتماعی فارم کے روزمرہ کے کام میں پائی جانے والی کوتاہیوں پر تنقید کی گئی۔ اجتماعی ملکیت کی زمین کا ضیاع۔ غلط استعمال اور اس سلسلہ میں کی جانے والی بے ایمانی اور بددیانتی پر اور بوجہ کام کے غلط تعین وغیرہ پر تنقید کی گئی، اور ان کوتاہیوں کو دور کرنے کے طریقوں کی نشاندہی کی گئی ۔۔۔۔۔ لیکن ان اجتماعی فارموں کی اصل کوتاہیاں تو ان کی تنظیم اور MANGEMENT میں تھیں جو سامنے نہیں لائی گئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض مقامات پر تو ان کی حالت انتہائی خراب ہوگئی جس کی وجہ سے اشتراکی زراعت کی ترقی میں بڑی رکاوٹ پیش آئی[2] ۔۔۔۔"

پھر ان اجتماعی فارموں میں جو کچھ مشینیں وغیرہ سپلائی کی گئیں ان کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ یہ مشینیں ڈھنگ سے استعمال نہیں کی گئیں۔ ۱۹۴۹ء کی صورت حال کا تذکرہ اس تاریخ میں یوں ہے کہ

"۔۔۔ انہوں نے مشینوں کا استعمال بہت ہی خراب کیا۔ اور ان کی تنظیم و نگرانی کے اخراجات بہت زیادہ تھے اس طرح کے

---

[1]۔ ایضاً صفحہ ۵۲۵

[2]۔ ایضاً صفحہ ۶۰۶

اجتماعی فارم کی بدولت پیداآوری صلاحیت کی ترقی پر قدغن لگ گئے[۴۷]...."

اس کا حل یہ نکالا گیا کہ اجتماعی فارموں کو مزید بڑا بنایا گیا۔ کئی چھوٹے چھوٹے اجتماعی فارموں کو ملا کر چند بڑے بڑے اجتماعی فارم بنائے گئے۔ اس کے بعد ۱۹۵۰ء میں زراعت کی جو صورت حال رہی اس کا بیان اس سرکاری تاریخ میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے کہ

"اجتماعی ملکیت کے کھیتوں نے زرعی پیداوار بڑھانے کے جو مواقع مہیا کئے تھے ان کا پورا پورا فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ زرعی پیداوار کے ذریعہ عوام کے لئے خوراک کی بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا نہیں کیا جا سکا اور نہ ہی غذا تیار کرنے والی اور دوسری ہلکی صنعتوں کے لئے خام مال ہماری زرعی پیداوار کے ذریعہ مہیا کیا جا سکا۔ غلہ اور اناج کا مسئلہ بھی حل نہیں ہو سکا۔ اگرچہ گذشتہ پانچ سال میں اناج کی پیداوار کا رقبہ ۲۰ فی صد بڑھایا گیا لیکن پھر بھی جنگ (جنگ عظیم دوم) سے پہلے جتنی اناج کی پیداوار نہ ہو سکی۔ پیداوار فی ہیکٹر بھی بہت کم رہی۔ مویشیوں کی تعداد بڑھانے کے معاملہ میں بھی بے شمار کوتاہیاں ہوئیں۔ جنگ سے پہلے گائے اور سور کی جتنی تعداد تھی اس کے برابر تعداد پھر نہ ہو سکی۔ مویشیوں کی صلاحیت کار بھی بہت کم رہی۔ مشینوں کا استعمال بھی بہت سے اجتماعی فارموں نے ڈھنگ سے نہیں کیا۔ بہت سے علاقے اور اجتماعی فارم ایسے رہے جو دوسروں سے بہت پیچھے رہے[۴۸]...."

جنگ ختم ہونے کے پانچ سال بعد کی یہ رپورٹ ہے۔ جنگ سے پہلے جو کچھ صورت حال تھی وہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ پارٹی کی اٹھارہویں کانگریس جو ۱۹۳۹ء میں ہوئی تھی اس وقت بھی یہی کہا گیا تھا کہ زرعی پیداوار اطمینان بخش نہیں ہے۔ محنت کار کافی تعداد میں ہونے کے باوجود کام نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ اجتماعی ملکیت کے فارموں پر مصنوعی طور پر محنت کاروں کا قحط پیدا ہو گیا ہے۔ مطلب یہ کہ جنگ سے پہلے بھی کوئی اطمینان بخش صورت حال نہیں تھی کجا یہ کہ اس کے گیارہ سال بعد کی رپورٹ ۱۹۵۰ء میں یہ کہتی ہے کہ ہم جنگ سے پہلے کی صورت حال کے برابر بھی نہیں ہو سکے۔ گویا اس عرصہ میں مزید ترقی کی بجائے زرعی پیداوار میں خاصا زوال ہوا۔

اس کے دو سال بعد جب پارٹی کی ۱۹ویں کانگریس ۱۹۵۲ء میں ہوئی تو اس وقت کہا گیا کہ

"..... اجتماعی فارم کی پیداوار کی بعض بنیادی اشیاء کی قیمتیں اتنی کم رکھی گئی تھیں کہ ان کی پیداوار پر جو لاگت آتی تھی وہ لاگت بھی ان قیمتوں سے نہ نکل سکتی۔ اجتماعی فارم اور ان میں کام کرنے والوں کو ابھارنے کے لئے زیادہ پیداوار پر مادی فوائد بہم پہنچانے کے اصول کو پامال کیا گیا۔ زرعی پیداوار پر ٹیکس کا نظام اجتماعی فارم کے کسانوں کے اپنے گھرانے کے لئے انفرادی پلاٹ پر ضمنی کام کے ذریعہ آمدنی کے حصول کو ناممکن بنا دیتا تھا۔ ان تمام باتوں کا اجتماعی فارم کی پیداوار پر انتہائی خراب اثر پڑا ہے[۴۹]...."

گویا اشتراکی انقلاب کے ۱۹۱۷ء سے ۱۹۵۳ء تک کے ۳۵ سال کے درمیان ہمیشہ یہی رپورٹ ہے کہ فلاں فلاں باتوں کے نتیجہ میں

۴۷۔ ایضاً صفحہ ۶۰۶

۴۸۔ ایضاً صفحہ ۶۰۷

۴۹۔ ایضاً صفحہ ۶۱۵

اجتماعی فارموں سے زرعی پیداوار نسلی بخش نہیں ہوسکی۔ اب اور آگے دیکھئے کہ کیا ہوتا ہے۔

۱۹۵۴ء اور ۱۹۵۵ء میں پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے خصوصی اجلاس ہوئے جس میں صرف زراعت ہی کو مرکزی مسئلہ بنا کر اس کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا۔ اس سے پہلے ستمبر ۱۹۵۳ء میں بھی زراعت ہی کے مسئلہ پر مرکزی کمیٹی کا اجلاس ہوا اور اس اجلاس کو زرعی صورت حال بدلنے کا ایک (TURNING POINT) قرار دیا گیا تھا لیکن اس ۱۹۵۳ء کے اہم اجلاس کے بعد ۱۹۵۴ء اور ۱۹۵۵ء میں جو زرعی صورت حال سامنے آئی اسے کمیونسٹ پارٹی کی سرکاری روسی تاریخ ان الفاظ میں پیش کرتی ہے۔

"..... قیادت کی نااہلی کے اسباب کی جڑیں داخلیت کے رویہ میں ملتی ہیں (یعنی قیادت کا کوئی خارجی معیار نہیں تھا بلکہ اوپر والوں کی خوشنودی کے نقطہ نظر سے قیادت چنی جاتی تھی)۔ زراعت کی صورت حال کو سمجھنے کے لئے گذشتہ کئی سالوں سے کچھ نہیں کیا گیا۔ زراعت کے بعض شعبوں میں جو حقیقی صورت حال تھی اسے چھپایا گیا اور اسے ملمع کرکے خوبصورت شکل میں پیش کیا گیا۔ مشینوں کو ڈھنگ سے استعمال نہیں کیا جا رہا تھا۔ اکثر و بیشتر اجتماعی ملکیت کے فارموں، مشین و ٹریکٹر کے اسٹیشنوں اور حکومتی فارموں میں قابل اور اہل قیادت اور ماہرین کا فقدان تھا...... بہت سی زرعی پیداوار کی اشیاء کی قیمت خرید اتنی نہیں تھی کہ ان کی پیداوار پر محنت کار کی جو محنت صرف ہوتی ہے اس کا حق ادا ہو سکے جس کے سبب محنت کار پیداوار کے لئے دل سے آمادہ نہ ہو سکے اور انہیں پیداوار بڑھانے کے کام پر ابھارا نہ جا سکا۔ بہت سے اجتماعی فارموں پر یومیہ اجرتیں جو دی جاتی تھیں وہ انتہائی کم تھیں[٦٧]....."

گویا جو رپورٹ ۱۹۵۲ء میں تھی ۱۹۵۵ء میں اس سے زیادہ بری صورت حال سامنے آئی اور یہ بتایا گیا کہ پچھلی رپورٹوں میں بہت سی چیزوں کو چھپایا جاتا تھا۔ ۱۹۵۲ء میں سب کچھ چھپانے کے باوجود جنگ سے پہلے کے برابر پیداوار نہیں تھی۔ ۱۹۵۵ء میں ۱۹۵۳ء کی انقلابی تبدیلیوں کے باوجود زرعی پیداوار گویا پہلے سے کم تھی کیونکہ پہلے بہت کچھ چھپایا جا رہا تھا اور اب حقیقت کا اظہار ہو رہا تھا۔ کیونکہ پہلے قیادت اسٹالن کی تھی اور اب خروشچیف کی۔ یہ بھی اعتراف کر لیا گیا کہ ان اجتماعی فارموں اور دوسری جگہوں پر جو منیجر وغیرہ مقرر ہوتے تھے وہ اپنی اہلیت کی بنا پر نہیں بلکہ اسٹالن کے حامیوں اور اس کی ہاں میں ہاں بھرنے میں کمال دکھانے کے سبب۔ شروع سے اب تک وہی رونا رویا جا رہا ہے کہ کسان ڈھنگ سے کام نہیں کرتے انہیں اور آمدنی ہونی چاہئے۔ پھر یہ بھی مانتے ہیں کہ حکومت جن قیمتوں پر خریدتی ہے وہ بہت کم ہے یہاں تک کہ لاگت بھی پوری نہیں ہوتی کجا یہ کہ کسان کو بچت یا آمدنی ہو۔ اشتراکی انقلاب کی ابتدا سے ۱۹۵۵ء تک کی ساری رپورٹوں کا انداز ایک جیسا ہے اور نتیجہ ہر وقت وہی کہ زرعی پیداوار ڈھنگ سے نہیں ہوئی لیکن آئندہ ہماری فلاں فلاں تدبیروں کے سبب ہو جائے گی۔ اب دیکھئے آئندہ مزید کیا صورت حال سامنے آتی ہے۔

۱۹۵۶ء میں پارٹی کی ۲۰ ویں کانگریس کا اجلاس ہوا جس میں مسٹر خروشچیف نے اسٹالن کے خلاف اپنی ساری بھڑاس نکالی اسٹالن کو ناکام ثابت کرنے کی کوشش میں زرعی ترقی میں ناکامی کا اعتراف بھی کیا گیا اور چونکہ ایک سال پہلے اس معاملہ میں تفصیلی اقدامات کئے جا چکے۔ اس لئے اس کانگریس میں کوئی قابل ذکر بات زرعی پیداوار کے سلسلہ میں سامنے نہیں لائی گئی

٦٧۔ ایضاً صفحہ ۶۳۸

۱۹۵۸ء میں مرکزی کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ اس میں بتایا گیا کہ زرعی صورت حال پہلے سے کچھ بہتر ہوئی ہے لیکن اس میں جو ایک اہم فیصلہ کیا گیا وہ انتہائی مہلک تھا۔ اسٹالن نے اجتماعی فارموں کو مشینیں اور ٹریکٹر مفت سپلائی کئے تھے بلکہ مشینوں کے استعمال کا علیحدہ آزاد ادارہ تھا جو حسب ضرورت مختلف اجتماعی فارموں پر جاکر اپنی خدمات پیش کرتا تھا۔ اس کے نقصانات سامنے آئے ۔ ان نقصانات کا اعتراف کیا گیا کہ اس طرح دو آزاد اداروں، اجتماعی فارم اور مشین و ٹریکٹر اسٹیشن کے علیحدہ علیحدہ وجود کے سبب کوئی بھی اپنے سر ذمہ داری نہیں لیتا تھا اور پیداوار میں کمی ہوتی تو ایک ادارہ دوسرے کو ذمہ دار قرار دیتا۔ اس کے علاوہ انتظامی اخراجات میں زیادتی کا اعتراف بھی کیا گیا۔ اس لئے اس نظام کو بدلنے کا فیصلہ کیا گیا۔ بدلنے کے فیصلہ سے یہ تو کم از کم ثابت ہے کہ اب تک جو نظام چلایا جا رہا تھا اس کے سبب زرعی پیداوار میں ترقی نہیں ہوئی بلکہ وہی بیوروکریسی کے نتائج سامنے آئے۔ اجتماعی فارم کہے کہ ہمیں وقت پر ٹریکٹر اور مشینیں نہیں ملیں اس لئے پیداوار گر گئی اور مشین و ٹریکٹر اسٹیشن کہے کہ ہم نے تو سب کام وقت پر کر دیا تھا لیکن اجتماعی فارم کے منیجر صاحب اپنی نااہلی ہمارے سر ڈال رہے ہیں۔ یہ اور اس طرح کی شکایات جیسا کہ ہم پہلے واضح کر چکے ہیں زمینوں کو اجتماعی ملکیت میں لینے کے بعد وجود میں آنے والے بڑے بڑے اداروں کی بیوروکریسی کے فطری نتائج ہیں۔

لیکن ۱۹۵۸ء میں پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے اس اجلاس نے اسٹالن کو بھی جس معاملہ میں مات کر دیا وہ یہ کہ اسٹالن کا خیال تھا کہ مشینوں اور ٹریکٹروں کی خریداری کا بار اجتماعی فارموں پر ڈالنا مناسب نہیں ہے لیکن اس اجلاس میں طے کیا گیا کہ چونکہ دو علیحدہ آزاد اداروں میں سے کوئی بھی اپنے سر ذمہ داری نہیں لیتا اس لئے مشینیں اور ٹریکٹر کے علیحدہ ادارہ کا وجود ختم کر دیا جائے۔ یہاں تک تو خیر پھر بھی درست تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ یہ مشینیں اور ٹریکٹر جو اجتماعی فارموں کو دیئے جائیں گے وہ اسٹالن کی طرح مفت نہیں بلکہ قیمت پر۔ یعنی یہ فروخت کئے جائیں گے اور اجتماعی فارموں کو ان کی قیمت ادا کرنی ہوگی۔ جس بار کے وہ متحمل نہیں ہو سکتے تھے اور خود اسٹالن کی نظروں میں متحمل نہیں ہو سکتے تھے وہ بار ان پر ڈالا گیا۔ اس کا یہی نتیجہ ہو سکتا تھا کہ اجتماعی فارموں پر کام کرنے والے کسانوں کی آمدنی جو پہلے ہی کم تھی اب اور زیادہ کم ہو گئی۔

اس کے بعد ۱۹۵۹ء میں پارٹی کی ۲۱ ویں کانگریس کا اجلاس ہوا۔ اس میں آئندہ کے لئے سات سالہ منصوبہ طے کیا گیا جس میں بڑی توقعات باندھی گئیں کہ زرعی پیداوار میں ۷۰ فی صد اضافہ ہوگا۔ اس کا جائزہ ہم بعد میں لیں گے لیکن اس کانگریس کے وقت تک کا جائزہ ایک سوویٹ معیشت دان KORIAGIN کے الفاظ میں یہ ہے:-

"جنگ سے پہلے (سنہ ۱۹۳۰ء تا ۱۹۴۰ء) اور جنگ کے بعد ۱۹۴۶ء تا ۱۹۵۴ء میں صنعتی پیداوار اوسطاً ۲۲۲ء۱۶ فی صد سالانہ کی رفتار سے بڑھی اور زرعی پیداوار ۲ فی صد سالانہ سے کچھ زائد" (۲۷)

اور یہ ۲ فی صد جیسی معمولی ترقی بھی اس لئے ہوئی کہ ۱۹۵۴ء کے بعد ۱۰،۰۰۰،۰۰۰ ایکڑ نئی زمین زیر کاشت لائی گئی تھی۔ ایک تو زرعی پیداوار میں ۲ فی صد کا اضافہ جبکہ صنعت میں ۱۶ فی صد رہا ہو۔ یہ اضافہ ہی انتہائی سست رفتاری کو ظاہر کرتا ہے اور اس کی اصل وجہ بھی کچھ اور ہے۔ وجہ یہ نہیں ہے کہ اجتماعی ملکیت کے فارم یا بیوروکریسی کی کارکردگی میں بہتری کے سبب یہ معمولی سا اضافہ

---

(۲۷) Voprosi ekonomki No. 3, 1959, p. 43. Article by

ہوا ہو بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ نئی زمینیں زیر کاشت لائی گئیں جن کے سبب پیداوار میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہونا ہی چاہئے تھا۔ لیکن جن میدانوں میں سوشلزم کام کر رہا تھا یعنی اجتماعی ملکیت کے فارم اور بیوروکریسی کا نظام اس کے سبب کوئی قابل ذکر اضافہ سامنے نہیں آسکا

اس وقت تک کی زرعی صورت حال کے سلسلہ میں ۱۹۵۸ء کے آخیر میں خروشچیف نے یہ اعتراف کیا کہ

"..... صنعت اور زراعت کے میدان میں ایک دوسرے سے خاصی دوری پیدا ہو گئی۔ اس دوری سے بڑے سنگین اور خطرناک نتائج نکلنے کا امکان پیدا ہو گیا ہے۔ اس کے باعث اشتراکی صنعت بھی مزید ترقی نہیں کر سکے گی، نہ ہی محنت کاروں کے معیار زندگی میں بہتری ہو سکے گی اور نہ ہی کیمونزم کی منزل کی طرف (ہمارا یہ سوشلسٹ نظام) قدم بڑھا سکے گا۔ اس طرح بالآخر سوویت یونین اور پورے اشتراکی کیمپ کی معاشی طاقت بہت کمزور ہو جائے گی ..... "[78]

یہ تھے وہ خطرات جو ۱۹۵۸ء کے آخر میں مسٹر خروشچیف کو زرعی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ نہ ہونے کے سبب نظر آرہے تھے

اس لئے خروشچیف نے زرعی ترقی کے معاملہ پر کافی توجہ دی اور نئی زمین کو زیر کاشت لانے، غلہ اور اناج کی پیداوار بڑھانے، گھاس کے میدانوں میں کمی کرنے وغیرہ کی مہمات چلائیں لیکن ان مہمات کا نتیجہ سوشلسٹ نظام کے سبب اور اس کی پیدا کردہ بیوروکریسی اور اجتماعی ملکیت کے سبب جیسا کچھ بھی نکلا وہ سخت مایوس کن تھا۔

پارٹی کی ۲۲ ویں کانگریس کا اجلاس ۱۷ تا ۳۱ اکتوبر ۱۹۶۱ء میں ہوا۔ اس میں دوبارہ اس عزم کا اظہار کیا گیا کہ زراعت پر بہت زیادہ توجہ کی ضرورت ہے اور سات سالہ منصوبہ میں جو زراعت کی ترقی کا پروگرام بنایا گیا ہے اسے ہر قیمت پر کامیاب بنانا ہے۔ ان سارے عزائم کے اعلان کے باوجود اس وقت تک کی زرعی صورت حال کی کمزوری چند ماہ بعد یعنی یکم جون ۱۹۶۲ء کے ایک اعلان میں بالکل کھل کر سامنے آگئی۔ اشتراکی روس کے اس اہم اعلامیہ میں یہ بتایا گیا تھا کہ مویشی، سور، بھیڑ، بکری اور مرغی کے گوشت کی قیمتوں میں اوسطاً ۲۵ فی صد اضافہ کیا جا رہا ہے اور مکھن اور کریم کی قیمت میں دس فی صد۔ یعنی یہ اضافہ اجتماعی فارم کے کسانوں کو دیا جائے گا جن سے حکومت یہ چیزیں اس طرح کی نامز قیمت پر خریدے گی اور پھر جب حکومت خود اسے صارفین کو بیچے گی تو اس قیمت فروخت میں گوشت پر ۳۰ فی صد اور مکھن اور کریم پر ۲۵ فی صد اضافہ کرے گی۔ اس اعلان کو مغربی ممالک میں اشتراکی نظام کے زرعی نظام کی شدید ناکامی اور بحران کا اعلان سمجھا گیا۔ اس اضافہ کی وجہ یہ تھی کہ حکومت اس سے پہلے جن قیمتوں پر کسانوں کی پیدا کردہ اجتماعی فارم کی اشیا خریدتی تھی ان سے کسانوں کو کافی نقصان ہوتا تھا اور انہیں کوئی منافع یا بچت نہیں ہوتی تھی اور جیسا کہ پہلے بھی بار بار اس کا اعتراف کیا گیا۔ کہ ان قیمتوں کو زیادہ کرنا چاہئے اور حکومت نے انہیں ہمیشہ زیادہ سے زیادہ رکھنے کی کوشش کی لیکن اس تمام کے باوجود ان اجتماعی فارموں کی کارکردگی اس قدر گئی گذری تھی کہ کتنی ہی قیمت بڑھاؤ لاگت پوری نہیں ہوتی یا کسان کو بچت نہیں ہوتی اور جہاں ایک کی جگہ سات آدمی کام کریں وہاں بھلا لاگت زیادہ کیسے نہیں ہوگی۔ چنانچہ یکم جون ۱۹۶۲ء کو کسانوں کو کام پر آمادہ کرنے کے لئے قیمتوں میں مزید ۳۵ فی صد کا جو اضافہ کیا گیا اس کے باوجود ایک "اپیل" بھی حکومت کو کسانوں سے کرنی پڑی۔ اس اپیل میں کہا گیا کہ اس اضافہ کے باوجود بہت سے اجتماعی فارموں کی لاگت زیادہ ہونے کے سبب بچت کی گنجائش کم ہی ہے اس لئے کسانوں سے درخواست کی گئی کہ وہ

---

[78] The Sovist Economy, p. 145.

اس بچت کی گنجائش کو بڑھانے کے لئے لاگت کو کم سے کم کرنے کی کوشش کریں۔ ہمارے خیال میں قیمتوں میں اس قدر اضافہ کا بھی پیداوار پر کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا کیونکہ اس اضافہ سے اجتماعی فارموں کے کسانوں کی ماہوار آمدنی میں بمشکل ایک روبل کا اضافہ ہوگا۔ یہ کارکردگی کا عالم ہے کہ کتنا ہی قیمتوں میں اضافہ کیا جائے کسانوں کی آمدنی میں اضافہ زیادہ نہیں ہو پاتا۔ دوسری طرف یہ اعلان بہ ظاہر کرتا ہے کہ حکومت مویشیوں کی تعداد کی کمی اور کسانوں کے کام نہ کرنے کی قسم کھانے کی عادت سے سخت مشکلات سے دوچار ہے۔ پھر اس کا اثر صرف یہی ہوگا کہ شہری آبادی کے صارفین قیمتوں میں اس قدر اضافہ کے سبب اپنی مانگ کم کر دیں گے۔ یعنی زرعی پیداوار میں اضافہ کی چونکہ زیادہ امید نہیں ہے اس لئے علاج یہ ہے کہ مانگ کم ہو جائے۔ یہ سب کچھ اس کے علی الرغم ہے کہ ۱۹۵۹ء کے سات سالہ منصوبہ میں اس کا بخوبی احساس تھا اور یہ منصوبہ سات سال کے اندر گوشت کی پیداوار کو دگنا کرنا چاہتا تھا لیکن اس منصوبہ کے تین سال کے اندر ہی، جو نتیجہ سامنے آیا تھا وہ یہ تھا کہ:-

"اس طرح گوشت کی پیداوار میں ۳۲ فی صدی اضافہ کی بجائے الٹا کمی آئی۔ دودھ کی پیداوار کے سلسلہ میں گائے کی تعداد میں سات سالہ منصوبہ کے پہلے تین سالوں میں ۱۵ فی صد سالانہ کا تخمینہ لگایا گیا اور پورے سات سالوں میں ۱۰.۶ ۸ فی صد کے اوسط سالانہ اضافے کا منصوبہ بنایا گیا لیکن حقیقت میں جو اضافہ ان تین سالوں میں ہوا وہ ایک فی صدی کے آدھے سے بھی کم تھا۔ ... "

اب آئیے یہ دیکھئے کہ خود سوویٹ روس کے کارپردازوں کی طرف سے اس سات سالہ منصوبہ کے متعلق جس میں زرعی ترقی کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی تھی، کیا رپورٹ پیش کی جاتی ہے۔

کمیونسٹ پارٹی کی ۲۳ ویں کانگریس جو ۲۹ مارچ تا ۸ اپریل ۱۹۶۶ء کے دوران ہوئی اور جو اس وقت تک کی آخری کانگریس ہے اس میں اس سات سالہ منصوبہ کا جائزہ لیا گیا۔ اس منصوبہ میں زرعی پیداوار میں ۷۰ فی صد اضافہ کا پروگرام بنایا گیا تھا لیکن اضافہ ہوا صرف ۱۴ فی صد جس کا اعتراف اس کانگریس میں رپورٹ پیش کرتے ہوئے مسٹر کوسیجن نے ان الفاظ میں کیا ہے:-

"..... لیکن زراعت میں ہدف پورے نہیں ہو سکے۔ گزشتہ سات سالوں میں زرعی پیداوار میں اضافہ صرف ۱۴ فیصد ہوا ہے ..... "

اسی مارچ میں پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا اجلاس بلایا گیا جس میں زراعت میں پیچھے رہنے کے اسباب کا تجزیہ کیا گیا اور ایسے اقدامات کا فیصلہ کیا گیا کہ اب تک کی ساری کوتاہیاں دفع ہو سکیں اور زرعی پیداوار کے تمام شعبوں میں ترقی کی رفتار تیز ہو سکے۔

زرعی پیداوار میں کمی کے سبب غذائی اور ہلکی صنعتوں کی ترقی بھی منصوبہ کے ہدف کے مطابق نہیں ہو سکی اور اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا اور ہوا کہ قومی آمدنی میں اور عوام کی خوشحالی میں ترقی کی رفتار سست پڑ گئی۔

حقیقی آمدنی میں کمی کی دوسری وجہ محنت کاروں کی صلاحیت کار اور کارکردگی میں کمی ہے جو گزشتہ چند سالوں

---

77 Radio Free Europe, Background Information, U.S.S.R., June 23. 1960, pp. i-v.

8 The Soviet Economy, p. 173.

میں پیچھے گر گئی ہے۔ ۶۰-۱۹۵۹ء میں اس میں ۶ء۲۵ فی صد سالانہ کی رفتار سے اضافہ ہو رہا تھا لیکن ۶۵-۱۹۶۱ء میں یہ کم ہو کر ۲ء۶۴ فی صد سالانہ ہو گیا[۱۸] ۔۔۔۔

اسی رپورٹ میں اس کوتاہی پر پردہ ڈالنے کے لئے مسٹر کوسیجن نے یہ ترکیب نکالی کہ ۱۹۲۴ء سے اب تک پانچ پانچ سال کے عرصہ میں جو تھوڑا تھوڑا اضافہ ہوتا رہا اس کا موجودہ پیداوار سے موازنہ کر کے بتایا کہ ۱۹۲۴ء سے اب تک زرعی پیداوار میں ۱۵۰ فی صد سالانہ کے حساب سے اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۲۴ء کی بجائے اگر وہ زمانہ قدیم سے موازنہ کرتے تو لاکھوں فی صد سالانہ اضافہ کے اعداد و شمار ممکن ہوتے اور اگر صنعتی انقلاب کے پہلے کے زمانہ سے موازنہ کرتے تو ہزاروں فی صد سالانہ اضافہ نظر آتا۔ مقصد یہ ہے کہ اگر آدمی اس وقت سے موازنہ کرے جبکہ ترقی بالکل صفر تھی تو یقیناً یہ فی صد اضافہ بہت زیادہ نظر آئے گا۔ ہم یہ پوچھتے ہیں کہ اگر روس کی زرعی پیداوار میں اتنا ہی زیادہ اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا جو ۱۵۰ فی صد کے عدد سے ظاہر ہوتا ہے تو پھر تمام پارٹی کانگریسیں ہمیشہ یہ رونا کیوں روتی رہیں کہ زرعی ترقی تسلی بخش نہیں ہو رہی ہے اور پھر خود بھی مسٹر کوسیجن کہتے ہیں کہ ۱۵۰ فی صد سالانہ زرعی پیداوار اور بڑھنے کے باوجود چونکہ آبادی بھی پچاس فی صد بڑھی اس لئے زرعی پیداوار ناکافی رہی۔ پیداوار کچھ بڑھی تو اس لئے کہ ایک کی جگہ سات سات آدمیوں نے کام کیا اگر وہی ایک آدمی رہتا اور آبادی میں اضافہ نہ ہوتا تو زرعی پیداوار بھی نہ بڑھتی لیکن جب پیداوار کا فی صد دکھانا ہوتا ہے تو آبادی کو الگ نکال کر دکھایا جاتا ہے کہ ہمارے سوشلزم سے یہ اضافہ ہوا ہے حالانکہ اضافہ اسی آبادی نے کیا ہے جس کے لئے کہا جاتا ہے کہ اضافہ کے باوجود زرعی پیداوار اس آبادی کے لئے ناکافی ہے۔ سوشلسٹ نظام چاند پر آدمی تو بھیج سکتا ہے لیکن اپنے مزدوروں اور کسانوں کے لئے دو وقت کی روٹی نہیں پیدا کر سکتا۔ جن غریب کسانوں اور مزدوروں کے لئے اس نظام کو وجود میں لایا گیا ہے وہ گذشتہ پچاس سال سے سر مار رہا ہے اور آج تک خود تمہارے اعتراف کے مطابق اتنی پیداوار نہیں کر سکا کہ ان کو چین سے دو وقت کی روٹی فراہم کر سکے

۱۵۔ چین کی زراعت میں سوشلزم کی ناکامی

چین میں جو زرعی بحران رہا ہے اس کی تفصیل میں جانے سے قبل یہ بتا دینا ضروری ہے کہ چینی زراعت ماضی میں بالعموم تین فرائض انجام دیتی رہی ہے۔ آبادی کے لئے غذا کی فراہمی، کپڑے اور غذائی صنعتوں کے لئے خام مال کی فراہمی اور ملکی برآمدات کے لئے مضبوط بنیاد کی فراہمی۔ اشتراکی حکومت کے قبضہ سے پہلے ملک طویل عرصہ تک خانہ جنگی کا شکار رہا۔ اس دوران میں ذرائع آمد و رفت بھی بہت متاثر ہوئے اس لئے زرعی حالت بہت بگڑی ہوئی تھی۔ اشتراکی انقلاب کے بعد اس خانہ جنگی کا سلسلہ ختم ہوا اور ملک میں امن و امان قائم ہوا۔ ذرائع حمل و نقل بحال ہوئے اور اس طرح ۱۹۵۲ء تک دوبارہ پیداوار اپنی پچھلی پوزیشن پر آ گئی۔ اس کے بعد پہلا پانچ سالہ منصوبہ ۱۹۵۳ء تا ۱۹۵۷ء کے لئے بنایا گیا۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق خوراک کی پیداوار میں ۱۹ اُنیس بیس (۲۰) فی صد اضافہ ہوا۔ لیکن آبادی میں بھی گیارہ فی صد اضافہ ہوا۔ اس طرح ڈیڑھ (۱ء۵) فی صد فی کس سالانہ کے حساب سے خوراک کی

18/ 23rd Congress of the CPSU, 1966, Moscow, p. 175.

پیداوار میں اضافہ ہوا۔[۸۵] لیکن حقیقت یہ ہے کہ خود سرکاری اعداد و شمار کے مطابق یہ سارا اضافہ اور ترقی ۱۹۵۵ء سے پہلے کی ہے یعنی یہ سارا اضافہ اس وقت تک کا ہے جب تک کہ زمینوں کو اجتماعی ملکیت میں نہیں لیا گیا تھا۔ یعنی ۱۹۵۵ء سے پہلے تک زراعت میں سوشلزم کا محض نام ہی نام تھا اصل سوشلزم کی ابتدا زرعی معاملات میں ۱۹۵۵ء سے ہوئی جب کہ کسانوں سے مختلف بہانوں سے زمین لے کر اجتماعی ملکیت کے فارم بنانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ۱۹۵۵ء سے پہلے زرعی حالت ایسی ہی تھی جیسے کسی سوشلسٹ نظام میں ہو سکتی تھی۔ اور اگر اجتماعی ملکیت کا سلسلہ نہ شروع کیا گیا ہوتا تو جس طرح ۱۹۵۵ء تک زرعی حالت روز بروز بہتر ہو رہی تھی اسی طرح شاید اور بہتر ہوتی رہتی لیکن ۱۹۵۵ء سے سوشلزم کا نفاذ شروع ہوا اور اس کے بعد سے زرعی پیداوار میں ترقی کی رفتار بھی گرنے لگی۔ اگرچہ حکومت نے اس کمی کو چھپانے کی بہتیری تدبیریں کیں لیکن حقیقت زیادہ عرصہ تک چھپ نہ سکی۔ چینی اخبارات اور رسالوں میں غذائی قلت اور سخت قسم کی راشن بندی کی رپورٹیں شائع ہونے لگیں۔ شہری علاقوں میں تو یہ راشن بندی روز بروز سخت ہوتی گئی[۸۶] پھر دیہاتی علاقوں سے غلہ اور اناج کی فراہمی میں مشکلات کی رپورٹوں سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ زرعی حالات روز بروز بد سے بدتر ہونے لگے تھے۔ اجتماعی ملکیت کے کھیت تشکیل دینے کے باوجود کہ جو حکومت کے کنٹرول میں تھے دیہی علاقوں سے زیادہ غلہ اور اناج حاصل نہ کیا جا سکا۔ جب پیداوار ہی گر گئی ہو تو بھلا حکومت کہاں سے غلہ حاصل کر سکتی ہے۔ جب کھیت اجتماعی ملکیت میں چلے گئے تو کسانوں نے اناج حکومت کو دینے کے بجائے خود زیادہ سے زیادہ استعمال کرنا بہتر سمجھا۔ اس طرح دیہی علاقوں میں خوراک زیادہ استعمال ہونے لگی اور شہری علاقوں میں سخت ضرورت کے باوجود خاطر خواہ سپلائی نہ ہو سکی۔[۸۶]

زمین کو اجتماعی ملکیت میں لینے کے بعد کسانوں کو جو غصہ آتا ہے اس کا سب سے زیادہ اظہار مویشیوں پر ہوتا ہے۔ کسان بیچارے حکومت کے خلاف تو کچھ کر نہیں سکتے اس لئے اپنا غصہ نکالنے کے لئے ان کے سامنے جانور ہی رہ جاتے ہیں۔ یعنی ان کی پرورش کی طرف سے لاپرواہی برتنی شروع کر دیں' انہیں بیمار ہونے اور مرنے دیں۔ انہیں وقت پر غذا نہ دیں۔ غرض ان کو پالنے کے لئے جس احتیاط اور شفقت کی ضرورت ہے اس طرف سے غافل ہو جائیں تو لازمی بات ہے کہ مویشیوں کی تعداد گھٹے گی۔ روس میں بھی یہی ہوا تھا اور چین میں بھی یہی ہوا۔ پھر کسان صرف اتنے مویشی رکھتے ہیں جو ان کی اپنی دودھ و گوشت اور اپنے انفرادی چھوٹے پلاٹ کی ضروریات پوری کر سکیں اس سے زیادہ جو حکومت کو درکار ہیں اس طرف سے تغافل برتتے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۵۹ء میں چین کے اخبار JEN-MIN JIH PAO کی ۲۰ اپریل ۱۹۵۷ء کی اشاعت میں نہ صرف اس کا اعتراف کیا گیا کہ مویشیوں کی تعداد بہت کم ہوئی ہے بلکہ اس کے اسباب بھی سرکاری ادارہ شماریات (STATISTATICAL BUREQUE) کے حوالے سے یہ گنائے گئے (۱) اجتماعی فارم کی طرف سے بوڑھے، کمزور اور لاغر مویشیوں کو قبول کرنے سے انکار (۲) اجتماعی فارم کے کارپردازوں کو مویشی پالنے کا تجربہ نہ ہونا کہ مویشیوں کو اجتماعی طور پر کیسے پالا جائے (۳) اجتماعی فارم کی طرف سے ممبروں کے اپنے نجی (چھوٹے پلاٹ پر) کام کے لئے کوئی وقت بچنے نہ دینا (۴) غلہ کی کسانوں

---

۸۵ "Ten Great Years", pp. 11, 119, 124, by Helen Yin and YIO Yin

۸۶ "The Basic Situation of Planned Purchase and Planned Supply of Foodgrains in China, "Tung chi Kang-, tso, (Statistical Work" No. 19, Oct-1957, pp 28,31,32

میں تقسیم کے وقت مویشیوں کی غذا کے لئے کچھ نہ دینا، (۵) حکومت کے لئے حاصل کئے جانے والے غلہ کا کوٹہ بہت زیادہ ہونا کہ غلہ دوسرے کاموں کے لئے بچنے ہی نہیں پاتا۔ (۶) مویشیوں کی خریداری کے لئے حکومت کی مقرر کردہ قیمتوں کا انتہائی کم ہونا، (۷) کثرت کے ساتھ جانوروں میں بیماریوں کا پھیلنا۔[85]

سرکاری طور پر چینی اخبار میں اوپر کے جو اسباب گنائے گئے ہیں ان سے نہ صرف مویشیوں کی تعداد کے گھٹنے کی وجوہات معلوم ہوتی ہیں بلکہ عمومی زرعی حالت کا پتہ بھی چلتا ہے اور اجتماعی ملکیت کے فارم کے ذریعہ جب زرعی پیداوار کی جاتی ہے تو کس قسم کی مشکلات و پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں ان کی بھی تصویر سامنے آتی ہے۔ مثلاً یہ کہ اجتماعی فارم کے سبب اجتماعی طور پر مویشی پالنے کی شکل غلہ کی تقسیم کے نظام میں جہاں انسانوں ہی کو مشکل سے کھانے کو ملتا ہو وہاں مویشیوں کے لئے کون کھانے کو دے۔ کسی کے ذاتی مویشی کھیتوں میں گھس کر چر بھی نہیں سکتے اس لئے کہ کھیت کسی کی انفرادی ملکیت نہیں ہیں۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کسانوں سے اتنی بے گار لی جاتی ہے کہ ان کو اپنے انفرادی پلاٹ کے لئے بالکل کوئی وقت نہیں ملتا وغیرہ۔ غرض اوپر کے پیش کردہ سارے ہی اسباب سے چین میں زراعت کی ناگفتہ بہ حالت اور اجتماعی فارم کے سوشلسٹ نظام میں پوشیدہ کچھ خرابیاں وضاحت سے سامنے آتی ہیں سب سے بڑھ کر یہ کہ اس سے کم از کم ملک میں خوراک کی کمی کی بات پورے طور پر ثابت ہو جاتی ہے۔ یعنی چین میں اشتراکیت آنے سے پہلے چینی زراعت جو نہایت بنیادی کام کر لیتی تھی وہ اب سوشلزم کے بعد نہیں کر سکی۔ یعنی نہ ملک کے لئے خوراک کی فراہمی ہو سکی اور ظاہر ہے کہ اس کے سبب صنعتوں کے لئے بھی خام مال کی فراہمی کہاں سے ہو سکتی اور برآمد کا تو خیر سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے۔ یعنی سوشلزم کے رائج کرنے سے یہ برکت ہوئی کہ پہلے جو کچھ کھانے کو مل جاتا تھا وہ بھی نہ مل سکا۔ اضافہ تو کیا پہلے جیسی حالت ہی برقرار رکھنا مشکل ہو گیا۔ یہ ۱۹۵۷ء کی تصویر ہے جب کہ پہلا پانچ سالہ منصوبہ مکمل ہوا تھا۔

۱۹۵۵ء کے بعد زمینوں کو اجتماعی ملکیت میں لینے کے نتیجہ میں جو زرعی صورت حال سامنے آئی اس کو دیکھنے کے بعد خود اشتراکی لیڈر پریشان ہوئے۔ ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۷ء تک کے عرصہ کے لئے ایک بارہ سالہ منصوبہ بنایا گیا تھا۔ جنوری ۱۹۵۶ء میں اس منصوبہ کے خدوخال کا اعلان خود ماؤزے تنگ نے کیا تھا۔ یہ اس وقت پیش کیا گیا تھا جب کہ زمینوں کو اجتماعی ملکیت میں لینے کا کام بس شروع ہی ہوا تھا لیکن دو سال کے اندر اس میں جو مشکلات دیکھی گئیں تو اس کے نتیجہ میں چینی کمیونسٹ پارٹی نے چینی اخبار JEN MIN JIH POO کی ۲۶ اکتوبر ۱۹۵۷ء کی اشاعت میں "۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۷ء کے دوران زرعی ترقی کا نظر ثانی شدہ مسودہ" پیش کیا۔ جنوری ۱۹۵۶ء کے ابتدائی خاکہ کے بعد اکتوبر ۱۹۵۷ء میں نظر ثانی کر کے ایک نیا خاکہ پیش کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ جنوری ۱۹۵۶ء اور اکتوبر ۱۹۵۷ء کے عرصہ میں زرعی معاملات میں چینی لیڈروں کو کونسی چیزیں نظر آئیں کہ اپنے خاکہ پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہو گئے۔ نظر ثانی اگر اس طرح کی ہوتی کہ پہلے جو کچھ ہدف تھے ان میں مزید اضافہ کرنا مقصود ہو تو ایسی نظر ثانی یقیناً خوش آئند کہی جا سکتی ہے لیکن وہاں تو معاملہ بالکل برعکس ہے یعنی نظر ثانی کر کے ہدف کو کم کیا گیا۔ بارہ سال میں زیر کاشت لائی جانے والی زمینوں کا رقبہ ۱۰۰ لاکھ ہیکٹر سے کم کر کے ۶۰ لاکھ ہیکٹر کر دیا گیا۔ چاول کی کاشت کا رقبہ ۲۱۰ لاکھ ہیکٹر سے گھٹا کر ۱۴۷ لاکھ ہیکٹر کر دیا گیا۔ کپاس کی پیداوار فی ہیکٹر ۱۹۶۷ء میں ۹۰۰ سے ۷۵۰ کیلو سے

---

۸۵ "Economic Development of Communist China", by Choh Mingli, pp. 59-70.

گھٹا کر ۰۰ سے ۰۰ کیلو کر دی گئی۔ پہلے کہا گیا تھا کہ ہر اجتماعی فارم کو چاہیے کہ حکومت کا کوٹہ پورا کرنے کے بعد بچے ہوئے غلہ کی اتنی مقدار اسٹاک کرنے کی کوشش کرے کہ ایک سے دو سال کی ضروریات اس سے پوری ہو سکیں۔ اس کو گھٹا کر ایک سے دو سال کی بجائے تین، چھ، نو، بارہ اور اٹھارہ مہینے کر دیا گیا[86]۔ مقصد یہ کہ اجتماعی فارم کی جو تحریک اس نظر ثانی سے پہلے چلائی گئی اس سے پتہ چل گیا کہ غلہ کی زیادہ پیداوار ممکن نہیں ہے اس لئے ۱۲ سال کے بعد کا ہدف یہ رکھا گیا کہ ہر اجتماعی فارم کم از کم تین ماہ کا غلہ اسٹاک رکھنے کی کوشش کرے یعنی سوشلسٹ طریقہ سے جو زرعی ترقی ہوگی اس میں ۱۲ سال کے طویل عرصے کے بعد یہ توقع کی جاتی ہے کہ تین ماہ کا اسٹاک رکھنا ممکن ہو سکے گا۔ کیا یہی وہ رفتار ترقی ہے جو پس ماندہ ممالک کے لئے مثال بن سکتی ہے؟

اس ۱۲ سالہ منصوبہ کے تحت جو پہلا پانچ سالہ منصوبہ ختم ہونے کے بعد اختیار کیا گیا تھا۔ دوسرا پانچ سالہ منصوبہ بنایا گیا اور ۱۹۵۸ء میں عظیم چھلانگ (GREAT LEAP FORWARD) کا نعرہ بلند کیا گیا۔ اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ معاشی ترقی کا کام محض معیشت دانوں اور فنی ماہرین وغیرہ پر نہ چھوڑا جائے بلکہ سیاسی کارکنوں کو فوقیت دی جائے تو تیز رفتار معاشی ترقی ہوگی۔ اس پالیسی کے تحت بڑے اونچے اونچے ہدف رکھے گئے اور ہر سطح پر دو قسم کے ہدف مقرر کئے گئے۔ اوپر والوں نے نیچے والوں کے لئے زیادہ سے زیادہ ہدف رکھا۔ پھر نیچے والوں سے پوچھا گیا کہ تم اصل ہدف سے زائد کتنی پیداوار کر سکتے ہو تم اپنا ہدف بتاؤ۔ اس دوسرے زائد والے ہدف کو نیچے والوں نے اپنے سے نیچے والوں پر لازم کرکے ان سے پوچھا کہ تم اس سے زائد جتنی پیداوار کر سکتے ہو ہمارے ہدف سے زائد پیداوار کا ہدف دو۔ اس طرح یہ سلسلہ جب نیچے تک پہنچا تو یہ ہدف اتنے زیادہ بڑھ گئے کہ جن کی تکمیل کسی صورت میں اجتماعی فارم کے لئے ممکن نہ ہو سکتی۔ اس طرح جب بھی اوپر ذرا سا ہدف اونچا کیا جاتا تو نیچے پہنچتے پہنچتے وہ کئی گنا زیادہ بڑا ہو کر پہنچتا۔ گویا زرعی ترقی کا ایک واحد طریقہ یہی رہ گیا تھا کہ کاغذ پر ہدف کو زیادہ سے زیادہ اونچا کرنے میں مسابقت کی جائے۔ لیکن حقائق کی دنیا میں تو اس طرح کی خوش فہمیوں سے ترقی نہیں ہو سکتی۔ اس کا علاج چینی حکومت نے یہ نکالا کہ ۱۹۵۸ء اور ۱۹۵۹ء میں زرعی ترقی کے بہت اونچے اونچے اعداد و شمار شائع کرنے شروع کر دیئے حالانکہ فی الحقیقت اتنی زیادہ ترقی کسی صورت میں ممکن نہ ہو سکتی تھی۔ مثلاً ان جھوٹے دعوؤں میں سے چند دعوے یہ تھے کہ ۱۹۵۸ء میں خوراک اور کپاس کی پیداوار میں پانچ، دس فی صدی نہیں بلکہ ٹھیک سو فی صدی اضافہ ہوا ہے یعنی ان کی پیداوار ایک سال کے اندر یکایک دگنی ہو گئی ہے۔ اس طرح جو ہدف کہ ۱۲ سالہ منصوبہ میں نظر ثانی کے بعد ۱۲ سال بعد کے لئے رکھا گیا تھا وہ اچانک دو ہی سال میں حاصل ہونے کا دعویٰ کیا گیا[87]۔ اگر اس دعویٰ کو صحیح مان لیا جائے تو ماؤزے تنگ جس نے یہ ۱۲ سالہ منصوبہ پیش کیا اور منصوبہ بندی کے اسٹاف کو نالائق ماننا پڑتا ہے کہ جو ہدف ۲ سال میں حاصل ہو سکتا تھا اس کے لئے انہوں نے ۱۲ سال کا تخمینہ لگایا۔ اس لئے اس کو بنیاد بنا کر ۱۹۵۹ء کا ہدف بدل کر اسی مناسبت سے اونچا رکھا گیا۔ چونکہ ۱۹۵۸ء میں خوراک کی پیداوار ۳۷۵ء ۳ کروڑ ٹن کا دعویٰ کیا گیا تھا اس لئے ۱۹۵۹ء کے لئے ہدف ۵۲۵ء ۵ کروڑ ٹن رکھا گیا۔ اور ۱۹۵۸ء میں کپاس کی پیداوار ۳۳۲ لاکھ ٹن کا دعویٰ کیا گیا تھا اس لئے ۱۹۵۹ء

ح86 Economic Development of Communist China, p. 71

ح87 Chou En-Lai's "Report on Government's Work" at First Session of the 2nd National People's Congress on April 18, 1959, (New China, Fortnightly) No. 9, May 6, 1959, p. 2.

کے لئے ہدف ۵۰ لاکھ ٹن رکھا گیا۔ یہ سب اونچے اونچے دعوے اور ہدف اس صورت حال کے علی الرغم کئے جا رہے تھے جو ملک میں غذائی قلت کے سبب پیدا ہو گئی تھی۔ اس کا جواب یہ دیا گیا تھا کہ ملک میں غلا کی کمی پیداوار کی کمی کے سبب نہیں ہے بلکہ ذرائع حمل و نقل کی کوتاہیوں کے سبب ہے۔ کھیتوں پر بہت سارا غلہ اور اناج پڑا ہے لیکن اسے ادھر ادھر لانے لے جانے میں مشکلات پیش آ رہی ہیں اس لئے ملک میں غذائی قلت نظر آ رہی ہے۔ جن معاشی ماہرین نے اس طرح کے اعداد و شمار پر شبہ کا اظہار کیا ان کو کہا گیا کہ یہ "قنوطی" ہیں اور اس طرح کے لوگوں کے خلاف مختلف اقدامات کئے گئے۔ چنانچہ مسٹر آرتھر اے کوہن لکھتے ہیں کہ

"۔۔۔ "چھلانگ" ۔۔۔۔ لگانے کی اس مہم کے دوران چینی پریس میں پارٹی کے اندر مسلسل ایک ایسے گروہ کی موجودگی کا بار بار تذکرہ کیا جاتا رہا جو ان عظیم ذمہ داریوں کو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا جو "چھلانگ" کی اس مہم کا تقاضہ تھے "قنوطیوں کے اس گروہ" پر یہ الزام تھا کہ یہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ۱۹۵۸ء کے پیداوار کے دعوے بعد میں چل کر جھوٹے ثابت ہوں گے۔ اس مہم کے ایک سرکردہ پروپیگنڈہ باز مسٹر تان چن لن نے فروری ۱۹۵۹ء میں کہا کہ ابھی ایک ایسا گروہ موجود ہے جو ہمارے دعوؤں کو شک کی نظروں سے دیکھتا ہے اور یہ پوچھتا ہے کہ "اگر گیہوں کی وافر فصل ہوئی ہے تو کیوں آٹا بالکل نہیں ملتا؟" تان نے غصہ سے جواب دیا کہ "اگر ایسے لوگوں کی نظریاتی اساس جلد درست نہ کی گئی تو امسال کی "چھلانگ" کی مہم کو سخت نقصان پہنچے گا" چنانچہ پولٹ بیورو Polit-Bureaue کے ممبر اور سرکردہ معیشت دان مسٹر چن یارن کو ان کی پوزیشن سے اتار پھینکا گیا تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھی "قنوطیوں" کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو ان دعوؤں کو شک کی نظروں سے دیکھتے ہیں[88]۔۔۔۔"

لیکن معلوم نہیں بعد میں چین کی کی موجودہ ساری لیڈر شپ ہی کو کیوں نکال باہر نہیں کیا گیا جبکہ سارے چینی لیڈر قنوطی بن گئے اور سرکاری محکمہ اعداد و شمار کی جانب سے ۲۶ اگست ۱۹۵۹ء کو ایک اعلان "زرعی پیداوار کے اعداد و شمار میں ہم آہنگی کا اعلامیہ" کے نام سے جاری کیا گیا۔ اس میں پچھلے سارے جھوٹے دعوؤں کی پول خود سرکاری جانب سے ہی کھل گئی جیسا کہ نیچے کی جدول سے ظاہر ہے جس میں سارے اعداد و شمار چینی ذرائع ہی سے حاصل کئے گئے ہیں۔

۱۹۵۸ء میں خوراک و کپاس کی پیداوار کے دعوے، منصوبے اور حقائق کے اعداد و شمار

یونٹ : لاکھ ٹن

۱۹۵۸ء		۱۹۵۹ء		
پہلے دعوے (جھوٹے) (ا)	اعتراف حقیقت (ب)	ابتدائی ہدف (ج)	نظرثانی شدہ ہدف (د)	حقیقی پیداوار (ر)

88 "Maoism" by Arthur A. Cohen in "Marxism in the Modern World" by M. M. Drakovitch, 1965, p. 175.

خوراک کی فصل:	۳۷۵۰	۲۵۰۰	۵۲۵۰	۲۷۵۰	۲۷۰۰۲۵
کپاس:	۳۲۵	۲۱۰	۵۰	۲۳۱	۲۴۱

ماخذ

و:۔ سرکاری محکمہ اعداد و شمار "قومی معیشت کی ترقی کا اعلامیہ" شائع کردہ "عوامی روزنامہ" مورخہ ۱۵ اپریل ۱۹۵۹ء

ب:۔ " "زرعی پیداوار کے اعداد و شمار میں ہم آہنگی کا اعلامیہ" "عوامی روزنامہ" مورخہ ۲۷ اگست ۱۹۵۹ء

ج:۔ "چینی کمیونسٹ پارٹی کی آٹھویں مرکزی کمیٹی کے چھٹے اجلاس کا اعلامیہ" " " مورخہ ۱۸ دسمبر ۱۹۵۸ء

د:۔ "۱۹۵۹ء میں چین کی قومی معیشت کی ترقی کا پریس کمیونک" " " مورخہ ۲۲ جنوری ۱۹۶۰ء

۱۹۵۸ء میں جس سو فی صد اضافہ کا دعویٰ کیا گیا وہ بعد میں ۳۵ فی صد نکلا۔ گویا ۶۵ فی صدی کے جھوٹ کو سرکاری طور پر تسلیم کیا گیا۔ باقی بچے ہوئے ۳۵ فی صدی میں سے بھی بہت سے معاشیین کا خیال ہے کہ اس میں بھی مزید جھوٹ کا عنصر خاصا موجود ہے جس کے ثبوت میں وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر بالفرض ۳۵ فی صد بھی ۱۹۵۸ء میں اضافہ ہوا تھا تو اس کا اثر فی کس پیداوار کی زیادتی، برآمدات یا اسٹاک کی زیادتی کی شکل میں ظاہر ہونا چاہئے تھا۔ لیکن اس کے بجائے چینی پریس میں الٹی غذائی قلت کی شکایات نہ صرف ۱۹۵۸ء میں شائع ہوتی رہیں بلکہ ۱۹۵۹ء میں یہ قلت نہایت شدید اور سنگین ہو گئی جبکہ ۱۹۵۹ء میں مزید اضافہ پیداوار کے ہدف رکھے گئے تھے اس دوران میں برآمد میں جو اضافہ ہوا وہ اتنا قلیل تھا کہ اس ۳۵ فی صد اضافہ کو صحیح تسلیم کرنے کے لئے کافی نہیں تھا اب آخری صورت یہ رہ جاتی ہے کہ یہ زائد اضافہ شاید اسٹاک کر لیا گیا ہو۔ یعنی یہ کہ عوام بھوکے مریں تو انہیں بھی کھانے کو نہ دیا ہو اور برآمد بھی نہ کیا ہو بلکہ کہیں گوداموں میں رکھا ہو۔ لیکن چین میں اسٹاک رکھنے کی سہولتوں کے جو اعداد و شمار ہیں ان کے حساب سے اتنے گودام ہی نہیں ہیں کہ چار کروڑ ٹن غلہ اسٹاک کیا جا سکتا اور نہ ہی اس زمانہ کے اخراجات کے کالم میں گوداموں کی تعمیر کے کسی منصوبے کے نشان ملتے ہیں اور اگر بالفرض کہیں چھپے ہوئے گودام مان بھی لئے جائیں تو ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۱ء میں جب قحط جیسی صورت حال پیدا ہوئی اس وقت اس اسٹاک کو باہر آنا چاہئے تھا۔ یہ بھی نہیں ہوا۔ قصہ مختصر یہ کہ اپنے ابتدائی سو فی صد اضافہ کے دعوے میں سے چینی حکومت نے ۶۵ فی صد دعویٰ جھوٹا ہونا تسلیم کر کے یہ توقع کی تھی کہ باقی ۳۵ فی صد کے اعداد و شمار کو تو لوگ سچا مان لیں گے لیکن معاشیین نے حتمی دلائل کے ساتھ اور خود تلخ حقائق نے یہ ثابت کر دیا کہ خوراک کی پیداوار میں ۳۵ فی صد اضافہ کا دعویٰ بھی غیر صحیح ہے۔ محض پروپیگنڈے کے بل پر لوگوں کو زیادہ عرصہ تک دھوکہ نہیں دیا جا سکتا۔ سوشلزم کا سب سے اہم ہتھیار یہ پروپیگنڈا ہی ہے۔

۱۹۵۸ء اور ۱۹۵۹ء میں کسانوں کی زمین کو اجتماعی ملکیت بنانے کے نتائج زرعی پیداوار اور مویشیوں کی کمی اور ملک میں غذائی قلت اور کسانوں کے کام نہ کرنے کے جذبہ کی شکل میں نمودار ہو چکے تھے لیکن اس سے کوئی سبق لینے اور صحیح نتیجہ اخذ کرنے کی بجائے سوشلزم کی الٹی منطق سے کام لیا گیا۔ یعنی کسانوں کے پاس انفرادی ضروریات کے لئے جو چھوٹا سا ۔۔۔۔۔

پلاٹ رہنے دیا گیا تھا وہ ۱۹۵۸ء میں شروع کی گئی نئی زرعی تنظیم "کمیون" کے تحت چھین لیا گیا۔ اس میں کئی کئی
اجتماعی فارموں کو ملا کر ایک کمیون کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس کمیون کے فرائض میں زرعی ترقی ہی نہیں تھی بلکہ اپنے وسیع علاقہ کی
صنعتی، تعلیمی، تمدنی ہر لحاظ سے ترقی کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ اس میں کام کرنے والے کسانوں کے "پیداآور بریگیڈ" کے نام سے جتھے بنائے
گئے اور سب کے سب مزدور بنا دیئے گئے جنہیں اجرت (کچھ زر اور کچھ غلہ کی شکل میں) دی جاتی تھی۔ اس طرح تمام چینیوں کو مزدور
بنا دینے میں یہ سہولت تھی کہ ان بھیڑ بکریوں کی جب صنعت میں ضرورت ہوتی انہیں ادھر ہانکا جا سکتا اور جب زراعت میں ضرورت
ہوتی تو زراعت کی طرف۔ کسان پہلے کے اجتماعی ملکیت کے کھیتوں collective کے نظام ہی سے کون سے خوش تھے کہ جیسے
وہ نظام مکمل ہوا اس دوسرے کمیون کے نظام کی آفت ان پر آن پڑی۔ پہلے ان کے پاس کم از کم اپنے چھوٹے انفرادی پلاٹ تو تھے
جن پر کچھ اگا کر یا جن کے ذریعہ کچھ کما کر اس کمی کو کسی حد تک پورا کیا جا سکتا جو حکومت کی طرف سے ملنے والے راشن اور کم اجرتوں کے
سبب ہوتی تھی۔ دوسرے یہ کہ پچھلے نظام میں برائے نام ہی سہی انہیں اجتماعی فارم کا حصہ دار کہا جاتا تھا کیونکہ ان کی زمین اس میں لگائی
گئی تھی لیکن اس نئے نظام میں تو وہ برائے نام پوزیشن بھی نہیں رہی بلکہ صرف مزدور بن کے رہ گئے کہ اگر کھانے کو کچھ کم پڑے تو اپنے
پلاٹ ہیں نہ مویشی کہ جن کے ذریعہ کمی پوری کر سکیں۔ پھر تیسرے یہ کہ پہلے تو کچھ آزادی بھی تھی کہ اگر انفرادی پلاٹ سے ضرورت پوری ہو جائے
تو اجتماعی فارم میں آدمی کام نہ کرے لیکن اب یہ رہی سہی آزادی بھی ختم۔ اگر زندہ رہنا ہے تو لازماً حکومت کا مزدور بننا پڑے گا جس میں
اوقات کار بھی طویل اور ہفتہ میں ایک دن کی چھٹی بھی نہیں، مہینہ بھر میں کل دو چھٹیاں۔ محنت زیادہ اور اجرت بھی کم اور ڈسپلن فوجیوں جیسا
کہ ذرا چوں وچرا کی گنجائش نہیں۔ اور اس نظام کے متعلق یہ دعویٰ کیا گیا کہ یہ ہے اصل کمیونزم یعنی ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق
کھانے کو دینا اور ہر ایک سے اس کی صلاحیت اور قوت کے مطابق کام لینا۔ جس قوم کی شامت آئی ہو وہی ایسے کمیونزم کو پسند کر سکتی
ہے، جو کمیون کے نام پر چین میں رائج کیا گیا۔ ایک ایسے نظام میں زرعی پیداوار اور کسانوں کی خوشی و خوشحالی کی کوئی کیا توقع کر سکتا ہے ؟
اور عملاً ایسے ہی نتائج نکلے جیسے کہ اس سوشلزم میں توقع کئے جا سکتے تھے۔ وہی ہوا کہ جو سوشلزم میں ہونا ہی چاہئے تھا۔

یہ دیکھنے کے لئے اب ہم واپس اسی اعداد وشمار کی دنیا میں جانا چاہتے ہیں۔ ۱۹۵۹ء کی حقیقی پیداوار کے اعداد وشمار کے بعد
جو دعوؤں کے تقریباً آدھے سے زائد کسی صورت میں نہ ہو سکے تھے چینیوں نے پھر کبھی سالانہ ترقی کے اعداد وشمار شائع نہیں کئے۔ اس
لئے ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۱ء میں جو صورت حال رہی اس کے اعداد وشمار کو خود چین کی اشتراکی حکومت نے قابل اشاعت نہیں سمجھا لیکن
سرکاری طور پر اتنا اعتراف پھر بھی کرنا پڑا کہ ۱۹۵۸ء کے بعد سے پیداوار بڑھنے کے بجائے کافی گر گئی۔ اور یہ گر کر ۱۹۵۲ء بلکہ ۱۹۵۱ء
کی پوزیشن پر پہنچ گئی ہے[۴۹]۔ گویا ۱۹۵۸ء میں "کمیون" بنانے کا جو سلسلہ شروع کیا گیا تھا اس کے بعد پیداوار بڑھنے کی بجائے گھٹنے لگی
اور ۱۹۶۱ء میں گھٹ کر ۱۹۵۱ء کے برابر ہو گئی۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ۱۹۵۲ء تک چین کی زراعت ترقی کر رہی تھی کیونکہ اس وقت
تک سوشلزم اس میں داخل نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد اجتماعی ملکیت کے کھیت کا نظام شروع ہوا تو چینیوں نے جھوٹ بول بول کر
جان بچائی۔ پھر اس کے بعد ۱۹۵۸ء سے "کمیون" کا نظام یعنی سوشلزم کو اپنی معراج کمیونزم کے قریب پہنچا دیا تو پھر ۱۹۶۱ء میں پیداوار

---

۴۹ ,Peking Review, Vol. 40, Oct. 6. 1961. p. 6-9.

گھوم کر واپس اسی جگہ چلی آئی جہاں کہ ۱۹۵۵ء میں سوشلزم میں داخل ہونے سے پہلے تھی۔ گویا ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۱ء تک چھ سال کے عرصہ میں سوشلزم کے نئے نئے تجربے کرنے کے بعد نتیجہ دیکھا تو ۱۹۵۵ء کے مقابلہ میں صفر نکلا۔ گویا یہ چھ سال یوں ہی ضائع ہوئے۔

چنانچہ حالت ۱۹۶۲ء میں غذائی صورت حال اس قدر ابتر ہوچکی تھی کہ خود چین کی اشتراکی افواج میں عدم اعتمادی پیدا ہونے لگی تھی۔ امریکیوں نے کسی طرح چین کے انتہائی صیغہ راز کے کچھ کاغذات اور رپورٹیں ہتھیالیں جن میں سے ایک اس عنوان کے تحت تھی "چین کی عوامی آزاد فوج کے سیاسی محکمہ کی سرگرمیوں کی رپورٹ"۔ یہ رپورٹ اب امریکی لائبریریوں میں بالعموم ہر جگہ پائی جاتی ہے اس کی رو سے ۱۹۶۱ء میں فوجیوں کے راشن میں بھی غذائی قلت کے سبب حکومت کو کمی کرنی پڑی تھی۔ کچھ تو اس وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ فوجی اپنے چاروں طرف اپنے دوستوں اور عزیزوں سب کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ رہے تھے۔ فوجیوں کے اندر نظم و ضبط کی شدید کمی آگئی تھی۔ جب خود فوجیوں کی یہ حالت ہوگئی ہو تو پھر بے چارے عوام کی کیا گت نہ بنتی ہوگی۔ خود پارٹی کے کارکنوں میں سخت بے چینی پیدا ہوگئی تھی۔ کسانوں میں تو نوبت یہاں تک آگئی تھی کہ کئی جگہوں پر بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی تھی، جس سے مقامی نظم و ضبط بالکل ختم ہوچکا تھا۔ یہ ساری باتیں اس انتہائی راز کی رپورٹ میں موجود ہیں جو کسی دل جلے چینی کے ذریعہ مختلف ہاتھوں سے گذرتی ہوئی کسی طرح امریکیوں کے ہتھے چڑھ گئی۔

اس رپورٹ کے علاوہ دوسرے ذرائع سے بھی جو خبریں ملیں ان تمام سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اشتراکی چین کے رہنماؤں کو کسانوں کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لئے خود اپنی پارٹی کے بعض کارکنوں کو یہ کہہ کر بھینٹ چڑھانا پڑا کہ ان لوگوں نے کسانوں پر سخت ظلم کیا تھا۔ (KUWANG TUNG) کوانگ تنگ میں عوامی عدالتیں قائم کرکے کئی پارٹی سیکرٹریوں کو موت کی سزا دی گئی کہ انھوں نے کسانوں پر ظلم کیا تھا۔ یہ سارا ڈرامہ کسانوں کی بغاوتیں فرو کرنے کے لئے کھیلا گیا۔[۹۵] پھر اشتراکی رہنماؤں نے قدم پیچھے ہٹائے اور اعلان کیا کہ انفرادی پلاٹ کسانوں کو واپس کر دیئے جائیں گے۔ اس طرح "کمیون" کے نظام میں سوشلزم کو جس معراج پر پہنچایا گیا تھا اس سے پھر واپس قدم لوٹانے پڑے اور ساری دنیا پر یہ ثابت ہوگیا کہ کسانوں کی انفرادی ملکیت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرنا زراعت کو تباہ کرنے کے مترادف ہے۔ سوشلزم کے اصول کے تحت تو ساری املاک صرف اجتماعی ہی ہونی چاہئیں۔ لیکن روس بھی مجبور ہے کہ کسانوں کو کم از کم چھوٹے سے انفرادی ملکیت کے پلاٹ کی اجازت دے، چین بھی مجبور تھا کہ ایسا ہی کرے، اور جب چین نے سوشلزم کے تقاضے کے تحت اسے چھیننے کی کوشش کی تو بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی جو طاقت کے زور سے بھی نہ دب سکی۔ بالآخر سوشلزم کو گھٹنے ٹیک دینے پڑے اور کسانوں کو صرف اسی طرح ٹھنڈا کیا جا سکا کہ ان کی انفرادی ملکیت کے چھوٹے پلاٹ انھیں واپس دے دیئے گئے۔ ماؤزے تنگ نے کسانوں کی انفرادی ملکیت کے چھوٹے پلاٹ بھی چھین کر سوشلزم کا communeکا نظام نافذ کرنے کا جو جُوا کھیلا تھا وہ ماؤ کی زندگی کی سب سے بڑی ناکامی ثابت ہوئی۔ اس کے بعد ماؤزے تنگ کو یہ سوجھی کہ ابھی چینی عوام روایت پرست ہیں اور ان کے دلوں سے اپنی پرانی

---

۹۵ "Maoism", op. cit. p. 179.

۳

اشتراکیت

اور

مسلمان

★

احمد انس	• محمد قرآن اور اسلام
آبادشاہ پوری	• روسی استعمار کی مسلم کش پالیسی
آبادشاہ پوری	• اشتراکی سامراج اور وسط ایشیا کے مسلمان

"اشتراکیت کے ثقافتی انقلاب کے اہم ترین کاموں میں
سے ایک جو عوام کی عظیم قوت کو متاثر کرنے والا ہے یہ ہے کہ اس نے
نہایت صحیح ترتیب اور منصوبہ بندی کے ساتھ اور استقلال پیہم
کے ساتھ مذہب کیخلاف جنگ کی ہے ۔ مذہب جو عوام کے
لئے افیون کا درجہ رکھتا ہے .... پرولتاریہ کی حکومت کو
عوام کو پوجا پاٹ کی اجازت دے گی لیکن وہ ماقبل میں غلبہ
رکھنے والے مذہب کی مخصوص امتیازی حیثیت کو لازماً ختم
کر دے گی اور جتنے وسائل بھی اس کے پاس ہیں ان کو
مذہب کیخلاف پروپگنڈے لئے استعمال کرے گی۔ اور اپنے تمام تعلیمی
نظام کو سائنسی مادیت کی بنیادوں پر از سرنو تشکیل دیگی"

{عالمی اشتراکی تحریک کا پروگرام
مطبوعہ ۱۹۳۶ء، صفحہ: ۵۴}

محمد، قرآن اور اسلام

روسی مستشرقین کی نظر میں

احمد انس

یہ کوئی انوکھی بات نہیں کہ غیر مسلم اسلام کو بگاڑ کر پیش کریں۔ اسلام اور غیر اسلام کی کشمکش کی تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ غیر مسلموں نے اسلام کے عقائد اور اس کی تعلیمات کو مسخ کر کے اسے دوسروں کے لئے قابل نفرت اور مستوجب دہشت بنانے کی کوشش کی ہے۔ مکہ میں اسلام کی دعوت کے دور اول سے لے کر آج تک مخالفوں کی تکنیک یہی رہی ہے۔ اور یہ اس بنا پر ہے کہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اپنی اصل شکل میں یہ پیغام دلوں میں گھر کرنے والا ہے۔ ماضی قریب میں جب کہ بیشتر مسلم ممالک مختلف استعماری طاقتوں کے سیاسی غلبہ کا اور اس کی جلو میں آنے والے بے شمار تہذیبی و فکری مسائل کا شکار رہے ہیں، یہ کوششیں بہت کھل کر سامنے آگئی ہیں۔ اب ان کا مقصد صرف یہ نہیں رہا تھا کہ غیر مسلموں کو اسلام سے بدظن کر کے انہیں اس طرف آنے سے روکا جائے بلکہ یہ بھی تھا اور اسی کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ کہ خود مسلمانوں کو اسلام سے بدظن کر کے ان کی قوت کے اصل سرچشمہ کو ختم کیا جائے اور اس طرح انہیں کمزور کر کے، ان کے رشتے اپنی تاریخ، تہذیب اور مذہب سے کاٹ کر انہیں اپنی سیاسی سیادت اور تہذیبی غلبہ کا آلہ کار بنایا جائے استعماری طاقتوں کو اپنی نو آبادیوں کے وسیع خطہ ہائے اراضی میں مسلمانوں کی کثیر آبادیوں سے ان کی صدیوں کی جمی جماتی سلطنتوں سے اور مضبوط جڑیں رکھنے والی تہذیبی اور معاشرتی روایات سے سابقہ درپیش تھا۔ برطانیہ ہو یا فرانس، اٹلی ہو یا روس، اسلام اور مسلمان ان کے لئے آئندہ مسئلے تھے اور انہیں اس سے نبٹنا تھا۔ مغربی طاقتوں نے اس باب میں جو کچھ کیا ہے۔ آج ان کے زیر نگیں رہنے والے علاقوں کی سیاسی آزادی کے بعد کھل کر سامنے آچکا ہے، اور ہم ہندو پاکستان کے مسلمان خود اپنے تجربے کی بنا پر اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔ لیکن وسط ایشیا کی مسلمان ریاستوں میں اشتراکیوں نے جو تدابیر اختیار کیں اور اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ جو بدترین سلوک کئے وہ ان علاقوں کی ہنوز غلامی کے سبب[1] اور اشتراکیوں کے آہنی پردہ کی بنا پر

---

[1] دور حاضر کی تاریخ کا یہ کیسا المیہ ہے کہ وسط ایشیا کے ان مظلوم مسلمانوں کی آزادی کے لئے آواز اٹھانے والا اب کوئی نہیں ہے۔ عالمی سیاسی صورت حال نے مسلم ممالک کو اس پوزیشن میں ڈال دیا ہے۔ یا مسلم ممالک نے اپنے کو اس پوزیشن میں مبتلا کر دالیا ہے ———— کہ وہ روس کی اس مسلسل (باقی صفحہ ۲۹ پر ملاحظہ ہو)

میں، دنیا کے سامنے اپنی حقیقی شکل میں نہیں آتے ہیں۔

۱۹۱۷ء کے اشتراکی انقلاب کے بعد روس میں جو حکومت قائم ہوئی ہے، وہ استعماریت اور اشتراکیت کے بدترین امتزاج کا مظہر ہے۔ اس نے قوت و طاقت، ظلم اور تشدد، دھوکہ اور فریب، ہر تدبیر کو کام میں لاکر وسط ایشیا کے مسلمان علاقوں پر اپنا تسلط قائم کر لیا[1]۔ اور پھر ایک سوچی سمجھی پالیسی کے تحت مسلمانوں کو بحیثیت مسلمان نیست و نابود کرنے کے لئے ایک منظم منصوبہ پر کام کیا اور آج تک کر رہے ہیں[2]۔ یہ الگ بات ہے کہ مسلمانوں کا نام و نشان مٹانا کوئی آسان کام نہ تھا اور اشتراکی ہر قسم کے جبر و استبداد کے باوجود اس میں بری طرح ناکام ہوتے ہیں[3]، اور اسلام کی زندگی کے آثار ان علاقوں میں اب بھی نظر آتے ہیں[4]۔

اشتراکیوں کی ایک بنیادی تکنیک مذہب اسلام، اس طرح کے عقائد و عبادات اور معاشرتی روایات کے خلاف پروپیگنڈہ کی ایسی مسلسل مہم تھی جو جبر و استبداد کے انتظامی محاذ کے ساتھ ساتھ فکری محاذ پر جاری رہے اور مسلمانوں کو نامسلمان بنائے۔ مذہب کے بارے میں ان کا موقف کوئی راز نہیں ہے[5] اور اسلام سے جس نے عملی تجربہ کے بعد ان کی یہ شکایت بڑھتی ہی گئی ہے کہ اس کے ماننے والے اسے آسانی سے نہیں چھوڑتے، ان کی خصوصی دشمنی اور نفرت و غصہ کی وجہ آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے۔

وسط ایشیا کی مسلمان ریاستوں میں مسلمانوں کے بے شمار بلند پایہ علمی و تحقیقی مراکز تھے۔ اور لاکھوں مدارس دینی علوم کی اشاعت میں مشغول تھے۔ منظم منصوبہ کے تحت ان مدارس کو ایک ایک کر کے ختم کیا گیا۔ تاکہ کمیونسٹ پروپیگنڈہ کے توڑ کا کام مسلمانوں کے لئے عملاً ناممکن ہو جائے۔ علمی و تحقیقی مراکز کو ختم کیا گیا یا اپنے حسب منشا تحقیق کے مراکز میں تبدیل کر دیا گیا۔ ایسے مراکز قائم کئے گئے جہاں مارکسزم کی روشنی میں اسلام کو جدید شکل عطا کی جائے اور پھر یہاں کی تحقیقات کے خطوط پر سارے مسلمان علاقوں میں کام ہو۔ کمیونسٹ مستشرقین کی ایسی پوری ٹیم تیار کی گئی جو علوم اسلامی کو پڑھے ہوئے ہوں۔ مسلمانوں کی تاریخ سے واقف ہوں اور پھر اس تاریخ کو مارکسی نظریات کے مطابق ڈھال کر پیش کر سکیں۔

استعماریت سے آنکھیں بند کئے ہوتے ہیں۔ اگر آج مسلمان اسلام کی بنیاد پر متحد ہو کر عالمی طاقت بنیں تو اس کے امکانات پیدا ہوں گے کہ ازبکستان، آذربائیجان، تاجکستان اور وسط ایشیا کی دوسری تاریخی اسلامی ریاستوں کی آزادی کیلئے آواز اٹھے اور سمرقند و بخارا اور تاشقند تہذیب اسلامی کے جیتے جاگتے مراکز کی شکل میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکیں۔ اتحاد اسلامی روس کیلئے ایک ڈراؤنے خواب کی حیثیت رکھتا ہے اور اسکے ذکر پر ہی اس کے بھڑکنے کی وجہ صاف سمجھی جا سکتی ہے۔

[1] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو۔ اس اشاعت خاص میں، جناب آباد شاہ پوری کا مضمون۔ "روسی استعمار کی مسلم کش پالیسی"

[2] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو۔ جناب آباد شاہ پوری کا دوسرا مضمون، "اشتراکی سامراج اور وسط ایشیا کے مسلمان"

[3] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "روس میں اسلام" از والٹر کولارز۔

[4] اور انہی باقیات کو روسی ماہرین فن پروپیگنڈہ انتہائی چابکدستی سے عرب اور مسلم ممالک میں سوویت روس کے مسلمانوں کی مذہبی آزادی کے ثبوت کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔

[5] اس موضوع پر جناب شاہ رحمٰ کا مضمون "اشتراکیت اور مذہب" ملاحظہ فرمائیں۔

اس کے ساتھ ہی اس کا اہتمام کیا گیا کہ نشر و اشاعت کے تمام ممکنہ ذرائع استعمال کرکے ان باتوں کا مسلسل پروپیگنڈہ کیا جائے ریڈیو ٹیلیویژن، اخبارات و رسائل و مضامین، جیسے، مذاکرے، کارٹون، نمائشیں، ڈرامے، غرض رائے عامہ کو متاثر کرنے کے تمام ذرائع پورے سرکاری اہتمامات کے ساتھ اس مہم میں لگائے گئے۔ اس مہم کی خطرناکی کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے یہ بات پیش نظر رہنی ضروری ہے کہ ایک طرف عملاً بھی اسلام کو ملیامیٹ کرنے کے لئے انتظامی اقدامات انتہائی مستعدی سے کئے جا رہے تھے۔ لیکن دوسری طرف مسلمانوں کو کسی بھی طرح کے جواب دینے سے یا غلط فہمیاں دور کرنے کے ذرائع سے مکمل طور پر محروم کر دیا گیا تھا۔

یہ وہ پس منظر ہے۔ جس میں فکری محاذ پر روسی مستشرقین کی کاوشوں کا جائزہ لیا جانا چاہیے۔ اشتراکی حکومت کیلئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اسلام سے صرف نظر کرلے۔ چنانچہ انہوں نے اس سے براہ راست مقابلہ اور اس میں پوری دلچسپی لے کر اسے بگاڑنے اور مسخ کرنے کی پالیسی اختیار کی۔ روس میں اسلام اور مسلمانوں کے مسائل پر جس بڑے پیمانے پر طباعت و اشاعت کا کام اشتراکی دور حکومت میں ہوا ہے۔ وہ بظاہر ہمارے لئے تعجب کا باعث ہوگا، مگر اگر اس کے پیچھے کام کرنے والے مقاصد کو سامنے رکھا جائے، تو یہ تعجب دور ہو جاتا ہے۔ اس وسیع لٹریچر میں، اسلام کو بگاڑنے کی جو کوششیں کی گئی ہیں، ان کا تفصیلی جائزہ اس ایک مضمون میں لینا مشکل ہے۔ اس لئے ہم صرف چند اہم اقتباسات کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کریں گے کہ اسلام میں اس "علمی دلچسپی" کے اصل محرکات کیا ہیں اور عملاً یہ دلچسپی کن نتائج کی صورت میں سامنے آئی ہے۔

اسلام کا مطالعہ کیوں؟ اشتراکیوں نے اسلامی اور مشرقی علوم کے بارے میں جس سرگرمی کا مظاہرہ کیا ہے، اس کی وجہ خود ایک مستشرق ہی کی زبانی سنیئے۔

"اسلام سے متعلق ہمارے لٹریچر کو سوویٹ عوام بالخصوص ان علاقوں کے رہنے والوں کے لئے جہاں اب بھی مذہب اسلام کے اثرات ہیں، رہنمائی کا کام انجام دینا چاہئے۔ اس لٹریچر کو ہمارے پروپیگنڈہ کرنے والوں کے لئے ایسا مواد فراہم کرنا چاہئے۔ جس کی مدد سے وہ انسانی شعور میں مذہب، مذہبی روایات کے باقی ماندہ آثار، رسوم اور تصورات کے خلاف جنگ کر سکیں"[۹]

لندن یونیورسٹی کی فارسی کی پروفیسر این۔ کے۔ ایس لیمبٹن نے سوویٹ اسلامی تحقیقات کے مقاصد کو بڑی وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔

---

۷ بلکہ اسلام کو اس کی حقیقی شکل میں ماننے والوں کیلئے ہر طرح کی مشکلات اور ابتلا اور آزمائشیں تھیں اور عوام کے سامنے صورت یہ تھی کہ اسلام پر عمل مصیبتوں کو دعوت دینے اور اسے ترک کرکے حکومتوں کے مجوزہ اسلام کی حمایت دنیوی ترقی اور آسائشوں کے مترادف تھا۔

۸ انقلاب کے بعد مختلف تحریروں کے مسلمات کی نگرانی مرکزی ادارہ کے تحت مستشرقین کی ایک سائنٹفک ایسوسی ایشن قائم کی گئی جسے ۱۱ دسمبر ۱۹۲۱ء کو سرکاری طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ علاوہ ازیں تاشقند اور دوسرے شہروں میں اسکے باقاعدہ شعبے قائم کئے گئے۔ پیٹرز برگ کی سائنس اکیڈمی میں مشہور مستشرقین ان موضوعات پر مواد پیش کرتے رہے۔ ماسکو کی فوجی اکیڈمی میں مشرقی علوم کے شعبہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ تاشقند میں مشہور مستشرق ایشمار کی نگرانی میں اسلامیات کے مطالعہ کا مرکز قائم کیا گیا۔

"۔۔۔ انقلاب کے بعد مستشرقیات کے مطالعہ میں دو اہم نقطہ نظر رہنمائی کرتے ہیں۔ اوّلاً اس لئے کہ روسیوں کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ مسلمان قوموں کے سامنے کیمونزم کی زیادہ بہتر تشریح کرسکیں اور روسی مقاصد کو آگے بڑھا سکیں۔ دوسرے یہ کہ مسلمان قوموں کی تاریخ کی ایک نئی تعبیر کی گئی ہے۔ تاکہ وہ مارکسی نظام کے مطابق ہو جائے اور اسے روسی پالیسی کے مختلف پہلوؤں سے ہم آہنگ بنایا جائے"[13]

اسلام

مذہب اسلام کو سامراجیوں کا، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں اور سوویٹ روس کے دشمن غیر ممالک کا ایجنٹ[14] قرار دیا جا رہا ہے۔ اسے ترقی کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ کہا گیا ہے اور اشتراکی مقاصد اور نظریات کے بالکل مخالف قرار دیا گیا[15]۔

میر جعفر عباسوف باقروف نے ۱۲ جولائی ۱۹۵۰ء کو باکو میں آذربائیجان کیمونسٹ پارٹی کے زیر اہتمام تعلیم یافتہ طبقہ کے ایک اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔[16]

"اسلام جملہ غیر مسلموں کے ساتھ انتہائی عصبیت کا جذبہ رکھتا ہے۔ شروع سے عرب حکمرانوں نے مذہب کی آڑ میں اپنی سلطنت کو وسعت دینے کے لئے اور دوسری اقوام کو محکوم بنانے کے لئے تلوار اٹھائی۔ ملک گیری کی یہ جنگ جہاد فی سبیل اللہ اور غیر مسلم اقوام میں دین حق کی تبلیغ کے بہانے لڑی گئی۔ دوسرے مذاہب کی طرح مسلمانوں نے بھی اپنی ذاتی اغراض پوری کرنے کی خاطر اپنے پیروؤں کو تقدیر پرستی اور ظالم حکمرانوں کے سامنے سرتسلیم خم کرنا سکھایا۔ لفظ اسلام کے معنی ہی تسلیم اور اطاعت کے ہیں اور مسلم کے معنی تسلیم کرنے والا یا اطاعت کرنے والا۔ ایسے احول میں اسلام قبول کرنے والے طبقے بالخصوص رجعت پسند اور ملک گیر حکمرانوں کے ہاتھ بہترین آلہ کار بن گئے"[17]

بازورتھ (Bosworth) سے اپنی کسی تصنیف میں اسلام کی وہ صورت پیش کرنے میں کوتاہی ہو گئی جو اشتراکیت کو مطلوب ہے، تو سمرنوف اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھا۔

"۔۔۔۔۔۔۔ وہ اسلام کی طبقاتی خاصیت کو نہ سمجھ سکا اور اس حقیقت کا ادراک نہ کرسکا کہ اسلام ہمیشہ اور ہر جگہ محنت کش عوام پر جبر و استحصال کا آلہ کار رہا ہے۔"[17]

---

١٣ کتاب مندرجہ حوالہ ۹ کے مقدمہ میں۔

١٤ مسلمان علاقوں کے باشندوں کی طرف سے ہونے والی عام دینی مزاحمت اور عوام کی عام بغاوتوں کو بورژوا قوم پرستی کے زور سے کچلنے اور غداری کے الزام لگا کر پھانسیاں چڑھانے کے لئے یہ دعویٰ روسی حکومت کے لئے بہت مفید رہا ہے

١٥ ان سارے الزامات میں یہ آخری الزام ہے۔ جس سے ہمیں پورا اتفاق ہے۔

١٦ مناسبت لفظی ہی نہیں معنوی بھی ہے۔

١٧ یہ تقریر اس مذہب کے بارے میں ہو رہی ہے جس نے اطاعت تو ضرور سکھائی ہے۔ لیکن صرف ایک خدا کی اور مذاہب کی تفصیل صفحہ نمبر ۔۔۔)
١٩ بحوالہ نمبر ١۔

اس بارے میں فیصلہ کن بات پروفیسر کلیمووچ نے کی ہے۔ اس کی حیثیت سرکاری شارح اور ترجمان کی ہے اس نے اشتراکیت کے مقابلے میں اسلام کی نظریاتی پوزیشن بہت وضاحت سے متعین کر دی ہے۔

"اسلام ایک غیر سائنسی، رجعت پسند عالمی مذہب ہے جو لینن اور مارکس کے سائنسی نظریات سے کوئی مس نہیں رکھتا۔ اسلام روحانی اور حیات انگیز نقطہ نظر کا مخالف ہے۔ سوویت عوام کے مفادات اس کے ذریعے کبھی بھی حاصل نہیں ہو سکتے۔ یہ اپنے ماننے والوں کو ایک انسانی اشتراکی معاشرہ کے قیام سے باز رکھتا ہے"[1]

۱۹۳۱ء میں اسلام کے متعلق مقالات کا ایک مجموعہ شائع کیا گیا جس میں ڈونکی کا مقالہ "عہد جدید اور اسلام" اور بی۔ این کوولکف کا مقالہ "اسلام اور حکومت" شایع تھا۔ ان میں بتایا گیا تھا کہ اسلام اقتصادی مادیت کے ان نظریوں کا علمبردار ہے۔ جو مارکس اور لینن کے اصولوں کے بالکل مخالف ہیں۔[2]

اسلام کا آغاز

۱۔ اشتراکی محققین کو ایک مسئلہ یہ بھی درپیش تھا کہ وہ عرب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور اس کے بعد انتہائی مختصر مدت میں ان کی دعوت کی حیرت انگیز کامیابی اور وسیع حصہ ہائے ارض پر اس کی حکمرانی کے ایسے اسباب تلاش کریں جو ان کے مخصوص فلسفہ تاریخ کے مطابق ہوں۔ اس ضمن میں بڑی دلچسپ تحقیقات سامنے آئی ہیں۔ پانچ مختلف نظریات پیش کئے گئے ہیں۔ ہم انہیں بلا تبصرہ پیش کر رہے ہیں۔

کلیموویچ اور بعض دوسرے مستشرقین کا نظریہ یہ ہے کہ مذہب اسلام کی متحرک طاقت مکہ اور مدینہ کے بورژوا تاجروں نے فراہم کی تھی۔ اس کی وضاحت (M.A.Reysnner) نے یہ کی ہے کہ "عرب کے خانہ بدوش قبائل مکہ کی بیرونی تجارت کی نشو ونما میں مزاحم ہوتے تھے۔ محمد نے یہ کہہ کر کہ اللہ خود لین دین کرنے والا تاجر ہے۔ اسلام کے لیے نقطہ اتحاد فراہم کر دیا"

۲۔ این۔ اے۔ روزخوف (N-A-ROZKHOV) کا نقطہ نظر یہ ہے کہ محمد ایک جاگیردارانہ انقلاب لائے (لعنت اللہ علی الکاذبین)

۳۔ ایل۔ ایم ٹومر (L.M.TOMER) کا کہنا ہے کہ مکہ تجارتی دارالخلافہ تھا۔ لیکن مدینہ کی آبادی کسانوں پر مشتمل تھی۔ اسلام غریب اور مفلس طبقہ کا مذہب ہے۔ یہ حجاز کے مفلوک الحال کسانوں میں پھیلا۔

۴۔ ایم۔ اے۔ مارروزوف نے اپنی کتاب "اسلام کہاں سے آیا" میں لکھا ہے کہ اسلام ایک بحری حادثہ کا شاخسانہ ہے جو مکہ کے قریب بحر سرخ میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ عرب جزیرہ نما کسی مذہب کی تخلیق کرنے کے قابل نہیں ہے۔ کیونکہ وہ عام مہذب ممالک سے دور افتادہ ہے قرآن میں جو کہ بعد کی یعنی گیارہویں صدی کی تصنیف ہے[3] اس بحری حادثہ کا سراغ ملتا ہے۔

بقیہ نمبر ۱۵۔ اسکے ساتھ ساتھ چھوٹے خداؤں سے بغاوت کا درس دیا ہے یہی معنی ہیں لا الہ الا اللہ کے نیز اس مذہب کے متعلق ہے۔ جس کا اصل اصول ہی یہ ہے کہ ظالم حکمران کے سامنے کلمہ حق کا اظہار افضل ترین جہاد ہے۔ حدیث نبوی۔

[1] بحوالہ Walter Kolarz: The Soviet Attitude Towards Religion

[2] اسلام اور اشتراکیت کے معاشی اصولوں میں یکسانیت ڈھونڈنے والے ذرا اس پر غور کریں۔

[3] ہے نا بالکل نئی تحقیق:

۵۔ ایس۔ پی ٹولستوف کے مطابق، اسلام ایک ایسا مذہب ہے۔ جس کا آغاز غلاموں کے مالک طبقہ سے ہوا نہ کہ عرب، معاشرہ کے جاگیردار طبقہ سے۔[۱۲]

محمدؐ کی شخصیت اشتراکی اہل قلم کا ایک ہدف نبی کرم علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات کی ذات، ذوالاصفات بھی ہے۔ جہاں میں اس استہزا سے بحث نہیں جو اس بارے میں ان کے ادیبوں کا وطیرہ ہے۔ بلکہ صرف "علمی انداز" پر پیش کئے نظریات، بلکہ "تحقیقات" سے سروکار ہے۔ مغربی مستشرقین بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک ہی کو اپنی معتقدانہ تحریرات کا سب سے بڑا ہدف بناتے ہیں اور اشتراکی مستشرقین بھی یہ بھی "مدبری سرکار میں پہونچے تو سبھی ایک ہوگئے" کا ایک عجیب وغریب مظہر سرفہرست تحقیق کا وہ گروہ ہے۔ جو سرے سے نبی اکرمؐ کے تاریخی وجود ہی کا منکر ہے۔ اور یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ جو کسی ایک محقق نے کبھی کبھار قلم سے نکال دی ہو، بلکہ اس کے ماننے والوں میں سب سے زیادہ معروف اور "مستند" ماہر اسلام کلیمووچ بھی ہے۔ اولاً یہ نظریہ موروزوف نے پیش کیا، اور پھر محققین کی قابل لحاظ تعداد اس سے متاثر ہوئی۔ کلیمووچ نے ۱۹۳۰ء میں فلسفہ اکیڈمی میں ایک مقالہ پڑھا، جس کا عنوان تھا "کیا محمد کا وجود حقیقی تھا"۔ اس مقالہ میں اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ محض ایک مفروضہ ہے، تمام مصنفین جنہوں نے آپؐ کی سوانح حیات لکھی۔ آپؐ کی وفات کے کئی صدیوں بعد پیدا ہوئے، اور یہ ایک تاریخی مفروضہ ہے کہ ہر مذہب کے لئے ایک بانی کا ہونا لازم ہے۔[۱۳]

موروزوف نے وسط ایشیا کے قبائل کی دیو مالائی شخصیتوں پر اسے بھی قیاس کیا اور یہ کہا کہ محمدؐ کی شخصیت وسط ایشیا کی دیگر مذہبی دیومالائی شخصیتوں سے ملتی جلتی ہے۔ اس افسانے کا مقصد تاجروں، خانہ بدوشوں اور کسانوں کے سیاسی جتھے کو انتشار و افتراق سے محفوظ رکھنا تھا تاکہ اسلام کے ذریعہ حاصل شدہ نئے جاگیردارانہ خصائص کی طاقت برقرار رہے۔[۱۴]

وحی اولین آئی۔ این۔ وامیکوف (I.M. VAM/KOV) اس کی توجیہ علم الاقوام کی روشنی میں کرتا ہے۔ ایس۔ پی اولڈن برگ نے اپنے ۱۹۲۴ء کے ایک مقالہ میں اس افسانہ کی دو قسمیں کی ہیں۔ اوّل انفعالی، یعنی محمدؐ کا وحی الٰہی سے انکار کرنا اور دوم فعالی یعنی ان کا اسے باطمینان قبول کرلینا۔ انفعالی حیثیت سے محمدؐ کے چادر اوڑھوانے اور خود پر پانی ڈلوانے کی خواہش کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔

قرآن پاک قرآن پاک کے بارے میں مغربی مستشرقین کا یہ عام موقف کہ یہ محمد کی تصنیف ہے۔ روسی محققوں کے لئے صرف اس اختراع کا اظہار ہی کافی نہ تھا، چنانچہ انہوں نے اس بارے میں بھی "نئی تحقیقات" پیش کی ہیں یہ بات تو گذر ہی چکی ہے کہ ایک صاحب کے نزدیک یہ گیارہویں بارھویں صدی کی تصنیف ہے۔ اسمرنوف کا کہنا ہے کہ قرآن محمدؐ کی تصنیف

---

۱۲ S. mirnov: An Out-line of The History of Islamic Studies in U.S.S.R

۱۳ ایضاً

۱۴ ایضاً

نہیں، بلکہ اجتماعی تخلیقی کارناموں کا نتیجہ ہے[۲۳]۔ تالستوف اس کا کوئی تعلق نبی اکرم کی ذات اور ان کی زندگی سے اس لئے ماننے کے لئے تیار نہیں کہ اس میں ان مقامات کے نام نہیں۔ جہاں جنگیں لڑی گئیں اور نہ ہی ہجرت کا ذکر ہے کلیموویچ نے ایک کتاب مندرجات قرآن (contents of the Quran) لکھی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ قرآن میں جو کچھ ہے۔ اسے اس طرح مرتب کرکے پیش کیا جائے کہ وہ مذہب دشمنی پروپیگنڈہ کرنے والوں کے کام آسکے۔ مصنف کے دعوے کے مطابق یہ پہلی تصنیف ہے جو (نعوذ باللہ) قرآن کے اندرونی تناقض اور تضاد پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس کے مطابق قرآن خالصتاً استحصالی قوتوں (Exploitation) کے مفاد میں ضبط تحریر میں لایا گیا تھا اور مظلوم (Exploited) لوگ وہ تھے جو تابعداری اور تسلیم و رضا کی بنا پر تسکین قلب کے لئے مستقبل کی آسمانی زندگی پر یقین رکھتے تھے۔ یہ گروہ اس طرح۔ قرآن کی مدد سے۔ استحصال کرنے والوں کا آلہ کار بن کر رہ گیا۔[۲۴]

اسلامی تقریبات و رسوم

روسی مستشرقین نے اس موضوع پر خوب خوب خامہ فرسائی کی ہے اور بے شمار تصنیفات اور اشاعتی پمفلٹ ان موضوعات پر شائع کئے ہیں۔ کلیموویچ کی "۔ اسلام کی خون چوسنے والی جگالی" (۱۹۳۰)، وی۔ شوخوف کی رمضان کا ماہ مقدس (ماسکو ۱۹۳۰)، ایس۔ ترخانوف کی "مسلم کرتب بازیاں" کلیموویچ کی "قربان بیرم" (عیدالاضحیٰ) (ماسکو ۱۹۳۱) اور قدیم الاضحیٰ (ددذه) ماسکو ۱۹۳۳ء ان سینکڑوں کتابوں اور پمفلٹوں میں سے چند ہیں۔ جو ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے مطابق ان تقریبات کو رجعت پسندانہ، زہر آلود "قومی اقتصادیات اور صحت عامہ کے لئے نقصان دہ" قرار دے کر مسلمانوں کی زندگی سے مٹانے کی خاطر کثیر تعداد میں پھیلائی جا رہی ہیں۔

ایک اہم ہدف عورتوں کا پردہ اور اسلام کا تصور عصمت و عفت ہے۔ ایس۔ اگما ادگی اسلام کے جداگانہ سماج میں خیال عصمت۔ ناموس (NAMUS) سے نجات حاصل کرنے کے لئے معاشی آزادی کا نسخہ تجویز کرتا ہے اور اس طرح عصمت کا احساس مسلم خواتین کے دلوں سے محو کرنا چاہتا ہے۔ اس کے خیال میں اس مقصد میں کامیابی کے لئے جبر ناگزیر ہے۔ ۱۹۲۹ء میں سمرنوف نے پردہ کے موضوع پر ایک کتاب (The chadur) تصنیف کی[۲۵]

ختنہ کے بارے میں کلیموویچ نے ایک ریڈیائی تقریر میں کہا کہ وہ یہ ایک مخصوص مذہب سے وابستہ ہونے کی علامت ہے۔ لہٰذا یہ ایک عقیدہ کے لوگوں کو دوسرے عقیدہ کے پابند لوگوں سے ممتاز کرتی ہے۔ چونکہ اس رسم کی ادائیگی میں حفظان صحت کے اصولوں سے چشم پوشی برتی جاتی ہے۔ اس لئے اس کا نتیجہ فرد کی اخلاقی اور جسمانی لنگڑے پن کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس رسم کی ادائیگی میں بجز نقصان کے کچھ حاصل نہیں"۔

تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش

ان علمی سرگرمیوں کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ مسلمان طلبہ اور مسلمان عوام کے سامنے اُن کی تاریخ کو بھیانک اور قابل نفرت بنا کر پیش کی جائے اور بالخصوص ان محترم ہستیوں

---

۲۳ ایضاً

۲۴ KREMLIN AND ISLAM محمد القاسم ۸ مئی ۱۹۸۴ء

۲۵ اس بارے میں عملی کوششوں کی تفصیل کے لئے والٹر کولارز کا مضمون "سوویت یونین میں اسلام" ملاحظہ فرمائیے

کی مسلسل توہین کی جائے جو مسلمانوں کی نظر میں اپنی عدیم المثال قربانیوں اور دین پر استقامت کی وجہ سے اہم مقام کی مالک ہیں۔ تفصیلات میں جائے بغیر ہم صرف اتنا عرض کریں گے کہ روس کی تاریخ میں زار کے زمانے میں اور اشتراکی انقلاب کے بعد بھی مسلمان علاقوں میں تجدید و احیائے دین کی، روسیوں کے تسلط سے نجات کی یعنی آزادی کی کئی تحریکیں اٹھیں۔ انہیں بزور کچلا تو گیا ہی، لیکن بعد میں اب بھی ان کی مذمت اور تحقیر کی مہم جاری ہے۔ یہ مسلمانوں کے لئے جیسا کچھ روح فرسا ہو سکتا ہے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

یہ اس امر کا ایک مختصر سا جائزہ ہے کہ اشتراکی اسلام کے مسلمہ عقائد کے معاملے میں کیا کچھ گل افشانیاں کرتے رہے ہیں مگر ان کی حیثیت محض گل افشانیوں کی نہیں کہ بس یہ باتیں ہی پیش کی گئیں۔ بلکہ جیسا کہ مضمون کے شروع میں واضح کیا گیا ہے۔ صرف انہی نظریات کی تبلیغ و اشاعت اور جا بہ حکومت کی سرپرستی میں پورے زور و شور سے جاری ہے اور جواب دینے کی سرے سے کوئی آزادی نہیں۔ بہرحال اس جائزے سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اشتراکیوں کا حقیقی موقف اسلام کے بارے میں کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سچے اشتراکی حقیقی اسلام کے بارے میں کوئی کلمہ خیر نہیں کہہ سکتے (اور کہنا بھی نہیں چاہیے) اسلام اور اشتراکیت دو مختلف سمتوں میں لے جانے والے نظریات ہیں۔ ان میں مماثلت کے دعوے کرنے والے اور ان دونوں کا امتزاج تلاش کرنے والے دراصل ایک عارضی غلط سے پردہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ ورنہ جب سوشلزم کو غلبہ حاصل ہو تو کسی بھی اسلامی ملک میں اسلام کا حشر اس سے مختلف نہ ہوگا۔ جو روس اور چینی ترکستان میں ہوا اور آج بھی ہو رہا ہے

(بقیہ ۲۸۴)

روایات کی محبت جب تک کھرچ کر نکال نہیں جائے گی اس وقت تک چین میں سوشلزم نافذ نہ ہو سکے گا۔ اسی مقصد کے لئے وہ "ثقافتی انقلاب" برپا کیا جارہا ہے جس کے ذریعہ پچھلی ساری روایات کو جن میں کسان کی اپنی زمین سے محبت کی روایت بھی شامل ہے، بورژوا روایات اور سرمایہ دارانہ اثرات کہہ کر کھرچ کر نکالا جائے۔ لیکن یہ کام کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ابھی تک ماؤزے تنگ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ ابھی یہ دیکھنا ہے کہ اس ثقافتی انقلاب کی تحریک کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ لیکن اب تک کے جو تجربے مختلف ناموں سے زراعت کے اندر سوشلزم نافذ کرنے کے لئے کئے گئے ہیں وہ سب ناکام رہے ہیں۔ اور پیداوار میں کمی، فوجی نظم و ضبط میں کمی اور بالآخر کسانوں کی بغاوت تک پر منتج ہو چکے ہیں۔

آباد شاہ پوری

روسی استعمار کی مُسلم کش پالیسی

وسط ایشیا کے مسلمان گزشتہ چار پانچ صدیوں سے روسی سامراجیت کا شکار چلے آرہے تھے۔ لیکن ان کی مملکتوں پر اشتراکیوں کے قبضہ کے بعد انہیں جس سامراج سے پالا پڑا، وہ زاروں کے سامراج سے بالکل مختلف تھا۔ زاروں کا سامراج ان کی زمین کے اندر چھپے ہوئے ذخائر دولت کا بھوکا تھا یا پھر ان کے جسموں کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنانا رہتا تھا۔ ان کی روح سے اسے بالعموم کوئی واسطہ نہ تھا اور اگر اس نے ان کی روح کو مطیع کرنے کی کوشش کی بھی تو اس میں بری طرح ناکام ہوا اور اس کوشش کو اپنی سامراجی حدود سلطنت کی توسیع میں حائل پاکر اس سے سرکاری طور پر دستبردار ہو گئی لیکن سوشلسٹ سامراج زمین اور وسائل دولت ہی کا بھوکا نہ تھا، بلکہ وہ سیاسی سامراج ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نظریاتی سامراج بھی تھا۔ وہ سیاست کی دنیا ہی میں نہیں، فکر و عقائد اور روح کی دنیا میں بھی اَنا ولاغیری کا قائل تھا۔ وہ اپنے سوا ہر دوسرے نظریے اور عقیدے کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا چاہتا تھا۔ وہ کسی قوم کو جسمانی طور پر ہی محکوم بنانے کا خواہاں نہیں تھا بلکہ اس کی تاریخ، اس کی روایات، اس کے عقائد و نظریات اس کا مذہب، اس کی معاشرتی و تہذیبی اقدار اور تمدنی مظاہر تک کا استیصال چاہتا تھا کہ اس کی اپنی زندگی کا دارومدار اس تخریب پر تھا۔ کسی قوم کی حقیقی زندگی اس کے افکار و عقائد، اس کی روایات اور اس کے تہذیبی تصورات ہوا کرتے ہیں۔ یہ سرمایہ اگر محفوظ رہے تو سیاسی غلامی کی رات اگرچہ کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو جائے، آزادی کی صبح طلوع ہو کر رہتی ہے۔ لیکن اگر کسی قوم کو اس سرمائے سے محروم کر دیا جائے تو اسے نہ صرف سیاسی طور پر ہمیشہ کے لئے غلام بنا کر رکھا جا سکتا ہے۔ بلکہ قومی اعتبار سے موت کے گھاٹ اتارا جا سکتا ہے۔ سوشلسٹ سامراج کو خوب علم تھا کہ مسلمانوں کی اصل قوت اور حقیقی زندگی ان کا دین، ان کی ملی روایات اور ان کی تہذیبی اقدار و تصورات ہیں۔ انہی کے بل پر انہوں نے زاروں کے سامراجی عزائم کی صدیوں تک مزاحمت کی تھی اور اپنی کمزوریوں کی بنا پر اگرچہ مغلوب ہو گئے۔ مگر ملی زندگی کے ان سرچشموں سے وابستگی نے انہیں غلامی پر قناعت کر کے بیٹھ جانے نہ دیا۔ آزادی کا جذبہ ان کے سینوں میں کبھی مرنے نہ پایا بلکہ خاکستر میں دبی ہوئی چنگاریوں کی طرح ہمیشہ سلگتا رہا۔ جونہی موقع میسر آیا، آگ بن کر بھڑک اٹھا۔ چنانچہ زاروں کے اس جانشین سامراج نے اپنے پنجے مضبوطی سے گاڑ چکنے کے بعد مسلمان اقوام کو ان کی زندگی کے ان سرچشموں سے کلیۃً کاٹ دینے کی موثر تدابیر اختیار کیں۔

وحدتِ ملی کا خاتمہ

وسط ایشیا میں سوشلسٹ سامراج کے قیام اور ملک کی اجتماعی زندگی کو کمیونزم کے سانچے میں ڈھالنے کی جدوجہد کی جو شدید مزاحمت کی گئی اس میں وحدتِ ملی کے تصور کا گہرا ہاتھ تھا۔ کمیونسٹ سامراجیوں نے اولین فرصت میں

اسی وحدت ملی پر ضرب لگائی گیا۔ ایدل اورال کو چھ ٹکڑوں میں، آذربائیجان کو چار ٹکڑوں میں، قفقاز کو دس اور ترکستان کو پانچ ٹکڑوں — ازبکستان، تاجکستان، ترکمانستان، قزاقستان اور قرغیزستان۔ میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس طرح ایک ہی ملت جسے مذہب اور صدیوں کی مشترکہ تاریخی اور تہذیبی روایات نے وحدت کا رنگ بخشا تھا۔ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہر ٹکڑے کو محض بولیوں اور قبیلوں کی بنیاد پر ایک مستقل قوم کی حیثیت دے دی، ان کی الگ الگ حکومتیں قائم کیں اور ان کے اندر علاقائی اور لسانی عصبیت پیدا کی۔

کمیونسٹ سامراجیوں نے ایک ملت کے اس بٹوارے کا جواز یہ پیش کیا کہ اس طرح ہر نسلی گروپ کو آزادی اور خود مختاری حاصل ہوگی اور اس کی زبان اور کلچر دوسری زبانوں اور قومیتوں کے کلچر سے آزاد رہ کر ترقی کر سکے گا۔ لیکن ان سامراجیوں کے ہاتھوں ان نسلی قومیتوں کی آزادی و خود مختاری اور زبان کا جو حشر ہوا، اس سے ان کے اس دعوے کی واضح تردید ہو گئی۔ در حقیقت یہ ساری کارروائی "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے اصول پر عمل میں لائی گئی تھی۔ اور یہ وہ اصول ہے، جسے ہر سامراجی قوم نے اپنی نوآبادیات میں اپنایا ہے۔ وسط ایشیا کے مسلمانوں سے سوشلسٹ سامراج کو سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ وہ اس کے خلاف متحدہ محاذ قائم کر لیں گے۔ اس خطرے کے سدباب کے لئے اس نے انہیں پارہ پارہ کر دیا تاکہ ان کے اندر مشترکہ قومیت یا تہذیب و تمدن کا احساس نہ رہے۔ ضرورت پڑنے پر انہیں ایک دوسرے سے ٹکرایا جا سکے اور ان میں سے ہر ایک سامراجی سوشلسٹ روس کے ساتھ اپنا رشتہ استوار رکھنے پر مجبور رہے۔

اکثریت کو اقلیت بنانے کی مہم

زار شاہی سامراج کے زمانے ہی سے روسی اور دوسری غیر مسلم قومیتیں مسلمان علاقوں میں آباد کی جاتی رہی تھیں سوشلزم نے زار شاہی کی جگہ لی تو آبادکاری کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ زار شاہی کا مقصد تو روسیوں کو مقبوضہ ملکوں میں منتقل کر کے بڑھتی ہوئی آبادی کا دباؤ کم کرنا تھا۔ مگر کمیونسٹ سامراج مسلمان اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کر کے ان ملکوں کو روسی اور یورپی علاقے بنانا چاہتا تھا۔ اس نے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق مسلمان علاقوں میں روسیوں اور غیر روسی اجنبی قومیتوں کو آباد کرنا شروع کیا جس میں وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا چلا گیا۔ مسلمان خود اپنے ملکوں کے اندر جس طرح اقلیت بنتے جاتے ہیں۔ اس کا اندازہ چند مثالوں سے ہو سکتا ہے۔

ایدل اورال میں روسی سامراج کے تسلط سے پہلے مسلمان بھاری اکثریت میں تھے۔ باشقری پبلک میں ۱۹۲۰ء کے عشرے میں باشقر کل آبادی کا اہم حصہ تھے۔ ۱۹۳۰ء کے عشرے میں یہاں تیل دریافت ہوا تو نوآبادکاروں کا مزید سیلاب امڈ آیا اور باشقر آبادی آٹے میں نمک بن کر رہ گئی۔ یہی کیفیت تاتار ریپبلک کی ہے۔ جس کا دارالحکومت قازان ہے کہنے کو یہ تاتار ریپبلک ہے۔ مگر تاتاری آبادی اقلیت میں ہے اور اس کے دروبست پر بھی غیر تاتاری آبادکار چھائے ہوئے ہیں۔ باکو آذربائیجان کا دارالحکومت آبادی اور تہذیب و تمدن کے لحاظ سے ایک روسی شہر معلوم ہوتا ہے۔ کریمیا کی مسلمان آبادی کا جو حشر ہوا، اس کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔ تاہم اس حشر سے پہلے مسلمان آبادی کی اکثریت کس طرح اقلیت میں تبدیل ہوئی۔ اس پر ایک نظر ڈال لینا مفید ہوگا۔ زار شاہی نے جب اس علاقے پر قبضہ کیا اور کریمیا کے ترکوں نے بار بار اس کے خلاف بغاوت کی تو ان کی بھاری تعداد کو روس کے اندرونی علاقوں میں منتقل کر دیا گیا اور ان کی جگہ روسی اور یوکرینی لا بسائے گئے۔ ۱۹۱۷ء میں کریمیا کی کل آبادی پانچ لاکھ چوبیس ہزار تھی۔ جس میں ایک لاکھ اٹھاسی ہزار (۳۵ فی صد) تاتاری تھے۔ ۱۹۲۱ء میں کریمیا کی آبادی سات لاکھ تھی۔ جب کہ صنعتوں کا آغاز ہوا۔ ۱۹۳۹ء میں یہ آبادی گیارہ لاکھ ۲۰ ہزار تک پہنچ گئی۔ اس میں مختلف قوموں کا تناسب حسب ذیل تھا۔

تاتاری (۲۰۵۹،۲۰۰) ۲۳،۱ فی صد

روسی ۵٫۳۴ فی صد۔

یوکرینی ۱۰٫۰۰ فی صد۔

یہودی ۷٫۴ فی صد۔

جرمن ۵٫۷ فی صد۔

دیگر ۱۰٫۳ فی صد۔

۱۹۵۶ء میں آبادی کا اندازہ گیارہ لاکھ ۱۹ ہزار تھا۔ جب کہ سارے تاتاری مسلمانوں کو ان کے گھروں سے کھدیڑ کر شمالی روس اور سائبیریا میں منتشر کیا جا چکا تھا۔

ترکستان میں بھی روسی کسانوں کی آباد کاری زارشاہی کے عہد میں شروع ہو گئی تھی۔ پرانے شہروں کے ساتھ نئی بستیاں خالص روسی آبادی پر مشتمل وجود میں آ گئی تھیں اور بعض نئے شہر بھی آباد کئے گئے، جو بالکل یورپی شہر معلوم ہوتے تھے۔ کمیونسٹ سامراج کے دور میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور آج بھی اتنی تیزی کے ساتھ اور وسیع پیمانے پر جاری ہے کہ ایشیائی "جمہوریتوں" میں یورپی آباد کاروں کا علاقہ جنوب کی طرف بڑھتا آ رہا ہے۔ ۱۹۲۶ء اور ۱۹۵۹ء کے درمیانی عرصے میں روسی آبادی کا تناسب ازبکستان میں ۲ فی صدی سے بڑھ کر ۷٫۱۷ فی صدی قرغیزیہ میں ۱۲ فی صدی سے ۳۰٫۲ فی صدی، ترکمانستان میں ۸ فی صدی سے ۱۷٫۳ فی صدی اور تاجکستان میں ایک فی صدی سے ۱۳٫۲ فی صدی ہو گیا۔ دوسرے غیر روسی یورپینوں کی تعداد ان کے علاوہ ہے۔ ترکستان کی پانچویں ریاست قزاقستان میں روسیوں کی آباد کاری کی داستان کے آئینہ میں روس کے سوشلسٹ سامراج کے بھیانک خدوخال زیادہ نمایاں انداز میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

کمیونسٹ سامراج کے تسلط سے پہلے قزاقستان کی کل آبادی میں روسی ۱۹٫۷ فی صد تھے۔ ۱۹۲۶ء میں قزاقستان کی کل آبادی ۶۰ لاکھ ۲ ہزار نو سو ستر تھی، جس میں ۳۷ لاکھ ۱۹ ہزار تین سو ستر قزاق (۶۱ فی صد)، ۱۲ لاکھ ۸۰ ہزار ایک سو روسی (۲۱٫۱ فی صد) ۸ لاکھ ۶۱ ہزار یوکرینی (۱۴٫۲ فیصد) اور ۲ لاکھ ۱۲ ہزار ۵ سو ازبک تھے۔ ۱۹۳۹ء میں قزاق کل آبادی کا ۳۸ فی صد رہ گئے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد قزاقستان کو صنعتی علاقہ بنانے کا بڑا منصوبہ پورے زور و شور سے شروع کیا گیا۔ اس دوران میں روسیوں کی مزید بھاری تعداد قزاقستان پہنچ گئی اور قزاقوں کی فی صد آبادی اور کم ہو گئی۔ سٹالن کے مرنے کے بعد اس کے جانشینوں نے ۱۹۵۳-۵۴ء کے جاڑوں میں وہ منصوبہ مرتب کیا جو اچھوتی دھرتی کو آباد کرنے کا منصوبہ کہلاتا ہے۔ اس منصوبے کے مطابق یہ طے پایا کہ شمالی قزاقستان میں پھیلی ہوئی غیر کاشتہ زمین پر کھیتی باڑی کی جائے اور وسیع علاقے جو اب تک مویشیوں کے لئے چراگاہ کا کام دیتے رہے ہیں، انہیں سویٹ یونین کا اناج گھر میں تبدیل کر دیا جائے۔ اس فیصلے کے دوسرے معنی یہ تھے کہ روسی اور دوسرے یورپی نو آباد کاروں کا ایک نیا سیلاب قزاقستان کی طرف امڈ پڑے گا۔ اور قزاق آبادی کا تناسب اور کم ہو جائے گا۔ اس سے قزاقستان کی معاشی زندگی ہی نہیں بلکہ قزاقوں کے سیاسی حقوق بھی متاثر ہوں گے۔ جو تھوڑے بہت انہیں جمہوریہ قزاقستان میں ابھی تک حاصل رہے تھے۔ اس بنا پر قزاقوں کا اضطراب اور اس فیصلے سے اختلاف ایک فطری امر تھا۔ اس وقت قزاقستان کمیونسٹ پارٹی کا اول سیکرٹری ایک قزاق زومابے شائق ای تونف تھا۔ پچھلے آٹھ برس سے وہ اس عہدے پر فائز چلا آتا تھا۔ فروری ۱۹۵۴ء کے اوائل میں اسے برطرف کر دیا گیا۔ الزام یہ عائد کیا گیا کہ اس نے اپنے عملے کا انتخاب کارکردگی اور سیاسی صلاحیتوں کی بنیاد پر نہیں کیا تھا بلکہ محض دوستانہ روابط، خاندانی تعلقات اور مقامی جانبداری کو پیش نظر رکھا تھا۔ شائق اور اس کے ساتھیوں کی جگہ لینے کے لئے ماسکو سے دو اہم کمیونسٹ قزاقستان بھیجے گئے۔

ایک چینی موں پروز مدکر تھا جو ماسکو پارٹی کی مجلس صدارت (پریذیڈیم) کا امیدوار رکن تھا۔ اسے قزاقستان کی کمیونسٹ پارٹی کا اوّل سیکرٹری بنا دیا گیا۔ دوسرا لیونڈ بریزنیف تھا جو اس وقت سوویٹ بحریہ میں سیاسی کمیسار تھا۔ (اور بعد ازاں سوویٹ یونین کا صدر بنا اور آج کل روسی کمیونسٹ پارٹی کا سیکرٹری ہے) اسے دوئم سیکرٹری بنایا گیا۔ ان دونوں کے عہدے سنبھالتے ہی قزاقستان میں اکھاڑ پچھاڑ ہوئی اور شائق ہی توف کے ہم نوا پارٹی اور جمہوریہ کے اہم مناصب سے الگ کر دیئے گئے۔ اب اچھوتی دھرتی کے منصوبے پر عمل درآمد شروع ہوا اور چند برس بعد اس منصوبہ کی عظیم الشان کامیابی کا اعلان کر دیا گیا۔ ماسکو سے بڑے فخر کے ساتھ کہا گیا کہ فرانس سے بھی بڑے رقبے کا علاقہ زیر کاشت آ چکا ہے۔ ۵۰۰ بڑے بڑے سرکاری فارم قائم ہو چکے ہیں۔ اور بہت سے صنعتی کارخانے وجود میں آ گئے ہیں۔ لیکن یہ سارا کارنامہ روس سے آنے والے یورپی نوآبادکاروں نے انجام دیا تھا۔ ۱۹۵۹ء میں جب مردم شماری ہوئی تو پتہ چلا کہ قزاقستان میں قزاقوں کی آبادی کا تناسب ۳۰ فی صد سے بھی کم رہ گیا ہے۔ ۱۹۶۰ء تک روسی نوآبادکاروں کی تعداد میں مزید اضافہ ہو گیا۔

قزاقستان میں روسی اور دوسرے یورپی نوآبادکاروں کی تعداد جیسے جیسے بڑھتی گئی، سوشلسٹ سامراج کو اصل منصوبے پر عمل کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ قزاقستان کو تقسیم کر دیا گیا۔ شمالی قزاقستان کو جہاں یورپی آبادی غالب اکثریت رکھتی تھی، جمہوریہ کے باقی علاقوں سے الگ کر کے ایک جداگانہ حیثیت دے دی گئی۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۶۰ء کو ایک سوویٹ فرمان کے ذریعے "اچھوتی دھرتی کا خطہ" قائم کر دیا گیا۔ اکمولنسک کو جو اسی دوران میں نمبر کیا گیا تھا۔ اس خطے کی راجدھانی قرار دیا گیا۔ بعد ازاں اس شہر کا ایشیائی نام تبدیل کر کے ورزلینوگراڈ یعنی "اچھوتی دھرتی کے خطے کا شہر" رکھ دیا گیا۔ اچھوتی دھرتی کا خطہ تیس لاکھ سے زائد آبادی پر مشتمل ہے اکثریت روسیوں اور یوکرینیوں کی ہے۔ پارٹی اور انتظامیہ کے عہدوں پر بھی روسی اور یوکرینی قابض ہیں۔ اس طرح روس کے سوشلسٹ سامراجیوں نے زار شاہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ایک اور خالص مسلمان علاقے کو اس کے جسد سے کاٹ کر روسی علاقے میں تبدیل کر دیا۔

شمالی قزاقستان کا یہ حشر چونکا دینے والا ہی نہ تھا۔ بلکہ خطرے کا الارم تھا۔ کیونکہ جس عمل کا یہ نتیجہ تھا وہ ترکستان کی دوسری "جمہوریتوں" میں بھی جاری تھا۔ ان کے اندر سخت اضطراب اور بے چینی پیدا ہوئی۔ ہر جگہ کمیونسٹ پارٹیوں کے اندر صدائے احتجاج بلند ہوئی۔ روسی کمیونسٹ جریدے "ملینے کے مسائل" نے اس احتجاج پر سخت گرفت کی۔ اس نے مشرقی جمہوریتوں میں مزید سپیشلسٹ اور دائم بھیجے جانے کی خبر دی اور لکھا:

"اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ کسی قوم کی حیثیت یا خصوصیات زائل کر دی جائیں۔ جیسا کہ بعض کامریڈوں نے غلطی سے سمجھ لیا ہے۔ بلکہ اس طرح ان قوموں کو بین الاقوامی بنایا جا رہا ہے۔"

جریدہ مذکورہ "بین الاقوامی" بنانے کی اس مہم کی مخالفت کرنے والے کامریڈوں کو تنبیہ کرتے ہوئے مزید لکھتا ہے:

"ان جمہوریتوں میں پائی جانے والی انفرادی رائے کا اظہار، قومی خود غرضی، جنگ جویانہ وطن پرستی اور قومی ہٹ دھرمی کے خلاف مستقل اور بے رحمانہ جنگ جاری رکھنا اب بھی نہایت ضروری ہے۔"

پھر اسی جریدے نے کمیونسٹ پارٹی کی ناراضی کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

"مشرقی جمہوریتوں میں دوسری قوموں کی آبادی میں توسیع اور سرکاری عملے کے تبادلے وغیرہ کی مخالفت میں جس طرز عمل کا مظاہرہ کیا گیا ہے، کمیونسٹ پارٹی اس کی سخت مذمت کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ سوشلزم کے سائے میں حرکت پذیر قوموں کو ایک جگہ

سے دوسری جگہ منتقل ہونا، اس حرکت پذیری سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ جو سرمایہ دارانہ نظام کے حامل ملکوں میں عمل میں آتی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے سلسلے میں حرکت پذیری بعض قوموں کے غلبے اور دیگر اقوام کی محکومیت کے ذریعے عمل میں آتی ہے۔ جب کہ کمیونزم کے ماتحت وہ "عمل کے ہم آہنگ اتحاد" کی عکاسی کرتی ہے۔"

اجتماعی نسل کشی

مسلمانوں کی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کرنے کا یہ عمل جسے "روسی کمیونسٹ پارٹی نے عمل کے ہم آہنگ اتحاد" کا نتیجہ قرار دیا دو طریقوں سے وجود میں آیا۔ اول روسیوں اور روس کی حدود میں بسنے والے یورپینوں کو لاکھوں کی تعداد میں وسط ایشیا کے مختلف ملکوں میں منتقل کر دیا گیا۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔ دوسرے یہ کہ مقامی آبادی کے بڑے بڑے گروہوں کو مختلف الزامات لگا کر سائبیریا اور دور دراز خطوں میں جلا وطن کر دیا گیا۔ بعض علاقوں سے پوری کی پوری آبادی کو کھدیڑ کر باہر پھینک دیا گیا۔

۱۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۳ء کے درمیان جب خانہ بدوش قزاقوں کو اجتماعیت کے شکنجے (COLLECTIVIZATON) میں کسا گیا تو ان کے ۸۰ فی صد مویشی، ۸۰ فی صد بھیڑ بکریاں اور ۹۰ فی صد گھوڑے تلف ہو گئے اور ایسا قحط پڑا کہ لاکھوں اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ بے شمار لوگ ہجرت کر گئے۔ صرف فنا کی گود میں جانے والے قزاقوں کی تعداد انہی کل آبادی کا ۴/۱ تھی۔

۲۔ چیچن، انگوش، کرد، شائی بلکار اور کریمیا کے تاتاروں کا حشر اس سے بھی برا ہوا۔ پندرہ لاکھ افراد پر مشتمل ان مختلف مسلمان قوموں کو ان کے گھروں سے نکال سائبیریا اور روس کے دور دراز علاقوں میں منتشر کر دیا گیا۔ کئی لاکھ بوڑھے، بچے اور عورتیں راستے کی سختیوں اور سردی کی شدت کی تاب نہ لا کر چل بسیں۔ ان کا قصور یہ تھا کہ جنگ کے زمانے میں انھوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے آقاؤں ـــــ سوشلسٹ سامراجیوں کے ساتھ پرجوش تعاون نہیں کیا تھا بلکہ بعض ـــــ مثلاً کریمیا کے تاتار ـــــ جرمنوں سے جا ملے تھے۔ غالباً اس کی مثال انسانی تاریخ کا کوئی بدترین سامراج ہی پیش کر سکتا ہے کہ اس کی محکوم قوموں نے اس کے ساتھ کسی جنگ میں تعاون نہ کیا ہو یا ان کی کچھ تعداد اس کے دشمن کے ساتھ جا ملی ہو اور اس کی پاداش میں اس نے پوری کی پوری قوموں کو کلیتہً نیست و نابود کر دیا ہو۔

اسلامی تہذیب و ثقافت کا المیہ

سوشلسٹ سامراج نے مسلمان علاقوں پر پوری طرح تسلط جمانے اور گرد ملیوں کی قوت توڑنے کے فوراً بعد ان کے باشندوں کو ان کے دین، افکار و عقائد، ملی و اسلامی روایات اور تہذیبی و ثقافتی قدروں سے محروم کرنے کی جد و جہد شروع کر دی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ ایک طرف تو انھیں ان کی اپنی زندگی اور قوت کے اصل سرچشمے سے متمتع ہونے سے روک دیا جائے۔ دوسری طرف دنیا بھر کی مسلمان قوموں کے ساتھ وہ جس رشتۂ وحدت میں بندھے ہوئے ہیں اسے منقطع کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں انھوں نے بتدریج اقدامات شروع کئے۔ حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آ گیا کہ اسلام اور اسلامی تہذیب کے خلاف ایک ہمہ جہتی جنگ چھیڑ دی گئی۔ بڑے بڑے علماء اور بااثر مسلمان رہنما موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ باقی ماندہ کو شہری حقوق سے محروم کر کے سائبیریا کے سرد جہنم میں سسک سسک کر مرنے کے لئے بھیج دیا گیا۔ اوقاف پر قبضہ کر لیا گیا۔ دینی مدارس بند کر دیئے گئے۔ اخلاق و عقائد کے وہ حصار جو امت مسلمہ کو ہر دور اور ہر زمانے میں اٹھنے والے فکری و تہذیبی فتنوں سے محفوظ رکھنے کے لئے کھڑے کئے گئے تھے ان سب کو منہدم کر دیا گیا۔ مسلمانوں پر سخت مظالم توڑے گئے اور ایسے جبر و استبداد سے کام لیا گیا کہ بدترین سامراجی طاقتوں کو بھی مات کر دیا۔ سمرقند کے کمیونسٹ مصنف جورشا کو نے اس ظلم و ستم کی بہت سی مثالیں دی ہیں۔ سمرقند کے ایک دیہات میں دس کسانوں کو اجتماعی زراعت کی رکنیت سے اس لئے محروم کر دیا گیا کہ وہ مسجد میں نماز ادا کرتے دیکھے گئے تھے۔ ایک مسلمانوں کی اجتماعی زراعت کو محض اس لئے توڑ دیا گیا کہ اس کے ارکان نے مسجد میں جانے پر اصرار کیا تھا اور اجتماعی زراعت

سے نکالے یا سے کلیتہً ختم کر دینے کے معنی متاثرہ افراد کو بھوکوں مارنے کے تھے۔

اس زمانے میں کمیونسٹ نشۂ تند میں کیسے بدمست تھے اور مسلمانوں کے دین و اخلاق سے کس طرح کھیل رہے تھے اس کا اندازہ جوشاؤ نسر کی اس روایت سے کیا جا سکتا ہے :- ایک کمیونسٹ شراب کے نشے میں بدمست کسانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہتا "اللہ کی مدد سے ہم نے تمہارے مویشی تو چھیا لئے ہیں۔ اب تمہاری بہو بیٹیوں کو بھی اجتماعی ملکیت میں دینے والے ہیں، ہم انھیں اپنے ساتھ سلائیں گے۔ اس طرح ہم ایک دوسرے کے ساتھ خوب اچھی طرح گھل مل جائیں گے"

انقلاب سے پہلے زار شاہی عہد میں وولگا، ترکستان اور دوسرے مسلمان علاقوں میں ایک ہزار سے زائد مدرسے تھے۔ صرف بخارا میں ۱۰۹ دینی مدارس کام کر رہے تھے۔ لیکن اب سوشلسٹ سامراج کے سائے میں صرف بخارا کا ایک مدرسہ "میر عرب" باقی رہ گیا ہے۔ جہاں کمیونسٹ ملّا اور مفتی تیار کئے جاتے ہیں۔ یہی حشر مسجدوں کا ہوا ہے۔ کمیونسٹ سامراجیوں سے پہلے صرف یورپی روس میں سات ہزار مسجدیں تھیں۔ سوویٹ وار نیوز (۱۶ رمئی ۴۲ء) کی اطلاع کے مطابق ۱۹۴۲ء میں سوویٹ روس میں صرف ۱۲۔۱۳ مسجدیں باقی رہ گئی تھیں۔ گذشتہ ۲۵ سال میں ان مسجدوں کی کیا حالت ہوئی ہے اور اب اسلام کے اس علمی، دینی اور تہذیبی مرکز میں اسلام کس صورت حالات سے دوچار ہے اس کا اندازہ دو تین بیانات سے کیا جا سکتا ہے۔

مسٹر ایم اے ایچ اصفہانی جنھوں نے ۱۹۴۲ء میں سوویٹ روس کا سفر کیا تھا اپنے سفرنامے "لینن گراڈ سے سمر قند تک" (انگریزی) میں تاشقند کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> جلد جلد کھانا کھانے کے بعد ہم وسطی ایشیا اور ازبکستان کے مسلمانوں کا دینی مرکز دیکھنے گئے۔ وہ بالکل خالی تھا۔ یوں نظر آتا تھا جیسے اس کا حال ایک حویلی مدتوں سے غیر مستعمل پڑا ہے۔ پہلے ازبکستان میں دینی اعلیٰ تعلیم کے لئے دو مدرسے تھے۔ اب تاشقند کا مدرسہ بند ہو چکا ہے صرف بخارا کے مدرسے میں تعلیم ہو رہی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ تاشقند میں ۱۱ مسجدیں ہیں۔ ازبکستان کی آبادی کی عظیم اکثریت حنفی ہے۔ مرکز کے عین سامنے شیخ جامع مسجد کھڑی ہے۔ یہ شہر کی بڑی مسجدوں میں سے ایک ہے۔ اور غالباً واحد مسجد ہے جو آباد ہے"

پھر سمر قند اور لینن گراڈ وغیرہ کی مسجدوں کی حالت زار بیان کرنے کے بعد اصفہانی صاحب لکھتے ہیں:

"سوویٹ روس میں آج دو قسم کی عبادت گاہیں ہیں۔ ایک وہ جو آباد ہیں۔ دوسری وہ جو غیر آباد اور ویران پڑی ہیں۔ اول الذکر کی تعداد ہر سال گھٹتی چلی جاتی ہے جب کہ موخر الذکر عبادت گاہوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ جو گرجے اور مسجدیں آباد ہیں ان میں صرف بوڑھے اور ادھیڑ عمر کے لوگ ہی عبادت کے لئے آتے ہیں۔ نوجوان مرد یا عورتیں عبادت گاہوں میں شاذ و نادر ہی دکھائی دیتے ہیں۔ بچوں کو سکولوں میں مذہب کی تعلیم نہیں دی جاتی۔ یہاں انسان کو یہاں محسوس ہوتا ہے کہ سوویٹ روس میں مذہب آہستہ آہستہ مر رہا ہے اور جب تک کمیونسٹوں کا نقطۂ نظر تبدیل نہیں ہوتا میرا خیال ہے کہ گرجے، عبادت خانے اور مساجد کو غیر آباد ہونے میں زیادہ سے زیادہ دس پندرہ سال اور لگیں گے۔ صرف تاریخی اہمیت اور حسین فنی تعبیر کی حامل عبادت گاہیں باقی رہ جائیں گی۔ ریاست انھیں گزشتہ قومی یادگاروں اور ملکی ورثے کی حیثیت سے اور سامان کشش کے طور پر محفوظ رکھے گی"

اب جان گنتھر کی روایت بخارا کے متعلق سنیئے

"بخارا کا نو سو سالہ قدیم دینی مدرسہ ابھی تک کام کر رہا ہے۔ ہم نے مدیر سے بات چیت کی۔ وہ اپنی خواب آلود آنکھوں اور گھنی چوڑی داڑھی کے ساتھ شمالی نائجیریا یا مراکش کا عالم دین نظر آتا تھا۔ وہ اس ادارے کا گذشتہ تیس برس سے ذمہ دار اور نگران چلا آتا ہے۔ مدرسے میں ایک سو طالب علم ہیں۔ نصاب تعلیم نو سال کا ہے۔ یہاں کے فارغ التحصیل سارے وسط ایشیا میں ملا بن کر جاتے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ بخارا کی کتنی فی صد آبادی مسجد میں نماز پڑھنے آتی ہے۔ ڈائریکٹر کچھ دیر خاموش رہا اور پھر اس سوال کو ٹال گیا اور کہنے لگا کہ بہت سے لوگ گھر پر نماز پڑھ لیتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کیا نمازیوں میں کمیونسٹ پارٹی کا کوئی ممبر بھی ہوتا ہے۔ نہیں، مگر ہو سکتا ہے کہ وہ بھی گھر پر نماز پڑھتے ہوں"

ان روایات کو ایک سرمایہ دار یا امریکی کی روایات قرار دے کر نظر انداز نہ کیجیے۔ روس کی نووستی پریس ایجنسی کے ایک رپورٹر کی زبان سے بھی آپ کو یہی داستان سنائی دے گی۔ جسے اس ایجنسی نے اپنے ایک مجموعہ میں شائع کیا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

خیوا کے مشہور مدرسے مادامین خان کے نئے مگر خالی حجروں کی دیر تک سیر کرنے کے بعد ہم ایک تنگ سی پر پیچ گلی میں ٹہلتے ہوئے جا رہے تھے .... اچانک فضا میں ایک لمبی تان کی آواز بلند ہوئی۔ موذن لوگوں کو نماز کی طرف بلا رہا تھا ....

خیوا کے کثیر التعداد میناروں کے کلس آج بھی فضا میں بلند نظر آتے ہیں۔ شہر میں کئی بے نظیر مسجدیں ہیں۔ مثلاً ایک مسجد پورے وسط ایشیا میں جواب نہیں رکھتی .... لیکن آباد صرف یہی ایک مسجد جامع سعید اتبلیکر ہے۔ پھر یہ مسجد بھی بہت کم موقعوں پر بھرتی ہے۔ ملا خطیب الیشان کا خیال ہے کہ تقریباً دو ہزار مسلمان خیوا اور گرد و نواح سے یہاں پڑھنے آتے ہیں۔ مگر اب یہ تعداد رفتہ رفتہ کم ہوتی جا رہی ہے

"کیا کوئی دن ایسا بھی آسکتا ہے۔ جب موذن کی پکار پر ایک شخص بھی مسجد میں نہیں آئے گا؟"

"ایسا تو کبھی کبھار اب بھی ہوتا ہے" ملا نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے نوجوان مسجد میں کیوں نہیں آتے؟"

"کاش مجھے معلوم ہوتا، میں تو اپنے بیٹے کو بھی سمجھ نہیں سکا۔ جب اس نے دسویں پاس کی تو میں بہت خوش ہوا۔ میں نے اس سے کہا۔ بیٹے، تم پر خدا کی برکت ہو، بخارا جا کر مدرسے میں دینی تعلیم حاصل کرو اور میرے کام کو جاری رکھو، مگر وہ گھر سے بھاگ گیا اور بخارا کے بجائے تاشقند چلا گیا۔ وہاں ایک کالج میں داخل ہو گیا۔ میں نے بڑی لعنت ملامت کی اور صاف صاف کہہ دیا کہ آئندہ میرے گھر کی دہلیز پر قدم نہ رکھنا"

"پھر کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا، آخر باپ ہوں، میرے بیٹے میں بھی دل ہے پتھر نہیں۔ پھر میں بوڑھا ضعیف آدمی ہوں۔ سال بھر کے بعد میں نے اسے معاف کر دیا .... میں جب کبھی ان نوجوانوں کو دیکھتا ہوں جو مسجد میں آنا پسند نہیں کرتے تو یہی خیال آتا ہے کہ ان کی زندگی کا رنگ ڈھنگ ہی اور ہے اور شاید اللہ کو منظور بھی یہی ہے"

اللہ کو منظور ہے یا نہیں، موذن کی بیٹی ایک مقامی سکول میں تاریخ پڑھاتی ہے۔ مذہب کی تاریخ۔ وہ خود ملحد ہے، حالانکہ اس کے باپ کی آواز خیوا کی فضا میں گونجتی ہے اور مسلمانوں کو خدا کی طرف متوجہ ہونے کی دعوت دیتی ہے۔

"تمہاری دلہن تو تمہارے گھر ہی میں رہتی ہے نا؟" ہم نے اس سے پوچھا۔ "رہتی ہے"، اس نے کہا۔ "لیکن ہم کبھی آپس میں جھگڑتے نہیں۔ ہم دین کے موضوع پر گفتگو کرنے سے احتراز کرتے ہیں۔ خاندان میں جنگ و جدال کے بیج کیوں بوئیں؟ اللہ ہمیں راضی برضا رہنے کی تعلیم دیتا ہے۔"

اس ساری صورت حالات پر اب نووستی پریس ایجنسی کے اس رپورٹر کا تبصرہ ملاحظہ کیجیے:

"دو نمبوا کی ان مسجدوں اور میناروں کے درمیان، جہاں اس کی جڑیں نہایت گہری اور پیچیدہ نہیں، مذہب بڑی خاموشی سے دم توڑ رہا ہے۔ یہ فطرت کے عین مطابق ہے۔ اس درخت کو کاٹ پھینکنے میں بظاہر کوئی شخص مصروف نہیں ہے لیکن یہ پھر بھی غائب ہوتا جا رہا ہے۔ جس طرح تاریخ کے دیو قامت پودے اور درخت کسی زمانے میں غائب ہو چکے ہیں۔ اب زندگی کے دامن میں کوئی ایسی چیز نہیں رہی ہے جس سے پرانے عقائد کی بقا اور نشو و نما کا جواز مل سکے۔ ہستی مطلق کے بارے میں اب سوچنے کی کسے ضرورت ہے۔ زندگی اس سے کہیں زیادہ کار آمد، منضبط اور ہیجان خیز ہے۔"

"میں نے مؤذن کی غم آگیں آواز سنی تو جی چاہا کہ اس کو ٹیپ ریکارڈ کر لوں، کیونکہ یہ آواز بہت جلد تاریخ میں دفن ہو جائے گی۔"

کمیونزم کے ایک ادارے کی اس شہادت سے نہ صرف وسط ایشیا کے مسلمانوں کی بے بسی کا پتہ چلتا ہے۔ بلکہ اصفہانی صاحب کے تاثر کی بھی حرف بحرف تائید ہوتی ہے۔

رسم الخط کی تبدیلی

سوشلسٹ سامراج نے مسلمانوں کو ان کے ماضی اور عالمی اسلامی برادری سے کاٹ دینے کے لئے ایک اور دور رس اقدام یہ کیا کہ ان کے رسم الخط کو بدل ڈالا۔ ۱۹۲۳ء-۱۹۲۷ء کے درمیانی عرصے میں عربی رسم الخط کی جگہ لاطینی رسم الخط جاری کیا گیا۔ تین سال بعد عربی رسم الخط میں لکھی ہوئی ترکی کتابوں اور اخباروں کی اشاعت بند کر دی گئی۔ ۱۹۴۰ء میں لاطینی رسم الخط کی جگہ روسی رسم الخط رائج کر دیا گیا۔ اس طرح سوویٹ مسلمانوں اور ان کی تہذیب و ثقافت کے درمیان خلیج اور بھی وسیع ہو گئی۔ گو جاننے والے جانتے تھے کہ اس کا مقصد کیا ہے چنانچہ تاتاری جمہوریہ کے چیئرمین قالی انفضل الدین وشش وین محمد روف نے اس اقدام پر تحسین و آفرین کے ڈونگرے برساتے ہوئے کہا تھا کہ اس سے تاتاری اور روسی ثقافتوں کے درمیان تعاون و اشتراک اور گہرا ہو جائے گا۔ تاہم اس کے جواز میں باقاعدہ ایک فلسفہ تراشا گیا۔ اور کہا گیا کہ عربی رسم الخط ترکی زبانوں کی اصوات اخذ کرنے کی صلاحیتوں سے عاری ہے اور طباعت کے جدید تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ نیز تعلیمی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا ہے آخر بلی تھیلے سے باہر آگئی۔ اب صاف اعتراف کر لیا گیا کہ عربی رسم الخط کو ختم کرنے کا مقصد یہ تھا کہ سوویٹ روس میں رہنے والے مسلمانوں کا رشتہ ان کے ماضی، ان کی تہذیب و ثقافت، ان کے لٹریچر اور دوسری مسلمان قوموں سے کاٹ دیا جائے۔ جریدہ "سوویٹکایا ایتھنوگرافیا" نے یہ اعتراف ان الفاظ میں کیا:

"رسم الخط کی تبدیلی نے ترکستان میں رسمی اسلام کے زوال میں اہم حصہ لیا ہے۔ اس کا اندازہ اس حقیقت سے ہوتا ہے کہ عربی، جو مسلمانوں کے مذہب اور مسجد کی زبان ہے، جاننے والے لوگوں کی تعداد ہر سال کم سے کم تر ہوتی جاتی ہے۔"

پھر رسم الخط کی تبدیلی ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق مقامی زبانوں میں روسی الفاظ بھی کثرت سے داخل کئے جا رہے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ مسلمان اپنا علیحدہ ثقافتی و علمی اور لسانی وجود گم کر دیں اور سامراجی سوشلزم کی زبان، کلچر اور تہذیب میں ضم ہو کر رہ جائیں اور ظاہر ہے کہ یہ زبان، کلچر اور تہذیب روس ہی کی ہوگی (یا پھر چین کی) کہ وہی سوشلزم کا علمبردار بھی ہے اور اسی کی زبان [illegible] حکم

اور حاشیہ بردار ملکوں میں باہمی اظہار کا مشترک ذریعہ بنی ہوئی ہے۔ اس طرح روسی رسم الخط کا رواج و نفاذ روسی زبان کے سامراج کو مسلط کرنے کا باعث بن گیا ہے۔

معاشی اور مادی ترقی کا افسانہ

کمیونسٹ سامراجی اذران کے گماشتے افریشیائی اقوام خصوصاً مسلمان قوموں میں یہ پروپگنڈا بڑے زور شور سے کرتے ہیں کہ "ان ایشیائی جمہوریتوں" نے سوشلسٹ برادری میں شریک ہونے کے بعد اقتصادی اور صنعتی لحاظ سے زبردست ترقی کی ہے۔ وہ اس ترقی کو پسماندہ قوموں کے لیئے قابل فخر نمونہ قرار دیتے ہیں۔ مسٹر خروشیف نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے پندرہویں اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

"ہمیں فخر ہے کہ روس کے سابق علاقوں کے تجربے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ صرف ایک نسل کی زندگی میں مشرقی ممالک سے پسماندگی غربت اور جہالت کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ اور انہیں اقتصادی لحاظ سے ترقی یافتہ ملکوں کی سطح پر لایا جا سکتا ہے"۔

یہ دعوٰی درست ہے، اس ضمن میں پیش کیئے جانے والے اعداد و شمار واقعتًا حیرت ناک ہیں۔ جو لوگ ان ایشیائی جمہوریتوں کی سیاحت کر جاتے ہیں وہ اس ترقی کو دیکھ کر ششدر رہ جاتے ہیں اور کمیونسٹوں کے اس عظیم کارنامے کے گن گاتے ہیں۔ لیکن اس خیرہ کن ترقی کے پیچھے جو بھیانک اور مکروہ مناظر کار فرما ہیں۔ مرعوب ذہن اور چندھیائی ہوئی آنکھیں ان تک پہنچنے سے قاصر رہتی ہیں

بنیادی سوال یہ ہے کہ یہ عظیم معاشی ترقی اور مادی کارنامے کس قیمت پر انجام پائے ہیں؟ ہم قبل ازیں مفصل بیان کر چکے ہیں کہ سوشلسٹ سامراج نے مسلمانوں کی آبادیوں کی آبادیاں کس طرح حرف غلط کی طرح مٹا دیں، کس وحشیانہ طریقے سے لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا لاکھوں کو مصنوعی قحط کا شکار بنایا اور کس جبر و تشدد اور کن انسانیت سوز حرکتوں سے اپنی بات کو منوایا۔ اگر وسیع پیمانے پر انسانیت کی تباہی کے بعد یہ کارنامہ انجام پاتا ہے تو اس پر فخر کی کون سی بات ہے؟ انسانیت کے اس قتل عام اور توہین و تذلیل کے نتیجے میں حاصل ہونے والی اس معاشی اور مادی ترقی پر انسانیت سے عاری کمیونسٹ سامراجی یا ان کے گماشتے ہی نازاں ہو سکتے ہیں

دوسرا سوال یہ ہے کہ اس عظیم اور قابل فخر ترقی کے ثمرات کس کی جھولی میں گر رہے ہیں۔ اگر کوئی سامراجی قوم اپنے کسی محکوم علاقہ کی زرعی و صنعتی ترقی کی طرف اس لیئے توجہ دیتی ہے کہ اس کی پیداوار اور صنعتیں اس کی اقتصادیات کے لیئے ریڑھ کی ہڈی کا کام دیں یا ہزاروں سکول اور کالج اس لیئے کھولتی ہے کہ ان کے ذریعے اس قوم کی نوخیز نسل کو ذہنی اور اخلاقی طور پر قتل کر دے۔ تو اسے اس قوم کا ہی خواہ کیونکر کہا جا سکتا ہے اور اس تعلیمی، زرعی اور صنعتی ترقی کو اس قوم کی ترقی کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ آخر مغربی سامراجی بھی اپنی نوآبادیات میں ایسی ترقی کا سامان کرتے رہے ہیں۔

لیکن ان دونوں سوالات کو سردست نظر انداز کیجیئے۔ سوال یہ ہے کہ جس ترقی کا ڈھنڈورہ پیٹا جا رہا ہے، فی الواقع ان ایشیائی اقوام کی ترقی ہے اور اس کے ثمرات سے یہی قومیں بہرہ اندوز ہو رہی ہیں؟

اس سوال کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو ایک انتہائی روح فرسا تصویر سامنے آتی ہے۔

"ہم دیکھتے ہیں کہ [illegible] سالوں میں گزشتہ ایشیائی ممالک جیسے جیسے معاشی و مادی ترقی کی بلندیوں تک پہنچ رہے ہیں ان کی [illegible] [illegible] [illegible] جا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ [illegible] [illegible] [illegible] ہے۔ کیا حقیقت یہ ہے کہ [illegible] ترقی [illegible]

خام شیں بلکہ دوسری چیزوں کے لئے تیار کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ جن علاقوں میں اجنبی قومیں نسبتاً کم آباد ہوئی ہیں۔ وہاں معاشی و مادی ترقی کی طرف بھی کم توجہ دی گئی ہے۔ ایڈگر زبورغ نے "نیشنل جیوگرافیکل میگزین" کے نمائندے کی حیثیت سے خیوا کی سیاحت کی تھی۔ اس کا ایک مضمون جولائی ۱۹۵۳ء کے میگزین میں OSIS: CITY OF KHEVA کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں وہ لکھتا ہے۔

"وسط ایشیا کے بہت سے دوسرے حصوں کے مقابلے میں خوارزم کے صوبے نے کم ترقی کی ہے۔ اس کی بڑی وجہ اس کی گرم آب و ہوا ہے۔ جو بہت کم روسی آبادکاروں کو اپنی جانب کھینچتی ہے"۔

ایشیائی ممالک کی معاشی و اقتصادی زندگی کی رہنمائی اور اس پر کنٹرول ماسکو سے ہوتا ہے۔ کوئی جمہوریت اپنی مرضی اور ضرورت کے مطابق معاشی و اقتصادی منصوبے نہیں بنا سکتی۔ جب بھی مقامی کمیونسٹوں نے مطالبہ کیا کہ انہیں اپنی خاص اقتصادی شکل و صورت کو محفوظ رکھنے اور اسے ترقی دینے کی آزادی ہونی چاہئیے۔ نیز معاشی ترقی اور اقتصادی ور کارناموں کا فائدہ پہلے ملک کے اصل باشندوں کو ہونا چاہیے۔ ماسکو نے اس کی مخالفت کی اور اس رجحان کو مذموم اور "بورژوا قوم پرستی" کا مظہر قرار دیا۔ ۸ اگست ۱۹۵۱ء کو ازبکستان کی کمیونسٹ پارٹی کے اول سیکرٹری مسٹر [illegible] نے اپنے بیان میں کہا "جہاں تک معیشت کی علاقائی تحدید خصوصاً ساری ریاست کے مفادات کے بجائے علاقائی مفادات کا تعلق ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ قوم پرستی کے جراثیم ابھی تک باقی ہیں۔ کامریڈ خرد نیف نے جون ۱۹۵۹ء میں اسمبلی کے اجلاس میں ہماری جمہوریہ کی سخت سرزنش کی تھی"۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایشیائی ممالک صرف ایک ہی قسم کی زرعی پیداوار فراہم کرنے کی منڈی بن گئے ہیں۔ جسے ماسکو کلیتاً اپنے مفادات کے تحت کام میں لا رہا ہے۔

اب ذرا تعلیم کے شعبے کو لیجئے۔ سر دست اس سے صرف نظر کیجئے کہ ایشیائی مسلمان ممالک میں تعلیم کے فروغ و ترویج کا مقصد مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کو ختم کرنا اور کمیونسٹ روس کے کلچر کو نشو و نما دینا ہے۔ چنانچہ پورا تعلیمی ڈھانچہ اسی مقصد کی تکمیل کے لئے کھڑا کیا گیا ہے۔ اس وقت صرف یہ دیکھئے کہ جن درس گاہوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کا ملک کے طول و عرض میں جال بچھا ہوا ہے۔ ان سے مقامی لوگ اپنی آبادی کی مناسبت سے کس حد تک بہرہ اندوز ہو رہے ہیں۔ ایشیائی ری پبلکوں میں تعلیم پانے والے طلبہ کی اکثریت روسیوں پر مشتمل ہے یہ صورت حالات یونیورسٹیوں میں اور اعلیٰ سطح کے ٹیکنیکل اداروں میں یکساں پائی جاتی ہے۔ یہی کیفیت ان اداروں کے سٹاف کی ہے۔ ان کی اکثریت بھی روسی ہے۔ ۱۹۵۱ء میں الماآتا کی قازق سٹیٹ یونیورسٹی میں ۳۷۰ طالب علم تھے۔ ان میں قزاق طلبہ کی تعداد صرف ۱۵۵ تھی۔ تاشقند کے میڈیکل سکول کے ۱۰۴۵ طلبہ نے فائنل امتحان دیا، ان میں ۲۳۴۹ طلبہ ترکستانی تھے۔ تمام تعلیمی اداروں میں روسی زبان کی تعلیم لازمی ہے۔

جمہوریتیں، آزادی اور مساوات

سوشلسٹ سامراج نے اپنے ماتحت علاقوں کو مختلف قومیتوں کی بنیاد پر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے انہیں ری پبلک (جمہوریہ) کی حیثیت دے دی ہے۔ اصل مقصد تو انہیں مرکزی حکومت کے مقابلے میں انتہائی حد تک بے بس بنا دینا اور ایسی صورت پیدا کرنا ہے کہ یہ مختلف قومیتیں روسی قومیت کے مقابلے میں کوئی متحدہ محاذ نہ بنا سکیں۔ تاہم اس سے سوشلسٹ سامراج بیرونی دنیا کے سادہ لوحوں کو یہ فریب دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ یہ جمہوریتیں خود مختار اور داخلی آزادی سے بہرہ مند ہیں۔ سوویٹ روس کا علاقائی ڈھانچہ بظاہر بڑا عظیم الشان ہے۔ ۱۵ مکمل حقوق رکھنے والی سوویٹ ری پبلکیں، ۲۰ اندرونی طور پر خود مختار ری پبلکیں، ۸ داخلی طور پر خود مختار صوبے اور دس قومی علاقے ہیں۔ مزید برآں سوویٹ روس کا دستور ہر قومیت کو سوویٹ یونین سے الگ ہو جانے کا حق بھی دیتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ سوشلسٹ سامراج کے دکھانے کے دانت ہیں۔ عملی اعتبار سے ان علاقائی اداروں کا کوئی مستقل کردار

نہیں۔ انہیں کسی وقت بھی ختم کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً والگا جرمنوں کی ری پبلک اور ولاڈی واسٹک کے قریب کورین اضلاع اس لئے ختم کر دیے گئے کہ سوشلسٹ سامراج کو یہ اندیشہ تھا کہ بیرونی حکومتیں ان کی موجودگی سے فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔ شیشن اور کالمک ری پبلکیں اس لئے توڑ دی گئیں کہ دوران جنگ میں ان کے کچھ باشندے جرمن فوجوں کے ساتھ جا ملے تھے۔ یہی حشر کریمیا کی ری پبلک کا ہوا۔ سوریں اضلاع اس لئے اپنا وجود کھو بیٹھے کہ روسی نوآبادکار اصل آبادی سے بڑھ گئے تھے۔ کریلو فنش ری پبلک بھی اسی انجام سے دوچار ہوئی۔ اس طرح ان تمام نام نہاد ری پبلکوں کے سر پر سوشلسٹ سامراجیوں کی تلوار ہر وقت معلق رہتی ہے۔

سوویٹ دستور وفاقی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اختیارات مرکزی اور علاقائی حکومتوں کے درمیان بٹے ہوئے ہیں۔ کچھ معاملات میں مرکز کی برتری تسلیم کی جاتی ہے اور کچھ معاملات میں علاقائی حکومتوں کی۔ لیکن اس وفاقی حکومت کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ سوویٹ یونین میں دوعملی طرز حکومت ہے۔ کچھ اختیارات ری پبلکوں کو دیے گئے ہیں۔ لیکن یہ عدم مرکزیت عملاً بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے۔ کیونکہ حکومت کا سارا انتظام کمیونسٹ پارٹی کے کنٹرول میں رہتا ہے۔ جو بذات خود ایک شدید قسم کی مرکزی تنظیم ہے۔ کمیونسٹ پارٹی میں اصل قوت سیکرٹری اول یا اس کے بعد نائب کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

ایشیائی ری پبلکیں کہنے کو تو داخلی طور پر خود مختار ہیں۔ مگر دراصل اقتدار روسیوں کے ہاتھ میں ہے۔ ماضی قریب تک کمیونسٹ پارٹیوں کے سربراہ اوّل سیکرٹری اور ان کے نائب (دوم سیکرٹری) ماسکو سے بھیجے جاتے رہے ہیں۔ اب ری پبلک کی مرکزی کمیونسٹ کمیٹی کے اول سیکرٹری اور ری پبلک کے اندر صوبائی کمیونسٹ پارٹیوں کے اوّل سیکرٹری تو بالعموم مقامی ہوتے ہیں۔ مگر دوم سیکرٹری روسی ہوتے ہیں۔ یہ نہ صرف اول سیکرٹری کی نگرانی کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ بلکہ اصل قوت انہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ ان کی مرضی کے بغیر اوّل سیکرٹری کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے۔ یہی کیفیت حکومت کی ہے۔ ری پبلک کی کونسل آف منسٹرز کا چیئرمین (وزیر اعظم) عام طور پر ایشیائی ہوتا ہے۔ نائب وزیر اعظموں میں سے ایک روسی ہوتا ہے۔ ری پبلک کے باقی وزیر ایشیائی ہوتے ہیں۔ جبکہ ان کے انتظامی شعبوں کے سربراہ اکثر روسی ہوتے ہیں۔

لیکن قصہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ اب آگے کی داستان ایک ترکستانی فاضل ڈاکٹر مرزا ہبستہلے کی زبان سے سنیے۔ وہ اپنے مضمون "ترکستان میں روسی امپیریلزم" میں لکھتے ہیں۔

> "حکومت اور پارٹی کے ۹۰ فی صد سے زیادہ مناصب روسیوں کے ہاتھ میں ہیں۔ جبکہ "آزاد" جمہوریتوں کا بجٹ ماسکو میں طے کیا جاتا ہے (دیکھیے سوویٹ روس اور یوکرین کی جمہوریتوں کا حق میزانیہ۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۵۱ء) سوویٹ یونین کے ترکی خطے میں ۱۴۲ کلیدی مناصب میں سے ۱۲۱ پر روسی اور دوسرے غیر ترکستانی قومیتوں کے افراد فائز ہیں۔ ترکستانی عوام کا ایک نمائندہ بھی نہیں ہے تمام سفارتی مشنوں کا عملہ روسیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ .... ریاست کی ساری سیکورٹی سروس اور ڈاکخانہ، ٹیلیفون ٹیلیگراف اور ریلوے کے محکموں کی غالب ترین انتظامی اسامیاں روسیوں کے ہاتھ میں ہیں۔"

بڑا بھائی اور سوتیلا بھیا

یہ ہے اس داخلی خود مختاری کی حقیقت جس کا دعویٰ سوشلسٹ سامراج کرتا ہے۔ اس سے "سوشلسٹ مساوات" سے بھی پردہ اٹھ جاتا ہے جس کا راگ سوویٹ روس بھی اور اس کے گماشتے بھی گاتے رہتے ہیں۔ تاہم اس پہلو کے متعلق چند اور امور بھی پیش کر دینا ضروری ہیں۔

۲۱ اگست ۱۹۱۷ء کو زار شاہی کے آخری گورنر جنرل کوروپٹکن نے ایک ترکستانی وفد سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔

"روس کے کرنے کرنے میں سب سے اہم اور سب سے زیادہ ذمہ داری کا کردار روسیوں ہی کو ادا کرنا ہے وہی رہنمائی سلاحیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ روس کی تعمیر میں انہوں نے باقی سب لوگوں سے زیادہ قربانیاں دی ہیں انہی نے سب سے زیادہ محنت ومشقت کی ہے۔ روس میں جتنی قومیتیں آباد ہیں، سب ایک ہی ماں عظیم روس کے بچے ہیں۔ لیکن اس بڑے بھرے خاندان میں روسیوں ہی کو باقی سب کا بڑا بھائی بننا ہے۔"

بڑے بھائی کا یہ تصور روسیوں میں آج بھی موجود ہے۔ سٹالن نے جشن فتح کے موقع پر ۲۵ مئی ۱۹۴۵ء کو عظیم روسی عوام کے نام جو پیغام دیا اس میں روسی عوام کو سوویٹ یونین میں شامل تمام قوموں میں سب سے زیادہ ممتاز اور ملک کی رہبر طاقت قرار دیا۔ مادام انا نیکرا نوواجو سوویٹ روس کی مشہور مورخ اور کمیونسٹ مرکزی کمیٹی کی ممبر تھیں، اپنی تصنیف "عظیم روسی قوم" میں جو کچھ لکھتی ہیں۔ اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

"روس میں جتنی قومیتیں آباد ہیں۔ عظیم روسی قوم نے ان سب کی معاشی اور تہذیبی ترقی کے لئے ہر دور میں بے مثال کام کیا ہے۔ اس سلسلے میں اس کی دین جتنی لاثانی ہے۔ اتنی ہی بے غرض بھی ہے۔ زارشاہی ماضی اور سوویٹ حال میں اس نے ان قومیتوں کو جو مدد دی ہے اور پناہ کا جو احساس بخشا ہے۔ اس کے لئے انہیں عظیم روسی قوم کا ممنون احسان ہونا چاہئیے انہیں تو اس بات پر بھی اظہار تشکر کرنا چاہیے کہ زارشاہی روس نے انہیں فتح کیا۔ انہیں اپنے ساتھ ملایا۔ بصورت دیگر وہ روسی قوم کی ترقی یافتہ تہذیب کے قریب نہیں آسکتے تھے۔ اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مفتوحہ علاقوں میں انیسویں اور بیسویں صدی میں روسیوں کے خلاف جو شورشیں بپا ہوئیں وہ رجعت پرستانہ تھیں۔ کیونکہ ان شورشوں کی رہنمائی جن لوگوں کے ہاتھ میں تھی، وہ روسی قبضے کے "ترقی پسندانہ رول" کو نظر انداز کر بیٹھے تھے۔ اب سوویٹ دور کی طرف آئیے۔ یہاں بھی ان مصیبت بھرے برسوں میں جب کمیونسٹ نظام حکومت قائم ہو رہا تھا۔ روسی قوم ہی انقلاب کا ہراول دستہ تھی۔ بعد میں روسیوں ہی نے ملک کو صنعتی بنایا۔ اسے زرعی میدان میں اجتماعیت کی راہ پر لگایا........ دوسری جنگ عظیم میں بھی رہنمائی کا بوجھ روسیوں ہی نے اٹھایا۔ ملک کے اندر اور جنگی محاذ پر وہ دوسری قوموں کے لئے قربانی اور جانبازی کی مثال بنے۔"

"بڑے بھائی" کا یہ تصور "چھوٹے بھائیوں" کے فکر و ذہن میں بھی رچ بس چکا ہے۔ مقامی کمیونسٹ پارٹیوں اور ری پبلکوں کے مقامی رہنما اپنے بیانات میں بڑے عزیز بھائی کی الطاف و عنایات کے گن گاتے اس کی محبت اور عقیدت کے راگ الاپتے اور اس کی وفاداری کا عہد کرتے نظر آتے ہیں۔ آخر بڑا بھائی جس بے غرضی سے ان کی مدد کر رہا ہے اور اس نے جس بے غرضی سے انہیں محض ترقی سے ہمکنار کرنے کی ذمہ داری اٹھا رکھی ہے۔ اس پر اظہار تشکر و سپاس کیوں نہ کیا جائے۔

بڑے بھائی کی چھاپ چھوٹے بھائیوں کی اجتماعی زندگی اور ان کے شہروں، دیہات، سکولوں، فیکٹریوں اور کھیتوں ہر جگہ لگی ہوئی ہے۔ "بڑے بھائی" کو سوویٹ یونین کے ہر حصے خصوصاً ایشیائی مسلمان ملکوں میں خصوصی رعایات حاصل ہیں۔ چھوٹے بھائی اپنے آپ کو بڑے بھائی کے رنگ میں رنگنے کی تگ و دو میں شب و روز لگے رہتے ہیں۔ اسے بڑا بھائی "سوویٹانے" کا عمل قرار دیتا ہے۔ بڑے بھائی کے احسانات اتنے عظیم اور بے حد و حساب ہیں کہ چھوٹے بھائیوں کا انہیں نظر انداز کر کے اپنے شاندار ماضی کو یاد کرنا، اس پر فخر کرنا یا اپنی ممتاز شخصیتوں کی یادگار قائم کرنے کا تصور بھی قابل نفرت ہے۔ اس کے برعکس بڑے بھائی کی یادگاریں کھڑی کرنا، چھوٹے بھائیوں کا فرض عین قرار پایا۔ چنانچہ آپ کو جہاں جہاں آپ پھر

جاہیے۔ آپ کو ہر جگہ اجنبی ناموں سے پالا پڑے گا۔ ایک آدھ سڑک یا گلی کوچہ ایسا نظر آئے گا جس کا نام دیسی ہوگا۔ حتیٰ کہ امام بخاریؒ کے اس وطن میں آپ کو بے خداؤں کی سڑک (بیزبوژنایا) بھی دکھائی دے گی جس بڑے بھائی (جنرل فرنزہ) نے بخارا فتح کیا تھا۔ اس کے نام پر ایک سڑک اور چوراہا نہیں ہے بلکہ باقاعدہ ایک یادگار بھی قائم کی گئی ہے۔ ماضی کی کسی شخصیت کے نام پر کسی گلی کوچے کا نام رکھنے کو بڑا بھائی "بورژوا قوم پرستی" قرار دیتا ہے۔ لیکن جہانگیر، تیمور اور شہزادہ رہ کے ایک بڑی سپہ سالار [illegible] کے نام پر ایک سڑک آپ کو بڑے بھائی کی وسعت قلب کا پتہ دے گی۔ یہی کیفیت آپ کو تقریباً ہر ایشیائی شہر میں نظر آئے گی۔

چھوٹے بھائی اگرچہ بڑے بھائی پر بظاہر نچھاور کر رہے ہیں مگر یہ ہیں تو چھوٹے بھائی اور مشہور ہے "سگ باش برادر خورد مباش" چنانچہ بڑے بھائی کے عنایات و اکرامات کے باوجود "چھوٹے بھائیوں" میں جو احساس محرومی موجود ہے اس کی نشاندہی مرزا ترسون زادہ (جو چند سال پہلے سوویٹ افریشیائی استحکام کمیٹی کے چیئرمین تھے) نے اپنی "مادر روس" سے اس طرح کی ہے۔

"اے میری ماں، اے مادر روس

میں تیرا سوتیلا بیٹا نہیں ہوں۔

میری پیاری ماں

میں تیرے خون اور دل کے ٹکڑوں سے بنا ہوں۔

میں تیرا بیٹا ہوں۔

جب تو مجھے پکارتی ہے تو میں تیرے ساتھ ہو لیتا ہوں۔

تیری پکار کا جواب دیتا ہوں۔

میری سب سے پیاری ماں!

تو مجھے جو کام بھی کرنے کو کہتی ہے۔

میں اسے پورا کرنے کو تیار رہتا ہوں"

یونین سے علیحدگی کا حق

سوویٹ یونین کے دستور میں ہر قومیت کو یونین سے الگ ہو جانے کا حق دیا گیا ہے۔ مگر یہ حق کاغذ پر کھینچے ہوئے حسین و جمیل خطوط کے سوا اور کوئی حقیقت اپنے دامن میں نہیں رکھتا۔ عملاً جب کسی قومیت کے رہنماؤں ——— بورژوا نہیں کمیونسٹ رہنماؤں ——— نے یونین سے الگ ہو جانے کے لئے نہیں محض دستور میں عطا کردہ عام حقوق کو عملاً دیئے جانے کا مطالبہ کیا، ان پر بورژوا قوم پرستی کا الزام عائد کر کے ختم کر دیا گیا۔ ازبکستان کے فیض اللہ خواجہ اور اکمل اکرام [illegible] تاتاری کمیونسٹ مرزا سلطان غالب اور اس کے ساتھی اسی انجام سے دوچار ہوئے۔ سلطان غالب کٹر انقلابی کمیونسٹ تھے۔ لیکن وہ ترکی، ازبک، تاتاری، قزاق اور آذری ترکوں کے اتحاد کا قائل تھا۔ اور یہ اتنا بڑا قصور تھا کہ اس کی سزا موت ہی ہو سکتی تھی۔

[illegible] کے موسم گرما میں ترکستانی کمیونسٹوں کی ایک بڑی تعداد ماسکو میں جمع ہوئی تھی اور ایک پروگرام تشکیل دیا تھا۔ جس کا نام "پروگرام ترکستان مسلم کمیونسٹ" رکھا گیا۔ [illegible] اس اجتماع میں مطالبہ ظاہر کیا گئی کہ ازبک، قازق، کرغیز، ترکمان، باشقرد، تاتار اور روس کی دوسری ترک قومیں سوویٹ فیڈریشن کے اندر ایک ری پبلک قائم کریں۔ اس وقت تو سوویٹ روس کی حکومت نے اس مطالبہ کے [illegible]

وجہ سے یا سابق ریاست کا اظہار کیا۔ تاہم تحریک [illegible] مسلمانوں کو تختۂ مشق بنا کر کے رکھ دیا۔ پھر ۱۹۴۴ء
میں نیشنلسٹوں کی اس تنظیم کو منتشر کر دیا گیا۔ اس کے بعد ترکستان اور دوسری جمہوریتوں میں روسی سیاسی پولیس نے "بورژوا قوم پرستوں" کی ایک
گہری سازش کا پتہ چلایا اور اس تنظیم کی تشکیل میں جن ممتاز نیشنلسٹوں نے حصہ لیا تھا، ان سب کو گرفتار کر کے یا تو گولی سے اڑا دیا گیا یا سائبیریا کے
جنگلوں میں بھیج دیا گیا۔

Introducing Islam

a set of twelve pamphlets on different aspects of Islam written by different authors—

The following have appeared:—G. Editor: Khurshid Ahmad

1. The Religion of Islam
   by Abul A'la Maududi
2. The Road to Peace and Salvation
   by Abul A'la Maududi, Price -65
3. The Prophet of Islam
   by Abul A'la Maududi, Price -/85
4. Life After Death
   by Abul A'la Maududi, Price -/55
6. The Religion of Truth
   by Abul A'la Maududi, Price -/85

The following are forthcoming:—

5. Islam: The Right Path by Abul A'la Maududi
7. Islam: What it Stands For? by A. K. Brohi
8. Islamic State: Its Nature and Characteristics by Khurshid Ahmad
9. Islamic Law by Abul A'la Maududi
10. Principles of Islamic Economy by Khurshid Ahmad
11. Moral Foundations of Islam by Abul A'la Maududi
12. The Message of Islam by Abul A'la Maududi

Can be had from

Maktaba-e-Chirag-e-Rah, Karachi-I

آباد شاہ پوری

اشتراکی سامراج اور وسط ایشیا کی مسلم ریاستیں

مشہور مثل ہے، ہاتھی کے دانت، کھانے کے اور، دکھانے کے اور۔ یہ مثل سوشلزم پر حرف بحرف صادق آتی ہے۔ سوشلزم کے ایک دانت وہ ہیں، جن سے وہ اپنے آپ کو مزدوروں اور کسانوں کا نجات دہندہ، کمزوروں کا حامی، بے کسوں کا مددگار، سامراج کا دشمن اور محکوم قوموں کی آزادی کا علمبردار ظاہر کرتا ہے۔ دوسرے دانت وہ ہیں جن کے ذریعہ وہ قوموں اور ملکوں کا شکار کرتا ہے۔ سوشلزم کے یہ دانت مغرب کے سامراجی درندوں سے بھی زیادہ تیز، خوفناک اور مضبوط ہیں۔ مغربی سامراجی تو اب بوڑھے ہو چکے ہیں۔ ان کے فتراک ستم کے اکثر نخچیر آزاد ہو گئے ہیں لیکن یہودیوں کے سازشی ذہن اور یورپ کی مادہ پرستانہ تہذیب کے سنجوگ سے جنم لینے والا یہ سامراج ابھی جوان ہے۔ اس نے نہ صرف پرانے نخچیروں کو پوری قوت کے ساتھ اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ بلکہ یہ ہر وقت تازہ شکار کی تلاش میں بھی رہتا ہے۔ افریقہ اور ایشیا کے مسلمان ملک اپنے گوناگوں داخلی اور بین الاقوامی مسائل اور ایک آدھ مستثنیات کے ساتھ، ترقی اور ٹکنیک سے بے بہرہ اور مفاد پرست حکمران طبقے کی خود غرضیوں اور بداعمالیوں کے باعث سب سے زیادہ اس سامراج کی زد میں ہیں۔ اس کے ہراول دستے ہر جگہ کام کر رہے ہیں۔ زیر زمین بھی اور کھلے عام بھی۔ اس سے ان ملکوں کی نوخیز آزادی ہی کو خطرہ نہیں ہے، بلکہ ان کا نظام زندگی، ان کی تہذیب، ان کی معاشرت، ان کے افکار و عقائد، ان کی روایات اور ان کا ملی و دینی وجود بھی خطرے میں ہے۔ اس کا تازہ ترین شکار شام اور مصر ہیں۔ انڈونیشیا اس کے چنگل سے بال بال بچا ہے۔ بالکل معجزانہ طریقے سے۔ مگر سخت کشت و خون کے باوجود خطرہ اب بھی موجود ہے۔ سوشلزم جب اپنے سامراجی دانت کسی ملک پر گاڑتا ہے، تو وہاں کے مسلمانوں اور ان کے دین و تہذیب کا کیا حشر ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ وسط ایشیا کے مسلمان ملکوں کی داستان سے کیا جا سکتا ہے۔ جو اس کے پنجے میں ایک عرصہ سے گرفتار چلے آتے ہیں۔ وسط ایشیا کی داستان سوشلزم کی درندگی، اسلام دشمنی اور سامراجیت کی بھیانک داستان ہے۔

اس داستان کو بیان کرنے سے پہلے ہمیں ماضی بعید کے کچھ اوراق الٹنے پڑیں گے۔ اس لئے کہ وسط ایشیا میں سوشلزم دراصل روس کے زاروں اور کمنتانگ کے واسطے سے چینی شہنشاہوں کا جانشین ہے۔ ماضی کے پس منظر میں سوشلسٹ سامراج کا مطالعہ زیادہ خوبی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔

مردم خیز اسلامی خطے

وسط ایشیا کی یہ داستان مغربی ترکستان، داغستان، شمالی آذربائیجان، قرم (کریمیا)، ایدل و رال، سائبیریا اور مشرقی ترکستان و منگولیا کی داستان ہے۔ یہ علاقے تقریباً ۶۴ لاکھ مربع کیلومیٹر رقبے پر مشتمل ہیں۔ اس میں سے ۱۷ لاکھ ۴۰ ہزار مربع کیلومیٹر پر چینی سوشلزم نے قبضہ کر رکھا ہے اور باقی پر روسی سوشلزم کی استعماریت چھا رہی ہے۔ یہ معدنیات اور زرعی و غیر زرعی پیداوار کے اعتبار سے نہایت زرخیز علاقے ہیں۔ کوئلے، تیل، پٹرولیم، لوہے، سونے، چاندی، تانبے، جواہرات، یورینیم، کرومیم، ولفرام، مولیبڈیم، کپاس، غلے، ہر قسم کے پھلوں اور

سرزمین اور جنگلات کے وسیع طبقے پایاں ذخائر سوشلسٹ سامراج کی اقتصادیات اور صنعت کے لئے ریڑھ کی ہڈی کا کام دیتے ہیں۔ ان کے بغیر یہ سامراجی دیو محض لنجا ہو کر رہ جاتا ہے۔

یہ علاقے زمانۂ قدیم سے ترک قبائل کا مسکن اور ان کی تہذیب کا مرکز رہے ہیں۔ اسلام سب سے پہلے دوسری صدی کے اوائل میں مغربی ترکستان میں پہنچا۔ یہ عبدالملک بن مروان کا عہد تھا۔ سلیمان بن عبدالملک کے عہد تک پورا ماوراء النہر اسلام کے پرچم تلے آگیا۔ ہشام بن عبدالملک کے زمانے تک پورا داغستان مسلمان ہو چکا تھا۔ اسی صدی میں مغربی ترکستان کی راہ سے اسلام مشرقی ترکستان میں داخل ہوا۔ ترکستان اور قفقاز کو اپنی آغوش میں لینے کے بعد اسلام شمال کی طرف بڑھا۔ چوتھی صدی ہجری تک ایدل اورال اور سائبیریا کے ترک قبائل بھی حلقہ بگوش اسلام ہو گئے اور اسلام پورے وسط ایشیا میں ایک زبردست کارفرما قوت بن گیا۔ سوشلسٹ سامراج کے تسلط سے پہلے اس پورے علاقے میں مسلمانوں کی تعداد تین کروڑ سے زائد تھی۔

اسلام نے اس علاقے کی زندگی اور تہذیب و تمدن پر گہرے نقوش ثبت کئے ہیں۔ خصوصاً ترکستان کے ترکوں نے مسلمانوں کی دینی، سیاسی اور علمی تاریخ کی تشکیل میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ سیاسی لحاظ سے اس سرزمین سے بڑے بڑے حکمران، خاندان اور فوجی لیڈر اٹھے ہیں۔ تیموری، سامانی، خاقانی، غزنوی، سلجوق، خشیدی اور خوارزم شاہی اسی خاک سے تعلق رکھتے تھے۔ دینی نقطۂ نظر سے اس خاک سے بڑے بڑے محدثین، علما اور فقہا پیدا ہوئے۔ مشہور محدث عبداللہ بن مبارکؒ۔ کتاب اللہ کے بعد صحیح ترین کتاب بخاری کے مصنف و مؤلف امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ۔ امام ترمذیؒ اور سجستانیؒ اسی سرزمین سے تعلق رکھتے تھے۔ فلسفیوں میں ابونصر فارابی۔ ابن سینا۔ ابوالعباس احمد بن محمد فرغانی۔ حکیم سمرقندی۔ ابومعشر۔ ماہرین ہیئت اور ریاضی دانوں میں ابوعبداللہ محمد بن موسیٰ۔ خوارزمی۔ الغ بیگ۔ حبش الحاسب۔ المروزی۔ صوفیا میں شیخ ابوالقاسم خواجہ بہاء الدین محمد نقشبند۔ اہل علم و فضل اور فقہا میں امام ابو منصور ماتریدی۔ زمخشری۔ کاشغری۔ جواہری۔ سکاکی۔ جمال الدین قرشی اور یوسف حاجب اسی خاک کے فرزند تھے۔

زارشاہی سامراج

روس کی عظیم الشان سلطنت کو دیکھ کر آج کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا کہ بارھویں صدی عیسوی میں اس کی حیثیت ایک مختصر اور بے مایہ جاگیر کی رہی ہے۔ جو پہلے منگول حملہ آوروں کا اور پھر تاتاری مسلمان سلاطین کو خراج دیتی تھی۔ تیرھویں صدی کے آخر میں الیگزینڈر نوسکی کے بیٹے ایوان نے گرد و پیش کے علاقوں کو ضم کر کے ماسکووی ریاست کی بنیاد رکھی۔ جس کا رقبہ پانچ سو مربع میل تھا۔ اس زمانے میں ماسکو ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس کے چاروں طرف لکڑی کا جنگلا لگا ہوا تھا۔ اس کے بیٹے سائمن نے ماسکو کے حدود پھیلانے اور گرد و پیش کے علاقوں کو نگلنے کا کام جاری رکھا۔ سائمن کا بیٹا دیمتری باپ سے بھی زیادہ توسیع پسند تھا اس کے عہد میں تاتاری مسلمانوں کے ساتھ کشمکش شروع ہوئی۔ ایوان سوم ماسکو کا پہلا حکمران تھا جس نے زار (قیصر) کا لقب اختیار کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ایدل اورال کی ازبک سلطنت انتشار اور افتراق کا شکار ہو رہی تھی۔ مغربی علاقے میں تین سلطنتیں قازان۔ حاجی ترخان (استرخان) اور کریمیا قائم ہو چکی تھیں اور مشرقی علاقے میں قازق۔ یہ سلطنتیں آپس میں برسر پیکار رہتی تھیں۔ ماسکو کی ابھرتی ہوئی قوت اور دست درازیاں بھی انہیں متفق نہ کر سکیں۔ ایوان سوم نے قازان کو خراج دینے سے انکار کر دیا۔ اور اطاعت کا جوا اتار پھینکا۔ ۱۴۶۷ء سے ۱۵۵۲ء تک ۸۵ برس کے عرصہ میں ماسکو اور قازان کے درمیان گیارہ لڑائیاں ہوئیں۔ آخر ۱۵۵۲ء میں قازان سرنگوں ہو گیا۔ ۱۵۵۶ء میں اس نے استرخان پر بھی قبضہ کر لیا۔ اب اس نے سائبیریا کا رخ کیا۔ مسلمان ترک حکمران کوچم خان اور اس کے بیٹوں علی خان اور ابراہیم خان نے چالیس برس تک مقابلہ کیا اور بالآخر ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو گئے۔

اب روسی سامراج قفقاز (کاکیشیا) داغستان کی طرف بڑھا۔ داغستان کی جنگیں روسی سامراج کے مقابلے میں حریت کی مزاحمت کا عنوان کہلاتی شاندار باب ہیں۔ اہل داغستان ۱۸۲۴ء سے ۱۸۵۹ء تک ملک کے چپے چپے کے لئے جنگ کرتے رہے۔ مگر انہوں نے ہتھیار ڈالے وہ تو علاقہ برگزیدہ گئے

۳۰ برس تک مزاحمت کرتے رہے۔ امام شاملؒ آخری دینی رہنما تھے جنہوں نے ۱۸۳۴ء سے ۱۸۵۹ء تک مسلسل ۲۵ برس روسیوں سے جنگ کی۔ امام شاملؒ تیغ و قلم دونوں کے دھنی تھے۔ وہ ملک کے مشائخ میں سے تھے۔ اور متبحر عالم اور گوناگوں خوبیاں رکھتے تھے۔ مجاہدین کی قیادت سنبھالنے کے بعد ان کے جوہر کھلے۔ وہ ایک بہترین سپہ سالار اور اعلیٰ درجے کے منتظم ثابت ہوئے۔ انہوں نے مسلمانوں میں جہادی روح تازہ پھونکی۔ روسی فوجوں کو پے در پے ہولناک شکستیں دیں۔ ان کی ہیبت کا یہ عالم تھا کہ روسی ان کا سامنا کرنے سے کتراتے تھے۔ انہوں نے روسیوں سے بہت بڑا علاقہ واپس لے لیا لیکن زار روس ہر قیمت پر داغستان فتح کرنے پر تلا ہوا تھا اور فوجوں پر فوجیں بھیج رہا تھا جن کی قیادت لائق ترین روسی اور جرمن جرنیل کر رہے تھے۔ جدید ترین ساز و سامان سے لیس دو لاکھ روسی فوج میدان میں آ چکی تھی۔ اور امام شاملؒ کے ہاتھوں شکست کھا رہی تھی۔ ان فتوحات نے امام کی دھاک دور دور تک بٹھا دی تھی لیکن تن تنہا امام اپنے چند ہزار سرفروش مجاہدوں کے ساتھ ٹڈی دل سپاہیوں کا مقابلہ کب تک کر سکتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی قوت گھٹتی گئی۔ تاہم انہوں نے ہمت نہ ہاری۔ توکل بر خدا آخر دم تک ڈٹے رہے۔ ایک ایک پہاڑ، ایک ایک شہر اور ایک ایک گاؤں کے لئے جنگ کی یہاں تک کہ آخری مسجد کے لئے بھی مقابلہ کیا۔ جہاں امام شاملؒ، ان کے اہل خاندان اور مٹھی بھر ساتھی، جو زندہ بچ رہے تھے، گرفتار ہو گئے۔ اس طرح داغستان ایک عظیم اور طویل مزاحمت کے بعد ۱۸۵۹ء میں روسی استعمار کا محکوم ہو گیا۔ اس لڑائی میں روسی افواج نے عظیم نقصان اٹھایا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے روس کے فوجی مؤرخ جنرل فادییف نے لکھا:

"کوہستان قفقاز کے باشندوں کے ساتھ لڑائی میں ہمیں اتنے بڑے لشکر سے کام لینا پڑا جو ہندوستان سے جاپان تک پھیلے ہوئے ملکوں کو فتح کرنے کے لئے کافی تھا۔"

۳

اسی دوران میں روسی سامراج ایران پر ڈورے ڈال کر آذربائیجان کے بیشتر حصے پر قابض ہو گیا تھا۔ ۱۸۰۰ء اور چالیس برس پہلے کریمیا کی آزادی بھی دم توڑ چکی تھی۔ (۱۷۸۳ء)

جب روسی سامراج نے سولہویں صدی کے وسط میں قازان اور استراخان پر قبضہ کر لیا تو مغربی ترکستان پر دست درازی شروع ہوئی۔ لیکن ابھی ترکوں میں دم خم باقی تھا انہوں نے روسیوں کو بڑھ کر پسپا کیا اور انہیں زبردست جانی نقصان پہنچایا۔ روسیوں نے محسوس کیا کہ ترکستان نرم چارہ نہیں ہے چنانچہ انہوں نے اپنی سرگرمیوں کا رخ سائبیریا کی طرف پھیر دیا۔ اٹھارھویں صدی ترکستان کے لئے انتشار و افتراق کا دور لے کر آئی۔ ترکوں کی وحدت چار ریاستوں میں بٹ گئی۔ اور یہ ریاستیں ہر وقت باہمی جنگ و جدل میں اپنی قوتیں برباد کرنے لگیں۔ روسی سامراج اسی موقع کا منتظر تھا۔ ۱۸۵۰ء کے بعد اس نے اپنی توجہات اس طرف مرکوز کر دیں۔ اس نے اپنے حملہ کا آغاز سائبیریا اور اورن برگ کی طرف سے کیا۔ ترکستانی تقریباً ایک صدی تک کامیاب مزاحمت کرتے رہے۔ تاہم وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ روس کی قوت میں اضافہ اور مسلمانوں کی قوت زوال پذیر ہوتی چلی گئی۔ مگر خیوا، خوقند، فرغانہ، بخارا اور قازق روسیوں کی بڑھتی ہوئی شدید تیز یلغار کو دیکھتے ہوئے بھی متحد و منظم نہ ہو سکیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ایک کر کے چاروں ریاستیں سرنگوں ہو گئیں۔ ۱۸۹۰ء تک پورا مغربی ترکستان روس کے قبضے میں چلا گیا۔ قازق اور فرغانہ کو براہ راست روس کا صوبہ بنا دیا گیا۔ بخارا اور خیوا کی ریاستیں برقرار رکھی گئیں اور انہیں زیر حمایت علاقوں کا درجہ دے دیا گیا۔ اس طرح سولہویں صدی کے اندر اندر ماسکو کی ریاست ایک زبردست سامراجی قوت میں تبدیل ہو گئی۔

زاروں کے سامراجی ہتھکنڈے

روسی قیصریت زاریت نے ان ملکوں پر مسلط ہونے کے بعد پہلے تو ختم عام لاکھوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور لاکھوں کو وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد متعدد دوسرے اقدامات کئے۔ اول اصل باشندوں سے زرخیز زمینیں چھین کر روسی آبادکاروں کو لا بسایا۔ لاکھوں ایکڑ غیر آباد زمینوں پر قبضہ اس کے علاوہ تھا۔ اس طرح مقامی آبادی کے درمیان نہ

صرف ایک نیا عنصر پیدا کیا بلکہ مقامی باشندوں کو معاشی بدحالی کی پستیوں میں گرا دیا گیا۔

دوم مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لیے مشنریوں کا جال پھیلایا اور سرکاری سطح پر تحریص و ترغیب کے ساتھ ظلم و ستم اور غصب و نہب کے تمام ممکن ہتھکنڈوں سے کام لیا۔ ۱۷۱۳ء میں زار روس پیٹر نے جو مجنوں کے لقب سے مشہور ہے، ایسل اور ال میں یہ فرمان جاری کیا کہ جو قبیلے بھی چھ مہینے کے اندر اندر عیسائیت اختیار نہ کریں گے، ان سے اراضی چھین لی جائے گی۔

سوم۔ اقتصادی لوٹ کھسوٹ کا سلسلہ وسیع پیمانے پر جاری کیا۔ ملک کی زرعی و معدنی دولت بے تحاشا روس منتقل کی جانے لگی۔

چہارم۔ ترک عوام کو نہ صرف عصری تعلیم سے محروم رکھا گیا، بلکہ دینی مدارس پر بھی گوناگوں پابندیاں عاید کی گئیں۔ پھر اسی پر بس نہیں کیا، بلکہ ترک نوجوانوں کو تحصیل علم کے لیے ترکستان سے باہر جانے سے روک دیا گیا۔

پنجم۔ ترک مسلمانوں کو ایک دوسرے سے منقطع کرنے کے لیے گوناگوں تدابیر اختیار کی گئیں۔ حتیٰ کہ ایک علاقے کا دوسرے علاقے کے درمیان ڈاک اور تار کا سلسلہ بھی منقطع کر دیا۔

یہ تو وہ خصوصی تدابیر تھیں جن کے ذریعے زار روس کی حکومت نے مسلمانوں کی قوت کو پاش پاش کرنے، ان کے دین کو مٹانے اور ان کے جذبۂ حریت کو کچلنے کی کوشش کی۔ ترک آبادی کے ساتھ اس حکومت کے حکام کا برتاؤ کس نوعیت کا تھا؟ اس کا اندازہ چند مثالوں سے کیا جا سکتا ہے۔

۱۸۹۸ء میں اندیجان کی ناکام بغاوت کے بعد ترکستان کے روسی وائسرائے جنرل دوخوفسکوی نے پورے اندیجان کے علما و صلحا کو جامع مسجد میں جمع ہونے کا حکم دیا۔ پھر سنگینوں کے سائے میں انہیں سجدے میں گر جانے پر مجبور کیا گیا اور جب وہ سجدے میں گئے تو یہ جابر ان کی گردن پر پاؤں رکھتا ہوا چلا گیا۔

تاشقند کے وائسرائے جنرل ابوانوف نے اپنے ماتحت حکام کو یہ ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ مقامی لوگوں پر کسی حالت میں بھی رحم نہ کریں۔ ان پر سیاسی تازیانے برساتے رہیں۔ اور ہر وقت "روسی مُکّے" سے مرعوب رکھیں تاکہ وہ روسی برتری کے آگے سرنگوں رہیں اور اس کے خلاف آواز تک نہ اٹھا سکیں۔

ایک اور وائسرائے جنرل سامونوف نے ایک مرتبہ اپنے اہل کاروں کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ایک روسی کسان اور مزدور خواہ وہ کیسا ہی جاہل اور بدھو کیوں نہ ہو، ایک معزز اور شریف ترک شہری کے مقابلے میں زیادہ عزت کا مستحق ہے۔ اور زیادہ حقوق رکھتا ہے۔ اسی شخص نے اپنی اور زار کی تصویر اور بیاء؟ تاکی جامع مسجد میں آویزاں کر رکھی تھی۔

روسی وائسرائے جنرل مارٹنس نے فرمان جاری کیا کہ جب کوئی روسی افسر، خواہ وہ کسی مرتبے اور عہدے کا ہو، راستے سے گزرے تو ہر ترکستانی کو چاہئے کہ وہ اپنی جگہ پر نگاہیں نیچی اور گردن خم کرکے دست بستہ کھڑا ہو جائے۔ اسی وائسرائے نے یہ حکم بھی جاری کیا تھا کہ کوئی ترکستانی کسی پارک میں داخل نہیں ہو سکتا۔ جنرل کروپاٹکن ترکستان میں زار کا آخری وائسرائے تھا۔ اس نے ظلم کی انتہا کر دی۔ شمال مشرقی ترکستان کے قرغیز اور قزاق قبائل کی رہی سہی زمینیں چھین کر روسیوں کے حوالے کر دیں۔ اور جب ترکوں نے پرامن احتجاجی مظاہرہ کیا، تو اس نے مظاہرین کے قتل عام کا حکم دے دیا۔ اس قتل عام میں تقریباً ۵۰ ہزار ترک مارے گئے۔

روس کی اس جابرانہ پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکستانی معاشی طور پر پسماندہ اور سیاسی طور پر مضمحل ہو کر رہ گئے۔ لیکن اس کے باوجود ان کا جذبۂ آزادی زندہ و تابندہ رہا۔ انہوں نے روسی قیصریت کو ذہنی طور پر قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مغربی ترکستان میں روسی زاریت کا دور استبداد ۴۲ سال پر پھیلا تھا۔ اس عرصہ میں پندرہ بغاوتیں بڑے وسیع پیمانے پر ہوئیں۔ یہی کیفیت ایدل اورال، داغستان اور کریمیا کی تھی۔ روسی سامراج اپنے لاؤ لشکر اور ہتھیاروں کی قوت سے اگرچہ ہر بغاوت کو کچلنے میں کامیاب رہا۔ مگر دلوں کی آگ سرد نہ ہو سکی۔ یہ آگ خاکستر میں دبی ہوئی چنگاریوں کی طرح دوبارہ بھڑک اٹھنے کے لئے

موقعہ کی منتظر رہی۔ ۱۹۱۷ء میں جب زاریت کا تختہ الٹا تو یہ موقعہ اسے مل گیا۔

انقلاب روس

زاروں کا روس انقلاب کی راہ پر ایک عرصہ سے گامزن تھا۔ زاروں کی مستبد اور مطلق العنان حکومت کے نتیجے میں بے چینی صرف مقبوضہ ملکوں ہی میں پھیلی ہوئی نہ تھی۔ بلکہ خود روس کے اندر جوالا مکھی کھول رہا تھا۔ بنیادی حقوق، قانون ساز اسمبلی، معاشی انصاف، قانون کی عملداری کے قیام اور اقتصادی استحصال کے خاتمے کا مطالبہ عام ہوگیا تھا۔ زار شاہی استبداد ہوا کے رُخ کو بھانپنے کی بجائے اس مطالبے کو قوت کے زور سے کچلنے میں مصروف تھا۔ مگر آگ تھی کہ بڑھتی ہی جاتی تھی۔ حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے زیرِ زمین تحریکیں زور و شور سے کام کر رہی تھیں۔ انارکسٹوں اور سوشلسٹ دہشت پسندوں کی سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔ امن و اطمینان رخصت ہوگیا تھا۔ قتل، غارت اور تخریب کاری کی وارداتیں عام ہوگئی تھیں۔ سوشلزم دانش وروں کے طبقے میں بڑی تیزی اور بے پایاں وسعت کے ساتھ جڑیں پکڑ رہا تھا۔ زار کے مستبدانہ قوانین نے کسی معقول اور اعتدال پسندانہ نقطہ نظر کے لئے کام کرنے کے مواقع کلیتہً معدوم کر رکھے تھے۔ اور سازشی اور تخریبی قوتوں کی بن آئی تھی۔ یہ جوالا مکھی ۱۹۰۵ء میں پہلی مرتبہ پھٹا۔ اگرچہ فوج اور پولیس کی مدد سے اس جوالا مکھی کو پھیلنے اور بے قابو ہونے سے روک لیا گیا۔ مگر اس سے ملک کی حقیقی صورتِ حال کھل کر سامنے آگئی۔ بے چینی نیچے سے اوپر تک پھیل چکی تھی۔ فوج پر اب زیادہ مدت تک اعتماد و انحصار نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اس بغاوت میں بری اور بحری فوج کے بعض دستوں نے بھی حصہ لیا تھا۔ انقلابی قوتوں کی اس کوشش ناکام نے انقلاب کی رفتار اور تیز کر دی اور بارہ سال کے بعد روسی قیصریت کا عظیم الشان اور بظاہر مستحکم، مگر حقیقت میں جور و استبداد، مطلق العنانی اور سازشوں اور بدعنوانیوں کا گھن کھایا ہوا قصر زمین بوس ہو کر رہ گیا۔ انقلاب کے بعد کرنسکی کی نیابت میں حکومت قائم ہوئی۔ مگر جلد ہی بالشویکوں (انتہا پسند سوشلسٹ جو بعد ازاں کمیونسٹ کہلائے) نے لینن کی رہنمائی میں کرنسکی سے ملک کی زمام اقتدار چھین لی۔

سُرخ سامراج
اور
اسلامیانِ رُوس

انقلاب رونما ہوتے ہی مسلمان علاقوں نے روس کا سامراجی جُوا اتار پھینکا تھا۔ اور اپنی آزادی کا اعلان کر دیا تھا۔ مگر یہ آزادی چند روزہ ثابت ہوئی۔ دراصل ابھی بالشویکوں کا اقتدار مستحکم نہیں ہوا تھا کہنے کو تو ملک کی زمام ان کے ہاتھ میں تھی۔ مگر چند بڑے بڑے شہروں کو چھوڑ کر باقی سارا ملک عملاً انکے حیطۂ اقتدار سے باہر تھا۔ انقلاب برپا ہوتے ہی خانہ جنگی چھڑ گئی تھی۔ زار کی حامی سفید فوجیں سرخ فوجوں سے جنگ آزما تھیں۔ اور کئی محاذوں پر سرخ فوجیں بری طرح پٹ رہی تھیں۔ ایسی حالت میں انہوں نے روس کے محکوم مسلمانوں کی ہمدردی جیتنے، ان کا تعاون حاصل کرنے اور اپنی شرائط منوا کر سفید فوجوں کا ساتھ دینے سے روکنے کے لئے ایک اعلان جاری کیا۔ جسے "روسی انقلاب کا اعلان" کہا جاتا ہے۔ اس اعلان پر لینن کے دستخط تھے اس میں کہا گیا تھا۔

روس کے مسلمانو، والگا اور کریمیا کے ترکو اور تاتارو، ترکستان کے سارتو، ٹرانس کاکیشیا کے ترکو اور تاتارو اور وہ سب لوگو، جن کی مسجدیں اور عبادت گاہیں تباہ کر دی گئی تھیں، اور جن کے مذہب اور روایات کو روسی زاروں اور غاصب فرمانرواؤں نے پامال کر دیا تھا۔ آج سے تمہارا دین و ایمان، تمہاری روایات، تمہارے قومی اور ثقافتی اداروں کی آزادی اور حرمت کا اعلان کیا جاتا ہے۔ اپنی قومی زندگی کی تعمیر آزادی سے اور بے روک ٹوک

کرو۔ یہ تمہارا حق ہے۔ سوویٹ انقلاب اس کی تمہاری دوست ہے۔ سوویٹ یونین کی تمام اقوام کی حفاظت اور تکریم کرے گا۔ سوویٹ یونین تم سے صرف تعاون چاہتی ہے۔ عوامی کیساروں کی کونسل نے فیصلہ کیا ہے کہ مختلف قوموں کے متعلق اپنی پالیسی کی بنیاد مندرجہ ذیل اصولوں پر رکھے گی۔

۱۔ روسی قوموں کو مساوی حقوق اور حاکمیت حاصل ہوگی۔

۲۔ روسی قوموں کو حق خود اختیاری حاصل ہوگا نیز انہیں روس سے الگ ہوکر آزاد اور خودمختار ریاستیں قائم کرنے کا حق بھی ہوگا۔

"قوموں کے حق خود اختیاری" اور "آزاد قومی ریاست" کی مزید تشریح قومیتوں کے عوامی کیسار سٹالن نے ایک مضمون میں ان الفاظ میں کی۔

"تمام ملکوں کی سوشل جمہوریت عوام کے حق خود ارادیت کو تسلیم کرنے کا اعلان کرتی ہے۔ کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی قوم کی مدرسوں کا ہرج اور قوانین کو تباہ کرنے اور اس کے رسم و رواج اور عادات و روایات کو مٹانے کے لئے اس کی زندگی میں مداخلت کرے۔"

لینن اور سٹالن کے یہ اعلانات اگرچہ سوشلزم کے دکھاوے کے دانت تھے[1] تاہم ان کا مقصد پورا ہوگیا مسلمان دام فریب میں آگئے۔ وہ سوشلسٹ روس کو آزادی دہندہ کی حیثیت سے دیکھنے لگے۔ ان کی ہمدردیاں بالشویکوں کے ساتھ ہوگئیں۔ بعض مقامات پر انہوں نے سفید فوجوں کے مقابلے میں ان کی حمایت بھی کی۔ اپنی نوزائیدہ مملکتوں کے تحفظ کے لیے کوئی اقدامات نہ کئے۔ چنانچہ جونہی سفید فوجوں کی قوت مزاحمت کمزور پڑی اور سوشلسٹ روس کے پاؤں مضبوطی کے ساتھ جم گئے۔ اس نے "اعلان انقلاب" کو بالائے طاق رکھ دیا۔ اور سرخ فوجیں روسی زاروں اور غاصب فرمانرواؤں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ان نوآزاد ریاستوں پر چڑھ دوڑیں اور ایک ایک کرکے انہیں نگل گئیں یہ داستان چونکہ سوشلسٹ سامراج کے حقیقی خدوخال اجاگر کرتی ہے۔ اس لئے ہم اسے ہر ریاست کے عنوان کے تحت قدرے مفصل بیان کریں گے

ایدل اورال

انقلاب برپا ہوتے ہی ماسکو میں ایک کل روسی مسلم کانگریس منعقد ہوئی جس میں روسی مقبوضہ کے تمام مسلمان علاقوں کے نمائندے شریک ہوئے۔ کانگریس نے بھاری اکثریت سے مسلمان علاقوں کی خودمختاری کی تجویز منظور کی۔ اور ایک مفصل منصوبہ تیار کیا۔ اس سلسلہ میں ایک مسلم نیشنل کونسل (مجلس شوریٰ) منتخب کی گئی جس کا کام یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کا نقطہ نظر روسی حکومت کے سامنے پیش کرے۔ اس مجلس کا مرکز پیٹرو گراڈ قرار پایا۔ اور اس کی صوبائی شاخیں قائم کر دی گئیں۔ مجلس شوریٰ کی اہم ترین شاخیں قازان اور اوفا میں تھیں۔ قازان کی شاخ نے ایک مسلم اسمبلی بلائی اور فروری ۱۹۱۸ میں والگا اور اورال کی متحدہ ریاست اور داخلی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ اور آئین ساز اسمبلی بنانے کا حکم دیا۔ اس نوآزاد ریاست کا صدر صدری مقصودی تھا۔ لیکن بالشویکوں نے اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچنے نہ دیا۔ جنوری ۱۹۱۸ میں بالشویک حکومت نے روسی مسلمانوں کی ایک مرکزی مسلم کیساریٹ بنائی۔ جس کا چیئرمین ایک تاتاری کمیونسٹ مُلّا نور وقتوف تھا۔ نور وقتوف نے اس سلسلہ میں اہم غدارانہ کردار ادا کیا۔ وہ پیٹرو گراڈ سے قازان پہنچا اور ترغیب و تحریص اور ریشہ دوانیوں کے ذریعے تاتاریوں کی ایک بڑی تعداد کو غداری پر آمادہ کر لیا۔ اس نے تاتاریوں کی ایک فوج قائم کی۔ ادھر قازان میں پہلے ہی بالشویک روسی دستے موجود تھے۔ ماسکو سے مزید روسی فوج پہنچ گئی۔ بالشویک فوج اور تاتاریوں کے درمیان زبردست جنگ ہوئی۔ آخر روسی شہر کے تاتاری علاقے پر قابض ہو گئے۔ مجلس ملّی اور مسلمانوں کی دوسری سیاسی تحریکیں خلاف قانون قرار دے

---

[1] حق خود ارادیت اور آزادی کا جو مفہوم و مطلب دنیا بھر میں لیا جاتا ہے، مارکسٹ اس کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک حق خود اختیاری اور آزادی کا یہ تصور "بورژوائی" ہے۔ مارکسٹوں کا تصور حق خود ارادیت و آزادی یہ ہے کہ عوام کی اکثریت چاہے کسی بھی نظام حیات اور نظام حکومت کی خواہش مند ہو چند کمیونسٹ پرولتاریوں کے نام پر اقتدار پر قبضہ کریں۔ اب اگرچہ وہ ریاست "بڑے بھائی" اور "ماتا" کی تابع محمل ہی کیوں نہ ہو، وہ آزادی اور حق خود ارادیت کی حامل ہے۔

دی گئیں۔ مارچ ۱۹۱۸ء میں تاتار سوویٹ جمہوریہ قائم کی گئی۔ اس "جمہوریہ" کی حد بندی کرتے وقت اس امر کا خصوصی اہتمام کیا گیا کہ تاتاریوں کی واضح اکثریت نہ ہونے پائے۔

جنوبی سلسلۂ اورال میں باشقر آباد تھے۔ یہ لوگ دراصل تاتاریوں ہی کی ایک شاخ تھے۔ روسی انقلاب برپا ہوا تو باشقر حریت پسندوں نے احمد ذکی ولیدوف کی قیادت میں کل باشقرہ دستور ساز اسمبلی (کرلتائی) اور جرگے کے مقام پر طلب کی۔ اسمبلی نے آزاد باشقر حکومت قائم کرنے کا اعلان کر دیا (نومبر ۱۹۱۷ء) فروری ۱۹۱۸ء میں ذکی ولیدوف کو بالشویکوں نے گرفتار کر لیا۔ مگر وہ انہیں جُل دے کر نکل گیا۔ اور باشقروں کی فوج جمع کر کے امیر البحر کولچک کی سفید فوجوں سے جا ملا۔ لیکن کولچک اب بھی زار کے توسیع پسندانہ سامراج کا علمبردار تھا۔ اس لئے ذکی ولیدوف کو اس کا ساتھ چھوڑنا پڑا۔ اس نے لینن اور سٹالن سے ملاقاتیں کیں۔ معاہدہ طے پایا اور فروری ۱۹۱۹ء میں باشقر دستے سرخ فوجوں کے ساتھ جا ملے۔ ۲۳ مارچ ۱۹۱۹ء کو ایک فرمان کے ذریعے باشقر سوویٹ جمہوریہ کا قیام عمل میں آگیا۔

داغستان

داغستان نے قیصری روس کے سامراجی عزائم کی سب سے زیادہ مزاحمت کی تھی۔ امام شامل کی ناکامی کے بعد بھی یہ علاقہ اضطرابات اور ہنگاموں کی آماجگاہ بنا رہا۔ جب روس میں انقلاب آیا تو داغستان کے حریت پسندوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ انھوں نے فوراً روس سے آزادی کا اعلان کر دیا۔ دسمبر ۱۹۱۷ء میں داغستان کی آزاد حکومت وجود میں آئی جسے ترکی، جرمنی اور خود سوویٹ حکومت نے تسلیم کیا۔ مگر مئی ۱۹۱۹ء میں جنرل ڈینکن کی قیادت میں سفید فوجوں نے حملہ کر دیا۔ اہل داغستان نے حاجی اوزون اور دوسرے زعماء کے زیر قیادت حملہ آوروں کا سخت مقابلہ کیا۔ اسی اثنا میں سرخ فوجیں بھی بن بلائے مدد کو آن پہنچیں۔ سفید فوجوں کو شکست تو ہو گئی۔ مگر داغستان اب سرخ سامراج کے چنگل میں گرفتار ہو چکا تھا۔ سوویٹ فوج نے کچھ مدت آزاد حکومت کو گوارا کیا اور پھر اس کی بساط لپیٹ کر خود قابض ہو گئی۔

کریمیا

انقلاب برپا ہوتے ہی کریمیا کے ترکوں نے جمہوریۂ کریمیا کے قیام کا اعلان کر دیا۔ مفتی اکبر قشلس جہان جمہوریہ کے صدر منتخب ہوئے۔ فوراً ہی یوکرینیا اور کریمیا کے درمیان سفیروں کا تبادلہ ہوا۔ بعض دوسری حکومتوں نے بھی اسے تسلیم کر لیا۔ ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ روس نے کریمیا پر حملہ کر دیا۔ حریت پسندوں نے بڑی سختی سے مزاحمت کی۔ خونریز لڑائیوں کے بعد آخر کار ۱۹۲۰ء میں کریمیا پھر سرنگوں ہو گیا۔

آذربائیجان

۱۹۰۵ء تک روس اور اس کے مقبوضہ ممالک میں سیاسی پارٹیاں قائم کرنے کی اجازت نہ تھی۔ ۱۹۰۵ء کے ناکام انقلاب کا ایک ثمرہ یہ تھا کہ زار نے سیاسی پارٹیاں قائم کرنے اور سیاسی کام کیلئے عام کرنے کی اجازت دے دی۔ اس طرح ہر جگہ سیاسی سرگرمیوں کا آغاز ہو گیا۔ ۱۹۱۱ء میں محمد امین رسول زادہ نے آذربائیجان میں حزب مساوات قائم کی۔ مارچ ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب کے بعد حزب مساوات نے آزادی کی مہم شروع کر دی۔ باکو کی آبادی کی اکثریت روسیوں پر مشتمل تھی۔ انقلاب رونما ہوتے ہی یہاں ایک کمیونسٹ انقلابی کونسل قائم ہو گئی جس کا سربراہ ایک آرمینی سٹیپن شاہمیاں تھا۔ حریت پسندوں نے غانزہ کو اپنا دار الحکومت بنایا۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۱۷ء کو جمہوریہ آذربائیجان نے ٹرانس کاکیشیا کی فیڈرل ری پبلک میں شمولیت اختیار کر لی۔ مگر زمینی بعد اختلافات کی بنا پر الگ ہو گئی اور مکمل آزادی کا اعلان کر دیا۔ ۴ جون ۱۹۱۸ء کو ترکی کے ساتھ معاہدۂ امن طے ہوا اور پھر ترکی اور آذربائیجان کی مشترکہ فوجوں نے نوری پاشا کی قیادت میں باکو پر یلغار کی اور اسے سرخ فوجوں سے چھین لیا۔ ادھر ہندوستان کی طرف سے برطانوی فوجیں بڑھیں۔ اور ۱۷ اگست ۱۹۱۸ء کو باکو پر قابض ہو گئیں۔ تین دن بعد فتح علی خان خویاسکی کی قیادت میں آذربائیجانی حکومت قائم ہو گئی۔ ۷ دسمبر ۱۹۱۸ء کو بالغ رائے دہی کی بنیاد پر دستور ساز اسمبلی کے لئے عام انتخابات ہوئے جس میں ۱۲۰ نشستوں میں سے ۴۴ پر مساوات پارٹی کامیاب ہو گئی۔ علی مردان توپچی باشی اسمبلی کا سپیکر منتخب ہوا۔ اور نسیب انسیب نے نئی حکومت بنائی جسے اتحادی طاقتوں نے تسلیم کر لیا (جنوری ۱۹۲۰ء) لیکن اسی سال ۲۷،

اپریل کو آذربائیجان پر سرخ فوجوں نے حملہ کر دیا۔ کہا یہ گیا کہ یہ اقدام آذربائیجانی انقلابی کمیٹی کی استدعا پر اٹھایا گیا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ ایک کھلی سامراجی جارحیت تھی، جس کا ارتکاب آذربائیجان کی نمائندہ حکومت کے خلاف محض تیل کے چشموں پر قبضہ کرنے کے لئے کیا گیا۔ ۲۸ اپریل کو آذربائیجان کی آزاد زندگی ختم ہو گئی۔ اور "سوویٹ جمہوریہ" وجود میں آ گئی۔

ترکستان

اب ترکستان کی داستان سنیئے۔ زاروں کے عہد میں انتظامی اور سیاسی اعتبار سے ترکستان کے دو حصے تھے۔ ایک وہ جو براہ راست روس کے انتظام میں تھا۔ اور دوسرے استعماری مقبوضات کی طرح اس کا ایک داخلی "صوبہ" سمجھا جاتا تھا۔ تاشقند اس صوبے کا دارالحکومت تھا۔ دوسرا وہ جو بخارا اور خیوا کی ریاستوں پر مشتمل تھا۔ جہاں امیر حکمرانی کرتے تھے۔ سیاسی اعتبار سے ان ریاستوں کی حیثیت بالکل ویسی تھی جو برصغیر پاکستان و ہند میں برطانوی عہد میں راجواڑوں کی ہوا کرتی تھی۔

روس میں انقلاب برپا ہوا تو ترکستان میں افراتفری کی کیفیت تھی۔ تاشقند میں کئی جماعتیں سرگرم عمل تھیں۔ ایک ترکستان کی عارضی حکومت کی کمیٹی تھی۔ دوسری مزدوروں، سپاہیوں اور کسانوں کے نائبین کی کونسل تھی۔ جس کے دروبست پر کمیونسٹ چھائے ہوئے تھے۔ تیسری ترک مسلمانوں کی تحریک شورائے اسلامیہ تھی۔ چوتھی نوجوان ترکستان یا جدید پارٹی تھی۔ موخر الذکر پارٹی ترکستان کی مکمل سیاسی خودمختاری اور بخارا و خیوا کی ریاستیں ختم کرنے کی علمبردار تھی۔ جب سوویٹ حکومت نے اعلان انقلاب جاری کیا۔ تو دسمبر ۱۹۱۷ء میں مسلمان تنظیموں اور ریلوے ورکروں نے کوکند میں قومی کانگرس منعقد کی۔ کانگرس نے مصطفےٰ چوقائی اوغلو کی سربراہی میں عارضی حکومت قائم کر دی اور دستور ساز اسمبلی منتخب کرنے کا فیصلہ کیا۔ تاکہ یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ ترکستان کمیونسٹ ریاست کے اندر شامل رہے یا آزادی کا اعلان کر دے۔ کوکند کے کمیونسٹوں نے کوکند کی عارضی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کی۔ پولٹراسکی نامی ایک کمیونسٹ کوکند اسٹیٹ کا سارا روپیہ لے اڑا۔ اتنے میں جنرل کولی سوف تاشقند سے فوج لے کر پہنچ گیا۔ خونریز جنگ کے بعد کوکند مغلوب ہو گیا (فروری ۱۹۱۸ء)۔ اور علما اور حریت پسند ترکستانی ارد گرد کے علاقے میں پھیل کر گوریلا جنگ لڑنے لگے۔

بخارا کا سقوط

اب کمیونسٹوں کے حوصلے بڑھ گئے تھے۔ مارچ ۱۹۱۸ء میں انہوں نے اپنا رخ بخارا کی طرف موڑ دیا۔ بخارا میں جدیدیت کی رو ۱۹۰۵ء سے پہلے ہی شروع ہو چکی تھی۔ ۱۹۰۵ء کے بعد جب روس میں کھلی سیاسی سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔ بخارا میں بھی جدید پارٹی نے کام شروع کیا۔ مگر امیر بخارا نے اسے دبانے کی کوشش کی۔ زار کو زوال آیا تو جدیدیت پسندوں کی جدوجہد ایک نئے مرحلے میں داخل ہو گئی۔ امیر نے کچھ سطحی اصلاحات منظور کر کے انہیں مطمئن کرنا چاہا۔ قیدی بھی رہا کر دیئے گئے۔ مگر ان اقدامات سے کوئی بھی مطمئن نہ ہو سکا۔ اب امیر نے قوت کے بل پر مخالفوں کو خاموش کر دینا چاہا۔ تیس نمایاں انقلاب پسند گرفتار کر لئے گئے۔ اور انہیں کوڑوں کی سزا دی گئی۔ ایک لیڈر مرزا نصر اللہ کو ڈیڑھ سو تازیانے لگائے گئے۔ جن کی تاب نہ لا کر وہ مر گیا۔ مرتے وقت اس نے توقع ظاہر کی کہ آزادی کی جدوجہد جاری رہے گی۔ نصر اللہ کی موت نے آگ پر تیل کا کام کیا۔ ہر طرف ہنگامے اٹھ کھڑے ہوئے۔ احتجاجی مظاہرے ہونے لگے۔ ادھر جدید پارٹی کے بائیں بازو نے جنرل کولی سف سے ساز باز شروع کر دی۔ دائیں بازو کے جدیدی بخارا اور خیوا کے امیروں کو ختم کرنے کے تو حامی تھے۔ مگر وہ آزادی پسند بھی تھے اور جمہوری و قومی نقطہ نظر بھی رکھتے تھے۔ وہ ترکستان کو ایک آزاد قومی ریاست بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے قیدیوں کی رہائی اور اپنی تنظیم کی قانونی منظوری کے لئے امیر سے مذاکرات کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس پر کمیونسٹ پارٹی سے الگ ہو گئے۔ اور نوجوانان بخارا پارٹی کے نام سے اپنی الگ جماعت قائم کر لی۔ فیض اللہ خدیوان ان کا لیڈر تھا۔ جنرل کولی سف نوجوانان بخارا پارٹی کی دعوت پر بخارا کی طرف بڑھا۔ مگر اسی اثنا میں دو اہم واقعات رونما ہوئے۔ زار کے حامی جنرل ڈیوٹوف نے سائبیریا کے قازقوں کو ہمراہ لیکر اورنبرگ پر قبضہ کر لیا جو ماسکو سے تاشقند جانے والی ریلوے کا

پرواقع تھا اس طرح مغربی ترکستان ماسکو سے کٹ گیا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف مغربی ترکستان میں قحط نمودار ہو گیا۔ اور دوسری طرف کیونسٹ خود اپنے مرکز سے کٹ کر رہ گئے۔ ادھر کوکند میں جمہوری حکومت قائم ہو گئی۔ اس صورت حال سے کمیونسٹوں کے لئے خاصی مشکل پیدا ہو گئی۔ جنرل فرونزے نے بخارا کا محاصرہ کر لیا تھا۔ لیکن مسلمانوں نے حملہ آور کی سخت مزاحمت کی اور جان پر کھیل گئے حتیٰ کہ دشمن کو بھی ان کی شجاعت اور دلیری کا اعتراف کرنا پڑا۔ نوجوانان بخارا پارٹی کا لیڈر فیض اللہ اس عظیم مزاحمت کی داستان ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

"قدامت پسند مجنوں ملا بے سروسامانی کے باوجود نہایت بہادری سے لڑے۔ ان کے ہاتھ میں صرف چاقو، کلہاڑے اور زنگ آلود تلواریں تھیں۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے ایک مسلمان کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لاٹھی تھی۔ وہ اپنے دانتوں میں تلوار دبائے بے خوف و خطر مشین گن کی طرف بڑھا، اور ایک ہی وار سے مشین چلانے والے کا کام تمام کر دیا۔"

کمیونسٹوں نے بخارا پر قبضہ کرنے کے لئے جان توڑ کوشش کی۔ ایک طرف بخارا پر زبردست گولہ باری کی اور دوسری طرف افغانستان سے سمجھوتا کرنا چاہا۔ مگر ناکام رہے اور کوئی سخت محاصرہ اٹھانے پر مجبور ہو گیا۔ لیکن بخارا کی یہ زندگی چند روزہ تھی۔ کوکند سے نپٹنے کے بعد کمیونسٹ پھر بخارا پر چڑھ دوڑے۔ اس عرصہ میں روس میں کمیونسٹوں کے قدم مضبوطی کے ساتھ جم چکے تھے۔ زار کی حامی فوجوں کو شکست پر شکست ہو رہی تھی۔ جنرل ڈبروف مشرقی ترکستان کی طرف پسپا ہونے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اب کمیونسٹوں کو ماسکو سے بے روک ٹوک کمک پہنچ سکتی تھی۔ ادھر ملک کے اندر سارا کتیزوں نوجوانانِ بخارا پارٹی کی تخریبی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ امیر بخارا کے لئے یہ صورت حالات سخت مایوس کن تھی۔ چنانچہ وہ خزانہ سمیٹ کر افغانستان چلا گیا۔ بخارا نے علما کی قیادت میں سرخ فوجوں کی شدید مزاحمت کی۔ مگر تا بکے۔ آخر کار بخارا سرنگوں ہو گیا۔

بخارا کی فتح کے بعد کمیونسٹوں نے خیوا پر بھی قبضہ کر لیا۔ اب میدان جنگ تاجکستان کی طرف منتقل ہو گیا۔ جہاں حریت پسندوں نے گوریلا جنگ ایک مدت تک جاری رکھی۔ کمیونسٹ، ترکستانی مسلمانوں کی اس جدوجہد آزادی کو بسماچی تحریک یعنی لٹیروں کی تحریک کا نام دیتے تھے۔ یہ کوئی نیا نام نہ تھا جو کمیونسٹوں نے حریت پسندوں کو دیا تھا۔ زارانِ روس کے زمانے میں جب بھی حریت پسندوں نے پرچم آزادی لہرایا۔ سامراجی حکومت نے انہیں بسماچی (لٹیرے) کے نام سے یاد کیا۔ یہاں تک کہ یہ لفظ ترکستانی مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کی علامت (SYMBOL) بن گیا۔ ابراہیم بیگ بسماچی تحریک کا رہنما تھا۔ اس نے کمیونسٹوں کو کئی معرکوں میں شکست دی اور متعدد شہروں پر قبضہ کر لیا۔ اسی اثنا میں انور پاشا بھی پہنچ گیا۔ اور تحریک آزادی کی رہنمائی اپنے ہاتھ میں لے لی۔ بخارا کے سقوط کے بعد بہت سے ان لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں جو کمیونسٹ انقلاب میں ترکستان کی آزادی کا خواب دیکھ رہے تھے۔ چنانچہ وہ کمیونزم سے منحرف ہو کر حریت پسندوں سے آملے۔ عثمان خلیل انہی میں سے ایک تھا۔ مجاہدین نے کمیونسٹوں سے نبرد آزما ہونے کی تیاریاں زور و شور سے شروع کر دیں۔ انہوں نے کئی شہر ان سے چھین بھی لئے۔ مگر اتحاد و اتفاق اور جوش و خروش کی یہ فضا زیادہ مدت تک قائم نہ رہ سکی۔ داخلی خلفشار اور بدنظمی نے ہوا کا رُخ بدل دیا۔ ابراہیم بیگ جو انور پاشا کی آمد سے پہلے بسماچی تحریک کا لیڈر تھا، اس سے الگ ہو گیا۔ اور اس کی کوششوں کی راہ میں روڑے اٹکانے لگا۔ ادھر کئی اور لوگ بھی الگ ہو گئے۔ ان میں فیض اللہ بھی تھا۔ اب باہر سے کمیونسٹ فوجوں کا دباؤ بڑھنے لگا۔ اور اندر سے کمیونسٹوں نے انور پاشا کی فوجوں میں بے دلی اور تفرقہ اندازی کا کام جاری رکھا۔ اس طرح انور پاشا کی ساری صلاحیتیں ہی چپقلشوں اور مار آستینوں کی ریشہ دوانیوں میں الجھ کر رہ گئیں۔ اسی اثنا میں وہ ایک جنگ میں شہید ہو گئے۔ اب قیادت ابراہیم بیگ کے ہاتھ میں آئی۔

ابراہیم بیگ نے از سرِ نو اپنی فوجیں منظم کیں۔ کمیونسٹوں کے پروپیگنڈے کا سدباب کیا۔ ان پر کڑی نظر رکھنے کے لئے خفیہ پولیس کا انتظام کیا۔ ان کے خلاف وسیع پیمانے پر پراپیگنڈا کیا۔ ان ساری کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمیونسٹوں کی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں۔ تاہم یہ صورت حال عارضی تھی۔ کمیونسٹوں کی

کی مزاحمت میں علما پیش پیش تھے۔ بخارا، خیوا اور کوکند میں بھی وہی آخری دم تک مسلمانوں کو ابھارتے رہے تھے۔ گوریلا فوجیں منظم کرنے میں بھی انہی کا ہاتھ تھا اور اب تاجکستان میں بھی وہی آگے آگے تھے۔ کمیونسٹوں نے محسوس کر لیا کہ جب تک علما کا توڑ نہ کیا جائے گا۔ عام مسلمانوں کے جذبۂ جہاد کو سرد نہ کیا جا سکے گا۔ چنانچہ انہوں نے کچھ ملاؤں کو اپنا آلۂ کار بنایا۔ ان ملاؤں نے عام مسلمانوں کو ہموار کرنے کے لئے قرآن و حدیث کے حوالوں سے کمیونزم کی حقانیت بیان کی اور اشتراکیوں کو دین اسلام کا محافظ ثابت کیا۔ جو علمائے حق کمیونزم کی مزاحمت کر رہے تھے، ان کو اسلام کا دشمن، کافر اور اقتدار کا خواہاں قرار دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک جانب علما کی صفوں میں انتشار پیدا ہو گیا۔ اور دوسری جانب عام مسلمان کمیونزم کو مصالحت پسندانہ نقطۂ نظر سے دیکھنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی کمیونسٹوں نے دیہاتی عوام میں انتشار کا بیج بونے اور انہیں طبقہ وارانہ کشمکش کا شکار بنانے کی جدوجہد شروع کر دی۔ کیونکہ دیہات ہی گوریلا گروہوں کی افرادی قوت کا منبع تھے۔ علما کی دعوتِ جہاد پر لبیک کہنے والے زیادہ تر دیہاتی عوام ہی تھے۔ گوریلا گروہوں کو ان کے تعاون سے محروم کر کے ہتھیار ڈالنے پر ان کو مجبور کیا جا سکتا تھا۔ کمیونسٹوں کی یہ تدبیریں کارگر ہوئیں۔ رفتہ رفتہ کمیونزم کے خلاف مزاحمت دم توڑنے لگی۔ اور ۱۹۲۶ء تک پورے ملک میں کمیونسٹوں اور روسیوں کا پرچم لہرانے لگا۔ تاہم بسماچی تحریک کی اکا دکا چنگاریاں ۱۹۳۱ء تک سلگتی رہیں۔ ابراہیم کی گرفتاری کے بعد سوشلسٹ سامراج کے مقابلے میں مسلمانوں کی مزاحمت کا ایک عظیم الشان باب ختم ہو گیا۔

۴

عالم اسلام میں اشتراکی تحریک

★

نمبر

یہ جو ہم سنا کرتے ہیں کہ کوئی صاحب اجتماعی منصوبہ بندی کی ضرورت پر زور دے رہے ہیں اور کوئی دوسرے صاحب ملک کے معاشی نظام میں انقلابی تبدیلیاں چاہتے ہیں اور کوئی تیسرے بزرگ فرماتے ہیں کہ زمین کو انفرادی ملکیت سے نکال کر قومیا دیا جائے اور کسی طرف سے آواز آتی ہے کہ ساری کلیدی صنعتیں بھی قومائی جائیں اور کوئی عطائیوں کی مجلس بڑے غور و خوض کے بعد یہ نسخہ کیمیا لے کر آتی ہے کہ زمین کی شخصی ملکیت کو ختم کر دیا جائے، یہ سب وہ نوادر حکمت ہیں جو مغرب کے اناڑیوں کی بیاض سے اڑائے گئے ہیں اور اب یہاں وہ سب تجربات ہوا چاہتے ہیں جو روس میں، جرمنی میں اور امریکہ و انگلستان میں ہو چکے ہیں مگر اس معاملے میں بھی ہماری اور ان کی مماثلت ایک فرق کے ساتھ ہے۔ وہاں کے اناڑی کم از کم مجتہد تو ہیں مگر یہاں جو حضرات مطب کھولے بیٹھے ہیں وہ اناڑی پن کے ساتھ مقلد بھی ہیں۔ مغرب کے اناڑی نقصان ہوتا دیکھتے ہیں تو نسخے میں کچھ رد و بدل کر لیتے ہیں مگر یہاں مغرب سے ہی کوئی رد و بدل کی اطلاع آجائے تو بات دوسری ہے ورنہ ڈاکٹر مریض کی آخری ہچکی تک انشاء اللہ ایک ہی نسخہ پلاتا رہے گا۔

ابوالاعلیٰ مودودی

عرب سوشلزم کی حقیقت و ماہیت

صدر مصر جمال عبدالناصر کا مقولہ ہے کہ "سوشلزم شریعت اللہ ہے"[1]- اس فقرے کے اندر وہی خیال کارفرما ہے جو اکبر کے "دین الٰہی" میں تھا- اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ عرب سوشلزم کی تاریخ اور اس کے نتائج و ثمرات پر گفتگو کرنے سے پہلے "عرب سوشلزم" کی حقیقت اور ماہیت خود عرب سوشلزم کے علمبرداروں کی زبان سے معلوم کرلیں - تاکہ ہمیں یہ اندازہ کرنے میں آسانی ہو سکے کہ کیا فی الواقع سوشلزم شریعت اللہ ہے ؟

سوشلزم کو عرب ممالک میں سب سے زیادہ قوت اور جرأت کے ساتھ پھیلانے کا سہرا مصر اور صدر مصر کے سر ہے- اس لئے ہم مصر کے سرکاری بیانات اور سرکاری ترجمانوں کی تحریروں سے عرب سوشلزم کی حقیقت و ماہیت کا جائزہ لیتے ہیں - اس وقت ہمارے سامنے مصر کے سرکاری ادارے اور سرکاری ترجمان کی تحریر کردہ کتاب : "الاشتراکیۃ" ہے - اس کتاب کو سوشلزم کی سرکاری دستاویز سمجھا جاتا ہے - اس کے مصنف ڈاکٹر بطرس غالی (؟) عرب سوشلسٹ پارٹی کے رہنما ہیں - ایک سرکاری پبلشنگ ہاؤس "دارالمعارف" نے اسے منتخب مطالعہ Selected Studies, کے عنوان سے شائع کیا ہے -

سوشلزم کی تعریف و تشخیص میں جو جانت بھانت کی بولیاں عرب مفکرین بول رہے ہیں ان کی "الجھنوں اور پراگندہ خیالیوں" کو دور کرنے کے لئے مصنف نے ایک مستقل باب میں تمام سوشلسٹ نظریات اور مذاہب بیان کئے ہیں - اور ان متنوع نظریات و مذاہب میں سے اس نظریہ پر انگلی رکھ دی ہے جو مصر کا مطمح نظر ہے - مصنف لکھتا ہے کہ ہم تمام سوشلسٹ مدارس فکر کو دو بڑی قسموں میں تقسیم کرتے ہیں : ایک "انقلابی سوشلزم" اور دوسرا "ارتقائی سوشلزم" - اول الذکر مدرسہ فکر کی نگاہ میں "انقلاب" اور "راست اقدام" ہی وہ واحد طریق کار ہے جو سرمایہ دار معاشرے کو سوشلسٹ معاشرے میں تبدیل کر سکتا ہے - مارکسزم اسی مدرسہ فکر کی شاخ ہے - ثانی الذکر مدرسہ فکر کے نزدیک دستوری نظام کے اندر تدریجی طور پر سوشلزم کو فروغ دیا جا سکتا ہے بلکہ تدریجی تبدیلی زیادہ دیرپا اور وسیع الاثر ہوتی ہے - اس مدرسہ فکر کو مصنف نے دو بڑی جماعتوں میں منقسم کیا ہے ایک گِلڈ سوشلزم Guild Socialism اور دوسری اجتماعی سوشلزم collectivism فابین سوشلزم Fabian Socialism. کو مصنف نے اجتماعی سوشلزم

---

[1] کتاب : "یدالا اشتراکیۃ" (؟) تالیف احمد فواد الیاقی (؟) مطبوعہ دارالریحانی ، بیروت ، ص ۱۵۰ مصنف نے یہ مقولہ شامی ادیب زہیر شلق کے حوالے سے نقل کیا ہے - شامی ادیب کا بیان ہے کہ صدر ناصر جزری (؟) یہ کہا کرتا ہے کہ "سوشلزم شریعت اللہ ہے"

کا کامیاب نمونہ بنایا ہے۔ برطانیہ کی لیبر پارٹی اسی سوشلزم کی علمبردار ہے۔ اسے ڈیموکریٹک سوشلزم بھی کہا جاتا ہے۔ اسکنڈے نیوین ممالک (ناروے، سویڈن اور ڈنمارک اسی سوشلزم کی جانب مائل ہیں) اسی تقسیم و تعریف کے بعد مصنف نے سوشلزم کی تمام اقسام پر شدید تنقید کی ہے اور انہیں ناقص اور غیر موثر قرار دیا ہے۔ البتہ مارکسزم پر مصنف نے تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ اور اسے سوشلزم کی مکمل ترین نوع ثابت کیا ہے۔ مارکسزم کے فلسفے کو اور طریق کو مصنف پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ چنانچہ مصنف نے مارکسزم کی چاروں بنیادوں کی شرح و بسط سے تحلیل کی ہے۔ یعنی مارکسزم کا اقتصادی نظریہ، اس کا نظریۂ ارتقاء تاریخ کی مادی تعبیر اور پروپیگنڈے میں سوشلزم کی تمام اقسام کو غیر موثر قرار دیا ہے البتہ وقتی مصالح کا لحاظ ان تمام بنیادوں میں سے ہر ہر بنیاد پر مصنف نے دل کھول کر داد تحسین دی ہے۔ البتہ اسے مارکسزم سے صرف اس پہلو سے اختلاف ہے کہ مارکسزم تمام دینی اور اخلاقی اقدار کا قلع قمع کرتا ہے اور کسی "روایت پرست معاشرے" کے لئے اسے قبول کرنا مشکل ہے[1]۔ پوری بحث کے بعد مصنف نے یہ خلاصہ نکالا ہے کہ "مصر نے جس سوشلزم کو اپنا رکھا ہے وہ نہایت صحیح اور متوازن ہے۔ مصر نے جاگیرداری نظام کو ختم کر دیا ہے۔ متزاید محصول کا نظام جاری کیا ہے، ضروریات زندگی کی تقسیم کا نظام اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے، امداد باہمی کے اصولوں پر بعض منصوبے نافذ کئے ہیں، مزدوروں کے حقوق کے تحفظ کے لئے متعدد قوانین وضع کئے ہیں، تعلیم اور صحت کا پورا نظام قومی ملکیت میں لے لیا ہے، اور کنٹرولڈ اقتصادی نظام کو جاری کیا ہے۔ بایں ہمہ مصر سیاسی اور اقتصادی میدان میں بڑی بنیادی تبدیلیوں کا محتاج ہے۔ مصری سوسائٹی انقلابی مرحلے سے گذر رہی ہے"۔ مصنف نے مشورہ دیا ہے کہ اگر "مصری سوسائٹی کی روایات و عادات اس سوشلزم کے نفاذ کے راستہ میں حائل ہو رہی ہوں تو انہیں اٹھا کر دیوار پر پھینک دینا چاہیئے سوسائٹی کو تمام "دینی بدعات" سے پاک کر دینا چاہیئے، اور ان تمام افکار و عقائد کو جو پیشرو نسلوں سے ہم تک پہنچے ہیں، زمین میں دفن کر دینا چاہیئے۔ اگر یہ تمام ارادے ہم نے پورے کر لئے اور ہم نے سوشلزم کے اعلیٰ و ارفع مقاصد پہچان لئے تو یقیناً ہم نہایت مضبوط اور اٹل بنیادوں پر سوشلسٹ سوسائٹی کی تعمیر کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے"[2]۔

سائنٹیفک سوشلزم

یہ بات معلوم و معروف ہے کہ "سائنٹیفک سوشلزم" مارکسزم کا دوسرا نام ہے۔ لینن اور "انقلابی سوشلزم" کے دوسرے لیڈر اسے استعمال کرتے آئے ہیں۔ سائنٹیفک سوشلزم کی اصلاح جب زبان پر آئے گی تو اس سے مراد مارکسی سوشلزم ہوگا۔ اور یہ اصطلاح اُسے دوسرے اشتراکی تصورات سے ممیز کرے گی۔ لینن نے دوسرے "ڈھیلے ڈھالے" اشتراکی تصورات کے مقابلے میں جب مارکسزم کو پیش کیا تو اس کے لئے "سائنٹیفک، انقلابی سوشلزم" کی اصطلاح کو استعمال کیا۔ عرب اشتراکی زعماء بھی "عرب سوشلزم" کے لئے "سائنٹیفک سوشلزم" کی اصطلاح استعمال کر رہے ہیں۔ یعنی دوسرے لفظوں میں وہ سوشلزم کی اُس قسم کے علمبردار ہیں جو مارکس نے پیش کی ہے اور جسے لینن نے نافذ کیا ہے۔ اور اُسی رنگ ڈھنگ کے ساتھ اس کی تنفیذ چاہتے ہیں جو "انقلابی سوشلزم" کا خاصہ ہے۔ عرب زعماء کی تقریروں اور بیانات میں بالعموم یہ کلمات آتے رہتے ہیں کہ ہم "الاشتراکیۃ العلمیۃ الثوریۃ" نافذ کرنا چاہتے ہیں۔

عرب ممالک میں سوشلزم کا سب سے پہلا قابل ذکر داعی بعث پارٹی کا بانی میشیل عفلق[1] ہے وہ کہتا ہے "مارکسزم کو ہم قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور اشتراکی ہونے کی حیثیت سے ہم مارکسزم سے بہت کچھ مواد اخذ کرتے ہیں"[2] صلاح الدین بیطار جو شام میں وزارت عظمیٰ کے عہدہ پر رہ چکا ہے اور

(حاشیہ نمبر ۱، ۲ صفحہ ۳۲۳ پر ملاحظہ فرمائیں)

---

[1] ممکن ہے یہ بات بھی مصنف نے اس لئے لکھ دی ہو کہ مصر کے مسلم معاشرے کے اندر دینی اور اخلاقی اقدار کی کھل کر مخالفت کرنے میں مارکسزم کا پروپیگنڈے کا نظریہ اجازت نہ دیتا ہو۔ [2] الاشتراکیۃ تالیف یحییٰ عویس ص ۱۵۰

جو بعث پارٹی کی "بین الاقوامی کمان" کا ممبر ہے پوری وضاحت کے ساتھ کہتا ہے "سب سے پہلے میں اُس ابہام کا پردہ چاک کرنا چاہتا ہوں جو سوشلزم کے لفظ میں پایا جاتا ہے۔ جب ہم "عرب سوشلزم" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہم شاید سوشلزم کی کوئی نئی قسم ایجاد کرنے والے ہیں۔ میں پورے وثوق سے کہنا چاہتا ہوں کہ ہماری نظر میں سوشلزم صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے سائنٹیفک سوشلزم ہمارے نزدیک مارکسزم سوشلزم کا ماخذ اساسی ہے"[1] بعث پارٹی کے ایک اور لیڈر ڈاکٹر نورالدین اتاسی موجودہ صدر شام نے فروری ۱۹۶۶ء کو بعثی انقلاب کے موقع پر کہا: "ہم ملک کے اندر سائنٹیفک سوشلزم نافذ کریں گے"[2]

مصر کا "میثاق" جو مصر کے لئے "عظیم دستوری دستاویز" کی حیثیت رکھتا ہے اور جس کی تدوین پر مصر کے صدر جمال عبدالناصر کو غیر معمولی فخر حاصل ہے، صاف اعلان کرتا ہے "ترقی کا صحیح لائحہ عمل اختیار کرنے کے لئے موزوں اسلوب سائنٹیفک سوشلزم ہے۔ کسی اور لائحہ عمل سے یقینی طور پر مطلوبہ ترقی حاصل نہیں ہو سکتی"[5] چنانچہ عرب دنیا کے مشہور کمیونسٹ لیڈر خالد بکداش نے بھی "عرب سوشلزم" کی تائید کرتے ہوئے اعلان کر دیا ہے کہ عرب سوشلزم سے مراد سائنٹیفک سوشلزم ہے اور یہ کمیونزم کا صحیح ترین ہدف ہے"[6] مصر کی کمیونسٹ پارٹی نے اپنے آپ کو مصر کی عرب سوشلسٹ پارٹی کے اندر مدغم کر دیا ہے۔ کیونکہ دونوں کے مقاصد میں اب کوئی اختلاف نہیں رہا۔

سوشلزم کے اسی تصور کی بنیاد پر عرب اشتراکی لیڈر سوشلزم کو محض ایک اقتصادی حل نہیں کہتے بلکہ اسے ایک عقیدہ اور نظام حیات قرار دیتے ہیں:-

> "عرب دنیا کا عسکری سوشلزم محض تجربہ ہی نہیں بلکہ ایک جوا ہے۔ یہ جوا اقتصادی ترقی اور بنیادی آزادیوں کے ساتھ ہی نہیں کھیلا جا رہا ہے، بلکہ عقیدہ، مصلحت اور عرب تہذیب کے ساتھ بھی کھیلا جا رہا ہے۔ اور یہ ہمیشہ بیرونی امداد کا محتاج رہے گا"[7]

اردن کا ایک اور اشتراکی مفکر ڈاکٹر منیف الرزاز لکھتا ہے۔

> سوشلزم کا یہ تصور کہ یہ محض ایک اقتصادی نظام ہے غلط تصور ہے۔ سوشلزم ایک نظام زندگی اور مستقل فلسفۂ حیات ہے۔ وہ مخصوص طرز زندگی پیش کرتا ہے۔ اگر آپ سوشلسٹ ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ لازماً کسی سوشلسٹ نظام کے اندر ہی زندگی بسر کریں، آپ کے سوشلسٹ ہونے کا یہ تقاضا ہے کہ آپ زندگی کے مطلوبہ طرز کو سمجھیں

---

[1] بعث پارٹی ۱۹۴۰ء میں شام میں قائم ہوئی تھی، اس کا بانی میشیل عفلق عیسائی ہے۔ اس وقت یہ پارٹی شام میں برسر اقتدار ہے۔

[2] ملاحظہ ہو روزنامہ الجماہیر، بغداد، شمارہ ۲۰ فروری ۱۹۶۳ء

[3] ملاحظہ ہو روزنامہ الاحد، بیروت، شمارہ ۲۱ اپریل ۱۹۶۳ء

[4] ملاحظہ ہو ماہنامہ الطلیعۃ دمشق، شمارہ جولائی ۱۹۶۶ء۔ یہ انقلاب بعث پارٹی کی علاقائی کمان نے بعث کی بین الاقوامی کمان کے خلاف برپا کیا تھا۔ کیونکہ بین الاقوامی کمان سوشلزم کے بارے میں "ڈھیلے ڈھالے" نظریہ کی حامی تھی۔ جب کہ علاقائی کمان چشم زدن میں اسے نافذ کرنا چاہتی ہے۔

[5] ملاحظہ ہو: المیثاق، ص ۵۱ باب ششم۔ مطبوعہ الدار القومیۃ للطباعۃ والنشر القاہرہ

[6] ملاحظہ ہو روزنامہ الاخبار، بیروت، شمارہ ۳۱ مارچ ۱۹۶۵ء۔

[7] ملاحظہ ہو کتاب الاشتراکیۃ فی التجارب العربیۃ مطبوعہ دار الکتاب الجدید، بیروت ص ۱۷۷

اور اس کے لئے کام کریں۔ اور جد وجہد جاری رکھیں۔ آپ کی یہ جد وجہد سوشلزم کا عمل کہلائے گی۔ ... سوشلزم نظریۂ زندگی ہے جو اقتصاد، سیاست، تعلیم و تربیت، اجتماعی معاملات، صحت، اخلاق، ادب، اور علم و تاریخ پر حاوی ہے۔ زندگی کے ہر چھوٹے اور بڑے پہلو سے بحث کرتا ہے۔ آپ کے سوشلسٹ ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ آپ زندگی کے ہر معاملے میں سوشلزم کی رہنمائی قبول کریں۔[1]

مصر کا نامور سوشلسٹ رہنما کمال رفعت مصری سوشلزم کی توضیح کرتے ہوئے کہتا ہے:

"سوشلزم زندگی کا ایک نظام اور ایک اسلوب ہے۔ یہ کسی معین چیز کے ساتھ مقید نہیں ہے۔ بلکہ ان حالات کے ساتھ مقید ہے جن میں اسے نافذ کیا جاتا ہے۔ ہمارا سوشلزم ایک مخصوص فکرِ حیات ہے۔ اُس کا مخصوص مزاج اور نقطۂ نظر ہے۔ یہ مجرد کوئی اقتصادی اصلاح نہیں ہے بلکہ یہ فرد اور معاشرے کی تمام نظری اور عملی مشکلات کا حل ہے"۔[2]

اسی بات کو ایک اور مصری سوشلسٹ مفکر ڈاکٹر جمال سعید نے یوں ادا کیا ہے:

"عرب سوشلزم کا یہ امتیاز نہیں کہ وہ ایک اقتصادی تحریک ہے۔ بلکہ اُس کا یہ امتیاز ہے کہ وہ ایک نظام، ایک انسانی مذہب، اور ایک اسلوبِ حیات ہے۔ اس کا مقصد ایک نئے سماج کی تشکیل ہے۔ یہ سوشلزم محض وسائلِ پیداوار کو فرد کی ملکیت سے نکال کر ریاست اور معاشرے کی ملکیت میں دینے کا نام نہیں ہے۔ یہ مجرد قومی اقتصاد پر قبضہ کر لینے اور اُسے معاشرے کی بہبود کے لئے مخصوص کر دینے کا نام نہیں۔ یہ محض اجتماعی اور اقتصادی اصلاح تک محدود نہیں بلکہ یہ فرد اور معاشرے کے لئے ہمہ پہلو نظری اور عملی حل پیش کرتا ہے۔ سوشلزم ایک نئے سماج کی تعمیر کی جد وجہد کا نام ہے"۔[3]

چنانچہ جس سوشلزم کو مارکسزم سے غذا ملتی ہو، اور جو محض اقتصادی تحریک نہ ہو بلکہ پوری زندگی کا نظام ہو اُس کا جو تقاضا ہے عرب سوشلسٹ لیڈر اُسے پوری آب و تاب کے ساتھ اور اخلاص و عزم کے ساتھ پورا کرنے میں منہمک ہیں۔ فکری اور طبقاتی کشمکش انہوں نے چھیڑ رکھی ہے۔ عرب سوسائٹی کو انہوں نے انہی خطوط پر تقسیم کر دیا ہے جو مارکسزم کا مدعا ہے۔ روزمرہ کی زبان میں وہی اصطلاحات استعمال کر رہے ہیں جو اس مخصوص نظامِ فکر و عمل کے لئے وضع کی گئی ہیں۔ داخلی اور خارجی سیاست انہی راہوں پر چل رہی ہے جو سوشلسٹ کیمپ نے تجویز کر رکھی ہیں۔ ہم ان امور پر تفصیل سے روشنی ڈالنے سے قبل عرب ممالک میں سوشلزم کے داخلے کی تاریخ کا ایک نظر جائزہ لینا مناسب سمجھتے ہیں۔

عرب ممالک میں سوشلزم کے داخلہ کی تاریخ

جنگِ عظیم ثانی سے قبل عرب ممالک سوشلزم اور کمیونزم کی دعوت سے ناآشنا تھے۔ جونہی جنگِ عظیم ختم ہوئی شام کی بعث پارٹی اور عرب ممالک کی کمیونسٹ پارٹیوں نے

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب "دراسات فی الاشتراکیۃ" تالیف ڈاکٹر منیف الرزاز ایڈیشن سنہ ۱۹۶۰ء

[2] ملاحظہ ہو ماہنامہ الکاتب، قاہرہ، شمارہ ستمبر سنہ ۱۹۶۲ء۔ ماہنامہ "الکاتب" مصری سوشلسٹ تحریک کا سرکاری ترجمان ہے۔ جولائی سنہ ۱۹۶۱ء میں جب مصر میں سوشلسٹ قوانین کا پہلی مرتبہ اجراء عمل میں آیا تو اسی مناسبت سے اس ماہنامہ کو بھی جاری کیا گیا۔

[3] ملاحظہ ہو کتاب "الاشتراکیۃ العربیۃ ومکانہا فی النظم الاشتراکیۃ" تالیف ڈاکٹر جمال سعید

سوشلزم (الاشتراکیۃ) اور کمیونزم (الشیوعیۃ) کا راگ چھیڑ دیا[1] لیکن یہ راگ الاپنے اور سننے والے بہت محدود افراد تھے۔ عام طور پر ان افکار سے لوگ نفرت کرتے تھے اور ان کو قبول کرنا یا ان کے بارے میں تساہل برتنا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ کسی عرب یا مسلمان کے لئے سب سے بڑی تہمت یہ تھی کہ اُسے مارکسزم کا ایجنٹ کہا جائے[2]۔ عرب ممالک میں سوشلزم کا اصل چرچا اس وقت سے شروع ہوا ہے جب سے مصر کے صدر جمال عبدالناصر نے اسے نظریہ کے طور پر قبول کیا ہے اور جولائی سنہ ۱۹۶۱ء کو اسی نظریہ پر مبنی "نیشنل چارٹر" (المیثاق الوطنی) مدون کیا ہے۔ یہ چارٹر موجودہ نظام کی روح ہے[3]۔

عرب سوشلزم کا دورِ نو، جو جمال عبدالناصر اور بعث پارٹی کی قیادت میں شروع ہوا ہے اس کا تاریخی پس منظر روس کے اس کردار سے وابستہ ہے جو اس نے ایک مدت سے عرب ممالک کے اندر اختیار کر رکھا ہے۔ یہ بات اگرچہ اکثر لوگوں کے لئے نرالی ہوگی لیکن یہ حقیقت ہے کہ مشرق اوسط میں سوویت یونین کا سیاسی کردار دراصل اُن عزائم کی تکمیل ہے جو روس کے زار حکمرانوں کے ذہن میں مدتوں سے پل رہے تھے۔

چار سو سال تک زاری روس بحر روم میں داخل ہونے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن ایران اور ترکی اس کے لئے سدِ راہ بنے رہے۔ عثمانی خلافت بحر روم میں روسیوں کی پیش قدمی کے آگے دیوار بنی ہوئی تھی۔ چنانچہ روسی چار صدیوں تک عثمانیوں کے ساتھ برسرِ جنگ رہے اور دونوں کے درمیان بیس سے زیادہ جنگیں برپا ہوئیں۔ لیکن عثمانی بڑی پامردی کے ساتھ روسی حملوں کے سامنے ڈٹے رہے۔ اور اگر عثمانیوں کی طرف سے اس معاملے میں عظیم الشان جرأت اور بسالت کا مظاہرہ نہ ہوتا تو آج عرب ممالک روسی سامراج کا ویسا ہی ایک حصہ ہوتے جیسے قوقاز (کاکیشیا) اور جزیرہ نمائے قرم زاران روس کی سلطنت کا ایک حصہ بن گئے تھے[4]۔ ان علاقوں پر قبضہ کرنے کا مقصد بھی یہ تھا کہ بحر روم سے ملانے والی آبی شاہراہوں کو ہاتھ میں لے لیا جائے۔ سنہ ۱۹۱۷ء میں زاری نظام ختم ہوا اور کمیونسٹ حکومت قائم ہوئی۔ لینن نے ترکی کے ساتھ عدم جنگ کا رویہ اختیار کیا بلکہ اتاترک کے ساتھ دوستانہ روابط قائم کئے۔ لیکن روسی اپنے تاریخی خواب سے کبھی دستبردار نہ ہوئے۔ چنانچہ جب اسٹالن کا دور آیا تو اسٹالن نے ترکی سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تھی مگر ترکوں نے ہوشیاری اور شجاعت سے کام لیا اور جنگ عظیم دوم کا عرصہ (۱۹۳۹ء — ۱۹۴۵ء) خیر و عافیت سے گزار دیا۔ جنگ ختم ہوئی تو سوویت فوجیں ترکی کی مغربی سرحد (بلغاریہ) میں داخل ہو گئیں۔ اس طرح دونوں فریقوں کے تعلقات پھر نزاکت اختیار کر گئے۔ اسٹالن نے کوشش کی کہ وہ موقع سے فائدہ اٹھا کر ترکی پر فوری حملہ کر دے اور آبناؤں پر قبضہ کر کے بحر روم کی جانب پیش قدمی کرے لیکن ترکوں نے اس مرتبہ بھی خطرے کا مقابلہ ثابت قدمی سے کیا اور اسی بنا پر ترکوں کو مغربی کیمپ کی طرف جھکنا پڑا۔

ایران کا قلع قمع کرنے کے لئے بھی اسٹالن برابر کوششیں کرتا رہا۔ کبھی اندرونی طور پر انقلاب برپا کرنے کی سازشیں کیں اور کبھی بیرونی طور پر دباؤ ڈالا۔ مگر ایران بھی ترکی کی طرح دلیری اور مردانگی کا ثبوت دیتا رہا۔ اور ترکی کی طرح اُسے بھی مجبوراً مغرب کی طرف مائل ہونا پڑا۔ بہرحال اسٹالن اپنے دور میں ترکی اور ایران کو مغلوب کر کے عرب ممالک میں داخل ہونے میں ناکام رہا۔ اور وہ عرب ممالک کے تیل اور بحر روم پر تسلط کا پرانا خواب شرمندۂ تکمیل نہ کر سکا۔

اسٹالن کے جانشینوں نے سنہ ۱۹۵۳ء میں مشرق اوسط میں اپنی سرگرمیوں کا نئے سرے سے آغاز کر دیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد مشرق اوسط

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب: "دور الماركسية في الاشتراكية العربية" تالیف ڈاکٹر عمر حلیق، مطبوعہ دار الکتاب الجدید، بیروت۔ ص ۵۔

[2] ملاحظہ ہو کتاب: "ایمان لا تیشا بهان" تالیف احمد فؤاد الیانی مطبوعہ دار الریحانی، بیروت، ص ۱۲۰

[3] دور الماركسية ص ۵ [4] ایضاً ص ۱۵ [5] اب روس نے حال ہی میں یہ مطالبہ کیا ہے کہ اسے درۂ دانیال دیا جائے۔ یہ دراصل روسیوں کے اسی پرانے خواب کا اعادہ ہے۔

پہ انگریزوں کا فوجی تسلط تھا۔ امریکہ کا نفوذ بڑھا تو اُس نے مختلف طریقوں سے دباؤ ڈال کر انگریزوں کو اکثر حصوں سے رخصت کر دیا مگر خود انگریزوں کی جگہ پُر نہ کر سکا۔ روس نے حالات سے فائدہ اٹھایا اور اپنے حامیوں کی مدد سے اور سوشلزم کے نعروں کے سہارے اس خلاء کو پُر کرنے کی کوشش کی۔ معاہدہ بغداد جو ترکی، ایران اور عراق کو سوویت خطرے سے محفوظ کرنے کے لئے کیا گیا تھا، روس نے اس کی پوری شدت اور تندی کے ساتھ مخالفت کی۔ اور بالآخر روس عراق کے فوجی انقلاب (۱۹۵۸ء) کے ذریعہ اس معاہدے سے عراق کو نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ عبدالکریم قاسم کے فوجی انقلاب کے بعد عرب ممالک میں پہلی مرتبہ سوشلزم اور کمیونزم کی آواز کھل کر بلند ہوئی۔ مگر عراق کی کمیونسٹ پارٹی نے اس انقلاب کے بعد درندگی، بہیمیت، خونخواری اور انسان کُشی کا جو ڈرامہ کھیلا اُس نے عرب کے سنجیدہ حلقوں کو کمیونزم سے بے حد خائف کر دیا۔

امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک کے استعماری ہتھکنڈوں اور عرب دشمن پالیسی نے مشرق اوسط میں روس کے حق میں فضا ہموار کرنے میں کافی مدد فراہم کی ہے۔ اور بالخصوص فلسطین کے معاملے میں ان طاقتوں نے جو موقف اختیار کیا ہے اُس نے عربوں کو سہارا لینے پر مجبور کر دیا۔ مگر اس سہارے کی مثال کیکڑے کی سی تھی جس کے ہاتھ میں ہاتھ دینے کا مطلب زندگی سے ہاتھ دھونے کے مترادف تھا۔

روس ۱۹۵۵ء میں مشرقِ وسطیٰ کی سیاست میں دخل انداز ہوا ہے۔ اس دخل اندازی کا آغاز اُس معاہدے سے ہوا جس کی رو سے روس نے مصر کو فوجی اسلحہ کی سپلائی شروع کی۔ اُس وقت تمام عرب ممالک المیۂ فلسطین سے غافل ہو چکے تھے۔ عرب فوجیں اپنی حکومتوں پر یہ الزام لگا رہی تھیں کہ ۱۹۴۹ء کی جنگ فلسطین میں عرب فوجوں کی شکست کا سبب خود عرب حکومتیں ہیں، کیونکہ انہوں نے اس جنگ میں ضروری مقدار میں اسلحہ فراہم نہیں کیا تھا۔[1] مغربی ممالک بھی عربوں کو اسلحہ دینے سے انکار کر رہے تھے۔ روس آگے بڑھا اور اُس نے مصر سے اسلحہ کی فراہمی کا معاہدہ کر لیا[2]۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ روس نے اُس وقت عربوں کو یہ اسلحہ کیوں نہ فراہم کیا جب ۱۹۴۹ء میں وہ اسرائیل سے برسرپیکار تھے۔ اس وقت اگر عرب افواج کے پاس ضروری مقدار میں اسلحہ ہوتا تو یقیناً وہ اسرائیل کا خاتمہ کر دیتے۔ اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ اُس وقت عرب ممالک میں کوئی ایسی حکومت نہ تھی جس پر روس بھروسہ کر سکتا۔ ۱۹۵۲ء میں جب مصر میں نجیب کے ہاتھوں فوجی انقلاب برپا ہوا اور ۱۹۵۴ء میں یہ انقلاب جمال عبدالناصر کی جھولی میں آگرا اور نجیب کے بجائے جمال عبدالناصر مصر کا نجات دہندہ بن کر اُٹھا تو روس نے بلا تاخیر مصر سے فوجی اور سیاسی روابط کے قیام کی داغ بیل ڈال دی۔ روس کی سیاست خارجہ کا یہ دوسرا اہم باب ہے۔ پہلا اہم باب وہ ہے جب روس نے فوجی کارروائی سے مشرقی یورپ کی ریاستوں کو اپنے اندر شامل کیا تھا اور دوسرا اہم باب یہ ہے کہ اُس نے مشرق وسطیٰ کی ایک فوجی حکومت کے ساتھ محبت کا رشتہ استوار کیا ہے[3]

---

[1] ملاحظہ ہو: دور الماركسية ص ۶۱

[2] مصر نے ۱۹۵۶ء کی جنگ سوئز میں روسی اسلحہ استعمال کیا تھا۔ اور جنگ ہی کے دوران یہ بات کھل گئی تھی کہ اسلحہ انتہائی ناکارہ اور بوسیدہ تھا۔ اور بارود کی بعض پیٹیوں سے بارود کے بجائے بھُس نکلا۔

[3] روس اس نئے رشتے پر آج تک فخر کرتا رہا ہے۔ اس رشتے کے ذریعہ سے جو فکری ثمرات وہ حاصل کرنا چاہتا تھا وہ بارآور ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ کیوبا اور روس کے مابین تعلقات میں چین کی وجہ سے بحران پیدا ہو رہا ہے۔ مشرقی یورپ کی حکومتیں بھی ماسکو کو بیگانہ و تعلق لوکیم دیتی ہیں۔ رومانیا اور سوویت یونین کے تعلقات پر اوس پڑ چکی ہے۔ خود چین اور روس کی نزاع بھی نقطۂ عروج کو چھو رہی ہے۔ مگر ماسکو اور قاہرہ برابر "محبت کی پینگیں" بڑھا رہے ہیں۔ بلکہ قاہرہ کو اپنے "محبوب ماسکو" کے انداز تغافل اور رسم بے وفائی نے مزید محبوب کا والہ و شیدا بنا دیا ہے۔

مصر میں سوشلزم کی تحریک اور اس کے مراحل

اگر ہم صاف گوئی سے کام لیں تو عرض کریں گے کہ جمال عبدالناصر وہ پہلے لیڈر ہیں۔ جنہوں نے عربوں کو "انقلاب پرست بائیں بازو" کا تحفہ دیا۔ اور عرب قومیت کو اور عرب اتحاد اور مسئلہ فلسطین کو اشتراکی دعوت کے چہرے کا "دوسرا رُخ" بنا کر رکھ دیا۔ صرف اس بنا پر کہ انہیں روس سے فوجی امداد ملی، لمبے چوڑے قرضے ملے۔ ترقیاتی پروگراموں میں تعاون ملا، اور ڈپلومیٹک میدان میں ایک راہنما نصیب ہوا۔ سنہ ۵۶ء میں جب مصر پر سہ طاقتی حملہ ہوا تو اس میں روس کے کردار نے روس اور عبدالناصر کو لازم و ملزوم کی حیثیت دے دی۔ بلکہ روس کی زبان میں ناصر نہ صرف "عرب دنیا کا عظیم نجات دہندہ" رہا بلکہ دنیا کے چند گنے چنے عبقری رہنماؤں کی صف میں شامل ہو گیا۔ سویز کے آزاد کرانے کے بعد ناصر صاحب عرب عوام کی اچھی خاصی تعداد پر بھی اپنا شخصی اثر و نفوذ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں دوسری جنگ عظیم کے بعد مصر، شام اور لبنان میں اشتراکی تحریکیں ابھرنا شروع ہوئیں۔ مگر ان کی آواز محدود حلقوں سے آگے تجاوز نہ کر سکی۔ اشتراکیت[1] (سوشلزم) کو اصل اہمیت جولائی سنہ ۱۹۶۱ء کو حاصل ہوئی ہے جب صدر ناصر نے بیک مصر کے اندر سوشلزم کے مرحلہ اوّل کے نفاذ کا اعلان کیا۔ اور ساتھ ہی اشتراکی قوانین کا نفاذ عمل میں لایا گیا۔ اور یہ عزم بھی ظاہر کیا گیا کہ "وحدت مقصد کو بروئے کار لایا جائے گا۔ یعنی دوسرے عرب ممالک میں بھی سوشلسٹ انقلاب برپا کئے جائیں گے۔" اس اقدام کے ساتھ ہی میثاق وضع کیا گیا جس میں "سائنٹیفک سوشلزم" کو صحیح طریق کار قرار دیا گیا۔ اور اسے ملکی دستور کی حیثیت دی گئی۔

لیکن یہ دلچسپ بات ہے کہ قاہرہ کا "سوشلزم" کئی لباس بدلتا رہا ہے سائنٹیفک سوشلزم کی تھیوری تک پہنچنے میں اُسے دیر لگی ہے۔ سنہ ۱۹۶۱ء سے پہلے جمال عبدالناصر جس سوشلزم کی طرف اشارہ کرتا رہا ہے وہ تھا: "کوآپریٹو ڈیموکریٹک سوشلسٹ سوسائٹی کا قیام"[2] اس اصطلاح سے یہ سوال پیدا ہوا کہ اس طرح کا معاشرہ کیسے قائم ہوگا۔ مزید برآں یہ کہ ناصر نے دوسری طرف کمیونزم (شیوعیۃ) پر بھی حملے شروع کر رکھے تھے۔ اس کے دست راست عبدالقادر حاتم نے سنہ ۱۹۶۰ء میں اپنی کتاب: "اشتراکیتنا (یعنی ہمارا سوشلزم کیا ہے ؟)" میں یہ واضح کیا تھا کہ: "ہمارا سوشلزم وہ ہے جسے برطانیہ کی لیبر پارٹی نے اختیار کر رکھا ہے"۔ مصر کی اس دور کی سرکاری مطبوعات میں بھی ہمیں "ڈیموکریٹک سوشلزم" کی اصطلاح بکثرت ملتی ہے۔ مگر سنہ ۱۹۶۱ء کا سال سوشلزم کا مفہوم متعین کرنے میں حد فاصل بن کر آیا۔ اس سال بڑے پیمانے پر صنعتوں کو قومی ملکیت میں لیا گیا اور پھر سنہ ۱۹۶۲ء میں مصر کے میثاق نے سابقہ تصورات کو محو کر دیا اور نقش آخر میں یہ ثبت کیا کہ "سائنٹیفک سوشلزم ہی ترقی کا صحیح لائحہ عمل تجویز کرنے کے لئے موزوں ہے۔ کسی اور لائحہ عمل سے بالیقین مطلوبہ تغیر حاصل نہیں ہو سکے گا۔" سائنٹیفک سوشلزم کے بارے میں ہم یہ تفصیل یہ واضح کر چکے ہیں کہ مارکسی سوشلسٹ اس اصطلاح کو مارکسزم کو دوسرے سوشلسٹ نظریات سے ممتاز کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ سائنٹیفک سوشلزم دراصل خالص مارکسزم کا نام ہے۔ لینن نے کہا تھا: "مارکسی عقیدہ جامع اور مانع عقیدہ ہے۔ اور یہ نہایت کامل اور ہم آہنگ عقیدہ ہے۔" میثاق نے اس خیال کو یوں نبھایا ہے کہ "سائنٹیفک سوشلزم وہ واحد لائحہ عمل ہے جس سے مطلوبہ ترقی حاصل کی جا سکتی ہے۔"

سوشلزم اور میثاقِ مصر

جب مصری میثاق شائع ہوا تو عرب ممالک کے اندر یہ بات کھل کر کہی جانے لگی کہ "مصر مارکسزم کے راستے پر گامزن ہو گیا ہے"[3] چنانچہ ہر طرف سے تنقیدیں شروع ہو گئیں۔ ہر محفل میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں بحث و مناقشہ کا

---

[1] عربی زبان میں سوشلزم کے لئے "اشتراکیۃ" کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور کمیونزم کے لئے "شیوعیۃ" کا۔ اسی لئے ہم جب اشتراکیت کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد اصطلاحاً سوشلزم ہے نہ کہ کمیونزم۔ یہ بھی صرف الفاظ کا تفاوت ہے۔ ورنہ عرب سوشلزم کمیونزم ہی کا دوسرا نام ہے۔

[2] ملاحظہ ہو کتاب: "التضلیل الاشتراکی" تالیف ڈاکٹر صلاح الدین المنجد مطبوعہ دار الکتاب الجدید، بیروت طبع ثانیہ: ص ۲۵۔

[3] بحوالہ کتاب التضلیل الاشتراکی ص ۲۸ و ۲۹۔

لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ اور چاروں طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ اس کے جواب میں جمال عبدالناصر نے ایک تقریر میں مصری سوشلزم کی وضاحت کی۔ اس تقریر کے متعلقہ حصہ کا متن یہ ہے[1]

"میثاق میں کہا گیا ہے کہ سائنٹیفک سوشلزم ہی ترقی کا صحیح لائحہ عمل تجویز کرنے کے لئے موزوں ہے۔ میں اس موضوع پر کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ کہا گیا ہے کہ "سائنٹیفک سوشلزم" کفر ہے۔ اور یہ عین مارکسیت ہے۔ میں نے یہ بات خود سُنی ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ میں سے بھی اکثر لوگوں نے یہ بات سُنی ہوگی۔ "سائنٹیفک سوشلزم" کا کیا مفہوم ہے؟

"ہمارا سوشلزم "عرب سوشلزم" ہے۔ سائنٹیفک سوشلزم نہیں ہے۔ یہ بات محض مغالطہ پر مبنی ہے۔ مثلاً جب ہم علی الصبح اخبار پڑھنے لگتے ہیں تو کبھی کبھی ہم یہ پڑھتے ہیں کہ فٹ بال ٹیم ہار رہی ہے جیتنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ ٹریننگ حاصل کرے اور سائنٹیفک اصولوں کے مطابق کھیلے۔ یعنی کسی فرد کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ وہ سائنٹیفک طریقہ اختیار کرے۔ اگر ہم کامیاب اور صحت مند سوشلزم چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ وہ سوشلزم سائنٹیفک طریقہ کے ذریعہ قائم ہو۔ سائنٹیفک طریقہ کی ضد انتشار ہے۔ پس ہمارا سوشلزم سائنٹیفک سوشلزم ہے اور علم کی بنیاد پر قائم ہے۔ انتشار پر قائم نہیں ہے۔ یہ مادی سوشلزم بھی ہرگز نہیں ہے۔ ہم نے کبھی نہیں کہا کہ ہمارا سوشلزم مادی سوشلزم ہے۔ اور نہ ہم نے یہ کہا ہے کہ ہمارا سوشلزم مارکسی ہے۔ اور اور نہ ہم نے یہ کہا ہے کہ ہم دین سے خارج ہوگئے ہیں۔ بلکہ ہم نے یہ کہا ہے۔ کہ ہمارا دین سوشلسٹ دین ہے۔ اسلام نے قرون وسطیٰ میں دنیا کے اندر سوشلزم کا سب سے پہلا تجربہ کیا ہے۔"

جمال ناصر کی یہ تشریح یا تاویل اُن لوگوں کے لئے تو قابل قبول ہوسکتی ہے جنہوں نے دنیا کے اقتصادی نظاموں کا مطالعہ نہ کیا ہو اور وہ مختلف اقتصادی نظاموں کی اصطلاحات سے واقف نہ ہوں۔ اور خاص طور پر مارکسزم کے ڈھانچے سے وہ بے خبر ہوں۔ لیکن صاحب علم لوگ اس تاویل کو محض ایک دھوکہ سمجھتے ہیں۔ مزید براں یہ کہ مصر میں جو اشتراکی قوانین نافذ کئے گئے ہیں ان کا اگر جائزہ لیا جائے، انفرادی سرمایہ داری ختم کرکے اجتماعی سرمایہ داری کا جو نظام قائم کیا گیا ہے اُسے دیکھا جائے، "بورژوا" طبقہ جسے "رجعت پسند" کہا جا رہا ہے اس کے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے اُس کی تفصیلات معلوم کی جائیں، نیشنلائزیشن کی کارروائیاں مطالعہ کی جائیں، سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی تشکیلات جو بروئے کار لائی گئی ہیں اُن کو پرکھا جائے تو اس امر میں کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ یہ سب کچھ مارکسزم کے اصولوں سے اخذ کیا گیا ہے، اور صدر ناصر نے اپنے سوشلزم کے لئے جس "علم" کا سہارا لیا ہے وہ "مارکسی علم" ہے۔ بلکہ اگر ہم میثاق کے الفاظ و اصطلاحات کا مارکس کے اقوال سے موازنہ کریں تو میثاق ہمیں بلاشبہ چند ایک جزوی عبارتوں کے ماسوا "نقل مطابق اصل" معلوم ہوتا ہے۔

اپنی بات کو مزید واضح کرنے کے لئے ہم میثاق مصر اور کمیونسٹ منشور کا بعض مقامات پر موازنہ کر دیتے ہیں۔ تاکہ قارئین پر میثاق مصر کی اصل حقیقت اظہر من الشمس ہو سکے۔

۱۔ مارکس نے مینی فسٹو میں سب سے پہلے جس بات پر زور دیا ہے وہ "انقلاب" ہے۔ مارکس کے نزدیک "انقلاب" ہی "تبدیلی" کا واحد ذریعہ اور ترقی کی واحد بنیاد ہے۔ مصر کا میثاق بھی بار بار "انقلاب" پر زور دیتا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں "تجربہ نے یہ ثابت کر دیا ہے، اور برابر ثابت کر رہا ہے، کہ "انقلاب" ہی تمام تبدیلیوں کا واحد راستہ ہے"[2] نیز "انقلاب فطری طور پر عوامی اور ترقی پسندانہ کارروائی ہے"[3]

---

[1] بحوالہ کتاب التضلیل الاشتراکی ص ۲۸ و ۲۹ [2] المیثاق، باب دوم عنوان: "انقلاب کی ضرورت" ص ۱۱ عربی زبان میں انقلاب کے لئے "ثورۃ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی وہ انقلاب جس میں تشدد، تندی اور غیظ و غضب اور انتقام کے جذبات بھی شامل ہوں۔ ہم نے اُس کا ترجمہ "انقلاب" کیا ہے، جو اصل مفہوم کو پوری طرح ادا نہیں کرتا۔ [3] المیثاق ص ۲۲۔

جس طرح مارکس نے دنیا بھر کے مزدوروں کو اتحاد اور انقلابی حرکت کے لئے پکارا تھا اسی طرح میثاق مصر بھی سوشلسٹ انقلاب کو تمام عرب ممالک کا مطمح نظر قرار دینے کی دعوت دیتا ہے۔ میثاق انقلابی اصطلاحات اور تراکیب سے بھی بھرا پڑا ہے، جس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ میثاق انقلاب کو (جو وضع میثاق سے ۹ سال قبل مصر میں برپا ہو چکا ہے) برحق ثابت کرنا چاہتا ہے۔ اور اسے واجب الاتباع راستہ قرار دینا چاہتا ہے۔ میثاق کی "انقلابی ترکیبیں" ملاحظہ ہوں "جمہور کا قدیم انقلابی عزم" - "انقلابی سچائی" - "انقلابی ارادہ" "ہمہ گیر انقلاب" - "اصل انقلاب" - "انقلابی ہراول فریق" - "انقلابی شعور" "انقلابی خواہش" "جمہور کی انقلابی کش مکش" "انقلابی فکر" - "انقلابی مزاج" - "انقلاب پسند عوام"۔

بلکہ صدر جمال عبدالناصر نے مئی ۱۹۶۲ء کو آزادی فلسطین کمیٹی کے جلسوں کے دوران اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ "موجودہ حالات میں آزادی فلسطین کے لئے جنگ ناممکن ہے۔ جنگ فلسطین کی آزادی اور بحالی کا ذریعہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ آزادی "ہمہ گیر عرب انقلاب" کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے"۔[1]

یہاں "انقلاب" کا لفظ "ارتقا" کے مقابلے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اصلاح کا ایک تصور "ارتقائی سوشلزم" کے نام سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ تصور سوشلزم کو بتدریج سوسائٹی کے اندر نافذ کرنے کا حامی ہے۔ دوسرا تصور "انقلابی سوشلزم" کا ہے۔ انقلابی سوشلزم وقت کا انتظار کئے بغیر قوت کے بل پر فوری انداز سے معاشرے کو سوشلسٹ بنانے کا نام ہے۔ اس کے لئے "سرخ انقلاب" کی اصطلاح بھی اختیار کی گئی ہے۔ اس سے اشارہ اس ہمہ گیر تخریبی کارروائی کی طرف ہے جو صحیح انقلاب کو برپا کی جاتی ہے اور بورژوائیت، مذہبیت اور رجعت پسندی کو خون سے نہلا دیا جاتا ہے۔

۲- مارکس کا منشور صرف سوشلسٹ حل کو حتمی اور آخری قرار دیتا ہے۔ اور اقتصادی اور معاشرتی رشتوں کو اشتراکی مزاج کے مطابق منظم کرنا ناگزیر سمجھتا ہے۔ یعنی بورژوا طبقے کے ہاتھ سے اختیار حکمرانی، ملکیت زمین کا حق اور وسائل پیداوار چھین لینا۔

میثاق مصر نے بھی اپنے باب ششم کا عنوان قرار دیا ہے "سوشلسٹ حل حتمی اور آخری ہے"۔ اور اس پر یہ روشنی ڈالی ہے: "مصر کی اقتصادی اور معاشرتی پسماندگی کے مسئلہ کے لئے سوشلسٹ حل — جو ترقی کا انقلابی زینہ ہے — محض پسندیدہ انتخاب ہی نہیں ہے۔ بلکہ سوشلسٹ حل تاریخ کا فیصلہ ہے جسے امر واقع نے بزور نافذ کیا ہے۔ اور جسے جمہور کی وسیع امنگوں نے عملی جامہ پہنایا ہے"۔[2]

۳- مارکس اس امر پر زور دیتا ہے کہ طبقاتی جنگ انسانی تاریخ کا لب لباب ہے۔ انسانی تاریخ کا دفتر طبقاتی جنگوں سے بھرا پڑا ہے۔ یہ جنگ نہایت لابدی ہے۔ سماج کی تبدیلی طبقاتی جنگ کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ میثاق مصر بھی طبقاتی جنگ کا سہارا لیتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ "مختلف طبقات کے درمیان فطری اور حتمی جنگ سے تغافل یا انکار نہیں کیا جا سکتا"۔[3] "طبقاتی جنگ" خالصۃً مارکسی نقطہ نظر ہے۔ برنٹن نے طبقاتی جنگ کی حقیقت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: "یہ جنگ دراصل ان عداوتوں سے عبارت ہے جن کی پرورش کینہ، حسد اور ملامت کرتے ہیں اور یہ ان انسانی گروہوں کے درمیان پیدا ہوتی ہے جن کی اقتصادی مصلحتیں ایک دوسرے سے مربوط ہوتی ہیں، اور جن کا ملکی اور معاشرتی ترکہ مشترک ہوتا ہے"۔[4]

---

[1] الفضلیل الاشتراکی ص ۳۶ اسرائیل اور عربوں کی حالیہ جنگ بھی مصر کے ارادے سے نہیں برپا ہوئی۔ بلکہ مصر اس جنگ کے لئے آخری وقت تک تیار نہیں تھا۔

[2] المیثاق، باب ششم ص ۵۰ یہ تصور بھی کہ سوشلزم تاریخ حاضر کا تقاضا ہے اور تنازع طبقات کی جنگ میں تمام نظریات سوشلزم کے مقابلے میں شکست کھا گئے ہیں خالص مارکسی تصور ہے۔ میثاق نے اس تصور کی ترجمانی کی ہے۔

[3] المیثاق ص ۴۴۔ [4] ملاحظہ ہو کتاب "انقلاب" تالیف برنٹن ص ۲۹۶

۴۔ مارکس نے زمین کی انفرادی ملکیت کو منسوخ کرکے اُسے ریاست کے قبضہ میں دینے کا اعلان کیا۔ میثاق مصر نے بھی ملکیت زمین کی تحدید کر دی[1]۔ اور یہ اشارہ نہیں کیا کہ اس تحدید کی آخری حد کیا ہے۔ عین ممکن ہے کہ تحدید کے بعد تنسیخ کا اعلان کر دیا جائے[2]۔

۵۔ مارکس نے وسائل پیداوار پر قبضہ کرنے کو ناگزیر قرار دیا۔ اور میثاق مصر نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے کہا: "اس حقیقی انقلاب نے ہی مصری عوام کو یہ طاقت دی کہ وہ سب سے پہلے وسائل پیداوار پر مکمل قبضہ کرلیں"[3]۔ میثاق کے اس اعلان کے بعد اشتراکی قوانین نافذ کر دیئے گئے اور بالفعل تمام صنعتی اداروں کو اور وسائل پیداوار کو حکومت کی ملکیت میں دے دیا گیا۔ مصر کا سوشلسٹ لیڈر صبری ابوالمجد اپنی کتاب "البناء الاشتراکی" میں لکھتا ہے: "ہمارے عرب سوشلزم کے بنیادی ستون یہ ہیں کہ ہمارا یہ کامل ایمان ہو کہ ریاست کا یہ واضح اور صریح حق ہے کہ وہ وسائل پیداوار کو اپنی ملکیت میں لے۔ قدرتی دولت کے سرچشمے قومی تحویل میں دے، اور اقتصاد اور ثقافت پر اس کا کامل اور ہمہ گیر کنٹرول ہو"[4]۔

۶۔ مارکس کی یہ تعلیم ہے کہ سرمایہ کا تسلط ختم کیا جائے۔ میثاق اس کی تائید کرتا ہے اور "انقلاب مصر" کا یہ تیسرا اصول ٹھہراتا ہے کہ "ذخیرہ اندوزی کا خاتمہ اور حکومت پر سرمایہ کے تسلط کا استیصال"۔

۷۔ مارکس یہ طے کرتا ہے کہ ہر دور تحریک کا یہ فرض ہے کہ وہ بورژوائیت کو تلوار کے ذریعہ ختم کرنے کے لئے ہمہ وقت مستعد ہو۔ کیونکہ بورژوائیت بطیب خاطر حکومت سے دستبردار نہیں ہوگی۔ میثاق مصر کا بیان ملاحظہ ہو: "تجربہ نے جو منظم انقلابی جد و جہد کا شروع ہی سے ہمرکاب رہا ہے، یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ ناگزیر ہے کہ "انقلاب" رجعت پسندی کی تعبیر کی مہم اپنے کندھوں پر لے، رجعت پسندی کو ہر نوعیت کے ہتھیاروں سے نہتہ کر دے اور حکمرانی کی طرف اس کے رجوع کی ہر کوشش کو ناکام کر دے"[5]۔

مارکس کے منشور اور میثاق مصر کے مابین ہم آہنگی کے چند ایک خطوط بیان کر دیئے گئے ہیں۔ لیکن درحقیقت پورا میثاق مارکس کے منشور کا چربہ ہے۔ اور اسے اگر "عرب سوشلزم" سے تعبیر بھی کیا جائے تو اس لحاظ سے تو صحیح ہوگا کہ اس سوشلزم کی اٹیچ عرب ملک ہے۔ مگر اپنی اصلیت اور روح کے لحاظ سے اس کے مارکسی سوشلزم ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ اس کی ایک اور روشن دلیل یہ ہے کہ روس کا وزیراعظم کوسیجن بھی میثاق کو دیکھ کر جھوم اٹھا تھا۔ مارچ ۱۹۶۶ء میں جب کوسیجن قاہرہ گیا تو اس نے مصر کی قومی اسمبلی میں اپنی تقریر کے دوران میثاق کو داد تحسین دیتے ہوئے کہا کہ "میثاق آئیڈیالوجی اور مقاصد کی نہایت اہم دستاویز ہے"[6]۔ اسی تقریر میں اس نے یہ اعتراف بھی کیا کہ "سوویت یونین اور مصر کے عوام کے درمیان مقاصد اور نظریات کا اتحاد ہے"[7]۔ بریجنیف اس سے پہلے اس امر کی مدح سرائی

---

[1] میثاق ص ۵۷۔ [2] ۹ ستمبر ۱۹۵۲ء کو جب مصر میں زرعی اصلاحات نافذ کی گئی تھیں تو ہر زمیندار کے لئے دو سو ایکڑ کی تحدید کر دی گئی تھی۔ لیکن ۱۹۶۱ء میں اشتراکی قانون نمبر ۱۲۷ کے ذریعہ دو سو ایکڑ کے بجائے ایک سو ایکڑ کی تحدید کر دی گئی۔ مگر کچھ عرصہ بعد قانون نمبر ۱۲۸ کے ذریعہ یہ مقدار بھی نصف کر دی گئی اور ابھی انقلابی عزم پورے جوش پر ہے۔ جوں کا عادی ہے۔ حش اچھا تر بچا۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔ [3] میثاق ص ۸ [4] البناء الاشتراکی، تالیف صبری ابوالمجد ص ۱۲۔ یہ کتاب قاہرہ کے ایک سرکاری ادارے کی طرف سے شائع کی گئی ہے۔ [5] میثاق ص ۴۴

[6] روزنامہ الاہرام، قاہرہ، شمارہ ۱۷ مئی ۱۹۶۶ء۔ الاہرام کے اس شمارے میں لطفی الخولی کا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ کوسیجن کے یہ الفاظ ہم نے اسی مضمون سے نقل کئے ہیں۔

[7] مجلۃ الانباء السوفیاتیۃ، شمارہ ۱۱ - ۵ جون ۱۹۶۶ء۔

کر چکا ہے کہ متحدہ عرب جمہوریہ میں نئی تبدیلیاں آچکی ہیں، یعنی اشتراکیت کی تنقید ہو رہی ہے[1] سوویت نیوز میگزین بھی مطلع کر چکا ہے کہ "سوویت یونین اور مصریوں کے درمیان جو روابط قائم ہوئے ہیں انہوں نے ہمیشہ امپریلزم کے خلاف اور داخلی رجعت پسندی کے خلاف خواہ وہ سیاسی ہو یا مذہبی جنگ میں غیر معمولی حصہ لیا ہے۔[2]

مہدی بن برکہ کا سوشلزم

یہاں تک تو ہم نے مصر کے "عرب سوشلزم" کو موضوع گفتگو بنائے رکھا ہے لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض دوسرے عرب ملکوں کے "سوشلزم" کا بھی قدرے تعارف حاصل کر لیا جائے۔

مراکش، سوشلزم سے کوسوں دور ہے۔ مگر مراکش کے مرحوم سوشلسٹ لیڈر مہدی بن برکہ جو مراکش کی سوشلسٹ پارٹی کے سربراہ تھے۔ مراکش کو سوشلسٹ ریاست بنانے کے لئے زندگی بھر کوشش کرتے رہے۔ مراکش میں مہدی بن برکہ کو وہی مقام حاصل تھا جو شام میں بعث پارٹی کے لیڈر میشل عفلق کو یا کمیونسٹ لیڈر خالد بکداش کو حاصل ہے۔ مہدی بن برکہ احمد بن بلا اور دنیائے عرب کے دوسرے انقلابی سوشلسٹوں کا بھی نظریاتی بھائی رہا ہے۔ مہدی بن برکہ نے ۱۹۶۳ء میں پیرس کی ایک مجلس مذاکرہ میں اپنے سوشلزم کے خطوط تفصیل سے بیان کئے۔ ہم اُس کی اس تقریر کے ضروری حصے یہاں نقل کرتے ہیں[3]

> "ہر اصلاحی اقدام چند مقاصد کے تحت ہونا چاہیئے۔ ان میں سے پہلا مقصد زمین پر ملکیت اور پیداوار کے سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ ہے پھر اس زمین کو کاشتکاروں کے اندر تقسیم کرنا۔ زمین کی تقسیم بھی محض منصوبے کا پہلا مرحلہ ہے جو اصلاحی اقدام محض تقسیم اراضی تک آ کر رک جائے وہ اصلاح نہیں کہلا سکتا۔ ہمیں ہر وقت چین کے تجربہ سے ہدایت اخذ کرتے رہنا چاہیئے۔ اس لئے کہ ہماری اکثر مشکلات چین کی مشکلات کے مماثل ہیں۔ چین میں جب زرعی اصلاحات کا آغاز ہوا تھا تو یہ سوال پیدا ہوا تھا کہ کیا ہم اصلاحات پر اکتفا کریں۔ اور جن کسانوں کے اندر اراضی تقسیم کی گئی ہے انہیں آزاد چھوڑ دیں تاکہ وہ اس ملکیت سے پوری طرح متمتع ہوتے رہیں۔ اور ان کو نئی اشتراکی کارروائیوں سے مبتلائے اضطراب نہ کریں۔ کیونکہ مدت دراز سے اُن کے دل ان زمینوں میں اٹکے ہوئے تھے؟ —————— چین کے اشتراکی انقلاب کے رہنماؤں کا جواب یہ تھا کہ گرم گرم لوہے کو کوٹ لینا چاہیئے۔ اشتراکیت کی تنفیذ میں جتنا توقف کیا جائے گا خطرناک ہوگا۔ چھوٹے کسان کو چھوڑ دینا تاکہ وہ اپنی زمین کو خود ہی کاشت کرتا رہے اشتراکی تغیرات کی راہ میں حائل ہو جانے گا۔ لینن نے کہا تھا: چھوٹے پیمانے کی انفرادی پیداوار ہر روز بلکہ ہر گھڑی، خود بخود اور وسیع پیمانے پر سرمایہ داری اور بورژوائیت کو جنم دیتی رہتی ہے۔ ماؤزے تنگ نے ۱۹۵۵ء میں چھوٹے کسانوں میں زمینیں تقسیم کرنے کے بعد لکھا تھا کہ پچھلے چند ہی سالوں کے اندر دیہاتوں میں مالدار کسانوں کی تعداد خود بخود بہا بڑھتی گئی ہے۔ اگر یہ شوق یونہی ترقی کرتا رہا اور ہم نے بر وقت اس کے آگے بند نہ باندھا تو زرعی فارموں کے کاشتکاروں میں اختلافات بڑھتے جائیں گے[1]

---

[1] ایضاً شمارہ ۷ - ۵ اپریل ۱۹۶۶ء

[2] ایضاً شمارہ ۱۱ - ۵ جون ۱۹۶۶ء

[3] مہدی بن برکہ ایک قاتلانہ حملہ میں جاں بحق ہو چکا ہے مگر اس کی پارٹی ابھی قائم ہے۔ اور وہ اپنے پروگرام کے لئے مسلسل کام کر رہی ہے۔ اس پارٹی کی طرف سے روشنی ڈالنا ضروری ہے۔

اس کے بعد مہدی بن برکہ نے کہا :

"یہ ضابطہ ہمیں ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ ہمیں کسانوں کے اندر زمینیں تقسیم کر کے چپ سادھ کر نہ بیٹھ رہنا چاہیئے۔ دیہاتوں کے اندر مالدار کسانوں کے ابھر آنے کا ہی خطرہ نہیں بلکہ یہ بھی خطرہ ہے کہ تقسیم اراضی اور کسانوں کی جہالت کی وجہ سے پیداوار گر جائے گی۔ اس لئے مستحسن یہ ہے کہ بڑے بڑے زرعی فارم قائم کئے جائیں اور کسانوں کے ذریعہ ان کا انتظام کیا جائے۔ یہ کسان وہاں کارکن بن کر رہیں نہ کہ مالک بن کر۔"

مہدی بن برکہ نے اپنی تقریر میں یہ بھی بتایا کہ زرعی ملکیتوں کو اشتراکیت کے اس مرحلے میں داخل کرنے کے لئے جہاں کسان زمین کا مالک نہیں ہوگا، تقسیم اراضی کے بعد ذیل کے اقدامات کئے جائیں۔

۱ - صاحب ملکیت کسانوں کے اندر یک گونہ تعاون قائم کیا جائے۔

۲ - کسانوں کی انفرادی ملکیت کی اساس پر کوآپریٹو سوسائٹیوں کی تشکیل کی جائے۔

۳ - پھر سوشلسٹ کوآپریٹو سوسائٹیاں قائم کی جائیں جو کسانوں کی انفرادی ملکیت کو ختم کر دیں۔ کسان صرف سوسائٹی کا ایک کارکن بن کر کام کرے۔

۴ - بڑے بڑے اجتماعی زرعی فارم قائم کئے جائیں جن میں سینکڑوں خاندان کام کریں۔ ان کو کام کی اجرت دی جائے۔ لیکن زمین کے کسی حصہ کا مالک نہ بنایا جائے"[1][2]

یہ ہے مراکش کی سوشلسٹ پارٹی اور اس کے "ہر دلعزیز" لیڈر کا سوشلزم۔ الجزائر کے سابق صدر احمد بن بلا اسی سوشلزم کے علمبردار تھے۔ بلکہ ماؤزے تنگ سے اُس کی شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ وہ لباس کے معاملے میں بھی اپنے "معلم اول" کی سنت پر چلتا تھا۔ الجزائر سے احمد بن بلا اگرچہ رخصت ہو چکا ہے مگر اُس کا "سوشلزم" تاحال ترقی کی راہ میں سدِ راہ ہے۔

عراق میں سوشلزم کا ماضی اور مستقبل

عراق کا حال دوسرے عرب ملکوں سے بالکل مختلف ہے۔ نظریاتی میدان میں عراق نے "ترقی معکوس" کی ہے۔ عراق کے انقلاب کا آغاز کمیونزم کے غلبہ سے ہوا۔ کمیونزم کو چھوڑ کر بعث ازم کی طرف آیا۔ اور اب بعث ازم سے توبہ کر کے سوشلزم سے راہ و رسم پیدا کی ہے[3] عراق میں ۱۹۵۸ء کے فوجی انقلاب سے پیشتر کمیونسٹ پارٹی اور سوشلسٹ پارٹی خلاف قانون تھی۔ نوری السعید کی تشدد آمیز پالیسی نے اُسے زیر زمین تحریک چلانے کا موقع فراہم کر دیا۔ ۱۹۵۸ء کا فوجی انقلاب فوج کے "آزادی پسند افسروں" کی تنظیم نے برپا کیا تھا۔ اس تنظیم میں عراق کی خفیہ کمیونسٹ پارٹی اور شام کی بعث پارٹی سے تعلق رکھنے والے فوجی افسروں کا ایک گروہ بھی

---

[1] اس کا یہ مطلب ہوا کہ زرعی اصلاحات کے قانون کی رُو سے اگر کچھ کسان زمین کے چند ایکڑ حاصل کرے اور محنت اور جد و جہد کے ذریعہ اپنی مادی حالت کو بہتر بنا لے اور دوسرے کاہل اور کسل مند کسانوں پر اُسے برتری حاصل ہو جائے تو وہ کسان اور اس جیسے دوسرے کسان "بورژوا" طبقہ میں داخل ہو گئے۔ اور یہ بات سوشلزم کے لئے ہرگز گوارا نہیں ہو سکتی۔ سوشلزم تو یہ چاہتا ہے کہ کسی کو فوقیت حاصل نہ ہو سب ایک ہی معیار پر قائم و دائم رہیں۔

[2] الاشتراكية في التجارب العربية ص ٢٣، ٢٤، ٢٥

[3] الاشتراكية في التجارب العربية ص ٢٦٤

شامل تھا۔[1] چنانچہ انقلاب کے بعد عراق کی کمیونسٹ پارٹی اور فوج کے کمیونسٹ افسروں نے حالات سے فائدہ اٹھا کر عراق کو کمیونزم کی گود میں ڈالنے کی کوشش کی۔ عبدالکریم قاسم کا خصوصی رفیق کرنل وصفی طاہر فوج سے ان تمام افسروں کو جن میں عبدالسلام عارف بھی شامل تھا عبدالکریم قاسم کے حلقۂ اعتماد سے نکال رہا تھا اور کمیونسٹ افسروں کو سول اور فوج کے اہم مناصب سونپ رہا تھا۔ چنانچہ اس کی یہ سازش کسی حد تک کامیاب رہی۔ عبدالسلام عارف اور دوسرے مسلمان فوجی افسر جیل میں ڈال دیئے گئے اور فضا کمیونسٹوں کے لئے خالی ہو گئی۔ اور پھر کیا تھا انہوں نے ملک کے اندر قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ روس ان کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ بغداد، کرکوک اور بصرہ کے اندر کمیونسٹوں نے مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہا دیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عراقی عوام کمیونزم سے نہ صرف دل برداشتہ ہو گئے بلکہ انہیں اس سے شدید نفرت ہو گئی۔ فوج کے مسلمان افسروں نے پانی کو سر سے گزرتا دیکھا تو اس صورت حال کے تدارک کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور حالات کا پانسہ بدل دیا۔ مارچ ۱۹۵۹ء میں لیفٹیننٹ کرنل عبدالوہاب شواف نے شام اور عراق کے بعض عناصر کے ایماء پر عبدالکریم قاسم کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے موصل میں تحریک برپا کی۔ متحدہ عرب جمہوریہ اس تحریک کی پشت پر تھی۔[2] عبدالوہاب شواف اس تحریک میں ناکام ہو گیا۔ اُسے گرفتار کر لیا گیا۔ اور اس پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا۔ عبدالوہاب شواف نے بڑی عیاری کے ساتھ اس تحریک میں اُن تمام فوجی افسروں کو لپیٹ لیا جو کمیونسٹوں اور بعثیوں کے خلاف تھے۔[3] چنانچہ نہ صرف ان افسروں کو سزائے موت دی گئی بلکہ بعثیوں اور کمیونسٹوں نے ملک کے اندر شدید ہنگامے اور دارو گیر برپا کر دیئے۔ موصل کے اندر انہوں نے انسانیت کا جو قتل عام کیا ہے وہ تاریخ جرائم کا سیاہ ترین باب ہے۔ ملک کے اندر بعثی حکومت قائم ہو گئی۔ بعث حکومت نے کسی انتظار کے بغیر ملک کے اندر "بعث ازم" پر عملدر آمد شروع کر دیا۔ اُس نے سب سے پہلا وار شرعی اوقاف اور مسلمانوں کے شخصی قوانین پر کیا۔ اُسی دور میں ایک کتاب بھی چھاپی گئی جس کا عنوان تھا: "خدا مجرموں کے کٹہرے میں" (اللّٰہ فی قفص الاتہام) نعوذ باللہ من ذالک۔ عراق کے مسلم عوام کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ اُن کی بے بس نگاہیں آسمان کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ فوج کے عام سپاہی اور افسر خون کے آنسو رو رہے تھے۔ کہ یکایک فضا میں تغیر رونما ہوا۔ عبدالسلام عارف مرحوم نے جیل میں بیٹھ کر انقلاب کا منصوبہ تیار کیا۔ اور آناً فاناً اُسے نافذ کر دیا۔ اور عبدالکریم قاسم کو اُس انجام سے دوچار ہونا پڑا جس انجام سے نوری السعید دوچار ہوا تھا۔

عبدالسلام عارف (مرحوم) اور سوشلزم

عبدالسلام عارف مرحوم طبعاً ایک شریف اور اسلام دوست انسان تھا۔ قاہرہ کے ساتھ اگرچہ اُس نے اپنے تعلقات کو کبھی بحرانی دور میں تو داخل نہیں ہونے دیا مگر دل سے نہ وہ قاہرہ عبدالسلام سے خوش تھا اور نہ عبدالسلام قاہرہ کو بنگاہ استحسان دیکھتا تھا۔ سیاسی تملق کا دونوں مظاہرہ کرتے رہتے تھے۔ عبدالسلام عارف کا دور کمیونزم اور بعث ازم دونوں کے لئے موت کا پیغام لے کر آیا۔ عوام پہلے ان نظریات کے ہاتھوں دہائی دے رہے تھے اب حکومت نے بھی ان کے بارے میں اپنی پالیسی تبدیل کر لی۔

عبدالسلام عارف "عرب سوشلزم" کا قائل نہیں تھا۔ اُس کا مذہبی اور قوم پرستانہ ذہن "عرب سوشلزم" کو مخصوص گروہوں کے سیاسی حربے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ مئی ۱۹۶۴ء کو اسوان ڈیم کی تعمیر کے پہلے مرحلے کے اختتام پر مصری حکومت نے اسوان میں ایک تقریب منعقد کی۔ اس میں خروشچیف اور عبدالسلام عارف بھی شریک ہوئے۔ خروشچیف نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ عرب اپنا یہ نعرہ ترک کر دیں کہ "اے عرب متحد ہو جاؤ" اور اس کے بجائے یہ نعرہ اپنائیں

---

[1] ملاحظہ ہو مقالہ: "عراق کی تاریخ معاصر" (عربی مخطوطہ) از قلم عبدالقہار داؤد، بغداد۔ یہ مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات میں محفوظ ہے۔

[2] عبدالکریم قاسم کے انقلاب ۱۹۵۸ء کو قاہرہ نے اشیر باد دی تھی۔ مگر جب عبدالکریم قاسم جمال عبدالناصر کے مقابلے میں ایک "عرب لیڈر" بن کر نمودار ہوا تو دونوں کے تعلقات خراب ہو گئے۔ اور قاہرہ عبدالکریم قاسم کو گرانے کی کوشش کرتا رہا۔ شواف تحریک کی حمایت بھی اسی جذبے کے تحت تھی۔

[3] مثلاً ناظم طبقچلی اور رفعت الحاج سری

کہ "اے عرب محنت کشو، اے عرب کسانو، متحد ہو جاؤ"[1] مصر کے سوشلسٹ لیڈروں نے اس نئی تجویز کا خیر مقدم کیا۔ مگر عبدالسلام عارف نے اسی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے اس نئے نعرے کی مخالفت کی اور اسے عربوں کی عربیت پر ایک حملہ سمجھا[2]۔ عبدالسلام عارف "محنت کشوں" کے اتحاد کے بجائے عراق کے تمام گروہوں اور طبقوں کو قومی اور اسلامی بنیادوں پر متحد کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ شمالی عراق کے کردوں کی بغاوت کو وہ اپنے آخری دور میں انہی بنیادوں پر فرو کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

عبدالسلام عارف اس لحاظ سے کیا عرب سربراہ تھے کہ ایک طرف انہوں نے "ڈیموکریٹک سوشلزم" کی مخالفت کی، سائنٹیفک سوشلزم سے برأت کا اظہار کیا، بعث ازم (جو کمیونزم کا دوسرا نام ہے) کو عراق میں ابدی نیند سلایا، "عرب سوشلزم" سے کنارہ کشی اختیار کئے رکھی۔ بلکہ ان تمام "ازموں" کی اصطلاحات کے استعمال تک سے گریز کرتے رہے۔ اور دوسری طرف انہوں نے ایک موقع پر "اسلامی سوشلزم" کا نظریہ پیش کیا۔ اُن کے اس رجحان میں اُن مسلمان مفکرین کی تحریروں کو بھی دخل حاصل ہے جو فضا اور ماحول کا دباؤ دیکھ کر "سوشلزم" کو اسلام سے ثابت کرنے پر لگ گئے تھے[3]۔ عبدالسلام عارف نے جزوی طور پر بعض قوانین بھی جاری کئے جن کو عرب حلقوں نے اشتراکی قوانین کا نام دیا۔ ان قوانین کی رُو سے انہوں نے عراق کے بنکوں، انشورنس کمپنیوں اور بعض نئی صنعتی فرموں کو قومی تحویل میں لے لیا۔ چاول اور دھاتوں کی تجارت کو بھی نیشنلائز کر دیا۔ اور پھر یہ اعلان کیا کہ اس کے بعد حکومت کسی ادارے کو قومیانے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ عبدالسلام عارف مرحوم ۱۹۶۶ء میں ہوائی جہاز کے ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ ان کے بھائی عبدالرحمان عارف ان کے جانشین ہوئے۔

عراقی عوام اور سوشلزم

عبدالرحمان عارف کے دور میں بغداد اور قاہرہ کے درمیان وہ کشیدگی تو تقریباً ختم ہو گئی جو سابقہ دور سے در پردہ چلی آ رہی تھی مگر عراق قاہرہ کے سوشلزم سے اُسی طرح ابا کرتا ہے جس طرح پہلے کرتا تھا۔ اور ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ عراق کبھی "عرب سوشلزم" کے لئے تیار نہیں ہو گا۔ عبدالکریم قاسم نے اپنے دور میں عراقی عوام کو کمیونزم اور بعث ازم کا مزہ اس حد تک چکھا دیا ہے کہ وہ پھر اس بل میں ہاتھ ڈالنے کو تیار نہیں ہے۔ ایک عرب مصنف لکھتا ہے:

> اشتراکی دعوت کے بارے میں عراق گہرے شکوک و شبہات میں مبتلا ہے۔ عراق کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ دو بار اشتراکی نظم حکومت کا تجربہ کر چکا ہے۔ ان دونوں تجربات کے بعد عراقیوں کا یہ یقین پختہ ہو چکا ہے کہ داخلی اصلاح، عربوں کے باہمی تعاون اور خارجی تعلقات کے لئے اشتراکیت کا سہارا سراسر خسارہ ہے۔ اشتراکی تجربوں نے عراق کے اندر بکثرت لوگوں کی عزت و ناموس کو ذبح کیا ہے، شہری آزادیوں کو پامال کیا ہے، اجتماعی کفالت اور نسلی اور گروہی تعلقات کو ایسی ایسی شکلوں میں اپنی شطرنج کا مہرہ بنایا ہے۔ جس سے عراق اور اہل عراق کو پہلے کبھی پالا نہ پڑا تھا ...... بغداد کا تعلیم یافتہ طبقہ اس حیثیت (یعنی سوشلزم) کو بیرونی طاقت کا فکری حملہ قرار دیتا ہے۔ ۱۵ فروری سے ۲۵ فروری ۱۹۶۵ء تک بغداد میں

---

[1] "عرب اتحاد" کا نعرہ قومی اور نسلی نعرہ ہے۔ جس سے کمیونسٹ لیڈر اتفاق نہیں کر سکتا۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہ گوارا کر سکتا ہے کہ "دنیا کے مزدور متحد ہو جاؤ" کے بجائے علاقائی مصلحت کا لحاظ کرتے ہوئے "عرب مزدور متحد ہو جاؤ" کا نظریہ وقتی طور پر قبول کرے۔ اسی اجتماع میں خروشیف نے عرب قومیت پر بھی سخت تنقید کی تھی اور کہا تھا کہ "اشتراکیت کے ساتھ قومیت کے سرمایہ دار حکمران کا کیا تعلق ہو سکتا ہے" اس کا مطلب یہ تھا کہ قومیت اور اشتراکیت ایک ہی بطن میں جمع نہیں ہو سکتیں — اول الذکر نسلی نعرہ ہے اور ثانی الذکر نظریاتی تحریک ہے جو جغرافیائی حدود کے خلاف ہے۔

[2] اسی اجتماع میں یہ لطیفہ پیش آیا کہ عبدالسلام عارف نے جب اپنی تقریر کا آغاز کیا تو تمام مقررین کے برعکس حمد و ثنا سے اپنی تقریر شروع کی اور ایمان اور اسلام پر زور دیا اور قرآن کی آیات کا حوالہ دیا۔ مصری عوام اس پر خوب تالیاں بجاتے رہے۔ خروشیف بھی تالیوں میں شریک ہو گیا۔ لیکن ترجمان نے پیچھے سے اس کے کان میں

"انجمن تصنیف و تالیف" کی جو کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس میں اسی فکری حملے کے خلاف آواز اٹھائی گئی تھی۔ یہ کانفرنس حکومت عراق کی سرپرستی میں ہوئی۔ عراق کے وزیر اتحاد اور بغداد یونیورسٹی کے چانسلر اس کے منتظمین میں شامل تھے۔ عراق کے صدر جمہوریہ بھی اس کے کئی اجلاسوں میں شریک ہوئے۔" [1]

شام کی بعث پارٹی کی مختصر تاریخ

قاہرہ کے بعد سوشلزم کا سب سے زیادہ فتنہ جس پر سوار ہے وہ شام کی بعث پارٹی ہے۔ یہ پارٹی ۱۹۴۲ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس کا بانی ایک عیسائی ہے جس کا نام میشیل عفلق ہے۔ اس پارٹی نے شام پر فرانس کے انتداب سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ فرانس شام کی مسلمان اکثریت کو دبانے کے لئے وہاں کی اقلیتوں کو مختلف ہتھکنڈوں سے ابھار رہا تھا۔ شام کے علوی جن کا اصل نام نُصیری ہے۔ لیکن فرانس نے ان کا نام علوی رکھ دیا تاکہ مسلمانوں کے دلوں سے ان کی نفرت کو کم کیا جا سکے۔ اور دُروزی فرقے مسلمانوں کے ہمیشہ سے دشمن رہے ہیں یہ وہی فرقے ہیں جو تاریخ میں نُصَیری اور قَرامطہ کے نام سے مشہور رہے ہیں۔ ان دونوں فرقوں نے مسلمانوں پر بڑے مظالم ڈھائے ہیں۔ قرامطہ کے بارے میں یہ تاریخی شہادت موجود ہے کہ بحرین اور جزیرۂ عرب کے بعض دوسرے علاقوں پر جب ان کا اقتدار قائم ہوا تو انہوں نے مسلمان علماء کے خون کی ندیاں بہائیں۔ حج کے موقع پر ان کی جماعتیں مکہ معظمہ پہنچیں اور انہوں نے حرم شریف میں داخل ہو کر حجاج کا قتل عام کیا اور ان کی لاشوں کو چاہ زمزم میں پھینکا۔ حجر اسود کو توڑ ڈالا۔ اور اس کے ٹکڑوں کو اٹھا کر لے گئے۔ جو مدتوں تک ان کے پاس رہے۔ حسن بن صباح کی تحریک کو چلانے والے بھی یہی لوگ تھے۔ انہوں نے اسلام کے علمی مراکز اور علمی اور مذہبی شخصیات کو ختم کرنے کی سازشیں کیں۔

اس وقت نُصَیری اور دُروزی آبادیاں ہی بعث پارٹی کی روح رواں ہیں۔ ایک طرف بعث پارٹی کا عیسائی لیڈر اپنے افکار و نظریات کو ان آبادیوں کے نوجوانوں میں پھیلاتا رہا اور دوسری طرف فرانس سوچی سمجھی اسکیم کے تحت فوج اور سول کے کلیدی مناصب ان کی تحویل میں دیتا رہا۔ شام میں جتنے فوجی انقلابات آئے ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر میں فوج کے ان عناصر نے حصہ لیا ہے جو بعث پارٹی سے وابستہ رہے ہیں۔ چونکہ جمہوری فضا میں بعث کے پنپنے کا کوئی امکان نہیں تھا اس لئے اس نے فوج کے اندر خفیہ حلقے قائم کئے اور فوجی افسروں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے ملک کے اندر فوجی آمریت کے لئے راستہ ہموار کیا۔ اور فوج کے

بقیہ حاشیہ صــــ تقریر کے اس حصے کا مفہوم بتایا تو خروشیف کی پیشانی پر شکن آگئے اور اس نے منہ بسور کر ہاتھ پشت کی جانب کر لئے اور سر ہلا ہلا کر اپنی غلطی کی تلافی کرنے لگا الاشتراکیۃ فی المذاہب العربیۃ ص ۱۲

[2] استاذ مصطفیٰ سباعی مرحوم اس گروہ قلیل کے سرخیل ہیں بعض ازہری مشائخ نے یہ اصطلاح اختراع کی تھی۔ سباعی صاحب بھی ان سے متاثر ہو گئے۔ اس پر شام کے تمام اہل علم حلقوں نے ان پر سخت تنقیدیں کیں۔ اور سباعی صاحب نے اپنے موقف سے کسی حد تک پسپا ہونا شروع کر دیا۔ اسی دوران مرحوم پر فالج کا حملہ ہوا۔ اور دو سال تک فالج کے مرض میں گرفتار رہنے کے بعد دنیا سے رخصت ہو گئے۔ آخری دنوں میں خاکسار کو چند روز ان کی رفاقت میں رہنے کا موقع ملا ہے۔ اس دوران زیادہ تر گفتگو "اسلامی سوشلزم" کے موضوع پر ہوتی رہی۔ مرحوم فرماتے تھے کہ معترضین میرا اصل مدعا نہیں سمجھے۔ میں صرف ان نوجوانوں کو جو "سوشلزم" سے مرعوب ہو رہے تھے یہ بتانا چاہتا تھا کہ اسلام کا عدل اجتماعی سوشلزم سے بہتر ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں نے اپنی کتاب کا نام "اشتراکیۃ الاسلام" (اسلام کا سوشلزم) اس لئے رکھا ہے تاکہ نوجوان گروہ کتاب کے نام سے مانوس ہو کر اس کے اصل مضامین سے استفادہ کی جانب راغب ہو سکیں۔

[1] ملاحظہ ہو روزنامہ الحیات، بیروت، شمارہ ۱۵ مارچ ۱۹۶۵ء مقالہ ڈاکٹر عمر حق۔

تعاون سے بعثی نظریات کی تنفیذ کی۔ ۱۹۵۸ء میں جب شام اور مصر کی یونین قائم ہوئی تو شامی صوبے میں جو حکومت تشکیل کی گئی اس پر بعثی عناصر کو غالب اکثریت حاصل ہوئی۔ شامی عوام نے انہی عناصر سے نجات پانے کے لئے مصر کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیا تھا مگر مصر نے ان کی مرضی کے علی الرغم پھر انہی عناصر کو شامی عوام کے سروں پر مسلط کر دیا۔[2] اس اتحاد کو ۳ سال سے زیادہ زندگی نہ نصیب ہو سکی۔ ۱۹۶۱ء میں شامی عوام نے ناگہانی طور پر علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ ستمبر ۱۹۶۳ء میں فوج کے بعثی گروپ نے پھر انقلاب برپا کر دیا اور خالص بعثی حکومت قائم کر دی گئی۔ تادمِ تحریر شام پر بعث پارٹی ہی کوس لمن الملک بجا رہی ہے۔

ابتدا میں عرض کر دیا گیا تھا کہ عرب ممالک میں سب سے پہلے جس نے سوشلزم کا نام لینا شروع کیا تھا وہ بعث پارٹی تھی۔ ۱۹۴۰ء میں بعث نے جس سوشلزم پر اپنے "غیر متزلزل عقیدے" کا اعلان کیا تھا اُس میں اور آج جس "سوشلزم" کا اس نے لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ اُس میں مشرق و مغرب کا فرق ہے۔ بعث کے بانی میشیل عفلق نے آغاز کار میں جس "عرب سوشلزم" کا پرچار کیا تھا اس کے بارے میں کہا تھا کہ "سوشلزم صرف ایک اقتصادی نظام ہے جس میں بڑی لچک ہے اور جو ہر قوم کی ضروریات کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکتا ہے"[3] لیکن اس دعوے کے ساتھ اُس نے دوسرے ایسے نظریات اور مطالبات کا اعادہ شروع کر دیا جو اس سے صریح طور پر متصادم تھے۔

بعث پارٹی اور عرب قومیت

ایک طرف اُس نے بعث کو صرف ایک سوشلسٹ تحریک کہا اور محض اقتصادی زندگی میں اصلاح کا ارادہ ظاہر کیا۔ اور دوسری طرف سوشلزم کا عرب قومیت کے ساتھ ناطہ جوڑ دیا۔ حالانکہ عرب قومیت کا فلسفہ جس بنیاد پر قائم تھا وہ یہ تھی کہ عرب اقوام کسی بیرونی فلسفۂ زندگی کو درآمد کرنے کے بجائے اپنی تہذیب اور اپنی ثقافت کو زندہ کریں اور اسے فروغ دیں۔ اور مختلف عرب اقوام جو خلیج عربی سے بحر اطلس تک پھیلی ہوئی ہیں اُن کے درمیان وجہ اشتراک ان کی زبان، ان کی مشترک تاریخ، ان کی مشترک تہذیب و ثقافت اور ان کے مشترک مسائل ہوں۔ سوشلزم کا نعرہ عربوں کے درمیان وجہ اشتراک کے بجائے وجہ تفریق تھا۔ کیونکہ اُس نے عرب قومیت کے نظریہ کے برعکس طبقاتی جنگ کی دعوت دی۔ اور عربوں کو محنت کش اور سرمایہ دار، ترقی پسند اور رجعت پسند، انقلابی اور انقلاب دشمن طبقوں میں تقسیم کیا اور اپنے محبوب طبقے کو دوسرے طبقے کے خلاف قتال کے لئے ابھارا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ سوشلزم کے ساتھ بعث کے بانی کو عرب قومیت کا نعرہ لگانے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی۔ اس کا جواب بھی اُس نے خود ہی دیا کہ اس مرحلہ میں عربوں کے لئے واحد محرک عرب قومیت ہے۔ "عرب قومیت ایک ایسا پاس ورڈ بن چکا ہے جو تنہا عربوں کے دلوں کے تار ہلانے کے لئے کافی ہے۔ عرب قومیت کی دعوت ان کے دل کی گہرائیوں میں اُترنے میں دیر نہیں لگاتی"[1] اس کا صاف مفہوم یہ ہے کہ جس دور میں بعث پارٹی نے سوشلزم کی تبلیغ شروع کی تھی اُس وقت عربوں کے دل و دماغ پر صرف ایک ہی نظریہ چھایا ہوا تھا اور وہ تھا "عرب قومیت" کا نظریہ۔ اس نظریہ کے سوا وہ کسی دوسری بات پر کان دھرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ چنانچہ بعث پارٹی مجبور تھی کہ وہ سوشلزم کو لوگوں کے حلق میں اتارنے کے لئے اُسے عرب قومیت کی چاشنی دے۔ ورنہ عرب قومیت

---

[1] بعث پارٹی کی مکمل تاریخ، اس کے نظریات اور اس کے حامی عناصر کی اصل حقیقت معلوم کرنے کے لئے ملاحظہ ہو راقم الحروف کا مضمون شام کی حزب البعث، اس کی تاریخ، نظریات اور کارنامے" شائع شدہ ماہنامہ ترجمان القرآن" بابت اگست و ستمبر ۱۹۶۷ء۔

[2] نہ صرف مسلط کیا بلکہ بعث پارٹی کے بانی اور مفکر میشیل عفلق کو مصر نے بھاری رشوت دی۔ اس کا اعتراف خود جمال عبد الناصر نے کیا ہے۔ اپریل ۱۹۶۳ء میں جب سہ طاقتی (مصر، شام اور عراق) اتحاد کی نئے سرے سے بات چیت ہو رہی تھی تو جمال عبد الناصر نے اس میں یہ انکشاف کیا کہ میں نے میشیل عفلق کو مختلف اوقات میں ۵۰ ہزار، ۲۰۰ ہزار اور ۳۰۰ ہزار پونڈ کی امداد دی تھی۔ (ملاحظہ ہو کتاب: سقوط الثورات الاشتراکیۃ مطبوعہ لبنان، ص ۲۲)۔

[3] ملاحظہ ہو کتاب: فی سبیل البعث تالیف میشیل عفلق ص ۵، شائع کردہ دار الطلیعہ، بیروت۔

کوئی مقصود بالذات نظریہ نہیں تھا۔[2]

بعث ازم کے اجزائے ترکیبی

سوشلزم اور عرب قومیت کا اَن مِل جوڑ لگانے کے بعد میشیل عفلق نے خود بعث ازم کے بارے میں بھی عجیب و غریب تصور پیش کیا۔ کہا کہ بعث ازم کے اجزائے ترکیبی وحدت، حریت اور اشتراکیت ہیں۔ اور وحدت کا مطلب یہ ہے کہ "عربوں کی انقلابی قوتوں کی وحدت ہو، صرف سیاسی وحدت ہی نہیں، بلکہ شعور، وجدان، نظریہ، جذبات اور زندگی کے نقطۂ نظر کے بارے میں مکمل وحدت ہو۔ اقتصاد، فوج اور عوامی تنظیم میں وحدت ہو۔ اور حریت سے مراد انسانی ارادہ کی حریت ہے۔ انسان کو ہر طرح کی نفسیاتی، اجتماعی، سیاسی اور فکری قیود سے آزاد کرانا اور بالخصوص اُسے "دینی خرافات" کے بندھنوں سے نجات دینا ہے[3] اور اشتراکیت کے بارے میں اُس نے وہی تصور پیش کیا جو مارکسزم کا ہے۔ لیکن دو ٹوک بات کہنے کے بجائے طرح طرح کے ایچ پیچ کے ساتھ۔

سوشلزم کے نفاذ کا طریقہ

سوشلزم کے نفاذ کے لئے اُس نے صاف صاف سوشلسٹ انقلاب برپا کرنے کی اسکیم پیش کی۔ اُس نے وضاحت کے ساتھ لکھ دیا کہ "یہ انقلاب محض تدریجی اصلاح کے ذریعہ نہیں ہوگا[4] اور نہ یہ عمومی طور کی فکری دعوت اور پروپیگنڈے کے ذریعہ شدید جنگ برپا کرنے سے ہوگا۔ یہ جنگ محض فکری نہیں ہوگی بلکہ یہ عوامی جنگ ہوگی جو بوسیدہ حالات کے ساتھ چمٹے رہنے والے طبقے اور "انقلابی ہراول دستے" کے درمیان ہوگی۔ "انقلابی ہراول دستہ" سے مراد وہ مزدور، کسان اور محنت کش لوگ ہیں جو اس سوشلزم پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ انقلاب سیاسی، اجتماعی، اقتصادی اور ثقافتی میدان کو محیط ہوگا اور اُن تمام اداروں کو اپنی لپیٹ میں لے گا جن پر سماج کی بنیادیں قائم ہوتی ہیں، مثلاً روایات، عادات، نظامِ حکومت، اور حکومت کی پوری مشینری۔ اور اس کا سب سے اہم پہلو یہ ہوگا۔ کہ یہ نفسیات کو بھی بدل کر رکھ دے گا اور فرد کی شعوری گہرائیوں تک کو ہلا کر رکھ دے گا۔ زندگی، مذہب اور اخلاق کے بارے میں فرد کے نقطۂ نظر کو تبدیل کردے گا۔"[5] ایک مرتبہ میشیل عفلق سے اُس کے ایک ساتھی نے یہ سوال کیا کہ "ہمارا سوشلزم کب بروئے کار آئے گا؟" میشیل عفلق نے جواب دیا کہ "جونہی ہم نے شام کی حکومت پر قبضہ کرلیا ہم تمام امتیازات اور تفریقوں کو ختم کردیں گے، اور عدل کو قائم کردیں گے۔ اور بقیہ مشن کی تکمیل کے لئے تیاری کریں گے۔ ہوسکتا ہے کہ ہم قوم کی ہر وہ خواہش پوری نہ کرسکیں جس کا وہ مطالبہ کرے۔ بلکہ ہم قوم کی ضروریات میں سے بھی کچھ حصہ لیں گے تاکہ فوج کی پرورش کرسکیں اور تمام عرب ممالک کے اندر انقلاب برپا کرسکیں۔"[6]

میشیل عفلق کے خیالات اسلام کے بارے میں

بعث پارٹی کے لیڈر نے اسلام پر بھی تند و تیز حملے کئے۔ اُس کی نگاہ میں اسلام آسمانی دین نہیں بلکہ عربوں کی قومی تحریک کی ایک کڑی ہے۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم، عربوں کے [illegible] نہیں ہیں۔ ہم اُس کے خیالات کو اُسی کی زبان میں نقل کرتے ہیں: "اسلام عربی تحریک تھی۔ اور اس کا ہدف عرب قومیت (عروبہ) کی تجدید و تکمیل تھا۔ اسلام نے جو زبان اختیار کی وہ عربی ہے۔ اشیاء کے بارے میں اُس نے جو نقطۂ نظر پیش کیا وہ عربی عقل کی عینک کے تابع تھا، جن اوصاف کی اسلام نے تلقین کی وہ سب عربوں کے اوصاف

---

[1] فی سبیل البعث ص ۸۷
[2] سوشلسٹوں کی یہ پرانی تکنیک ہے۔ ان کے پروپیگنڈے کا یہ مستقل ضابطہ ہے کہ "دوران سفر مقامی اثرات کے ساتھ مصالحت کا رویہ اختیار کیا جائے" عربوں کے اندر اُس وقت عرب قومیت ہی اصل پاس ورڈ تھا اس لئے بعث نے اسی کو ذریعۂ تعارف بنایا۔ اور پاکستان کے اندر چونکہ مذہبی ذہنیت کو غلبہ حاصل ہے اور ہر تحریک مجبور ہے کہ مذہب کے نام سے آغاز سفر کرے اس لئے یہاں کے سوشلسٹ عناصر اپنے سوشلزم پر اسلام کا غلاف چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔
[3] فی سبیل البعث ص ۸۔
[4] تدریجی اصلاح کا قائل سوشلزم برطانیہ کی لیبر پارٹی کا سوشلزم ہے۔ بعث کو اس سوشلزم سے انکار ہے۔
[5] ملاحظہ ہو کتاب فی سبیل البعث ص ۲ تا ۱۴۔
[6] ایضاً ص ۹۹۔ اس عبارت میں لگی لپیٹ رکھے بغیر بتا دیا گیا ہے کہ بعثی سوشلزم کا نفاذ فوج کے ذریعہ ہوگا۔ مزدوروں اور کسانوں کا نام محض برائے بیت لیا جاتا ہے۔

تھے، اُس وقت مسلم عرب افراد ترقی پسند اور انقلابی عرب انسان ہوتا تھا۔ ویسے ہی جیسے ہم آج بعض افراد کو "وطن پرست" کہتے ہیں۔ اور اس سے ہماری مراد یہ تخصیص کرنا ہوتا ہے کہ یہ افراد اپنے وطن کے مسائل پر ایمان رکھتے ہیں۔[1] اور اب اسلام عرب قومیت کی نئی تحریک کی شکل میں ظہور پذیر ہوا ہے۔[2] بلکہ اسلام صرف عربوں کے لئے ہے۔ یہ عرب قوم، عرب اوصاف، عرب اخلاق اور عرب صلاحیتوں کے ماسوا کسی اور قالب میں نہیں ڈھل سکتا تھا۔[3] کارنامہ اسلام اپنے طبعی اسٹیج سے الگ نہیں کیا جاسکتا اور وہ طبعی اسٹیج ہے سرزمین عرب۔ اور نہ اسے اس کے اصل ہیروؤں اور ایکٹروں سے کاٹا جاسکتا ہے اور وہ ہیں تمام عرب۔ اسلام کو بروئے کار لانے کے لئے جس طرح حامیوں کا گروہ ضروری تھا اسی طرح مشرکین عرب بھی ضروری تھے۔ اسلام کی جن لوگوں نے مخالفت کی ہے انہوں نے بھی اسلام کی کامیابی میں اتنا ہی حصہ لیا ہے جتنا حامیوں اور مددگاروں نے۔[4] عربوں کے اندر بیداری انگڑائیاں لے رہی تھی کہ اسلام کا پیغام ظاہر ہوگیا۔ زیادہ مناسب الفاظ میں اسلام اُس دور کے عربوں کی بیداری کا ترجمان ہے۔[5] یہ تحریک ہزار ہا برس سے چلی آرہی ہے۔ عرب قوم نے اپنے زندگی بخش احساس کا متعدد اوقات میں اور مختلف شکلوں میں اظہار کیا ہے۔ کبھی حمورابی کے قانون کی شکل میں کبھی دورِ جاہلیت کی شاعری کے اندر، کبھی دین محمد کے پردے میں، اور کبھی عہد مامون کی ثقافتی سرگرمیوں کے رنگ میں ان تمام ادوار اور اشکال میں احساس ایک ہی کارفرما رہا ہے۔[6]

اسلام کے بارے میں میشیل عفلق نے سب سے بڑا نکتہ جو بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ "دین کی حقیقت اور دین کے ظاہر دونوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ کیونکہ دین کا ایک باطن ہوتا ہے اور ایک ظاہر۔ اور بسا اوقات دین کے ظاہر اور باطن میں انتہائی فرق ہوتا ہے۔ بلکہ تعارض کی حد تک پہنچ جاتا ہے اور کبھی کبھی دین کا ظاہر دین کے اصل مقاصد کے بالکل برعکس ہوتا ہے اور اصل مشکل اس وقت درپیش آتی ہے۔"[7]

بعث پارٹی اور سائنٹیفک سوشلزم

یہاں تک تو ہم نے بعث پارٹی کے وہ خیالات بیان کئے ہیں جو اس نے آغاز کار میں اختیار کئے تھے۔ لیکن آگے چل کر بعث نے صاف گوئی سے کام لینا شروع کر دیا۔ ۱۹۵۶ء میں بعث پارٹی کا جو منشور شائع ہوا اُس میں صاف طور پر کہہ دیا گیا کہ "اسلام تو صرف زکوٰۃ، صدقات اور دوسروں پر احسان دھرنے کا "سوشلزم" پیش کرتا ہے۔ مگر "عرب سوشلزم" تو سرے سے غربت اور لقمہ اندوزی کا قلع قمع کر دیتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ سرزمین عرب میں ایک انسان بھی ایسا نظر نہ آئے گا جسے کسی کے احسان، صدقہ، شفقت و رحمت اور مہربانی اور کرم نوازی کی ضرورت ہو۔"[8]

کچھ مدت تک تو بعث پارٹی سوشلزم کے ساتھ لفظ "عرب" کا اضافہ کرتی رہی۔ اور لفظی طور پر عربوں کے جذبات کی رعایت میں یہ کہتی رہی کہ بعث کا سوشلزم "عرب سوشلزم" ہے۔ مگر ۱۹۶۳ء میں جب اس پارٹی نے شام میں خالصتہً بعثی انقلاب برپا کیا اور فوج کی طاقت سے سوشلزم پر عملدرآمد شروع کیا تو اُس نے یہ لفظی منافقت بھی ترک کر دی اور صاف صاف مارکسزم کا اعلان کر دیا۔ مندرجہ ذیل بیانات سے یہ بات خوب اظہر من الشمس ہو جاتی ہے۔

---

[1] ایضاً ص ۴۴۔ [2] ایضاً ص ۴۹۔ [3] ایضاً ص ۷۴ [4] یعنی مشرکین مکہ کی حیثیت محض اپوزیشن لیڈروں کی تھی۔ ورنہ عرب قومیت کی اس تحریک (اسلام) کی ترقی و فروغ میں وہ علمبرداران اسلام سے پیچھے نہیں رہے اور یہی وجہ ہے کہ عفلق نے مشرکین عرب کی توقیر اور محبت میں دمشق میں ابوجہل اور ابولہب کے نام سے کلب قائم کئے۔ [5] فی سبیل البعث ص ۴۵، ۷۴ [6] فی سبیل البعث ص ۷۷ اسلام تو میشیل عفلق کے نزدیک عرب قومیت کی تحریک کا نام ہے۔ مگر اس کی اپنی پختہ زناری کا یہ عالم ہے کہ باقاعدہ اس نے ویٹیکن میں جا کر پوپ کی زیارت کی ہے اور پوپ سے تمغہ حاصل کیا ہے۔ [7] ایضاً ص ۲۰۰ دراصل باطنیہ کی ہر تحریک نے دین کے بارے میں یہی تصور پیش کیا۔ میشیل عفلق کی تحریک کے تمام عناصر بھی باطنی فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں (یعنی نصیریہ، دروز، قرامطہ) اس لئے وہ ان عناصر کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے دین کی وہ تشریح کر رہا ہے جو مذہبی لحاظ سے اُن کو مطمئن کرنے والی ہے۔ [8] بحوالہ ہفت روزہ الشہاب، دمشق، شمارہ ۱۵ جنوری ۱۹۶۷ء۔

بعث کے رکن رکین صلاح الدین بیطار نے ایک پریس بیان میں کہا :

"سب سے پہلے میں بعث کے شعار (اشتراکیت) سے پردۂ ابہام ہٹانا چاہتا ہوں۔ "عرب سوشلزم" کے لفظ سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ ہم سوشلزم کی کوئی نئی قسم ایجاد کر رہے ہیں۔ میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہماری نگاہ میں سوشلزم کی ایک ہی قسم ہے اور وہ ہے "سائنٹیفک سوشلزم" ...... چنانچہ مارکسزم ہمارے نزدیک سوشلسٹ نظریہ کا اساسی ماخذ ہے[1]"

فروری ۱۹۶۶ء میں جب بعث پارٹی کے بائیں بازو نے انقلاب برپا کیا تو اس کی حمایت میں ڈاکٹر نورالدین اتاسی (موجودہ صدر شام) نے ۵ مارچ کو ایک بیان میں واضح کیا کہ : "ہمارا بنیادی مشن سائنٹیفک سوشلزم (یعنی مارکسزم) کا نفاذ ہے"[2]

خود میشیل عفلق نے سوشلزم کی نئی تفسیر پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ "ہم مارکسزم کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ سوشلسٹ ہونے کی حیثیت سے ہم مارکسزم سے بہت کچھ مواد اخذ کریں گے"[3]

نئے نقطۂ نظر اور پرانے نقطۂ نظر میں روح اور اصلیت کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ الفاظ کا معمولی پردہ تھا سو وہ بھی اتار دیا گیا۔ یہ پارٹی طبقاتی جنگ کی روز اول سے حامی ہے۔ ۳ سال قبل اس نے اپنی جس آئیڈیالوجی کا اعلان کیا تھا اس میں طبقاتی جنگ کا یہ انداز رچایا گیا ہے۔

"عوام کے پسماندہ طبقے کے ذہن میں طبقاتی تعاون کا جو بچا کھچا تصور موجود ہے اس کی تطہیر اور اخراج لازمی ہے اس جنگ کا تقاضا صرف اتنا ہی نہیں کہ قلع قمع کرنے پر اکتفاء کیا جائے، بلکہ غلط نظریات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ضروری ہے۔ انقلابی عوام کو بورژوا طبقے کے خلاف طبقاتی جنگ کا مسئلہ واضح اور قطعی شکل میں اختیار کرنا چاہیئے۔ یا ہم زندہ رہیں گے اور یا بورژوا زندہ رہیں گے۔ کوئی بھی درمیانی حل محض جھوٹ اور فریب ہوگا۔ اور اس کا مقصد بورژوائیت کا بچاؤ ہوگا"

۔ بعث پارٹی شہریوں کو "سائنٹیفک سوشلزم" (یعنی مارکسزم) کی تربیت دینا چاہتی ہے تاکہ انہیں ان بوسیدہ اجتماعی افکار و روایات سے نجات دلائی جائے جنہیں وہ نسلاً بعد نسل سینے سے لگائے چلے آرہے ہیں۔ اور تاکہ ایک ایسا عرب انسان تیار کیا جا سکے جو روشن اور سائنٹیفک شعور سے بہرہ ور ہو، جدید سوشلسٹ اخلاق سے آراستہ ہو، اجتماعی اقدار پر ایمان رکھتا ہو"[4]

---

[1] ملاحظہ ہو روزنامہ الاحد، بیروت، شمارہ ۲۱ اپریل ۱۹۶۳ء بیان صلاح الدین بیطار وزیر اعظم شام۔

[2] ملاحظہ ہو مجلۃ الطلیعہ، قاہرہ شمارہ جولائی ۱۹۶۶ء۔

[3] ملاحظہ ہو اخبار الجماہیر بغداد، شمارہ ۲۰ فروری ۱۹۶۳ء۔

[4] ملاحظہ ہو کتابچہ "المنہاج العقائدی لحزب البعث" (بعث کی پارٹی کی آئیڈیالوجی) شائع شدہ ۱۹۶۳ء۔

شام کے فوجی انقلابات کا پس منظر

سنہ ۱۹۶۴ء میں بعث پارٹی کی حکومت نے شام کے اندر دھوم دھام سے سوشلزم کے نفاذ کا افتتاح کر دیا۔ بڑی بڑی صنعتی کمپنیوں کو، بنکوں کو زرعی زمینوں کو قومی ملکیت میں لے لیا۔ اور متعدد کمپنیوں پر پورا قبضہ کرنے کے بجائے اُن کی ایک چوتھائی آمدنی میں مملکت کو شریک کر دیا۔ اس دوران ایک مشکل یہ پیش آئی کہ جو بنک قومی ملکیت میں لے لئے گئے تھے ان پر بڑے قرضے مختلف صنعتی یا تجارتی اداروں کے ذمہ تھے ان قرضوں کی وصولی کیسے ہو۔ اس کا سوشلسٹ حل یہ تجویز کیا گیا کہ ان قرضوں کے عوض حکومت ان اداروں میں اپنے حصے مقرر کر دے گی حکومت کی طرف سے یہ اعلان بھی کر دیا گیا کہ جو زمینیں قومی ملکیت میں لے لی گئی ہیں اُن کو کسانوں میں تقسیم نہیں کیا جائے گا بلکہ "اجتماعی زرعی فارم" قائم کئے جائیں گے۔[۱] ان "سوشلسٹ اصلاحات" سے یہ صاف نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ شام کا سوشلزم "تدریجی" نوعیت کا نہیں ہے بلکہ "انقلابی نوعیت" کا ہے۔ اور پیدا ہوتے ہی اُن انتہائی حدود کو چھونے لگا ہے جن پر چین اور کیوبا کا پھنکارتا ہوا سوشلزم قائم ہے۔

میشیل عفلق کئی سال پہلے سوشلزم کے نفاذ کا یہ راستہ بتا چکا ہے کہ حکومت پر قبضہ کیا جائے اور فوج کو اس غرض کے لئے استعمال کیا جائے۔ ہم پیچھے بتا چکے ہیں کہ میشیل عفلق فرانسیسی انتداب کے زیر سایہ علویوں (نصیریوں) اور دروزیوں کے اندر اپنی دعوت پھیلاتا رہا ہے۔ اور خود فرانسیسی انتداب بھی انہی قوموں کو فوج کے اہم عہدوں پر متمکن ہونے کا موقع دیتا رہا ہے۔ اس طرح بعث پارٹی اور فرانسیسی انتداب دونوں کی ملی بھگت نے فوج کے اندر بعثی عناصر کا ایک مضبوط گروپ جنم دے دیا۔

۱۹۴۹ء سے شام میں فوجی انقلابات کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ ان انقلابات کے پیچھے فوج کا وہ عنصر کام کرتا رہا ہے جو فرانسیسی انتداب کے زیر عاطفت پروان چڑھا ہے۔ ۱۹۵۸ء میں جب شام اور مصر کا اتحاد قائم ہوا تو شام کے صوبے میں جو حکومت تشکیل دی گئی اُس میں بعثی عناصر کا پلڑا بھاری تھا۔ اس طرح پہلی مرتبہ بعث پارٹی کو اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع ملا اور سوشلزم کے نام سے لوگوں کے اموال پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیئے۔ اتحاد کے ۳ سالوں کے اندر بعثیوں اور ناصریوں نے شام کے اندر جو طوفان بدتمیزی برپا کیا اُس سے شامی عوام کا آخر کار پیمانۂ صبر چھلک گیا[۲] اور ستمبر ۱۹۶۱ء کے اندر شام نے مصر سے بزور بازو علیحدگی حاصل کر لی۔ بعث پارٹی کا فوجی گروپ شام کو سوشلسٹ آمریت کے شکنجے میں کسنے کے لئے اُدھار کھائے بیٹھا تھا۔ چنانچہ مارچ ۱۹۶۳ء کو اس گروپ نے انقلاب برپا کر دیا۔ اور خالصۃً بعثی ڈکٹیٹر شپ قائم کر دی۔ مگر اس کے بعد بھی بعث پارٹی نے شام کے اسٹیج پر جو سیاسی اور خونی ڈرامے کھیلے ہیں اُن کا بیان قارئین کے لئے غیر مفید نہ ہوگا۔ اور قارئین کو یہ اندازہ لگانے میں سہولت ہو جائے گی کہ بعث پارٹی کا سوشلزم کن کن خرابیوں سے بھرا ہوا ہے۔

انقلاب برپا کرنے کے بعد بعثی عناصر نے "تطہیر" کا عصا ہاتھ میں لیا اور سول اور فوج کے اہم مناصب سے ان تمام عناصر کو نکالنا شروع کر دیا جو بعث کے نظریہ کے خلاف تھے۔ یا بعث پارٹی کے رہنماؤں سے ان کے ذاتی اختلافات تھے۔ اسلام پسند عناصر اُن کے انتقام کا ہدف خاص تھے۔ اس ہنگامہ دار و گیر نے ملک کے اندر شدید اضطراب کی صورت اختیار کر لی۔ مخالفین سے انتقام در انتقام کا ایک ہولناک سلسلہ شروع ہو گیا۔ نہ کوئی قانون کی حرمت باقی رہی اور نہ کسی فرد کی عصمت و آبرو کا تحفظ رہا۔ جنرل امین الحافظ اور صلاح الدین بیطار نے یکسوئی کے ساتھ امور حکمرانی انجام دینے کا بیڑا ہاتھ میں لے لیا۔ تمام فوجی افسروں کو "مال غنیمت" میں سے حصہ دیا گیا۔ مگر تقسیم غنیمت کے دوران ہی بعث پارٹی کے اندر اختلافات بلکہ رسہ کشی کا آغاز ہو گیا۔

دسمبر ۱۹۶۵ء کو بعث پارٹی دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک بعث کی "بین الاقوامی کمان" اور دوسری "علاقائی کمان"۔ بین الاقوامی کمان میں شام کی نمائندگی

---

[۱] ملاحظہ ہو اخبار الحیات، بیروت، شمارہ ۳۱ مئی ۱۹۶۴ء

[۲] ملاحظہ ہو بیان شکری القوتلی سابق صدر شام، بحوالہ نحو سیاسۃ عربیۃ تالیف احمد محمد جمال۔ مکہ معظمہ۔

میشیل عفلق، امین الحافظ اور صلاح الدین بیطار کر رہے تھے اور علاقائی کمان پر نصیری اور دروزی عناصر کا قبضہ تھا۔ علاقائی کمان نے یہ دیکھ کر کہ شام کی حکمرانی کا سارا لطف بین الاقوامی کمان اٹھا رہی ہے اپنے چند مطالبات پیش کئے جنہیں میشیل عفلق نے ٹھکرا دیا۔ اور علاقائی کمان کو توڑ دیا۔ آخر علاقائی کمان نے بین الاقوامی کمان کے خلاف بغاوت کر دی۔ جنرل صلاح جدید (نصیری)، اور بریگیڈیر سلیم حاطوم (دروزی) اور ان کے دوسرے ہمنواؤں نے مل کر دمشق پر لشکر کشی کر دی[1] اور اس تاریخی شہر پر توپوں سے گولہ باری کی۔ امین الحافظ کے بیوی بچے اس گولہ باری میں مارے گئے۔ خود امین الحافظ بھی جو صدر مملکت تھا۔ شدید زخمی ہوا اور اسے گرفتار کر کے المزہ جیل بھیج دیا گیا۔ بعث پارٹی کے بانی میشیل عفلق کی گردن بھی ناپی گئی اور اسے بھی جیل پہنچا دیا گیا۔ فوج اور سول کے وہ تمام افسر جن کا نام بین الاقوامی کمان کی فہرست میں کسی نہ کسی حیثیت سے شامل تھا اسی حشر سے دوچار ہوئے۔ فوج کے مسلمان افسروں کی نہ صرف چھانٹی کی گئی بلکہ ان میں سے بیشتر ایسے غائب کئے گئے جن کا آج تک سراغ نہیں مل سکا۔ حالانکہ یہ مسلمان اکثر و بیشتر دینداری کے لحاظ سے صفر تھے اور ہمیشہ بعث کے ہمنوا رہے مگر اقلیتی فرقوں کی مذہبی عصبیت نام کے مسلمانوں کو بھی گوارا کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ الغرض ایسا فتنہ محشر بپا ہوا کہ پورا ملک سراسیمگی میں مبتلا ہو گیا۔

ستمبر ۱۹۶۶ء میں بعث کے مذہبی تعصب نے ایک اور رُخ اختیار کر لیا۔ جنرل صلاح جدید (نصیری) اور سلیم حاطوم (دروزی) کے درمیان ٹھن گئی۔ سلیم حاطوم کو شکایت تھی کہ ہر جگہ نصیریوں کا قبضہ ہے جب کہ نصیری ہر سیکٹر میں دو تہائی اسامیوں سے زیادہ کے مستحق نہیں ہیں۔ ۸ ستمبر ۱۹۶۶ء کو سلیم حاطوم، طلال ابو عسلی اور ان کے پندرہ ساتھیوں نے فوجی انقلاب کی اسکیم تیار کی۔ اس اسکیم کے تحت مؤخر الذکر گروپ صلاح جدید اور چند دوسرے جنرلوں کو مصالحتی گفت و شنید کے بہانے اپنے مرکز میں بلا کر گولی سے اڑانے کے بعد اقتدار پر قبضہ کر لینے کا اعلان کرنے والا تھا۔ قاہرہ کو اس سازش کا علم تھا۔ قاہرہ نے اس میں دوغلا کردار ادا کیا۔ ایک طرف سلیم حاطوم کے گروہ کو تھپکی دی اور وقت آنے پر مدد کا یقین دلایا اور دوسری طرف صلاح جدید اور اس کی حکومت کو اس سازش سے باخبر کر دیا۔ چنانچہ یہ سازش عین وقت پر بے نقاب ہو گئی۔ سلیم حاطوم اپنے پندرہ ساتھیوں سمیت جو سب کے سب دروزی تھے بھاگ کر اردن چلا گیا اور وہاں سیاسی پناہ حاصل کر لی۔ انہوں نے عمان میں ایک پریس کانفرنس میں یہ بیان دیا کہ،

۱۔ شامی حکام میں فرقہ بندی اور گروہی تعصب پایا جاتا ہے۔ اور اس وقت فوج میں علویوں (نصیریوں) کو تسلط حاصل ہے۔

۲۔ شامی حکام نے کمیونسٹوں کے ساتھ ساز باز کر لی ہے، اور اس وقت کمیونسٹ ہی تمام سول محکموں پر چھائے ہوئے ہیں۔

گویا اب صرف نصیری میدان میں رہ گئے۔ ظاہر ہے کہ ۶۰ لاکھ کی آبادی میں ان کی تعداد سوا دو لاکھ سے زیادہ نہیں ہے۔ ایسی کمزور اقلیت کے لئے جس نے پورے ملک کو اپنا دشمن بنا لیا ہو، تنہا اپنے بل بوتے پر حکمرانی کرنا بالکل محال ہے۔ چنانچہ اس "ناتواں اقلیتی حکومت" نے بلا قید و شرط اپنے آپ کو روس کی گود میں ڈال دیا۔ اور اس طرح سے یہ "فوجی سوشلزم" "موقع پرست کمیونزم" کا نوالہ تر بن گیا۔

شام میں بعثی سوشلزم کے ثمرات

بعث پارٹی کے سوشلزم (یا صحیح معنوں میں کمیونزم) نے ۴ سال کے اندر شام کی جو "خدمت" سر انجام دی ہے اُسے ہم ایک عرب مصنف کی زبان سے یہاں نقل کرتے ہیں:

"اقتصادی طور پر شام کی جو بدحالی ہو چکی ہے وہ الگ ایک موضوع ہے۔ آبادی کے لحاظ سے بھی شام کی حالت اس مریض

---

[1] لبنان کے اخبار الجمہور الجدید نے یہ دلچسپ بات لکھی ہے کہ فرانس نے اپنے دورِ انتداب میں دمشق پر ایک مرتبہ حملہ کیا۔ اور خود اہل شام اپنے تاریخی شہر پر ۲۵ مرتبہ حملہ کر چکے ہیں۔

کی طرح ہو چکی ہے جس کے جسم سے خون کی غیر معمولی مقدار بہہ چکی ہو۔ شام کے انجینئر، پروفیسر، ماہرین امور مملکت، ہر طرح کے اسپیشلسٹ جن پر شام نے کئی ملین پونڈ صرف کئے ہیں، ڈاکٹر، سائنسدان، ڈپلومیٹ، قانون دان، ادباء، اخبارات، ٹیلی ویژن اور ریڈیو میں کام کرنے والے، صنعت کار اور صنعت پیشہ، بڑے درمیانے اور چھوٹے تاجر، روپیہ لگانے والے چھوٹے چھوٹے ملازمین، کاشتکار اور مزدور بہت بڑی تعداد میں ملک کو چھوڑ چکے ہیں اور آزاد اقتصادی پالیسی رکھنے والے ممالک میں پناہ لے چکے ہیں۔ مختلف حلقوں میں سے دس فیصد سے لے کر ستر فیصد تک لوگ ہجرت کر چکے ہیں، اور بعض حلقوں سے اس سے بھی اونچے تناسب پر ہجرت ہو چکی ہے۔ اور بہت بڑی تعداد پابرکاب ہے۔ صرف سینیگال میں ایک ہزار دو سو شامی ماہرین (جن میں پروفیسر، انجینئر، تاجر، سرمایہ دار اور صنعت پیشہ شامل ہیں) جا چکے ہیں۔ اور ایسے ہی لوگوں کی بھاری تعداد شام کے اشتراکی انقلابات کے بعد سے مختلف افریقی ممالک میں پھیل چکی ہے۔ مراکش، تونس، لیبیا اور سوڈان میں بھی شام کے مختلف طبقے سر چھپائے بیٹھے ہیں۔ یورپ کے مختلف ممالک مثلاً فرانس، مغربی جرمنی، سوئٹزرلینڈ، اور شمالی علاقوں میں شام کے مہاجر بڑی تعداد میں نظر آ رہے ہیں حالانکہ ان ملکوں میں کاروبار کے لئے بڑی کٹھن شرائط پائی جاتی ہیں۔ کویت، قطر اور دوسری عرب ریاستوں میں بڑی بڑی شامی جماعتیں ایام ہجرت گزار رہی ہیں۔ رہا سعودی عرب تو وہاں یوں نظر آتا ہے جیسے شام کے محلوں کے محلے منتقل ہو چکے ہیں۔ وہاں ہر طبقہ کے افراد آپ کو ملیں گے۔ ان میں سابق وزرائے اعظم، وزراء، نوجوانی کے اندر ہی ریٹائرڈ کر دیئے جانے والے فوجی افسر، پروفیسر، انجینئر، ڈاکٹر اور صنعت و حرفت سے تعلق رکھنے والے لوگ شامل ہیں۔ بلکہ ہر سطح کے تاجروں اور مزدوروں کی بھی بہت بڑی تعداد موجود ہے۔

"شام کا تمام سرمایہ لبنان منتقل ہو چکا ہے۔ شام کی تمام چھوٹی اور بڑی صنعتیں وہاں پہنچ چکی ہیں۔ بلکہ صنعتی لحاظ سے لبنان شام بن چکا ہے۔ اور شام صنعتی اور تجارتی لحاظ سے تمام ممالک سے کٹ چکا ہے اور انتہائی فقر کی حالت میں مبتلا ہے۔ اشتراکی دور سے قبل شام کی مصنوعات اور پیداوار دنیا کی منڈیوں کو بھرتی رہی ہے۔ شام اپنا زائد غلّہ اور روئی برآمد کرتا تھا۔ ایک مرتبہ صرف دمشق نے فلوریڈا اور نیویارک کو ۳۰ لاکھ شامی لیروں کا کانچ برآمد کیا تھا۔ اور اگر اشتراکیت کا خونی طلامہ شام کی کمر نہ توڑ کر رکھ دیتا تو شام زراعت سے لے کر صنعت و تجارت تک اور فن و ثقافت سے لے کر علوم و سائنس تک ہر میدان میں گوئے سبقت لے جاتا۔"

"اس وقت ۲ لاکھ ۸۰ ہزار شامی فنی ماہرین بیروت اور اس کے گرد و نواح میں جمع ہیں۔ شام کو اب اگر جا کر دیکھا جائے تو وہ ویران اور سنسان صحرا کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ معمولی چھوکرے اس پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ بازار اچھے تاجروں سے خالی ہو چکے ہیں۔ کساد بازاری کا دور دورہ ہے۔ باہمی اعتماد رخصت ہو چکا ہے۔ دیہاتوں کی حالت اور بھی دگرگوں ہے۔ موجودہ دور میں ان دیہاتوں کے لوگ جس مفلوک الحالی سے دوچار ہیں وہ پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی۔ اگرچہ اشتراکی دور کے ہر شخص کی پیشانی پر بدقسمتی چسپاں ہو چکی ہے مگر کسان اور مزدور کی حالت سراسر ناگفتہ بہ ہے۔ حالانکہ کسان اور مزدور کے نام پر تمام اشتراکی انقلاب برپا ہو رہے ہیں۔"[1]

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب "ایمان کا تیشہ بہاؤ" تالیف احمد فواد الیاس، مطبوعہ دار الریحانی بیروت ص ۱۲۸ تا ۱۳۱

شام کے وزیر اقتصاد نے ایک مرتبہ شہریوں کی شکایات کا جواب دیتے ہوئے شام کے اقتصادی بحران کے اسباب پر روشنی ڈالی اور بتایا:[1]

الف: ملکی منڈیوں پر جمود طاری ہے۔ ہمسایہ ممالک کو تجارتی برآمد نہ ہونے کے برابر ہے۔

ب: بعض بنکوں اور تجارتی اداروں کے ساتھ معاملات میں گڑبڑ ہو گئی ہے۔ کیونکہ ۶ ماہ سے برآمدات کی قیمتیں ان کو ادا نہیں کی گئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فارن سیکٹر میں ملکی آمدنی سکڑ گئی ہے۔

ج: اشیائے ضرورت بازار سے غائب ہو گئی ہیں۔ بس کباب ہیں۔ اشیاء کی قیمتیں بالعموم بڑھ گئی ہیں۔

د: جدید تجارتی، زراعتی اور صنعتی منصوبے نافذ نہیں کئے جا سکے۔

مشہور شامی سوشلسٹ لیڈر اکرم حورانی کا بیان ہے کہ "رجعت پسندوں کے دور میں تقسیم اراضی میں عدل اجتماعی کی جامع اور ہمہ گیر مثالیں ملتی ہیں مگر انقلابی دور میں وسائل کی فراوانی کے باوجود یہ مثالیں مفقود ہیں۔[2] حکمران گروہ نے تمام زمینداریوں کو تو قومی ملکیت بنا لیا ہے مگر ان کے مالکوں کو ایک پائی تک معاوضہ ادا نہیں کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ نُصیری اور دروزی زمیندار "اشتراکی قوانین" کی زد سے محفوظ ہیں۔ یہ قوانین صرف مسلمان "رجعت پسندوں" کے لئے مخصوص رہے ہیں۔ ان قوانین کو جس تشدد اور جبر کے ساتھ نافذ کیا جا رہا ہے اس کا اندازہ صرف ایک مثال سے ہو سکتا ہے۔ جنوری ۱۹۶۶ء کے پہلے ہفتے میں شام کے شمالی علاقے میں الشجرہ نامی قصبے کے اندر فوجی عدالت قائم کی گئی جس کا مقصد ان کسانوں اور غریب فلاحین کا محاسبہ تھا جنہوں نے اشتراکی احکام کی تعمیل سے انکار کر دیا تھا یا ان کی تنفیذ میں کسی نہ کسی حیثیت سے رکاوٹ بنے تھے۔ چنانچہ ان کسانوں کو فوجی عدالت کی طرف سے عبرتناک سزائیں دی گئیں۔[3]

مزید برآں یہ کہ "زرعی اصلاحات" اور دوسرے اشتراکی احکام سے اصل مدعا عوام کی خدمت نہیں بلکہ ذاتی انتقام تھا۔ جمال عبدالناصر کا دست راست حسنین محمد ہیکل کا بیان ہے کہ "شام کا وزیر زراعت مصطفیٰ حمدون بعض اوقات زرعی قوانین کی تنفیذ میں سخت تشدد برتتا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ گویا وہ آتش انتقام بجھا رہا ہے"۔ ہیکل نے اس سلسلے میں ایک واقعہ بھی نقل کیا ہے۔ حلب کے ایک زمیندار رشاد الجابری کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ہے۔ شام کی زرعی اصلاح کا قانون اراضی کی تقسیم کے سلسلے میں مالک کو یہ اختیار دیتا تھا کہ وہ زمین کے مختلف ٹکڑوں میں سے اپنے لئے جو چاہے ایک ٹکڑا منتخب کر لے اور باقی حکومت کی تحویل میں دے دے۔ مگر جب رشاد الجابری کی اراضی تقسیم کی گئی تو مصطفیٰ حمدون نے رشاد الجابری کو اس انتخاب کے حق سے محروم کر دیا۔ اور جب ان سے دریافت کیا گیا کہ جب قانون کی نص صریح مالک کو انتخاب کا حق دیتی ہے تو آپ نے یہ موقف کیوں اختیار کیا ہے تو مصطفیٰ حمدون نے جواب دیا کہ رشاد الجابری انفصال پسند بلاک کا حامی ہے۔[4]

بعث حکومت کی ان متشددانہ کارروائیوں اور دھاندلیوں کو دیکھ کر جمال عبدالناصر جیسا لیڈر بھی پکار اٹھا کہ "بعث پارٹی اخلاق سے بھی عاری ہے اور انسانیت سے بھی دور ہے۔ یہ پارٹی ہرگز برسر اقتدار نہ آ سکتی تھی۔ اس نے تشدد اور جبر کا راستہ اختیار کیا۔ خونریزی کو مشغلہ بنایا۔ بعثی اقتدار ایک فاشسٹ نظام ہے۔ یہ قوم کا نمائندہ نہیں ہے۔ بعث حکومت کی بنیاد خون، تشدد اور جیلوں پر قائم ہے"۔[5] قاہرہ کے ہفت روزہ روز الیوسف نے حزب البعث کی حکومت کا تعارف کراتے ہوئے لکھا:

> "شام کی حزب البعث نے نیشنلزم اور سوشلزم کے نعروں کے سہارے ترقی پسندی کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ لیکن پچھلے سالوں کے تجربے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ بعث پارٹی شام اور عراق کی حکومتیں چھین کر محض اپنا اقتدار مضبوط کرنا اور ان نعروں کو عملی شکل دینے

---

[1] سقوط الثورات الاشتراکیة ص ۲۹ [2] الاشتراکیة فی التجارب العربیة ص ۸۵ [3] ملاحظہ ہو کتاب "ماذا جری فی سوریة" تالیف حسنین محمد ہیکل ص ۷، ۸ [4] ۸، ۹ [5] اسکندریہ میں جمال عبدالناصر کی تقریر کا اقتباس بحوالہ "سقوط الثورات الاشتراکیة"۔

سے قائم رہی ہے۔[1]

اور خود شام کے عرب سوشلسٹ لیڈر (یعنی اکرم حورانی اور اس کے ساتھی) یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ "فوجی سوشلزم ایک شر ہے جس کا ازالہ لازمی ہے"[2] بلکہ انتہا یہ ہے کہ صلاح الدین بیطار جو کل تک بعث پارٹی کے چوٹی کے رہنماؤں میں شمار ہوتا تھا۔ وہ بھی چلا اٹھا ہے۔ اور بعث کے بارے میں یہ کہنے لگا ہے کہ "مجھے یقین ہو چکا ہے کہ بعث کوئی انقلاب یا انقلابی تحریک نہیں ہے۔ بلکہ سراسر جہل اور جہالت ہے۔ جن کے نزدیک حریت کا یہ مفہوم ہے کہ عوام کی ٹینکوں، توپوں، جاسوسی، جیلوں، زد و کوب، جبر و تشدد اور تعذیب سے سرکوبی کی جائے۔"[3]

بعث کا اسلام پر تازہ ترین حملہ

بعث سوشلزم کا سب سے اہم پہلو اس کا وہ رویہ ہے جو اس نے کسی رُو رعایت کے بغیر مذہب کے بارے میں اختیار کر لیا ہے۔ روسی الاصل ہونے کی وجہ سے مصر کا سوشلزم بھی مذہب کی نفی کرتا ہے مگر وہ براہ راست مذہب کا قلع قمع کرنے کے بجائے دوسرے ہتھکنڈوں کو استعمال کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں بعث سوشلزم کیمونسٹ چین سے کسب فیض کر رہا ہے اسی لئے وہ منافقت کے بجائے ببانگ دُہل مذہب کی خبر لیتا ہے[4]۔ مذہب کے بارے میں بعث کا واشگاف موقف اس کی درج ذیل تحریر سے معلوم ہو سکتا ہے جو حال ہی میں شامی فوج کی مائی بکمان کے ترجمان "جیش الشعب" میں شائع ہوئی ہے۔

"عرب قوم نے خدا کو مدد کے لئے پکارا۔ اسلام اور مسیحیت کی بوسیدہ قدروں کی جستجو کی۔ سرمایہ داری، جاگیرداری اور قرون وسطیٰ کے بعض نظاموں کا سہارا لیا۔ لیکن ان میں سے کسی ایک نے اس کی ذرہ بھر مدد نہ کی"۔

"اسلام اور مسیحیت کی قدروں نے عرب انسان کو ذلیل اور توکل پرست بنا دیا۔ مجبور اور تابع بنا دیا۔ ایک ایسا انسان بنا دیا جو صرف یہ کہنا جانتا ہے کہ: "لا حول ولا قوۃ الا باللہ"

"عرب تہذیب کی تعمیر جدید اور عرب سماج کی تشکیل نو کا واحد راستہ یہ ہے کہ ایک جدت پسند، انقلاب پرست اور اشتراکی انسان کو جنم دیا جائے، جس کا پختہ ایمان ہو کہ خدا، دین، سرمایہ داری، جاگیرداری، سامراج اور وہ تمام قدریں جو آج تک سماج پر چھائی رہی ہیں محض حنوط شدہ ڈھانچے ہیں اور فقط تاریخ کے میوزیم کی زینت ہیں"۔

"جب ہم یہ شرط عائد کرتے ہیں کہ جدید انسان کو پچھلی تمام قدریں ردی کی ٹوکری میں اٹھا کر پھینک دینی چاہئیں تو اس کے ساتھ ہمارا یہ بھی فرض ہے کہ ہم مخصوص نوعیت کی نئی قدریں وضع کریں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ بنیادی طور پر صرف ایک ہی قدر درکار ہے اور وہ ہے: "جدید خود مختار انسان" پر ایمان مطلق، جو صرف اپنی ذات اور اپنے کام اور انسانیت کی خدمت پر بھروسہ کرتا ہو۔ اور اسے یقین ہو کہ موت اس کا حتمی خاتمہ ہے اور موت کے بعد کچھ نہیں ہے، جنت اور دوزخ سب افسانے ہیں۔ انسان موت کے بعد ایک ذرے میں تبدیل ہو جاتا ہے اور گردش زمین کے ساتھ گردش کرتا رہتا ہے"۔

"ہمیں ایسے انسان کی ضرورت نہیں ہے جو نمازیں پڑھتا ہو اور ذلیل و عاجز بن کر رکوع میں جھکتا ہو، اپنے لئے رحم اور مغفرت کی طلب میں سرگرداں ہو..... ہم جس انسان کے ضرورت مند ہیں وہ سوشلسٹ اور انقلاب پسند انسان ہے جس کا ایمان ہو کہ انسان ہی حقیقت مطلقہ ہے"[5]

---

[1] مجلہ روز الیوسف، قاہرہ، شمارہ ۸ مارچ ۱۹۶۶ء [2] ملاحظہ ہو عرب سوشلسٹ لیڈروں کا بیان شائع شدہ روزنامہ الحیات، بیروت، شمارہ ۱۷ ستمبر ۱۹۶۶ء

[3] ملاحظہ ہو جریدہ الانوار، بیروت، شمارہ ۲۴ ستمبر ۱۹۶۶ء [4] چنانچہ یہ بعث پارٹی کی حکومت کا کارنامہ ہے کہ اس نے دمشق کی تاریخی مسجد جامع اموی پر گولہ باری کی اور عین نماز کی حالت میں لوگوں کو شہید کیا۔ حمص کی جامع مسجد کے اندر گھس کر لوگوں کو گرفتار کیا، ان کی داڑھیاں نوچیں اور کثیر تعداد کو گرفتار کر لیا۔ [5] ملاحظہ ہو روزنامہ الحیات بیروت، شمارہ ۵ مئی ۱۹۶۷ء۔ نیز ہفت روزہ "اخبار العالم الاسلامی" مکہ، بابت ۵ جون ۱۹۶۷ء۔ یہ اس مضمون کے چند اقتباسات ہیں جو جریدہ جیش الشعب میں ابراہیم خلاص کے قلم سے شائع ہوا ہے۔

اس مضمون کی اشاعت پر شام کے مسلمان عوام نے علماء کی قیادت میں سخت احتجاج کیا، مظاہرے اور ہڑتالیں کیں۔ اس کے جواب میں شام کی حکومت نے تشدد کا راستہ اختیار کیا۔ ان پر گولیاں چلائیں، ان کی دکانوں کے تالے توڑے اور ساز و سامان کو لوٹا۔ ان کی کثیر تعداد کو جیلوں میں ٹھونس دیا۔ اور تقریباً ایک ہفتہ تک پورے شام میں دہشت گردی کا سماں طاری رہا۔ اس "بغاوت" کو کچلنے میں شام کی "مسلح قومی فوج" نے بھی غیر معمولی حصہ لیا۔

شام کے "ریڈ گارڈز"

شام کی "مسلح قومی فوج" پچھلے سال قائم کی گئی ہے۔ اور انہی خطوط پر قائم کی گئی ہے جن پر چین کے ریڈ گارڈز کی تنظیم ہے۔ اور جس طرح چینی ریڈ گارڈز نے چین میں "ثقافتی انقلاب" برپا کر رکھا ہے اسی طرح "قومی فوج" کا مقصد بھی "شامی قوم کو رجعیت اور استعمار کے اثرات سے پاک کرنا" بتایا گیا ہے۔ یہ فوج باقاعدہ مسلح ہے اور اس میں وہ تمام عناصر بھرتی کئے گئے ہیں جو "انقلاب پرست" ہیں۔ "قومی فوج" کے کارکنوں کو کھلی چھٹی دی گئی ہے کہ جس جگہ بھی قدامت پرستی کی بو سونگھیں اس کا استیصال کر دیں۔ چنانچہ جو لوگ حکومت کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ انہیں استعمار کا ایجنٹ اور رجعت پسندی کا آلۂ کار کہہ کر زد و کوب کیا جاتا ہے۔ ان کے گھروں کی تلاشی لی جاتی ہے اور اگر ضرورت پیش آ جائے تو انہیں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا جاتا ہے۔ قومی فوج کے کارکنوں نے مسجدوں کے اندر گھس کر دوران خطبہ اماموں اور خطیبوں کی بے عزتی کی ہے اور ہڑتالیوں کی دکانوں کے تالے توڑ کر دکانوں کا سامان لوٹا ہے اور لطف یہ ہے کہ ان کے مقابلے میں عوام کو بذریعہ قانون غیر مسلح کر دیا گیا ہے۔[1]

الجزائر میں سوشلزم

الجزائر کا "سوشلزم" چینی نظریات سے ماخوذ ہے۔ مراکش کا سوشلسٹ لیڈر مہدی بن برکہ احمد بن بلا کا "فکری استاذ" تھا۔ مہدی بن برکہ کے افکار ہم پیچھے بیان کر چکے ہیں۔ الجزائر کی حکومت نے جن زمینداریوں اور صنعتوں کو قومی ملکیت میں لیا ہے اُن کے مالکان کو سات سال گزر جانے کے بعد بھی ابھی تک معاوضہ نہیں دیا گیا۔ اور قومی ملکیت میں لینے کے لئے جو احکام صادر کئے گئے ہیں خود ان کے اندر بھی یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ یہ معاوضے طویل المیعاد قسطوں میں دیئے جائیں گے۔[2]

حبیب بورقیبہ کا دستوری سوشلزم

سوشلزم کی اس بحث میں ہم تونس کے سربراہ حبیب بورقیبہ کے سوشلزم پر بھی مختصراً روشنی ڈالنا ضروری سمجھتے ہیں۔ بورقیبہ نے اپنے سوشلزم کا نام "دستوری سوشلزم" تجویز کیا ہے۔ اس سوشلزم کی تفصیل خود ان کی اپنی زبان سے ملاحظہ ہو:

> "سوشلزم کا جوہر یہ ہے کہ ایک ایسا ترقی یافتہ اور ترو تازہ معاشرہ پیدا کیا جائے جس میں دولت کی تقسیم عادلانہ بنیادوں پر ہو اور جس سے تمام لوگوں کی ضروریات پوری ہو سکتی ہوں۔ "دستوری سوشلزم" جس کو ہم نے اختیار کر رکھا ہے، کے بارے میں فیصلہ نتائج کے بعد ہی دیا جا سکتا ہے۔ اس وقت ہم اپنی اقتصادیات کو بڑھا رہے ہیں اور باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ انہیں اجتماعی انصاف کی طرف ترقی دے رہے ہیں۔ اجتماعی انصاف ہی باشندگان ملک

---

[1] اسرائیل نے ۵ جون ۱۹۶۷ء کو جب عرب ممالک پر حملہ کیا تو اس وقت شام کی "قومی فوج" رجعت پسندی کے قلع قمع میں مصروف تھی اور جیش الشعب کے مذکورہ بالا مضمون کے خلاف مسلمانوں کے احتجاج کو طاقت کے زور سے دبا رہی تھی۔ انہی ہنگاموں کے دوران اسرائیل نے حملہ کر دیا۔ یہاں یہ ذکر کر دینا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ اسرائیل کے خلاف جب جنگ ہو رہی تھی باقاعدہ شامی آرمی دمشق کے اردگرد متعین تھی تاکہ ملک کے اندر حالات میں کوئی بغاوت نہ رونما ہو جائے۔ اسرائیلی فوجوں سے جس شامی فوج نے مقابلہ کیا ہے وہ یہی مسلح قومی فوج تھی (پاکستان ٹائمز لاہور، شمارہ ۲۰ جولائی ۱۹۶۷ء)

[2] الاشتراکیۃ فی التجارب العربیۃ ص ۴۳

ملک کے اندر جذبہ و ارادہ پھونک سکتا ہے اور ان کے اندر وہ فراواں جوش و ولولہ بھڑکا سکتا ہے جو پیداوار کو وافر مقدار تک ترقی دے۔ اسی چیز کو ہم "دستوری سوشلزم" کہتے ہیں۔ اس کی مدد سے بیک وقت تقسیم کے نظام میں بھی عدل قائم رہتا ہے اور پیداوار میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ بات کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے۔ اس لئے کہ انسان فطرتاً عدل اور اطمینان سے محبت رکھتا ہے۔ اور جب انسان یہ دیکھے کہ تمام معاملات انصاف کے ساتھ چل رہے ہیں اور وہ ظلم اور غبن کے شر سے محفوظ ہے تو اس کی کارکردگی اور جوش و جذبہ بڑھ جاتا ہے اور وہ زیادہ سے زیادہ محنت کرنے لگتا ہے۔ اس کے نتیجے میں پیداوار میں خود بخود اضافہ ہوتا ہے اور تمام انسانوں کا معیار زندگی معقول حد تک بلند ہو جاتا ہے۔"

"بعض نوجوان ہمارے سوشلزم کا مطالعہ کئے بغیر "عرب سوشلزم" کی دعوت دینے لگتے ہیں اور انہیں یہ خبر نہیں ہے کہ یہ سوشلزم عربی ہے یا عجمی۔ یہ لوگ "زرعی اصلاحات" کا مطالبہ بھی کرتے ہیں۔ اور وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ہماری زرعی اصلاحات مالکوں کے ہاتھ سے زمین چھین کر اُن لوگوں میں تقسیم نہیں کرتیں جو زمین کو آباد کرنے کی صلاحیت سے عاری ہوتے ہیں۔ اور نہ ہماری اصلاحات محنت کشوں اور فقیروں کے سینے ٹھنڈے کرنے کی خاطر مالکان اراضی کو جیلوں میں پھینکتی ہیں۔ یہ دعوے سب ریاکاری پر مبنی ہیں۔ اور جھوٹے مظاہرے کے ذریعہ عوام کو دھوکہ دینے کی چالیں ہیں۔ ہم یہ ریاکاری اور دھوکہ دہی پسند نہیں کرتے۔ اور نہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ لوگوں کو ایسی باتوں کا رسیا بنا دیں جو ان کے دلوں میں حسد اور کینہ کے جذبات بھڑکا دیں۔ ہمارا اصل مشن یہ ہے کہ پیداوار وافر حد تک ہو۔ اور زرعی اصلاحات سے ایجابی نتیجہ اخذ کرنے میں کامیابی ہو۔ اور یہ بات کیسے پوری ہو سکتی ہے اگر ہم زمین مالکوں سے جو مزدوری آلات کشاورزی کی بدولت اس کی علاوہ خدمت کر سکتے ہیں چھین کر اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں اور اُسے عوام الناس کے ہاتھ میں دے دیں۔ پھر سوال یہ ہے کہ زمین صحیح خدمت گاروں سے چھین کر کس کے حوالے کریں۔ کیا فرد کے حوالے کریں۔ یا کسی ادارے اور جماعت کے۔ یعنی کیا ہم زمین کی آبادکاری فوج کے کسی افسر کے ذریعہ کریں یا کسی بورڈ کے ذریعہ جیسا کہ بعض عرب ملکوں میں یہ ہو رہا ہے؟

لیکن کیا یہ رسوائی کی بات نہیں ہے کہ جب کوئی فوجی افسر یا بورڈ زمین پر قابض ہوتا ہے تو زمین کے سابق مالکان اس سے جو پیداوار حاصل کرسکتے تھے اُس سے کئی درجے پیداوار کم ہو جاتی ہے۔ لہذا اصل مسئلہ مالکان کو بے دخل کرنے اور ان کی جگہ نئے کسان مقرر کرنے کا نہیں ہے۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ نیا کسان زمین کی آبادی میں سابق کسانوں کی نسبت فنی مہارت اور جدید آلات کشاورزی کے استعمال میں سبقت لے جانے والا ہو۔ اور زمین کے تین یا چار چار ٹکڑے جمع کرکے "کوآپریٹو فارموں" کا قیام بھی اصل چیز نہیں ہے۔ بلکہ اصل چیز وہ صلاحیت ہے جو ایسے فارموں کو چلانے کے لئے ناگزیر ہے۔ اور یہ صلاحیت یکایک اور خود بخود حاصل نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے حصول کے لئے متعدد دروازوں پر دستک دینا پڑتی ہے۔ مثلاً حساب، فزکس، کیمسٹری، تجربہ اور مشق۔ اس اصول کے تحت عرب سوشلزم اور مارکسزم اور کمیونزم کے داعی جو کچھ چاہتے ہیں وہ ہمارے پاس وافر موجود ہے۔ کیونکہ اگر ان کا مقصود زمین کی حالت بہتر بنانا ہے تو ہم یہ مہم سرانجام دے رہے ہیں لیکن معقول اور کامیاب وسائل کے ساتھ نہ کہ چھلانگیں لگا کر۔

"موجودہ دولت و ثروت کی تقسیم بھی اہم نہیں ہے۔ اس لئے اگر آپ مالداروں کے ہاتھ سے تمام دولت چھین لیں اور فقراء میں تقسیم کر دیں تو آخر ہر فقیر کے حصہ میں کیا آئے گا۔ اصل چیز یہ ہے کہ قوم کا ہر فرد زیادہ سے زیادہ دولت کی افزائش میں حصہ لے۔ تاکہ جو کچھ موجود ہے اُس میں مزید اضافہ ہو۔ اور اس تمام دولت کو عدل کے ساتھ تقسیم کیا جائے۔ اور ذخیرہ اندوزی، نفع اندوزی اور اجارہ داری کا قلع قمع کیا جائے۔ اور ملکیت میں تصرف کے لئے ایک حد مقرر کر دی جائے۔ چنانچہ ہم قومی اتحاد پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور ادارہ افراد کے تعاون پر بھی۔"[1]

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب الاشتراکیة فی التجارب العربیة ص ۲۶ تا ۲۹

اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ عرب ممالک کے اندر اس وقت تین قسموں کے سوشلزم پائے ہیں۔ ایک عرب سوشلزم جس کا صحیح نام مارکسزم ہے اس پر مصر، شام اور الجزائر کار بند ہیں۔ اور مراکش کی سوشلسٹ پارٹی بھی اس کی علمبردار ہے۔ دوسرا "اسلامک سوشلزم" جسے عراق کے مرحوم سربراہ عبدالسلام عارف نے اختراع کیا تھا اور جو اپنی مخصوص حیثیت کا واضح تعارف کرائے بغیر ابھی تک عراق میں موجود ہے، اور تیسرا دستوری سوشلزم جو تونس کے سربراہ حبیب بورقیبہ نے اختیار کر رکھا ہے۔ اور جو ڈیموکریٹک سوشلزم سے ملتا جلتا ایک نظام ہے۔ چونکہ ہمارا موضوع اس وقت عرب سوشلزم ہے اس لئے ہم آئندہ صفحات میں اسی سوشلزم کے نتائج و ثمرات پر کلام کریں گے۔

مصر کا عرب سوشلزم

عرب سوشلزم کے نتائج و ثمرات معلوم کرنے کے لئے ہم مصر کا انتخاب کرتے ہیں۔ شام کے بارے میں ہم کسی قدر سادہ اشارات کر چکے ہیں۔ اس لئے اس پر مزید گفتگو کی ضرورت نہیں ہے۔ مصر چونکہ اس وقت اپنے آپ کو "عرب سوشلزم" کا امیر، ادر معلّم اول اور ہراول دستہ شمار کرتا ہے اس لئے ہم مصر کے سوشلزم پر ذرا تفصیل سے بحث کریں گے۔ اس بحث کو ہم دو بڑے عنوانوں پر تقسیم کرتے ہیں۔ ایک مصر پر سوشلزم کا داخلی اثر اور دوسرا خارجی اثر بلے

مصر میں سوشلزم کے داخلی اثرات و نتائج

داخلی طور پر سوشلزم کا سب سے پہلا اور دُور رس اثر یہ پڑا کہ مصر مستقل طور پر آمریت کے چنگل میں چلا گیا۔ ۱۹۵۲ء میں مصر میں فوجی انقلاب برپا ہوا تھا۔ ۱۹۶۱ء تک یہ انقلاب "عرب نیشنلزم" کا متبنّیٰ ہونے کا دعویٰ کرتا رہا مگر جب جمال عبدالناصر کی سیاسی پالیسی کے قبلہ میں تحویل ہو گئی اور روس سے رشتۂ مودت استوار ہوا تو "انقلاب مصر" نے "عرب سوشلزم" کا سپوت ہونے کا اعلان کر دیا۔ بہرحال سوشلزم اور آمریت لازم اور ملزوم ہیں۔ اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ سوشلزم کو آمریت کی ضرورت ہے یا آمریت سوشلزم کی محتاج ہے۔

بیوروکریسی اور آمریت کا استحکام

مصری انقلاب کو آج چودہ سال ہونے کو ہیں مگر آج تک وہاں مستقل دستور نافذ نہیں کیا گیا۔ ۱۹۵۲ء کے فوجی انقلاب نے فاروق کے عہد کا دستور منسوخ کر دیا۔ اور ۱۹۵۵ء میں ایک عارضی دستور وضع کیا گیا۔ ۱۹۶۲ء کے قریب اس دستور کو بھی فارغ خطی دے دی گئی اور "میثاق" کی تدوین ہوئی۔ یہ میثاق دستور نہیں ہے بلکہ سوشلسٹ انقلاب کی بائیبل ہے۔ اور آئندہ جو دستور بھی وضع کیا جائے گا وہ اسی میثاق سے اپنی بنیادیں اخذ کرے گا۔ مگر آج تک دستور وضع نہیں کیا گیا۔ ایک عارضی دستور پر گزر اوقات ہو رہی ہے۔ ۱۹۶۴ء میں صدر عبدالناصر نے کہا تھا کہ "ملک میں ۱۲ سال سے مارشل لا نافذ ہے۔ ان ۱۲ سالوں میں بعض لوگ خوب پھل پھول گئے ہیں" تہ اور آج تک مارشل لا کی حکمرانی ہے۔ اور بعض اور لوگوں کو "پھلنے پھولنے" کا موقع مل رہا ہے۔ کیا کسی اور سوشلسٹ یا غیر سوشلسٹ ملک کی مثال پیش کی جا سکتی ہے جس نے ۱۴ سال بے دستوری کی حالت میں گزارے ہوں اور ابھی اسے کوئی خبر نہ ہو کہ کتنی مدت اور وہ اسی حالت میں رہے گا؟

لیکن یہ صورت حال کسی چوک یا غفلت یا تساہل کی پیداوار نہیں ہے بلکہ یہ اسی فلسفے کی پیداوار ہے جو سوشلزم نے مصر کو عطا کیا ہے۔ مصری سوشلزم کے مفکر ڈاکٹر یحییٰ عویس نے اس الجھن کو دور کر دیا ہے۔ ڈاکٹر یحییٰ عویس "سوشلسٹ معاشرہ" کے زیر عنوان لکھتا ہے: "جب ہم نے یہ تسلیم کر لیا کہ سوشلسٹ انقلاب

لہ عرب سوشلزم کے داخلی اثرات تو ہم نے اس مضمون میں کسی حد تک بیان کر دیئے ہیں۔ لیکن خارجی اثرات کا پورا باب اس مضمون میں شامل نہیں کیا گیا۔ یہ مضمون جب کتابی شکل میں چھپے گا تو اس میں اس باب کا اضافہ کر دیا جائے گا۔

تہ ۲۳ دسمبر ۱۹۶۴ء کو اسکندریہ میں جمال عبدالناصر کی تقریر بحوالہ "بیانات و تشابہات" ص ۱۲

کی بنیاد و سائل پیداوار کو قومی ملکیت میں لے لینا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسا نظام کامیاب ہو سکتا ہے اور کیا ایسا نظام ڈیموکریسی کی روح کے ساتھ چل سکتا ہے؟ دراصل سوشلسٹ معاشرے کی صنعتی ترقی کا دار و مدار اسی سوال کے جواب پر موقوف ہے"۔ اس کے بعد مصنف لکھتا ہے کہ "سوشلسٹ اکانومی کی تنظیم کے طریقہ پر بحث کرنے سے پہلے ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ایک "مرکزی اقتدار" ہی صنعتی نظام اور زرعی پیداوار کو اس راستے پر چلانے کا بیڑا اٹھا سکتا ہے جو معاشرے کو زیادہ سے زیادہ اقتصادی خوشحالی سے ہمکنار رکھے ...... اس مرکزی اقتدار کا فرض ہے کہ وہ افراد کی ضروریات کا مطالعہ کرے اور اَولاً فَاَولاً کے لحاظ سے ان ضروریات کی ترتیب قائم کرے اور پھر ایسے منصوبے وضع کرے جو معاشرے کے لئے اصل اہمیت کی اشیاء کی پیداوار کے لئے ضروری ہیں"[1] مصنف نے "مرکزی اقتدار" کو "عظماء کی ڈکٹیٹر شپ" سے بھی تعبیر کیا ہے۔ اور لکھا ہے "عظماء کی ڈکٹیٹر شپ" صحیح اور درست تجویز ہے کیونکہ اگر یہ ڈکٹیٹر شپ وجود میں نہ آئے تو حریت معدوم ہو جائے گی اور بورژوا ڈکٹیٹر شپ قائم ہو جائے گی"[2] عظماء کی ڈکٹیٹر شپ سے مصنف کی مراد پرولتاریا کی ڈکٹیٹر شپ ہے۔

"مرکزی اقتدار"[3] اور "پرولتاریہ کی ڈکٹیٹر شپ" سوشلزم کے لئے ناگزیر ضرورت ہے۔ اور اگر مصر اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے دستور اور جمہوری نظام سے محروم ہے تو ایک سوشلسٹ ملک ہونے کی حیثیت سے یہ کوئی نامکمل الوقوع بات نہیں ہے۔ مصر میں یہ مرکزی اقتدار جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے وہ یہ ہیں:

> "مصر کا نظام حکومت ناصریت پر مبنی ہے۔ اس ناصریت کی پشت پناہی قاہرہ کرتا ہے۔ اور اس نظام نے جن لوگوں کے ہاتھ میں قیادت دے رکھی ہے وہ جی حضوریوں، خوشامدیوں، طالع آزماؤں، سرکاری ایجنٹوں اور خفیہ پولیس افسروں کا ایک گروہ ہے"۔[4]

ان پرولتاریوں کے ساتھ بیوروکریسی نے مفاہمت کر رکھی ہے۔ قاہرہ کے اخبار روز الیوسف کے مطابق "مصر میں بیوروکریسی دیو استبداد کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ تمام قوم کو اس نے پاؤں کے نیچے لے رکھا ہے۔ اس نے داہنے ہاتھ میں عصا اٹھا رکھا ہے اور کھلیاں نکال کر یہ اعلان کر رہی ہے کہ کون ہے جو میرے سامنے اُف کر سکے"[5] "یہ بیوروکریسی مصر میں غیر ملکی سرمائے کی راہ میں حائل ہے۔ کیونکہ غیر ملکی فرمیں مصری بیوروکریسی کے بارے میں طرح طرح کے شکوک میں مبتلا ہیں"[6] جب مصر اور شام کا اتحاد قائم ہوا تو مصر کی طرف سے شام میں جس نوعیت کی حکومت کا اعلان کیا گیا اور متحدہ عرب جمہوریہ کے صدر کو جو اختیارات اور حقوق دیئے گئے وہ اس شکل و نوعیت کے تھے:

> اجتماع، نقل و حرکت اور نظام اقامہ کی آزادی پر پابندی، مخصوص مقامات پر مخصوص اوقات میں آمد و رفت کی ممانعت، مشکوک اشخاص اور امن عامہ کے لئے خطرہ پیدا کرنے والوں کی گرفتاری، عدالتی کارروائی کئے بغیر اشخاص اور مقامات کی تفتیش کی اجازت، کسی بھی شخص کو کسی نوعیت کا کام سونپ دینا، رسائل و اخبارات کا سنسر کرنا، ان کو خلاف قانون قرار دینا اور جن مطابع میں چھپتے ہوں اُن کو ضبط کر لینا، پبلک مقامات کو کھولنے اور بند کرنے کے اوقات کا تعین کرنا اور منقولہ اور غیر منقولہ جائداد

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب "الاشتراکیۃ" تالیف ڈاکٹر یحیٰ عویس، مطبوعہ دار المعارف قاہرہ، ص ۷۵ - ۷۹۔ [2] ایضاً ص ۱۰۵

[3] پاکستان میں ایک صاحب نے اسی مفہوم کے لئے "مرکز ملت" کی اصطلاح وضع کی ہے۔

[4] ملاحظہ ہو بعث پارٹی کی نیشنل کمان کا بیان مجریہ ۲۸ ستمبر ۱۹۶۳ء بحوالہ کتاب "یوماں لاتیشابہان" ص ۶۴

[5] ..... روز الیوسف، قاہرہ، شمارہ ..... ۱۹۶۵ء [6] "یوماں لاتیشابہان" ص ۸۰

پر قبضہ کر لیا...

یہ تو شام پر مصر کی آمریت کا نقشہ ہے۔ اب خود مصر میں شہری آزادیوں اور جمہوریت کے دعووں کی جو درگت بن رہی ہے اُسے ایک عرب مصنف کی زبان سے سنیئے:

"فاروق کے دور میں سیاسی آزادی تھی جس کا اظہار متعدد آزاد اخبارات، سیاسی پارٹیوں، اور دوسری سوشل تنظیموں اور گروہ بندیوں سے ہوتا تھا۔ ان میں سرکار کے حامی بھی تھے اور مخالف بھی۔ تقریر و خطابت اور تحریر و اجتماع کی آزادی بڑی حد تک محفوظ تھی۔ ملک کے اندر نمائندہ اسمبلی موجود تھی۔ جو اپنی تمام خامیوں کے باوجود عوام کے خلجان، ان کی خواہشوں اور اُن کی ناراضگیوں کی ترجمانی کرتی رہتی تھی۔ مگر آج "نفط" اُسی طرح قومی ملکیت میں لے لیا گیا ہے جس طرح ملکی پیداوار، درآمد و برآمد اور مارکیٹنگ قومی تحویل میں لے لی گئی ہے۔ صحافت کو بڑے بھونڈے اور شرمناک طریقے سے قومی ملکیت میں لیا گیا ہے۔ ایسے طریقے کی تشدد پیشہ ڈکٹیٹرشپ کے سوا کوئی اور اجازت نہیں دے سکتا۔"[2] امین الحافظ نے مصر کے نظام حکومت کے بارے میں کہا ہے کہ: مصری حکام کے پیش نظر تسلط ہے۔ وہ دوسروں کو سرنگوں کر کے رکھنا چاہتے ہیں۔ دجل اور فریب ان کا شعار ہے۔ لیکن میں یقین سے کہتا ہوں کہ آقا (یعنی شامی قوم) کبھی غلام بن کر نہیں رہ سکتا۔[3] الغرض مصر کا سوشلسٹ انقلاب اقتصادی نظام میں بیوروکریسی کو توسیع دینے سے عبارت ہے۔ اس نئے نظام نے قوم کی اکثریت کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے بجائے حکومت کے سرمایہ کا دست نگر بنا دیا ہے۔[4] اس نظام میں قانون کا ماخذ دو چیزیں ہیں ایک اسلحہ اور دوسرا ریڈیو۔[5]

سوشلزم میں مخالفین کا انجام

اس نظام کا خاصہ ہے کہ وہ مخالفین کے وجود کو برداشت نہیں کرتا۔ چنانچہ مصر کا چودہ سالہ فوجی آمریت کا دور اور خاص طور پر چھ سالہ "عرب سوشلزم" کا دور ایسے واقعات سے بھرا پڑا ہے۔ فوج اور سول کے متعدد افراد کو جبراً برطرف کیا گیا ہے۔ اور کسی ایسے فرد کو معاف نہیں کیا گیا جو داخلی یا خارجی معاملات میں "مرکزی اقتدار" سے اختلاف رکھتا ہو۔ اخوان المسلمون کے رہنما سید قطب اور ان کے دوسرے ساتھی صرف اس جرم میں پھانسیوں پر لٹکا دیئے گئے کہ انہوں نے مصری معاشرے کے لئے سوشلزم کے نظریہ کو نامناسب اور غیر فطری قرار دیا تھا۔ فوجی آمریت پر تنقید کی تھی۔ اور ملک کے اندر اسلام کے احیاء اور اسلامی شریعت کو غالب کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔[6] اخوان کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ رجعت پسند تھے اور شروع ہی سے مصری انقلاب کی مخالفت کرتے چلے آ رہے ہیں۔ لیکن انقلاب کے بانی جمال عبدالناصر کے دست راست اور ۱۴ سال تک انقلاب کے پشت پناہ بن کر رہنے والے بھی اس سے محفوظ نہیں رہ سکے۔ عبداللطیف بغدادی اور کمال الدین حسین، جمال عبدالناصر کے نائب رہ چکے ہیں۔ لیکن یمن کے مسئلے پر جب انہوں نے مصر کی سیاست سے اختلاف کا اظہار کیا تو انہیں برطرف کر دیا گیا۔ ان کی مخالفت اس بنیاد پر تھی کہ "مصر میں سوشلزم برپا کرنے کا یمن لانے کا کیا حاصل ہے جب کہ یمن میں مصر نے ۱۹۶۲ء سے ۴۰ ہزار کی تعداد میں فوج بٹھا رکھی ہے۔ اور حکومت ان پر ۷۰ کروڑ پونڈ صرف کر چکی ہے۔"[7] یہ اعتراض اگرچہ معقول تھا اور نیشنل اسمبلی میں اگر اس پر بحث کی جاتی تو بالیقین اکثریت کمال الدین حسین اور عبداللطیف بغدادی کی تائید کرتی مگر عرب سوشلزم کے نقطہ نظر کے تحت "مرکزی اقتدار" پر نکتہ چینی ترقی کی راہ میں مانع ہے۔ لہٰذا نکتہ چیں حضرات کو یک بینی و دو گوش ایوان حکومت سے باہر نکال دینا چاہیئے۔ ہمارے علم کی حد تک یہ دونوں حضرات ۱۴ سال سے بطلِ مصر کے ساتھ رہے ہیں اور

---

[1] ملاحظہ ہو قانون متحدہ عرب جمہوریہ نمبر ۱۲۲ (۱۹۶۲ء) بحوالہ "ماذا یجری فی سوریۃ" تالیف نزار عرابی، مطبوعہ دار الفکر، دمشق [2] احمد فؤاد الیمانی، "بریان لا یشاھبان" ص ۱۵۸ [3] ۱۷ اگست ۱۹۶۳ء کو حمص میں امین الحافظ کی تقریر کا اقتباس بحوالہ "بریان لا یشاھبان" ص ۵۵

[4] الاشتراکیۃ فی التجارب العربیۃ ص ۲۴ [5] ان امور کی تفصیل کے لئے سید قطب شہید کی کتاب "معالم فی الطریق" کا مطالعہ کر لیا جائے۔

[6] الاشتراکیۃ فی التجارب العربیۃ - مقالہ جبران شامیہ، ص ۱۱۲

پہلی مرتبہ انہوں نے اختلاف کی جرأت کی تھی - یہ تو وہ لوگ ہیں جن کی حکومت میں نمایاں حیثیت رہی ہے۔ لیکن فوج اور سول کے بکثرت افسروں کا یہی حشر ہو چکا ہے۔ اور ہو رہا ہے۔ مگر کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو پاتی۔ اور نہ کسی نمائندہ اسمبلی میں اس پر بحث ہو سکتی ہے اور نہ انصاف و عدل کا کوئی ایسا ادارہ موجود ہے جس سے کوئی مظلوم نالش کر سکے۔ بعض یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ ۲۳ جولائی ۱۹۵۲ء کو جب فوجی انقلاب برپا ہوا تو اس کو برپا کرنے والوں میں سے آج ایک تہائی سے بھی کم لوگ مسندِ حکومت پر نظر آ رہے ہیں، وہ کہاں گئے؟ اور کس نے انہیں ہضم کر لیا۔ ؟ کیا عوام کا یہ فطری حق نہیں ہے کہ وہ ان کے انجام کے بارے میں دریافت کریں ؟ — اور کیا حرج ہے اگر یہ صاف اعلان کر دیا جائے کہ ان لوگوں کو ۱۲ سالہ مارشل لاء ہڑپ کر گیا۔ عرب کا نامور فوجی ماہر میجر جنرل محمود شیت خطاب لکھتا ہے :

" قوم اور وطن کا کوئی بھی خیر خواہ یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ عرب فوج اعلیٰ صلاحیت کے قائدین کی کثیر تعداد سے محروم کر دی گئی ہے - کیونکہ ان قائدین کا گناہ یہ تھا کہ وہ پارٹی بازی کی رو میں بہنے کے لئے تیار نہ تھے - یا بر سر اقتدار پارٹی کے کسی ذمہ دار شخص کی انہوں نے بلا وجہ خوشامد نہیں کی - یا انہوں نے پارٹی کے نعروں سے فائدہ نہیں اٹھایا، یا وہ جلسوں اور تقریبوں میں حاضری دینے پر اس لئے راضی نہ ہوئے کہ ان کے فوجی فرض کی ادائیگی میں کوتاہی واقع ہوتی تھی - اور وہ دوسروں کی خوشامد میں تالیاں بجانے میں اپنی توہین محسوس کرتے تھے " [1] نیویارک کے ماہانہ میگزین " ورلڈ اینڈ یو ایس اے ریسرچ " کے نامہ نگار مقیم قاہرہ مسٹر جان لو کا بیان ہے کہ " صدر ناصر اور اُن کے شرکا کے خدشات بڑھتے جا رہے ہیں - اور وہ ان خدشات کو چھپا کر نہیں رکھتے - چنانچہ " تطہیر " کی نئی مہم شروع ہو گئی ہے اور اُن تمام عناصر کی گردنیں ناپی جا رہی ہیں جو مخالفانہ رویہ رکھتے ہیں - پولیس ان تمام مصریوں کی جانچ پڑتال کر رہی ہے جن کی عہد جدید کے بارے میں وفاداری مشکوک سمجھی جا رہی ہے - اور جس طرح ہر ڈکٹیٹر آزمائش میں گھر جانے کے بعد کرتا ہے اسی طرح صدر عبدالناصر بھی " محاصرہ " کر لینے والوں کے خلاف جہاد کرنے کی اپیلیں کر رہے ہیں " [2] صدر ناصر اور ان کے شرکا کے خدشات اور خطرات میں مزید اضافہ وہ مصری کرتے ہیں جو حسرت اور مایوسی میں ڈوبے ہوئے بیرون سے واپس آتے ہیں اور ان کے دلوں میں انتقامی ولولے بھرے ہوتے ہیں [3]

سوشلزم کا پہلا ہتھیار : فوج

" عرب سوشلزم " کا سیاسی نظام تین اداروں پر مشتمل ہے : فوج، واحد پارٹی اور نظام جاسوسی - فوج کا جو گروپ سیاسی معاملات کا کارپرداز ہے وہ مختلف القاب سے متعارف ہے : مثلاً انقلابی کونسل " مقدمۃ الجیش "، " قائدین کا ہراول دستہ " وغیرہ فوج کا اصل مقصد اگرچہ ملک کو بیرونی دشمنوں کے خطروں سے بچانا ہوتا ہے مگر سوشلسٹ نظام کے پیچھے چونکہ اصل طاقت فوج کی ہوتی ہے اس لئے اُسے ملک کے داخلی معاملات میں دخیل ہونا پڑتا ہے - فوج کے استعمال کے بارے میں مصر کے " میثاق " نے خود فیصلہ کر دیا ہے -

" متحدہ عرب جمہوریہ میں مسلح افواج کا رول یہ ہے کہ وہ تعمیر معاشرہ کے کام کی بیرونی خطرات سے حفاظت کرے -
نیز اُس کا یہ بھی فرض عین ہے کہ وہ ہر اُس رجعت پسندانہ کوشش کو کچلنے کے لئے چاق و چوبند رہے جو عوام کو اپنی عظیم امنگوں سے ہمکنار ہونے میں مانع ہو " [4]

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب " طریق النصر " تالیف محمود شیت خطاب، مطبوعہ بیروت -
[2] مسٹر جان لو، بحوالہ " پیرس لا ایستا بہان " ص ۲۷ [3] ایضاً ص ۳۷
[4] ملاحظہ ہو : المیثاق ص ۱۸ -

فوجی افسروں کی طرف سے ملکی معاملات میں عمل دخل کی وجہ سے ملک کے اندر ایک نیا طبقہ وجود میں آگیا ہے جسے "فوجیوں کا طبقہ" کہا جاتا ہے[1] مصری فوج اس وقت دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک عام سپاہی جس کی کمزوری اور پراگندہ حالی اور کس مپرسی کا یہ عالم ہے کہ وہ معمولی تنخواہ پر گذر بسر کرنے پر مجبور ہے۔ اور دوسرا حصہ اُن فوجی افسروں پر مشتمل ہے جو اسراف و تنعّم میں غرق ہیں۔ ملک کی تمام معیشت کا نظم و نسق ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ کسی تجارتی فرم، یا سرکاری ادارے یا صنعتی کمپنی کا کوئی ڈائرکٹر ایسا نہ ملے گا جو غیر فوجی ہو۔ سول معاملات میں فوجی افسروں کی دراندازی سے دو نقصانات ہو رہے ہیں۔ ایک یہ کہ فوج باصلاحیت افراد سے خالی ہوگئی ہے اور دوسرا یہ کہ ملکی انتظامیہ ناتجربہ کار منتظمین کی وجہ سے انتشار اور افراتفری کا شکار ہو گئی ہے۔ عراق کا نامور فوجی ماہر میجر جنرل محمود شیت خطاب انہی حالات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"جو فوج سیاست کے میدان میں کام کرتی ہے اور اپنا اصل فرض ترک کر دیتی ہے وہ فوج نہیں بلکہ ایک سیاسی پارٹی ہے۔ فوج نام ہے نظم و ضبط اور تعاون کا۔ سیاسی فوق فوج کو اس صفت سے محروم کر دیتا ہے۔ دوسری عالمی جنگ میں جرمنی کی ناکامی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ہٹلر نے جرمن فوج کو سیاست میں داخل کر دیا تھا۔ ہٹلر سیاست دان فوجی افسروں پر اعتماد کرتا تھا اور غیر سیاست دانوں پر انہیں ترجیح دیتا تھا۔ یہ لحاظ کئے بغیر کہ آیا ان میں فوجی صلاحیت اور اہلیت بھی پائی جاتی ہے یا نہیں۔"

"مجھے سب سے زیادہ جس بات پر دکھ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ قابل اور ماہر فوجی افسروں کو اصل میدان سے ہٹا کر سیاسی مشغلوں میں مصروف کیا جا رہا ہے اور فوجی ذمہ داریاں کمزور اور نااہل افسروں کے حوالے کی جا رہی ہیں جس طرح نیم حکیم مریض کے لئے پیغام موت ہوتا ہے اسی طرح اناڑی فوجی افسر بھی اپنی سپاہ کو موت کے منہ میں دھکیل دیتا ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ نیم حکیم ایک فرد کے لئے موت بن کر آتا ہے اور اناڑی افسر ملک اور قوم کو فنا کے گھاٹ اتار دیتا ہے"[2]

"فوجی افسروں کا طبقہ" دوسرے طبقات کی نسبت اپنی امتیازی حیثیت کا مدعی ہے۔ اور سیاسی میدان میں احساس کہتری کا شکار ہونے کی وجہ سے عجیب و غریب خرابیوں کو جنم دے رہا ہے[3] اس طبقے نے سرکاری نظم و نسق میں جو گُل کھلا رکھے ہیں وہ مصر کے سابق وزیر اعظم علی صبری (جو اب صدر کے نائب دوم ہیں) کی زبان سے سنیئے:

"متحدہ عرب جمہوریہ کی انتظامیہ خواہ وہ جو حکومت کے تابع ہے اور خواہ وہ جو نگران بورڈ کے تابع ہے شدید تضاد سے دوچار ہے۔ پبلک سیکٹر اور نگران بورڈ کے مابین تضاد ہے۔ مملکت کے تمام شعبوں کے مابین تضاد ہے۔ ہر سیکٹر کے لئے جو انتظامی کونسلیں بنی ہوئی ہیں ان میں باہمی تضاد پایا جاتا ہے۔ کمپنی اور کمپنی کے درمیان تضاد کار فرما ہے"[4]

کامیاب حکومت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس کی سیاسی اور انتظامی پالیسی ہم آہنگ اور مربوط ہو۔ ایک شعبہ دوسرے شعبہ کے لئے

---

[1] سقوط الثورات الاشتراکیة ص ۷۲۔ [2] "طریق النصر" تالیف محمود شیت خطاب۔ موصوف عراق میں منصوبہ بندی کے وزیر بھی رہ چکے ہیں۔
[3] سقوط الثورات الاشتراکیة ص ۵۷۔ [4] روزنامہ الاہرام، قاہرہ، شمارہ [illegible] ستمبر [illegible] روزنامہ الاہرام سے علی صبری کا انٹرویو۔

معاملہ ہو، پورا نظم و نسق ہمہ گیر منصوبہ بندی کے تابع ہو۔ اور قطرہ قطرہ متحد ہو کر ندّاں دواں شکل میں بہہ رہا ہو۔ علی صبری سابق وزیر اعظم مصر کے بیان کے بموجب مصر کا سوشلسٹ نظام اس خوبی سے جاری ہے۔ بلکہ اس کے برعکس وہ باہمی تصادم اور تحارب میں مبتلا ہے۔ گویا "طوائف الملوکی" کا دور دورہ ہے۔ اور بیوروکریسی اس صورت حال سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہی ہے۔ ۱۲ نومبر ۱۹۶۲ء کو صدر جمال عبدالناصر نے بھی نیشنل اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے یہ اعتراف کیا ہے کہ "مصر کی سوشلسٹ سوسائٹی میں ملازمین کی سستی اور ان کی فنی اور انتظامی نا اہلی کی وجہ سے نئے نئے تضادات ابھر آئے ہیں"[1] فنی اور انتظامی لحاظ سے نا اہل ملازمین سے صدر ناصر کی مراد فوجی، افسروں کا وہ گروپ ہے جو سول ایڈمنسٹریشن پر قابض ہے[2]

دوسرا ہتھیار : نظام جاسوسی

مصر میں جاسوسی کا نظام اس قدر وسیع اور پیچیدہ ہے کہ ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کا مخاطب جاسوس ہو سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قاہرہ کی ۴۰ لاکھ کی آبادی میں ایک لاکھ افراد جزوی یا کلی طور پر جاسوسی کی خدمات سرانجام دیتے ہیں۔ اس "افواہ" نے ہر شخص کے دل میں عدم اعتمادی کی فضا پیدا کر دی ہے۔ باپ کو بیٹے کے بارے میں اور بیٹے کو باپ کے بارے میں یہ وہم لاحق ہو چکا ہے۔ سوڈان کے نامور رہنما سید میرغنی لکھتے ہیں: "اگر ریاست از سرتا پا پولیس کے نظام میں تبدیل ہو جائے اور جاسوسی اور مخبری کا جال اس قدر وسیع پیمانے پر پھیلا دیا جائے کہ ایک شخص ہر وقت اپنے خلاف جاسوسی کے خوف میں مبتلا ہو۔ اُسے نہ بھائی پر اعتماد ہو، نہ باپ پر، اور نہ کسی دوست پر اُسے ٹیکسی ڈرائیور، گھریلو ملازم، ہوٹل کے خادم حتیٰ کہ جوتوں کی پالش کرنے والے سے بھی جاسوسی کا خطرہ ہو تو ایسے نظام حکومت کو کیسے جمہوری کہا جا سکتا ہے۔ لیکن مصر میں عملاً یہی صورت حال پائی جاتی ہے۔ اس وقت مصر کا کوئی باشندہ کسی دوسرے ملک میں تجارت یا ملازمت یا اعزہ و اقارب کی ملاقات یا محض سیر و تفریح کی غرض سے آزادانہ مصر سے باہر نہیں جا سکتا۔ اس بارے میں حکومت نے غیر معمولی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں"[3]

تیسرا ہتھیار : واحد پارٹی

مصر کی واحد پارٹی "عرب سوشلسٹ یونین" ہے (الاتحاد الاشتراکی العربی) جولائی ۱۹۶۱ء میں ملک کے اندر اشتراکی قوانین کے اجراء کے بعد یہ تنظیم قائم کی گئی ہے۔ اس وقت اس یونین کا دستور اور نظام ہمارے سامنے ہے۔ مصر کے میثاق اور یونین کے دستور کو یکجا شائع کیا گیا ہے[4] دستور کی رو سے "عرب سوشلسٹ یونین" کی حیثیت "سوشلسٹ ہراول دستہ" کی ہے[5]۔ یہ دستہ جمہور کی قیادت کرے گا، اور جمہور کے ارادوں کا ترجمان ہوگا، وطنی کوششوں کی رہنمائی کرے گا، اور وطنی کوششوں کو میثاق کے تقاضوں کے تحت صحیح سمت جاری رکھنے کے لئے بھرپور نگرانی کرے گا۔ اس کا یہ فرض بھی ہوگا کہ وہ ملک کے اندر "محفوظ ڈیموکریسی"[6] بروئے کار لائے۔ محفوظ ڈیموکریسی کے لئے اس نے "اجتماعی لیڈرشپ" کا راستہ تجویز کیا ہے۔ یونین کا ایک مقصد یہ بھی ہوگا کہ وہ مختلف ایسوسی ایشنز کی پشت پناہی کرے گی۔ یونین نے اپنے بنیادی فرائض یہ متعین کئے ہیں:

۱ - انقلابی عمل کے لئے ایجابی طاقت فراہم کرنا۔
۲ - انقلاب کے مقاصد کا تحفظ۔

---

[1] الاشتراکیۃ فی التجاریب العربیۃ ص ۱۱۵ [2] ایضاً ص ۱۱۵ [3] روزنامہ الندوہ۔ مکہ شمارہ ۱۲ دسمبر ۱۹۶۱ء

[4] مطبوعہ الدار القومیۃ للطباعۃ والنشر شارع الصحافۃ، قاہرہ ۔ الطلیعۃ الاشتراکیۃ [5] دنیا پہلے کنٹرولڈ ڈیموکریسی (اسکندر مرزا) اور "گائیڈڈ ڈیموکریسی" (سوکارنو) کی اصطلاحوں سے تو واقف ہو چکی ہے۔ اب اس نئی سوشلسٹ اصطلاح "سیف ڈیموکریسی" سے بھی اُسے متعارف ہو جانا چاہیئے۔

۳ - سرمایہ داری اور جاگیرداری کے نشانات کو مٹانا۔

۴ - رجعت پسندی کی سرکوبی۔

۵ - سلبی اور منحرف افکار رکھنے والوں کا قلع قمع

ان میں سے ہر ہر مقصد نہایت واضح ہے۔ یونین کے دستور نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ یونین "قوم کی محنت کش قوتوں پر مشتمل ہوگی۔ اور محنت کش قوتوں سے مراد کسان، مزدور، فوج اور تعلیم یافتہ نوجوان ہیں۔ دستور نے فوج کے لئے یونین کے دروازے کھلے رکھے ہیں۔ دستور میں یونین کے لئے کام کے اصول و ضوابط مقرر کئے گئے ہیں۔ ان میں بتایا گیا ہے کہ "یونین وطنی کوششوں کا جامع سیاسی نظام ہوگی" یعنی ملک کے اندر سیاست گری کا حق صرف یونین کو ہوگا۔ علاوہ ازیں یونین کا کام یہ ہوگا کہ وہ ملک کی لیڈرشپ اور سوشلسٹ ہراول دستہ اور جمہوریت کے درمیان ڈسپلن اور سمع و طاعت کا نظام مضبوط کرے۔ انقلابی کمان کے لئے اخلاص، اس کے کارناموں کے لئے تحفظ اور سوشلسٹ ہراول دستہ کے لئے سچی وفاداری کی فضا پیدا کرے۔ یونین کو عوامی طاقت قرار دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ "عرب سوشلسٹ یونین" جو پالیسی وضع کرے گی نیشنل اسمبلی اور دوسرے سنڈیکیٹیز کا کام اُسے نافذ کرنا ہوگا۔ یونین عوامی طاقت ہونے کی حیثیت سے قیادت و رہنمائی کا فرض بھی سرانجام دے گی اور قوم کے نام پر اس بات کی نگرانی بھی کرے گی کہ کیا اُس کی وضع کردہ پالیسی کو نافذ کیا جا رہا ہے۔ یونین کی ممبرشپ کے لئے جو صفات بیان کی گئی ہیں اُن کے مطابق کوئی ایسا شخص اس کا ممبر نہیں بن سکتا جو "نفع اندوز" کی تعریف میں آتا ہو۔ یونین کے ممبروں کے فرائض بیان کرتے ہوئے ہدایت کی گئی ہے کہ ان کا کام یونین کی تنظیموں کے فیصلوں کا بغور اور مسلسل مطالعہ کرنا اور دوسروں کے لئے اُس کی تشریح کرنا ہوگا۔ نیز اُسے ایک آئیڈیل سوشلسٹ ورکر" بن کر رہنا چاہیئے تاکہ دوسرے اس کی تقلید کریں۔ اسی طرح وہ جہاں کہیں سوشلسٹ انقلاب کا کوئی دشمن دیکھے پوری طاقت کے ساتھ اُس کے خلاف ایکشن لے۔[1]

یہ ہیں چند بنیادی نقطے جو "عرب سوشلسٹ یونین" کے دستور میں سے ہم نے بطور نمونہ بیان کر دیئے ہیں۔ اس دستور کے مطابق عرب سوشلسٹ یونین دراصل انہی اختیارات کی حامل ہے جو روس یا چین یا دوسرے کیمونسٹ ممالک میں کیمونسٹ پارٹی کو حاصل ہوتے ہیں۔ البتہ عرب سوشلسٹ یونین کا یہ دعویٰ کہ وہ عوام کی نمائندہ جماعت ہے یہ دلیل طلب دعویٰ ہے ڈاکٹر عمر حلیق لکھتے ہیں:

> مصر کے زراعت پیشہ عوام اور کارخانوں کے اندر مزدوری کرنے والے محنت کش عرب سوشلسٹ پارٹی کی عوامی تنظیموں سے کوسوں دور ہیں۔ اس پارٹی کا سارا دارومدار چند موقع پرست افراد پر ہے جو مختلف ایسوسی ایشنز سے وابستہ ہیں۔ نوخیز طلبہ کا ایک گروہ بھی اس میں شامل ہے۔ اور کچھ وہ لوگ ہیں جو دنیائے سیاست میں نئے نئے آشنا ہیں۔ یہ تمام عناصر سوشلسٹ نظریات کا پروپیگنڈا کرنے والے اخبارات سے فکری غذا حاصل کرتے ہیں[2]

مصر کی کیمونسٹ پارٹی نے بھی اپنا وجود ختم کر کے عرب سوشلسٹ یونین میں اپنے آپ کو مدغم کر لیا ہے[3] عرب سوشلسٹ یونین کی سب سے بڑی طاقت وہ سفید پوش پولیس ہے جو یہ رپورٹیں فراہم کرتی ہے کہ ملک کے اندر کہاں کہاں سوشلسٹ انقلاب کے مخالفین اور رجعت پسند عناصر کے حلقے پائے جاتے ہیں۔ رہے عوام تو وہ سوشلزم اور سوشلسٹ یونین سے بری ہیں۔ عوام کی اشتراکیت بیزاری کا اعتراف خود صدر جمال عبدالناصر کو بھی ہے۔ جمال عبدالناصر نے مصر

---

[1] ملاحظہ ہو: قانون الاتحاد الاشتراکیہ بحوالہ المیثاق: از ص ۱۱۳ تا ۱۱۸
[2] ڈاکٹر عمر حلیق: الاشتراکیۃ فی التجارب العربیۃ ص ۸۸
[3] التضلیل ص ۹۴

میں اشتراکی احکام کے اجراء کے بعد ایک پریس کانفرنس میں ایڈیٹروں کو نصیحت کی تھی کہ "ہماری صحافت کا فرض ہے کہ وہ عوام کو کھینچ کھینچ کر سوشلسٹ معاشرے میں شریک کرے۔" [1]

دین کے بارے میں عرب سوشلزم کا رویہ

اب ہمیں ایک نظر یہ دیکھنا چاہئیے کہ دین کے معاملے میں عرب سوشلزم نے کیا رویہ اختیار کر رکھا ہے۔

"میثاق" کے اندر راقم الحروف نے بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ دین کا مقام تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ میثاق کے تیسرے باب میں مصر کی تاریخی کش مکش کا جائزہ لیا گیا ہے اور آغاز ہی میں بتا دیا گیا ہے کہ "فراعنۂ مصر کا دور مصری تہذیب اور قدیم انسانیت کا بانی تھا۔"[2] اس بیان سے اندازہ ہوا کہ میثاق فراعنہ تہذیب کو آئیڈیل بلکہ پہلی انسانی تہذیب کا بانی قرار دیتا ہے۔ اس کے بعد پورے میثاق میں کہیں دین کو سوشلسٹ معاشرے میں رہنما قوت کی حیثیت نہیں دی گئی۔ دین کے بارے میں میثاق نے جن نظریات کا اظہار کیا ہے وہ یہ ہیں۔

"تمام ادیان اپنے جوہر کی رُو سے زندگی کے حقائق کے ساتھ متصادم نہیں ہوتے ہیں۔ بعض حالات میں یہ تصادم قدامت پسندوں کی کوششوں کی وجہ سے برپا ہوجاتا ہے جو دین کا ناجائز استعمال کرتے ہیں۔ اور دین کی روح اور مزاج کے خلاف ترقی کے راستے کا روڑا بن جاتے ہیں۔ اور دین کی ایسی تعبیریں کرتے ہیں جو دین کی بالا و برتر حکمت سے ٹکراتی ہیں۔"

"تمام ادیان ترقی پسند تھے۔ لیکن قدامت پرست نے جو زمین کی دولت اپنی اجارہ داری میں رکھنا چاہتے تھے اپنی خواہشوں پر دین کا پردہ ڈالنے کا جرم کرتے رہے ہیں۔ اور ترقی کی رفتار کو روکنے کے لئے دین کے اندر سے وہ مفہوم نکالتے رہے ہیں جن سے خود دین ابا کرتا ہے۔"

"تمام ادیان اپنے جوہر کے لحاظ سے انسان کے جینے اور آزاد رہنے کے حق کی توثیق کرتے رہے ہیں۔ بلکہ دین میں ثواب اور عذاب کی بنیاد بھی ہر انسان کے لئے یکساں مواقع کی فراہمی ہے۔"[3]

یہ عبارت ذیل کے نکات پر مشتمل ہے۔

۱۔ میثاق نے جسے دستوری حیثیت حاصل ہے مصر کی غالب اکثریت کے دین یعنی اسلام کو سرے سے چھوا تک نہیں ہے۔ انقلاب سے پہلے مصر میں جو دستور رائج تھا اُس میں الفاظ کی حد تک اسلام کو ریاست کا سرکاری دین قرار دیا گیا تھا مگر میثاق نے یہ لفظی اعتراف بھی گوارا نہیں کیا

۲۔ میثاق کے نزدیک اسلام بھی اُسی طرح کا ایک دین ہے جس طرح یہودیت اور عیسائیت ہے۔ تمام ادیان کو میثاق نے ایک ہی ترازو سے تولا ہے۔ یہ حقیقت کہ اسلام کامل اور ہمہ گیر اور آخری دین ہے میثاق نے اس کا اعتراف نہیں کیا ہے۔ بلکہ اس کی نگاہ میں یہودیت، عیسائیت اور اسلام یا رسالت محمدی سب برابر ہیں۔

۳۔ میثاق اُن تمام لوگوں کو جنہوں نے دین کی تعبیر و تشریح کی ہے، اور تاریخ اسلامی کے ہر دور میں مختلف پہلوؤں سے دین کی خدمات سر انجام

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب: البناء الاشتراکی تالیف صبری ابو المجد ص ۲۸۵، مطبوعہ قاہرہ۔

[2] المیثاق، باب سوم، ص ۱۷ [3] المیثاق، ص ۸۷

دی ہیں، اسلامی قانون کی تشریح وتفصیل میں انبار کے انبار لگا دئیے ہیں ــــــ ان تمام لوگوں کو قدامت پرست کہہ کر ترقی کے راستہ کا روڑا سمجھا ہے۔ گویا میثاق کی نظر میں اسلامی تاریخ کا وہ سنہرا دور جس میں اسلام کا غلغلہ بلند رہا اور علما نے علم وثقافت کے میدان میں وہ عظیم کارنامے سرانجام دیئے جن کا اعتراف یہودی مستشرقین کو بھی ہے، ترقی سے عاری دور تھا۔ کیونکہ علماء زمین پر انفرادی ملکیت کے قائل رہے ہیں۔

۴۔ میثاق صرف دین کی روح کا قائل ہے۔ اور دین کی روح یہ ہے کہ انسان کو جینے اور آزاد رہنے کا حق ملے۔ باقی وہ تمام فرائض جو دین انسان پر عائد کرتا ہے وہ دین کی روح کے اندر نہیں پائے جاتے بلکہ قدامت پرستوں نے اپنی طرف سے دین میں داخل کر دیئے ہیں۔

۵۔ تمام ادیان "ترقی پسند" تھے۔ "ترقی پسندی" کا یہاں وہ مفہوم مراد ہے جو سوشلزم متعین کرتا ہے۔ سوشلزم کے نزدیک خدا، رسالت، آخرت اور دوسرے مذہبی عقائد اور اخلاقی ضوابط بوسیدہ قدریں ہیں۔ صرف وہ معاشرہ "ترقی پسند" کہا جا سکتا ہے جس میں سوشلزم اپنے تمام تقاضوں سمیت رائج کیا جاتے۔

۶۔ میثاق کے نزدیک ثواب اور عذاب کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری یا نافرمانی پر نہیں ہے بلکہ اس بنیاد پر ہے کہ انسان کو یکساں مواقع فراہم ہوں۔

چنانچہ صدر جمال عبدالناصر نے ۲۳ جولائی ۱۹۶۱ء کو جب اشتراکی قوانین کا اعلان کیا تو اپنی تقریر میں علمائے دین کو نصیحت کی کہ ان قوانین کے خلاف انہیں کسی قسم کا شرعی فتویٰ صادر کرنے کا حق نہیں ہے۔ ایسا فتویٰ دینے والوں کے بارے میں انہوں نے کہا کہ یہ لوگ جاگیرداروں، رجعت پسندوں[1] اور سرمایہ داروں کے آلہ کار ہیں۔ اور مرغی کے دو چوزوں کے عوض فتویٰ صادر کر دیتے ہیں"[1] اسی تقریر میں صدر ناصر نے پھر خود ہی یہ فتویٰ صادر کیا کہ "سیدنا محمد نے جو ریاست قائم کی تھی وہ پہلی سوشلسٹ اسٹیٹ تھی"[2]

مصری سوشلزم کے مفکر ڈاکٹر یحییٰ عویس نے بھی سوشلزم کے اصولوں پر جس معاشرے کے قیام کا نقشہ پیش کیا ہے اس میں دینی جذبات وافکار کا مستقبل تاریک ہے۔ وہ لکھتا ہے "جو سوسائٹی دینی اور نسلی افکار کو ابھرنے کا موقع دیتی ہے وہ فاسد سوسائٹی ہے اور اس کا انجام زوال وانحطاط ہے"[3] اور مصر چونکہ سوشلزم پر نظریں جمائے ہوئے ہے اس لئے "اگر جامد روایات وعادات معاشرے کے تغیر اور ارتقاء میں مانع ہوں تو محفوظ طریقہ یہ ہے کہ ہم انہیں ایک طرف اٹھا کر پھینک دیں، اور معاشرے کو ان تمام بدعات سے پاک کر دیں جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور ان تمام بانجھ افکار کو اگل دیں جو ہم نے گذشتہ نسلوں سے ورثے میں پائے ہیں"[4]

"دینی بدعات" کو اگلنے کا جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے اس کا قاہرہ کے اخبار "المساء" ایک کارٹون میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ مارچ ۱۹۶۲ء میں اس اخبار نے ایک کارٹون چھاپا تھا۔ جس میں ایک مرغ نے اپنے دونوں پر پھیلا رکھے تھے۔ اور نو مرغیاں اپنے نیچے بٹھا رکھی تھیں۔ کارٹون کے نیچے یہ عبارت درج تھی، "محمد صاحب اور نو بیویاں"۔ اس کارٹون کے خلاف پورے عرب ممالک میں احتجاج کیا گیا تھا اور عرب لیگ تک اس کی شکایت کی گئی تھی۔[5]

---

[1] ملاحظہ ہو الندوہ، مکہ مضمون سید میر غنی۔ نیز ملاحظہ ہو التضلیل الاشتراکی ص ۱۰۱ [2] التضلیل ص ۱۰۱
[3] الاشتراکیۃ تالیف یحییٰ عویس ص ۸۳۔ [4] ایضاً ص ۱۵۱
[5] التضلیل ص ۱۰۰

اشتراکی مفکرین نے صرف یہی نہیں کیا کہ علمائے دین سے دین کی تعبیر و تشریح کا حق چھین لیا، بلکہ خود بڑھ کر اسلام کا مفہوم و مدعا بیان کرنا شروع کر دیا۔ علمائے دین کی تعبیر قدامت پرستی سے متاثر تھی۔ اب اشتراکی مفکرین کی ترقی پسندانہ تعبیر ملاحظہ ہو:

جمال عبدالناصر : "ہمارا دین سوشلسٹ ہے۔ اسلام نے قرونِ وسطیٰ میں دنیا کے اندر پہلا اشتراکی تجربہ کیا۔"[1]

ماہنامہ منبرالاسلام[2] : "سوشلزم کو مذہبی رواداری کی بدولت عرب معاشرے کے اندر مناسب فضا مل گئی۔ بلکہ اس معاشرے کے اندر سوشلزم نے اپنے بین الاقوامی قواعد و ضوابط کے اندر بھی مناسب اصلاح کر لی ۔۔۔ اسلام دینِ فطرت ہے اس کی شریعت عمل و اتحاد کا عنوان ہے۔ اس لئے ہمارا عرب سوشلزم دین کے ساتھ چل رہا ہے۔"[3]

احمد حسن زیات : "سوشلزم سے دین مکمل ہوتا ہے۔ اور ایمان کی تکمیل تب ہوتی ہے جب آپ اپنے بھائی کے لئے وہی پسند کریں جو اپنے لئے پسند کرتے ہیں ۔۔۔۔ کیا آپ پختہ یقین رکھتے ہیں کہ سوشلزم اُس وقت تک قائم و دائم رہے گا جب تک ملت قائم رہے گی۔"[4]

محمد عبداللہ العربی : "عرب سوشلزم سائنٹیفک سوشلزم ہے۔ کیونکہ یہ علم سے رہنمائی حاصل کرتا ہے۔ اور علم کی فضیلت کے بارے میں اللہ کا ارشاد ہے کہ "ھل یستوی الذین یعلمون والذین لایعلمون"۔"[5]

ماہنامہ الطلیعۃ : "اسلام میں سوشلزم کا مقام ایسے نظریات اور اصولوں کا مقام نہیں ہے جو آزادیٔ رائے کے تحت بدلتے رہتے ہیں بلکہ یہ وہ ازلی و ابدی حقیقت ہے جس میں رائے کے اختلاف کو دخل نہیں ہے۔"[6]

ابراہیم السباعی : "خدیجہ (رضی اللہ عنہا) سوشلسٹ نظام کی پہلی علمبردار خاتون ہیں۔ خدیجہ نے جو کچھ بھی کیا وہ دراصل عرب ممالک کے اندر ایک نئی سوشلسٹ اسٹیٹ کے قیام کی بشارت تھی۔"[7]

---

[1] التضلیل ص ۳۹

[2] منبرالاسلام "امورِ اسلامی کی اعلیٰ کونسل" کا آرگن ہے۔ یہ کونسل مصر کا سرکاری ادارہ ہے۔

[3] ماہنامہ منبرالاسلام، قاہرہ، شمارہ جون ۱۹۶۵ء

[4] الرسالۃ، قاہرہ، شمارہ ۴ مارچ ۱۹۶۵ء۔ اسی مصنف نے ۱۹۵۰ء میں یہ لکھا تھا کہ اشتراکیت نہ لوگوں کو زمین کا مالک بناتی ہے نہ اُن کے رزق کی [illegible] کر سکتی ہے اور نہ انہیں آزادی سے بہرہ ور کر سکتی ہے۔ اشتراکیت ایک باطل دعوت ہے (الرسالۃ، ۲ مارچ ۱۹۵۰ء)

[5] الرسالہ، ۴ مارچ [illegible]

[6] مجلہ الطلیعۃ شمارہ ۸، ۱۹۶۵ء

[7] ملاحظہ ہو کتاب: "خدیجۃ اُمّ الاشتراکیۃ (خدیجہ مادرِ اشتراکیت)" تالیف ابراہیم السباعی شائع کردہ الدار القومیۃ۔ قاہرہ۔

اسلامی تاریخ کی تعبیر سوشلزم کے نقطہ نظر سے

اور بھی بہت سی سرکاری کتابوں کے اندر سوشلزم کو جزو اسلام بلکہ عین اسلام ثابت کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں مصر کے اشتراکی مفکرین اس اصول کے بھی علمبردار ہیں کہ "تاریخ کی مادی تعبیر تاریخ نویسی کا صحیح ترین اسلوب ہے"[1] چنانچہ ان مفکرین نے اسلامی تاریخ کا بھی مادی نقطہ نظر سے تجزیہ کیا ہے۔ اس تجزیہ کی چند مثالیں یہ ہیں :-

یہ ابھی ہم بیان کر چکے ہیں کہ ان مفکرین کے نزدیک حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سوشلزم کی پہلی علمبردار خاتون ہیں۔ ان کا سوشلزم یہ تھا کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جو مال دے کر تجارت کے لیے شام بھیجا کرتی تھیں اُس کے نفع میں آپ کو شریک کرتی تھیں۔

ماہنامہ "الکاتب" عرب سوشلسٹ یونین کا ترجمان ہے۔ سوشلزم کی تعبیر و تفسیر کی اجارہ داری اسے حاصل ہے۔ جنوری ۱۹۶۵ء سے اس پرچے کے صفحات میں ایک سلسلہ مضامین مسلسل چھپ رہا ہے جس کا عنوان ہے "اسلام میں دائیں بازو اور بائیں بازو کی کشمکش" مصنف نے اس سلسلہ مضامین میں اسلامی تاریخ کو سوشلسٹ ذہن سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ چند اقتباسات یہ ہیں :-

"نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) بائیں بازو کے لیڈر تھے۔ بلکہ بائیں بازو کی سیاست کے اصول آپ نے وضع کیے۔ جیسا کہ ہر انقلاب میں ہوتا ہے اسی دین (یعنی اسلام) کو ماننے والا ہراول دستہ بھی تین رجحانات کا حامل تھا۔ ایک انقلاب پسند بائیں بازو کا رجحان، دوسرا معتدل اور درمیانہ رجحان اور تیسرا قدامت پرست دائیں بازو کا رجحان"

"انقلاب پسند بایاں بازو ناداروں، غلاموں اور آزاد کردہ موالیوں پر مشتمل تھا۔ اسلام کے بارے میں ان کا نقطہ نظر واضح تھا کیونکہ یہ کسی نوع کی ملکیت سے خالی تھے۔ درمیانہ رجحان ان عملی افراد پر مشتمل تھا جن کا کام یہ تھا کہ وہ نبی کی وفات کے بعد اسلام کو اس کشمکش سے بچائیں جو بائیں بازو اور دائیں بازو کے درمیان چھڑنے والی تھی۔ بایاں بازو اسلام کی اُس تعبیر کا قائل تھا جو ہمہ گیر طور پر عدل و انصاف کو بروئے کار لائے۔ جبکہ دائیں بازو کے نزدیک اسلام کا مفہوم یہ تھا کہ یہ طبقاتی تفاوت کو ختم کر دیتا ہے۔ رہا عدل اجتماعی کا وسیع پیمانے پر قیام تو یہ بات دائیں بازو کے پیش نظر نہ تھی"

"نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی میں ان کے مقربین کمزور اور غریب طبقے کے افراد تھے جن کے لیڈر علی ابن ابی طالب (کرم اللہ تعالیٰ وجہہ) تھے مگر جدید ریاست کی بنیادوں کو پائیدار کرنے کے لیے اوپر کی سطح کی سیاسی پالیسی کا تقاضا تھا کہ علی بن ابی طالب ایڈوائزری کونسل میں داخل نہ ہوں۔ اس کونسل کی سرکاری ہیئت کیا تھی جس پر یہ تشکیل کی گئی یہ بات ہم معین طور پر نہیں جانتے"

"اتنا ہمیں معلوم ہے کہ اس کونسل میں انقلاب پرست بائیں بازو کا کوئی نمائندہ ماسوائے علی بن ابی طالب کے شریک نہیں تھا (ملاحظہ ہو اوپر کی عبارت اور اس عبارت کا واضح تضاد) کیونکہ بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے کمزور اور غریب تھے اسلام سے سچی عقیدت کے سوا ان کے پاس کسی نوعیت کی کوئی قوت نہ تھی۔"

"نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عہد میں کونسل کی سرکاری طور پر تشکیل نہیں کی گئی تھی بلکہ اجتہادی طریقے سے اس کی شرائط مستنبط کی گئی تھیں۔ اس اجتہادی

---

[1] الاشتراکیہ، تالیف یحییٰ عویس ص ۹۹

طریقے کے اندر بھی سیاست نے بہت اہم رول ادا کیا تھا۔ زیادہ راجح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ کونسل مسلمانوں پر مجبراً ٹھونسنے کے لیے تشکیل نہیں دی تھی۔"

"بایاں بازو ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کی بے شک قدر کرتا تھا لیکن اس حد تک نہیں کہ انہیں مسلمانوں کی زمام قیادت سونپ دی جائے۔ خاص طور پر جبکہ اسلام کی اجتماعی اصلاحات کا ابھی آغاز نہیں ہوا تھا۔ اسی بنا پر علی بن ابی طالب اور صحابہ کے بائیں بازو کے نمائندہ گروپ نے اُن کی بیعت کی مخالفت کی۔ دایاں بازو بالاتفاق ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کی خلافت اور ایڈوائزری کونسل کا خیر مقدم کر رہا تھا جو ایک اہم طاقت ور سرکاری ادارہ ہونے کی حیثیت سے بیعت ابوبکر کے بعد ہی ظہور پذیر ہوئی تھی (پھر تضاد ملاحظہ ہو)۔ کچھ عرصہ تک یہ کونسل قائم رہی اور بالآخر اس کا کلی خاتمہ ہو گیا۔ اس کے کچھ ارکان وفات پا گئے، کچھ الگ ہو گئے اور کچھ خلافت کے جھگڑے میں باہمی جنگوں میں مارے گئے۔ یہاں تک کہ اقتدار کی باگ ڈور معاویہ (رضی اللہ عنہ) کے ہاتھ آ گئی۔"

"دائیں بازو کی طرف سے خلافتِ ابوبکر کا خیر مقدم کرنا اور اُس کی تائید میں عجلت سے کام لینا یہ مفہوم رکھتا ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت بائیں بازو کے رجحان کی حامی تھی۔ ان کی نمائندگی علی (رضی اللہ عنہ) اور اُن کے رفقاء کر رہے تھے۔ ان کے رفقاء سے ہماری مراد جمہور مسلمین ہیں جو بائیں بازو کے رجحانات کے حق میں تھے۔ اس لیے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) خود ایک بائیں بازو کے لیڈر تھے اور بائیں بازو کی سیاست کے اصول وضع کرنے والے تھے۔"

"جب ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کی وفات ہوئی تو بائیں بازو کی انتہائی خواہش تھی کہ عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) کے لیے بیعت ہو۔ یہ معلوم و معروف ہے کہ بایاں بازو ہمیشہ عجلت کا محتاج ہوتا ہے کیونکہ وہ ہمیشہ بلند ترین آئیڈیالوجی پر ایمان رکھتا ہے اور مصالحت کی طرف بھی اسے جھکنا پڑتا ہے خاص طور پر ان حالات میں جب انقلاب مسلسل ہچکولے کھا رہا ہو۔ چنانچہ اس مرحلے پر بھی بائیں بازو کو عجیب و غریب موقف اختیار کرنا پڑا۔ یعنی پہلے بائیکاٹ کا موقف اختیار کیا پھر مصالحت کا اور پھر موافقت کا۔ یہ اس وجہ سے ہوا تاکہ انقلاب مجموعی حیثیت سے سر پہ منڈلانے والے تمام خطرات سے بسلامت گزر جائے۔"

حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے حضرت سلمان الفارسی (رضی اللہ عنہ) کو کوفہ کی امارت سے الگ کر دیا تھا۔ اس واقعہ کی تشریح یوں کی گئی ہے :۔

"اس وقت ایک نہایت اہم واقعہ پیش آیا تھا۔ سلمان الفارسی (رضی اللہ عنہ) عمر (رضی اللہ عنہ) کے زمانے میں کوفہ کے عامل تھے۔ سلمان الفارسی (رضی اللہ عنہ) نے عراق میں بائیں بازو کے رجحانات کے مطابق پالیسی نافذ کرنا چاہی چنانچہ انہوں نے صنعت گروں کی یونینیں قائم کیں مگر ہوا یہ کہ تاجروں اور سرمایہ داروں نے انہیں اپنی جانب مائل کرنا چاہا لیکن وہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے سلمان الفارسی (رضی اللہ عنہ) سے کھلا کھلا جنگ چھیڑ دی جو ظاہر ہے اسی صورت میں چھیڑی گئی ہو گی جبکہ سلمان فارسی کی طرف سے ایسی انتظامی کارروائیاں روبعمل لائی گئی ہوں جن سے تاجروں اور سرمایہ داروں کے مفادات خطرے میں پڑ گئے ہوں گے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مقامی کوششوں سے سلمان فارسی کو سرنگوں کرنا آسان نہیں تھا۔ اس سے یہ بھی اخذ ہوتا ہے کہ انہیں اپنے صوبے کے اندر بے پناہ عوامی مقبولیت حاصل ہو گی۔ بہرحال تاجر اور سرمایہ دار ایک وفد کی شکل میں مدینہ (دار الخلافت) گئے۔ عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) سے انہوں نے ملاقات کی۔ اور اپنی شکایت اُن کے سامنے رکھی۔ اور ان تمام انتظامی کارروائیوں کی تفصیلات سے انہیں آگاہ کیا جو ان کی مصلحتوں کے لیے نقصان دہ تھیں۔ چنانچہ عمر (رضی اللہ عنہ) نے سلمان کو فی الفور معزول کر دیا۔"

"یہ بات پورے یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ سلمان فارسی کی برطرفی سے عمر (رضی اللہ عنہ) اور بائیں بازو کی پارٹی کے درمیان شدید کشمکش برپا ہو گئی تھی۔ لیکن عمر (رضی اللہ عنہ) اپنے موقف سے سرِ مو نہ سرکے۔ اور بائیں بازو نے بھی اس برطرفی کو منسوخ کروانے کے لیے کوئی تشدد آمیز اقدام نہ

کیا: اور بڑے اچنبھے کی بات ہے کہ سلمان فارسی کی تولیت اور ان کی معزولی کی تفصیلات مؤرخین کی کتابوں میں بہت کم ملتی ہیں[1]

ان اقتباسات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مصر کے نئے موسسٹ مفتی اور مورخ، اسلام کی تعبیر و تشریح اور اسلامی تاریخ کا تجزیہ کن خطوط پر کر رہے ہیں اور کیا اس سے اُن کا مقصد اسلام کی خدمت ہے یا اسلام کی بنیادوں کو منہدم کرنے کی اسکیم ہے۔ پاکستان کے جو علماء حضرات مصر کے سوشلزم کے حق میں قصائد مدحیہ کی تلاوت سے نہیں تھکتے اُن سے درخواست ہے کہ وہ مذکورہ بالا عبارتوں کا کھلی آنکھوں مطالعہ کریں اور ہوا کے رخ کا صحیح صحیح اندازہ کریں۔

سوشلزم کے اقتصادی نتائج و ثمرات

اب تک تو ہم نے عرب سوشلزم کے اضافی اثرات پر بحث کی ہے۔ لیکن اب ہم سوشلزم کے اصل میدان کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یعنی یہ دیکھتے ہیں کہ اقتصادی میدان میں سوشلزم نے مصری قوم کو کیا دیا ہے۔ اس جائزہ میں ہم نے سوشلزم کے پورے اثرات کو سمیٹنے کی کوشش نہیں کی ہے، اور ان صفحات میں ان کا سمیٹنا بھی مشکل ہے۔ ۱۹۶۱ء سے سوشلزم مصر کے اندر روبعمل ہے۔ ان پورے چھ سالوں کا حقیقت پسندانہ جائزہ طویل بحث کا محتاج ہے۔ ۱۹۶۵ء میں سوشلزم کا نغمہ مصر کے اندر پورے عروج پر تھا۔ اس لیے ہم نے ۱۹۶۵ء کے دو مہینے جائزے کے لیے منتخب کیے ہیں۔ اور ہم پوری کوشش کریں گے کہ اقتصادی نظام کے بڑے بڑے پہلو جائزہ کے دائرے میں آجائیں۔ مزید برآں یہ کہ ہم جو کچھ بیان کریں گے وہ خود مصر کے اخبارات و رسائل کے حوالوں سے بیان کریں گے اور تا بحدِ امکان سرکاری رپورٹوں کی روشنی میں بیان کریں گے۔ خوش قسمتی سے اس وقت مصر کے مشہور و معروف اخبارات اور رسائل کی فائلیں ہمارے سامنے ہیں۔ اس "گھر کے بھیدی" سے ہم آپ کو مشتے نمونہ از خروارے سوشلزم کی داستان سنواتے ہیں۔

سوشلزم نصر انڈسٹریز میں

نصر انڈسٹریز مصر کی مشہور موٹر سازی کی فرم ہے۔ یہ قومی ملک ہے۔ ۱۹۶۱ء۔ فرم کی تباہی کی داستانیں عام و خاص کی زبان پر ہیں۔ چنانچہ نیشنل اسمبلی کی طرف سے پنج رکنی کمیٹی تحقیقات کے لیے مقرر کی گئی۔ اس کمیٹی نے فرم کے تمام ذمہ دار اصحاب جو عرب سوشلسٹ یونین (ادنیٰ) فرم کی انتظامیہ کے ممبر ہیں سے ربط قائم کیا اور اصل واقعات کی تحقیق کی اور ان کے بیانات قلمبند کیے جو حسبِ ذیل ہیں:۔

"عبد العزیز شعیب چیئرمین نے بتایا، ملازمین کی بے تحاشا بھرتی، موٹروں کا مُسرفانہ استعمال، اور دفتروں کے اندر قیمتی فرنیچر کی تنصیب تباہی کا سبب ہے۔ ہر منیجر چاہتا ہے کہ اُس کے تحت زیادہ سے زیادہ ملازمین ہوں تاکہ وہ "بڑا" معلوم ہو۔ خواہ ملازمین کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ جو کام دس آدمی کر سکتے ہیں وہ بیس آدمی کر رہے ہیں اور وہ قابلیت کے لحاظ سے کم تر ہیں۔ مزدوروں کو لانے والی بسوں کی تعداد سے افسروں کے استعمال میں رہنے والی خصوصی کاروں کی تعداد زیادہ ہے۔ معمولی سے معمولی دفتر میں بھی ۲ سو پاؤنڈ سے کم کا فرنیچر نہیں ہے۔ اوور ٹائم کا رجحان آفت کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ عبد العزیز نے مالیات کے مدیر کا ایک نوٹ پڑھ کر سنایا جس میں مدیر مالیات نے کہا کہ اوور ٹائم کا مسئلہ فرم کے قابو سے باہر ہو چکا ہے۔ اوور ٹائم کام چوری اور مستقل زائد آمدنی کا ذریعہ بن چکا ہے۔ بعض لوگ دن میں ورکشاپ میں کام نہیں کرتے تاکہ رات کو اوور ٹائم لگا کر زائد کمائی کریں"۔

پیداواری پالیسی کے بارے میں اُس نے بتایا کہ فرم نے ورکشاپ نمبر ۲ کے لیے اس کی تعمیر سے قبل

---

[1] یہ تمام اقتباسات ہم نے ماہنامہ "الکاتب" قاہرہ کے ایک سلسلۂ مضامین سے نقل کیے ہیں۔ ملاحظہ ہو الکاتب بابت جنوری و فروری و مارچ ۱۹۶۵ء یہ مجلہ حکومت کے ایک ادارے "الدار القومیۃ للطباعۃ والنشر" کی طرف سے نکلتا ہے۔

مشینیں درآمد کی تھیں۔ دو سال گزر چکے ہیں لیکن ابھی تک انہیں نصب نہیں کیا گیا۔ بجٹ کے کنٹرولر نے انکشاف کیا کہ فرم کے موجودہ سامان کے اندر ۵ الاکھ پونڈ کا خسارہ ہو چکا ہے۔ کنٹرولر کی زیر نگرانی ایک کمیٹی چھان بین کے لیے تشکیل دی گئی تھی۔ اُس نے تاحال کوئی رپورٹ نہیں دی۔"

"غفلت اور لاپرواہی کے بارے میں عبدالعزیز شعیب نے بتایا کہ کارگاہوں کے عقبی حصوں میں فالتو پُرزوں کے سینکڑوں بکس لاوارث پڑے ہوئے ہیں جن کے مُنہ کھلے ہیں اور ریت میں ڈالے ہوئے ہیں کئی ٹرک اور نئی بسیں بھی کھڑی ہیں جن میں چھوٹے چھوٹے نقص پیدا ہو چکے ہیں۔ لیکن ان کا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہے۔"

صنعتی بورڈ اور فرم کے تعلقات کے بارے میں اُس نے شکایت کی کہ "بورڈ فرم کے ہر چھوٹے بڑے معاملے میں دراندازی کرتا رہتا ہے۔ بورڈ نے فرم کے اندر دو مینجروں کی نامزدگی کی ہے۔ لیکن فرم کی انتظامیہ کو اس کی خبر تک نہیں دی گئی۔ بورڈ خود ہی نامزد کردہ اشخاص کی تنخواہیں بھی مقرر کرتا ہے۔"

گودام کی بدحالی کے بارے میں اُس نے بتایا کہ "فرم کے پاس کوئی ایسا گودام نہیں جس میں تمام اشیاء محفوظ کی جا سکیں۔ سازوسامان کھلی حالت میں سڑکوں پر پڑا ہوا ہے۔ ہمارے پاس ۱۹۶۱ء کے ایسے خطوط موجود ہیں جواب تک نہیں کھولے جا سکے۔ ہمارے پاس ایک کرین تھا جسے مرمت کے لیے ورکشاپ میں دیا گیا اور آج تک واپس نہیں آیا۔ ہمارے پاس الیکٹرک ٹیسٹنگ مشینیں پڑی ہیں جن کی قیمت ۱۴ ہزار پونڈ بنتی ہے مگر سب بے کار پڑی ہیں۔ جن غیر ملکی کمپنیوں سے ہم سامان خریدتے ہیں وہ ہمیں صرف ۶ ماہ کی گارنٹی دیتی ہیں۔ لیکن ہمارے پاس متعدد ایسے بکس پڑے ہیں جو ۱۹۶۱ء میں خریدے گئے تھے اور آج تک استعمال کر کے نہیں دیکھے گئے حالانکہ ان کی گارنٹی کی مدت ختم ہو چکی ہے۔ ان کی قیمت ۳۵ لاکھ ۴۱ ہزار پونڈ ہے اور نہ آج تک کسی سے ان کے بارے میں حساب دریافت کیا گیا ہے۔ اس سامان کے اندر ۲۵۳ سلنڈر ہیں جو غلطی سے منگوا لیے اور پھر انہیں واپس کر دیا گیا لیکن اس پر کسی ذمہ دار شخص کی بازپرس نہیں کی گئی۔ بورڈ خریداری کے معاملے میں بھی دخل دیتا رہتا ہے اور ایک مخصوص کمپنی سے ہمیں اشیاء خریدنے پر مجبور کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ تنہا اس کمپنی کو ۵ الاکھ پونڈ کی درآمد کرنے کا آرڈر دیا گیا ہے۔ بورڈ کے لوگ موٹریں خرید لیتے ہیں اور ان کی قیمت ادا نہیں کرتے۔ ان کے ذمہ تقریباً سات ہزار پونڈ کا قرض ہے۔"

سوشلسٹ یونین کمیٹی کے اسسٹنٹ سیکرٹری کرم احمد علی نے نصر انڈسٹریز کے ممبران سے پردہ اُٹھاتے ہوئے بتایا کہ "اس بحران کا سبب انتظامیہ کے اندر بار بار تبدیلی ہے۔ ۵ سال کے اندر تین مرتبہ انتظامیہ تبدیل کی جا چکی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہی ہے کہ انتظامیہ کے سربراہ مشکلات کو حل نہیں کر پاتے اس نے بتایا کہ فرم کے قواعد و ضوابط میں مستریوں کی محدود اُجرتیں رکھی گئی ہیں اور ان کے معاشرتی مسائل کی قطعاً رعایت نہیں کی گئی۔ کوئی کارکن جب ترقی کرتا ہے تو اُسے نیا گریڈ نہیں دیا جاتا۔ مرکزی انتظامیہ نے فتویٰ صادر کیا ہے کہ اُجرتیں ہر آدمی کی قیمت کے مطابق معین کی جاتی ہیں۔"

"ورکرز یونین کے ممبر احمد خالد نے انتظامی پیچیدگیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ مجھے ایک فالتو پرزہ خرچ کرنے کے لئے کام کو بند کر دینا پڑتا ہے اور میرے ساتھ پوری لیبر اور مشینیں بھی بند ہو جاتی ہیں۔ میں گھنٹوں اپنے شعبے کے سربراہ کے کمرہ میں بیٹھا رہتا ہوں۔ مگر وہ کوئی توجہ نہیں دیتا۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ورکشاپیں صرف دوروں کے موقع پر چالو ہوتی ہیں۔ جب یہ اعلان ہوتا ہے کہ فلاں شخصیت کا دورہ ہو رہا ہے تو تمام مشینیں حرکت میں آ جاتی ہیں اور انجینئر بھی اپنے اپنے دفتروں سے نکل پڑتے ہیں۔"

"سوشلسٹ یونین کمیٹی کے ایک اور ممبر سامی شویل نے بتایا کہ فرم کے مینجروں میں باہمی اتفاق نہیں ہے۔ ہر شخص من مانی کارروائی کر رہا ہے

اور اُسے عمومی مصلحت کا کوئی لحاظ نہیں ہے۔ اُس نے مخصوص کمپنیوں کو درآمد کے آرڈر دئے جانے کے بارے میں بتایا کہ ٹرک کا دروازہ ہم گیارہ پونڈ میں خریدتے ہیں جب کہ ہمارے پاس دوسری کمپنیوں کی طرف سے ½۴ پونڈ کی پیشکش آچکی ہے۔ اُس نے یہ انکشاف کیا کہ بیوروکریسی درآمد کے بارے میں دسیسہ کاری کرتی رہتی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اکثر درآمد کنندگان ۱۹۶۰ء سے اپنے ذمہ کی اشیاء سپلائی کر چکے ہیں مگر یہ حقیقتاً اشیاء موجود نہیں ہیں۔ ہوسکتا ہے انہیں زمین نگل گئی ہو۔ اگر ہم تحقیق کریں گے تو ہمیں درآمد کے ۵۰ واؤچر ملیں گے۔ پچھلی مرتبہ تحقیقاتی کمیٹی نے جب چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ کئی ایسے بکس سرے سے موجود ہی نہیں ہیں جنہیں گودام کے ریکارڈ میں درج کر دیا گیا ہے۔ کیا کسی شخص سے اس بارے میں بازپرس کی گئی ہے؟ ہرگز نہیں۔ جب یہ پوچھا جاتا ہے کہ فرم کا ذمہ دار کون شخص ہے؟ تو کوئی جواب نہیں ملتا۔ نئے مینیجر نے اصلاح احوال کے لیے ۳ ماہ کی مہلت لی تھی۔ مگر یہ تین ماہ بھی گزر چکے ہیں اور یہ نالہ وہیں کھڑا ہے۔ درآمد کنندہ جب روپیہ کی لاگت میں مشکلات کا سامنا کرتا ہے تو وہ چیزوں کے نرخ بالا کر دیتا ہے۔"

"انتظامیہ کے رکن حسین حمیدان نے صنعتی پالیسی پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ طے یہ ہوا تھا کہ ۸ سالوں کے اندر اندر ٹرکوں اور بسوں کے ۹۵ فیصد پرزے مقامی طور پر بنائے جائیں۔ مگر ۵ سال گزر چکے ہیں ابھی تک اس پہلو میں حکومت کی خواہش پوری نہیں کی گئی۔ ہمارے پاس آلات معطل پڑے ہیں۔ حقیقی صنعت پرزوں کی ترکیب (Assemble) نہیں ہے بلکہ پرزوں کی ساخت ہے۔ صدر نے جب دورہ کیا تھا تو کہا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ جب اگلی مرتبہ دورے پر آؤں تو تمہارے ہاتھ کی گاڑیاں بنی ہوئی دیکھوں۔"

"عادل العبد (انجینیر) نے پلیننگ ڈائرکٹر بھی ہیں اعتراف کیا کہ چھانٹی کے اندر اصول براہت پر عمل کیا جاتا ہے۔ دیدہ ریزی سے کام نہیں لیا جاتا۔ اُس نے بتایا کہ فرم کے مزدوروں کے اندر گروہ بندی عروج پر پہنچی ہوئی ہے۔ اور مفادات کی خاطر ریشہ دوانیاں اور سازشیں ہوتی رہتی ہیں۔ اُس نے کوالٹی قائم کرنے کے طریق کار کی مثال دی۔ اُس نے بتایا کہ اس طریق کار میں ایک مرتبہ انجینیروں کے علم کے بغیر تبدیلی کر دی گئی۔ اور پھر مزدوروں کے اندر یہ افواہ پھیلائی گئی کہ اس تبدیلی میں انجینیروں کا ہاتھ ہے۔ سپلائی کی پیچیدگیوں پر بھی اُس نے اظہار خیال کیا۔ اُس نے کہا ڈیڑھ سال ہو رہا ہے میں نے ایک بکس کھولنے کا آرڈر بھیجا تھا۔ اس پر چار فوری یاد دہانی کی چٹھیاں بھی بھیج چکا ہوں مگر بکس نہیں کھولا گیا۔ اور نتیجتہً پیداوار رُک گئی ہے۔ میں نے مجبور ہو کر پلیننگ برانچ کا ایک نمائندہ بھیجا جو بکس کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر لے آیا۔ میں نے متعلقہ ذمہ دار ملازم کی تحقیق کا مطالبہ کیا مگر وہ بیمار بنتا رہا اور کام سے مدت تک غیر حاضر رہا۔ یہاں تک کہ وقت گزر جانے پر میرا دعویٰ از خود ساقط ہو گیا۔"

منصوبہ بندی اور تنفیذ کے مراحل کے بارے میں مصطفیٰ قطان نے گفتگو کی۔ مصطفیٰ قطان انتظامیہ کا ممبر ہے۔ اس نے بتایا پہلے مرحلہ میں پلاننگ کا معیار گھٹیا تھا۔ اُس نے بتایا کہ ابھی تک ایسے قواعد و ضوابط مرتب نہیں کیے گئے جو فرم کے تمام سیکٹروں کو باہم منظم کرتے ہوں۔ فرم کی تنظیم دس سال سے پہلے ناممکن ہے۔ مگر یہ پورا عرصہ نظم و ضبط کے بغیر کیسے گزرے گا؟"

"پلاننگ کے بغیر تنفیذ نہایت دشوار کام ہے۔ بس انفرادی ہیرا پھیری سے کام چل رہا ہے۔"

"انتظامیہ کے ممبر کمال مدنی نے انتظامیہ کی مشکلات بیان کیں۔ اُس نے بتایا کہ صنعتی بورڈ کے چیئرمین کے نام گزشتہ سال ایک میمورنڈم بھیجا تھا۔ جس میں فرم کی تمام مشکلات پر انگلی رکھی گئی تھی۔ چیئرمین نے یہ میمورنڈم انتظامیہ کے غور و خوض کے لیے بھیج دیا۔ لیکن انتظامیہ نے ابھی تک اُسے ہاتھ نہیں لگایا۔ اس نے کہا میں نے مطالبہ کیا تھا کہ انتظامیہ، عرب سوشلسٹ کمیٹی اور ورکرز یونین کمیٹی کے ارکان پر مشتمل ایک اعلیٰ سطح کی کمیٹی بنائی جائے جو مجبوروں

کے معیار پر غور کرے اور تمام شکایات کی پڑتال کرے۔ یہ کام قواعد و ضوابط کی تدوین سے پہلے انجام دیا جائے تاکہ معاملات صحیح رخ پر چلیں۔ کیونکہ مزدوروں کی بہت بڑی تعداد فروری ۱۹۶۲ء کی فوری ترمیات کی وجہ سے عظیم ظلم کا شکار ہو چکی ہے۔ اس نے کہا میں نے یہ بھی مطالبہ کیا تھا کہ فرم کے اندر بلا ضرورت ملازمین کی جو وسیع پیمانے پر بھرتی کر رکھی ہے اُسے کم کیا جائے۔ ان ملازمین کی اکثریت اوقات کار میں کام میں اس لیے کوتاہی کرتی ہے تاکہ اُوور ٹائم لگا کر کمائی کی جا سکے۔ اُس نے بتایا کہ فرم میں پہلے ملازمین کی تعداد ایک ہزار ایک سو تھی اور اب بلا ضرورت ایک ہزار سات سو پچاس کر دی گئی ہے اور ملازمین کی مجموعی تنخواہ ۱/۲ ۱۲ لاکھ پونڈ سالانہ بنتی ہے۔ اُس نے بتایا کا سکندریہ کے دفتر میں پہلے صرف دس ملازم کام کرتے تھے جن میں سو فیصدی قابلیت پائی جاتی تھی۔ اب یہ تعداد دگنی ہو چکی ہے اور قابلیت کا معیار افسوسناک حد تک گر چکا ہے۔"

"عبداللطیف حمودہ نے حفاظت اور پہرے کے نظام پر روشنی ڈالی۔ اُس نے بتایا کہ فرم کا مال چوروں کی آماجگاہ بنا رہتا ہے۔ کیونکہ فرم کے اندر پہرے کا نظام بہت کمزور ہے۔ اس نے بتایا کہ پوری فرم کے اندر صرف ۶ بندوقیں ہیں اور وہ بھی ناقابل استعمال۔ اس نے بتایا کہ ایک مرتبہ کارخانے پر چوروں نے حملہ کیا۔ مگر چوکیدار فرار ہو گیا۔ کیونکہ اُس کی بندوق کا کارتوس نہ چل سکا۔ اُس نے بتایا کہ چوکیدار کی فائل میں سینکڑوں چوری اور ڈاکے کے واقعات کا اندراج ہے مگر کسی ایک کی تحقیق نہیں کی گئی۔"

"انتظامیہ کے ایک رکن اور سوشلسٹ یونین کے لوکل یونٹ کے سیکرٹری فوزی خلیفہ کا بیان ہے۔ انتظامیہ کو یہ استثنائی حق حاصل ہے کہ وہ چاہے تو اعلان اور انٹرویو کا راستہ اختیار کیے بغیر ملازمین کو بھرتی کر سکتی ہے۔ انتظامیہ نے اس حق سے خوب ناجائز فائدہ اٹھایا ہے اور بلا ضرورت نامزدگیاں کی جا رہی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ کارخانے کے مزدوروں اور کارکنوں کے اندر بددلی پھیل گئی ہے۔ مزدوروں کو غذا اچھی نہیں مل رہی ہے ہم نے بیس ہزار پونڈ کی لاگت سے ورکشاپ کے اندر ایک ریسٹورنٹ کھولا تھا۔ مگر آج ہم اُسے نیلام کرنے پر مجبور ہیں۔ انتظامیہ کی اصل ڈیوٹی کیا ہے۔ اس کا آج تک ہمیں علم نہیں ہو سکا۔ انتظامیہ کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اپنی مرضی کے لوگوں کو بھرتی کرتی رہتی ہے یا بھتے تقسیم کرتی رہتی ہے اور ڈیلی گیشن بھیجنے کی تجویزیں سوچتی رہتی ہے۔"

"سوشلسٹ یونین کمیٹی کے ممبر اور مالیات کے نگران محمد کاسب نے مینجروں کی بیوروکریسی کا رونا رویا۔ اُس نے ایک انجینیئر کے بارے میں بتایا کہ وہ ایک مرتبہ بیبیا گیا۔ اس کے ذمہ دست گرداں میں چار سو اسٹرلنگ پاؤنڈ کا حساب تھا۔ جب وہ واپس آیا تو اُس نے صرف ایک سو پاؤنڈ واپس کرنا چاہے اور وہ بھی مقامی کرنسی میں۔ اور بار بار اطلاع کے بعد اُس نے وہ حساب بھی ادا نہیں کیا۔ سلامہ مجمی نے مطالبہ کیا کہ مینجروں اور مزدوروں کے درمیان شدید اختلافات برپا ہیں انہیں ختم کرنا چاہیئے۔ اُس نے بتایا کہ فرم کی طبی سروس انتہائی ناقص ہے۔ ملازمین اور مزدوروں کے درمیان دوا کی تقسیم میں امتیاز برتا جاتا ہے۔ مالیات کے مینجر سلیمان بکر نے مختار ابراہیم انجینیئر کے بارے میں بتایا کہ یہ شخص سال بھر سے تنخواہ لے رہا ہے لیکن آج تک اسے کوئی کام نہیں سونپا گیا۔ اور آخر کار اُسے فالتو پرزوں کی ورکشاپ کا ڈائرکٹر مقرر کیا گیا۔ مگر لطف یہ ہے کہ فرم کے اندر اس نام کی کوئی ورکشاپ نہیں ہے۔ چند لا معموری مشینیں پڑی ہوئی ہیں۔" [1]

ان تفصیلات سے آپ ایک ایسی فرم کا تانا بانا بآسانی سمجھ سکتے ہیں جو قومی ملکیت میں ہو اور جسے سوشلزم کی علمبردار حکومت چلا رہی ہو۔

مصری صنعت کا حال

"نیشنل اسمبلی میں ابراہیم قریشی نے بجٹ پر بحث کے دوران یہ سوال اٹھایا کہ میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا

---

[1] - نصر اللہ ڈسٹری بیوٹر کے بارے میں یہ تمام معلومات ہم نے قاہرہ کے روزنامہ "اخبار الیوم"، بابت ۸ مئی ۱۹۶۵ء سے من و عن نقل کی ہیں۔ یہ معلومات جمال البدوی نے مرتب کی ہیں۔

ترقی پذیر ممالک کی بھاری صنعتیں اہم ہیں یا ہلکی اور چھوٹی چھوٹی صنعتیں؟ اور کیا جدید ممالک کے لیے ضروریات زندگی میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا ممکن ہے یا اُس کے لیے ترقی یافتہ ممالک کے ساتھ تعاون لازمی ہے؟ صنعتی میدان میں میں صرف فالتو پُرزوں کی صنعت پر اپنی گفتگو مرکوز رکھنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ فالتو پرزوں کی ساخت مشینری کی ساخت سے بھی اہم ہے۔ ہمارے ملک میں ہزارہا مشینیں اس لیے بیکار پڑی ہیں کہ فالتو پُرزے موجود نہیں ہیں۔ یہ ہمارے لیے بہت بڑے خسارے کی بات ہے ——— میں وزیرِ صنعت سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے پہلے پنجسالہ منصوبہ میں تعمیری سامان کی دگنی پیداوار کے لیے کیا کوشش سرانجام دی ہے۔ کیونکہ اس وقت ملک تعمیری سامان کی غیر معمولی قلّت سے دوچار ہے۔ ہم آبادکاری کی وزارت سے درخواست کرتے ہیں کہ ملک کو "گپڑی" کی لعنت سے پاک کریں۔ یہ لعنت ملک کے اندر بُری طرح پھیل چکی ہے"[1]

قومی امانت کا حشر

آیئے ہم آپ کو سوشلسٹ اسٹیٹ کے سرکاری گوداموں کی کیفیت سے روشناس کراتے ہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے قاہرہ کا نامور روزنامہ الاہرام ہے۔ اس کے ۲ جون ۱۹۶۵ء کے شمارے میں سرکاری گوداموں کے بارے میں مکرم محمد احمد اور سامی متبولی کا مشترک رپورتاژ شائع ہوا ہے۔ اس کے اہم حصے درج ذیل ہیں۔

"حکومت کے گوداموں کی نگران مشینری اس بارے میں صحیح اعداد و شمار فراہم نہیں کرسکتی کہ گوداموں میں سے ہر سال کتنی مالیت کا غبن ہوتا ہے بلکہ یہ بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ ان گوداموں کا ریکارڈ رکھنے کی بھی حاجت محسوس کی جاتی ہے۔ یہ گودام ۴۴ کروڑ پاؤنڈ کی مالیت کے سامان پر مشتمل ہیں۔ وزارت داخلہ کی تحقیقات سے یہ ثابت ہوا ہے کہ گوداموں کا سرقہ اکثر و بیشتر داخلی نہ بیروں سے ہوتا ہے"

"گوداموں کی تاریخ چوریوں سے بھری پڑی ہے۔ یہ تمام چوریاں "حکومت متحدہ عرب جمہوریہ" کی فارموں کے ذریعہ ہوئی ہیں اور معین قواعد و ضوابط کے تحت ہوئی ہیں۔ سرقہ کی سب سے بڑی واردات وہ ہے جو کیڑوں مکوڑوں کے مارنے والی دواؤں کو پیش آئی ہے اور پورے ۴ سال تک جاری رہی ہے اور ۲ لاکھ ۴۰ ہزار پاؤنڈ کے نقصان پر منتج ہوئی ہے۔ دوسری واردات گورنمنٹ پرنٹنگ پریس میں پیش آئی ہے اور سال بھر سے کمیٹیاں تحقیقات میں مصروف ہیں۔ ریلوے گوداموں کے ساتھ بھی قصہ پیش آیا ہے جو ڈکیتی کی فلموں کا منظر پیش کرتا ہے۔ ایک مرتبہ سامان کے کئی ٹرک گوداموں میں داخل ہونے لگے مگر داخلہ سے قبل ہی لوٹ لیے گئے"۔

"ریلوے کے گوداموں میں اشیاء کی گمشدگی کی ماہانہ رپورٹ پر ایک نظر ڈالنے سے نہایت ہولناک تصویر سامنے آتی ہے۔ ہمارے سامنے ۱۰ فل اسکیپ صفحات پر مشتمل ایک فہرست ہے جس میں صرف ایک گودام کی اشیائے گمشدگی کی تفصیل درج ہے۔ اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۰ اپریل سے ماہ جون تک دو ماہ کے اندر ریلوے کی ۱۲۷۰ ویگنوں میں سے ۳۸۰ ویگن کے اندر سے ۱۲۷۰ چیزیں گم ہوگئیں۔ ان میں گاڑیوں کے شیشے، کھڑکیاں، سیٹیں وغیرہ بھی شامل ہیں۔ اسی طرح ۲۱۱ ڈیزل کاروں میں سے ۲۸ ڈیزل کاروں کے اندر سے ۵۵۵۰ اشیاء گم ہوئیں۔ یہ معاملہ گاڑیوں کا ہے جن کی روزانہ چیکنگ ہوتی رہتی ہے لیکن گوداموں کا حال ناگفتہ بہ ہے"۔

"ان چوریوں کے لیے مختلف اسالیب اختیار کیے جاتے ہیں۔ سب سے خطرناک اسلوب یہ ہے کہ سامان سرے سے گودام میں داخل نہیں ہوتا۔ صرف کاغذات میں داخل ہوتا ہے۔ اور گیٹ مین سے لیکر سٹور کیپر تک اُس کے داخلہ کی تصدیق کرتے جاتے ہیں۔ گورنمنٹ پریس کے [illegible] بھی ہوا۔ دوسرا اسلوب یہ ہے کہ اندراج کرنے والے کلرک اور سٹور کے نگران اعلیٰ کے درمیان معاملہ طے ہوجاتا ہے۔ اندراج کرنے والا کلرک اخراج کرنے والے

---

[1] روزنامہ الاہرام ۲۳ جولائی ۱۹۶۵ء

کلرک کو اعتماد میں لیتا ہے ۔ اور اس طرح غبن کی بہت ہولناک واردات پیش آجاتی ہے ۔ حشرات الارض کو مارنے والی دوائیوں کے ساتھ یہی اسلوب اختیار کیا گیا ہے ۔ تیسرا اسلوب یہ ہے کہ اوپر سے لے کر نیچے تک بلوں کے اندر جعل سازی کی جاتی ہے ۔ چوتھا طریقہ یہ ہے کہ گوداموں کے اندر سے نئی چیزیں نکال کر اُن کی جگہ پرانی چیزیں رکھ دی جاتی ہیں اور اس طرح سے تجارتی کاروبار کیا جاتا ہے ۔ [51]

" گورنمنٹ کے ڈرگ اسٹورز کا حال اس سے بھی بدتر ہے ۔ ان اسٹورز میں ۷ لاکھ ۳۰ ہزار پونڈ کی دوائیں پڑی ہیں ۔ ان دوائیوں کی مشکل یہ ہے کہ یہ حرکت نہیں کرتیں اور اس جگہ پڑے پڑے یہ زائد المیعاد ہو رہی ہیں ۔ کیا اتنی بڑی مقدار زائد از ضرورت ہے ۔ یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ میڈیکل سنٹرز کی طرف سے یہ بتایا جا رہا ہے کہ ہر سال دوائیوں کی لاگت میں دس فیصد اضافہ ہو رہا ہے ۔ درحقیقت ان دواؤں کی تقسیم کسی منصوبہ بندی کے تحت نہیں ہو رہی ہے ۔"

" یہی حال وزارت تعلیم کے اسٹوروں کا ہے ۔ تمام تعلیمی ڈویژن اپنے بجٹ میں آزاد ہیں ۔ مگر بایں ہمہ وزارت تعلیم نے مختلف ڈویژنوں کے اندر درسی کتابوں کی تقسیم کا انتظام اپنی گردن پر لے رکھا ہے ۔ وزارت کو ہر سال ۸ کروڑ کتابوں کی طباعت کا انتظام کرنا پڑتا ہے ۔ کتابوں کی اتنی بڑی مقدار طباعت کے مرحلے طے کرکے گوداموں میں آکر ڈیرے ڈال لیتی ہے ۔ محفوظ کمرے نہ ہونے کی وجہ سے یہ کتابیں ہر سال پانی کے سیلاب کی نذر ہو جاتی ہیں ۔ اور اکثر و بیشتر ضائع ہو جاتی ہیں ۔ سوال یہ ہے کہ اتنی بڑی مقدار کیوں منجمد پڑی رہتی ہے جب کہ اضلاع میں ان کی مانگ ہے ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تھوڑے تھوڑے وقفوں سے نصاب کی تبدیلی عمل میں آ رہی ہے ۔ سال رواں میں ۱۲ کتابیں ابتدائی تعلیم کی اور ۱۲ کتابیں مڈل تعلیم کی اور ۱۰ کتابیں ثانوی تعلیم کی منسوخ کی جا چکی ہیں حالانکہ یہ کتابیں انبار در انبار چھپ کر اسٹورز میں پہنچ چکی تھیں ۔ ان کا مصرف نیلامی کے سوا کچھ نہیں ہے ۔ محمد علی سیکرٹری ایجوکیشن کا خیال ہے کہ ہر سال نصاب کی ہنگامی تبدیلیوں کے آگے سرکاری ملازمین کا کوئی بس نہیں چل سکتا ۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ نصاب کی کتب چھپ کر آ جاتی ہیں اور بعد میں اس میں خامیوں کا ضمیمہ بھیج دیا جاتا ہے ۔ ۱۷ کتابوں کے ساتھ یہ معاملہ ہو چکا ہے ۔

" ریلوے کے گوداموں کو بھی ایسی ہی مشکلات کا سامنا ہے ۔ اس وقت ۹۰ لاکھ پونڈ کا سامان جو ۵ لاکھ اصناف پر مشتمل ہے کھلے میدان میں لاوارث پڑا ہے ۔" [52]

محکمہ بجلی کا حال

" المحلة الکبریٰ " کا سکینڈل بھی سوشلزم کی تاریخ کا دلچسپ باب ہے ۔ اسے قاہرہ کے ہفت روزہ " آخر ساعة " نے جون ۱۹۶۵ء کے شمارہ نمبر ۱۵۹۱ میں بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ اپنی طرز کا نرالا واقعہ ہے جس کی بدبو ہزار میل کے فاصلے سے سونگھی جا سکتی ہے ۔

" اس واقعہ کا ہیرو ایک چھوٹا سا ملازم ہے جس کا نام حمدی امین ہے ۔ الکبریٰ شہر کی بلدیہ میں اس کی تبدیلی ہو گئی ۔ اپنے کام کا چارج لیتے ہی اس نے اس سکینڈل کا انکشاف کر دیا ۔ مختلف حلقوں کی طرف سے اُسے قتل کی دھمکیاں دی گئیں مگر وہ اپنے موقف پر ڈٹا رہا ۔ اُس نے پولیس کو اس کی اطلاع دی اور چار ماہ کی کھینچا تانی کے بعد بالآخر بلدیہ کے چیئرمین نے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی اور معلوم ہوا کہ یہ واقعہ ایک جرم نہیں ہے بلکہ سلسلہ جرائم کی ایک کڑی ہے ۔

بجلی کا بل وصول کرنے والے کلرک رقم کا اکثر و بیشتر حصہ اپنی جیب میں ڈال لیتے ہیں اور بلدیہ کے خزانہ میں صرف چند ٹکے جمع کرا دیتے ہیں

---

[51] روزنامہ الاہرام ۲ جون ۱۹۶۵ء

[52] ملاحظہ ہو الاہرام ۳ جون ۱۹۶۵ء

مثلاً ایک کلرک ۸ پونڈ ۴ ۹۲ ملیم کے بل میں سے ۸ پونڈ جیب میں رکھ لیتا ہے اور باقی جمع کرا دیتا ہے ۔ ۹۹ پونڈ ۸۰ ملیم کے بل میں سے ۹۰ پونڈ اپنے پاس رکھ لیتا ہے ۔ ۱۱۶ پونڈ ۱۷۹ ملیم کے بل میں سے وہ صرف ۱ پونڈ ۱۷۹ ملیم خزانے کے حوالے کرتا ہے ۔ الغرض صرف ایک ڈویژنل برانچ میں سے اس طرح ۲۱ ہزار ۴ سو ۵ پونڈ کی رقم کا غبن ہوتا ہے ۔"

۲۔ جو کارخانے قومی ملکیت میں لیے جا چکے ہیں ۔ وہ سرے سے بل ہی ادا نہیں کرتے ۔ پونڈ تو کجا ملیم بھی جمع نہیں کراتے ۔ فری بجلی استعمال کرتے ہیں اس میں کیا حکمت ہے یہ اللہ کو معلوم ہے یا تحصیل کنندگان کو ! فری بجلی استعمال کرنے والا صرف ایک کارخانہ اب تک ایک ہزار ایک سو ۹۹ پونڈ کی بجلی استعمال کر چکا ہے ۔ ایک دوسرا کارخانہ ایک ہزار چار سو ۱۵ پونڈ کی ۔ ایسے "عطیات" کی مجموعی رقم ۳۲۵۰۸ پونڈ بنتی ہے ۔

۳۔ دفتر کے رجسٹروں میں سے بعض لوگوں کے کاغذات ہی ختم کیے جا چکے ہیں اس لیے اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ وہ بجلی کے صارفین میں شامل ہیں ۔ بل کلرک بھی ان کے نام سے ایک ملیم بھی جمع نہیں کرتا ۔ ایسے لوگوں کی تعداد ۱۹۲ ہے ۔ مگر محکمہ بجلی کی طرف سے انہیں باقاعدہ بجلی سپلائی ہو رہی ہے ۔

یہ معلومات صرف ایک ڈویژن سے متعلق ہیں اور جب تحقیقاتی کمیٹی نے رپورٹ پیش کی تو اس کا بوجھ سارقین اور صارفین پر پڑنے کے بجائے تحقیقات کنندگان کے سر پر پڑا ۔ پوری بلدیہ ان کے مخالف ہو گئی اور آخر کار ان تینوں اصحاب کو دوسری برانچوں میں منتقل کر دیا گیا ۔

اس داستان کے اندر قابل لحاظ جو پہلو ہے مصر کا یہ اصول ہے کہ :۔

۱۔ "اگر تم کسی سکینڈل کا انکشاف کرو گے تو اپنے آپ کو خطرے میں ڈالو گے ۔

۲۔ اگر تم خاموش رہو گے تو امن میں رہو گے ۔

۳۔ اور اگر سکینڈل میں شریک ہو جاؤ گے تو ہیرو بن جاؤ گے ۔"[1]

"اجتماعی کاشت" کا نگران ادارہ اور سوشلزم

حکومت کے اموال یا غبن اور سرقہ کی نذر ہو رہے ہیں اور یا لاپرواہی اور عدم اہتمام کے سبب ضائع ہو رہے ہیں ۔ ہفت روزہ آخر ساعۃ قاہرہ کے ۱۲ مئی ۱۹۶۵ء کے شمارے میں عبدالعاطی حامد کے قلم سے ڈائرکٹریٹ آف لیبریشن کے بارے میں سروے رپورٹ شائع ہوئی ہے ۔ ڈائرکٹریٹ آف لبریشن زرعی اصلاحات اور اجتماعی کاشت کا نگران ادارہ ہے ۔ عرب سوشلزم کا تمام دارومدار اسی ادارے پر ہے ۔ اس ادارہ کا اندرونی حال عبدالعاطی حامد کی زبانی سنئے :۔

"مجھے مالیات کے مدیر محمود حنفی کے دفتر میں ایسی متعدد کارروائیوں کی صفحہ گردانی کا موقع ملا ہے جو ڈائرکٹریٹ آف لبریشن کے بارے میں اختیار کی جا چکی ہیں ۔ محمود حنفی نے مجھے بتایا کہ ڈائرکٹریٹ آف لبریشن کے ۴۰۴۴ ملازمین کو انکوائری کورٹ کے سپرد کیا جا چکا ہے ۔ یہ خبر سن کر میں دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ ڈائرکٹریٹ میں گیا ۔ اس وقت ذمہ دار اصحاب میں سے اکثر شخص موجود نہیں تھے ۔ معلوم ہوا کہ یہ لوگ ڈائرکٹریٹ کی گاڑیوں پر قاہرہ میں ایک فٹ بال میچ دیکھنے گئے ہوئے ہیں ۔ صرف مدیر مالیات موجود تھے ۔ ان سے ہم نے اخباری نمائندوں کے بجائے وزارت داخلہ کے انسپکٹروں کی حیثیت سے تعارف کرایا ۔ میں نے سعد زغلول مدیر مالیات سے ڈائرکٹریٹ اسٹورز کے بارے میں معلومات طلب کیں ۔ وہ مجھے گندم مال کے اسٹور میں لے گئے ۔ میں نے ان سے کہا کہ میں خود کئی مرتبہ مشاہدہ کر چکا ہوں کہ فالتو پرزے یہاں سے نکال کر باہر بازار میں بیچے جا رہے ہوتے ہیں ۔ اس نے

---

[1] ملاحظہ ہو آخر ساعۃ جون ۱۹۶۵ء

ہنس کر کہا آپ نے درست فرمایا۔ اکثر ایسا ہوتا رہتا ہے۔ اُس نے کہا اسٹور میں ۱۵۰ ٹن پیاز پڑے تھے۔ مگر بے اعتنائی کی نذر ہو گئے۔ اور بالآخر انہیں کنڈم کرنا پڑا۔ موٹروں کی ورکشاپ میں جاکر معلوم ہوا کہ موٹروں اور ٹریکٹروں کی بہت بڑی تعداد معمولی معمولی نقصان کی بنا پر معطل پڑی ہے۔ زرعی آلات کے گیراج میں گئے۔ تقریباً ۲۵۰ بڑے بڑے ٹریکٹر اور دوسرے زرعی آلات جن کی قیمت ۱۰ لاکھ پونڈ سے زائد ہو گی بیکار پڑے ہوئے تھے۔ جب سے ڈائرکٹریٹ آف لبریشن نے زرعی اصلاحات کا کام اپنے ذمہ لیا ہے یعنی ۱۹۶۱ء سے اب تک ۲۰۰ ٹریکٹر نشانۂ تغافل ہو چکے ہیں جن کی مجموعی قیمت ۴ لاکھ پونڈ ہے۔ ملازمین کو جب بازپرس کا اندیشہ ہوا تو انہوں نے ان ردّی ٹریکٹروں کے سٹور کے ارد گرد اونچی دیوار چنوا دی اور اس جگہ کا نام "ٹریکٹر قبرستان" رکھ دیا۔ میں نے چھانٹی کے کام کے انچارج سے دریافت کیا کہ یہ تمام ٹریکٹر کس نے وصول کیے تھے اور کون ان کا ذمہ دار ہے لیکن معلوم ہوا کہ پورے ڈائرکٹریٹ آف لبریشن میں کسی کو یہ معلوم نہیں ہے کہ ان کا ذمہ دار کون ہے۔ ڈائرکٹریٹ کے تمام جانور طبی دیکھ بھال سے محروم تھے۔ حالانکہ جانوروں کا ہسپتال دفتر کے اندر موجود ہے۔ یہ جانور جب طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہوئے تو فخری واصف نامی ایگریکلچرل انجنیئر نے ایک قصاب کے گھر میں جاکر انہیں فروخت کر دیا۔"

"ڈائرکٹریٹ آف لبریشن مصر ہے کہ سبزیوں کی پیداوار فروخت کرنے کے لیے صرف بنہادی (سبزیوں کے ایک تاجر) کے ساتھ معاملہ رکھے گا اور ڈائرکٹریٹ کے فارم کی تمام سبزیاں اُس کے ذریعہ مارکیٹ میں فروخت کی جائیں گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہو رہا ہے اور یہ سبزیاں معمولی داموں پر اُس کے ہاتھ بیچی جا رہی ہیں۔ مثلاً ایک سیر پیاز ۵ ملیم میں (ایک ملیم = ۱ پاکستانی پیسہ)"

اجتماعی کاشت کے رنگ ڈھنگ

مصری سوشلزم کا سب سے محبوب نعرہ یہ ہے کہ "اُس نے ملک کے اندر جاگیرداری کا خاتمہ کر دیا ہے اور زرعی اصلاحات کے ذریعہ ملک کو ایک نئی زندگی بخشی ہے۔" اب ہم سوشلزم کے اس نعرے کی حقیقت کو معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ قاہرہ کے روزنامہ "الاخبار" کا نامہ نگار نیشنل اسمبلی کے چالیس ممبروں کے ایک وفد کے ساتھ ڈائرکٹریٹ آف لبریشن (زرعی اصلاحات کی تنفیذ و نگرانی کا ادارہ) گیا اور قومی زراعت کی مشکلات کا جائزہ لیا۔ نامہ نگار لکھتا ہے:-

"گفتگو کا آغاز یہاں سے ہوا کہ پیداوار کے اضافہ میں کیا کیا مشکلات ہیں اور سوشلزم کی ذمہ داریوں کو کیوں پوری طرح ادا نہیں کیا جا رہا۔ اس گفتگو میں ڈائرکٹریٹ کے اعلیٰ افسران اور عام کارکن سب شریک تھے۔"

"جنوبی ڈویژن کے نگران فواد علی انجینیئر نے صراحت سے بتایا:- ڈائرکٹریٹ آف لبریشن کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ انقلاب کا سب سے پہلا مقصد یہ تھا کہ کسان کا معیارِ زندگی اونچا کیا جائے۔ مگر اب صورت یہ ہے کہ ایک ایکڑ زمین کی اصلاح و ترقی پر ۲۷۵ پونڈ صرف ہو رہے ہیں۔ یہ بہت بڑی رقم ہے۔ ۱۹۵۶ء میں ہم نے نوباریہ نہر سے پانی لے کر شمالی حلقے کی زمینوں کو درست کرنا شروع کیا تھا۔ چنانچہ ہم نے بنجر زمینوں کو آباد کر دیا۔ حالانکہ اس میں ہمارے مصارف بہت کم ہوئے۔ محمود شعیر رکن اسمبلی نے دریافت کیا کہ تم عمدہ زمینوں کو کیوں نہیں آباد کرتے۔ فواد علی نے جواب دیا کہ ہم مدت تک اس انتظار میں رہے کہ پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ نوباریہ نہر کو وسعت دے کر پانی عام کرے گا کیونکہ سابقہ پانی کم تھا اور تمام زمینوں کی سیرابی ناممکن تھی۔ ہم آج تک اس انتظار میں ہیں۔"

دریافت کیا گیا کہ شمالی حلقے میں آپ لوگوں نے کامیابی حاصل کر لی لیکن وہاں کی کاشت کی رفتار بہت سست ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟ [illegible] شمالی علاقے کی کاشت کی رفتار تو پھر بھی غنیمت ہے۔ جنوبی علاقے میں کچھ بھی نہیں ہو رہا [illegible] ہے۔ یعنی زرعی [illegible] اس کا ہم نے حل یہ تجویز کیا ہے کہ فوج کو بھی سرگرم پیداوار میں شریک کر لیا ہے۔ چنانچہ فوج [illegible] ڈائرکٹریٹ میں

پابندی سے آتے ہیں۔ یہ ٹیم ۲۵ ہزار ایکڑ میں مکی کاشت کرے گی۔ اس ٹیم میں ایگریکلچرل انجنیئر بھی ہوتے ہیں۔ عام سپاہی بھی اور نیز دفوج میں کے افسر بھی۔ یہ ایک نیا تجربہ کیا جارہا ہے۔ مئی کے پہلے ہفتے میں یہ ٹیم ۲۵ ہزار ایکڑ میں کاشت کا آغاز کردے گی۔"

"کمال مرعی رکن اسمبلی نے پوچھا کہ آپ کے ڈائرکٹریٹ سے زرعی مزدور کیوں بھاگ جاتے ہیں؟ عبدالمنعم اسماعیل نے بتایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجلہ "آخر ساعۃ" نے ایک مرتبہ یہ خبر چھاپی تھی کہ زرعی مزدوروں کو ٹھیکیداروں کی طرف سے صرف ۸ قرش (تقریباً ۱۲ آنے پاکستانی) یومیہ اُجرت دی جاتی ہے۔ سرکاری ملازموں اور ٹھیکیداروں نے آپس میں گٹھ جوڑ کر رکھا ہے۔ فواد علی نے جواب دیا کہ ہمیں بلدیاتی کونسلیں مزدور سپلائی کرتی ہیں۔ ٹھیکیدار بھی اپنے ساتھ مزدور لاتے ہیں۔ دراصل ضرورت ہے کہ مزدوروں کو زرعی فارموں میں رہائش کرنے کی ترغیب دی جائے۔ مزدوروں کی کمی کا یہ حال ہے کہ ۳ سال سے ٹھیکیدار اپنا کام روکے بیٹھے ہیں۔ رشاد شبر رکن اسمبلی نے کہا کہ آپ لوگ براہِ راست کیوں مزدور بھرتی نہیں کرتے۔ فواد نے جواب دیا کہ نامعلوم اسباب کی بنا پر مزدور صرف ٹھیکیدار کے ذریعہ کام کرنا پسند کرتے ہیں۔"

عبدالمنعم اسماعیل رکن اسمبلی نے کہا۔ دراصل یہ مسئلہ ذہنی تربیت سے حل ہوگا۔ ڈائرکٹریٹ آف لبریشن ملک کا بہت بڑا ادارہ ہے اور یہ سوشلزم کا پہلی مرتبہ تجربہ کررہا ہے۔ میرے تصور میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ ٹھیکیدار اور سرکاری ادارے مل کر مزدوروں کا خون چوسیں گے۔ تعجب ہے کہ ڈائرکٹریٹ آف لبریشن جیسا اہم ادارہ ایک ہزار مزدور حاصل کرنے کے لیے ٹھیکیداروں کے ساتھ ملی بھگت کرے گا۔ اور مزدوروں کی یومیہ آمدنی کا نصف حصہ یہ دونوں آپس میں بانٹ کھائیں گے۔"

"اسمبلی کے ایک اور رکن طناش نے ٹریکٹروں اور دوسرے زرعی آلات کا قصہ چھیڑ دیا۔ اور یہ بتایا کہ یہ تمام آلات ناقص ہیں[1]۔ اس کے بعد طناش نے کاشت شدہ رقبے اور باغات اور بجٹ کے بارے میں سرکاری رپورٹ طلب کی۔ اس رپورٹ سے یہ معلوم ہوا کہ قومی زرعی فارموں پر ۲۵۰ لاکھ پونڈ صرف ہوئے ہیں اور آمدنی صرف دس لاکھ ۶۰ ہزار پاؤنڈ ہے۔ طناش نے کہا دراصل یہاں کام کا جو نقشہ بنایا گیا ہے وہ انسانی اور مشینی ہمت سے بالا ہے۔ وسائل کے مطابق دانشمندانہ طور پر منصوبہ بندی ہونی چاہیے۔ مثلاً یہاں تمام ٹریکٹر اس لیے بیکار پڑے ہیں کہ فالتو پرزے موجود نہیں ہیں۔ محمد رشاد شبر نے بتایا کہ پچھلی پارلیمانی کمیٹی کی رپورٹ بتاتی ہے کہ حکومت کے اسٹور فالتو پرزوں سے پُر ہیں۔ فواد نے بتایا کہ دراصل دو سال سے یہ تمام اسٹاک ختم ہوچکا ہے۔ محمد شعیر نے یہ تجویز پیش کی کہ فالتو پرزوں کی درآمد کے لیے ہمیں فوری سفارش کرنی چاہیے۔ نیز یہ ٹریکٹر سوشلسٹ یونینوں کے ذریعہ تقسیم نہ کیے جائیں۔"

کسانوں اور مزدوروں کے مسائل پر بھی گفتگو ہوئی۔ یہ گفتگو ایک وسیع ہال میں تھی۔ اور محفل میں ۳ ہزار کسان اور مزدور موجود تھے۔ انہوں نے تحقیقاتی بورڈ کے سامنے تین سو سے زائد اجتماعی اور انفرادی شکایات پیش کیں۔ ان میں زیادہ تر شکایتیں مزدوروں اور سرکاری ملازموں کے باہمی معاملات اور تعلقات کی خرابی سے متعلق تھیں۔ اصل خرابی یہ ہے کہ ڈائرکٹریٹ ہر مزدور اور ملازم کے ساتھ یومیہ اُجرت پر معاملہ کرتا ہے۔ اس اجرت کے علاوہ انہیں کسی قسم کا تحفظ حاصل نہیں ہے۔ کمال مرعی نے کہا: شکایات کی کثرت بتاتی ہے کہ کسانوں اور مزدوروں اور مختلف شعبوں کی انچارج ٹیموں کے درمیان کوئی کڑی غائب ہے۔ دراصل سیاسی اور ذہنی تربیت کا فقدان ہے۔" [2]

---

[1] مصر یہ تمام [illegible] روس اور مشرقی یورپ کے کمیونسٹ ممالک سے درآمد کرتا ہے۔

[2] [illegible]

[illegible]

"قومی زراعت" کا ایک اور تجربہ

جریدہ "روز الیوسف" میں سمیر عزت اپنے رپوتاژ میں لکھتا ہے :

یہ "ابوالغیط" بستی ہے جو قاہرہ سے صرف ۱۵ کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اس بستی کا ذکر اخبارات میں آ رہا ہے۔ حالانکہ اخبارات بستیوں کا ذکر صرف اسی وقت کرتے ہیں جب کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آ جائے۔ سیلاب آ جائے۔ یا آتش زدگی کا حادثہ رونما ہو جائے لیکن یہاں عجیب و غریب نوعیت کا حادثہ پیش آیا ہے : ۲۵ لاکھ پونڈ خاک میں مل گئے۔ حالانکہ حکومت ایک ایک پائی کی محتاج ہے"

"بڑے غور و خوض اور تجربات کے بعد طے پایا کہ بستی ابوالغیط ضلع قلیوبیہ میں اعلیٰ زمین کا انتخاب کر کے ۲۵۴ ایکڑ میں گلاڈیوس کے پھول کاشت کئے جائیں۔ ان پھولوں کی باہر کی منڈیوں میں بڑی مانگ ہے۔ ماہرین کا اندازہ تھا کہ ان پھولوں سے ہمیں کئی لاکھ پونڈ کا زرمبادلہ ملے گا۔ کیونکہ یہ پھول مصر میں ہر موسم میں کاشت ہو سکتا ہے۔ جبکہ ہالینڈ اور دوسرے ممالک میں سال کے صرف دو مہینے اس کے لئے مناسب فضا مہیا کرتے ہیں"۔

• گلاڈیوس کی کاشت کے لئے کسانوں سے زمینیں خالی کروا لی گئیں۔ حالانکہ وہ اپنی زمینوں کے سہارے جی رہے تھے اور پورے رقبہ میں سے صرف ایک سو ایکڑ میں گلاڈیوس کی کاشت کی گئی۔ ایک ایکڑ پر آٹھ سو پونڈ صرف ہوئے۔ گلاڈیوس کے پاس ہی تیس ایکڑ میں "منی میکر" ٹماٹر بوئے گئے۔ چنانچہ گلاڈیوس خوب بار آور ہوا۔ لیکن اسے برآمد کرنے کی کوئی تحریک نہ اٹھی۔ قلیوبیہ کی ضلعی کونسل میں عبدالغنی ابراہیم نامی ایک ممبر ۔ ڈویژنل افسر سے پوچھا کہ کسانوں سے جو زمین چھینی گئی ہے اس میں سے ۱۶۰ ایکڑ خالی پڑے ہیں انہیں کیوں چھوڑ دیا گیا ہے۔ وہ زمین اس وقت سیم اور تھور کی نذر ہو رہی ہے نیز گلاڈیوس کے پھول کیوں برآمد نہیں کئے گئے۔ حالانکہ بتایا گیا تھا کہ ان سے وافر مقدار میں زرمبادلہ حاصل ہو گا۔ اس سوال پر ضلعی کونسل کی طرف سے ایک کمیٹی مرتب کی گئی جو پوری صورت حال کا جائزہ لے"۔

• اس خبر کے بعد راقم الحروف (روز الیوسف کا نامہ نگار) بستی ابوالغیط گیا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ اہالیان قریہ "سوشل ریسرچ کمیٹی" کا بے صبری سے انتظار کر رہے ہیں۔ اس کمیٹی نے انہیں یہ اطلاع دی تھی کہ جونہی گلاڈیوس کے پھول چن لئے جائیں گے۔ یہ زمین اہالیان قریہ میں تقسیم کر دی جائے گی "سوشل ریسرچ" نے یہ زمین، جسے کسان اپنے بل بوتے پر برسوں سے کاشت کرتے چلے آ رہے تھے۔ خود ہی اپنے قبضہ میں لے لی تھی اور اسی کا یہ فیصلہ تھا، کہ گلاڈیوسس کی کاشت ناکام ہو گئی ہے، اس لئے اس زمین کو تقسیم کر دیا جائے گا"

"ضلعی کونسل کی کمیٹی جب اس بستی میں پہنچی تو لاتعداد کسان زمین حاصل کرنے کے لئے درخواستیں لئے ارکان کمیٹی کے اردگرد جمع ہو گئے۔ مگر انہیں یہ بتایا گیا کہ یہ "سوشل ریسرچ کمیٹی" نہیں ہے بلکہ ضلعی کونسل کی ایک کمیٹی ہے۔ اور تحقیق احوال کے لئے آئی ہے۔ کمیٹی نے چند گھنٹوں میں اپنی تحقیق مکمل کر لی۔ دوران تحقیق معلوم ہوا۔ کہ مقبوضہ زمین میں سے ۱۲۱ ایکڑ سیم اور تھور کی نذر ہو چکی ہے اور اسے کاشت نہ کرنے کی ذمہ داری زرعی اصلاحات کے نگران کی گردن پر ہے"۔

• ضلعی کونسل کے اجلاس میں کمیٹی کی رپورٹ پر غور کیا گیا۔ زرعی اصلاحات کے نگران نے سیم زدہ زمین کے وجود سے انکار کر دیا۔ کمیٹی کا اصرار تھا کہ ایسی زمین موجود ہے مگر نگران اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ ایک اور کمیٹی تشکیل کی گئی تاکہ مذکورہ زمین کو لاوارث چھوڑنے کی تحقیق کرے۔ اگلے روز ابوالغیط بستی میں نئی کمیٹی پہنچ گئی۔ دن بھر کی تحقیق سے نئی کمیٹی نے جو رپورٹ تیار کی اس نے سابقہ کمیٹی کے موقف کی توثیق کر دی۔ یہ راز بھی منکشف ہوا کہ زرعی اصلاحات کے ذمہ دار اصحاب نے اس مقبوضہ زمین کا کچھ رقبہ گلاڈیوسس کی کاشت کے بجائے اپنے کسی دوست کو مکئی کی کاشت کے لئے دے دیا تھا۔

نئی کمیٹی کی رپورٹ کے بعض قابل ذکر حصے یہ ہیں :-

"دریافت کیا گیا کہ ۱۲۱ ایکڑ زمین کو کیوں متروک رکھا گیا۔ جس کی وجہ سے وہ سیم اور تھور کی نذر ہو گئی۔ زرعی اصلاحات کے نگران نے کہا، یہ رقبہ "زیادہ

اگاؤ" مہم کے افسران کی طرف سے یکم جولائی ۱۹۶۲ء کو اس کی تحویل میں دیا گیا ہے۔ اس لئے وہ تاریخ مذکور سے اس زمین کا ذمہ دار ہے۔ اس سے پہلے جو کچھ ہوا ہے اس کی ذمہ داری "زیادہ اگاؤ" مہم کے افسران پر عائد ہوتی ہے۔ نگران نے یہ بھی تسلیم کیا کہ فی الواقع یہ زمین سیم زدہ ہو چکی ہے اور جس حصے میں کچھ کاشت کی گئی ہے وہ ضلعی کونسل میں اس موضوع کے چھڑنے کے بعد کی گئی ہو۔"

"نگران افسر سے دریافت کیا گیا کہ گزشتہ سال جب اس زمین کو کاشتکاروں سے حاصل کیا گیا تھا تو اس کے بعد اسے کاشت کیوں نہیں کیا گیا۔ سال بھر کیوں یہ خالی رہنے دی گئی۔ اس نے جواب دیا: اس رقبہ پر میں اپنی مرضی سے کوئی تصرف نہیں کر سکتا۔ زرعی اصلاح کا مرکزی دفتر ہی اس کے تصرف کا حق رکھتا ہے۔ اس نے بتایا کہ ۱۵ نومبر کو اس نے اپنے مرکزی دفتر سے ربط قائم کیا تھا اور درخواست کی تھی کہ اس رقبہ کو اُجرت پر کسانوں کو دے دیا جائے یا اسے کسی اور مصرف میں لایا جائے۔ اسے خالی نہ چھوڑا جائے۔ کیونکہ سیم کا خطرہ ہے۔ اس نے بتایا: یہ بھی طے تھا کہ اس رقبہ میں ۵۰ ایکڑ کے اندر آلوؤں کی کاشت ہوگی۔ آلوؤں کا بیج مشرقی جرمنی سے پہنچنے کی اطلاع تھی مگر یہ بیج نہیں پہنچا۔ اس نے بتایا کہ ۱۴ دسمبر کو اس نے ایک اور فوری چٹھی اپنے مرکز کو لکھی اس ارجنٹ چٹھی کا جواب اُسے مرکز کی طرف سے ۲ ماہ کے بعد دیا گیا۔ اور کہا گیا کہ یہ رقبہ جس چیز کے لئے مخصوص کیا گیا تھا۔ اسے کاشت نہیں کیا جائے گا۔ اس لئے یہ زمین اجرت پر کاشت کرنے والوں میں تقسیم کر دی جائے۔"

"کسانوں کو دو سال اس زمین سے محروم رکھنے کے بعد، اسے سیم اور تھور کے حوالے کرنے کے بعد اور گلاڈیوس کی کاشت کے تجربے کی خاطر اس پر ۸۰ ہزار پاؤنڈ صرف کرنے کے بعد مذکورہ بالا فیصلہ کیا گیا"۔

کمیٹی کی رپورٹ میں اور بھی کئی دلچسپ نکات ہیں:

۱۲۱ ایکڑ زمین کا عظیم رقبہ ۱۹۶۳ء سے بلا کاشت پڑا ہے یعنی جس تاریخ سے "زیادہ اُگاؤ" مہم کے دفتر نے اس زمین پر قبضہ کیا ہے۔ اس تاریخ سے یہاں ایک دانے کی کاشت نہیں کی گئی۔

جولائی ۱۹۶۴ء کو جب یہ رقبہ زرعی اصلاحات کی تحویل میں آیا تو اس تاریخ سے مسلسل اس زمین میں سیم اور تھور کا اضافہ ہو رہا ہے اور جب کمیٹی نے بیج کھاد اور کارکنوں کی اجرتوں کی رسیدیں طلب کیں تو معلوم ہوا کہ ان میں کوئی چیز بھی ذمہ دار اصحاب کے پاس نہیں ہے۔

یہ بھی ثابت ہوا کہ ۳۰ ایکڑ میں منی میکر ٹماٹر کی کاشت کی گئی تھی اور بڑی مقدار میں ٹماٹر پیدا ہوا تھا۔ لیکن وہ زمین پر ضائع ہو گیا۔ اسے استعمال میں نہیں لایا گیا۔ حالانکہ مارکیٹ میں ٹماٹر کی مانگ شدت پر تھی اور ایک سیر ۱۵ قرش (مساوی ۳ روپے پاکستانی) میں فروخت ہو رہا تھا۔

۳۰ ایکڑ پر گلاڈیوس کی کاشت کی گئی لیکن اُسے نہ تو برآمد کیا گیا اور نہ مقامی مارکیٹ میں سپلائی کیا گیا۔

کمیٹی نے اس سلسلے میں کچھ تجویزیں بھی پیش کیں مثلاً یہ کہ ایسے منصوبے پر جسے نگران مقرر کیا جائے اسے پورے اختیارات دئیے جائیں تاکہ وہ بروقت کوئی فیصلہ کر سکے۔ دفتری روٹین کے چکر میں اسے نہ ڈالا جائے۔

اب دو ہفتوں سے ضلعی کونسل کے اجلاسوں میں تند و تیز تقریریں ہو رہی ہیں اور ایک دوسرے پر الزامات عائد کئے جا رہے ہیں۔ کونسل کے ایک رکن نے بیان کیا کہ کمیٹی کی رپورٹ سے واضح ہوتا ہے کہ زرعی اصلاحات کا نگران افسر متضاد باتیں کرتا ہے۔ ایک اور رکن نے کہا: اس تمام پیداوار کے ضیاع کا سبب الوادی کمپنی ہے۔ اس کمپنی نے "زرعی بورڈ" سے ٹماٹروں کا ٹھیکہ لے رکھا ہے مگر افسوس ہے کہ کمپنی نے اپنی ذمہ داریوں کو ادا نہیں کیا۔ ایک اور رکن صفوت محی الدین نے کہا: دراصل اس ضیاع اور بربادی کا سبب زرعی اصلاح بورڈ کے چیئرمین اور "گارڈنز کمپنی" کے ڈائرکٹر کا ذاتی اختلاف ہے۔ اس ذاتی اختلاف کی قیمت مملکت نے ادا کی ہے۔

کونسل کا اجلاس اس قرارداد پر ختم ہوا کہ اس مسئلے کی عرب سوشلسٹ یونین کے جنرل سیکرٹری، نائب وزیر اعظم برائے زراعت اور دوسرے انتظامی اور تحقیقاتی اداروں کو اطلاع کی جائے ـــــــ یہ قصہ ابھی جاری ہے اور زمین ابھی تک نہ کاشتکاروں میں تقسیم کی گئی ہے اور نہ اجتماعی کاشت کے کسی منصوبے کی تحویل میں دی گئی ہے۔" [1]

روزمرّہ کی ضروریات اور سوشلزم

علاوہ ازیں مصر روز روز جن نئے مصائب سے دوچار رہتا ہے۔ ان کی فہرست اتنی ہی طویل ہے جتنی انسانی زندگی کی یومیہ ضروریات۔ مثلاً:

روزنامہ الاہرام ۲ راگست ۱۹۶۵ء کی اشاعت میں لکھتا ہے:

"اگلے سال ہمارا پالا گندم کے مسئلہ سے پڑنے والا ہے۔ مقامی ضرورت پوری کرنے کے لئے ہم دس کروڑ ڈالر کی گندم کے محتاج ہیں۔ یہ رقم ہمیں قرض لینا ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اس سے ترقیاتی منصوبے متاثر ہوں گے۔ قوم مسئلہ گندم کے معاملہ میں کیا کردار ادا کر سکتی ہے؟ ہمارا جواب یہ ہے کہ اس مسئلہ کو ہم "انقلابی عزم" سے حل کریں۔ ہم اپنی غذا میں کمی کریں۔ مکئی کی روٹی استعمال کریں اور روٹی کا ہرگز بے جا اسراف نہ کریں۔"

"قاہرہ میں تربوز بلیک مارکیٹ میں بک رہا ہے۔ کیونکہ حکومت نے اس کا ریٹ مقرر کر دیا ہے اور جب ایک تاجر سے اس کی بلیک مارکیٹنگ کی وجہ دریافت کی جاتی ہے تو وہ کہتا ہے: ہم تربوز کنٹرول کے بھاؤ پر نہیں بلکہ نیلامی کے ذریعہ خریدتے ہیں۔ نیلامی کے اندر بعض اوقات ایک ایک سیر کی قیمت ۳ اور ۴ قرش ہوتی ہے۔ اس لئے ہم حکومت کے مقرر کردہ نرخ پر ہرگز نہیں بیچ سکتے۔ وزارت خوراک اگر اسے مقرر نرخ پر بیچنا چاہتی ہے تو اُسے چھوٹے تاجروں پر بوجھ ڈالنے کی بجائے بڑے تاجروں کو قابو میں لینا چاہیئے۔"

"خفیہ پولیس کا بیان ہے کہ اس نے ۸۵ ایسے تاجروں کو گرفتار کر لیا ہے جو بلیک میں تربوز بیچ رہے تھے۔" [2]

"روزمرہ کی ضروریات کے بارے میں حکومت کی متضاد اور غیر منظم پالیسی کا یہ حال ہے کہ ٹھنڈے مشروبات جیسے عام ضرورت کی چیز سے قاہرہ محروم ہے۔ قاہرہ کی آبادی ۴۰ لاکھ سے متجاوز ہے۔ مگر اسے ٹھنڈا مشروب میسّر نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ میکڈونالڈ فیکٹری کی مشین ٹوٹ گئی ہے۔" [3]

"اسی طرح اسکندریہ میں ماچس نایاب ہے۔ سگرٹ فروش آزمائش میں گھر چکے ہیں۔ کیونکہ ان کا کاروبار ماند پڑ گیا ہے۔ قاہرہ اسکندریہ کو ماچس فراہم کر سکتا ہے لیکن اقتصادی پالیسی تنظیم اور ہم آہنگی کی صفت سے عاری ہے۔" [4]

مصر کی نیشنل اسمبلی کے اسپیکر انورالسادات کی اہلیہ سکینہ السادات لکھتی ہیں:

"ہم جب منصورہ پہنچے تو منصورہ کے ڈپٹی کمشنر نے اپنے دفتر میں ہمارا استقبال کیا۔ انہوں نے مجھے کہا کہ: میں چند منٹ آپ سے علیحدگی میں بات چیت کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد مسٹر اسماعیل فرید نے آبدیدہ ہو کر کہا: منصورہ فوڈ سپلائی سے ناواقف ہے۔ کئی روز ہو چکے ہیں یہاں مٹی کے تیل کا سٹاک ختم ہو چکا ہے۔ عوام کی ٹولیاں میرے دفتر کے اردگرد جمع ہو جاتی ہیں اور خالی کنستر پیٹ پیٹ کر مجھ سے تیل کا مطالبہ کرتی ہیں اور آپ حیران ہوں گے کہ میری بے بسی کا یہ عالم ہے کہ میں عوام سے زبانی طور پر بھی کسی چیز کا وعدہ نہیں کر سکتا اور نہ مجھے اس مشکل کا کوئی حل نظر آتا ہے۔ فوڈ سپلائی کا سارا نظام وزارت خوراک کے ہاتھ میں ہے اور مقامی انتظامیہ کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" [5]

---

[1] ملاحظہ ہو جریدہ "روز الیوسف" شمارہ ۲۸ جون ۱۹۶۵ء رپورٹ سمیر عزت [2] روزنامہ الاخبار ۲۴ جون ۱۹۶۵ء [3] روزنامہ الاخبار شمارہ ۲۴ جون ۱۹۶۵ء [4] ایضاً [5] ملاحظہ ہو ہفت روزہ المصور، قاہرہ، شمارہ ۱۱ جون ۱۹۶۵ء

سوشلزم اور بدعنوانیاں اور بلیک مارکیٹ

"قاہرہ کی سیکورٹی پولیس کے بیان کے مطابق صرف قاہرہ میں ۳ ہزار جیب کترے موجود ہیں۔ قاہرہ سیکورٹی پولیس کے انسپکٹر جنرل نے نیشنل اسمبلی اور سوشلسٹ یونین کی عوامی تنظیموں کے نمائندوں کا ایک اجتماع منعقد کیا اور ان کے سامنے اس خطرناک صورتِ حال کو رکھا۔ اسمبلی کی ایک رکن خاتون مفیدہ عبدالرحمان نے کہا: سوشلسٹ یونین کے ارکان کا فرض ہے کہ وہ عوام کو باشعور بنائیں اور انہیں تربیت دیں کہ وہ اپنی جیبوں کی حفاظت کریں۔" سوشلسٹ یونین کے اسسٹنٹ سکرٹری نے یہ تجویز پیش کی کہ ان لوگوں کے لئے کیمپ قائم کئے جائیں اور وہاں انہیں مختلف کاموں کی تربیت دی جائے اور انہیں کام کا اتنا معاوضہ بھی دیا جائے کہ اس سے ان کی اور ان کے اہل وعیال کی ضروریات پوری ہوسکیں۔

سیکورٹی پولیس کا بیان ہے کہ جیب کتروں میں ۱۵۰ عورتیں ہیں اور ۷۰۰ سو کم عمر لڑکے۔ اور جو جیب کترے گرفتار ہوچکے ہیں وہ محض اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے پولیس کے قابو میں آئے ہیں ورنہ ماہر جیب کترے پولیس کی گرفت سے باہر ہیں اور ان کی صحیح تعداد بتانا مشکل ہے۔"[1]

"قلیوب کی عدالت سے مقدمات کی فائلیں چوری ہوگئیں اور انہیں جلادیا گیا۔ ان فائلوں میں ۱۵ فوجداری مقدمات اور ۸ دوسرے مختلف مقدمات تھے اس حادثے کے معائنہ کے لئے قاہرہ سے وزیر انصاف اور پولیس کے افسر اور اٹارنی جنرل جاتے ہیں۔ وزیر انصاف کا بیان ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں ایسا حیرت ناک واقعہ کبھی نہیں دیکھا۔"[2]

"مصر کو آج ۴۵ ہزار نرسوں کی ضرورت ہے۔ نرسنگ کا پیشہ انتشار اور افراتفری سے دوچار ہے۔ ڈاکٹروں کا بیان ہے کہ یہ انتشار اس وجہ سے برپا ہے کہ ۷۲ فی صد اپریشن کیس ناکام ہورہے ہیں۔ اس وقت ہسپتالوں میں نرسوں کا تناسب یہ ہے کہ ہر نرس یومیہ ۵۰ مریضوں کی دیکھ بھال کی ذمہ دار ہے۔ ایک نرس ہفتے میں ۷۰ گھنٹے کام کرتی ہے اور اس کے باوجود ۱۵ اور ۲۰ سال کی سروس کے بعد بھی نرس کو ۱۰ اور ۱۲ پونڈ ماہانہ سے زیادہ تنخواہ نہیں ملتی۔"[3]

"ہر بلیک مارکیٹ کے پیچھے کسی نفع خور تاجر یا خطرناک اسمگلر یا رشوت خور ملازم کا ہاتھ کام کر رہا ہوتا ہے۔ پچھلے ہفتے کاربن پیپر بھی کالے بازار میں اتر گیا اور بحث وتحقیق کے بعد "روز الیوسف" کو معلوم ہوا ہے کہ اس کھیل کے پیچھے "کورس" فیکٹری کا ہاتھ ہے۔ یہ فیکٹری اپنی پروڈکشن قاہرہ کے صرف تین بک سیلرز کو دیتی ہے۔ یہ تینوں بک سیلرز ذخیرہ اندوزوں اور منافع خوروں کا رول ادا کر رہے ہیں اور اس پر پردہ یہ کہہ کر ڈالا جاتا ہے کہ کاربن پیپر کی قلت اس لئے ہوتی ہے کہ یہ سرکاری دفاتر اور دیگر سرکاری فرموں اور کمپنیوں کو سپلائی کیا جاتا ہے۔ فیکٹری کے مالک صفی الدین محمود اور مذکورہ بک سیلرز باہمی تعلقات اور گٹھ جوڑ کے ذریعہ غیر معمولی نفع حاصل کرچکے ہیں۔ پولیس کے دو سب انسپکٹر سفید لباس میں فیکٹری کے مالک کے پاس کاربن پیپر کی طلب لے کر گئے مگر اس نے طرح طرح کے عذرات پیش کئے۔ بالآخر پولیس نے چھاپہ مارا اور فیکٹری کے اندر سے ۲۷۵ ۳ پیکٹ برآمد کئے ہر پیکٹ ایک سو دستوں پر مشتمل تھا۔"

"تحقیق کے دوران معلوم ہوا کہ صنعتی سنسر شپ بورڈ کے ایک ملازم علی غراب جو ہیبٹ بیٹری کمپنی کی انتظامیہ کا بھی رکن ہے کا بھی اس کاروبار میں حصہ ہے صفی الدین محمود اور فیکٹری کے مالک کے درمیان یہ سازش ہو رہی تھی کہ موجودہ اسٹاک ختم کردینے کے بعد فیکٹری کو اس بہانے سے بند کر دیا جائے کہ اس کی مشینری میں نقص پیدا ہوچکا ہے لیکن اس آخری اقدام سے پہلے وہ اپنا تمام سرمایہ ملک سے باہر اسمگل کرنا چاہتے تھے۔ ۵ لاکھ پونڈ وہ بالفعل اسمگل کرچکے ہیں۔"[4]

مصر کی اندرونی زندگی کا اجمالی نقشہ

آخر میں ہم ایک عرب مصنف کی زبان سے "سوشلسٹ مصر" کے داخلی حالات کا اجمالی نقشہ پیش کرتے ہیں۔ مصنف کہتا ہے:[5]

---

[1] ایضاً [2] روز الیوسف ۲۴ مئی ۱۹۶۵ء [3] روزنامہ الاہرام ۳۰ اپریل ۱۹۶۵ء [4] روز الیوسف شمارہ نمبر ۱۹۲۸ ۱۹۶۵ء [5] یہ پورا بیان ہم نے احمد فواد الیاقی کی کتاب "لیمان لا تیشا بحان" سے لیا ہے۔ ملاحظہ ہوں صفحات ۷۲ تا ۸۸۔

مصر اندرونی طور پر ڈانواں ڈول ہے اور اندرونی انقلاب کی علامات واضح سے واضح تر ہوتی جا رہی ہیں۔ اس کا سبب وہ پے در پے ضربات ہیں جو داخلی طور پر بھی اور خارجی طور پر بھی مصر کو لگ رہی ہیں۔ داخلی طور پر ضروریات زندگی کی کمیابی اور گرانی کی وجہ سے عوام کی شکایات بڑھتی جا رہی ہیں۔ خارجی طور پر دیکھا جائے تو مصر کثیر المصارف جنگ میں غوطے کھا رہا ہے اور اپنے یمنی بھائیوں سے برسر پیکار ہے۔ یمن کی جنگ کی وجہ سے اور مصر کی اقتصادی بدحالی کی وجہ سے قاہرہ مایوسی، بددلی اور ناکامی کے احساسات میں ڈوبا ہوا ہے۔ یمن کی جنگ ۴ سال سے افتاں و خیزاں ہے۔ مصر کو اس میں جو نقصانات پہنچے ہیں، وہ شمار سے باہر ہیں۔ اس جنگ میں مصر کئی بلین ڈالر ضائع کر چکا ہے۔ لیکن اس عظیم قربانی کے مقابلے میں اسے کوئی مادی یا اخلاقی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ یمن کی جمہوری حکومت اس وقت ملک کے جس حصہ پر قابض ہے وہ مصر کی دخل اندازی کے بعد سے مسلسل سکڑتا جا رہا ہے۔ جو مصری یمن سے واپس آتے ہیں وہ نہایت تلخ یادوں اور ناکامی کے جذبات سے لبریز ہوتے ہیں۔ جذبۂ انتقام ان کے رگ و پے میں سرایت کر رہا ہوتا ہے۔ جمال عبدالناصر نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ یمن کی جنگ کو محدود پیمانے پر جاری رکھیں گے اور ترک یمن کے لئے وہ کوئی عجلت میں معاہدہ نہیں کریں گے۔ اس فیصلے سے مصریوں کے رنج و غم اور غیظ و غضب میں کوئی تخفیف نہیں ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ صدر مصر یمن میں اپنی فوجیں باقی رکھنا چاہتا ہے تاکہ وہ ۱۹۶۸ء میں عدن سے برطانوی انخلاء کے بعد وہاں اپنی حکومت قائم کر سکے۔"

"اقتصادی مشکلات نے مصر کی اکثریت کے دل میں احساس ناکامی جاگزیں کر دیا ہے۔ پچھلے چند مہینوں میں مصارف زندگی کا دباؤ ہر حد کو پھاند چکا ہے۔ اس کا بڑا سبب حکومت کی یہ پالیسی ہے کہ تیار شدہ اشیاء عوام الناس کو کم از کم مہیا کی جائیں۔ لیکن اکثر مصریوں کو شکایت ہے کہ حکومت کی یہ پالیسی حدود اختیارات سے تجاوز کے مترادف ہے۔ مختلف مصنوعات پر نئے ٹیکسوں کی وجہ سے بھی صارفین کے لئے ان اشیاء کا حصول ناممکن ہو رہا ہے۔ بعض اشیاء کی قیمتوں میں پچھلے سال سے پچاس فی صد اضافہ ہو گیا ہے اور جو اشیاء قسطوں پر مل سکتی تھیں۔ ان کا قسطوں پر ملنا محال ہو چکا ہے۔ درآمدات پر نیا ٹیکس لگایا گیا ہے اس کے نتیجے میں اب مستعمل گاڑی بھی صرف چند خوش قسمت مصریوں کے نصیب میں رہ گئی ہے۔ مثلاً فورڈ گاڑی جو تین سال استعمال ہو چکی ہو۔ اس وقت قاہرہ میں ۹ ہزار ۵ سو ڈالر میں فروخت ہو رہی ہے۔"

"اشیائے خوردنی کی قیمتوں نے شہریوں کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ سبزیوں کے بھاؤ دوگنے ہو چکے ہیں۔ گوشت کا نرخ بالا سے بالا تر ہوتا جا رہا ہے۔ ہفتہ میں صرف تین روز گوشت مل سکتا ہے۔"

"مصر کی اکثر و بیشتر مصنوعات ناقص اور گھٹیا ہیں۔ جس بات نے مصر کو سب سے زیادہ پریشان کر رکھا ہے وہ یہ ہے کہ کارخانوں، بسوں اور نقل و حمل کی گاڑیوں کے لئے فالتو پرزے موجود نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر چیز باقاعدہ تحفظ چاہتی ہے اور اس کی ذرا سی خرابی بھی مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔ مگر حکومت کے پاس ڈالر اور اسٹرلنگ کی کرنسی نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس لئے مصر فالتو پرزے خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا اور نہ صنعتی مواد درآمد کر سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ مصر کی صنعت انحطاط پذیر ہے۔ مصر میں اس وقت گاڑیوں کی ترکیب کے دو کارخانے ہیں۔ ایک اسکندریہ میں فورڈ کا کارخانہ اور دوسرا قاہرہ میں فیٹ کا کارخانہ۔ لیکن ان دونوں کارخانوں نے کئی ماہ سے ایک بھی مسافر بس تیار نہیں کی ہے۔"

"حلوان کا فولاد کا کارخانہ، جس پر صدر ناصر ہمیشہ ناز کرتا رہا ہے۔ اب نصف پیداوار پر آ چکا ہے۔ ایسے کارخانے اور فیکٹریاں جن کی پیداوار فالتو پرزوں کی قلت کی وجہ سے انتہائی گر چکی ہے۔ ایک سو سے متجاوز ہیں۔"

"مصر کی ریزرو ہارڈ کرنسی جس کی مقدار صرف ۵۰ لاکھ ڈالر ہے۔ مزید کم ہوتی جا رہی ہے۔ قاہرہ کے ہوٹل مغربی دنیا کے کاروباری لوگوں سے بھرے رہتے ہیں۔ ان کی آمد کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے بھاری بھرکم سرمائے میں سے وہ معمولی مقدار جس کی انہیں حکومتِ مصر کی طرف سے اجازت مل چکی ہے، نکال کر باہر لے جائیں۔ مصری خزانہ خوفناک صورتِ حال سے دوچار ہے۔ مصر ۱۹۵۲ء سے آج تک تین سو پچاس کروڑ ڈالر اقتصادی امداد حاصل کر چکا ہے جس میں تہائی

سے زیادہ لئے امریکہ سے ملی ہے مگر بایں ہمہ اس کا خزانہ مفلس کا چراغ بنا ہوا ہے۔"

"امریکی امداد کو وہ پروپیگنڈا نصیب نہیں ہو سکا جو روسی امداد کو نصیب ہوا ہے لیکن امریکی امداد کے نتائج بھاری بھرکم رہے ہیں۔ امریکہ کی غذائی امداد کو صرف کرنے والے ممالک میں مصر سر فہرست ہے۔ "غذا برائے امن" کے پروگرام کے تحت امریکہ مصر کے مختلف شہروں کو ۸۰ فیصد آٹا اور گندم مہیا کرتا ہے۔ علاوہ ازیں امریکہ کے دوسرے خیراتی ادارے ۳۰ لاکھ سے زائد مصری بچوں کو غذا فراہم کرتے ہیں۔ زرعی اصلاحات کا تمام پروگرام امریکی قرضے کی بدولت جاری ہے۔ مصر کی پختہ شاہراہوں میں سے ۲ ہزار میل لمبا ٹکڑا امریکی سرمائے سے بنا ہے۔ اس طرح عہد ناصری کے اسکولوں کے ۲۹ فیصد کلاس روم، اور ۲ فیصد ہیلتھ سنٹر امریکی امداد سے قائم کئے گئے ہیں۔ قاہرہ کا الیکٹرک پاور اسٹیشن مشرق اوسط کا سب سے بڑا بجلی گھر سمجھا جاتا ہے اس کی تعمیر میں بھی امریکی مالیات نے حصہ لیا۔ یہ قرض امریکہ کو ۴۰ سال کے اندر بالاقساط واپس کیا جائے گا اور اس پر امریکہ کو سود کی بھاری رقم بھی وصول ہوگی۔"

"لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مصر کئی سال سے بھاری بھرکم امداد حاصل کر رہا ہے اس کے باوجود مصری اقتصادیات کیوں افسوسناک حالات میں گھر چکی ہیں۔ اس سوال کے جواب میں غیر ملکی مبصرین نے مختلف خیالات پیش کئے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے:

"عبدالناصر نے ہوا میں اڑنا شروع کر دیا اور صنعتی میدان میں کمل منصوبہ بندی کئے بغیر ضرورت سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ اقدامات کرنا شروع کر دیئے۔ عبدالناصر اس خام خیالی میں مبتلا تھا کہ وہ اپنے مختلف منصوبوں کے ذریعہ مصر کو یک لخت عالمی اسٹیج پر اہم کردار ادا کرنے کے لئے تیار کر لے گا۔ انہی منصوبوں نے ملک کی آمدنی میں گہرے خلا پیدا کر دیئے۔"

"ایک طرف صنعت، بنک، ذرائع نقل وحمل اور بیرونی تجارت کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا اور دوسری طرف نااہل بیوروکریسی نے اندھیر گردی مچا دی۔"

"مصر سینکڑوں کارخانے قائم کرنے کی خواہش پوری کرنے کے لئے مجبور تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ غیر ملکی قرضے حاصل کرے۔ اس کے ساتھ بکثرت تعمیری پروجیکٹوں کے شروع ہو جانے سے ملکی آمدنی نے قوت خرید نہ صرف ناقابل تصور حد تک بڑھا دی اور حکومت وسیع پیمانے پر اشیاء درآمد کرنے پر مجبور ہو گئی۔ اس دوران مصر نے اربوں ڈالر جیٹ طیاروں اور راکٹوں کے حصول پر خرچ کر دئے۔ روسی اسلحہ کی خریداری بھی وسیع پیمانے پر ہوئی۔ اور بھی دوسرے متعدد اعلانیہ اور خفیہ کام مصر کے باہر یمن، عراق، لبنان، شام اور اردن میں سرانجام دیئے گئے۔ ان سب نے مصری اقتصاد کو چوس لیا۔"

"زراعت پر مصر نے بہت کم توجہ دی ہے۔ جدید طریقوں پر کاشت کرنے والے کسانوں کی تعداد بہت کم ہے حکومت کی سال گزشتہ کی سرکاری رپورٹ کے مطابق کسانوں کی ۹۹ فی صد تعداد جھونپڑوں میں رہتی ہے اور بنیادی سہولتوں سے محروم ہے۔ مصر کے اکثر گاؤں ایسے ہیں جن میں نہ بجلی ہے اور نہ طبی امداد کا انتظام ہے۔ کسان کی آمدنی بہت معمولی ہے۔ اسے صرف دو وقت کی روٹی میسر ہے۔ جو غلہ پیدا کرتا ہے اس سے بمشکل اپنی گزر اوقات کر سکتا ہے۔ اس پیداوار میں سے بڑے شہروں کو صرف ۱۵ فیصد سپلائی ہوتا ہے حکومت نے اکثر و بیشتر صنعتی منصوبے اپنے ہاتھ میں لے لئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرکاری انتظامیہ کا اکثر حصہ صنعت کی طرف منتقل ہو گیا۔ چنانچہ مصری صنعت کا نظم ونسق اپنی سابق ملازموں کے ہاتھ میں ہے۔ ان کی اکثریت سابق فوجیوں پر مشتمل ہے۔ ناتجربہ کاری نے صنعت کا معیار پست کر دیا ہے اور اکثر و بیشتر مصنوعات معطل پڑی ہیں۔ کارخانوں کے اندر بلا ضرورت مزدور بھرتی کر دیئے گئے ہیں۔ مصر کے اندر بے روزگاری اس حد تک پھیل چکی ہے کہ حکومت بلا ضرورت لوگوں کو کارخانوں میں بھرتی کرنے پر مجبور ہے۔"

"نظری طور پر تو حکومت مصر غیر ملکی سرمائے کا خیر مقدم کرتی ہے مگر عملی زندگی میں یہ خیر مقدم بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔ غیر ملکی کاروباری حضرات مصر کی بیوروکریسی کے بارے میں گہرے شکوک وشبہات میں مبتلا ہیں۔ اس لئے خواہ کتنا ہی بڑا منصوبہ ہو اور اس میں مصر کو کتنا ہی بڑا فائدہ حاصل ہو کسی نتیجہ خیز گفتگو تک پہنچے بغیر ختم ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک امریکی سرمایہ دار نے یہ پیش کش کی تھی کہ وہ مصر میں کپڑے کو ڈھے ملانے والی دوائیوں کا کارخانہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ مصری زراعت کو ان

دواؤں کی شدید ضرورت ہے مگر امریکی کمپنی کئی جیتے جی حکومت کے فیصلہ کی منتظر ہیں۔ اسی دوران زرعی موسم کی وجہ سے ملک کو ان دوائیوں کی شدید ضرورت لاحق ہو گئی۔ چنانچہ یہ دوائیاں باہر سے منگوائی گئیں اور ان پر مصر کو جو قیمت ادا کرنا پڑی وہ کمپنی کی قیمتوں سے دوگنا تھی۔ مشرقی میدان میں نہایت پسماندہ ہے اور اسے وافر مقدار میں دوائیوں کی ضرورت ہے۔ مصر کی دواسازی کی ایک کمپنی مدت سے اپنے کام کو ۲۰ لاکھ ڈالر کے صرفہ سے وسعت دینے کی کوشش کر رہی ہے مگر اسے کامیابی نہیں ہو رہی ہے۔ سرکاری ملازمین شخصی اغراض کی وجہ سے اس کام میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔"

"فورڈ کمپنی نے بسوں، ٹرکوں اور کاروں کی ترکیب نئے سرے سے شروع کرنے کے لئے فالتو پرزے باہر سے منگوانے کے لئے ایک معاہدہ کرنا چاہا مگر بیورو کریسی نے اس معاہدہ سے اتفاق کرنے کی بجائے اسپین سے ۱۵ سو نئی بسیں درآمد کر لیں۔"

اسوان ڈیم صرف دس لاکھ ایکڑ زمین سیراب کر سکے گا۔ حالانکہ مصر کا ۹۶ فی صد صحرا ہے اور تمام کاشتکاروں کے ڈیلٹا اور کناروں پر آباد ہیں۔ دس لاکھ ایکڑ کی سیرابی کے لئے مصر نے اپنی تمام اقتصادی ترو تازگی کو اسوان ڈیم پر نچھاور کر رکھا ہے۔ ماہرین اسوان ڈیم کے بارے میں اس خطرہ کی نشاندہی بھی کر رہے ہیں کہ اگر کسی وقت دشمن نے اس ڈیم پر بمباری کر دی تو قاہرہ کا تاریخی شہر پوری طرح غرقاب ہو جائے گا۔"

ہم آخر میں صرف یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا یہی وہ اشتراکی جنت ہے جس کی طرف سوشلزم کے علمبردار دکھی انسانیت کو بلا رہے ہیں؟

عرب بعث پارٹی

کی قومی اشتراکیت

احمد اسحٰق انصاری

نوٹ: ۔ اس مقالے میں بعث پارٹی کے افکار و نظریات کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ جہاں تک عملی کارناموں کا تعلق ہے، اس کا مطالعہ اس مضمون میں ہمارے پیشِ نظر نہیں رہا ۔ مضمون لکھا جا چکا تھا کہ برادرِ محترم خلیل حامدی صاحب کے دو بصیرت افروز مقالات نگاہ سے گذرے، جن کا مطالعہ اس مضمون کے سلسلے میں قارئین کے لیے مفید ہوگا۔ ایک مقالہ تو چراغِ راہ کی اس اشاعت میں شائع ہو رہا ہے اور دوسرا ترجمان القرآن، لاہور کی اشاعت اگست ۱۹۶۳ء میں شام کی حزب البعث کے نام سے شائع ہوا ہے ۔

موجودہ مضمون میں جس دور کو خاص طور پر پیشِ نظر رکھا گیا ہے وہ بعث پارٹی کی تاسیس سے لے کر ۱۹۶۳ء تک کا دور ہے ۔ دوسرے الفاظ میں ہم نے اپنی توجہ بعث پارٹی کے بانیوں کی فکر سمجھنے پر صرف کی ہے ۔ بعث پارٹی کی موجودہ قیادت کے افکار کا مطالعہ ایک علیحدہ مضمون کا تقاضا کرتا ہے ۔ (ط - ا)

دوسری عالمگیر جنگ کا اختتام دنیا کے دوسرے محکوم ملکوں کی طرح متعدد عرب ممالک کے لیے بھی آزادی کی نوید لایا۔ شام اور لبنان، جو فرانس کے زیرِ اقتدار تھے، جلد ہی آزادی سے ہمکنار ہو گئے ۔ مصر، عراق اور شرقِ اردن میں، جو برطانیہ کے زیرِ اثر تھے ۔ حریت پسندوں نے مکمل آزادی کی جد و جہد تیز کر دی۔ شمالی مغربی افریقہ میں بھی بیرونی اقتدار کے خلاف ایک عظیم جہادِ آزادی کا پرچم بلند ہوا ۔ لیکن ابھی عرب، مکمل آزادی کی جانب گام زن ہوئے ہی تھے کہ دنیا کی دونوں عظیم طاقتوں —— امریکہ اور روس —— نے مل کر عرب دنیا کے سینے میں اسرائیل کا زہریلا خنجر پیوست کر دیا۔ عرب ریاستوں نے مسلح مزاحمت کی، لیکن وہ ناکام رہے اور اقوامِ متحدہ کی کوشش سے جنگ بندی کرا دی گئی اور اس طرح کرائی گئی کہ خود اقوامِ متحدہ کی مجوزہ حدود سے بہت زیادہ علاقہ اسرائیل کے قبضے میں آ گیا ۔

جنگِ فلسطین میں عرب ممالک کی اہانت آمیز شکست نے عربوں کو جھنجھوڑ ڈالا ۔ اس شکست کی تلخی ان کے رگ و پے میں سرایت کر گئی ۔ جنگِ فلسطین نے عربوں کی قومی زندگی کی کمزوریوں کا پردہ بڑی بے رحمی سے چاک کر کے رکھ دیا ۔ ان کی آپس کی نااتفاقی اُن کی پسماندگی، اُن کی قومی زندگی میں بے ایمانی اور خیانت کی گرم بازاری ۔ اُن کے عیاش، ناکارہ اور ناعاقبت اندیش حکمرانوں کی قومی

مفادات کو خاص مفادات پر ترجیح دینے سے دریغ نہ کرنے کی روش — غرضیکہ اُن کی قومی زندگی کا ایک ایک ناسور نمایاں ہو گیا[۳] اس کے نتیجے کے طور پر عربوں کا اپنے حکمرانوں پر سے اعتماد اٹھ گیا۔ اس جنگ نے بگاڑ کی ایک ایسی بھیانک تصویر پیش کی کہ اُن میں یہ احساس عام ہونے لگا کہ ان خرابیوں کو کسی معتدل اصلاحی جدوجہد کے ذریعے نہیں دور کیا جا سکتا، بلکہ اس کے لیے کسی ایسے زلزلہ انگیز انقلاب کی ضرورت ہے، جو اُن کی قومی زندگی کی کایا پلٹ دے۔ اپنے حالات سے شدید بے اطمینانی اور بیزاری، اور ان حالات کو آن کی آن میں بدل دینے کی خواہش نے عرب ممالک میں ایک ایسی فضا پیدا کر دی، کہ پرانے سیاستدان حالات کی زمام اپنے ہاتھوں میں نہ رکھ سکے۔ ان سیاست دانوں کا سب سے بڑا اثاثہ یہ تھا کہ آزادی کی جنگ اُن کی رہنمائی میں لڑی گئی تھی۔ لیکن حصولِ آزادی کے بعد یہ رہنما اپنا تاریخی کردار ادا کر کے، بڑی حد تک مردِ فاضل بن چکے تھے، اس لیے کہ ان کے پاس قومی تعمیر کا کوئی قابلِ قبول نقشہ نہ تھا۔ نئی نسل، مروجہ نظامِ زندگی سے بیزار ہو رہی تھی۔ اور اُن کا بنیادی کردار اس نظام کا تحفظ تھا۔ یہ وہ حالات ہیں جن میں ۱۹۵۰ء کے قریب متعدد عرب ممالک میں عربوں کے متوسط طبقے میں ان تحریکوں کو پذیرائی حاصل ہونی شروع ہوئی۔ جو نئی نسل کے ان باغیانہ اور انقلابی جذبات کی ترجمان تھیں

اس زمانے میں جن پارٹیوں کی ہر دلعزیزی میں نمایاں اضافہ ہوا، ان میں حزب البعث بہت نمایاں ہے، یہ پارٹی اگرچہ ۱۹۴۰ء میں قائم ہوئی تھی، لیکن سطحِ عام پر اس کی سرگرمیوں کا آغاز ۱۹۴۳ء میں ہوا۔ ۱۹۵۰ء کے قریب بیزاری، مایوسی اور جھنجھلاہٹ کی فضا میں شام، اردن اور عراق کے تعلیم یافتہ طبقے میں بعث پارٹی کو غیر معمولی فروغ کا موقعہ ملا، اور ۱۹۵۶ء تک اس کے اثرات اتنے بڑھ چکے تھے، کہ شام کی سیاستِ خارجہ اس کے اشاروں پر حرکت کرنے لگی تھی۔

بعث پارٹی بڑی حد تک بجا طور پر اپنی منفرد حیثیت پر نازاں ہے[۵]، اور الاخوان المسلمون (جو بعض وجوہ کی بناء پر عرب ممالک کی تمام جماعتوں سے، بشمول بعث۔ بنیادی طور پر مختلف ہے) اور کمیونسٹ پارٹی (جس کے اثرات کم سے کم ۱۹۵۵ء تک عرب ممالک میں بہت محدود تھے) کے علاوہ بعث ہی وہ واحد پارٹی ہے جس نے اپنے لیڈروں کے کارناموں کی یاد، یا اُن کی شخصی، بلکہ موروثی اثرات کی بناء پر مقبولیت حاصل نہیں کی، بلکہ وہ لوگوں کے سامنے ایک نظریے اور پروگرام کے ساتھ آئی، اور اس نے لوگوں کو ان کے گرد جمع کرنے کی کوشش کی۔ اس پارٹی کے بانی میشیل عفلق[۶] اور ان کے قدیم دوست اور دستِ راست صلاح الدین البیطار نے جب یہ پارٹی قائم کی، تو ان دونوں کی عمر ۳۰ برس کے لگ بھگ ہو گی۔ دوسرے سیاسی لیڈروں کے برعکس یہ سیاست کے میدان میں شہرت یافتہ سیاسی لیڈروں کے طنطنہ اور طمطراق کے ساتھ نہیں داخل ہوئے، بلکہ سیاسی مفکر کی حیثیت سے داخل ہوئے، اور ان کے مخاطب، عوام سے زیادہ تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لیے بھی وہ ایک عرصے تک جلسوں اور تقریروں کی بجائے کتابوں، چھوٹے چھوٹے پمفلٹوں، اور اخبارات کو استعمال کرتے رہے[۷]۔

بعث پارٹی کا امتیازی وصف یہ ہے، کہ اُس نے قومیت (نیشنلزم) اور اشتراکیت (سوشلزم) کے امتزاج سے ایک نیا سماجی فلسفہ اور سیاسی پروگرام پیش کیا۔ عرب ممالک میں بعث سے پہلے بھی عرب قومیت کا نظریہ پیش کیا جا چکا تھا۔ ایک نظریے کی حیثیت سے ساطع الحصری اور دوسرے عرب مفکر اس کی بڑی موثر وضاحت اور وکالت کر چکے تھے[۸] قومی نظریے کے بارے میں بحث و تمحیص کے نتیجے کے طور پر عرب قوم اور عرب قومیت کے تشکیلی عوامل کے بارے میں وہ نظریات جو عرب قومیت کے موجودہ فلسفے کی بنیاد ہیں، سامنے آ چکے تھے۔ خود عرب قومیت کے ان مقاصد کی بھی وضاحت ہو چکی تھی جو آج بھی عرب قومیت کے مسلمہ مقاصد میں

بیرونی طاقتوں کے غلبے سے نجات اور تمام عرب ممالک کا اس بنیاد پر اتحاد کہ تمام عرب ایک قوم ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ان خیالات کو بہت سے عرب ہمدردی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان سب کے باوجود یہ نظریات کسی جاندار عملی تحریک کی بنیاد نہ تھے۔ عرب بعث پارٹی کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ان نظریات کو اپنے سیاسی پروگرام اور سرگرمیوں کا مرکز و محور بنا دیا۔ علاوہ ازیں اس نے قومیت و اشتراکیت کو لازم و ملزوم قرار دے کر قومی آزادی اور اتحاد کے ساتھ ساتھ اشتراکی سماج کے قیام کو عرب قومی تحریک کا ہدف قرار دیا۔ اس طرح اس نے عرب ممالک کے ان لوگوں کے لیے جو جدید تعلیم یا جدید تہذیب کے اثرات کی بنا پر اسلام کو انسان کی پوری زندگی کے لیے اصول کے طور پر تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے، ایک متبادل اصول پیش کیا، جس کے مطابق قومی زندگی کی تشکیل کی جائے۔ دوسرے الفاظ میں نظریاتی اعتبار سے بعث پارٹی کی قومی اشتراکیت ان عربوں کی ایک بنیادی ضرورت کو پورا کرتی ہے، جو لادینیت کی طرف میلان رکھنے کی بنا پر اس سوال کا جواب طلب کرتے رہے ہیں کہ اگر اسلام کو قومی زندگی میں مرکزیت کے مقام سے بے دخل کر دیا جائے، تو اس سے پیدا شدہ خلا کو کس طرح پر کیا جا سکتا ہے۔

(۱)

عرب قومیت

جہاں تک عرب قومیت کی نظریاتی توضیح کا تعلق ہے، اس میں بعث مفکروں کا حصہ کچھ زیادہ اہم نہیں معلوم ہوتا۔ نہ صرف یہ، بلکہ اس مسئلے پر مجرد نظری بحث کو وہ ایک حد تک تحصیل حاصل بلکہ مضر قرار دیتے رہے ہیں۔[9] ان کا نقطۂ نگاہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ عرب قومیت، نظری بحث و تمحیص کی چیز نہیں، بلکہ ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے، اور اس قسم کی حقیقت ہے جسے کسی نظری دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ "تمام عرب ایک قوم ہیں اور ایک ابدی مشن کے علم بردار"[10] اسی جملے کو بعث پارٹی کے بنیادی عقیدے کی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن عرب کون ہیں، اور یہ کس طرح ایک قوم بن گئے۔ اس پر بعثی تحریروں میں اگرچہ زیادہ طویل بحثیں نہیں ملتیں، پھر بھی بعض اشارے ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے دوسرے عرب قوم پرست مفکروں کے افکار معمولی سے رد و بدل کے بعد اپنا لیا

قوم پرست مفکرین آہستہ آہستہ چند باتوں پر متفق ہوتے جا رہے تھے۔ مثلاً یہ کہ لفظ عرب کا اطلاق کسی مخصوص نسل کے افراد تک محدود نہیں، نہ عربیت صرف جزیرۃ العرب کے باشندوں یا مذہبِ اسلام کے پیروؤں تک محدود ہے، بلکہ عربی بولنے والے ممالک کے تمام باشندے عرب ہیں۔ ان عربوں کی شیرازہ بندی میں نسل، مذہب وغیرہ نے ممکن ہے ماضی میں موثر کردار ادا کیا ہو۔ لیکن اب ان کی وحدت کی اساس، زبان، ثقافت اور تاریخ کا اشتراک ہے۔[11] بعثی مفکروں نے عام طور پر ان نظریات کو قبول کر لیا۔ بعث پارٹی کے دستور کی رو سے عرب کا اطلاق ہر اس شخص پر ہوتا ہے جس کی زبان عربی ہو، اور جو عرب سرزمین کا باشندہ ہو، یا وہ (اجنبی الاصل) جو عربوں کی زندگی کا جزو بن چکا ہو اور جسے عرب قوم سے وابستگی کا یقین و اذعان ہو۔[12]

اس تعریف کی رو سے عربوں کی نسلی وحدت کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ میشیل عفلق نے بعض دوسرے مقامات پر اپنی تاریخ کے ابتدائی دور میں عربوں کے ایک نسل سے تعلق رکھنے کا ذکر کیا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس بات پر بھی زور دیا ہے، کہ اگرچہ اس ابتدائی دور میں "ان کی زندگی میں ہم آہنگی، یکسانیت اور وحدت کے استحکام کا سبب یہ تھا، کہ وہ ایک نسل سے تعلق رکھتے ہیں، جسے بعد میں زبان، روح

تاریخ و ثقافت کے اشتراک نے جلا اور قوت بخشی ہے۔[۱۱]

لیکن یہ خشک نظری مسائل، بعض مفکروں کی دلچسپی کا اصل مرکز ہی نہیں۔ ان کو اصل دلچسپی ان مقدمات سے پیدا شدہ منطقی نتائج سے ہے اور انہیں پر ان کا سارا زور ہے۔ بعث پارٹی کے دستور کی رو سے عرب قوم کی طرح "وطنِ عربی" ایک سیاسی اور اقتصادی وحدت ہے، اور اس کے اجزاء — یعنی مختلف عرب ممالک — ایک دوسرے سے جدا نہیں رہ سکتے۔ اسی طرح عرب قوم ایک ثقافتی وحدت ہے۔ اور جو بھی اختلافات عربوں کے درمیان پائے جاتے ہیں وہ اتفاقی اور مصنوعی ہیں، اور عرب شعور کے بیدار ہو جانے کے بعد ختم ہو جائیں گے۔ عرب قومیت کا مقصد یہ ہے کہ عرب آزاد اور متحد ہو کر تاریخ میں اپنی قومی شخصیت کو روبہ عمل لائیں، اور ترقی اور خوش حالی کی جدوجہد میں دوسری قوموں کا ہاتھ بٹائیں۔[۱۲]

بعث پارٹی کے نظریہ قومیت کی رو سے عرب قومی رشتے کو ہی اجتماعی و سیاسی زندگی کا واحد رشتہ سمجھنا چاہیے۔ اندرونی طور پر عرب دنیا میں قبائلی، نسلی، علاقائی، فرقہ دارانہ (یعنی دینی) اور جو فکری عصبیتیں پائی جاتی ہیں۔ بعث پارٹی کے نزدیک ان پر اسی طرح قابو پایا جا سکتا کہ قومی رشتے کو مضبوط بنایا جائے تاکہ عرب متحد ہو سکیں۔ دوسرے الفاظ میں انسانوں کے درمیان اتفاق و اتحاد اور وابستگی و اختلاف کی واحد بنیاد ان کی عربیت ہے اس کے علاوہ جو بھی بنیادیں ہیں وہ غلط ہیں۔ اگر عرب اپنے قومی رشتے کو مضبوط بنالیں تو تمام عرب متحد ہو سکتے ہیں اور انہیں ایک قوم کی حیثیت سے ضرور متحد ہونا چاہیے۔ اس اصول کا ایک منطقی نتیجہ یہ ہے کہ تمام عرب ریاستیں اپنے علیحدہ وجود ختم کر کے ایک ریاست میں ضم ہو جائیں۔ اس کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ عرب دنیا میں اندرونی طور پر بھی اور عرب دنیا سے باہر بھی عربوں کے طرزِ عمل کی صرف ایک ہی فکری بنیاد ہو سکتی ہے۔ ان کا عرب ہونا۔ اپنے اور پرائے میں تفریق کی کسوٹی بھی عربیت ہونی ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔[۱۳]

اسلام اور عرب قومیت کے باہمی تعلق کا مسئلہ دوسرے عربوں کی طرح بعض مفکرین کے لیے بھی دردِ سر بنا رہا ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بعث پارٹی دوسرے مفکروں کے برعکس ایک سیاسی پارٹی کی حیثیت سے عرب عوام کو اپنے پروگرام کے گرد جمع کرنا چاہتی تھی، اور ایک طرف دوسری طرف اسلام پسند عربوں کو یہ فکر برابر دامنگیر رہی ہے۔ کہ قومی بیداری اور آزادی کا جو صور میشیل عفلق اور ان کے ساتھی پھونک رہے ہیں، اس کے نتیجے کے طور پر ان کے سب سے قیمتی ورثے، اسلام کو قومی زندگی میں کیا مقام حاصل ہوگا۔ شاید اس مسئلے پر اضطراب کا ایک سبب یہ بھی تھا، کہ بعث تحریک کی سربراہی ایک عیسائی کے ہاتھ میں رہی ہے، اور اس کی صفِ اوّل کے افراد اس قماش تھے، کہ بعث پارٹی کو عموماً الحاد و بے دینی کا علمبردار خیال کیا جاتا رہا ہے۔[۱۴]

جہاں تک خود اسلام اور عربیت کے باہمی رشتے کا تعلق ہے وہ ہے بھی بالکل منفرد قسم کا اور نہایت نازک۔ ایک طرف تو یہ حقیقت ہے کہ اسلام کا پیغام ایک عرب نبی کے توسط سے ایک عربی صحیفے کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا گیا، اور اس کے اوّلین مخاطب بھی عرب ہی تھے پھر عرب اپنی گمنامی سے نکل کر عالمی تاریخ کے اسٹیج پر جب نمودار ہوتے ہیں، تو ان کے درمیان اسلام ہی نے اتحاد اور اتفاق پیدا کیا۔ اور اسی نے ان کو ایک فاتح قوم اور دنیا کا معلم و رہنما بنایا۔ اگر عربوں کی تاریخ کا اسلامی دور ان کی تاریخ سے نکال دیا جائے تو عربوں کو اپنے ماضی سے فخر کا شاید ہی کوئی سرمایہ مل سکے۔ ان وجوہ سے اسلام اور عربیت کا رشتہ اتنا قریب اور پیچیدہ رہا ہے، کہ ان کا جدا کرنا بڑا دشوار نظر آتا ہے۔ دوسری طرف قومیت کے فلسفے کی فکری بنیاد ہی اس لادینیت پر ہے جو اسلام سے اپنے روایتی تعلق کی بناء پر عربوں کے مزاج کے خلاف ہے۔

اس مسئلے پر بعض مفکروں کا رویہ (جس کا مقصد یہ ہے، کہ وہ عربیت کو عرب قومی زندگی کا محور بنا دیں) دو متضاد رجحانات کی عکاسی کرتا ہے، اگرچہ ان کی تحریروں کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ان کے بنیادی موقف اور مقصد کو سمجھ لینا دشوار نہیں۔

عروبۃ کی قدر و قیمت پر شدت سے زور، اور پھر یہ بات، کہ بعث پارٹی کی سرگرمی کا میدان ایک ایسی قوم ہے جس کی اکثریت مسلمان ہے۔ ان دونوں کا تقاضا یہ ہے، کہ بعثی مفکر۔ بالخصوص معتدل مزاج بعثی مفکر، اسلام کے بارے میں عقیدت مندانہ جذبات کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ اس موقع پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے، کہ اس عقیدت کی بنیاد وہ نہیں ہے جو ایک مسلمان کی عقیدت کی بنیاد ہوتی ہے۔ اسلام کی اصل قدر و قیمت بعثی رہنماؤں کے ہاں یہ نہیں کہ یہ خدا کا آخری پیغام ہے اور رہتی دنیا تک کے لیے انسان کے لیے مشعلِ راہ۔ بلکہ اس کی اصل اہمیت یہ ہے، کہ ایک خاص زمانے میں یہ عرب عبقریت کا مکمل ترین مظہر، اور عربوں کو متحد کرکے ایک اہم تاریخی قوت بنانے والی تحریک تھی۔ بعثی مفکروں کو اس عقیدت مندی کے باوجود قومی زندگی میں مذہبیت کو بطورِ اصول تسلیم کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ اسی لئے اسلام کی تاریخی اہمیت پر زور دینے کے باوجود بعثی اسلام کو وہ اہم مقام دینے کو تیار نہیں ہیں جو ماضی میں عرب اسے دیتے آئے ہیں اور اسلام کے مروجہ تصور اور اسلامی ریاست کے تخیل کے ہی وہ مخالف ہیں۔ چونکہ ان کے نزدیک عرب عبقریت نے ایک خاص زمانے میں اسلام کا پیکر اختیار کیا تھا، لہٰذا یہ بات انہیں قطعی غیر معقول نہیں نظر آتی کہ کم و بیش چودہ سو سال گذرنے کے بعد عرب عبقریت (جس کی خصوصیت ہی یہ رہی ہے کہ وہ تاریخ کے مختلف ادوار میں نئی اور گوناگوں شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے)۔ اپنے اظہار کے لیے اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا پیکر کیوں نہ اختیار کرلے۔ اسلام کی تاریخی اہمیت مسلم، یہ بھی تسلیم کہ وہ عرب ثقافت کا اہم اور قیمتی جزو ہے، لیکن ماضی کی چیزوں کی قدر کرنے کا صحیح طریقہ یہ نہیں ہے کہ ہم اپنی باگ پوری طرح ماضی کے ہاتھ میں دیدیں، اور اس کی مردہ شکلوں اور ہیئتوں کو اپنا کر زندگی کو جمود کا شکار بنا دیں۔ بلکہ اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ماضی کی روشنی میں ہم نئی شکلوں اور ہیئتوں کی تخلیق کریں اور نئے نئے تجربے کرتے ہوئے آگے کی طرف رواں دواں رہیں۔ اسلام کے بارے میں اس رجحان کی تائید میں بعثی یہ فلسفہ بھی پیش کرتے ہیں کہ دینداری کا جوہر اور دینداری کی بعض غلط اور جامد اشکال دو مختلف چیزیں ہیں۔ ان کے نزدیک جو چیز اس بات کی مستحق ہے کہ اسے باقی رکھا جائے وہ دین کا جوہر ہے نہ کہ غلط قسم کی مروجہ دینداری۔

جہاں تک عربوں کی قومی زندگی کا تعلق ہے، اس بارے میں بعث کا موقف یہ ہے کہ وہ جس قومیت کی علمبردار ہے وہ کوئی دینی قومیت نہیں۔ اس لیے کہ دین کا میدان الگ ہے اور وہ قومی زندگی میں اتحاد کا رشتہ نہیں بن سکتا، بلکہ اس کی وجہ سے انتشار اور تفرقہ کو فروغ ہوتا ہے اور لوگوں میں متعصبانہ اور غیر حقیقت پسندانہ ذہنیت پیدا کرتا ہے۔ عرب قومی ریاست کے مسئلے پر بعث پارٹی کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ وہ کسی مخصوص مذہب کو اپنا نہیں سکتی، بلکہ اسے تمام مذاہب کو یکساں تقدیس اور احترام کا مستحق قرار دینا چاہیے اور بہ حیثیت مجموعی دینداری کی ہمت افزائی کرنی چاہئے۔ اس لیے کہ وہ انسانی زندگی کے لیے عام طور پر اور عرب قومی زندگی کے لیے خاص طور پر ضروری ہے۔ کسی مذہب کو یہ مقام دینا کہ عرب قومی ریاست اس کی رہنمائی کی پابند ہو، سراسر غلط ہوگا اس لیے کہ ماضی میں اس کا تجربہ اسلامی ممالک میں اور مسیحی یورپ دونوں جگہ کیا گیا اور دونوں جگہ اس تجربے کو ناکامی ہوئی اور انسانیت کو بہت دکھ درد، خون خرابہ اور طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

مختصر یہ کہ اگر اسلام دوسرے ادیان مثلاً مسیحیت کی طرح انسان کے اجتماعی، معاشی اور سیاسی معاملات میں خود کو ایک ثانوی حیثیت دینے پر قانع ہو جائے اور اپنی دلچسپی کو انفرادی زندگی کے بعض مسائل تک محدود کر دے۔ اور قومی اشتراکی انقلابی رجحان کی تائید کرے، تو اس کو باقی رہنے کا حق دیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس بقا کی قیمت یہ ہوگی کہ اسے ایک محدود دائرے سے باہر قدم نکالنے کی اجازت نہ ہوگی۔

بعثی فکر کی رو سے عرب قوم ہی وفاداری اور محبت کا اولین اور اہم ترین مرکز ہے۔ دراصل بعثی نظریۂ قومیت وفاداری کے مرکز اور محور میں اسی قسم کی بنیادی تبدیلی کا مطالبہ کرتا ہے، جس طرح مذہب کرتا ہے۔ اسی لیے عروبۃ کے بارے میں جو باتیں لکھی جاتی ہیں۔ ان میں ایک قسم کی شاعرانہ اور روحانی مبالغہ آمیزی نظر آتی ہے اور عرب قوم سے وابستگی اور وفاداری کے سلسلے میں دینی اصطلاحات مثلاً ایمان وغیرہ کا استعمال بہ کثرت کیا

جاتا ہے۔ بعض تحریکیں اس رجحان کا آئینہ دار ان کا یہ تصور ہے کہ عرب ایک ابدی مشن کے علمبردار ہیں، ہمیں یورپ کی متعدد قومی تحریکوں کی یاد دلاتا ہے جو قومی مشن یا اسی قسم کے دوسرے مبہم تصورات کو کافی اہمیت حاصل رہی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کونسا ابدی مشن ہے جس کے وہ علمبردار ہیں۔ شاید بہت سے قارئین اس سوال کے جواب کو بہت آسان خیال کریں۔ اور اسلام کو عربوں کا ابدی مشن قرار دیں۔ لیکن بعث پارٹی کا نقطۂ نظر اس سے مختلف ہے۔ میشیل عفلق نے متعدد مقامات پر اس کی تشریح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی تحریروں کا ماحصل یہ ہے کہ عربوں کا ابدی مشن کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے معین طریقے سے بیان کیا جاسکتا ہو۔ وہ نہ تو کسی معین پروگرام سے عبارت ہے اور نہ کسی ضابطۂ قوانین سے، کہ عربوں کا ابدی مشن یہ ہے کہ وہ زندگی کا بے باکانہ تجربہ کریں ان کی زندگی جن برائیوں کا شکار ہو گئی ہے۔ ان پر قانع ہونے کے بجائے ان کو دور کریں اور زندگی کے لیے صحیح نہج کی تلاش میں سرگرداں ہوں اور اسے بروئے عمل لانے کے لیے مصروفِ کشمکش۔ گویا ابدی مشن عبارت ہے حاضر و موجود کی خرابیوں کو تسلیم نہ کرنے اور صحت مند زندگی کے قیام کے لیے مسلسل جدوجہد سے[25]

۲

اشتراکیت

بعث پارٹی جس فکری مرکب کی علمبردار ہے۔ اس کا دوسرا جزء اشتراکیت ہے۔ بعث پارٹی کے بانیوں کے نزدیک وہ جس اشتراکیت کے علمبردار ہیں وہ اشتراکیت کی دوسری انواع و اقسام سے جداگانہ اور ایک منفرد حیثیت کی مالک ہے۔ یہ عرب قوم کے مخصوص حالات، ضروریات اور مزاج کی پیداوار ہے۔ اور اسی لیے "عرب اشتراکیت" کہلانے کی مستحق ہے۔ ان کے دعوے کے مطابق ان کی اشتراکیت کمیونزم، مغربی یورپ کی اشتراکیت قسطاہت کی قومی اشتراکیت (جو نسلی تفوق کے نظریے پر قائم ہے)، اور خود جمال عبدالناصر کی پیش کردہ "عرب اشتراکیت" سے مختلف ہے۔

اگرچہ لفظ اشتراکیت عربی زبان میں بیرونی زبانوں سے آیا ہے، لیکن جہاں تک عرب اشتراکیت کے جوہر کا تعلق ہے وہ قطعی اجنبی چیز نہیں، بلکہ خود عرب قومیت کی گہرائیوں سے ابھرا ہے[26] بعض مفکروں اور رہنماؤں کے نزدیک اشتراکیت اور عرب قومیت لازم و ملزوم ہیں۔ اس لیے کہ عرب قومی تحریک عربوں کی جس نشاۃ ثانیہ کے لیے کوشاں ہے، اس کی تکمیل اسی صورت میں ہو سکتی ہے جبکہ عربوں کی آزادی اور قومی وحدت کے ساتھ ساتھ ان میں سماجی انصاف قائم ہو اور تیز رفتاری کے ساتھ اقتصادی ترقی کر کے دنیا کی دوسری قوموں کے ہمسر بن سکیں اور ان کی نگاہ میں ان چیزوں کا حصول اشتراکیت کے بغیر ممکن نہیں۔

دوسری طرف وہ رجعت پسند عنصر جو عرب ممالک میں اقتدار یافتہ ہے۔ ان مقاصد کے حصول میں ہر طرح سے مزاحم ہے۔ یہ عنصر عرب دشمن طاقتوں کے زیر اثر ہے اور یہ محسوس کرتا ہے کہ ان کے سایۂ عاطفت اور سرپرستی کے بغیر اس کے مفادات محفوظ نہیں، لہٰذا یہ ان کا آلۂ کار بننے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا ہے۔ پھر اس عنصر کے اپنے مفادات کا تقاضا بھی ہے کہ عرب معاشرے میں وہ بنیادی تبدیلیاں نہ آنے پائیں جو استحصال اور طبقاتی تفاوت کے موجودہ نظام کو ختم کر کے رکھ دیں۔ اور جو عربوں کی اکثریت کو ان بنیادی حقوق سے بہرہ مند کر سکیں جن سے عرب ممالک کی حکمران اقلیت نے اسے محروم کر دیا ہے[27]

بعض اشتراکیت کے علمبرداروں نے، بالخصوص اس کے ابتدائی رہنماؤں نے اشتراکیت کی دوسری اقسام سے اسے ممیز کر کے دکھانے کی

جو کوشش کی ہے اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ مغربی یورپ کی اشتراکی اور عالمی کمیونسٹ تحریکوں میں قومیت کی نفی یا کم سے کم اس کی اہمیت کو نظر انداز کر دینے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ کمیونسٹ اور سوشلسٹ دونوں اس بات کے دعویدار ہیں کہ وہ جس نظام کے علمبردار ہیں اس میں پوری انسانیت کے مسائل کا حل موجود ہے اور اس کا پروگرام اس نوعیت کا ہے کہ اسے ہر قوم (زیادہ سے زیادہ جزئی رد و بدل کے بعد) اپنا سکتی ہے۔ ان تحریکوں کی اصل دلچسپی کا مرکز کسی مخصوص قوم کی ترقی، خوش حالی اور فلاح نہیں۔ بلکہ ایک خاص فلسفے اور نظام کا فروغ ہے۔ پھر انسان اور انسان کے درمیان جس دائرے تقسیم کو یہ اہم اور درست قرار دیتے ہیں، وہ ہے طبقاتی تقسیم اس کے برعکس بعث پارٹی کے فلسفے میں قومیت کو بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے یہاں تک کہ میشیل عفلق کی رو سے اس کی فکر میں قومیت کو اشتراکیت کے مقابلے میں فوقیت حاصل ہے[illegible] بعث پارٹی کو کمیونزم اور مغربی اشتراکیت کی اس "لاقومیت" پر جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ عربوں کے ابدی مشن کے منکر ہیں شدت کے ساتھ اعتراض ہے اور وہ اسے ایک اجنبی قوم اور معاشرے کے مخصوص حالات کی پیداوار خیال کرتے ہیں اور اسے کسی طرح عرب معاشرے کے موجودہ حالات اور تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں خیال کرتے[illegible]

جہاں تک کمیونزم کا تعلق ہے۔ بعث پارٹی اپنی سیاسی زندگی میں بالعموم اس کی حریف رہی ہے۔ اگرچہ دائیں بازو کی پارٹیوں کے خلاف کمیونسٹوں اور بعث پارٹی میں متعدد بار صلح یا دوستی بھی رہی ہے، لیکن وہ بالعموم عارضی ہوتی تھی اور اکثر یہ دونوں گروہ باہم دست و گریباں رہے ہیں[illegible] بلاشبہ گذشتہ چند سال سے کمیونزم کی مخالفت کا یہ رجحان کچھ دبتا جا رہا ہے اور قرائن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بعث پارٹی میں کم و بیش کمیونسٹ طرز فکر رکھنے والے افراد کا اثر پہلے سے زیادہ ہو چکا ہے۔ لیکن کم سے کم ۱۹۶۳ء تک کمیونزم اور کمیونسٹوں کی مخالفت میں بعثی بہت کچھ کہتے اور لکھتے رہے ہیں۔ اس پارٹی کے ماضی اور حال تک اس کے فکری قائد میشیل عفلق نے قدرے تفصیل کے ساتھ کمیونزم سے اپنے اختلاف کا اظہار کیا۔ اس سلسلے میں میشیل عفلق کے حسب ذیل نکات قابل ذکر ہیں۔

۱۔ — کمیونزم زندگی کا ایک مکمل نظریہ اور نظام فکر پیش کرتا ہے یہ محض ایک اقتصادی نظام نہیں ہے۔ وہ اپنے مخصوص نظریئے کے مطابق پوری دنیا میں فکر و عمل کا ایک مکمل انقلاب برپا کرنے کی سعی میں مشغول ہے اور کمیونسٹ نظام کے اغراض و مقاصد کا تابع ہے۔ اس کے برعکس بعث پارٹی کی اشتراکیت ایک مخصوص اقتصادی نظام سے عبارت ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ تقسیم دولت کے موجودہ نظام میں ایسی تبدیلیاں کی جائیں جو عدل و مساوات کے قیام پر منتج ہوں اور جن کے ذریعہ سرعت کے ساتھ پیداوار میں اضافہ ہو سکے[illegible]

۲۔ کمیونسٹ فلسفے کی بنیاد مادہ پرایمان ہے۔ یہ فلسفہ تاریخ کے ارتقاء کی تعبیر میں صرف اقتصادی عامل کو موثر قرار دیتا ہے اور فکری اور روحانی عوامل کو نظر انداز کر دیتا ہے اسکے برعکس یعنی نظریہ فکری اور روحانی عوامل کو تاریخ کے ارتقا میں اہم قرار دیتا ہے۔

۳۔ کمیونسٹ فلسفے میں فرد کا کوئی مقام نہیں بلکہ اس فلسفے کے مادی رجحان کی بناء پر فرد کو محض ایک مادی شے سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی ذات کسی احترام اور تقدیس کی مستحق نہیں سمجھی جاتی۔ کمیونسٹ فلسفے کا یہ رجحان آمریت کے دروازے کھول دیتا ہے اور فرد اور جماعت کے درمیان جو صحیح تعلق ہونا چاہیے۔ اس کو درہم برہم کر دیتا ہے[illegible] اس کے برعکس بعثی نظریہ جس پر مغربی یورپ کی سوشلسٹ فکر کا خاص اثر معلوم ہوتا ہے ابتداء سے ہی مغربی یورپ کی سوشلسٹ پارٹیوں کی طرح فردی آزادی اور جمہوری اور نیابتی حکومت کے حق میں ہے اور حریت تحریر و تقریر، حریت اجتماع، حریت عقیدہ اور حریت فن کا حامی ہے اور آمریت و ڈکٹاٹورشپ کا اصولاً مخالف ہے[illegible]

۴۔ کمیونزم ایک ایسے اقتصادی نظریے کا علمبردار ہے جو موجودہ دور کی سائنٹفک تنقید کی تاب نہیں لا سکتا۔

۵۔ کمیونزم انفرادی ملکیت اور وراثت دونوں کی نفی کرتا ہے۔ اس طرح کمیونزم شخصی محرکات کے بارے میں جو انسانی زندگی میں نہایت قوی ہوتے ہیں

حقیقت پسندانہ اور صحت مند نقطۂ نظر نہیں اختیار کرتا۔ اس کے برعکس عرب اشتراکیت ان دونوں حقوق کو تسلیم کرتی ہے اگرچہ معاشرے کے مجموعی مفاد کے پیش نظر ان حقوق کے استعمال پر بعض پابندیوں کو ضروری خیال کرتی ہے[88]

بعث رہنماؤں کے نزدیک ان کی اشتراکیت کمیونزم کی طرح مغربی یورپ کی اشتراکیت سے بھی مختلف ہے۔ اس اختلاف پر زور دینے کا محرک شاید یہ اندیشہ ہے کہ اشتراکیت کو اجنبی چیز قرار دے کر مسترد نہ کر دیا جائے۔ ورنہ جہاں تک اپنے بیان کردہ اصولوں اور پروگرام کا تعلق ہے۔ بعث کی اشتراکیت مغربی یورپ کی اشتراکیت سے کافی مشابہ ہے[89] ان دونوں میں جو قابل ذکر اختلاف پایا جاتا ہے وہ اس مسئلے پر ہے کہ مغربی یورپ کی اشتراکیت میں ایک آفاقی رجحان پایا جاتا ہے، جبکہ بعث پارٹی اپنی بنیاد عرب قومیت پر قائم کرتی ہے اور عرب قومی مقاصد کو بنیادی اہمیت کا حامل قرار دیتی ہے۔ ان باتوں کے علاوہ آزادی اور عرب اتحاد کی جدوجہد کے دور میں دوسرے عربوں کی طرح بعث پارٹی کو بھی اس بات کا تجربہ ہوا کہ مغربی ممالک کی اشتراکی پارٹیاں ـ خاص طور پر فرانس کی اشتراکی پارٹی ـ عرب مفادات کی مخالفت اور عربوں کے مقابلے میں اسرائیل کی ہمدرد رہی ہیں[90]

اب سوال یہ ہے کہ بعث پارٹی جس اشتراکیت کی علمبردار ہے، اس کا اقتصادی پروگرام کیا ہے۔ بعث پارٹی کے اس پروگرام کے خدوخال بعث پارٹی کے دستور، بعث پارٹی کی قومی کانفرنس منعقدہ ۱۹۶۳ء کی قراردادوں[91] اور بعث پارٹی کے دورِ اقتدار میں شام کے لیے وضع کیے ہوئے عارضی دستور کی دفعات میں نظر آتے ہیں۔ مطالعہ کا حاصل یہ ہے کہ بعث پارٹی کے قائم کردہ اشتراکی نظام میں ذرائع پیداوار پر ایک وسیع پیمانے پر اجتماعی ملکیت قائم کر دی جائے گی۔ زرعی ملکیت کی اس اصول کے تحت تحدید کی جائے گی کہ مالکان اراضی صرف اتنی ہی زمین کے مالک ہوں جس کو وہ خود بلا کسی غیر کی مدد کے کاشت کر سکیں[92] چھوٹی صنعتیں محدود پیمانے پر افراد کی ملکیت ہوں گی۔ البتہ قومی مفاد کے حدود کے اندر انفرادی ملکیت[93] اور وراثت کا تحفظ کیا جائے گا۔

جہاں تک ریاست کا تعلق ہے بعث پروگرام کی رو سے وہ مفاد عامہ کے تمام کام، اہم قدرتی وسائل، بڑی صنعتوں، اور ذرائع نقل و حمل کی مالک ہوگی، اور براہ راست ان کا انتظام کرے گی[94] نہ صرف یہ بلکہ وہ اندرونی اور بیرونی دونوں قسم کی تجارت کی نگرانی کرے گی تاکہ صارفین کو پیدا کنندوں کے استحصال سے بچایا جا سکے اور قومی پیداوار کو بیرونی صنعتوں کے مقابلے سے محفوظ رکھا جا سکے۔ اس کے بعد ایک محدود پیمانے پر افراد کو چھوٹے پیمانے کی صنعتیں چلانے کی اجازت ہوگی، لیکن وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ وہ معیشت کے عوامی شعبے Public Sector کی نشوونما میں حائل نہ ہوں اور اشتراکی معیشت کی ترقی میں سدِ راہ نہ بنیں۔ نہ صرف یہ بلکہ غیر پیداآور اشیاء پر ذاتی ملکیت کا جو حق تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کے اجتماعی تفاعل Function کا تعین بھی حکومت کرے گی۔

اس پروگرام کے ذریعہ ریاست اس بات کی ذمہ داری لے گی کہ وہ ہر فرد کو روزگار فراہم کرے اور غیر معمولی صورتِ حال۔ مثلاً علالت، از کار رفتگی Disability یتیمی اور بڑھاپے میں ہر فرد اور اس کے اہل و عیال کی ضروریات فراہم کرے۔ اسی طرح ریاست ہر شہری کو تعلیم اور صحت کی سہولتیں فراہم کرنے کی ذمہ دار ہے۔ علاوہ ازیں وہ مزدوروں کے لیے مناسب اوقاتِ کار اور مناسب اجرت کی حد مقرر کرے گی اور انہیں با اجرت ہفتہ وار اور سالانہ چھٹی دلوائے گی۔ جہاں تک مزدوروں کے تنظیم سازی کے حق کا تعلق ہے اس کو تسلیم کیا گیا ہے اور مزدور تنظیموں کو آزادی کی ضمانت بھی دی گئی ہے، لیکن اس سلسلے کی تمام متعلقہ دفعات کے مطالعہ سے آدمی اس نتیجے پر پہنچتا ہے جس کا اظہار ابو جابر نے ان الفاظ میں کیا ہے۔ . . . "ٹریڈ یونینوں کا کام یہ ہوگا کہ وہ ریاست کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کریں"[95]

۳

تنقید و تبصرہ

اوپر کے صفحات میں ہم نے بعث پارٹی کے نظریے اور پروگرام کا خلاصہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ مرورِ ایام کے ساتھ ان میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہیں۔ لیکن یہ تبدیلیاں بنیادی نہ تھیں، بلکہ ان کا ماحصل یہ تھا۔ ابتدا میں جو متعدد رجحانات موجود تھے ان میں سے بعض کو پہلے سے کم اور بعض کو پہلے سے زیادہ

بعث پارٹی کے نظریے اور پروگرام کی اہمیت صرف یہی نہیں کہ اس کی علمبردار پارٹی کو شام اور عراق میں اقتدار پانے کے بعد اسے روبہ عمل لانے کا موقع حاصل ہوا، بلکہ خود سب سے بڑے مصر میں، جہاں جمال عبدالناصر اسلام کے علاوہ کسی اور نظریۂ زندگی کی تلاش میں تھے جسے وہ رہنما اصول کے طور پر استعمال کر سکیں، بعث فلسفے نے بڑا گہرا اثر ڈالا۔ جہاں تک مصر کے عوام کا تعلق ہے راقم الحروف کا ذاتی مشاہدہ یہ ہے کہ دل میں عرب قومیت، کے نعروں سے کوئی خاص حرارت پیدا نہیں ہوتی، بلکہ ان میں جوش و ولولہ اسلام کے ہی نام سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن جمال عبدالناصر جو عرب ممالک کی قیادت اور اپنے عوام پر مکمل کنٹرول کے خواہاں تھے، انہیں بعث فکر کے ذریعہ وہ سب کچھ حاصل ہو گیا، جس کی انہیں ضرورت تھی۔ ایک طرف سب سے بڑے عرب ملک کی حیثیت سے انہوں نے اپنے اقتدار کی توسیع کے لیے عرب اتحاد کے نعرے کو استعمال کیا۔ دوسری طرف انہوں نے اشتراکیت کے نام پر مصری عوام کے رزق کی تمام کنجیاں جو سیاسی طور پر پہلے ہی دست و پا ہو چکے تھے۔ اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ فوج اور پولیس کی قوت کے ساتھ ساتھ وہ اب ایک ایسے فلسفے سے لیس ہو کر نکلے جس نے ان کی ہوس آمریت کی تسکین کا مکمل سامان فراہم کر دیا۔ علاوہ ازیں بعثی فکر نے اسلام کو قومی زندگی سے بے دخل کر دینے کے لیے ایک مثبت فلسفے کا سہارا بھی انہیں فراہم کر دیا۔ گویا مصر کے اسلام پسند اور جمہوریت دوست عناصر سے نبرد آزما ہونے کے لیے جن نظریاتی ہتھیاروں کی انہیں ضرورت تھی وہ بعث کے اسلحہ خانے سے انہیں بغیر کسی ذہنی جدوجہد کے حاصل ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ جمال عبدالناصر جس عرب اشتراکیت کے علمبردار ہیں۔ اس میں بعث پارٹی کی قومی اشتراکیت میں مشکل سے ہی کوئی فرق ہو گا ہے جمال عبدالناصر کے پیش کردہ میثاق اور بعث پارٹی کے افکار کے موازنے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اول الذکر مؤخر الذکر کا چربہ ہے

۲۔ بعث پارٹی کے نظریے کے دونوں اجزاء قومیت اور اشتراکیت عرب دنیا کے اہم ترین سیاسی مفادات کے منافی ثابت ہوئے۔

عرب دنیا موجودہ دور میں جس سب سے بڑے مسئلے سے دوچار ہے وہ فلسطین کا مسئلہ ہے۔ عرب دنیا کے عین قلب میں امریکہ اور روس نے مل کر ایک ایسی حوصلہ مند عیار قوم کی ریاست قائم کر دی ہے جو بین الاقوامی سازشوں کے سہارے مسلسل توسیع کے منصوبے رکھتی ہے۔ اول تو خود اس کے قیام کا مطلب ہی یہ تھا کہ ایک سرزمین جو صدیوں سے عربوں کا وطن رہی ہے وہ ان کے ہاتھ سے نکل جائے۔ لیکن جیسا کہ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ نے ثابت کر دیا، اور جس کے بے شمار اور دوسرے قرائن ہمیشہ موجود تھے) اسرائیل اپنی سرحدوں کو مسلسل بڑھانے کا منصوبہ رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں دونوں عالمی بلاک۔ امریکہ اور روس۔ اسرائیل کے وجود کے محافظ ہیں۔ دراصل اسرائیل اپنے محدود رقبے کے باوجود اتنا عظیم خطرہ ہے کہ پوری اسلامی دنیا کی متحدہ کوشش کے بغیر اس کا مقابلہ ممکن ہی نہیں۔ لیکن بعث پارٹی جس عرب قومیت کا نظریہ لے کر سامنے آئی اس نے فلسطین کے مسئلے کو خالصتاً عرب مسئلہ بنا کر کہ

دیا ۔ یہ بات نہ صرف کبھی کبھی بعث پارٹی کی طرف سے پیش کی گئی بلکہ یہ بعث پارٹی کے نظریے کا ایک اہم اصول تھی اور اس نے بعث نے اس بات کی کوشش کی کہ فلسطین کا مسئلہ ایک بین الاسلامی مسئلہ نہ بننے پائے ۔ موجودہ عرب دنیا کا طالب علم یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ وہی لوگ جو عرب مفادات سے اپنی والہانہ شیفتگی کا اظہار کرتے نہ تھکتے ہوں ، انہوں نے آخر اس بات کے لیے اپنا پورا زور صرف کر دیا کہ فلسطین کا مسئلہ ۷۰ کروڑ مسلمانوں کا مسئلہ نہ بننے پائے ۔ بلکہ صرف دس بارہ کروڑ عربوں کا مسئلہ بنا رہے ۔ پھر نہ صرف یہ ، بلکہ عرب اور غیر عرب کے امتیاز پر جس طرح زور دیا گیا اس نے خود عرب دنیا میں عرب عصبیتوں کو پیدا کر کے خود عرب ممالک کے اتحاد میں ایک مزید رکاوٹ پیدا کر دی ۔

اسی طرح اشتراکیت ، جسے بعث پارٹی عرب قومی تحریک کا لازمی جزو قرار دیتی ہے ۔ عرب مفادات کے سراسر منافی ہے ۔ جن حالات سے عرب ممالک گذر رہے ہیں ، ان کا تقاضا یہ تھا کہ کچھ کم سے کم شرائط پر تمام عرب ممالک میں اتحاد ہو جاتا اور عربوں کی یہ متحدہ قوت اسرائیل اور اسی طرح کے دوسرے مسائل حل کرنے میں صرف کی جاتی ۔ لیکن تمام عربوں کے لیے اشتراکیت پر ایمان لانے کو لازمی قرار دینے کا نتیجہ خانہ جنگی کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا ۔ اشتراکیت کی تحریک نے اوّل تو ہر عرب ملک میں اندرونی تصادم اور کشمکش کا دروازہ کھولا ، خاص طور پر اس لیے کہ اشتراکیت دوست طبقہ بڑی حد تک اپنی قومی روایات اور اقدار سے برگشتہ اور موجودہ مادی تہذیب پر فریفتہ تھا ۔ لیکن اس سے زیادہ سنگین وہ کشمکش ہے جو مختلف عرب ملکوں کے درمیان پیدا ہوئی ۔ یہاں تک کہ تاریخ نے یہ سانحہ بھی دیکھا کہ ایک نام نہاد اشتراکی انقلاب کے تحفظ کے لیے ۵ سال سے مصر کی ۵۰ سے ۶۰ ہزار فوجیں یمن میں پڑی ہوئی تھیں ۔ اور مصری ہوائی جہاز یمن پر آگ برسا رہے تھے ۔ یہاں تک کہ اسرائیلی فوجیں بڑھیں اور چند دن کے اندر اندر غزہ اور سینا کو روندتی ہوئی نہر سویز کے مشرقی ساحل تک پہنچ گئیں ۔ عین اس وقت جبکہ اسرائیلی فوجیں اردن پر حملے کے لیے تیار ہو رہی تھیں ، شام کے اشتراکی اپنے فدائیوں کا ایک دستہ اس غرض سے اردن روانہ کر رہے تھے کہ شاہ حسین کو قتل کر کے وہاں کے غیر اشتراکی نظام کو ختم کر دیں واقعہ یہ ہے کہ اگر اشتراکیت کو وہ اہمیت دے دی جائے جو بعث پارٹی نے دی ہے ۔ خاص طور سے گذشتہ چند سال سے ۔ تو پھر جو ذہنیت پیدا ہو گی ۔ اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ فلسطین کی بازیابی کے لیے لوگوں کو آمادہ جہاد کر سکے گی ۔ ایک احمقانہ خام خیالی ہے ۔ اشتراکیت کو بنیادی اہمیت دینے کے بعد فطری بات یہ ہے کہ بلا قید ملک و مذہب تمام اشتراکی ایک صف میں ہوں ، اور بقیہ لوگ دوسری صف میں ۔ ابھی تک عربوں کے احساسات فلسطین کے بارے میں بڑے نازک ہیں لہٰذا کھل کر اسرائیل سے دوستی کی بات دشوار رہی ہے ۔ لیکن جس خطرے کی طرف ہم اشارہ کر رہے ہیں ۔ اس کے قرائن پیدا ہو چکے ہیں ۔ اسلامی اخوت کو عرب اخوت کے نام پر قربان کرنے کے بعد اب اشتراکی اخوت کا جذبہ راسخ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اسی اخوت کو ریاست اسرائیل کے اعتراف ، کا وسیلہ بنایا جا رہا ہے ۔ اس سلسلے میں خود میشیل عفلق کا کردار قابل ذکر ہے ۔

اسرائیل سے شائع ہونے والے ایک رسالے New outlook میں ایک مشہور سوشلسٹ رہنما اور برطانیہ کے ایک رکن پارلیمنٹ ، Eenner Brockevay نے (جو برطانیہ کی سوشلسٹ یعنی لیبر پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں) یہ انکشاف کیا ہے کہ میشیل عفلق مشرق وسطیٰ کے لیے ایک اشتراکی فیڈریشن کے قیام کے سلسلے میں یہودی اشتراکیوں سے گفت و شنید کے لیے تیار ہیں ۔ مضمون نگار کے الفاظ یہ ہیں ۔

Readers of NEW OUTLOOK will know that Dr. Michael Aflek, the General Secretary of the Baath Socialist Party, has indicated, through Dr. Leon Szur and myself that he would be ready to enter into discussions with Jewish Socialists on the basis of Common action to establish a Middle East Socialist Federation. He is thinking in terms of a federation which would allow the separate nations autonomy in their internal affairs and defence to the Federal Government. Dr. Aflek says frankly that he recognizes that the Jewish people are in the Middle East to stay.

شاید یہی وجہ ہے کہ خود صیہونی تحریک کے رہنما، امریکہ کی سرپرستی کے باوجود اشتراکیت سے دوستی کو اپنی پالیسی کا ایک اہم ستون بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ عالمی صیہونی تحریک کے صدر ناحوم گولڈمین (Nahum Goldman) نے ابھی کچھ عرصہ قبل برسلز کی عالمی صیہونی کانفرنس میں صیہونیوں کو یہ ہدایت کی تھی کہ وہ انقلابی اشتراکیت کی طرف دوستی اور تقرب کا ہاتھ بڑھائیں اور اسے عرب اسرائیل دوستی کے عہد جدید کا پیش خیمہ سمجھیں[۲]

دوسرے الفاظ میں بعثی قومی اشتراکیت کا سیاسی کردار یہ ہے کہ پہلے اس نے عرب دنیا کو اتحاد کے نام پر اسلامی دنیا سے الگ کرنے کی کوشش کی، اس کے بعد عرب دنیا کو مزید اشتراکی و غیر اشتراکی، اور ترقی پسند و رجعت پسند کے متحارب گروہوں میں تقسیم کر کے آپس میں لڑوایا، اور بھائی بھائی کو آپس میں لڑانے کے بعد یہ ذہنیت پیدا کی کہ اصل دشمن وہ اسرائیل نہیں جو عربوں کی سرزمین پر قابض ہے، بلکہ اصل دشمن اشتراکی فکر سے اختلاف کرنے والے عرب ہیں۔

۳ - جہاں تک بعث پارٹی کے پیش کردہ اقتصادی پروگرام کا تعلق ہے اس پر تبصرہ کرنا ایک پیچیدہ اور دشوار کام ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے پسماندہ ممالک کی طرح عرب ممالک بھی بعض ایسے سنگین اقتصادی اور سماجی مسائل سے دوچار ہیں جن کی وجہ سے اس قسم کے پروگرام میں جاذبیت محسوس ہوتی ہے۔ شدید ترین افلاس کے پہلو بہ پہلو ذخیرہ کی افراط اور دولت مندی، دوسرے پسماندہ ممالک کی طرح عرب ممالک میں بھی نظر آتی ہے۔ سماجی انصاف کا فقدان اور جگہوں کی طرح وہاں بھی نظر آتا ہے۔ پھر دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں معیار زندگی انتہائی اور عوام کی حالت انتہائی زبوں ہے۔ کلاسیکی سرمایہ دارانہ نظریے پر بھروسہ کیے بیٹھے رہنا کہ معاشی ترقی کی کوئی مرحلہ وار رفتار عوامی مرفہ الحالی کا باعث ہو گی، سخت دشوار ہے۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ اس طرح عوامی خوش حالی کا دور آ سکتا ہے تو بھی اس منزل کی طرف [illegible]

رفتار بڑی سست ہوگی، اتنی سست کہ اس کا انتظار کرنا موجودہ عرب نسل کے لیے دشوار ہے۔ پھر پسماندہ ممالک میں ایک دشواری تشکیل سرمایہ کی بھی ہے۔ لہٰذا کسی دردمند انسان کے لیے اس بات کا گوارا کرنا دشوار ہے کہ ریاست اقتصادی زندگی میں غیر جانبدارانہ تماشائی بنی رہے اور سماجی انصاف کے قیام کی ایجابی کوشش میں کوئی اہم کردار نہ ادا کرے۔

دوسری طرف ریاست جب اقتصادی زندگی میں دخل اندازی شروع کرتی ہے تو اس کے حدود کے تعیین کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اور اگر اقتصادی زندگی پوری طرح ریاست کی گرفت میں آجاتی ہے تو عوام کی آزادی معرضِ خطر میں پڑ جاتی ہے۔ نہ صرف یہ، بلکہ یورپ کا تجربہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اقتصادی زندگی میں ریاست کی بے محابا مداخلت - جس کے لیے اشتراکی فلسفے کو سندِ جواز کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ فسطائی اور نازی آمریت کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اگر عوام اشتراکی فلسفے کے نام پر ایک ایسی حکومت کو برسرِ اقتدار آجانے دیں جو زندگی کے سیاسی اور اقتصادی دونوں شعبوں پر حاوی ہو، تو یہ عمل بعض اوقات پرانے طبقہ داری نظام کو ختم کر کے ایک نئے طبقہ داری نظام کو جنم دینے کا باعث بن جاتا ہے اور اس سے ایسا با اختیار طبقہ وجود میں آجاتا ہے جو سماجی عدل کے تمام تقاضوں کو پسِ پشت ڈال کر محض اپنی ہوسِ اقتدار اور ہوسِ مال و زر کو پورا کرتا رہتا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کے عرب ممالک (اور دوسرے اسلامی ممالک) میں، جہاں جمہوریت اور آزادیٔ تحریر و تقریر کی روایات راسخ نہیں ہیں۔ ریاست کو اگر پوری اقتصادی زندگی کنٹرول کرنے کی اجازت دی جائے تو جمہوریت اور آزادی بلاشبہ معرضِ خطر میں پڑ جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ جب عرب ممالک میں مصر میں اشتراکیت کے نام پر ایک استبدادی آمریت قائم ہوئی تو بعث پارٹی نے اس کی شدت سے مخالفت کی۔ لیکن جب وہ خود اپنے نظریے اور پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اٹھی تو عراق اور شام میں جمہوریت اور آزادی کا گلا گھونٹ کے رہ گیا۔

اس سلسلے میں ایک اور بات جو سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ آزادی اور جمہوریت کو اشتراکیت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانے کے بعد بھی سماجی انصاف قائم ہو جانے کی کوئی مضبوط ضمانت موجود ہے؟ کیا عوام کی زبوں حالی لازماً ختم ہو جائے گی؟ کیا لوگوں کا معیارِ زندگی لازماً بلند ہو جائے گا؟ کیا اقتصادی ترقی کی رفتار لازماً غیر معمولی طور پر تیز ہو جائے گی؟ میرے خیال میں ان سوالات کا جواب لازماً اثبات میں نہیں دیا جا سکتا، اور عرب ممالک بالخصوص شام میں بعث پارٹی کے تجربے کے بعد ان سوالوں کا جواب اثبات میں دینا کافی دشوار ہے۔ اس کی وجہ محض یہ نہیں کہ بعض حکمرانوں میں تعمیری صلاحیت اور پختگی کی کمی ہے۔ بلکہ اس کے اور اسباب میں سے ایک اہم سبب یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی ملک میں اقتصادی زندگی کو کلیتاً اپنی کنٹرول میں دے دیا جائے تو اس تجربے کے نتائج کا انحصار اسی بات پر ہوگا کہ اس ملک کی نوکر شاہی میں انتظامی صلاحیت کتنی ہے اور اس کی اخلاقی حالت کیسی ہے۔ پسماندہ ممالک میں خاص طور پر جہاں جمہوریت کی روایات پختہ نہ ہوں یہ نوکر شاہی اچھے سے اچھے منصوبے کا ستیاناس کر سکتی ہے۔ مصر کے نصف سالہ قیام کے دوران راقم الحروف کے مشاہدات اس کی توثیق کرتے ہیں۔ شام کے جو حالات سامنے ہیں وہ اسی بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اشتراکی پروگرام کو اپنا کر ایک چلتے چلاتے ہوئے اقتصادی نظام (جو بلاشبہ عادلانہ نہ تھا) کو تھوڑی سی کوشش سے مختل تو ضرور کر دیا گیا لیکن مثبت طور پر نہ مرفہ الحالی میں معتد بہ اضافہ ہوا، نہ ترقی کی رفتار میں۔

خود یورپ کے سوشلسٹ ایک عرصے سے اشتراکیت کو [illegible] نیشنلائزیشن کا مترادف نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک اشتراکیت کا جوہر سماجی انصاف کے مقصد سے عبارت ہے۔ اور اصل اہمیت اس مقصد کی ہے نہ کہ ذرائع کی۔ نہ صرف یہ بلکہ ۱۹۵۱ء کی بین الاقوامی اشتراکی کانفرنس میں اشتراکیوں نے مکمل نیشنلائزیشن کے پروگرام کو مسترد کر دیا اور اس کی وجہ یہی تھی کہ اس سے سماجی انصاف اور جمہوریت کا وہ دوگانہ مقصد جس کا حصول پیشِ نظر تھا، معرضِ خطر میں پڑ جاتا ہے۔ سویڈن کی اشتراکی پارٹی نے اور جسے ایک طویل عرصے تک برسرِ اقتدار رہنے کا موقع ملا، اس میں

کا اقتصادی تجربہ خاصا کامیاب شمار کیا جاتا ہے) نیشنلائزیشن سے عمداً احتراز کیا ہے، بلکہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے تقاوم مماثل کو استعمال کیا ہے۔

اقتصادی پروگرام کے بارے میں راقم الحروف کا تاثر یہ ہے کہ بعث پارٹی کے رہنماؤں نے سہل انگاری کا راستہ اختیار کیا بجائے اس کے کہ اقتصادی حالات کے معروضی مطالعہ کے بعد، سماجی انصاف اور جمہوریت کے دوگونہ تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایسا پروگرام بنانے کی کوشش کی جاتی جسے عرب ممالک کے مخصوص حالات سے مناسبت ہوتی۔ بعث پارٹی نے نیشنلائزیشن کو تمام مسائل کا حل سمجھا۔ یہاں بھی بعث نے کسی تخلیقی، اجتہادی عمل کے بجائے تقلید کا آسان راستہ اختیار کیا۔ زندگی کے اور تمام شعبوں کی طرح شاید اقتصادیات کے میدان میں بھی کسی تخلیقی کارنامے کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ آدمی کسی حالات کا حقیقت پسندانہ شعور رکھتا ہو اور کچھی دوسرے کے سوچے ہوئے حل کو بے سوچے سمجھے قبول کرنے کے بجائے ان کو پرکھ کے خود رائے قائم کرنے اور پھر سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ اسے اپنے معاشرے کے مخصوص مزاج، اس کی روایات اور اقدار سے آگاہی ہو اور وہ ان سے لگاؤ بھی رکھتا ہو

لہ بعث پارٹی کا پورا نام ہے: حزب البعث العربی الاشتراکی۔

مضمون کے آغاز میں ہی اس امر کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اس مضمون میں لفظ "اشتراکیت" اور "اشتراکی"، بالترتیب سوشلزم اور سوشلسٹ کے مترادف کے طور پر استعمال کئے گئے ہیں۔ اس وضاحت کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ اگرچہ عربی میں لفظ "اشتراکیت" کو ایک اصطلاح کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے لیکن اردو میں اس کے استعمال میں قدرے لاپرواہی برتی جاتی ہے۔ کبھی تو اسے سوشلزم کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، اور کبھی کمیونزم کے لیے (کمیونزم کے لیے عربی کی مسلّمہ اصطلاح شیوعیۃ ہے۔ اردو میں اس کے لیے بعض اوقات اشتمالیت کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے لیکن ابھی تک اسے قبولِ عام حاصل نہیں ہو سکا)۔ ۲ے۔ یہ سطور لکھی جا چکی تھیں کہ عرب و اسرائیل کی حالیہ جنگ ۵ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ۔ کے دل خراش نتائج سامنے آگئے۔ یہ سطریں اس وقت لکھی جا رہی ہیں (۱۰ جون ۱۹۶۷ء) جبکہ اسرائیل کی فوجیں ایک طرف خلیج عقبہ اور نہر سویز کے مشرقی کنارے پر قابض ہیں اور دوسری طرف اردن کے ایک بڑے حصے کو (خاص طور پر بیت المقدس کے اس حصے کو جو ۱۹۴۸ء میں اُن کی زد میں نہ آسکا تھا، اور جہاں اسلام کی قدیم ترین یادگاریں ہیں) روند چکی ہیں، اور تیسری طرف دمشق کے دروازوں پر دستک دے رہی ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ صدرِ مصر جمال عبدالناصر نے اپنی تصنیف فلسفۃ الثورۃ (مطبوعہ ۱۹۵۴ء) میں فلسطین کی پہلی جنگ میں عربوں کی شکست کے اسباب کا قدرے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اور واضح طور پر اس خیانت کی پردہ دری کی ہے۔ جو اس شکست کا باعث ہوئی ہے۔ اس بار جو تاریخی سانحہ پیش آیا ہے، کاش وہ اس راز سے پردہ اٹھا سکیں کہ [illegible] خدمت کو نہ جمل ہے؟ کس نے عربوں میں پھوٹ پیدا کرنے اور اُن کے اختلافات کو باہمی دشمنی میں تبدیل کر دینے میں حصہ لیا، کس کس نے [illegible] عوام کو بیوقوف بنایا اور کون خود امریکہ، روس اور اسرائیل کے دامِ فریب میں گرفتار رہا؟ سابقہ جنگ کے بعد شام کے [illegible] مفکر اور صاحب نظم قسطنطین زریق نے بھی اس سانحے کا تجزیہ کر کے عبرت دلانے کے لیے معنی النکبۃ نامی کتاب لکھی تھی۔ (اس کا انگریزی ترجمہ بھی موجود ہے: The Meaning of Disaster, tr. by W. Winder, Beruit, 1956.) اس بار جو عبرت ناک نتائج سامنے آئے ہیں، اُن کا حق دس بیس مصنف بھی شاید ہی ادا کر سکیں!! ۳ے۔ یہاں میرا اشارہ خاص طور پر شام اور عراق کی سیاست داں اور اُن کی جماعتوں، مثلاً شام کی الکتلۃ الوطنیۃ اور حزب الشعب اور عراق کی حزب الاستقلال وغیرہ کی طرف ہے۔ اگرچہ اس کا اطلاق بڑی حد تک دوسرے عرب ممالک کے پرانے سیاست دانوں پر بھی ہوتا ہے۔ ۴ے۔ ۱۹۶۳ء میں دو نہایت اہم عرب ملک، شام اور عراق۔ بعث پارٹی کے زیرِ اقتدار تھے۔ اگرچہ ۱۹۶۳ء کے اختتام تک عراق اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا، لیکن شام پر ۱۹۶۳ء سے مسلسل بعث پارٹی کی حکمرانی ہے۔ وہ حالات

جس کا بنا پر اسرائیل اور عرب ممالک کے درمیان حالیہ جنگ ہوئی، ان کے پیدا کرنے میں شام کی برسرِ اقتدار بعث پارٹی کا نہایت اہم حصّہ ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مصر نے جب جنگ بندی کی قرارداد منظور کر لی، تو حکومتِ شام نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اعلان کیا کہ وہ اسرائیل سے تن تنہا اس وقت تک جنگ جاری رکھے گی جب تک تل ابیب پر فلسطین کا جھنڈا نہ لہرانے لگے۔ پتہ نہیں اسے قابلِ ستائش شجاعت قرار دیا جانا چاہیے یا احمقانہ تہوّر، یا پھر سستے جذباتی نعروں سے اپنے عوام کو فریب دینے کی ایک مکروہ کوشش، اس لیے کہ اس اعلان کو ابھی ۴۸ گھنٹے بھی نہ گزرے تھے کہ ہوتا ذرد جو پہلے ہی سیاسی تطہیر کی بنا پر بڑی حد تک کمزور ہو چکی تھی، قطعی بے بس ہو چکی تھی، اور اسرائیلی فوجیں دمشق سے زیادہ دور نہ تھیں۔ [illegible] مثلاً ملاحظہ ہو میشیل عفلق، معرکۃ المصیر الواحد، دار الآداب، بیروت، تیسرا ایڈیشن ۱۹۶۳ء، صفحہ ۹ عفلق کے نزدیک بعث کوئی عقلی اور فنی یا منطقی قسم کی تحریک نہیں، بلکہ ایک سنجیدہ اور ایجابی تحریک ہے۔ اس طرح عفلق بار بار اپنی پارٹی کو "انقلابی" اور معرکہ آرا جماعت قرار دیتے ہیں۔

[illegible] میشیل عفلق کی زندگی کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو: Middle East Forum, Vol. 33, No. 2. اس کے علاوہ ملاحظہ ہو کمال ابوجابر کی انگریزی تصنیف "The Arab Ba'th Socialist Party", Syracuse, 1966. صفحہ ۱۳

[illegible] یہ باتیں بعث پارٹی کے ابتدائی دور سے متعلق ہیں جبکہ ابھی اکرم الحورانی کی ہردلعزیزی، سیاسی زیرکی، اور خطیبانہ سحر انگیزی پر بعث کا کوئی حق قائم نہ ہوا تھا۔ اس وقت اکرم الحورانی اپنی ایک الگ جماعت چلا رہے تھے جس کا نام تھا الحزب العربی الاشتراکی۔ (اس دور میں بعث کا نام صرف حزب البعث العربی تھا) ۱۹۵۳ء میں دونوں جماعتیں ایک ہو گئیں، اور اس وقت سے حزب البعث کے نام میں عربی کے بعد لفظ "اشتراکی" کا اضافہ صرف نام میں ہی ہوا ہے، ورنہ اس سے قبل بھی بعث پارٹی اشتراکی فلسفہ اور پروگرام کی علم بردار تھی۔

[illegible] اس کے لیے ملاحظہ ہو H. Z. Nuscibeh, *The Ideas of Arab Nationalism*, 1950.

ساطع الحصری کی تصانیف اس سلسلے میں خاص طور پر قابلِ مطالعہ ہیں، بالخصوص ملاحظہ ہوں: آراء واحادیث فی القومیۃ العربیۃ (قاہرہ ۱۹۵۱ء)، دفاع عن العروبۃ (بیروت، ۱۹۵۶ء)، العروبۃ اولاً (دوسرا ایڈیشن، بیروت، ۱۹۵۹ء) محاضرات فی نشوء الفکرۃ القومیۃ (تیسرا ایڈیشن، بیروت، ۱۹۵۶ء) وغیرہ۔ [illegible] ملاحظہ ہو میشیل عفلق، فی سبیل البعث، (دار الطلیعہ، بیروت، ۱۹۵۹ء)، ص ۲۵ و مابعد۔ اس مسئلے پر میشیل عفلق کی تحریروں میں اکثر ایک قسم کا رومانوی اور متصوفانہ رنگ پیدا ہو جاتا ہے، جو اکثر قومی نظریات کا جزو رہا ہے۔ اس وصف کی بنا پر بعض اوقات ان کے صحیح مفہوم کا تعین دشوار ہو جاتا ہے، مثلاً وہ لکھتے ہیں:

"عرب قومیت کوئی نظریہ نہیں، بلکہ نظریات کی خالق ہے۔ اس کو کسی فکر نے جنم نہیں دیا، بلکہ اس نے خود افکار کو پروان چڑھایا ہے۔ یہ آرٹ کی رہینِ منت نہیں، بلکہ آرٹ کا سرچشمہ اور اس کی روح ہے۔ اس میں اور آزادی میں کوئی تضاد نہیں، کیونکہ اگر یہ اپنے فطری راستے پر گامزن ہو کر اور اپنی قوتوں کو بہ تمام و کمال روبہ عمل لا سکے، تو یہ خود (مجسم) آزادی ہے۔" (فی سبیل البعث، ص ۲۷)۔

[illegible] "العرب امّۃ واحدۃ، ذات رسالۃ خالدۃ" یہ بعث پارٹی کا شعار ہے، اور ان کی تحریروں کی ابتدا وانتہا میں اس پابندی سے اسے درج کیا جاتا ہے، جس طرح دیندار مسلمان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھتے ہیں۔ [illegible] اس سلسلے میں خاص طور پر نصیبہ کی محولہ بالا کتاب ملاحظہ ہو۔

[illegible] ملاحظہ ہو بعث پارٹی کے دستور کی دفعہ نمبر ۱، نضال البعث جلد اوّل، ص ۱۰۵۔ اسی طرح بعث پارٹی کے نزدیک "عرب سرزمین" یا "وطن عربی" کی حدود کیا ہیں، اس کے لیے ملاحظہ ہو دستور، صفحہ مذکور دفعہ نمبر ۱۔ عرب کی تعریف کے سلسلے کا آخری نکتہ یعنی خود کو عربوں کی قومی زندگی کا ایک جزو سمجھنا، یہ نقطۂ نظر ساطع الحصری اور عرب قومیت کے اکثر مفکرین کے نظریات سے مختلف ہے۔ ان مفکرین کے نزدیک ایک انسان کا

عرب ہونا ایک معروضی حقیقت ہے، جو اس کے شعور یا عدم شعور، اور علم یا لاعلمی سے متاثر نہیں ہوتی۔ ایک شخص خود کو عرب سمجھے یا نہ سمجھے، خود کو عرب تسلیم کرے یا نہ کرے، اگر وہ کسی عربی زبان بولنے والے معاشرے میں پیدا ہوا ہے، تو وہ لازماً عرب ہے۔ واضح ہے کہ اس تعریف کی رو سے عربی بولنے والے یہودی بھی اسی طرح عرب ہیں جس طرح مسلمان اور عیسائی۔ اس تصور کی زد عرب اسرائیلی کشمکش کی بنیاد ہی پر پڑتی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ عرب مفکرین حقائق سے صرف نظر کر لیتے ہیں۔ ؎ فی سبیل البعث ص ؎ ملاحظہ ہو دستور کی مختلف دفعات بحوالہ نضال البعث۔ ص ۱۷۵ تا ۱۷۶۔ ؎ بعض فکر کا یہ رجحان براہ راست مسلمانوں کے اس نظریے سے ٹکراتا ہے کہ تمام مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ عرب ممالک میں عرب قومیت کے خلاف جو لکھا جا رہا ہے اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ عرب اور غیر عرب کی اس تقسیم کو بعث پارٹی نے جو اہمیت دی ہے وہ مسلمانوں کے درمیان شدید تفریق کا باعث بن سکتا ہے۔ عرب قومیت کے اس پہلو پر متعدد عرب مفکرین نے شدید تنقید کی ہے اور اسے استعمار کا ایک دام فریب قرار دیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر ان کو طاقتور نہ بننے دیا جائے۔ ملاحظہ ہو محمد احمد باشمیل کی القومیۃ فی نظر الاسلام۔ نیز محمد الغزالی اور سید قطب کی تصانیف۔ ؎ بعث پارٹی پر اکثر اسلام دشمنی اور الحاد دوستی کا الزام لگایا گیا ہے۔ دوسرے لوگوں کے علاوہ خود صدر متحدہ عرب جمہوریہ جمال عبدالناصر نے بھی بعث پارٹی کو اس الزام کا ہدف بنایا ہے۔

؎ ملاحظہ ہو فی سبیل البعث ص ۳۴ و مابعد ۱ اور ۳۲، و مابعد۔ میشیل عفلق کی نسل کے بعد نوجوان بعثی لیڈروں کی جو نسل اب میدان میں ہے، ان میں سے متعدد لیڈروں کے رویے میں یہ ظاہری احترام بھی نہیں نظر آتا، بلکہ اس کی جگہ انتہا پسندانہ مخالفت ملتی ہے۔ ابھی ایک ماہ قبل شام کے ایک سرکاری جریدے میں اسلام کی جو کھلم کھلا تضحیک کی گئی ہے۔ وہ اس رویہ کی آئینہ دار ہے۔ ؎ فی سبیل البعث، ص ۲۰۲۔ اس موضوع پر میشیل عفلق کی تحریریں مختلف مقامات پر بکھری ہوئی ہیں۔ خاص طور پر ملاحظہ ہوں صفحات ۹۴ و مابعد، ۱۳۷ و مابعد، ۱۹۳ و مابعد، اور ۲۰۰ و مابعد اس سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے، کہ بعثی رہنما اس الزام کی شدت سے تردید کرتے ہیں کہ ان کی تحریک، الحاد کی تحریک ہے، یا یہ کہ وہ اصلاً مذہب کی نفی کرتی ہے، کمیونسٹوں کے مقابلے میں وہ اس حیثیت سے خود کو ممیز کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک مذہب تاریخ انسانی میں ہمیشہ ایک اہم عامل رہا ہے، اور اس کے بارے میں منفی رویہ اختیار کرنا ایک سطحی حرکت ہے۔ ؎ نضال البعث، جلد اول، ص ۱۷۲۔ ؎ یہ نقطہ نگاہ میشیل عفلق کی تحریروں میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ مثلاً ملاحظہ ہو فی سبیل البعث، ص ۱۰۹، ص ۱۳۰ و مابعد، اور معرکۃ المصیر الواحد، ص ۱۵۔ ؎ ملاحظہ ہو فی سبیل البعث، ص ۱۲۰، ۲۰۲ وغیرہ۔ لیکن دین کا کیا جوہر ہے۔ جس کے بقا کی بعثی مفکروں کو فکر ہے؟ بعثی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ جوہر [illegible] ہے لہذا اسلام سے قومی زندگی میں جس کردار کی توقع ہے وہ یہ ہے [illegible] انقلابی جدوجہد میں ایمان، نامساعد حالات کا مقابلہ کرنے کے سلسلے میں صبر و مقاومت کی قوت، اپنے نصب العین کی خاطر دنیوی لالچوں سے کنارہ کشی، اور مروجہ اور مسلط اقتدار سے بغاوت! (ملاحظہ ہو ص) ؎ فی سبیل البعث، ص ۲۱۳۔ ؎ ایضاً ص ۱۴۲، ۲۱۳، ۲۳۶، ۲۴۷۔ ؎ ایضاً ص ۱۶۶۔ اس کے علاوہ ملاحظہ ہو ص ۸۷، جہاں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ماضی میں لوگوں کی زندگی میں مذہب قوت محرکہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن موجودہ زمانے میں قومیت نے یہ مقام حاصل کر لیا ہے۔ ؎ ملاحظہ ہو فی سبیل البعث، ص ۱۰۹، ۱۴۹، ۱۵۹، وغیرہ۔ ؎ بعث پارٹی کے دستور کی دفعہ ۴۔ یہ خیال کہ بعثی اشتراکیت عربیت پر مبنی ہے، بعث پارٹی ایک عرصے تک اس پر زور دیتی رہی۔ گزشتہ چند سال سے بعث پارٹی کی نوجوان قیادت، جو اب شام پر حکمران بھی ہے۔ اس نے بڑی حد تک اس خیال کو ترک کر دیا ہے۔ موجودہ زمانے میں بعث پارٹی عرب اشتراکیت کی انفرادیت کے نظریے سے دستبردار ہو چکی ہے۔ (ملاحظہ ہو ابو جابر، ص ۹۹) ؎ فی سبیل البعث، ص ۱۰۷ تا ۱۰۸۔

۔ معرکۃ المصیر الواحد، ص ۷۰ ۔ فی سبیل البعث، ص ۸۰ وما بعد۔ کمیونسٹوں اور کمیونزم کی مخالفت بعثی لٹریچر میں جابجا پائی جاتی ہے عراق کے انقلاب (جولائی ۱۹۵۸ء) کے بعد یہ مخالفت اور بھی شدید ہوگئی۔ خود شام میں ۱۹۵۸ء میں متحدہ عرب جمہوریہ کے قیام سے قبل اور اس کے ایک عرصہ بعد تک بعث پارٹی کی پالیسی کا ایک اہم محرک اس کا یہ اندیشہ تھا کہ کمیونسٹ شام میں اپنا اقتدار نہ قائم کرلیں۔ کمیونزم اور کمیونسٹ پارٹی کے بارے میں بعث پارٹی کے نقطۂ نگاہ کو سمجھنے کے لیے ملاحظہ ہو سعدون حمادی، نحن والشیوعیۃ فی الازمۃ الحاضرۃ، فی سبیل البعث، ص ۹۶۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ میشیل عفلق کا یہ نظریہ کہ بعثی اشتراکیت کوئی مستقل نظریۂ زندگی نہیں۔ بلکہ ایک مجرد اقتصادی تنظیم کا نام ہے بعد میں بڑی حد تک ترک کر دیا گیا۔ خود منیف الرزاز نے، جو ابتدائی دور کے نسبتاً معتدل اشتراکی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں، انہوں نے بھی اشتراکیت کے ایک مکمل نظریۂ زندگی ہونے پر زور دیا ہے (منیف الرزاز اور دوسرے اشتراکی مصنفین کے اس رجحان کے لیے ملاحظہ ہو: الاشتراکیۃ فی التجارب العربیۃ سلسلۃ الفکر العربی۔ دار الکتاب الجدید، بیروت، ۱۹۶۵، ص ۲۱۵ وما بعد۔ فی سبیل البعث، ص ۹۶ وما بعد۔ ملاحظہ ہو بعث کے دستور کا اصول دوم۔ جمہوریت اور فرد کی آزادی پر عفلق کی تحریروں میں جابجا زور دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ملاحظہ ہو منیف الرزاز کی تازہ تصنیف، الحریۃ ومشکلتھا فی البلدان المتخلفۃ، دار العلم للملایین، بیروت، ۱۹۶۵ء۔ یہ بات واضح رہے کہ یہاں ہم ان نظریات کا ذکر کر رہے ہیں جو بعثی رہنماؤں نے پیش کئے ہیں نہ کہ ان کے عمل کا۔ اس لیے کہ جہاں تک عمل کا تعلق ہے۔ بعث پارٹی کا اقتدار خود ایک نہایت جابرانہ نوعیت آمرانہ قسم کی آمریت قائم کرنے کا باعث بنا۔ نہ صرف یہ کہ مصر کی طرح شام فوجی حکومت کا شکار رہا۔ جس کی مخالفت میں بعث پارٹی بہت کچھ کہتی آئی ہے۔ بلکہ اس کے ذریعہ اقتدار شام کے جمہور سے چھن کر ایک مخصوص اقلیت کے ہاتھ میں منتقل ہوگیا جو اشتراکیت کے بلند آہنگ نعروں کے سہارے لوگوں کو ان کی آزادی کے حق سے محروم کرچکی ہے۔ اور جس نے شام کی ۹۰ فی صد اکثریت کو فوجی طاقت کے بل بوتے پر بے دست و پا بنا کر رکھ دیا ہے اور جو کھلم کھلا ایک مخصوص فرقے کے مادی مفادات کو فروغ دینے کی ہرممکن کوشش کررہی ہے۔ اقتدار میں آنے کے بعد پارٹی نے جمہوریت سے کنی کترانی شروع کی اور "عوامی جمہوریت" کا نعرہ لگایا۔ جس کا عملاً مطلب یہ تھا کہ برسراقتدار پارٹی اپنے حسب منشاء عوام کے جمہوری حقوق پر ہر طرح کی پابندی لگاسکتی ہے۔ مثلاً ان کے اس حق کو سلب کرسکتی ہے کہ وہ جماعتیں بنائیں، آزادی سے جلسوں یا اخبار و رسالوں میں اپنے خیال کا اظہار کریں۔ پھر بھی پارلیمانی جمہوریت کے نصب العین سے زبانی وابستگی برقرار رکھی گئی اور کمیونسٹوں کی طرح "عبوری دور" کی دلیل بطور جواز کے پیش کی گئی۔ اس مسئلہ میں ملاحظہ ہو۔ ابوجابر، ص ۱۲ تا ۱۷۹۔ یہ تمام نکات میشیل کی تحریروں سے ماخوذ ہیں۔ خاص طور پر ملاحظہ ہو فی سبیل البعث، ص ۹۶ وما بعد۔ ملاحظہ ہو ابوجابر، ص ۱۰۰ تا ۱۰۹۔ ابتدائی دور کے بعثی رہنماؤں کا یہ دعویٰ کہ ان کی اشتراکیت مغربی ممالک کی اشتراکیت سے مستعار نہیں۔ بلکہ منفرد چیز ہے اور عرب عبقریت کی خلاقی کا مظہر ہے۔ ایک بے اصل اور مصنوعی دعویٰ تھا اور یہی وجہ ہے کہ آہستہ آہستہ بعث پارٹی کے نوجوانوں نے، جیسا کہ ہم اشارہ کرچکے ہیں، اسے ترک کردیا اور وہ تیزی کے ساتھ اشتراکیت کے اصل سرچشمے۔ مارکسیت۔ کو روز بروز زیادہ اہمیت دینے لگے۔ ایضاً ص ۱۰۹۔ اس کے متن کا انگریزی ترجمہ ابوجابر کی کتاب میں موجود ہے ملاحظہ ہو ضمیمہ ب ص ۱۵۰ تا ۱۶۵۔ ایضاً ضمیمہ ج ص ۱۷۵ تا ۱۸۳۔ بعث کی چھٹی کانفرنس کے موقع پر کمیونسٹ ملکوں کے مخصوص تجربے۔ اجتماعی کاشتکاری۔ کو اپنانے کی پرزور سفارش کی گئی۔ یعنی ان اشیاء کی ملکیت جو آدمی کے ذاتی استعمال میں ہوں، افزائش دولت کا ذریعہ نہ ہوں۔ لیکن ان صنعتوں کے انتظام میں مزدور شریک ہوں گے اور اپنی اجرت کے علاوہ انہیں منافع میں سے ایک حصہ بھی ملے گا، جس کا تعین حکومت کرے گی۔ مزدوروں کا کارخانوں کے انتظام میں شریک ہونا، اسے بعث پارٹی کافی اہمیت دیتی آرہی ہے۔ بعثی اشتراکیت کا ایک ایسا امتیازی پہلو

جس کی وجہ سے

قرار دیتی ہے۔ اشتراکیت نوکر شاہی کی مصیبت کے بغیر قائم ہوسکتی ہے۔ اپنے پیش کردہ نظام میں مزدوروں کی اس حیثیت کی بنا پر وہ اپنی اشتراکیت کو جمال عبدالناصر کی عرب اشتراکیت سے مختلف تصور کرتے ہیں۔ ۴۳ ابو جابر، ص ۹۴۔ ۴۴ کہا جاسکتا ہے کہ ایک اہم فرق یہ ہے کہ بعث جمہوریت نیابتی حکومت اور مختلف سیاسی پارٹیوں کے وجود کی قائل ہے اور افراد کی آزادی تحریر و تقریر وغیرہ کی حامی ہے۔ اور جمال عبدالناصر کا نظام یک حزبی آمریت کے اصول پر قائم ہے۔ لیکن اس سطح پر بھی فرق اتنا نہیں جتنا نظر آتا ہے۔ اس لیے کہ عملاً بعث پارٹی نے بھی اسی قسم کی آمریت مسلط کر رکھی ہے اور لوگوں کی آزادی تحریر و تقریر پر بھی پابندیاں لگا رکھی ہیں اور دہشت و تشدد کی وہی فضا قائم کر رکھی ہے جیسی کہ مصر میں ہے۔ ۴۵ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۶۳ء شام کے بعض رہنماؤں اور جمال عبدالناصر سے اتحاد کے سلسلے مذاکرات کے دوران جمال عبدالناصر نے بار بار اصرار کیا کہ بعثی یہ بتائیں کہ اس کے پروگرام کی کن شقوں سے انہیں اختلاف ہے اور وہ اطمینان بخش جواب دینے میں ناکام رہے۔ طرفہ تر یہ کہ خود جمال عبدالناصر نے انہیں یہ کہہ کر شرمندہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ واضح افکار اور پروگرام سے تہی دست ہیں، جبکہ جمال عبدالناصر کی اشتراکیت بڑی واضح اور معقول پروگرام رکھتی ہے۔ ۴۶ عبدالناصر و فلسطین مطبوعہ بیروت میں اس مقالے ۴۵ احمد فؤاد الیمانی ـ یوماں لا ینتشا بھان، بیروت، ۱۹۶۶ء، ص ۱۰۱۔

عالمی سیاسیات کے بارے میں جو لوگ سرسری معلومات بھی رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ عالمی کمیونزم کی طرح عالمی اشتراکیت کی اسرائیل دوستی بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ جہاں تک روس کا تعلق ہے۔ ریاست اسرائیل کے قیام کے سلسلے میں وہ اس ریاست کے قیام کا پرزور حامی تھا اور قائم ہونے کے بعد ان ملکوں میں تھا جنہوں نے اسے قائم ہوتے ہی تسلیم کر لیا۔ پھر پہلی عرب۔ اسرائیلی جنگ کے موقع پر یہ روسی بلاک کا بھیجا ہوا اسلحہ ہی تھا جس نے توازن کا پلڑا اسرائیلیوں کے حق میں جھکا دیا۔ عربوں کی دوستی کا دم بھرنے کے باوجود حالیہ جنگ کے بعد روس نے عربوں کی ناراضگی کے باوجود متعدد بار امریکہ کے ساتھ ووٹ دیا اور اسرائیلی فوجوں کے انخلاء کی جس قرارداد کا مسودہ اس نے امریکہ کے ساتھ مل کے تیار کیا تھا، اسی میں عربوں سے اسرائیل کو تسلیم کرنے کا مطالبہ تھا۔ عرب ممالک میں ایک کمیونسٹ ہی وہ تحریک ہے جو اصولاً ریاست اسرائیل کے قیام کی حامی ہے اور اب ایسا لگتا ہے کہ اشتراکی حضرات بھی انہیں کے نقوش قدم کو اپنے لیے راہنما سمجھ رہے ہیں۔

کتابیات

عربی

میشیل عفلق ـ فی سبیل البعث، دار الطلیعۃ، بیروت، ۱۹۵۹ء۔
" " ـ معرکۃ المصیر الواحد، الطبعۃ الثالثۃ، دار الآداب، بیروت، ۱۹۶۳ء
حزب البعث ـ نضال البعث، الجزء الاول۔ الجزء السابع، بیروت ۱۹۶۳ء۔ ۱۹۶۵ء۔
صلاح الدین البیطار ـ السیاسۃ العربیۃ، بین المبدأ والتطبیق، دار الطلیعۃ بیروت، ۱۹۶۰ء۔
منیف الرزاز ـ معالم الحیاۃ العربیۃ الجدیدۃ۔ الطبعۃ الثانیۃ، دار العلم للملایین، بیروت ۱۹۵۶ء
" " " ـ الحریۃ ومشکلتہا فی البلدان المتخلفۃ، دار العلم للملایین، بیروت، ۱۹۶۵ء
سعدون حمادی، نحن والشیوعیۃ فی الازمۃ الحاضرۃ، دار الطلیعۃ بیروت۔

کلونیس مقصود، ازمۃ الیسار العربی، بیروت،

عبداللہ عبدالدائم الاشتراکیۃ والدیمقراطیۃ، دارالآداب، بیروت ۱۹۶۱ء

Kemal S. Abu Jaber, *The Arab Ba'th Socialist Party*, Syracuse, 1966.

Mooroe Berger, *Arab World Today*, (Anchor Books edition), New York, 1964.

Malcolm Kerr, *The Arab Cold War*, London, 1965.

Patrick Scale, *The Struggle for Syria*, London, 1965.

Walter Z. Lacquer, (ed.) *Middle East in Transition*, New York, 1958.

M. Halperu, *The Politics of Social Change — The Middle East and North Africa*, Princeton, 1963.

الجزائری سوشلزم

ممتاز احمد

مئی ۱۹۶۵ء کو پراودا نے سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی اور الجزائر کی نیشنل لبریشن فرنٹ کا ایک مشترکہ اعلامیہ شائع کیا ہے[۱] مشترکہ اعلامیہ میں کہا گیا تھا کہ دونوں پارٹیوں کے رہنماؤں کا مشترکہ اجلاس اس لئے بلایا گیا تھا تاکہ الجزائریوں کو سوویت کمیونسٹ پارٹی کے طریق کار اور اس کی سرگرمیوں سے براہ راست واقفیت بہم پہنچائی جائے اعلامیہ میں سوویت کمیونسٹ پارٹی کے نمایندوں نے اس امر پر گہرے اطمینان کا اظہار کیا تھا کہ الجزائری عوام نے سوشلزم کا راستہ اختیار کیا ہے۔ اور بڑی صنعتوں کو قومی ملکیت میں لے لیا ہے۔
سوویت یونین کے نمایندوں نے الجزائری نمایندوں کی زبانی اُن حالات کی تفصیل "بڑی دلچسپی کے ساتھ سنی" جو الجزائری پیداواری شعبہ میں پائے جاتے ہیں۔

خارجی تعلقات میں بھی دونوں پارٹیوں نے مشترک مقاصد کا ذکر کیا اور سوویت نمایندوں نے الجزائر کی "مثبت طور پر غیر جانبدارانہ خارجہ پالیسی" کی تائید کی۔

مذکورہ مشترکہ اعلامیہ کے جاری ہونے سے دس روز قبل حوری بومیدین نے جو ایک سرکاری وفد کے سربراہ کی حیثیت سے ماسکو کے دورے پر آئے تھے۔ نیوٹائمز کے نمایندے کو انٹرویو دیتے ہوئے صاف صاف کہا کہ بنیادی طور پر الجزائر کی خارجہ پالیسی کی لائن بھی وہی ہے جو سوویت یونین کی ہے:[۲] ۱۹ جون ۱۹۶۵ء کو یعنی اس انٹرویو کے شائع ہونے سے دس دن بعد کرنل بومیدین نے بن بیلا کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا۔ اور خود سربراہ حکومت بن گئے۔ ماسکو سے واپسی کے فوراً بعد بومیدین کا یہ انقلابی اقدام صاف ظاہر کرتا تھا کہ الجزائر کے حالات کی اس فوری تبدیلی میں ماسکو کا کتنا دخل ہے؟

الجزائر میں کمیونسٹ پارٹی اکتوبر ۱۹۳۶ء میں قائم ہوئی۔ ۱۹۵۴ء میں جب الجزائریوں نے آزادی کی خاطر گوریلا جنگ کا آغاز کیا تو کمیونسٹ پارٹی کے ممبروں کی تعداد پندرہ ہزار تھی۔ اور کئی ٹریڈ یونینوں پر اس کا کنٹرول بھی تھا۔ کمیونسٹوں کے مقابلے میں قوم پرست عناصر نے بھی ٹریڈ یونینوں کی طرف توجہ دی اور تھوڑے ہی عرصے میں انہوں نے بہت سی ٹریڈ یونینوں کو کمیونسٹوں کے اثرات سے محفوظ کر لیا۔ الجزائری کمیونسٹ پارٹی مظاہروں اور احتجاجوں میں تو مصروف رہی لیکن اُس نے عملاً گوریلا جنگ میں حصہ نہیں لیا۔ چینی اشتراکیوں نے پارٹی کے اس رول کو ہدف تنقید بناتے ہوئے لکھا ہے:

"الجزائریوں کی کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر خروشچیف اور فرانس کی کمیونسٹ پارٹی کے اشاروں پر ناچتے رہے اور مسلح بغاوت کے خلاف ترمیم پسند پالیسی پر عمل درآمد کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ پارٹی جلد ہی الجزائری عوام کے اعتماد سے محروم ہو گئی اور الجزائر کی سیاسی زندگی میں غیر موثر ہو کر رہ گئی"[۳]

الجزائر کی کمیونسٹ پارٹی کے ایک لیڈر بشیر حاج علی نے بعد میں اعتراف کیا کہ پارٹی نے مسلح بغاوت کی کامیابی کے امکانات کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ پارٹی زیادہ تر فرانس

۱؎ Pravda, May 22, 1965
۲؎ New Times, Mosco June 9, 1965.
۳؎ Peking Review, April 3, 1964

میں پرولتاری انقلاب پر انحصار کر رہی تھی۔ گویا پارٹی کی پالیسی یہ تھی کہ اگر فرانس میں پرولتاری انقلاب آ جائے تو الجزائر کے عوام کو آزادی مل سکتی ہے۔ [1]

۱۹۵۶ء کے وسط میں کمیونسٹ پارٹی نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ وہ قومی تحریک سے الگ رہ کر اپنا وجود زیادہ دیر تک برقرار نہیں رکھ سکتی۔ نیشنل لبریشن فرنٹ کے ماتحت ہو کر کام کرنا منظور کر لیا اور اشتراکی آرمی گروپس کو فرنٹ کی کمان میں دے دیا۔ پارٹی اس بات پر بھی متفق ہو گئی کہ لبریشن آرمی کی کمان میں جانے والے کمیونسٹ اپنے نظریات پر قائم رہتے ہوئے، پارٹی سے تنظیمی تعلق عارضی طور پر منقطع کر لیں گے۔ کمیونسٹ پارٹی کے اس تمام تر تعاون کا مقصد الجزائری عوام کی ہمدردی حاصل کرنا اور قومی تحریک سے اپنے آپ کو وابستہ کرنا تھا۔ لیکن نیشنل لبریشن فرنٹ کے لیڈروں نے کمیونسٹوں کے ان ارادوں کو بھانپ لیا۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۵۸ء میں جب جمہوری حکومت کا قیام عمل میں لایا گیا تو اس میں کوئی اشتراکی شامل نہ تھا۔ پھر جب الجزائر کو آزادی ملی اور پہلے انتخابات منعقد ہوئے تو کمیونسٹ پارٹی نے ایک بار پھر ایف۔ ایل۔ این کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کی۔ پارٹی نے اپنے ممبروں سے اپیل کی کہ وہ ووٹ ایف۔ ایل۔ این کے نمایندوں کو دیں۔ حالانکہ صورت یہ تھی کہ کمیونسٹ پارٹی کے سامنے اس وقت کوئی متبادل صورت تھی ہی نہیں۔ ایف۔ ایل۔ این کا سیاسی پروگرام کم و بیش انہی نقاط پر مبنی تھا جو کمیونسٹ پارٹی کے پیش نظر تھے۔ اس کے علاوہ کمیونسٹ پارٹی تنظیمی طور پر اس قدر کمزور تھی کہ الگ سے سیاسی جد و جہد میں حصہ لینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ۲۹ نومبر ۱۹۶۲ء کو بن بیلا نے الجزائری کمیونسٹ پارٹی کو خلافِ قانون قرار دے دیا۔ کمیونسٹ پارٹی پر پابندی سوویت اشتراکیوں کے لئے بہت بڑا صدمہ تھی۔ سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی نے ایک اعلان میں کہا:۔

"اس خبر سے سامراجیوں اور نو آبادیت پسندوں ہی کو خوشی ہو سکتی ہے۔ سوویت یونین کے دیگر جرائد میں اس پابندی پر تبصرہ کرتے ہوئے خیال ظاہر کی گئی کہ کمیونسٹ پارٹی پر پابندی عائد کر کے دراصل فرانسیسی دوبارہ سامراجیت کو مسلط کرنا چاہتے ہیں۔" الجزائری حکومت کو "غیر جمہوری" اور "آمرانہ" ہونے کا الزام دیا گیا ——— ان سارے الزامات کے باوجود الجزائری حکومت کے بارے میں صرف ایک سال میں سوویت یونین کی پوزیشن یکسر تبدیل ہو گئی۔ نومبر ۱۹۶۳ء میں سوویت یونین کے جریدے "کمیونسٹ" نے اعتراف کیا کہ الجزائر میں اب کمیونسٹوں کو گرفتار کیا جاتا ہے اور نہ ہی اُن پر تشدد کیا جاتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ اب کمیونسٹ کو اپنے نظریات پھیلانے کے مواقع حاصل ہیں۔ [2] ۳ دسمبر ۱۹۶۳ء کو پراودا نے اس نئی پالیسی کی سرکاری طور پر توثیق کر دی۔ پراودا نے لکھا: "الجزائری حکومت نے اعلان کیا ہے کہ سوشلزم کی تعمیر اس کا بنیادی مقصد ہے۔" اب سوال یہ تھا کہ سوشلزم کی تعمیر کمیونسٹ قیادت کے بغیر کیسے ممکن ہے؟ اس سوال کا جواب الجزائری کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر بشیر علی نے حسب ذیل انداز میں دینے کی کوشش کی:۔

"آج حالات مختلف ہیں۔ ایف۔ ایل۔ این اب مختلف عناصر کا مجموعہ نہیں رہی۔ اب یہ بتدریج ایک ایسی جماعت بنتی جا رہی ہے جس کے پیش نظر اشتراکی انقلاب ہے۔ ایسا اشتراکی انقلاب جس کی بنیاد الجزائری چارٹر پر ہوگی۔ کمیونسٹوں نے اس جماعت میں کسی مصلحت کی خاطر شمولیت اختیار نہیں کی بلکہ ان کی شمولیت اصولوں پر مبنی ہے۔ ایف۔ ایل۔ این میں کمیونسٹ نہایت تن دہی اور وفاداری سے کام کریں گے۔ کمیونسٹوں کا مقصد اس کے اندر کوئی گروہ پیدا کرنا نہیں، سوشلزم کے حصول کے لئے تمام تعصبات ختم کر دیئے گئے ہیں۔" [3] جون ۱۹۶۵ء کے انقلاب کے بعد کی قیادت کو بھی روسی تعاون حاصل رہا۔ روس نے نو آزاد ممالک سے تعلقات استوار رکھنے کے لئے اور قومی تحریکات کے انقلابات سے بہتر کرنے کے لئے ایک نیا نظریہ وضع کیا ہے اور اس نظریہ نے روس کو کئی ایک نظریاتی پریشانیوں سے نجات دلا دی ہے۔ یہ نظریہ ہے "غیر سرمایہ دارانہ

---

[1] World Marxist Reviews - Problems of Peace and socialism, Toronto, Ont; 1965, NO I P. 56.

[2] Kommunist, 1963, No: 16, Page 118

[3] [illegible]

نظام" کا نظریہ۔ چنانچہ ایشیائی عوام کی جد و جہد سے متعلق ایک سوویت ... عرب جمہوریہ، برما، مالی، گھانا اور الجزائر کے "غیر سرمایہ دارانہ نظام" کی جانب ترقی کر رہے ہیں۔ ایک نوجوان روسی مستشرق نے "غیر سرمایہ دارانہ راہ" کی یوں وضاحت کی ہے:

"ایسے حالات میں جب کہ دنیا دو متضاد معاشرتی نظاموں میں بٹ چکی ہے، کسی پس ماندہ ملک کا سوشلزم کی جانب، سوشلسٹ ممالک کی عملی تائید کے ساتھ بڑھنا غیر سرمایہ دارانہ راستہ کہلائے گا۔" روسی جرائد نے لکھا کہ چونکہ نیشنل فرنٹ کے ممبر محنت کش عوام ہی ہیں اس لئے یہ جماعت مارکس اور لینن کے نظریات ہی کو بروئے عمل لانا چاہتی ہے۔ الجزائری قیادت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ لوگ نچلے درجے کے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے انقلابی دانشور ہیں۔ روسی جرائد نے دبے الفاظ میں اس امید کا اظہار بھی کیا ہے کہ اگر کمیونسٹ نیشنل فرنٹ میں شامل ہو جائیں تو ممکن ہے آگے چل کر قیادت "پرولتاریہ طبقہ" کے ہاتھ میں آ جائے۔ لیکن یہ تبدیلیٔ قیادت صرف اسی وقت عمل میں آ سکتی ہے جب پرولتاریہ میں سے بڑی تعداد میں لوگ فرنٹ میں شامل ہوں۔ کمیونسٹوں کو یہ انتباہ بھی کیا گیا ہے کہ وہ فرنٹ میں شامل ہونے کے لئے اپنی آزادانہ پالیسی کو بھی برقرار رکھیں اور یہ کہ طبقاتی کشمکش کسی صورت میں ختم نہیں ہو سکتی البتہ اس کی ظاہری صورت میں تبدیلی ممکن ہے۔

الجزائر میں سوشلزم کے نام پر چند بڑی صنعتوں کو قومی ملکیت میں دے دیا گیا تھا۔ لیکن ابھی تک متعدد صنعتیں ذاتی ملکیت میں برقرار رکھی گئی تھیں۔ جاگیرداری برائے نام ختم کر دی گئی تھی۔ لیکن برسرِ اقتدار طبقہ کے حامی افراد میں سے متعدد کے پاس جاگیریں موجود تھیں۔ دراصل الجزائر کی قیادت سوشلزم کے بارے میں کچھ زیادہ سنجیدہ نہیں تھی۔ الجزائری قیادت کو، بعض دوسرے ترقی پذیر ممالک کے سربراہوں کی طرح، سوشلزم سے دلچسپی اس کے آمرانہ رجحانات کی بنا پر تھی۔ ان کے نزدیک سوشلزم کا مفہوم یہ تھا کہ برسرِ اقتدار جماعت کے علاوہ باقی تمام جماعتوں پر پابندی لگا دی جائے۔ حزبِ اختلاف کا وجود ختم کر دیا جائے۔ سیاسی مخالفت کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ اور ملک کے تمام معاشی وسائل کو سرکاری کنٹرول میں لے کر ملک کے سیاہ و سپید کے مختارِ کل کی حیثیت اختیار کی جائے۔ یہ صورتِ حال نہ تو اسلام برداشت کر سکتا ہے اور نہ ہی مغربی جمہوری نظام میں اس کی گنجائش نکل سکتی ہے۔

الجزائری قیادت اس امر سے اچھی طرح آگاہ تھی کہ الجزائر کے عوام سوشلزم کی گولی کو آسانی سے نگلنے پر تیار نہیں ہوں گے۔ چنانچہ عوام کی اسلام پسندی کے پیش نظر بن بیلا اور دوسرے رہنماؤں کو کئی بار یہ اعلان کرنا پڑا کہ سوشلزم کی جو صورت ان کے پیش نظر ہے۔ وہ اسلام سے متصادم نہیں بلکہ اسلام کے عین مطابق ہے۔ بن بیلا کی ان تصریحات پر تبصرہ کرتے ہوئے روس کے ایک جریدے نے لکھا:

"یہ ممکن ہے کہ بعض حالات میں مذہبی لحاظ سے تشدد عناصر بھی عملاً سوشلزم کا پھل چکھنا ضروری سمجھیں۔ لیکن جب یہ ترقی (یعنی سوشلزم) ان کی زندگی کا ایک لازمی جزو بن جائے گی تو انہیں معلوم ہوگا کہ اس راستے میں ان کے لئے اصل رکاوٹ کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ سوشلزم کی جانب اس وقت تک ترقی کی ہی نہیں جا سکتی جب تک کہ ساتھ ساتھ اس طرح کی جہالت کو دور نہ کیا جائے اور عوام کا ثقافتی معیار بلند نہ کیا جائے۔ اس معیار پر پہنچ کر عوام لازماً اس سوال کو اٹھائیں گے۔ کہ کیا سوشلزم کی تعمیر کسی صورت میں بھی مذہبی تعصبات سے ہم آہنگ ہو سکتی ہے؟ پھر یقیناً محنت کش طبقے کی جماعت کی سیاسی قوت ان کو اس سوال کا صحیح جواب تلاش کرنے میں مدد دے گی۔" ؎

بن بیلا کے بعد کرنل بومدین نے بھی سوشلزم کے ساتھ اسلام کا نام لینا ضروری سمجھا۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ نیشنل لبریشن فرنٹ دراصل کسی ایک نظریے پر متفق منظم جماعت نہیں ہے بلکہ مختلف نظریاتی عناصر کا مجموعہ ہے۔ اس میں پکے کمیونسٹ بھی ہیں، قوم پرست بھی، اسلام پسند بھی اور سوشل ڈیموکریٹ بھی۔ بن بیلا کے جانے کے بعد فرنٹ میں کمیونسٹوں کا اثر کم ہو گیا تھا اور اسلام پسند عناصر عارضی طور پر قوت پکڑ گئے تھے۔ بومدین یہ جانتے تھے۔ کہ وہ فرنٹ کے اس اہم عنصر کو ناراض کر کے اپنے نئے نئے اقتدار کو برقرار نہیں رکھ سکتے۔

؎ Mezhdunarodnaya Zhizn, 1962, No: 10, P. 72

یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی ابتدائی تقاریر میں سوشلزم کے ساتھ ساتھ اسلام کا نام لینا بھی ضروری سمجھا۔ دوسری وجہ عوام کی اسلام پسندی اور اشتراکیت سے ناواقفی تھی۔ بومیدین قوم کو صرف سوشلزم کے نام پر پابند نہیں کر سکتے تھے۔ عوام کا اسلامی شعائر سے تعلق کا عالم یہ تھا کہ بن بیلا کی تمام تر کوششوں کے باوجود، اور حکومت کی طرف سے باقاعدہ مہم چلائے جانے کے باوجود عورتوں نے پردہ ترک کرنے سے انکار کر دیا۔ ٹائمز آف انڈیا کے نمائندے مسٹر ایم۔ وی کامتھ نے الجزائر کے دورے کے بعد لکھا:

”عورتوں کا ابھی گھر سے نکلنا باقی ہے۔ عورتوں کا سڑکوں پر برقعوں میں لپٹے لپٹائے دکھائی دینا ان لوگوں کے لئے صدمے سے کم نہیں جو یہ سمجھ رہے تھے کہ انقلاب نے عورتوں کو اس معاشرتی جبر سے نجات دلا دی ہے۔“ [۸]

کامتھ نے اپنے مکتوب کے آخر میں لکھا:

”الجزائری سوشلزم اس وقت تک بے معنی ہوگا جب تک کہ ملک کی تمام عورتیں اس پس ماندگی سے نکل نہیں آتیں۔“ [۹]

مسٹر کامتھ نے اس امر پر اطمینان کا اظہار کیا کہ بومیدین کی سرکردگی میں نئی قیادت اس ”اہم مسئلے“ کا شعور رکھتی ہے اور اسے جلد حل کر دے گی۔ [۱۰]

انقلاب سے کچھ دن بعد مصر کے ”الاخبار“ کو انٹرویو دیتے ہوئے کرنل بومیدین نے کہا کہ نئی قیادت ”ایک ایسے سوشلزم کی تعمیر کے لئے کام کرے گی جو الجزائر کے مخصوص حالات، ہمارے تجربات، ہمارے طرز زندگی، ہماری جد و جہد اور ہمارے مذہب کے مطابق ہوگا۔“ [۱۱]

”الجزائر کے مخصوص حالات“ سے بومیدین کی مراد غالباً یہ تھی کہ الجزائری سوشلزم کا روسی سوشلزم سے سو فی صد مطابقت رکھنا ضروری نہیں۔ کرنل بومیدین سوشلزم کی راہ پر اس حد سے آگے بڑھنے کو تیار نہیں تھے جس حد تک بن بیلا جا چکے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ذاتی ملکیتوں کا نظام بڑی حد تک برقرار رکھتے ہوئے چند مخصوص شعبوں میں ریاستی کنٹرول نافذ کیا جائے۔ ابھی تک روس سے ملاقات کی انہوں نے تفہیم نہیں ہوئی تھی اور وہ نہیں جانتے تھے کہ روس ان کو کس حد تک اقتصادی امداد مہیا کرے گا۔ اس دوران میں ان کی نظریں فرانس اور امریکہ کی طرف بھی لگی ہوئی تھیں۔ فرانس اور امریکہ سے امداد حاصل کرنے کے لئے ضروری تھا کہ بیرونی سرمائے کو تحفظ کی کافی ضمانت دی جائے۔ چنانچہ ۵ جولائی کو انہوں نے کہا:

”ہمیں چاہئے کہ ہم لوگوں کا اعتماد بحال کریں تاکہ ملکی و غیر ملکی سرمایہ کاروں کو ہمارے ملک کی ترقی کے لئے سرمایہ لگانے کی ترغیب دی جا سکے۔“ [۱۲]

اس کے بعد انہوں نے سوشلزم کی جو تعبیر کی وہ کم و بیش جمہوری ممالک میں اکثر استعمال ہونے والی مبہم اصطلاح ”عدل اجتماعی“ کے مترادف تھی اور اس تعبیر میں بڑی اور درمیانی صنعتوں اور بڑی ذاتی ملکیتوں کو قومیانے کا کوئی ذکر نہ تھا۔ کرنل بومیدین کے لئے سب سے پہلا مسئلہ ملک کا معاشی استحکام تھا، لیکن مصر کی روایت پر عمل کرتے ہوئے الجزائری قیادت نے بھی داخلی مسائل کی طرف کم اور خارجی معاملات پر زیادہ توجہ دی۔ ملک کی معاشی حالت کا عالم یہ تھا کہ سوشلزم کے تمام تر نعروں کے باوجود ملک کا ہر تیسرا بالغ فرد بے روزگار تھا۔ چھوٹے کاشت کاروں سے سوشلزم کے نام پر وعدے تو بہت کئے گئے، لیکن ابھی تک انہیں سوائے احساس محرومی کے اور کچھ حاصل نہیں ہو سکا ہے۔ [۱۳]

عوام کی حالت ویسی ہی ہے جیسی کہ آزادی سے قبل تھی۔ اور سوشلزم کی تعمیر جس انداز میں کی جا رہی ہے اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ ایشیائی افریقی ممالک میں محض نمائشی مجوزہ نمائش کے لئے بن بیلا نے الجزائر میں چالیس لاکھ ڈالر کے خرچ سے ایک اسٹیڈیم تعمیر کرایا تاکہ ایشیائی کھیلیں آئندہ یہاں منعقد ہوا کریں۔ بعد میں جب ان کے ایک قریبی دوست نے ہوٹل تعمیر کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو چالیس لاکھ ڈالر کے خرچ سے تعمیر کردہ یہ اسٹیڈیم گرا دیا گیا اور اس کی جگہ پر ایک عالی شان ہوٹل تعمیر کر دیا گیا

---

[۸] Times of India, Bombay, July 22, 1965. [۹] Ibid.
[۱۰] Ibid, [۱۱] Times of India, Bombay, July 6, 1965.
[۱۲] Times of India, Bombay, July 6, 1965.
[۱۳] "Ben Bellaism without Ben Bella" by David Ottaway, "Pakistan Observer," Dacca, Feb: 14, 1966.

۱۲ اس سوشلزم سے الجزائری عوام کو تو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ البتہ الجزائری قیادت نے اپنے اقتدار کے استحکام میں خاصی مدد لی ہے: بن بیلا نے سوشلزم کے پردے میں محمد خضر، فرحت عباس اور تحریک آزادی کے دوسرے رہنماؤں کو گرفتار اور جلا وطن کیا اور بے شمار مخالف سیاسی کارکنوں کو جیل میں ڈال دیا۔ اسی سوشلزم کے نام پر کرنل بومدین نے بن بیلا کی حکومت کا تختہ الٹا اور بن بیلا کے حامیوں کو بڑی تعداد میں گرفتار کیا۔ اس طرح اکثر نو آزاد ممالک کی طرح الجزائر میں بھی سوشلزم برسر اقتدار طبقہ کی نظر میں ایک ایسا ہتھیار ہے جو اُن کے اقتدار کے مخالفین کے خلاف استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ۱۳

---

۱۲ "Times of India, July 7, 1965.

۱۳ مضمون کا ابتدائی حصہ انسٹی ٹیوٹ فار دی اسٹڈی آف دی یو ایس ایس آر کے بلیٹن (جنوری ۱۹۶۶ء) سے ماخوذ ہے۔

انڈونیشیا

میں

کمیونسٹوں کا عروج و زوال

حسان کلیمی

۳۰ ستمبر اور یکم اکتوبر ۱۹۶۵ء کی درمیانی شب انڈونیشیا کی تاریخ میں ایک اہم رات تھی۔ اس رات انڈونیشیا کی کمیونسٹ پارٹی (P.K.I) نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت خونی انقلاب کے ذریعہ دنیا کے سب سے بڑے مسلمان ملک کی حکومت پر قبضہ کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

اس خونی انقلابی منصوبے کے روبہ عمل آنے سے چھ ماہ قبل انڈونیشی کمیونسٹ پارٹی کے سربراہ دیپا نوسان تارا آئیڈت نے ایک موقعہ پر نہایت وضاحت سے کہا تھا۔ "انڈونیشیا کے محنت کش طبقے کو اس بات کا احساس ہے کہ اشتراکیت کی منزل تک پہنچنے کے لئے اسے اپنی مساعی کو صرف سماجی اور اقتصادی میدانوں تک محدود نہیں رکھنا چاہیے۔ بلکہ سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرنی چاہیے۔"

آئیڈت کے خواب اقتدار کی تعبیر یوں نکلی کہ یکم اکتوبر ۱۹۶۵ء کی صبح کو جب جکارتا کے شہری سو کر اٹھے تو انہوں نے اپنی دنیا بدلی ہوئی پائی۔ شہر پر سرخ انقلاب کے سائے منڈلا رہے تھے۔ اور ریڈیو جکارتا انقلابی نغمات کی دھنیں نشر کر رہا تھا۔ ۳۰ ستمبر کی تحریک جسے انڈونیشی زبان میں GESTAPU یعنی Gerakan September Tiga-Puluh کا نام دیا گیا تھا بظاہر کامیاب تھی اور شہر پر کمیونسٹوں کا قبضہ تھا۔

پراسرار گستاپو کی کامیابی کے لئے کمیونسٹ پارٹی نے بساط انقلاب پر اپنے مہروں کو کلاسیکی اشتراکی انداز میں لگایا تھا۔ چونکہ صرف انڈونیشی افواج ہی سے اشتراکی انقلاب کا خطرہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے فوج کے سربراہوں کو ایک ساتھ اچانک قتل کر کے ایک خلاء پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ تاکہ اس خلاء میں کمیونسٹوں کے ہمدرد فوجی عناصر عنان حکومت سنبھال لیں۔

کمیونسٹ تعذیب

فوجی جرنیلوں کو اچانک گرفتار کرنے اور مارنے کے منصوبہ پر یکم اکتوبر کی صبح کو عمل کیا گیا۔ انڈونیشی افواج کے سربراہ جنرل احمد یانی کے مکان پر حملہ کر کے انہیں گرفتار کر کے وہیں گولی مار دی گئی اور ان کی نعش کو ٹرک پر لاد کر بلوائی آگے بڑھے۔ دوسرا نشانہ جنرل عبدالحارث ناسوتیان کا مکان تھا۔ ناسوتیان صبح کے ۴ بجے تہجد کی نماز کے لئے بیدار تھے۔ چنانچہ وہ اپنے مکان کی عقبی دیوار

سے چھلانگ لگا کر فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ لیکن ناسوتیان کا ایڈی کانگ تندیان جو اپنے جنرل سے صورت شکل میں بہت مشابہ تھا۔ بلوائیوں کا شکار ہوگیا۔ تندیان کو انہوں نے ناسوتیان سمجھا اور اس طرح انہیں یقین تھا کہ کمیونسٹوں کا سب سے بڑا دشمن راستے سے ہٹا دیا گیا۔ ناسوتیان کے مکان پر گولیوں کی بوچھاڑ سے جنرل کی ۵ سالہ بچی زخمی ہوئی اور جلد ہی چل بسی اس طرح بلوائیوں نے چار اور جرنیلوں کو زخمی اور گرفتار کر کے جلیم کے ہوائی اڈہ پر انہیں اندھے کنوئیں میں ڈال کر دفن کر دیا۔ کنوئیں میں ڈالنے سے قبل ان مردہ قیدیوں کے جسموں پر ویزر بلیڈ سے پچھنے لگائے گئے۔ بعض کے ناخن اور آنکھوں کے ڈھیلے نکال لیے گئے۔ اور بعض کے مخصوص اعضاء کو کاٹ ڈالا گیا۔

ایذا رسانی کی اس بھیانک رسم کا خاتمہ ایک خاص گانے اور ناچ پر ہوا۔ مقتول جرنیلوں کی لاشوں کے گرد "گروانی" (کمیونسٹ پارٹی کی نوجوان عورتوں کی شاخ) کی رضاکار عورتیں ناچ ناچ کر جرنیلوں کے کٹے ہوئے اعضاء کو ہاتھ میں لے کر اشارے کر رہی تھیں۔ چشم دید گواہوں نے اس خونی منظر کا نہایت بھیانک نقشہ بیان کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ عام طور سے نرم خو اور سیدھی سادھی انڈونیشی لڑکیاں بھی ایک ملحدانہ اور مادہ پرستانہ نظریۂ حیات سے متاثر ہو کر کتنی ظالم۔ بے حیا اور خونخوار بن سکتی ہیں

اس طرح انڈونیشی فوج کی اعلیٰ کمان کا صفایا کرنے کے بعد کمیونسٹوں کے آلہ کار کرنل انتنگ نے صبح ۷ بجے ریڈیو جکارتہ سے انقلاب کی خبر نشر کی۔ انتنگ نے کہا کہ اس نے ایک نام نہاد جرنیلوں کی کونسل کی جانب سے حکومت پر قبضہ کرنے کی کوشش کی پیش بندی کے طور پر انقلاب برپا کیا تھا۔ ساتھ ساتھ انتنگ کے زیر کمان وسطی جاوا کی افواج نے مواصلاتی مرکز اور قیصر مردیکا کا محاصرہ کر لیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ریڈیو سے ۴۵ افراد پر مشتمل ایک انقلابی کونسل کا اعلان کیا گیا۔ جس میں وزیر خارجہ سباندریو کا نام بھی شامل تھا۔ اس کونسل نے سکارنو کی کابینہ کو برخاست کر دیا اور خود حکومت کا اعلیٰ خود مختار ادارہ بن گئی۔ اس انقلابی کونسل کا سربراہ خود کرنل انتنگ تھا۔

انقلاب کی ناکامی

اس دوران دو اہم واقعات رونما ہوئے پہلا واقعہ جس نے کمیونسٹ انقلابی سازش میں صدر سوکارنو کو ملوث کر دیا وہ خود صدر کا حلیم کے ہوائی اڈہ پر جانا اور صبح نو بجے سے دن بھر وہاں قیام کرنا ہے۔ حلیم ہی پر کمیونسٹ پارٹی کا قائد ایدت اور انقلاب کا فوجی دماغ جنرل سپارجو بھی موجود تھے۔ عینی گواہوں کا کہنا ہے کہ جب سپارجو نے صدر سوکارنو کو انقلاب کی کامیابی کی خبر دی تو سوکارنو نے شاباش دیتے ہوئے سپارجو کی پیٹھ ٹھونکی لیکن جب صدر سوکارنو کو جنرل ناسوتیان کے بچ نکلنے کی خبر دی گئی تو ان کا چہرہ فق ہوگیا۔

دوسرا واقعہ خود جنرل ناسوتیان کا معجزانہ طور پر بچ جانا تھا۔ اپنے مکان کی دیوار سے کودنے کے بعد ناسوتیان کے دونوں پیروں کی ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں اور وہ روشنی کے ایک کھمبے کے نیچے گر رہے تھے۔ انہیں وہاں کوئی بھی باغی گولی کا نشانہ بنا سکتا تھا۔ لیکن بہت سوچے سمجھے منصوبوں پر بھی نہایت معمولی غفلت سے پانی پھر جاتا ہے۔ چنانچہ جب زخمی ناسوتیان عراقی سفارت خانے میں سے ہوتے ہوئے اپنے فوجی ہیڈ کوارٹر پہنچنے میں کامیاب ہوگئے تو کمیونسٹ سازش کے خلاف انڈونیشیا کی

فوج کا آزمودہ سلیوانگی ڈویژن حرکت میں آگیا۔

صبح کے ساڑھے نو بجے تک ناسوتیان کی وفادار فوجوں نے جن کی کمان جنرل سوہارتو کر رہے تھے۔ ریڈیو اسٹیشن اور اس کے بعد مواصلاتی مرکز پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح کرنل اُنٹنگ کی ایک دن کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ اُنٹنگ کے ساتھ جو باغی عناصر تھے۔ وہ فوج کی ۵ بٹالین پر مشتمل تھے۔ جن میں صدارتی باڈی گارڈ کی "چکرا بیراوا" رجمنٹ اور کمیونسٹ پارٹی کی نیم فوجی تنظیمیں "گروانی" (عورتوں کی تنظیم) اور "پیمودا رعیت" (نوجوانوں کی تنظیم) پیش پیش تھیں۔ کرنل اُنٹنگ ایک جلد باز اور کم عقل جوان افسر تھا۔ جس کے سپرد "چکرا بیراوا" کی کمان تھی اور جو صدر سوکارنو کا منظور نظر بھی تھا۔ بعد کی عدالتی تحقیقات سے پتہ چلا کہ سازش کا منصوبہ خود انڈونیشی کمیونسٹ پارٹی نے بنایا تھا اور اُنٹنگ کو صرف شروع کے مراحل میں سامنے رکھ کر اقتدار پر قبضہ کرنا مقصود تھا۔ انقلاب کے دن یہ بات بھی مشہور کر دی گئی تھی کہ آئیدت ایک انڈونیشی وفد کے ساتھ پیکنگ گیا ہوا ہے۔ لیکن دراصل آئیدت جکارتہ ہی میں رہا۔ اور انقلاب سے ایک دن قبل ایک تقریب میں لوگوں نے صدر سوکارنو کے ساتھ اسے بھی دیکھا تھا۔ انقلاب میں کمیونسٹ نوجوان تنظیم "پیمودا رعیت" کے نمایاں حصہ لینے سے بھی کمیونسٹ سازش کا پتہ چلتا ہے۔ انقلاب سے مہینوں قبل سے حلیم کے اڈہ پر "پیمودا رعیت" کے کارکنوں کو انڈونیشی فضائیہ کے چند افسروں کی نگرانی میں فوجی تربیت دی جا رہی تھی۔ اس سلسلہ میں یہ بات قابل غور ہے کہ انڈونیشی فضائیہ میں بشمول فضائیہ کے سربراہ ایئر مارشل عمر دھانی کمیونسٹ پارٹی کے ہمدردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ انڈونیشی فضائیہ نے کمیونسٹ رضاکاروں کو اسلحہ فراہم کرنے میں بھی بڑی فراخدلی کا ثبوت دیا تھا۔ بعد میں سوہارتو کی حامی فوجوں نے جب حلیم کے ہوائی اڈہ پر قبضہ کر لیا تو ان کے ہاتھ بعض ایسی دستاویزات آئیں، جن سے پتہ چلا کہ کمیونسٹ پارٹی نے انڈونیشی فضائیہ کے قلب پر قبضہ کر لیا تھا۔

سرخ سائے

سازشی انقلاب میں کمیونسٹوں کے ہاتھ ہونے کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی تھا کہ انڈونیشی کمیونسٹ پارٹی کے سرکاری ترجمان روزنامہ "ہاریان رعیت" نے کھل کر اُنٹنگ کے انقلاب کی حمایت کی اور اپنے ۲ اکتوبر کے اداریہ میں اس اخبار نے انقلاب کو خوش آمدید کہا اور لکھا کہ: "ہم انڈونیشی عوام ۳۰ ستمبر کے انقلاب کی پرزور حمایت کرتے ہیں اور وہ اس لئے کہ اس اقدام سے ہم نے انڈونیشی انقلاب کو بچا لیا ہے۔" بعد میں انڈونیشی حکومت نے اس اخبار کو بند کر دیا اور ساتھ ہی چند دنوں کے لئے سرکاری خبر رساں ایجنسی "انتارا" پر بھی قدغن لگا دی۔ واضح رہے کہ کمیونسٹوں نے اپنے عروج کے زمانہ میں ملک کی اس واحد ایجنسی پر عملاً قبضہ کر لیا تھا۔ اور اس کی خبریں بڑی حد تک کمیونسٹ نقطۂ نگاہ سے ترتیب دی جاتی تھیں۔ انتارا کی اشتراکیت نواز پالیسی پر نکتہ چینی کرتے ہوئے جکارتا کے انگریزی روزنامے "انڈونیشین ہیرالڈ" نے لکھا تھا کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر انتارا ایک دوسری غیر ملکی خبر رساں ایجنسی — کی ڈھنڈورچی بن کر رہ گئی تھی۔

کمیونسٹوں کے خلاف اس قدر واضح ثبوت اور ساتھ ہی ساتھ مقتول فوجی جنرلوں کی لاشوں کی ٹیلی ویژن پر نمائش نے پورے ملک میں کمیونسٹ پارٹی کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑا دی۔ شہر شہر اور قریہ قریہ عوامی جلسے ہوئے اور انڈونیشی عوام نے کمیونسٹ پارٹی

کے خلاف راست اقدام شروع کر دیا۔ کمیونسٹ پارٹی کے دفاتر نذر آتش کئے گئے اور جگہ جگہ کمیونسٹ پارٹی کے ہمدردوں اور اس کے مخالفوں کے درمیان مسلح تصادم شروع ہو گیا۔ اور مسلمان اور عیسائی جماعتوں نے کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگانے کا مطالبہ شروع کر دیا۔ ان جذبات کی ہم نوائی کرتے ہوئے جکارتا "ڈیلی میل" نے اپنی ۸ اکتوبر ۱۹۶۵ء کی اشاعت میں لکھا: "اب انڈونیشیا کے لاکھوں محب وطن عوام ۳۰ ستمبر کی تحریک کے داعیوں کے خلاف سخت اقدام کا مطالبہ کرتے ہیں۔ انڈونیشی عوام نے گسٹاپو کی غداری سے ایک بڑا عبرت ناک سبق لیا ہے۔ دراصل گسٹاپو والے فوج کے سربراہوں کو قتل کرنے کے بعد انڈونیشی عوام کو اپنی اطاعت میں سر جھکانے پر مجبور کرنا چاہتے تھے"۔ اس اخبار نے حکومت پر زور دیا کہ باغی عناصر کی مکمل سرکوبی کی جائے۔ کمیونسٹ پارٹی کے خلاف عوامی جذبات اس قدر مشتعل ہوئے کہ جلد ہی ملک کی ۲۰ جماعتوں نے متفقہ طور پر یہ مطالبہ کیا کہ پی۔ کے۔ آئی کو خلاف قانون قرار دیا جائے۔ سماترا کے ایک مسلمان لیڈر نے یہ بھی دھمکی دی کہ جب تک غداروں اور منافقوں کا خاتمہ نہیں کیا جاتا اور کمیونسٹ پارٹی پر پابندی نہیں لگائی جاتی اس وقت تک انڈونیشیا میں امن اور سلامتی کی تلاش فضول ہے۔ ان مطالبات کے نتیجہ میں ۱۸ اکتوبر ۱۹۶۵ء کو کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگانے کا اعلان کر دیا گیا لیکن اس اعلان کو عملی جامہ پہنانا اس وقت تک ناممکن رہا جب تک صدر سوکارنو فیصلہ کن مرد میدان بن کر اپنا کردار ادا کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔

سوکارنو کی دو عملی پالیسی

دراصل سازشی انقلاب کی ناکامی کے بعد بھی صدر سوکارنو مسلسل کمیونسٹ پارٹی کی حمایت کرتے رہے۔ اور ان کو یہ اس قدر بڑھی کہ ایک جلسے میں انہوں نے انڈونیشی انقلاب کے دوران کمیونسٹ پارٹی کے کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے کمیونسٹوں کو سب سے بڑا انقلابی قرار دیا۔ صدر سوکارنو کی جانب سے اس ردعمل نے پورے ملک میں ایک نظریاتی الجھن پیدا کر دی اور عوام کی انگلیاں خود صدر کی جانب اٹھنے لگیں۔ جکارتا اور پورے ملک میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں اور کمیونسٹ انقلاب کی پشت پر لوگوں نے صدر سوکارنو کا ہاتھ دیکھنا شروع کر دیا۔

صدر سوکارنو نے اپنی روایتی چابکدستی سے کام لیتے ہوئے سازشی انقلاب کو انڈونیشی افواج کا ایک "داخلی مسئلہ" قرار دیا اور عوام کے سامنے اس بات کی تلقین کرنی شروع کر دی کہ افواج کے سپریم کمانڈر ہونے کی حیثیت سے صرف صدر کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس اندرونی جھگڑے کا فیصلہ کرے اور عوام کو چاہئے کہ وہ اس سلسلہ میں خاموش رہیں۔ صدر سوکارنو نے یا تو سازشی انقلاب سے پیدا ہونے والی نازک صورت حال کی تشخیص کرنے میں غلطی کی یا وہ سارے معاملے کی اہمیت کم کر کے کمیونسٹ پارٹی کو عوامی عتاب سے بچانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں جب کشت و خون کا بازار بڑے پیمانے پر گرم ہوا جب بھی صدر سوکارنو یہی راگ الاپتے رہے کہ وہ جلد ہی ملک کے سامنے ایک "سیاسی حل" پیش کریں گے۔ اس دو عملی کے نتیجہ میں خود حکومت مفلوج ہو کر رہ گئی اور پولیس اور فوج ملک میں امن و امان برقرار رکھنے سے قاصر رہی۔ ظاہر ہے جب ملک کا صدر فوج کے ایک حصے پر قابو یافتہ ہو کر ایک سمت جانا چاہتا ہو اور فوج ہی کا ایک معتدبہ حصہ عوام کی خواہشات کے مطابق دوسری سمت سفر کرنا چاہتا ہو تو ملک کا کیا حال ہو گا یہ دو عملی پالیسی جس کے ذمہ دار بڑی حد تک خود صدر سوکارنو تھے۔ ملک کے لئے نہایت مہلک ثابت ہوئی اور اس غلط پالیسی کے نتیجہ میں جو بے یقینی اور انتشار بلکہ فراق کی کیفیت پیدا ہوئی۔ اس نے پورے انڈونیشیا کو خون میں نہلا کر
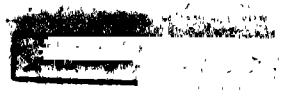
ملک کی چولیں ہلا دیں۔ دراصل صدر سوکارنو کا "سیاسی حل" انڈونیشیا کے لئے بہت مہنگا پڑا۔

چنانچہ جب کافی وقت گذرنے کے بعد ۱۱ فروری ۱۹۶۶ء کو صدر سوکارنو نے اپنی کابینہ میں ردوبدل کر کے جنرل ناسوتیان کو برطرف اور کمیونسٹوں کو وزیر بنایا تو انڈونیشی عوام نے نہایت مایوسی سے اس "سیاسی حل" کا خیر مقدم کیا۔ عوام نے محسوس کیا کہ "سیاسی حل" کے بہانے پی۔ کے۔ آئی کو از سر نو آباد کاری اور اس کو دوبارہ برسر اقتدار لانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ صدر سوکارنو کے اس اچانک اقدام کے نتیجہ میں ملک میں اور زیادہ بے چینی بڑھی اور اس عرصہ میں جکارتا سے باہر اور دور دراز کے جزیروں میں لاقانونیت کا دور دورہ رہا۔ جب پانی سر سے اونچا ہو گیا تو جکارتا میں طالب علموں کی تنظیم "کامی" (کالجوں کے طلباء پر مشتمل) اور "کاپی" (ہائی سکول تک کے بچوں پر مشتمل) کے وہ ہنگامہ خیز مظاہرے شروع ہوئے جن کی مثال افریقہ اور ایشیاء کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ طالب علموں نے نئی صدارتی کابینہ، کمیونسٹوں اور سوباندریو اور خیر الصالح جیسے طالع آزماؤں کی دوبارہ شمولیت کے خلاف پر زور آواز اٹھائی۔ طالب علموں نے مظاہروں کے دوران لاکھوں نفوس پر مشتمل جلوس نکالے اور جکارتا کے عوام نے کھل کر نوخیز نسل کی حمایت کی۔ اخباری نمائندوں کا بیان ہے کہ اگر ایک طرف فوج نے بچوں کے لئے سواری کا بندوبست کیا تو دوسری طرف عوام نے جگہ جگہ جیپیں چلائیں اور بچوں میں پھل اور مٹھائیاں تقسیم کیں۔ انڈونیشیا کی نئی نسل جسے انڈونیشی اخباروں نے چھیاسٹھ (۱۹۶۶) کی نئی نسل لکھنا شروع کیا، وہ کام انجام کر دکھایا جو فوج کی راست مداخلت سے نہ ہو پاتا۔ نئی نسل کے انقلاب آفریں نعروں سے قصر مرڈیکا کی دیواریں ہل گئیں اور جب ایک طالب علم لیڈر عارف حکیم گولی لگنے سے شہید ہوا تو مظاہرین نے عدیم المثال جرأت کے ساتھ صدر کے محافظ دستے کا مقابلہ کیا۔

عوام کی فتح

یہ مظاہرے صدر سوکارنو کے لئے سوہان روح بن گئے۔ دراصل فوج کا منشا بھی یہی تھا کہ نئی نسل کے ہاتھوں وہ فساد بن جائے۔ جو کسی حقیقی تبدیلی کے لئے ضروری تھی۔ اس طریقہ کار سے خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ چنانچہ قصر بوگر میں صدر سوکارنو نے گیارہ مارچ ۱۹۶۶ء کو صدارتی اختیارات، جنرل سوہارتو کو منتقل کر دیئے۔ یہ طالب علم انجمنوں کی بہت بڑی فتح تھی۔ اور ساتھ ہی یہ انڈونیشی عوام کی بھی فتح تھی کہ اس اقدام کے ذریعہ انڈونیشیا میں خطرناک، ردعمل کو ختم کرنے کے لئے راستہ ہموار ہو گیا۔

چنانچہ جنرل ناسوتیان کی زیر صدارت انڈونیشی کانگریس (ملک کا سب سے اعلیٰ مقتدر ادارہ) کے وہ تاریخ ساز اجلاس شروع ہوئے۔ جس کے نتیجہ میں ناکام کمیونسٹ انقلاب سے پیدا ہونے والی صورت حال کا دستوری اور قانونی حل نکالنے میں مدد ملی۔ جولائی ۱۹۶۶ء میں انڈونیشی کانگریس نے حسب ذیل فیصلے کئے۔

صدر سوکارنو کی "تاحیات صدارت" ختم کی جائے۔ لیکن ان کا پسندیدہ لقب ——————— "انڈونیشی انقلاب کا عظیم قائد" برقرار رکھا جائے۔

کمیونسٹوں کے اخراج کے بعد جو نئی کابینہ، اگست ۱۹۶۶ء سے قبل تشکیل دی جائے اس میں وزراء کا انتخاب صدر سوکارنو اور جنرل سوہارتو دونوں کے متفقہ فیصلہ کے ذریعہ ہو۔

ملک میں جولائی ۱۹۶۸ء تک عام انتخابات منعقد کرائے جائیں۔

فی الحال نائب صدر کی تقرری آئندہ کانگریس کے منتخب ہونے تک ملتوی کی جائے۔ واضح ہو کہ ۱۹۴۵ء کے بانچ الوقت دستور کے مطابق انڈونیشیا میں ایک نائب صدر ہونا چاہیے۔

انڈونیشی کیمونسٹ پارٹی (P.K.I) اور اس کی ذیلی تنظیمات پر پابندی لگائی جائے اور ملک میں مارکسزم اور لینن ازم کی تبلیغ و اشاعت پر بھی پابندی لگائی جائے۔

ایسی خاص کمیٹی مقرر کی جائے جو صدر سوکارنو کی تعلیمات کا تجزیہ اور تنقیح کر کے ان کو قومی نظریہ "پنچا سیلا" کے مطابق ڈھالے

پنچا سیلا خود صدر سوکارنو کا وضع کردہ وہ نظریہ ہے جس کے پانچ ستون ہیں (۱) خدا پر ایمان (۲) جمہوریت (۳) قومیت (۴) بین الاقوامیت اور (۵) اجتماعی عدل۔ ان اصولوں کو صدر سوکارنو نے انڈونیشیا پر جاپانی اقتدار کے زمانہ میں وضع کیا تھا۔ دراصل ان اصولوں کی جڑیں بدھ مذہب کی تعلیمات میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن سوکارنو کا وضع کردہ "پنچا سیلا" بعد میں نہرو کے وضع کردہ "پنچ شیل" سے لفظاً و معناً قطعاً مختلف ہے۔

تمام سرکاری مدارس میں پرائمری سے یونیورسٹی کے مرحلہ تک مذہبی تعلیم لازمی قرار دی جائے۔

صدر مملکت اور نوکر شاہی کو مخاطب کرنے کے لئے جو خوشامدانہ القابات استعمال کئے جاتے رہے ہیں۔ انہیں ترک کیا جائے۔

ان فیصلوں کے سامنے صدر سوکارنو کا بظاہر سر تسلیم خم کرا دینا ایک ایسا کارنامہ تھا جس پر بجا طور پر انڈونیشی نوجوان نسل (خاص طور پر کامی اور کاپی کی تنظیمیں) اور مسلح افواج بجا طور پر فخر کر سکتی ہیں۔

زیر زمین کیمونسٹ

انڈونیشی کانگریس کے اس فیصلہ کے باوجود صدر سوکارنو کی ذات بچے کھچے کیمونسٹ عناصر کے لئے سہارا بنی رہی۔ خود صدر نے بھی اس دوران ماضی کی غلطیوں سے استفادہ نہ کرتے ہوئے زیر زمین کیمونسٹ پارٹی کے رہنماؤں سے ربط ضبط باقی رکھا۔ عدالتی تحقیقات کے دوران یہ بات کھل کر سامنے آئی کہ صدر سوکارنو اس دوران کیمونسٹ لیڈر یوتو وغیرہ سے خط و کتابت کر رہے تھے

یہ صورت حال نئی حکومت کے لئے پیچ در پیچ مسائل پیدا کر رہی تھی۔ صدر سوکارنو کیمونسٹ پارٹی کے مردہ بچے کو اپنے سینے سے لگائے رہے اور ملک میں لاقانونیت بڑھتی جا رہی تھی۔ دراصل گذشتہ کئی سالوں میں صدر سوکارنو اس تناور مگر بوڑھے درخت کی طرح ہو گئے تھے۔ جس کی ٹہنیاں جھڑ چکی ہوں۔ اس درخت پر کیمونسٹ پارٹی کی آکاس بیل چاروں طرف سے چھا چکی تھی۔ اس لئے آکاس بیل کے وجود کو ختم کرنے کے لئے یہ ناگزیر ہو گیا تھا کہ خود درخت کی کانٹ چھانٹ کی جائے۔ سوہارتو اور ناسوتیان نے بادل ناخواستہ صدر سوکارنو پر آہستہ آہستہ جو عمل جراحی کیا وہ اس مجبوری کے تحت تھا۔ چنانچہ ۱۲ مارچ ۱۹۶۷ء کو انڈونیشی کانگریس نے اپنی آخری اور فیصلہ کن قرار داد کے ذریعہ صدر سوکارنو کو معزول کر کے جنرل سوہارتو کو "قائم مقام" صدر نامزد کیا۔ ساتھ ہی صدر سوکارنو کو ۱۹۶۸ء تک سیاست میں حصہ لینے سے منع کر دیا گیا اور صدر سوکارنو کا بلند آہنگ "انڈونیشی انقلاب کا عظیم قائد" کا لقب بھی واپس لے لیا گیا۔

جنرل سوہارتو کی رسم حلف برداری کے وقت کانگریس کے صدر جنرل ناسوتیان تھے اپنی تقریر میں کانگریس کے فیصلوں کی اہمیت بتاتے ہوئے کہا کہ اس کانگریس کا یہ کارنامہ ہے کہ اسی نے (۱) دستوری ذرائع سے صدر سوکارنو کو معزول کیا اور (۲) ۱۹۶۵ء کے ناکام کمیونسٹ انقلاب میں صدر سوکارنو کی شمولیت کا فیصلہ کیا اور ان پر مقدمہ قائم کیا۔

آج یہ ہے کہ صدر سوکارنو اپنے گھر کے محل میں نظر بند ہیں۔ انڈونیشیا کا سیاسی مطلع صاف ہوتا نظر نہیں آتا۔ سوکارنو کی قائم کردہ قومی پارٹی (P.N.I) سے کمیونسٹوں نے اپنے زیر اثر پہلے ہی کر رکھا تھا۔ کمیونسٹ پارٹی پر پابندی ۱۹۶۶ء کے بعد پی۔ این۔ آئی کے بائیں بازو کے عناصر نے مختلف طریقوں سے صدر کو ان کے کھوئے ہوئے عہدے پر واپس لانے کے بہانے نئی حکومت کو پریشان کرنا شروع کر دیا ہے۔ کہیں طلبہ کو بھڑکایا جاتا ہے کہیں طبقہ کو ابھارا جاتا ہے اور کہیں مقامی عصبیتوں کے نام پر جاہل عوام کو برانگیختہ کیا جاتا ہے۔ ان ریشہ دوانیوں کے پیچھے نظریہ بالکل صاف نظر آتی ہے کہ پی کے۔ آئی کے بعد پی۔ این۔ آئی کے انتہا پسند گروہ نے ایک پوشیدہ کمیونسٹ پارٹی کا روپ دھار لیا ہے۔ باخبر انڈونیشی ذرائع کا کہنا ہے کہ جس طرح حکومت نے ملک دشمن کمیونسٹ پارٹی کے خلاف قدم اٹھایا ہے۔ اسی طرح پی۔ این۔ آئی کی سرکوبی بھی لازمی ہو گئی ہے۔

دراصل مذہبی جماعتوں کے بعد ملک میں یہی دو بڑی سیکولر پارٹیاں باقی رہ گئی تھیں۔ پی۔ این۔ آئی کے بانی خود صدر سوکارنو تھے۔ لیکن گزشتہ ۵۔ ۶ سال یہ پارٹی صدر کے التفات سے محروم رہی کیونکہ اس کے مقابلہ میں صدر کو کمیونسٹ پارٹی کی "انقلابیت" زیادہ پسند تھی۔

انڈونیشی کمیونسٹ پارٹی کا آغاز

انڈونیشیا کی کمیونسٹ پارٹی کا آغاز بھی عجیب و غریب رہا ہے۔ ۱۹۲۰ء میں چند ولندیزی دانشوروں نے اسے قائم کیا۔ اس طرح انڈونیشی کمیونسٹ پارٹی اور انڈین نیشنل کانگریس میں ایک حیرت انگیز مشابہت پائی جاتی ہے ۱۸۸۵ء میں بھارتی کانگریس کو ایک انگریز مسٹر ہیوم نے قائم کیا تھا۔ سامراجیوں کی قائم کردہ یہ دونوں پارٹیاں اپنی مسلم دشمنی میں بھی بڑی حد تک یکساں رہی ہیں۔

گو کہ ڈچ سامراجی دور میں اس پارٹی کے ممبروں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ نہ ہو سکا۔ پھر بھی جلد ہی اس پارٹی نے ۱۹۲۱ء میں کمیونسٹ انٹرنیشنل (کومنٹرن) سے اپنا الحاق کر لیا۔ بعد میں سامراجی دباؤ کے تحت اس پارٹی کے بہت سے انڈونیشی سربراہ ملک سے باہر پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ اس پارٹی کی باقی ماندہ لیڈرشپ نے ۱۹۲۶ء میں غیر ملکی حکومت کے خلاف ایک ناکام بغاوت کرنے کی کوشش کی۔

اس ناکام بغاوت کے بعد دوسری جنگ عظیم تک انڈونیشی کمیونسٹ پارٹی ملکی سیاست میں کوئی نمایاں حصہ نہ لے سکی اس کا خاص سبب یہ تھا کہ ولندیزیوں کے اقتدار کے خلاف جدوجہد میں انڈونیشی مسلمان کمیونزم کے برخلاف اسلام سے زیادہ قریب رہے اور اسلامی جذبہ جہاد نے ملکی آزادی کی منزل سے ہمکنار ہونے میں انڈونیشی قوم کی سب سے زیادہ مدد کی۔ چنانچہ انڈونیشی تحریک آزادی میں نمایاں حصہ نہ لینے کا داغ کمیونسٹوں کی پیشانی پر ہمیشہ لگا رہا اور کمیونسٹ قیادت اس داغ کو دھونے کی بارہا سعی ناکام کر چکی ہے۔

جنگ عظیم دوئم کے خاتمہ پر بہت سے جلا وطن کمیونسٹ لیڈر انڈونیشیا واپس آگئے۔ ان لیڈروں میں جن میں تان ملاکا بہت نمایاں تھا۔ اپنا زیادہ وقت روس میں گزارا تھا۔ جہاں انہیں کمیونسٹ نظریات اور انقلابی طریق کار کے سلسلہ میں خاص تربیت دی گئی تھی، لیکن انڈونیشیا واپس آنے کے بعد۔ ان میں سے کئی لیڈروں نے بائیں بازو کی دوسری جماعتوں میں شامل ہونا پسند کیا۔ تو تان ملاکا کی بھی ماسکو سے زیادہ دن تک نہ نبھ سکی۔

کمیونسٹوں کی دوسری پارٹیوں میں نفوذ کی یہ تکنیک زیادہ کامیاب نہ ہو سکی۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ عبرتناک مثال تو تان ملاکا کی ہے۔ اس موقع پرست لیڈر نے انڈونیشی انقلاب کے چلانے والے لیڈروں سوکارنو اور محمد حتیٰ سے یارانہ گانٹھا اور دوران انقلاب ان کے بہت قریب آگیا۔ تان ملاکا نے سوکارنو اور حتیٰ سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ لوگ اس کو اپنا سیاسی جانشین بنالیں اور اس قسم کا وصیت نامہ لکھ دیں کہ اگر خدا نخواستہ جنگ آزادی میں سوکارنو اور حتیٰ کو کام آجائیں تو تان ملاکا ان کی جگہ قیادت سنبھال لے۔ جب سوکارنو اور حتیٰ نے اس قسم کا وصیت نامہ لکھنے سے انکار کیا تو تان ملاکا نے ایک ایسے علاقہ میں جا کر جہاں اس کا اثر تھا یہ اعلان کر دیا کہ سوکارنو اور حتیٰ اگر گرفتار کر لیئے گئے اور اپنی قیادت منوانے کے لئے اس نے ایک جعلی وصیت نامہ بھی لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے پیش کیا۔ لیکن جلد ہی اس سازش کا علم لوگوں کو ہو گیا۔

لیکن اس کوشش میں ناکامی کے بعد بھی تان ملاکا نے اپنی ہار نہ مانی اور پوری انڈونیشی تحریک آزادی پر قبضہ کرنے کی خاطر اس نے اپنے تاش کا دوسرا پتہ پھینکا۔ تان ملاکا نے ایک عظیم پرولتاری جمہوریہ کا نظریہ انڈونیشی عوام کے سامنے پیش کیا۔ اس عظیم پرولتاری جمہوریہ میں بقول تان ملاکا انڈونیشیا، ملایا، برما، تھائی لینڈ، فلپائنز اور شمالی آسٹریلیا شامل ہونگے۔ اس وقت کچھ قوم پرست حلقے بھی ایک عظیم تر انڈونیشیا کا خواب انہیں خطوط پر دیکھ رہے تھے۔ چنانچہ تان ملاکا نے انہیں "عناصر" کو خوش کر کے اپنی جگہ آپ پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن مارچ ۱۹۴۸ء تک تان ملاکا کی سازشی سرگرمیاں اس قدر بڑھ گئیں کہ اس نے دوبارہ آزاد انڈونیشی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی۔ اس کے نتیجے میں سوکارنو اور حتیٰ کی حکومت نے تان ملاکا کو گرفتار کر لیا اور کمیونسٹوں کا یہ قائد اول دو سال تک جیل سے باہر نہ آسکا۔

ماسکو کی آواز

جب ۱۹۴۸ء میں ولندیزیوں نے آزاد انڈونیشی حکومت کے خلاف "اہنی شکنجے کے" "پولیس ایکشن" کیا تو تمام آزاد دنیا کے ساتھ روس نے بھی انڈونیشی عوام کے حق میں آواز بلند کی۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ روس نے کچھ زیادہ ڈرامائی انداز میں کمیونسٹوں کو متاثر کرنے کی بار بار کوشش کی۔ چنانچہ انڈونیشیا میں بائیں بازو کے عناصر کا اعتماد بحال کرنے میں روس نے اس طرح خاطر خواہ کارنامہ انجام دیا۔ سوکارنو، حتیٰ اور شہریار ایسے لیڈروں سے روس کی یہ چال پوشیدہ نہ تھی۔ لیکن بہت سے ناپختہ کار انڈونیشی لیڈر روس کی اس فلاسفی پیم سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

اسی دوران میں دوسرے کمیونسٹ لیڈر موسو کا عروج ہوا۔ موسو نے ۲۲ سال جلاوطنی میں گزارے تھے۔ اور یہ بھی ماسکو کا خاص تربیت یافتہ آدمی تھا موسو نے آتے ہی شریف الدین ایسے چھپے ہوئے کمیونسٹوں کی مدد سے انقلاب کی تیاری شروع کر دی۔ شروع
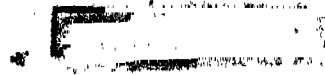
میں موسو کا خیال تھا کہ بغیر کشت و خون کے اقتدار پر اس طرح قبضہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ جس طرح گاٹ والڈ نے چیکوسلواکیہ میں کیا تھا۔ لیکن موسو کے کچھ زیادہ جوشیلے ساتھیوں نے قبل از وقت گڑبڑ بپا کی شروع کر دی اور حکومت نے انہیں طاقت کے ذریعہ دبا دیا۔ حکومت کے اس بر وقت اقدام اور چوکس انتظامات سے گھبرا کر موسو اور دیگر لیڈروں نے وسطی جاوا کے شہر مادیوں میں ایک کمیونسٹ کانفرنس کی۔ واضح رہے کہ انڈونیشی تاریخ کے اس ہیجانی دور میں جب کہ جنگ آزادی لڑی جا رہی تھی، مادیوں بائیں بازو کے عناصر کا مرکز تھا۔ کانفرنس میں کمیونسٹ لیڈروں نے اسی وقت مسلح انقلاب کے حق میں فیصلہ کیا۔ اس فیصلہ کے پیچھے واضح محرک یہی ہو سکتا تھا کہ اگرچہ سکارنو۔ حتا حکومت خبردار تھی۔ لیکن کمیونسٹوں کے اندازہ کے مطابق یہ حکومت بیک وقت دو محاذوں پر جنگ کرنے سے قاصر تھی۔ ایک طرف ولندیزیوں کا حملہ اور دوسری طرف پشت پر کمیونسٹوں کا حملہ واقعی نو آزاد مملکت کے لئے ایک کڑی آزمائش کا سامان فراہم کر سکتا تھا۔ چنانچہ کمیونسٹوں نے اپنے منصوبہ کو عملی جامہ پہنایا اور ۱۸ ستمبر ۱۹۴۸ء کو موسو نے انقلاب کا صور پھونک دیا۔ جس کے نتیجہ میں سکارنو حکومت کے خلاف کمیونسٹوں نے اپنے مضبوط گڑھ، مادیون میں بغاوت کا اعلان کر دیا۔ لیکن یہ اعلان بغاوت کمیونسٹوں کے لئے بہت مہنگا پڑا۔ دراصل موسو نے بغاوت کے لئے وقت کے تعین میں فاش غلطی کی تھی اور کمیونسٹ انقلاب کے لئے زمین ہموار کئے بغیر ایک ایسا قدم اٹھا لیا۔ جس کا نتیجہ شکست کے سوا اور کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ پھر بھی بغاوت کے بعد کمیونسٹوں نے اپنے زیر اقتدار علاقے میں چند دنوں کے لئے کافی کشت و خون کیا اور دہشت انگیزی سے عوام کو ہراساں کیا۔

کمیونسٹ بغاوت کے دوران انڈونیشی حکومت کے حریف ڈچ سامراج نے مادیون کے خلاف سکارنو۔ حتا کو مدد کی پیش کش کی جس کو ان سربراہوں نے ٹھکرا دیا اور کمیونسٹوں کی سرکوبی کی مہم میں صرف اپنے قوت بازو پر بھروسہ کیا۔ بغاوت کے فرو کرنے میں جنرل عبدالحارث ناسوتیان کی زیر کمان انڈونیشی افواج کے مشہور "سلی وانگی" ڈویژن نے خاص کارنامہ انجام دیا اور بغاوت شروع ہونے کے صرف ایک ہفتہ کے اندر موسو اور اس کے حامیوں کا قلع قمع کر دیا گیا۔ خود موسو مادیان کی جنگ میں معہ اپنے دوسرے ساتھیوں مثلاً شریف الدین وغیرہ کے مارا گیا۔

مادیون کی بغاوت نے کمیونسٹ پارٹی کے چہرہ سے نقاب ہٹا دی اور انڈونیشی عوام نے کمیونسٹوں کے صحیح خدوخال کو پہچان لیا۔ لیکن چونکہ مادیون میں پرانی نسل کے تمام کمیونسٹ لیڈر ختم ہو گئے تھے۔ اس لئے جب نئی قیادت نے سر ابھارا تو شخصیتوں کے الٹ پھیر نے سادہ لوح عوام کو ایک بار پھر دھوکہ میں ڈال دیا۔ ظاہر ہے کہ مادیون کے بعد موسو کے لئے انڈونیشی سیاست میں کوئی جگہ نہیں رہ گئی تھی۔ لیکن موسو کے بعد کمیونسٹوں کی ایک نئی قیادت ابھری جو زیادہ تر نوجوانوں پر مشتمل تھی اس نئی قیادت کی باگ ڈور ساتھرا نشا، آیدت اور لقمان کے ہاتھوں میں تھی۔

نئی زندگی

۱۹۵۰ء کے آغاز میں انڈونیشی کمیونسٹوں نے اپنی بچی کھچی قوت کو مجتمع کر کے دوبارہ سر اٹھانا شروع کیا۔ اس دوران کمیونسٹوں نے بائیں بازو کی دوسری جماعتوں کے اشتراک سے مزدوروں میں بے چینی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انڈونیشی مبصروں کا خیال ہے کہ اس سلسلہ میں کمیونسٹوں کا مقصد یہ تھا کہ انڈونیشی حکومت کو پریشان کیا جائے اور ملک کی اقتصادیات

کو مستحکم بنیادوں پر استوار نہ ہونے دیا جائے۔

کمیونسٹ پارٹی کی اس پالیسی کے نتیجہ میں اوائل ۱۹۵۰ء میں غیر ملکی زراعتی فارموں اور صنعتی اداروں کے محنت کشوں نے ایک بڑی ہڑتال کی۔ اس سیاسی ہڑتال بنگ میں عالمی اشتراکی تحریک کے قائدین نے جو غیر معمولی دلچسپی لی اس کا اندازہ لاکومنفارم جرنل" (۵ جنوری ۱۹۵۱ء کے شمارے) میں شائع شدہ ایک مضمون سے کیا جا سکتا ہے۔ مضمون نگار نے لکھا کہ اب انڈونیشیا دوبارہ ایک "غلام ملک" نہیں بن سکتا کیونکہ انڈونیشیا کی "جمہوری جماعتیں" (بائیں بازو کے عناصر) اپنی تنظیم کو کر کے سامراج اور اس اقتصادی شہ رگ پر ضرب کاری لگانے جا رہے ہیں۔ ان تمام ہمت افزائیوں کے بعد کمیونسٹ شورش پسندی اس قدر بڑھی کہ وزیر اعظم سوکیمان نے سرکاری طور پر ان کا نوٹس لیا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ انڈونیشیا میں غیر ملکی اشاروں پر ناچنے والے ایک طبقہ کی زیر زمین کارروائیوں سے سخت خطرہ پیدا ہو چکا ہے۔ انڈونیشی حکومت کے بیان کے مطابق یہ زیر زمین تحریک حکومت کا تختہ الٹ کر صدر، نائب صدر اور دوسرے کلیدی افسروں کو قتل کرنا چاہتی تھی۔ حکومت کے اس اعلان کے بعد کمیونسٹ پوری طرح سے زیر زمین چلے گئے۔ لیکن بعد میں تشکیل پانے والی وولوپو وزارت کے زمانہ میں کمیونسٹ تحریک پھر انڈونیشی سیاست کی سطح پر نمودار ہوئی۔

اکتوبر ۱۹۵۲ء میں کمیونسٹوں کو انڈونیشی افواج کے معاملات میں دخل اندازی کا بہترین موقع ہاتھ آ گیا۔ انڈونیشی افواج کے سربراہ ایک ولندیزی عسکری مشن کے ذریعہ ملک میں باقاعدہ، تربیت یافتہ فوج تیار کرنا چاہتے تھے۔ لیکن خود صدر سوکارنو ایک "عوامی فوج" کے حق میں تھے۔ جو کہ زیادہ تر تحریک آزادی کے غیر تربیت یافتہ مجاہدوں پر مشتمل ہو۔ اس نادر موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کمیونسٹوں نے "عوامی فوج" کے حق میں اپنا سارا زور استعمال کیا اور اس طرح صدر سوکارنو کی آواز میں آواز ملا کر اپنا الو سیدھا کرنے کی کوشش کی۔

دراصل کمیونسٹوں کا خیال تھا۔ اور یہ بالکل صحیح تھا۔ کہ ایک بے قاعدہ "عوامی فوج" میں نفوذ کرنے کا زیادہ موقع مل سکتا ہے۔ اس چپقلش کے نتیجہ میں فوج کے چیف آف سٹاف ناسوتیان اور وزیر دفاع سلطان ہمینگ کو بوونو کو مستعفی ہونا پڑا۔ بعض حلقوں کا خیال ہے کہ صدر سوکارنو خود ان حضرات سے پیچھا چھڑانا چاہتے تھے۔ بہرصورت سلطان کی جگہ ایک ایسے وزیر دفاع کا تقرر ہوا۔ جس کی اشتراکی مقاصد سے ہمدردیاں کوئی ڈھکا چھپا راز نہ تھیں۔ بعد میں جب نئے وزیر دفاع، ایواکو سوما سومانتری نے اپنے تین ساتھیوں کو فوج کے کلیدی عہدوں پر مقرر کیا تو انڈونیشی افواج میں بے چینی پھیلی اور خود صدر سوکارنو بھی فوج میں اشتراکی اثرات کے بڑھنے سے کچھ خائف ہوئے۔ ان حالات میں انڈونیشیا کی مسلمان جماعتوں نے بھی حالات کا جائزہ لیا اور حکومت میں بڑھتے ہوئے اشتراکی اثرات کو زائل کرنے کی تجاویز پر غور و خوض کرنا شروع کیا۔

سرخ ہتھکنڈے

۱۹۵۵ء کے اوائل میں حکومت میں شریک نیشنلسٹ پارٹی نے کمیونسٹوں کو رام کرنے کی خاطر انہیں کھلی چھٹی دے دی تھی کہ وہ عوام میں اپنے اثرات جس قدر چاہیں بڑھائیں۔ اس دوران میں کمیونسٹوں نے علی ساسترو امیجویو کی نیشنلسٹ پارٹی

کے ذریعے قائم شدہ حکومت کی کھل کر حمایت کی اور بعد میں بننے والی ماشومی وزارت اور اس کے وزیر اعظم برہان الدین ہراپ کی پر زور مخالفت کی۔ ساتھ ہی ساتھ کومنفارم جرنل" اور ماسکو، پیکنگ اور ہنوئی کے ریڈیو اسٹیشنوں سے ماشومی حکومت کے خلاف تیز و تند پروپیگنڈا نشر کیا جانے لگا۔

برہان الدین ہراپ اور ماشومی پارٹی کے خلاف کمیونسٹوں کا غم و غصہ بے جا نہ تھا کیونکہ ماشومی پارٹی اپنی پیش رو حکومتوں کی اشتراکیت نواز پالیسی کو یکسر بدل دینا چاہتی تھی۔ کمیونسٹوں کو ماشومی حکومت سے یہ بھی خطرہ تھا کہ مسلمان قیادت انہیں بہت جلد بے نقاب کرنے کی پوزیشن میں تھی۔ در اصل مادیوں کی بغاوت کے بعد کمیونسٹوں نے اپنے ہتھکنڈے بدل دیئے تھے اور مسلح بغاوت کے بجائے " جمہوری طریقوں" سے اپنی مقصد برآری کے لئے کوششیں شروع کر دی تھیں[1] اس سلسلہ میں بدنام اشتراکی عناصر کو ایک جائز اور بے ضرر جماعت کی حیثیت سے متعارف کرانے میں بڑے پاپڑ بیلنے پڑ رہے تھے۔ انہوں نے اپنی ماضی کی غداریوں کو چھپانے کے لئے کبھی تو علی شاسترو میجویو کی پارٹی کا دامن پکڑا اور کبھی صدر سوکارنو کی انانیت کی پرستش کی۔ لیکن ماشومی پارٹی ان کی بنیاد و جواز (legitimacy) ہی کو ماننے سے انکار کرتی تھی۔ اس لئے انڈونیشیا میں ماشومی پارٹی کا اقتدار کمیونسٹوں کے لئے سوہان روح بنا رہا اور اس اقتدار کو ختم کرنے میں انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔

اکتوبر ۱۹۵۵ء میں جو عام انتخابات ہوئے ان میں کمیونسٹ پارٹی کو توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی۔ تقریباً تین کروڑ ووٹوں میں پانچواں حصہ کمیونسٹوں کو ملا۔ ان انتخابات میں صدر سوکارنو کی نیشنلسٹ پارٹی کو ۲۲ر۳ فی صد، ماشومی پارٹی کو ۲۰ر۹ فی صد نہضۃ العلماء کو ۱۸ر۴ فی صد، کمیونسٹ پارٹی کو ۱۶ر۴ فی صد اور دوسری جماعتوں کو مجموعی ۲۲ فی صد ووٹ ملے۔ ووٹوں کے

---

[1] ۱۹۲۶ء کی ناکام بغاوت کے بعد انڈونیشی کمیونسٹ پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کے پولٹ بیورو کی جو "خود تنقیدی رپورٹ" شائع ہوئی ہے۔ اس میں کمیونسٹوں کی ناکامی کا سبب یہ بتلایا گیا ہے کہ انہوں نے ماؤ کی جنگجویانہ پالیسی ترک کر کے روسی ترمیم پسندوں کے پر امن ذرائع اختیار کر لئے تھے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اشتراکی قیادت نے ریاست کے بارے میں مارکس اور لینن کے نظریات کو پس پشت ڈال کر نام نہاد پر امن پارلیمانی ذرائع اختیار کر لئے تھے۔ رپورٹ میں جس طرز طریق کار کی حمایت کی گئی ہے، وہ یہ ہے۔

۱۔ دیہات میں گوریلا جنگ کا آغاز۔

۲۔ شہروں میں مزدوروں کی متشددانہ تحریکیں۔

۳۔ دشمن کی فوجوں کو کمزور کرنے کا کام۔

اس دستاویز میں کمیونسٹوں کو یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ ماضی سے سبق سیکھیں اور پر امن انقلاب کے نظریے کو ترک کر کے "مسلح انقلاب" لانے کی کوشش کریں اور دیہات کو مضبوط اور مستحکم فوجی چھاؤنیوں میں تبدیل کر دیں۔

***Peking Review*, Peking, July 14, 1967.**

لحاظ سے جکارتا شہر میں کمیونسٹ چوتھی بڑی پارٹی کی حیثیت سے ابھر آئے۔

نیا موڑ

انتخابات کے بعد صدر سوکارنو نے ایسی قومی حکومت کی تشکیل پر زور دیا جس میں قوم پرست، نہضۃ العلماء ماشومی اور کمیونسٹ پارٹیوں کے نمائندے شامل ہوں۔ دراصل کمیونسٹوں کی غیر معمولی کامیابی سے خود صدر سوکارنو بھی مرعوب تھے اور اسی مرعوبیت کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے قوم پرست، مذہبی اور اشتراکی عناصر کے مستقل تعاون کے نظریہ کو ایک جامد فارمولے کی شکل میں ڈھالنا شروع کر دیا سوکارنو نے ازراہ تفنن کبھی کہا تھا کہ تین ٹانگوں کا گھوڑا کہاں پایا جاتا ہے؟ آخرکار خود انہوں نے تین ٹانگوں کے گھوڑے پر سواری کرنے کی کوشش کی اور اس گھوڑے کا نام "ناساکوم" (NASAKOM) رکھا۔

لفظ "ناساکوم" میں ناس سے نیشنلسٹ، حرف "ا" سے "اگاما" یعنی مذہب اور "کوم" سے کمیونسٹ مراد ہیں۔ سوکارنو کے اس مضحکہ خیز اور عجیب وغریب نظریہ کو انڈونیشی قوم نے کبھی بھی دل سے قبول نہیں کیا۔ ذمہ دار ماشومی لیڈروں نے یہ کہہ کر اس نظریہ کا مذاق اڑایا کہ یہ آگ اور پانی کو ملانے کی سعی لاحاصل ہے۔ بہرصورت سوکارنو کا یہ نظریہ کمیونسٹوں کے لئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا۔ اس نے نہ صرف کمیونسٹوں کو ایک جائز پارٹی کی حیثیت دے دی بلکہ انہیں قومی زندگی اور حکومت کا جزو لاینفک قرار دیدیا۔

کمیونسٹوں کو دوسرا بڑا فائدہ اس وقت پہنچا جب سوکارنو نے واضح طور پر آمریت کی راہ اختیار کی۔ "ہدایت یاب جمہوریت" (Guided Democracy) دراصل آمریت ہی کا دوسرا نام تھا۔ چونکہ صدر سوکارنو نے جمہوری قدروں کو پامال کر کے ملک کے جمہوریت پسند طبقے کی سخت ناراضی مول لی تھی۔ اس لئے لازمی طور پر ایسے آڑے وقت میں اشتراکیوں اور دوسرے موقع پرستوں کی حمایت صدر سوکارنو کے لئے زندگی اور موت کا سوال بن گئی تھی۔ انڈونیشی عوام کے جمہوری جذبات کو نظرانداز کر کے کمیونسٹ پارٹی نے جس طرح صدر سوکارنو کے آمرانہ نظام کی حمایت کی وہ کمیونسٹ اخلاقیات کے معیار پر پوری اترتی ہو تو دوسری بات ہے۔ ورنہ عام انسانی اخلاقیات کے معیار پر اس موقع پرستی کو کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ دوسرے حریت نواز اور جمہوریت پسند حضرات کمال جرأت مندی کے ساتھ محدود اور ناقص جمہوریت کے پرچے اڑا رہے تھے اس وقت انڈونیشی کمیونسٹ پارٹی صدر کی ہم نوا بن کر عوامی احساسات کو ٹھیس لگانے میں پیش پیش تھی۔ اس مکارانہ اور خود غرضانہ روش کے برخلاف ڈاکٹر محمد حتا اور دوسرے ماشومی لیڈروں کا رویہ سامنے آتا ہے۔ جنہوں نے حکومت سے مستعفی ہو کر سلطان جابر کے سامنے کلمہ حق کہنے کا حق ادا کر دیا۔ صدر سوکارنو کی خود ساختہ جمہوریت پر تنقید کرتے ہوئے ڈاکٹر حتا نے اپنے مشہور کتابچہ (Demokrasi Kita) ——— "ہماری جمہوریت" ——— میں لکھا "ایسی جمہوریت جو نادری پر منتہی ہو دراصل آمریت کا دروازہ کھول دیتی ہے۔ یہ تاریخ کا نہ بدلنے والا اصول ہے۔ لیکن عالمی تاریخ سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ ایسی آمریت جو شخص واحد کا کھلونا ہو زیادہ دیر تک نہیں قائم رہتی۔ سوکارنو کی زندگی کے دن بہرحال محدود ہیں۔ سوکارنو کے بعد یہ سارا گھروندا ریت پر بنے ہوئے مکان کی طرح زمین پر آ رہے گا۔"

حتا کا کردار

ڈاکٹر حتا کی جرأت مندانہ تنقید سے صرف نظر کرتے ہوئے یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ سکارنو کے ساتھ نباہ نہ کر کے اور اپنی بے لچک پالیسی کے نتیجہ میں حکومت سے مستعفی ہو کر خود ڈاکٹر حتا نے یہ موقع فراہم کیا کہ صدر سوکارنو مکمل طور پر کمیونسٹوں کی گود میں چلے جائیں۔ ۱۹۵۸ء میں سماترا کی بغاوت کے سلسلہ میں سوکارنو حتا سے مصالحت کے لئے تیار تھے۔ لیکن حتا نے اپنی تمام شرائط کے منوانے پر اصرار کیا اور مذاکرات ناکام رہے۔ جاوا اور مرکزی حکومت کے خلاف دوسرے جزیروں خصوصاً سماترا اور سلاویسی کی بغاوت کی پشت پر جہاں معاشی عوامل کام کر رہے تھے۔ وہیں یہ احساس بھی کارفرما تھا کہ جاوا (یعنی مشرقی اور وسطی جاوا) لادین اشتراکیوں کا گڑھ ہے۔ اور یہی لوگ رفتہ رفتہ مرکزی حکومت پر قابض ہوتے جا رہے ہیں۔ حکومت میں کمیونسٹوں کی شمولیت پر اعتراض کرتے ہوئے حتا نے سوکارنو سے پوچھا تھا کہ کمیونسٹوں کے ساتھ اشتراک عمل کیسے ممکن ہے۔ درآنحالیکہ ان کا گذشتہ ۳۰ (اب ۴۰ سالہ) ریکارڈ اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ کمیونسٹ پارٹی انڈونیشی مفاد اور انڈونیشی آزادی کو بھی اپنی اغراض کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانے سے نہیں چوکتی؟"

اس کے جواب میں کمیونسٹوں نے سماترا کے باغی عناصر کی پرزور مخالفت کی اور خود ڈاکٹر حتا تک پر کیچڑ اچھالنے سے باز نہ آئے۔ اس کا انعام انہیں اس صورت میں ملا کہ "نئے طرز کی آمریت" کی گھنی چھاؤں میں انہیں پھلنے پھولنے کی اجازت ملی۔ اس موقعہ سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے آئیڈت نے انڈونیشی کمیونسٹ پارٹی کی شاخوں کو تمام ملک میں پھیلا دیا۔ اور اپنی پارٹی کی چھتری کے نیچے متعدد ذیلی جماعتیں قائم کر دیں جو مزدوروں، طالب علموں اور خواتین میں الگ الگ کام کرتی تھیں۔

اشتراکی دو عملی

رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ حکومت ان ضبط شدہ کارخانوں کو اس وقت تک نہیں چلا سکتی تھی۔ جب تک کمیونسٹ مزدور جماعت کے ارکان حکومت سے تعاون پر تیار نہ ہوں۔ ان حالات میں بظاہر کمیونسٹ پارٹی کے لئے فضا اس قدر سازگار نظر آتی تھی کہ آئیڈت کو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ وہ ٹراٹسکی کی راہ اپنائے یا لینن کی۔ ٹراٹسکی کا یہ اصول تھا کہ انقلاب کا علم فوراً بلند کر دیا جائے۔ خواہ نتائج کچھ بھی ہوں۔ اس کے برخلاف لینن کا یہ قول تھا کہ "پہلے مضبوط بن جاؤ اور باقی کام بعد میں!" آخرکار آئیڈت نے لینن کی تعلیم کو مشعل راہ بنایا۔ حالانکہ بعض مبصروں کا خیال ہے کہ ۱۹۵۹ء کے بعد جاوا میں کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم خود حکومت کے مقابلہ میں زیادہ مضبوط اور فعال تھی۔ لیکن آئیڈت نے شاید حالات کا صحیح تجزیہ کیا تھا کہ جاوا میں کمیونسٹ انقلاب کی صورت میں دوسرے جزیرے کٹ کر الگ ہو جائیں گے۔ اس لئے عارضی طور پر کمیونسٹ پارٹی نے یہ پالیسی اختیار کی کہ مرکز میں سکارنو حکومت کی حمایت کی جائے۔ لیکن دور دراز کے علاقوں اور دیہی سطح پر ملک کی تمام معاشی بدحالیوں کا ذمہ دار جکارتا میں بیٹھے ہوئے ارباب حل و عقد کو قرار دیا جائے۔ اس طرح جاوا کو اپنی انقلابی تحریک کا مرکز بنا کر آئیڈت نے بڑی خوبصورتی سے اپنی دو عملی پالیسی کے مطابق کام شروع کر دیا۔ آئیڈت سمجھتا تھا کہ وقت کمیونسٹ پارٹی کا ساتھ دے گا۔ اس لئے وہ قدم آگے

بڑھنے کے بعد ایک قدم پیچھے ہٹنے کو اپنی فتح سمجھتا تھا۔

جب جکارتا کی مرکزی حکومت نے سماترا اور سلاویسی کی بغاوت کو کچلنا شروع کیا تو فوج کے بڑھتے ہوئے اثرات کے پیش نظر کمیونسٹوں کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں سکارنو اور فوج مل کر ان کو دبانے کی کوشش نہ کریں۔ آیڈت کے سامنے مصر کی مثال تھی۔ جہاں ایک دوسرے آمر نے کیمونسٹ پارٹی پر قدغن لگا دی تھی، اس امکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آیڈت نے کہا تھا۔

"انڈونیشی اشتراکی اور عوام اپنے اس یقین پر جمے ہوئے ہیں کہ عملی طور پر جمہوریت کتنی ہی خراب ہو بہرصورت وہ فسطائیت سے بہتر ہے"۔ ظاہر بات ہے چونکہ سکارنو کی ناقص جمہوریت ہی وہ ٹٹی تھی۔ جس کی آڑ میں کیمونسٹ اپنا شکار کھیل سکتے تھے۔ اس لئے انہیں اس نام نہاد جمہوریت کو بچانے کی فکر تھی اور اسی لئے وہ مصری طرز کی "فسطائیت" سے گھبراتے تھے۔

سوکارنو کی شعبدہ بازی

کیمونسٹ پارٹی کے اس خوف کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہوئے سکارنو نے ایک ماہر بازیگر کی طرح کیمونسٹوں اور فوجیوں کے درمیان توازن قائم کرنے کی کوشش شروع کر دی۔

اسی دوران انڈونیشی کیمونسٹ پارٹی کو مختلف نظریاتی الجھنوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بہت سے سادہ لوح انڈونیشی عوام اور خواص کو کیمونسٹ لیڈر شپ اور خود صدر سوکارنو نے یہ سمجھا رکھا تھا کہ پی۔ کے۔ آئی ایک خالص قومی تحریک ہے۔ جس کی جڑیں مقامی زمین میں پیوست ہیں اور یہ جماعت کسی غیر ملکی بین الاقوامی انقلابی جماعت کا دم چھلا نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں خود پی۔ کے۔ آئی نے مختلف موقعوں پر مختلف باتیں کی تھیں۔ آخری بات جو ۱۹۵۶ء میں سامنے آئی اس سے انڈونیشی کیمونسٹ پارٹی کا عالمی کردار اور بیرون ملک سے وفاداری کھل کر سامنے آگئی۔ ۲۰ اکتوبر کو لقمان نے کھل کر اعتراف کیا کہ پی۔ کے۔ آئی ایک "قومی کیمونسٹ پارٹی" نہیں ہے۔ بلکہ اس کے مقاصد عالمگیر کیمونسٹ جماعت کے مقاصد سے ہم آہنگ ہیں۔"

لقمان کے اس بیان پر مشہور صحافی مختار لوبس نے اپنے اخبار "انڈونیشیا رایا" میں ۱۱ اکتوبر ۱۹۵۶ء کی اشاعت میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا "چونکہ لقمان نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ پی۔ کے۔ آئی بین الاقوامی اشتراکی تحریک کی آلہ کار ہے۔ اس لئے یہ جاننا بہتر ہوگا کہ بین الاقوامی اشتراکیت کے کیا مقاصد ہیں۔ اس کا مقصد، جیسا کہ لینن اور اسٹالن کی تحریروں سے ظاہر ہے، یہ ہے کہ تمام دنیا میں سرخ آمریت قائم کی جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کیمونسٹ دو محاذوں پر بیک وقت کام کرتے ہیں۔ ایک محاذ تو قانونی اور دستوری ہو سکتا ہے۔ دوسرا دہشت پسندی اور توڑ پھوڑ کا راستہ۔ انہیں طریقوں سے اشتراکی غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

ماشومی پارٹی کے آرگن روزنامہ "ابدی" نے لقمان کے بیان پر تنقید کرتے ہوئے لکھا:۔

"ہم لقمان کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے کھل کر کہہ دیا کہ ان کی پارٹی اور بین الاقوامی اشتراکیت میں کوئی فرق نہیں ہے اب ان لوگوں کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں جو پی۔ کے۔ آئی کو خالص انڈونیشی پارٹی سمجھتے تھے"

مثال کے طور پر روزنامہ "ابدی" نے ہنگری میں روسی مداخلت کے سلسلہ میں پی۔ کے۔ آئی کے موقف

کی طرف اشارہ کیا۔ "ابدی" نے لکھا کہ ہنگری کی خوں چکاں بغاوت کے بعد آہنی پردہ کے باہر بہت سی اشتراکی جماعتوں کے کارکنوں کے درمیان اس موضوع پر ہنگامہ آرائی ہوئی اور بہت سے لوگوں نے کیمونسٹ پارٹی کو خیر باد کہا۔ لیکن تعجب ہے کہ اس المیہ پر انڈونیشی کیمونسٹ پارٹی بالکل مہر بہ لب رہی اور روسی رویہ پر پی۔ کے۔ آئی کے کسی زعیم نے ہلکی سی بھی تنقید کرنے کی ہمت نہ کی۔

پی۔ کے۔ آئی کے لئے ایک اور سنگین مرحلہ اس وقت آیا جب انڈونیشی حکومت نے سمندر پار سے آئے ہوئے چینی باشندوں کے معاشی استحصال کے خلاف ۱۹۵۹ء میں قدم اٹھایا۔ اس سلسلہ میں واضح رہے انڈونیشیا میں ۳۰ لاکھ چینی نسل کے باشندے ہیں۔ ملک کی ساری معاشیات پر ان چینیوں کی گرفت نہایت مضبوط ہے۔ دراصل ولندیزی سامراج نے ان سمندرپار کے چینیوں کو انڈونیشیا میں اسی لئے درآمد کیا تھا کہ ان کی مدد سے انڈونیشیا کا خون چوسا جائے۔ چنانچہ ولندیزی سرپرستی میں اس طفیلی طبقہ نے رفتہ رفتہ ملک کی اقتصادی اجارہ داری اپنے ہاتھوں میں لے لی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ بڑے شہروں میں تھوک بیوپار اور برآمدی و درآمدی تجارت کے علاوہ دیہاتوں تک میں پرچون کے کاروبار تک پر بھی اس کا قبضہ ہو گیا۔ انڈونیشیا کی آزادی کے بعد برسوں تک دور دراز کے دیہاتوں میں نمک اور مٹی کا تیل بیچنے والا بھی کوئی انڈونیشی دکاندار ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا تھا۔

جب انڈونیشی حکومت نے اپنا مشہور ریگولیشن نمبر ۱۰ نافذ کرنے کی کوشش کی جس کے تحت چینی تاجروں کو دیہاتوں کی تجارت سے بے دخل کیا جانا تھا، تو اس کے خلاف پی۔ کے۔ آئی نے احتجاج کیا اور جکارتا کے حکام پر کھل کر تنقید کی۔ اس طرح کیمونسٹوں نے اپنے آپ کو ایک غلط مقام پر کھڑا کر لیا اور پورے محب وطن انڈونیشی پریس نے کیمونسٹوں کے اس رویہ کے خلاف کھل کر لکھا۔ اس موقع پر آیدت نے نہایت ہوشیاری سے عوام کے غم و غصہ کی لہر کو دوسری جانب موڑنے کی کوشش کی۔ آئیدت نے کہا کہ انڈونیشی اقتصادیات کی ابتری کا سبب چینی تاجر نہیں ہیں بلکہ غیر ملکی مغربی تجارتی ادارے مثلاً اسٹانواک اور کالٹیکس ہیں۔

موقعہ پرستی

پی۔ کے۔ آئی کو ایک اور بڑا دھکا اس وقت لگا جب وسط ۱۹۵۹ء میں سوکارنو نے عام انتخابات کو پس پشت ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ نہ صرف یہ بلکہ صدر نے، پارلیمینٹ کو برخاست کر کے اپنی "رہدایت یاب" جمہوریت کی بساط بچھانی شروع کی۔
کیمونسٹ پارٹی انتخابات پر نگاہ لگائے بیٹھی تھی اور اس کو توقع تھی کہ اس بار وہ ۱۹۵۵ء کی کامیابیوں سے کہیں آگے نکل جائے گی۔ لیکن سوکارنو کی اس کھلی ہوئی دھاندلی کے باوجود پی۔ کے۔ آئی کھل کر صدر سے تجربہ آزمائی کرنے کی ہمت اپنے اندر نہ پاتی تھی اس لئے اس نے حقیقت پسندی کا شیوہ اپناتے ہوئے یہ طے کیا کہ صدر سوکارنو کے خود ساختہ نظام میں گھس کر اس کو اندر سے کمزور کرنے اور بالآخر اسے ایک دھماکہ سے اڑانے (EXPLODE) کی کوشش کرے۔
اس لائحہ عمل کے مطابق کیمونسٹوں نے سوکارنو کے تمام برخود غلط نظریات کو دل سے نہ ماننے کے باوجود زبان سے دہرانا شروع کر دیا۔ اس سلسلہ میں کیمونسٹ منافقت کی ایک مثال یہ ہے کہ سرکاری طور پر انھوں نے ریاست کے بنیادی نظریہ

"پنچا سیلا" کی بھی حمایت کر دی، حبب کہ پنچا سیلا "کا پہلا اصول "خدا پر یقین" ہے۔ ظاہر ہے کیونسٹ اخلاقیات میں پاک اور ناپاک صحیح اور غلط ذرائع کی پرواہ کئے بغیر مقصد اور منزل تک کسی صورت پہنچ جانا ہی دراصل بڑی کامیابی ہے۔ لیکن شاید پی کے آئی کے علاوہ دنیا کی اور کسی بھی کیمونسٹ پارٹی کو اتنی کڑوی گولی حلق سے نہ اتارنی پڑی ہو۔ بہرحال ملحد اشتراکیوں کے لئے زبانی طور پر بھی "خدا پر یقین" کی بات کرنا نہایت مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ لیکن پی۔ کے۔ آئی نے سکارنو کی ذات کو زینہ بنا کر بام اقتدار پر پہنچنے کے لئے یہ پاپڑ بھی بیلا۔

یہ بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی کہ خود صدر سوکارنو کو پی۔ کے۔ آئی کی اس بدنیتی کا علم تھا یا نہیں۔ لیکن چونکہ سیاست کا کھیل معروف طور پر بدنیتی ہی کے مہروں سے کھیلا جاتا رہا ہے۔ اس لئے اتنی بات صاف ہے کہ اسلامی جماعتوں کا صفایا کرنے کے بعد شروع میں سوکارنو جو خود بڑے شاطر اور کہنہ مشق سیاست داں ہیں، چند سال تک پی۔ کے۔ آئی کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کرتے رہے۔ بعد میں جب افواج کا اثر بڑھا اور سوکارنو کے قوائے جسمانی مائل بہ انحطاط ہوئے تو پی۔ کے۔ آئی اور سوباندریو صدر کے لئے آنکھ اور کان بن گئے۔ سوکارنو اپنے آخری زمانہ میں کیمونسٹ حاشیہ برداروں پر اس حد تک انحصار کرنے لگے تھے کہ یوم آزادی کے موقعہ پر کی جانے والی اپنی تقریر بھی کیمونسٹ پارٹی کے سربرآوردہ رہنما یونتو سے لکھوایا کرتے تھے۔

زوال کے اسباب

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک ایسی پارٹی جس کے ۳۰ لاکھ ممبر ہوں اور جو ملک کے دروبست پر اس حد تک قابض ہو چکی ہو۔ اس کے زوال کے کیا اسباب تھے۔

۱۔ اس سلسلہ میں پہلی بات یہ ہے کہ انڈونیشی کیمونسٹ پارٹی بظاہر ایک دیوہیکل جماعت تھی۔ لیکن اس کی اندرونی قوت اس کے ظاہری جسم سے بہت کم تھی۔ اس کا ثبوت یوں ملتا ہے کہ وسطی اور مشرقی جاوا کے توہم پرست عوام کی ایک بھیڑ کیونسٹ سازش کی ناکامی کے بعد جوق در جوق پارٹی سے الگ ہو گئی۔ آبیدت کے لئے زمین اور روزگار دلانے کے سنہرے وعدوں کے ذریعہ ایک جم غفیر اکٹھا کرنا آسان تھا۔ لیکن اس انبوہ کو پارٹی ڈسپلن میں کسنے کے لئے جتنی مدت درکار تھی۔ وہ میسر نہ آسکی۔ انڈونیشی کیمونسٹ پارٹی کی یہ بھی کمزوری تھی کہ اس کی مرکزی کمیٹی کے مقابلہ میں پارٹی کانگرسیں زیادہ فیصلہ کن اختیارات کی حامل بن گئی تھی۔ یہ بات کلاسیکی کیمونسٹ مزاج کے خلاف تھی۔ ۱۹۶۰ء میں جب خروشچیف نے انڈونیشیا کا دورہ کیا تھا تو اس نے پی۔ کے۔ آئی کی اس کمزوری کو تاڑ لیا تھا۔ خروشچیف نے اس موقعہ پر کہا تھا کہ وہ کیمونسٹ پارٹی ایک پنساری کی دوکان نہیں ہے کہ جہاں آپ زیادہ سے زیادہ گاہک پھانسنے کی کوشش میں زیادہ سے زیادہ سستے داموں صابن، سڑی ہوئی مچھلیاں اور ردی مال کی نکاسی کر کے نفع بٹورنے کی کوشش کریں۔"

۲۔ دوسری بات جو پی۔ کے۔ آئی کے نقائص کے سلسلہ میں سامنے آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ کیمونسٹ پارٹی نے انڈونیشی عوام کے ہر طبقہ میں نفوذ کرنے کی کوشش کی۔ اس کو فنڈ چینی تاجر فراہم کرتے تھے۔ اور کارکن زیادہ تر ان مسلمانوں میں سے ملتے تھے جو صدیوں سے چینی تاجروں کے خلاف جذبات اپنے دل میں رکھتے ہیں۔ اس طرح پارٹی میں ایک ایسی داخلی کشمکش کا سامان

[illegible] آخرکار اسے لے ڈوبی۔ چنانچہ کیمونسٹ سازش کی ناکامی کے بعد ۱۹۶۵ء اور ۱۹۶۶ء میں جو خون ریزیاں ہوئیں ان میں اس کش مکش کا بھی دخل تھا۔

۳ - پی۔ کے۔ آئی کی تیسری غلطی یہ تھی کہ اس نے ۱۹۶۳ء کے بعد چینی اور روسی نظریاتی کشمکش میں کھل کر ایک فریق کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ یہ جانب داری اس حد تک بڑھی کہ ایک خاص ملک کے اشارے پر انڈونیشیا میں جتنی بھی افریقی ایشیائی کانفرنسیں (مثلاً افرو ایشین جرنلسٹ کانفرنس) ہوئیں ان کو عالمی اشتراکیت کی موجودہ نزاع کا اکھاڑہ بنا دیا گیا۔ پی۔ کے۔ آئی کو یہ معلوم تھا کہ انڈونیشی فوج کے اسلحے اور جہاز روس کے دیئے ہوئے ہیں۔ اس دباؤ کو نظر انداز کر کے پی۔ کے۔ آئی نے روس کے مخالفوں کا ساتھ دیا اور اس طرح اس جنگ میں ایک طاقت ور فریق کی حمایت سے محروم ہو گئی۔

۴ - انڈونیشی کیمونسٹ پارٹی نے صدر سوکارنو کے جمہوریت کش اقدام کی حمایت کر کے، ملک کے تمام جمہوریت پسندوں کی دشمنی مول لے لی۔ دراصل پی۔ کے۔ آئی نے سوکارنو کی آمریت کی حمایت اس لئے کی تھی کہ اس کے ذریعہ ملک کے اسلام پسندوں کا بالکل صفایا کرا دیا جائے۔ اس سلسلہ میں کیمونسٹوں کو بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی۔ انہوں نے سوکارنو کو حتیٰ سے کاٹ دیا۔ کیونکہ حتیٰ ایک بیدار مغز سیاست دان اور محب وطن انڈونیشی ہیں، جو اپنی ذاتی اغراض سے بالاتر ہو کر کیمونسٹوں کی مخالفت کرتے رہے اور اس کی قیمت یوں ادا کی کہ ملک کی نائب صدارت پر لات مار کر سوکارنو سے الگ جا کر کھڑے ہوئے۔ مزید یہ کہ کیمونسٹوں نے محمد ناصر اور برہان الدین ہراہپ کی ماشومی وزارتوں کو ورہا برد کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور بالآخر ماشومی پارٹی کو غیر قانونی قرار دلوا کر دم لیا۔ اس طرح سوکارنو کی آمریت کے سایہ تلے یہ تمام فائدے حاصل کرنے کے لئے غیر ارادی طور پر کیمونسٹوں کو ایک جمہوریت کش جماعت کے روپ میں انڈونیشی اسٹیج پر آنا پڑا۔ اور کیمونسٹوں کا یہ گھناؤنا کردار انڈونیشی عوام کے سامنے کھل کر آ گیا۔

۵ - سوکارنو کی غیر مشروط حمایت میں کیمونسٹوں نے یہ چوٹ بھی کھائی کہ ملک کی اقتصادی بدحالی کا ذمہ دار بالواسطہ طور پر انہیں بھی بننا پڑا۔ ظاہر ہے کہ صدر سوکارنو نے انڈونیشی اقتصادیات تباہ کر کے ملک کو تباہی کے جس گڑھے کے کنارے کھڑا کر دیا۔ اسے کھودنے میں کیمونسٹ پارٹی کا بھی بڑا ہاتھ رہا ہے۔ اب جو شواہد سامنے آئے ہیں۔ ان کی روشنی میں پتہ چلتا ہے کہ کیمونسٹوں نے ملکی اقتصادیات کو تباہ کرنے کی شعوری کوشش کی تھی تاکہ بھوکے اور ننگے عوام تیزی سے سرخ سویرے کی طرف لپکنا شروع کر دیں۔ بہر حال اس سلسلہ میں کیمونسٹ عزائم خواہ کچھ ہی رہے ہوں۔ عوام نے تو یہی سمجھا کہ یہ حکومت میں شریک کیمونسٹ بھی ان کی بدحالی کے ذمہ دار ہیں۔ عوام کے سامنے خود کیمونسٹ پارٹی کے ارکان کی نجی زندگی بھی تھی جو بدترین تضاد کا شکار تھی۔ خود آئیڈت کے پاس جکارتا میں پانچ پانچ مکانات تھے اور وہ شان و شوکت کی زندگی بسر کرتا تھا۔

۶ - انڈونیشی کیمونسٹ پارٹی کے تابوت میں آخری کیل کیمونسٹوں کی مذہب اور خاص طور پر اسلام کے خلاف وہ معاندانہ روش تھی۔ جس کا اظہار اس پارٹی نے اپنے دور عروج میں بار بار کیا۔ ۱۹۶۴ء میں وسطی جاوا سے یہ خبریں بار بار آئیں کہ اپنے اس گڑھ میں چند ناعاقبت اندیش کیمونسٹوں نے مسجدوں کی بے حرمتی کی اور قرآن کریم کو جلایا۔ ظاہر ہے یہ حرکت پارٹی کی قیادت کے اشارے پر نہیں ہوئی۔ لیکن کیمونسٹ قیادت اپنے ۳۰ لاکھ ارکان (اور ایک کروڑ ذیلی اشتراکی انجمنوں کے ممبروں) کو قابو میں بھی نہیں رکھ سکتی تھی۔ دراصل اسلامی جماعتوں کے خاتمہ کے بعد پارٹی میں شامل اسلام دشمن عناصر نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ اب مسلمانوں کے ساتھ

حرکت بھی کی جائے اسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر لیا جائے گا۔ لیکن انڈونیشیا میں وسطی جاوا کے علاوہ مسلمانوں کے اپنے گڑھ ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ وسطی جاوا میں اب بھی ہندو مذہب اور مشرکانہ توہم پرستی کے بڑے اثرات ہیں۔ چنانچہ جب ۱۹۶۵ء کی کیمونسٹ سازش ناکام ہوئی تو عوام نے ان کیمونسٹوں کے خلاف ہتھیار سنبھال لیے جو اب تک ان کا ناطقہ بند کئے ہوئے تھے انڈونیشیا میں جو قتل عام ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ پروپیگنڈہ بالکل بے سروپا ہے کہ انڈونیشی فوج نے کسی بیرونی طاقت کے اشارہ پر کیمونسٹوں کو مارا ہے۔ دراصل فوج تو اکثر مقامات پر پہنچ بھی نہیں پائی۔ سارا کشت و خون کیمونسٹوں اور ان کے مخالفین کے درمیان ہوا اور یہ خانہ جنگی عوامی سطح پر برپا ہوئی۔ جس میں جہاں کیمونسٹ قتل ہوئے تو اسلام پسند بھی مارے گئے۔ البتہ کیمونسٹ مقتولین کی تعداد زیادہ رہی۔

اگر کیمونسٹ پارٹی نے ۹۰ فی صد سے زائد آبادی کے مسلمان ملک میں مذہب کے سلسلہ میں بہتر حکمت عملی سے کام لیا ہوتا تو انڈونیشیا کی سرزمین اس قدر کشت و خون سے آلودہ نہ ہوتی۔ اشتراکیت تو شاید وہاں جب بھی کامیاب نہ ہوتی۔ لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسانی خون اتنا ارزاں نہ ہوتا۔ اشتراکی قوتیں گزشتہ دس سال سے مسلمانوں کا خون بہا رہی تھیں اور اب اس کا انتقام لینے کے لئے مسلمانوں نے بھی جوابی کارروائی کی۔ اشتراکیت نے جہاں بھی سر اٹھایا ہے انسانی خون سے ہولی کھیلی ہے اور مسلمانوں کا خون تو اسے بہت ہی مرغوب ہے۔

انڈونیشیا میں اشتراکی پارٹی کے عروج و زوال کی یہ داستان اپنے اندر عبرت اور موعظت کے بے شمار پہلو رکھتی ہے۔ اور دنیا کے تمام سوچنے سمجھنے والوں کو، اور خصوصیت سے مسلمانوں کو اس آئینہ میں اشتراکیوں کی حقیقی تصویر کا بغور مطالعہ کرنا چاہیے۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ ے

پاکستان میں اشتراکی سرگرمیاں

یعقوب طاہر - ناصر احمد

ہماری دعوت پر برادر محترم محمد یعقوب طاہر صاحب نے پاکستان میں اشتراکی عناصر کی سرگرمیوں پر ایک طویل مقالہ مرتب کیا تھا جس میں اخبارات سے تمام ضروری مواد جمع کر لیا گیا تھا۔ چراغ راہ میں اس پورے مواد کی اشاعت ممکن نہ تھی۔ اس لئے برادر عزیز ناصر احمد صاحب نے اس مواد کی تلخیص کی اور اسے از سر نو مرتب کیا۔ اپنی موجودہ شکل میں یہ مضمون ہمارے ان دونوں دوستوں کی مساعی کا نتیجہ ہے ——— ایڈیٹر

۱۹۶۷ء میں روس کے اشتراکی انقلاب کو پچاس سال پورے ہو گئے۔ ان پچاس برسوں میں دنیا نے ایک انقلابی تحریک کو ابھرتے، آگے بڑھتے اور بالآخر ایک قومی حکومت میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھا۔ جس اشتراکی پارٹی کا اہم اصول یہ تھا کہ سب لوگ مل کر معاشرے کے لئے کام کریں گے، اس نے تاجروں کو نفع اندوزی کی اجازت دے دی اور عوامی زندگی میں نفیسات کو داخل ہونے دیا۔ روس کی اشتراکی پارٹی نے یہ انقلابی تبدیلیاں برداشت کیں لیکن اشتراکیت کی دعوت و تبلیغ سے متعلق اس کے موقف میں کوئی فرق نہیں آیا۔ انقلاب روس کی پچاسویں سالگرہ پر روس کی اشتراکی پارٹی نے اعلان کیا کہ روس کی خارجہ پالیسی کا سب سے بڑا مقصد اشتراکیت کے نفاذ کے لئے فضا سازگار بنانا ہے اور روسی عوام بین الاقوامی طور پر اشتراکیت کو مستحکم دیکھنا چاہتے ہیں۔[1]

اس واضح اعلان کے بعد یہ سمجھنا چنداں دشوار نہیں کہ اشتراکی ملکوں کے علاوہ دوسرے ممالک میں جو اشتراکی پارٹیاں علی الاعلان یا خفیہ طور پر کام کر رہی ہیں وہ کیا چاہتی ہیں اور انہیں اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے رہنمائی کہاں سے حاصل ہو رہی ہے۔ جن ممالک میں اشتراکی حکومت نہیں ہے وہاں کے اشتراکی عناصر کا مقصد صرف ایک ہے اور وہ ہے جائز یا ناجائز ذرائع سے حکومت پر قبضہ کرنا اور پاکستان نے ان کے ضابطہ اخلاق کے مطابق کوئی ایسی نیکی نہیں کی ہے جس کی بنا پر اسے بخش دیا جائے۔ اشتراکی پاکستان میں بھی سرگرم رہے ہیں انہوں نے باقاعدہ کمیونسٹ پارٹی بھی قائم کی تھی جسے کچھ عرصہ بعد کالعدم قرار دے دیا گیا۔ اس کے بعد بھی اس امر کا واضح ثبوت موجود ہے کہ

---

[1] روزنامہ ڈان ۲۶ جون ۱۹۶۷ء

وہ اپنے مقاصد کے لئے جدوجہد کرتے رہے ہیں۔

اشتراکی پارٹی کے اعلان کے مطابق پاکستان کے اشتراکی عناصر بھی اقتدار حاصل کرنے کی فکر میں ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ان کی کوشش کچھ اس طرح کی نظر آتی ہے کہ اسٹیج پوری طرح مکمل ہونے کے بعد ایک بٹن دبا دیا جائے گا اور عالم اسلام کے ایک اہم قلعہ پر اسلام دشمنوں کا قبضہ ہو جائے گا۔ زیر نظر مضمون میں اشتراکی عناصر کی خفیہ سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس جائزے کا مقصد قارئین کو یہ بتانا ہے کہ بھارت کے فوجی حملے کے علاوہ پاکستان کو اشتراکی انقلاب کا بھی خطرہ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس وقت یہ خطرہ شدید نہ محسوس ہو لیکن وقت گذرنے کے ساتھ اس کی شدت میں اضافہ ہوسکتا ہے۔

ہندو پاک میں اشتراکی تحریک

برصغیر میں اشتراکیت کی ابتدا بہت پرانا واقعہ نہیں ہے۔ سنہ ۱۹۲۰ء کی بات ہے جب ایک ہندوستانی مسٹر ایم این رائے کو بین الاقوامی کمیونسٹ پارٹی کی مجلس منتظمہ کا رکن نامزد کیا گیا تھا[1]۔ نامزدگی کے بعد کام کا ایک منصوبہ لے کر مسٹر رائے ہندوستان پہنچے۔ انہیں پروپگنڈے کے ذریعے آل انڈیا کمیونسٹ پارٹی کے قیام کی راہ ہموار کرنی تھی اور انہوں نے یہ کام بڑی تن دہی کے ساتھ کیا۔ مسٹر رائے نے نوجوانوں کے لئے متعدد کتابچے لکھے، ہفتہ وار اور ماہوار جرائد نکالے۔ ان کی شب و روز کی محنت کا نتیجہ یہ ہوا کہ نامزدگی کے صرف پانچ سال بعد باقاعدہ کمیونسٹ پارٹی قائم ہوگئی اور اس کے دو سال بعد مزدوروں کی ہڑتالوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی نے اس تدر تیزی سے کام کیا کہ سنہ ۱۹۳۰ء تک اس کا ایک مخصوص مقام بن گیا اور اس کی آواز کو سنا جانے لگا۔ جلد ہی اسے اشتراکی درسگاہوں کے فارغ التحصیل کچھ متمول اور فیشن ایبل دانشور بھی میسر آگئے جن کی مدد سے اسے دانشوروں کے طبقے میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ سنہ ۱۹۳۰ء کے بعد سے برصغیر کے کیمونسٹ عناصر ایسے باثر دانشوروں سے محروم نہیں رہے ہیں

ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں وہاں کی اشتراکی پارٹی نے کوئی خاص کردار ادا نہیں کیا بلکہ بعض اقدامات کی بنا پر اسے قومی تحریک سے علیحدہ سمجھا گیا۔ تحریک آزادی کی دو بڑی تحریکوں کانگریس اور مسلم لیگ کے بارے میں ان کا خیال یہ تھا کہ یہ مذہبی فرقہ وارانہ کی علمبردار اور مقامی جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے حقوق کی حفاظت کرنے کے لئے اٹھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کمیونسٹ پارٹی نے قومی تحریکوں کی ہر موقع پر مخالفت کی۔ وہ تحریک خلافت سے الگ رہے۔ تحریک ترک موالات سے ان کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ انہوں نے سول نافرمانی کی تحریک کی مخالفت کی۔ ہندوستان چھوڑدو تحریک کے خلاف ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور اس میں حصہ لینے والے پولیس افسروں کے نام باقاعدہ لکھ کر حکومت کو شکایتاً بھیجے۔ اس وقت کے مقبول لیڈروں سبھاش چندر بوس اور جے پرکاش نرائن کو پھانسی دینے کا مطالبہ کیا اور ایسے نازک وقت میں کسانوں کو اشتعال دلاکر خون ریزی کرائی۔ ان اقدامات کی بنا پر اشتراکی پارٹی جدوجہد آزادی سے الگ تھلگ رہ کر کام کرنے پر مجبور ہوئی۔ لیکن وہ وقت ایسا تھا کہ اشتراکیت کی تبلیغ ممکن نہ تھی۔ پورے برصغیر میں آزادی کا مطالبہ گونج رہا تھا۔ چنانچہ کمیونسٹ ۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۶ء پارٹی کی تنظیم کے سوا کچھ اور نہ کرسکے۔ اس دوران پارٹی کو دانشوروں، ساقسد الحق ادیبوں اور صحافیوں وغیرہ کا تعاون حاصل رہا[2]۔

تقسیم کے بعد

تقسیم برصغیر کے ساتھ ہی کیمونسٹ پارٹی بھی تقسیم ہوئی۔ چھانٹ چھانٹ کر نام کے مسلمان اور فی الاصل اشتراکیوں کو پاکستان بھیجا گیا تاکہ وہ اس نئے ملک میں ہنگامۂ کارزار گرم کریں۔ اس وقت ہر شخص یہ سمجھ رہا تھا کہ پاکستان کی ہر

---

[1] کمیونزم اینڈ انڈیا۔ مصنف فلپ اسپراٹ [2] کمیونزم اینڈ انڈیا۔ مصنف فلپ اسپراٹ

چیز پہننے [illegible] کا اثر غالب ہوگا اور ہو ابتدا میں اپنا رنگ جمالے گا۔ میدان اسی کے ہاتھ رہے گا۔ پرجوش، منظم، باتدبیر اور باقیادت اشتراکیوں کو [illegible] تھا کہ وہ بہت جلد اشتراکی دنیا میں ایک نئے ملک کا اضافہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ پاکستان آنے والے اشتراکیوں نے پورے جذبہ" وفاداری کے ساتھ اس نوزائیدہ ملک میں کمیونسٹ پارٹی قائم کی۔ مشہور ترقی پسند ادیب سجاد ظہیر کو ہندوستان سے درآمد کر کے اس کا سیکرٹری بنایا گیا اور ملک گیر پیمانے پر پارٹی کی تنظیم ہوئی۔

یہاں یہ بات خاص اہمیت کی حامل ہے کہ اشتراکی پارٹی —— صرف ایک عام سیاسی پارٹی نہیں ہوا کرتی اور نہ وہ کبھی نئی ہوا کرتی ہے۔ وہ کسی بھی ملک میں قائم ہو اس کے لئے صرف کام کا میدان نیا ہوتا ہے۔ کام کرنے کا طریقہ اور وقتاً فوقتاً رہنمائی اور مالی اعانت بھی "رہنما" اور مرکزی پارٹی فراہم کرتی ہے۔ پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی بھی نام کو نئی تھی —— ورنہ حقیقت یہ تھی کہ وہ ایک پرانی پارٹی کی طرح فعال، سرگرم، منظم، مالدار اور تجربہ کار تھی۔

اپنے طے شدہ طریقۂ کار کے مطابق پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی نے اپنے کام کا آغاز کیا۔ میدان سیاست کے پرانے شہسوار متعدد ممالک کے تجربات کے بعد جس نتیجے پر پہنچے وہ یہ تھا کہ کام تمام میدانوں میں ایک ساتھ شروع کیا جائے۔ چنانچہ کچھ اشتراکی کارکنوں نے فکری، علمی اور ادبی مورچہ سنبھالا۔ کچھ لوگ اخبارات، جرائد اور ریڈیو کے ذریعہ حملہ آور ہوئے۔ کچھ دوسرے لوگ سیاسی اکھاڑے میں اترے اور کچھ رضا کاروں نے مزدوروں، کسانوں اور طالب علموں کو گمراہ کرنے کا کام اپنے ذمہ لیا۔ سب کاموں میں اہم تر کام پروپیگنڈے کا تھا جو صحافتی اداروں کے ذریعے انجام دیا جا سکتا تھا چنانچہ اولیت اسی کو دی گئی۔

کمیونسٹ پارٹی کو سب سے زیادہ فائدہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ان افراد سے ہوا جو علی الاعلان اشتراکیت کے فروغ کو اپنا مقصد، سوویٹ یونین کو اپنا حامی ومددگار اور اشتراکیت کو تمام مسائل کا واحد حل قرار دیتے تھے۔ اشتراکی عناصر نے پاکستان میں کچھ اس شد ومد سے کام شروع کیا کہ برسوں کا سفر مہینوں میں طے کر لیا اور یہ چیز صاف نظر آنے لگی کہ اگر انہیں روکا نہ گیا تو بہت جلد حالات قابو سے باہر ہو جائیں گے۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے کمیونسٹ پارٹی اور انجمن ترقی پسند مصنفین پر پابندی لگا دی گئی۔ لیکن اشتراکی عناصر پابندی کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے۔ اس سے صرف ان کے طریقۂ کار میں معمولی سی تبدیلی ہوتی ہے اور کام جاری رہتا ہے۔ پاکستان میں پابندی لگنے کے بعد وہ منظر عام سے ہٹ گئے۔ لیکن اس کے بعد ملک میں جو کچھ ہوتا رہا ہے اس میں ان کا ہاتھ صاف نظر آتا ہے —— دانشوروں، ادیبوں، صحافیوں، طالب علموں اور مزدوروں میں بائیں بازو کے لوگ بالکل نمایاں ہیں اور ان کا طریقۂ کار وہی ہے جو اشتراکیوں کا ہوتا ہے۔

قیام پاکستان سے لے کر اب تک انہوں نے جو کچھ کیا ہے اس کا مختصر خاکہ درج ذیل ہے۔

ادب وصحافت کے محاذ پر

قیام پاکستان سے قبل ہی ترقی پسند شعراء اور ادیب نوجوان ذہنوں کو مسخر کرنے کا خوش آئند تجربہ کر چکے تھے۔ چنانچہ پاکستان بننے کے بعد انہیں بجا طور پر فروغ اشتراکیت کا کام آسان محسوس ہوتا تھا ان کے یہ احساسات بار بار منظر عام پر بھی آئے ہیں۔ نومبر [illegible] میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے پہلے اجلاس میں چراغ حسن حسرت نے خطبۂ صدارت میں کہا۔

"...... آج ترقی پسندی کے خدوخال واضح ہیں ..... آج آپ لوگوں کو دیکھنا چاہئے کہ ادب اور شاعری کسی خاص

گروہ کا کھلونا نہ بن جائے۔ رمزوں اور اشاروں میں باتیں کرنے کی بجائے جو کچھ کہئے صاف صاف کہئے[۲۳]۔۔۔"

ان کے علاوہ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اعلان کیا کہ وہ اشتراکیت کو موجودہ سیاسی کشمکش کا واحد حل سمجھتے ہیں[۲۴]۔ نومبر ۱۹۴۹ء کے اجلاس میں باقاعدہ اعلان کیا گیا کہ اس ادبی تحریک (انجمن ترقی پسند مصنفین) کو سوویٹ یونین کی رہنمائی حاصل ہے[۲۵]۔ مشہور اشتراکی ادیب ممتاز حسین نے اپنے مضمون "نئی اور پرانی شاعری کا فرق" میں اشتراکیت کو مستقبل کی ایک حقیقت قرار دیا۔ ظہیر کاشمیری نے ادب برائے انقلاب کا نعرہ لگایا اور کہا کہ جب تک ہمارے تصورات اشتراکی انقلاب کے سانچے میں نہ ڈھل جائیں تب تک ان کی کوئی حیثیت نہ ہوگی[۲۶]۔ احمد ندیم قاسمی نے انجمن ترقی پسند مصنفین کا پہلا منشور پیش کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ "ہماری فکری اساس اشتراکی حقیقت پسندی ہے"[۲۷]۔

ان حضرات کے علاوہ ترقی پسند مصنفین میں سے تقریباً ہر ایک نے اشتراکی انقلاب کا نعرہ لگایا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مضامین لکھے اور نظمیں کہیں۔ ان کی ان کوششوں سے جو ادب وجود میں آیا اس میں سرخ رنگ صاف جھلکتا ہے۔ کسی کو بخارا و سمرقند سے بہاروں کے پیام آئے۔ کوئی ادب کی دنیا پر لال پھریرا لہرانے کے لئے اٹھا اور کسی نے آواز بلند کی کہ انقلاب "۔۔۔۔ اسی وقت ممکن ہے جب ہم موجودہ سرمایہ داری، جاگیرداری نظام توڑ کر محنت کشوں کی قیادت میں ایک عوامی جمہوری نظام قائم کریں جو اشتراکی معیشت کی تعمیر کرے[۲۸]۔"

اشتراکیت زدہ ادب کو پروان چڑھانے میں ماہنامہ سویرا اور ایک عرصہ تک سہ ماہی نقوش نے ایک خاص کردار ادا کیا ہے۔ نقوش میں "اسلامی ادب" کے خلاف زبردست مہم بھی چلائی گئی اور اس مہم کے سلسلے میں بھارت کے ہندو ادیبوں تک کے مضامین منگا کر شائع کئے گئے۔ روزنامہ "امروز" نے بھی قیام پاکستان سے مارشل لاء لگنے تک اشتراکی ادب کو آگے بڑھانے میں مدد دی ہے۔ یہ روزنامہ یوں تو بنیادی طور پر اخبار تھا لیکن اس میں اشتراکیت پسند شاعروں کی غزلیں، نظمیں اور اشتراکی ادیبوں کے افسانے وغیرہ بھی شائع ہوتے تھے۔ اس اخبار نے ایک ادبی اہمیت کے روزنامے کی حیثیت اختیار کی تھی اور یہ سب کچھ فروغ اشتراکیت کی جدوجہد کے لئے کیا گیا تھا۔ "امروز" کی اس مہم میں نمایاں حیثیت چراغ حسن حسرت، احمد ندیم قاسمی، فیض احمد فیض، ظہیر بابر، صفدر میر، سبط حسن اور لاہور کے چند اور اشتراکی نوجوانوں کی تھی۔

ادبی محاذ پر اشتراکیوں کے جرائد کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ادب کا رخ ایک خاص سمت میں موڑ دیا اور نئی نسل کے باصلاحیت ادیبوں اور شاعروں کی ایک قابل ذکر تعداد کو متاثر کر کے اپنے دائرے کے اندر سمیٹ لیا۔ اس کے ساتھ ہی انہیں بعض مراحل پر سخت مزاحمت کا مقابلہ بھی کرنا پڑا۔ مثال کے طور پر جب وہ اسلامی ادب کے خلاف مہم چلا رہے تھے اس وقت محمد حسن عسکری، شوکت سبزواری، محمد شاہین اور ممتاز شیریں نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا اور لکھا کہ پاکستان کا ادب سوائے پاکستانی (اور اس حیثیت سے اسلامی) ہونے کے کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ ان کی یہ مہم کافی کامیاب رہی اور اسلامی ادب کے خلاف اشتراکیوں کی تحریک کا زور بڑی حد تک ٹوٹ گیا۔ اسی طرح ایک موقع پر جب بھارتی ادیبوں نے مسئلہ کشمیر کے سلسلے میں اپنی حکومت کے موقف کی حمایت کی تو پاکستان میں بھی یہ مطالبہ کیا گیا کہ پاکستانی ادیب اپنی حکومت کی حمایت کریں۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ روس مسئلہ کشمیر کے سلسلے میں پاکستان کا زبردست مخالف تھا لہٰذا پاکستانی ادیبوں کے لئے پاکستان کی حمایت آسان نہ تھی۔ شاید محمد دین تاثیر نے اس وقت ایک قرارداد کا مسودہ تیار کیا تھا

۲۴۔ ص۴۰، ۲۵۔ ص۳۱، ۲۶۔ ص۵۰، ۲۷۔ ص۶۰، ۲۸۔ سویرا

اور ان پر ادیبوں کو دستخط کرنے کی دعوت دی تھی جس سے بہت سے ادیب بے نقاب ہو گئے تھے۔ بالآخر اشتراکی ادیبوں نے پس و پیش کے بعد "ریاست" سے وفاداری کا اعلان کیا تھا۔ اشتراکی ادیب اپنے مقاصد کے حصول کے لئے ادب کو دو طرح سے استعمال کر رہے تھے۔ ایک مثبت طور پر اشتراکی نظریئے کی تبلیغ کے لئے اور دوسرے پاکستان کے اسلامی معاشرے کی اقدار کی بیخ کنی کے لئے۔ جن رجحانات کو یہ لوگ اپنے افسانوں، ناولوں اور نظموں میں تقویت دیتے تھے ان میں جنس پرستی، مذہب سے بے زاری، الحاد، دہریت خاص طور پر اُن کے پیش نظر تھے۔

صحافت کے محاذ پر میاں افتخار الدین اشتراکیوں کے بہت کام آئے۔ میاں صاحب قیام پاکستان سے پہلے ہی کچھ ایسے خیالات کا اظہار کر چکے تھے جن سے بائیں بازو کے افراد کی ترجمانی ہوتی تھی۔ پنجاب کی پہلی کابینہ میں وہ وزیر مہاجرین بھی رہے لیکن کہا جاتا ہے کہ انہیں ان کے اشتراکی نظریات کی بنا پر وزارت سے علیحدہ کیا گیا اور مسلم لیگ سے نکالا گیا۔ بہر حال میاں صاحب نے فروغ اشتراکیت کے لئے جو اہم ترین کام کیا وہ پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے نام سے ایک ادارے کا قیام تھا۔ اس ادارے کے تحت تین جریدے پاکستان ٹائمز، امروز اور لیل و نہار شائع کئے گئے اور تینوں نے کھلم کھلا اشتراکیت کا پرچار کیا۔ اسلام کے خلاف آواز بلند کرنا آسان نہ تھا۔ لہذا اس کے خلاف ڈھکے چھپے حربے استعمال کئے گئے اور اس اہم "دشمن" پر ضرب کاری لگائی گئی۔ مارشل لا کے بعد میاں صاحب کا ادارہ اشتراکیت کی تبلیغ کا مرکز تو نہیں رہا لیکن بہت سے لوگ اس میں کام کرنے کے بعد ادھر ادھر بکھر گئے ہیں — اور یہ لوگ اشتراکیت کے پرخلوص مبلغ ہیں۔ ادبی جرائد کی طرح ان تینوں اخبارات نے بھی صحافت کو ایک خاص راہ پر لگایا اور باصلاحیت ذہنوں میں اشتراکیت کے بیج ڈالے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آج تقریباً تمام ادبی رسائل، اخبارات اور ریڈیو اسٹیشنوں میں اشتراکیت زدہ افراد کام کرتے ہیں۔ یہ لوگ اخبارات میں اپنے مخصوص مناصب سے فائدہ اٹھا کر اشتراکی نظریات کو فروغ دے رہے ہیں۔ پاکستان اور بیرون پاکستان کے اشتراکی رہنماؤں کے بیانات کو نمایاں طور پر شائع کرتے ہیں۔ اسلامی تحریکات کے خلاف پروپیگنڈہ کی مہم کو تقویت دیتے ہیں۔ فحش اور اخلاق سے گری ہوئی تصاویر اور مضامین شائع کر کے عوام کو بے راہ روی کی روش پر ڈالتے ہیں۔

اشاعتی اداروں میں پیپلز پبلشنگ ہاؤس کے قیام کی داستان اور اس کے لئے بیرون ملک سے اعانتوں کے سلسلے کی کہانیاں اب تو سب کو معلوم ہو چکی ہیں۔ اس ادارے نے سستا بلکہ بہت سستا اشتراکی لٹریچر شائع کیا۔ شروع شروع میں (ایک روایت کے مطابق) یہ ادارہ اپنے بیرونی کرم فرما آقاؤں کو بھی ایک مدت تک کچھ دیتا رہا۔ لیکن آج کل ایک بار پھر اپنے فرائض پوری تندہی سے انجام دے رہا ہے۔

مشرقی پاکستان میں بھی وہاں کے تقریباً تمام پرچوں پر اشتراکی صحافی چھائے ہوئے ہیں۔ سنگباد ان کا سب سے موثر نقیب تھا لیکن دوسرے تمام پرچوں میں حتیٰ کہ پاکستان مسلم لیگ (کنونشن) کے سرکاری ترجمان تک پر اشتراکی اہل قلم چھائے ہوئے ہیں اور ان کے اداریوں میں بائیں بازو کی کھلی کھلی تائید ہوتی ہے۔ مشرقی پاکستان میں بیرون ملک سے درآمد شدہ لٹریچر بھی بہت بڑے پیمانے پر پھیلایا جا رہا ہے۔ روس، چین اور بھارت کے طبع شدہ لٹریچر کا ایک سیلاب ہے جو وہاں موجزن ہے۔ کسی بھی بک اسٹال پر جا کر دیکھا جا سکتا ہے کہ وہ اشتراکی رسائل و جرائد اور کتب سے بھرا پڑا ہے۔

سیاست کے محاذ پر پابندی لگنے سے پہلے تک اشتراکی پارٹی کے پاس اپنا پلیٹ فارم موجود تھا جسے اپنے نظریات کی اشاعت کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ پابندی لگنے کے بعد جب یہ آسائش چھن گئی تو کمیونسٹ عناصر نے زیر زمین رہ کر کام

کرنا شروع کیا۔اس طرح ان کے لئے کوئی اہم تبدیلی نہیں ہوئی لیکن ملک کے لئے زیادہ خطرناک صورت حال پیدا ہو گئی۔

سیاست کے میدان میں اشتراکی عناصر کو مشرقی پاکستان میں بہتر مواقع حاصل رہے ہیں۔اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ مشرقی پاکستان میں مفلسی زیادہ ہے اور بربنائے مفلسی عوام میں اپنے دین کا مطالعہ کرنے کی نہ فرصت ہے اور نہ ان کے پاس ضروری کتابیں خریدنے کے لئے پیسہ ہے۔اس کے علاوہ مشرقی پاکستان میں اسلامی نظریات کی اشاعت کے لئے کافی رسائل وجرائد بھی موجود نہیں ہیں۔اور بنگلہ زبان میں اسلامی لٹریچر نہ ہونے کے برابر ہے۔

کمیونسٹ پارٹی پر پابندی عائد ہونے کے بعد اشتراکی عناصر نے ملک میں جو کچھ کیا ہے' وہ سب کچھ ذہانت سے کیا گیا ہے۔اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ الزام ان کے نام پر براہ راست تھوپا نہیں جاسکتا۔تاہم واقعات کا انداز کچھ اس قسم کا ہے یہ سب کچھ کمیونسٹوں کی اسٹرٹیجی کے عین مطابق ہے۔یہ واقعات عوام کو حکومت سے بدظن کرنے کے ہیں' خون ریزی کے ہیں' انتشار پھیلانے کے ہیں اور لوگوں کو گو مگو کی کیفیت میں مبتلا کرنے کے ہیں —— تاکہ انہیں فلاح صرف کیمونزم میں نظر آنے لگے۔

راولپنڈی سازش کیس

اشتراکیوں کو پاکستان میں سب سے بڑا مقابلہ عوام کی اسلام پسندی سے درپیش رہا ہے۔صحافت اور ادب کے میدانوں میں سخت ترین ہنگاموں کے بعد جب حکومت نے انجمن ترقی پسند مصنفین اور کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگادی تو اشتراکی عناصر کو صاف نظر آگیا کہ انہیں اقتدار حاصل کرنے کے لئے کچھ دوسرے ہتھکنڈے بھی استعمال کرنے ہوں گے اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے فوجی انقلاب برپا کرنے کا منصوبہ بنایا۔فوج میں اپنے حامی عناصر تلاش کئے۔انہیں مجتمع کیا اور باقاعدہ سازش کی راہ ہموار کی گئی۔خوش قسمتی سے یہ چیز قبل از وقت منظر عام پر آگئی۔جو فوجی افسران اور غیر فوجی اشتراکی عناصر اس میں ملوث تھے ان کے خلاف فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا اور جنوری ۱۹۵۳ء میں انہیں سخت سزائیں دے کر ملازمت سے علیٰحدہ کر دیا گیا۔میجر جنرل اکبر خاں کو بارہ سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔گروپ کیپٹن ایم کے جنجوعہ اور میجر حسن خاں کو سات سات سال کی سزائے قید بامشقت ہوئی۔ان کے علاوہ بریگیڈیر ایم اے لطیف' میجر ضیاء الدین اور کیپٹن نیاز محمد کو پانچ پانچ سال کی سزائے قید بامشقت دی گئی۔غیر فوجی عناصر میں فیض احمد فیض (ایڈیٹر پاکستان ٹائمز) مسٹر محمد حسین عطا اور سابق کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری سجاد ظہیر کو چار چار سال قید کی سزا ہوئی[ط] بعد میں سجاد ظہیر پاکستانی پاسپورٹ پر بھارت گئے اور لوٹ کر نہیں آئے۔

اس مقدمہ میں فوجی افسران کے ساتھ غیر فوجی اور اشتراکی عناصر کے ملوث ہونے سے عوام کی آنکھیں کھل گئیں۔لیکن چونکہ اشتراکی پارٹی —— عام قسم کی سیاسی پارٹیوں سے جدا نوعیت کی ہوتی ہے لہذا اس پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔اشتراکی عناصر کے لئے بہت سی چالوں میں سے ایک چال تھی جس میں کامیابی نہیں ہوئی۔

زبان کے مسئلہ پر فسادات

زبان کا مسئلہ تو ہر قوم کے لئے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔قوم کے دانشور اس کا پورا شعور رکھتے تھے اور پاکستان کے خصوصی حالات کے مطابق اس مسئلہ کو حل ہونا چاہئے تھا۔لیکن اشتراکی عناصر نے مسئلہ کی نزاکت کو محسوس کر کے اسے اپنے لئے جگہ پیدا کرنے کا ذریعہ بنایا اور افہام وتفہیم اور سیاسی گفت وشنید کے بجائے خون

ط روزنامہ جنگ ۷ جنوری ۱۹۵۳ء

خرابے اور تصادم و تشدد کا دروازہ کھولا۔ ایک طرف قوم کے مختلف طبقات میں لسانی تعصبات کو ہوا دینی شروع کی اور دوسری طرف مشرقی پاکستان میں فساد کی آگ کو بھڑکایا۔ نتیجۃً وہ مسئلہ جو سیاسی اور ثقافتی عمل کے ذریعہ حل ہونا چاہیئے تھا، ملک کے دونوں حصوں میں بُعد پیدا کرنے کا ذریعہ بن گیا اور فسادات کی آگ بھڑکا کر معاملہ کو اور بھی الجھایا گیا۔ اور یہی ہے اشتراکیوں کے کام کا اصل طریقہ کہ وہ ہر موقع سے اپنے لئے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ طلباء میں اشتراکیوں کا اثر تھا لیکن اس مسئلہ کو بنیاد بنا کر غیر اشتراکی اور محب وطن عناصر کو بھی ورغلایا گیا اور ہنگامہ آرائی شروع ہوگئی۔ اس مقصد کے لئے طلباء کے ایک گروہ کی عصبیت کو مشتعل کرکے اسے حکومت سے بھڑوا دیا گیا۔ پولیس نے طلباء کو منتشر کرنے کے لئے گولی چلانے کی حماقت کی جس کے نتیجے میں تین طالب علم ہلاک اور متعدد مجروح ہوئے۔ اس واقعہ نے ایک طرف تو طالب علموں میں ہیجان پیدا کردیا، دوسرے باقاعدہ اشتراکی عناصر کو انہیں استعمال کرنے کا موقع مل گیا۔

اس حادثے کے نتیجے میں زبان کا مسئلہ ایک پیچیدہ قومی مسئلہ بن گیا۔ بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے متعدد لیڈر خم ٹھونک کر میدان میں آگئے۔ طالب علموں سے یوم شہداء منوایا گیا جس پر ایک بار پھر نو طلباء زخمی ہوئے اور ڈھاکہ و راج شاہی میں گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ اشتراکی عناصر اور عوامی لیگ کی جانب سے کرائے جانے والے یہ ہنگامے مجلس دستور ساز کے اس فیصلے پر ختم ہوئے جس کی رُو سے اردو کے ساتھ بنگلہ کو بھی پاکستان کی قومی زبان قرار دیا گیا ہے۔

خون ریز فسادات

مغربی پاکستان میں اسلام پسند عناصر کی کثرت کی بنا پر اشتراکی کوئی بہت بڑا ہنگامہ کرانے میں کامیاب نہیں ہوئے لیکن مشرقی پاکستان میں حالات بہت مختلف تھے۔ اول تو اشتراکی عناصر خود ہی بہت سرگرم تھے، دوسرے ایسے ہندو اساتذہ کی کمی نہ تھی جو طالب علموں کو اسلام اور پاکستان کے خلاف بھڑکاتے تھے۔ ان اسباب کی بنا پر بنگالی و غیر بنگالی منافرت کا پودا اگا اور بڑھتا چلا گیا۔ پھر کلکتہ جو بھارت میں اشتراکی سرگرمیوں کا اہم مرکز تھا، بالکل قریب ہی تھا اور وہاں سے ہدایات اکثر آتی رہتی تھیں۔ زبان کے مسئلے کے سلسلے میں جو ہنگامے ہوئے ان سے اشتعال اور بڑھ گیا۔ ۱۹۵۴ء کے دوران مشرقی پاکستان میں جگہ جگہ مہاجرین اور مقامی آبادی کے گروہوں میں خون ریز تصادم ہوئے۔ پہلا فساد آدم جی جوٹ ملز میں ہوا۔ بنگالی مزدوروں نے غیر بنگالی مزدوروں کے خلاف قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا۔ اس کے بعد نارائن گنج ورکشاپ، کھلنا ماچس فیکٹری، کرنا فلی پیپر ملز اور آدم جی جوٹ ملز نارائن گنج میں خون ریز فسادات ہوئے۔ کرنا فلی پیپر ملز اور آدم جی جوٹ ملز نارائن گنج میں ہونے والے فسادات کے بارے میں بعد میں ملنے والی اطلاعات سے ثابت ہوگیا کہ یہ سب کچھ باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ کیا گیا۔ ان فسادات میں غیر بنگالی مزدوروں کے علاوہ متعدد غیر بنگالی افسروں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ آدم جی جوٹ ملز کا فساد تو اس قدر شدید تھا کہ اس میں تقریباً دو سو افراد ہلاک ہوگئے۔ خون ریزی کا سلسلہ کئی گھنٹے جاری رہا اور مہلک ہتھیاروں کا آزادانہ استعمال کیا گیا۔

روزنامہ نوائے وقت (لاہور) نے ان فسادات پر تبصرہ کرتے ہوئے ۲۶ مارچ ۱۹۵۴ء کے اداریہ میں یہ بھی لکھا کہ کمیونسٹ یہ سب جان بوجھ کر رہے ہیں۔ انہوں نے متحدہ محاذ کے ہاتھوں مسلم لیگ کو شکست دلوائی اور اب چاہتے یہ ہیں کہ فضل الحق وزارت کے قدم بھی جمنے نہ پائیں۔

۱۔ روزنامہ تسنیم ۹ فروری ۱۹۵۲ء

وہ یہ سب کیوں چاہتے تھے ؟ اس کا جواب بالکل واضح ہے۔ ان کے طریقہ کار کا ایک بڑا اصول یہ ہے کہ اشتراکیوں کے سوا کسی کو حکومت نہ کرنے دو۔ اس اصول کی تکمیل کے لئے موجودہ حکومت پر شدید نکتہ چینی کرنا اور الجھاوٹ والی صورت حال پیدا کرنا وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

پروگریسو پیپرز کے اردو اخبار امروز نے فسادات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا۔

"مغربی پاکستان کے لیگی رہنما، مغربی پاکستان کے لیگی صحافی اور اہل قلم اور مغربی پاکستان کے دانشور اس حقیقت کو اپنی لوح ذہن پر نقش کا لجر کر لیں کہ مشرقی بنگال جنوب مشرقی ایشیا سے متاثر ہو رہا ہے اور اس صوبے کی سیاست کو جنوب مشرقی ایشیا کے پس منظر ہی میں سمجھا جا سکتا ہے" [۱۵]

امروز نے اس تبصرے کے ذریعے واضح طور پر یہ بات کہی ہے کہ مشرقی پاکستان اشتراکیت سے متاثر ہو رہا ہے اور اس صوبے کی سیاست کو اشتراکیت کی مدد ہی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ قیام پاکستان کے صرف سات سال بعد ملک کے ایک حصے کی یہ حالت ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ مشرقی پاکستان میں اشتراکیوں کی مشینری زور و شور سے کام کر رہی تھی اور اسے تیزی سے کامیابیاں بھی حاصل ہو رہی تھیں۔

فسادات کے بعد مشرقی پاکستان کے اشتراکیوں اور بائیں بازو کی طرف رجحان رکھنے والے لیڈروں نے خون ریز واقعات کو اپنی دکان سیاست چمکانے کے لئے استعمال کیا۔ پاکستان کی سالمیت کے خلاف نعرے بلند کئے گئے اور یہ بانگ دہل اعلان کیا گیا کہ اگر مرکز نے سخت پالیسی اختیار کی تو خانہ جنگی چھڑ جائے گی۔

طریق انتخاب کا مسئلہ

۱۹۵۶ء میں چودھری محمد علی کی کوششوں کی بنا پر ملک کا دستور تو بن گیا لیکن اس میں چونکہ طریق انتخابات کا مسئلہ معلق چھوڑ دیا گیا تھا لہذا گو چہ سیاست کے فتنہ پردازوں کو ہنگامے کرانے کا ایک اور موقع ہاتھ آگیا۔ اسلام دشمن عناصر جن میں اشتراکی بھی شامل تھے "مخلوط انتخابات" چاہتے تھے۔ یہ طریقہ انتخاب نظریۂ پاکستان ہی کی نفی کرتا تھا۔ لہذا تمام محبان وطن مخلوط انتخاب کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ قومی اسمبلی اور اس سے باہر زبردست رسہ کشی ہوئی لیکن حکومت مخلوط تھی اور عوامی لیگ کے لیڈر مسٹر سہروردی وزیر اعظم تھے۔ لہذا جداگانہ انتخاب کے عوامی مطالبے کو بزور طاقت دبا دیا گیا۔ مسٹر سہروردی پر دباؤ ڈالنے والوں میں خود ان کی پارٹی میں انتہائی بائیں بازو کے لوگ شامل تھے۔

۱۱ اور ۱۲ اکتوبر ۱۹۵۶ء کی درمیانی شب میں قومی اسمبلی نے مغربی پاکستان کے لئے جداگانہ اور مشرقی صوبے کے لئے مخلوط طریق انتخاب کا بل منظور کر لیا۔ اس بل کی منظوری تمام اسلام دشمن عناصر کی سخت ترین جدوجہد کا نتیجہ تھی۔ ان عناصر میں اشتراکی خاص طور پر شامل تھے۔ ان کے کیمپ سے جداگانہ طریق انتخاب کی مخالفت محض اس وجہ سے تھی کہ اس طریقہ کی بنیاد مذہب پر تھی اور مذہبی انداز فکر کی ان کے ہاں کوئی گنجائش نہیں۔

اسلام دشمن عناصر کی اس فتح پر بھارت کے مشہور روزناموں جن میں تیج دہلی، سٹیٹسمین، ہیرالڈ لکھنؤ اور لیڈر الہ آباد نے انتہائی

---

[۱۵] روزنامہ امروز ۲۵ / ۲۷ مارچ ۱۹۵۴ء

مسرت کا اظہار کیا۔ انہوں نے لکھا آج یہ بات ثابت ہو گئی کہ دو قومی نظریہ حقیقت سے بالکل دور تھا۔

طریق انتخابات کا بل منظور ہونے کے بعد انتخابات کی تاریخ مقرر ہوئی۔ ساری پارٹیوں نے اپنی اپنی مہم کا آغاز کیا۔ لیکن تخریب پسند عناصر نے وہ راستہ اختیار کیا جس پر، اکتوبر ۱۹۵۸ء کو مارشل لا کی منزل آ گئی۔

نیشنل عوامی پارٹی

پاکستان کی موجودہ سیاسی پارٹیوں میں نیشنل عوامی پارٹی کو طور پر بائیں بازو کی جماعت سمجھی جاتی ہے۔ اس کا قیام ۲۶ جولائی ۱۹۵۷ء کو عمل میں آیا تھا۔ اس سے چار سال قبل ۱۹۵۳ء میں باقاعدہ کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگائی گئی تھی۔ پابندی لگنے کے بعد اشتراکی عناصر کام تو وہی کر رہے تھے جو انہیں پارٹی کے بحال ہونے کی صورت میں کرنا تھا لیکن ان کے پاس کوئی ایسا پلیٹ فارم نہ تھا جس سے وہ برسر عام قومی مسائل پر اظہار خیال کریں اور ڈھکے چھپے الفاظ میں مخصوص نظریات کی تشہیر ہو۔ چنانچہ باقاعدہ کمیونسٹ پارٹی کے کالعدم قرار دیئے جانے کے بعد اشتراکی عناصر نے پنجاب میں آزاد پاکستان پارٹی اور سندھ میں ہاری پارٹی قائم کی۔ اس کے علاوہ کچھ افراد سرخ پوش جماعت، عوامی لیگ اور گنا تنتری دل میں شامل ہو گئے۔ اس وقت سیاسی میدان میں ان کے لیڈر میاں افتخار الدین، میاں محمود علی قصوری، سی آر اسلم، ایرک سپرین، غلام محمد ہاشمی، رائے جمہور اختر جی ایم سید، حیدر بخش جتوئی، عبدالصمد اچکزئی، کسی حد تک خان عبدالغفار خاں، شیخ مجیب الرحمٰن اور مولانا عبدالحمید خاں بھاشانی تھے مولانا عبدالحمید خاں بھاشانی عوامی لیگ میں بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے افراد کے رہنما تصور کئے جاتے تھے ۱۹۵۷ء کے دوران عوامی لیگ کے لیڈر مسٹر سہروردی سے ان کے اختلافات بڑھ گئے تھے۔ ان ہی دنوں انہوں نے ڈھاکہ میں کل پاکستان جمہوری کانفرنس منعقد کی اور اپنے ساتھیوں سمیت عوامی لیگ سے نکل جانے کا فیصلہ کیا۔ جمہوری کانفرنس میں مغربی پاکستان کی آزاد نیشنل پارٹی بھی شریک تھی۔ اس پارٹی کے اشتراک سے نیشنل عوامی پارٹی قائم کی گئی جس کے لیڈر مولانا بھاشانی منتخب کئے گئے خان عبدالغفار خاں پارٹی کی شاخ مغربی پاکستان کے لیڈر منتخب ہوئے۔

اس پارٹی کے قیام کے بعد ایک طرف تو بائیں بازو کے بہت سے افراد کو (جو اس میں شامل ہوئے) ایک پلیٹ فارم ہاتھ آ گیا اور دوسری طرف اس میں خان عبدالغفار خاں کی شرکت سے مغربی پاکستان میں کام کا آغاز ہوا۔ اس وقت تک میدان سیاست کے اشتراکیوں کو مغربی پاکستان میں خان عبدالغفار خاں جیسے بڑے پہاڑ کی آڑ نصیب نہ ہوئی تھی۔ خان بادشاہ کی سرخ پوش تحریک نے انگریزوں کے خلاف جدوجہد آزادی میں قابل قدر خدمات انجام دی تھیں لیکن قیام پاکستان کے بعد ان کے کچھ اقدامات پاکستان کے خلاف تھے اور مارشل لا لگنے سے کچھ ہی قبل پہلے آزاد نیشنل پارٹی میں اور پھر نیشنل عوامی پارٹی میں ان کی شرکت ایک ایسا ہی اقدام تھا۔

نیشنل عوامی پارٹی میں شرکت کے بعد مطالبہ پختونستان کو بہت سے دوسرے وکیل اور کارکن ہاتھ آ گئے چنانچہ ۱۹۵۶ء ۱۹۵۷ء اور ۱۹۵۸ء میں مارشل لا لگنے تک پختونستان کے مطالبہ کی گونج مختلف کونوں کھدروں سے سنی جانے لگی۔ خان عبدالغفار خاں نے خود جو کچھ کیا وہ گرفتاریوں اور رہائیوں کی ایک طویل داستان ہے۔ ستمبر ۱۹۵۸ء میں ان کے حامیوں نے روزنامہ انجام پشاور کے دفتر پر جابر نوازی کے الزام میں دھاوا بولا اور توڑ پھوڑ کی۔ ان کی سرگرمیوں سے قطع نظر جو چیز زیادہ اہمیت کی حامل ہے وہ یہ ہے کہ مولانا بھاشانی اور ان کے ٹولے کے دوسرے افراد بھی بڑھ چڑھ کر پختونستان کے مطالبے کو جائز قرار دینے

لگے۔ چوک یادگار پشاور میں انہوں نے جلسۂ عام میں اعلان کیا کہ اگر پنجابیوں کے علاقے کو پنجاب اور سندھیوں کے علاقے کو سندھ کہا جا سکتا ہے تو پختونوں کے علاقے کا نام پختونستان رکھنے میں کیا ہرج ہے[1]۔

اس کے چند ہی ماہ بعد خان عبدالغفار خاں نے کراچی کے ایک جلسہ عام میں کہا کہ برطانیہ کی ساختہ پرداختہ انتظامیہ ہمارا (یعنی پختونستان) کا راستہ نہیں روک سکتی اور اگر ہمارے ساتھ انصاف نہ کیا گیا تو پٹھانوں کے لئے لڑنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہے گا نیشنل عوامی پارٹی پشاور کے صدر صدیق خاں نے کہا کہ پختونستان پر پختونوں کا پیدائشی حق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کمیونسٹوں کی طرف سے پختونستان کا مطالبہ پختونوں کے لئے نہیں بلکہ روس کے لئے کیا جا رہا تھا۔ "پختونستان" ان کے نزدیک تاشقند، سمرقند اور بخارا کی طرح روس کی ایک اور "ری پبلک" بن جاتی جس کے راستے سے برصغیر تک اس کا پہنچنا سہل ہو جاتا۔

پختونستان کے مطالبے کی ہر ممکن حمایت کے علاوہ نیشنل عوامی پارٹی کے پلیٹ فارم سے متعدد ایسے اعلانات ہوتے جو پاکستان کی سالمیت کے منافی تھے۔ مارچ ۱۹۵۸ء میں مولانا عبدالحمید خاں بھاشانی نے مشرقی پاکستان اسمبلی کے ارکان سے اپیل کی کہ وہ مکمل صوبائی خود مختاری کے لئے جدوجہد کریں[2]۔ مئی ۱۹۵۸ء میں انہوں نے دھمکی دی کہ اگر مرکز نے مشرقی پاکستان کی مدد نہ کی تو یہ صوبہ وفاق سے علیحدہ ہو جائے گا۔ اس وقت جبکہ اس طرز کے بیانات جاری کئے جا رہے تھے ملک کے عام انتخابات صرف چار پانچ ماہ دور تھے۔ ان انتخابات میں اسلام پسند عناصر کی فتح کے امکانات بہت روشن تھے لہذا اشتراکی عناصر سخت ترین جدوجہد کر کے حالات کو بد سے بدتر کر رہے تھے۔ خاص طور سے مشرقی پاکستان میں نچلے درجے کی سیاسی سرگرمیاں جاری تھیں اور یہ سب کچھ ایک بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

مارشل لا کے دوران تمام سیاسی پارٹیاں کالعدم رہیں لیکن اشتراکی عناصر اپنے کاموں میں مصروف رہے۔ اول تو ان کے اخبارات (پاکستان ٹائمز اور امروز) کسی نہ کسی طرح اپنا کام کرتے رہے، دوسرے ادبی رسائل میں ان کی مہم تیز ہو گئی اور تیسرے انہوں نے ثقافتی میدان میں اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ رائٹرز گلڈ پر قبضہ کیا۔ عائلی قوانین کی حمایت میں پورا زور صرف کیا۔ پاکستانی ثقافت کو اسلامی تہذیب سے کوئی علیحدہ چیز قرار دیا[3]۔ چین سے دوستی کی ضرورت پر ضرورت سے زیادہ زور دیا اور صدر مملکت کے مقرر کردہ پاکستان آئین کمیشن پر لادین دستور بنانے کے لئے ہر ممکن زور ڈالا۔

مارشل لا اٹھنے کے بعد جب اعلان کیا گیا کہ اب سیاسی پارٹیاں خود کو بحال کر سکتی ہیں تو سب سے پہلے جماعت اسلامی نے کام شروع کیا۔ دوسری پارٹیاں مذاکرات کے باوجود فوری طور پر خود کو بحال نہ کر سکیں۔ اس موقع پر نیشنل عوامی پارٹی کا موقف

---

(۱) نوائے وقت ۲۶۔ اکتوبر ۱۹۵۷ء

(۲) روزنامہ کوہستان ۱۱۔ مارچ ۱۹۵۸ء (عوامی لیگ سے مولانا بھاشانی کی علیحدگی کی وجہ ان کے اپنے اعلان کے مطابق یہ تھی کہ مسٹر سہروردی صوبائی خود مختاری کے وعدے سے منحرف ہو گئے ہیں)

(۳) ملاحظہ ہو فیض احمد فیض کا مضمون "پاکستانی ثقافت"۔ یہ مضمون پہلے لیل و نہار میں شائع ہوا اور اس کے بعد موصوف کی کتاب "میزان" میں شائع ہوا ہے۔

یہ تھا کہ جماعت اسلامی بھی اپنا کام نہ کرے۔ بہرحال کچھ عرصے بعد سیاسی پارٹیاں رفتہ رفتہ بحال ہوئیں۔ سب سے آخر میں نیشنل عوامی پارٹی نے کام شروع کیا۔ ۱۹۶۴ء میں جب صدارتی انتخاب کا مرحلہ آیا تو نیشنل عوامی پارٹی کا ایک ایسا روپ سامنے آیا جو اس وقت چھپا ہوا تھا۔

پاکستان مسلم لیگ کے مقابلے کے لئے تمام مخالف پارٹیوں نے متحدہ محاذ بنا لیا تھا جس میں نیشنل عوامی پارٹی بھی شامل تھی۔ اب یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی ہے کہ صدارتی امیدوار تلاش کرنے کے سلسلے میں محاذ کو جس شدید مرحلے سے گزرنا پڑا اس میں نیشنل عوامی پارٹی کا رول کیا تھا۔ پارٹی کی کوشش یہ تھی کہ کوئی ایسا امیدوار منتخب نہ کیا جائے جس کے جیت جانے کا اندیشہ ہو۔ اس کے بعد پارٹی نے انتخابی مہم میں انتہائی سرد مہری کا مظاہرہ کیا۔ اس وقت جبکہ ساری پارٹیوں کے لیڈر اور کارکن سخت ترین جدوجہد میں مصروف تھے نیشنل عوامی پارٹی متحدہ محاذ میں شرکت کے باوجود علیحدہ تھی۔ پارٹی کے لیڈر مولانا عبدالحمید خاں بھاشانی نے پوری مہم کے دوران تین چار بیانات دینے سے زیادہ کچھ نہیں کیا۔ اس کے علاوہ اس دوران صدر مملکت سے ان کی متعدد ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ پارٹی کے ایک اور لیڈر مسیح الرحمان نے صدر کی انتخابی مہم میں ان کے استقبال کئے اور انہیں ہار پہنائے۔

متحدہ محاذ میں شریک ہونے کے بعد اسے اندر سے سبوتاژ کرنے کی تکنیک اشتراکی عناصر کے لئے کوئی نئی چیز نہ تھی۔ یہاں کا ایک طے شدہ اصول ہے کہ جب کسی مدمقابل سے باقاعدہ مقابلے میں جیت کا امکان نہ ہو تو اس کے ساتھی بن جاؤ اور آستین کے سانپ کی طرح اپنا مقصد حاصل کرو۔ ۱۹۶۴ء کی انتخابی مہم کے دوران نیشنل عوامی پارٹی کے رویہ سے اس نقطۂ نظر کی مکمل تصدیق ہوتی ہے۔ عین اس وقت جبکہ انتخابی مہم زوروں پر تھی مغربی پاکستان میں پارٹی کے لیڈر خان عبدالغفار خاں صرف آنکھوں کے علاج کے لئے انگلستان چلے گئے اور وہاں سے جلد ہی کابل آ گئے۔ وہاں سے انہوں نے پاکستان کے خلاف زہر آلود بیانات دیئے۔ این آئی پی اس کھیل سے جو مذموم مقصد حاصل کرنا چاہتی تھی وہ اس نے بخوبی حاصل کر لیا۔ عبدالغفار خاں نیپ کے لیڈر تھے اور نیپ متحدہ حزب اختلاف میں شامل تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ برسراقتدار پارٹی نے عبدالغفار خاں کے خلاف عوامی غم و غصے کا سارا وزن متحدہ حزب اختلاف کے پلڑے میں ڈال دیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ متحدہ حزب اختلاف نے عبدالغفار خاں سے لاتعلقی کا اظہار کر دیا لیکن نیپ کے ہونٹوں پر مہر سکوت ہی لگی رہی۔

انتخاب میں شکست کے بعد نیشنل عوامی پارٹی نے اسی طرح متحدہ محاذ کا مذاق اڑایا جس طرح خود سرکاری پارٹی اڑا رہی تھی۔ پارٹی کے ایک اہم عہدیدار چودھری رحمت اللہ اسلم نے نیپ کے ترجمان "آفاق" میں متحدہ محاذ کی متعدد پارٹیوں کو سامراج کا آلہ کار قرار دیا۔ انہوں نے انتخاب ہارنے کے بعد اعلان کیا کہ نیپ اور حزب اختلاف کی دوسری جماعتوں کے درمیان تعاون کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پارٹی کے ایک اور لیڈر مسٹر غوث بخش بزنجو نے نوائے وقت کو انٹرویو دیتے ہوئے متحدہ حزب اختلاف کی تین اہم پارٹیوں کونسل مسلم لیگ نظام اسلام پارٹی اور جماعت اسلامی کا مذاق اڑایا اور سوشلزم کے نفاذ کی کوشش کے مقابلے میں بحالی جمہوریت کی مہم کو بھی نمبر ۲ اہم قرار دیا۔ نیشنل عوامی پارٹی نے اس سے قبل بھی مشرقی پاکستان کی متعدد پارٹیوں سے اتحاد قائم کیا اور اس کے رویّہ کی بنا پر کوئی اتحاد کامیاب نہیں رہا۔

اعلان تاشقند کے بعد ملک کی تمام مخالف سیاسی پارٹیوں نے اس کے خلاف آواز بلند کی لیکن چونکہ روس اور روسی

وزیر اعظم کا معاملہ تھا لہذا نیشنل عوامی پارٹی اس وقت بھی عوامی ردِعمل سے علیحدہ اور آزاد رہی۔ بلکہ پارٹی کے سیکرٹری مسٹر عثمانی نے پارٹی کے کارکنوں سے اپیل کی کہ وہ عوام کے دلوں سے اعلان تاشقند کے بارے میں غلط فہمیاں دور کریں۔

اپنی ابتداء سے کر اب تک نیشنل عوامی پارٹی نے جو کردار ادا کیا ہے اس کا مجموعی تاثر روز نامہ کوہستان نے اپنے ایک اداریہ "نیشنل عوامی پارٹی کی حقیقت" کے عنوان سے پیش کیا ہے:-

"... نیشنل عوامی پارٹی کے متعلق ایک عام خیال یہ پایا جاتا ہے کہ وہ بڑی منظم .... اور با اصول جماعت ہے .... حالانکہ این اے پی نہ منظم ہے اور نہ با اصول .... اگر کسی جماعت کے منظم ہونے کا معیار اس بات کو قرار دیا جائے کہ سب سے زیادہ ذہنیں کس نے توڑوائی ہیں تو ان لوگوں کو ملک کا سب سے با اصول اور منظم عنصر قرار دینا پڑے گا جنہوں نے جماعتی وفاداریاں تبدیل کرنے میں سارے ریکارڈ توڑ دیئے ہیں اور جن کی غلط کاریوں نے ملک کے سیاسی اور انتظامی استحکام کو دیمک کی طرح چاٹ لیا ہے۔

.... مشرقی پاکستان میں اس جماعت پر زیادہ تر بائیں بازو والوں کا قبضہ ہے ....

.... البتہ ان کے درمیان ایک مسئلہ پر کامل اتفاق ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں سے ان کے اس گناہ کا مزور انتقام لیا جائے کہ انہوں نے ان کی خواہش اور دشمنی کے علی الرغم پاکستان کیوں بنایا .... ان کی سیاست کو کس طرح با اصول کہا جا سکتا ہے جب کہ ان کی گذر بسر بھی سودے بازیوں پر ہے"[1]

نیشنل عوامی پارٹی فی الاصل اشتراکی پارٹی نہیں ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس میں بائیں بازو کے افراد کو بڑی قوت حاصل ہے اور غالباً ان میں سے کچھ لوگ تو پہلے باقاعدہ اشتراکی رہے بھی ہیں اس پارٹی نے سوشلزم کے نام پر کچھ ایسے کام کئے ہیں جن سے اشتراکی مقاصد کی تکمیل ہوئی ہے۔ پارٹی کے بااثر افراد نے لوگوں کو حکومت کے خلاف مشتعل کیا ہے۔ انہیں مذہب سے دور لے جانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ہے اور جہاں تک ہو سکا ہے واقعات کو الجھانے کی سعی کی ہے۔ روس اور چین کی کشمکش کے بعد این اے پی بھی روس دوست اور چین دوست گروہوں میں بٹ گئی ہے۔ بھارت کی طرح یہاں بھی پارٹی کے بڑے بڑے لیڈر اور دانشور (جو روس جیسے امیر ملک کے انعام و اکرام سے اکثر مستفید ہوتے رہتے ہیں، کبھی اعلانیہ اور کبھی خفیہ) تو روس کے حامی ہیں اور پارٹی کے کارکن چین کے حامی۔

طلبا میں نفوذ

اشتراکی عناصر نے طلبا اور مزدوروں کو گمراہ کرنے کی کوشش سب سے زیادہ کی ہے۔ طلبا میں کام کا اہم مقصد یہ تھا کہ مستقبل میں اشتراکیت کی مہم کے لئے رضاکاروں کی کھیپ مل جائے ـــ اور طلبا میں ان کے لئے کام کرنا مشکل بھی نہ تھا۔ نوجوان ایک تو فطرتاً اشتعال پسند ہوتے ہیں اور دوسرے ان کی اکثریت نے دینی لٹریچر کا مطالعہ نہیں کیا ہوتا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اشتراکی پروپیگنڈے کے سامنے ٹھہر نہیں پاتے۔ ہمارے نظام تعلیم میں بھی نوجوانوں کو اچھا مسلمان بنانے کے لئے کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ یہ اسباب تھے جن کی بنا پر نوجوان اشتراکی پروپیگنڈے کا شکار ہوئے اور بعد میں ان ہی کے رنگ میں رنگ گئے۔ مشرقی پاکستان میں اشتراکی نظریات کی حامل طالب علم انجمنیں تمام بڑے شہروں میں موجود ہیں اور انہیں

---

[1] روز نامہ کوہستان ۲۲ اگست ۱۹۶۸ء

اشتراکی لیڈروں سے براہ راست رہنمائی حاصل ہے۔ مغربی پاکستان میں خالصتاً اشتراکی نظریات کی حامل کوئی طالب علم انجمن نہیں ہے تاہم نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن اشتراکیت زدہ نوجوانوں سے خالی کبھی نہیں رہی ہے چند سال قبل تک کراچی کی حد تک این ایس ایف بڑی جماعت تھی اور اسے بااثر تصور کیا جاتا تھا لیکن اب اس میں اتحاد باقی نہیں رہا ہے اور یہ بھی اپنی PARENT-BODY کی طرح روس دوست اور چین دوست حصوں میں بٹ گئی ہے۔ فیڈریشن کی نوعیت سمجھنے کے لئے یہ سامنے رکھنا ضروری ہے کہ اس کے بڑے بڑے عہدیدار آگے چل کر نیشنل عوامی پارٹی کے رکن بنے۔ فیڈریشن کو اب بھی ضروری رہنمائی کمیونسٹوں سے حاصل ہوتی ہے۔

مزدوروں میں نفوذ

مزدور اشتراکی تحریک کے لئے مفید ترین خام مواد کی حیثیت رکھتے ہیں چونکہ اشتراکیت کا سارا کاروبار ہی بے چارے مزدور کے نام پر چلتا ہے اس لئے مزدوروں کی ایک اچھی خاصی تعداد کو ساتھ ملانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مزدوروں کو ساتھ ملانے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ پورے ملک کی معاشی زندگی کی باگ ڈور پارٹی کے ہاتھ میں آجاتی ہے۔ انقلاب روس کی کہانی مزدوروں کی مکمل ہڑتال سے شروع ہوئی تھی — لہذا اشتراکی عناصر تمام ممالک میں یہ کام بھی کرتے ہیں کہ مزدوروں پر اپنا اثر قائم کر کے صنعت کے گھومتے ہوئے پہیے کو اپنے کنٹرول میں لے لیں اور جب چاہیں اسے روک کر پورے دباؤ کے ساتھ اپنا مطالبہ تسلیم کرائیں۔

پاکستان میں صنعتی ترقی کی ابتدا چونکہ کراچی سے ہوئی ہے لہذا مزدوروں کے اتحاد، ٹریڈ یونینزم اور ان میں اشتراکیت کے نفوذ کی ابتدا بھی کراچی سے ہوئی ہے۔

قیام پاکستان کے وقت کراچی میں ہند مزدور لیڈر ایم این رائے کا گروپ تھا جو اس کے بھارت چلے جانے سے بکھر گیا لیکن کراچی میں کچھ دوسرے افراد نے مل کر آل پاکستان کنفیڈریشن کی بنیاد ڈالی جس کے صدر مسٹر خطیب منتخب کئے گئے۔ اس میں تمام قسم کے عناصر شامل تھے تاہم اس کی پالیسی معتدل تھی۔ کچھ عرصہ بعد ایک اور جماعت پاکستان مزدور فیڈریشن قائم ہوئی۔ اس جماعت میں روس کے تربیت یافتہ کچھ افراد شامل تھے اور اس کے صدر کے خیالات مکمل طور پر اشتراکی تھے۔ اس پارٹی نے ریلوے پر اپنی توجہ مرکوز کر کے کام شروع کیا لیکن کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگنے کے بعد فیڈریشن ختم ہو گئی۔ مسٹر خطیب کی آل پاکستان کنفیڈریشن معتدل راہوں پر ۱۹۶۰ء تک گامزن رہی لیکن اس کے بعد اس میں رخنے پڑنے لگے۔ بالآخر مشرقی و مغربی پاکستان کے علیحدہ حصے ہو گئے اور مغربی پاکستان فیڈریشن آف لیبر کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے صدر بھی مسٹر خطیب تھے۔ کچھ ہی عرصہ بعد قیادت پر موقع پرستی کا الزام لگا کر کمیونسٹ عناصر علیحدہ ہو گئے۔ چنانچہ اب مسٹر خطیب نے ایک علیحدہ جماعت مغربی پاکستان فیڈریشن آف ٹریڈ یونین اور کمیونسٹوں نے علیحدہ جماعت مغربی پاکستان فیڈریشن آف ورکرز کی بنیاد ڈالی لیکن شاخ در شاخ تقسیم ہوتے رہنے کا عمل یہاں بھی رک نہیں سکا۔ جلد ہی کمیونسٹوں میں روسی اور چینی نظریات کا اختلاف شدید ہو گیا۔ چنانچہ دنیا بھر میں ہر جگہ کمیونسٹ دو گروہوں میں تقسیم ہوئے اور اسی اختلاف کی وجہ سے مغربی پاکستان فیڈریشن آف ورکرز کو چھوڑ کر چین کی پالیسی کو درست سمجھنے والے عناصر علیحدہ ہو گئے۔ انہوں نے مرکزی مزدور کمیٹی کی بنیاد ڈالی۔

اس وقت مغربی پاکستان میں مزدوروں کی یہ دو جماعتیں (مغربی پاکستان فیڈریشن آف ورکرز اور مرکزی مزدور کمیٹی)

اشتراکیوں کے ہاتھ میں ہیں۔ ان میں سے اوّل الذکر کا کام زیادہ پھیلا ہوا ہے اور اس نے شہر شاد میں ایک لیبر ویلفیئر سنٹر بھی کھول رکھا ہے جہاں من جملہ دوسرے کاموں کے اشتراکیت کی تبلیغ بھی ہوتی ہے۔ یہ لوگ کھلم کھلا اشتراکیت کا نام نہیں لیتے لیکن مزدوروں کو حکومت کے خلاف بھڑکاتے ہیں، مذہب کو مطعون کرتے ہیں اور جو مزدور معمولی سا پڑھنا لکھنا جانتے ہیں انہیں کمیونسٹ لٹریچر پڑھنے کے لئے دیتے ہیں۔

مغربی پاکستان فیڈریشن آف ورکرز کا کام یوں تو پورے مغربی پاکستان میں پھیلا ہوا ہے لیکن کراچی سے باہر ان کا سب سے بڑا اور اہم مرکز حیدرآباد ہے۔ حیدرآباد میں تنظیم کے پاس بے شمار کارکن ہیں جو زور شور سے اشتراکیت کا لٹریچر تقسیم کرتے ہیں۔ ان کے اتحاد کا عالم یہ ہے کہ پچھلے دنوں حیدرآباد کے ایک مل میں ہڑتال ہوئی تو چند ہی دنوں کے بعد ساری ملوں میں ہڑتال ہو گئی اور حکومت و مالکان کو مجبوراً ان کے مطالبات ماننے پڑے۔

فیڈریشن جس پالیسی پر خاص طور سے زور دے رہی ہے وہ یہ ہے کہ کراچی میں تبلیغ اشتراکیت کا کام کھلم کھلا اور زور شور کے ساتھ نہ کیا جائے۔ اس کے لئے وہ مناسب وقت کے انتظار میں ہے اور حالات ایسے ہیں کہ وہ وقت زیادہ دور نظر نہیں آتا۔

مرکزی مزدور کمیٹی کا کام فی الحال کراچی سے باہر نہیں ہے لیکن یہ خاص طور پر ایئرویز ایمپلائیز یونین پر توجہ دے رہی ہے۔ کراچی میں اس کے اہم مراکز پاکستان انٹرنیشنل ائیرلائنز لانڈھی کے متعدد مل، صنعتی علاقے کے کچھ مل اور مسلم کمرشل بنک ہیں۔ کمیٹی نے بھی مزدوروں میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کے لئے اچھا کام کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی نظریات کی تبلیغ کا کام جاری ہے اور مطالعے کے سرکل کام کر رہے ہیں۔ کمیٹی کا اہم مرکز پی آئی اے کی یونین ہے جو ایک ماہوار رسالہ "منشور" شائع کرتی ہے رسالے کی فائلیں اس امر کا ثبوت ہیں کہ اسے اشتراکی پروپیگنڈے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔

مزدوروں میں اشتراکی کام کیسے کرتے ہیں — یہ اس سوال کا جواب نہایت اہم ہے۔ اوّل تو خاص طور پر ان مزدوروں کو منتخب کیا جاتا ہے جو کم علم ہوں ظاہر ہے کہ انہیں دھوکہ دینا آسان ہوتا ہے۔ جن انجمنوں میں ان کی مخالفت ہوتی ہے، وہاں وہ انتظامیہ سے ساز باز کر لیتے ہیں اور بعض اوقات خون ریزی اور قتل و غارت گری تک پر اتر آتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ عرصۂ دراز تک انہیں مزدوروں میں کام کرنے کی کھلی چھٹی مل رہی ہے اور ان کے مقابلے میں محب وطن عناصر کو کام کرنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا

مزدوروں پر سب سے زیادہ توجہ دے کر اشتراکی عناصر حصول اقتدار کی منزل کو قریب تر کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ ملک بھر کے مزدوروں کو اپنے کنٹرول میں لے کر ایک دن اچانک سب کاروبار روک دیا جائے، طیاروں کی سروسیں رک جائیں، ریل گاڑیاں ٹھہر جائیں، کارخانوں میں گھومتی ہوئی پلیاں ساکت ہو جائیں — اور یہ رواں دواں ملک خود بھی ایک جھٹکے کے ساتھ ٹھہر جائے۔ پھر سرخ پرچم بلند کیا جائے۔ کچھ خانہ جنگی ہو اور اقتدار ان کے ہاتھ لگ جائے

مشرقی پاکستان میں ان کا طریقہ کار نہ مختلف ہے اور نہ سست رو۔ وہاں کی تمام سیاسی پارٹیوں کا ایک ایک سب ڈویژن مزدوروں میں کام کرتا ہے اور ان جماعتوں میں اشتراکی خیالات کے لوگ بہت زیادہ ہیں۔ خاص طور پر نیشنل عوامی پارٹی اور عوامی لیگ کے اشتراکیت زدہ افراد مزدوروں میں ان ہی مقاصد کے لئے کام کر رہے ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

طریقۂ کار :- اشتراکیوں کے طریقۂ کار کے بارے میں کوئی بات مکمل وثوق سے نہیں کہی جا سکتی۔ ان کے کام کا انداز بظاہر

جس قدر بھیانک اور خطرناک نظر آتا ہے بہ باطن وہ اس سے کم تو نہیں لیکن زیادہ خطرناک ہو سکتا ہے۔ ان کے پاس تمام ممکنہ وسائل کے علاوہ متعدد ممالک میں کام کا تجربہ ہے جو قدم قدم یہاں کی رہنمائی کرتا ہے۔

پاکستان میں ان کو جس بڑی مشکل کا سامنا ہے وہ عوام کی مذہب پسندی ہے۔ ہمارے عوام مذہب سے خواہ کتنے ہی دور کیوں نہ ہوں، اشتراکیوں کی راہ پر کافی آگے نکل جانے کے بعد بھی جب انہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ مذہب کے خلاف ہے تو وہ چشم زدن میں اپنی جگہ واپس آجاتے ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستان میں احیائے دین کی جو منظم کوششیں ہو رہی ہیں، وہ بھی کمیونسٹوں کی راہ میں حائل ہیں۔

بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ پاکستان میں اشتراکی عناصر دوہری جنگ کر رہے ہیں۔ ایک طرف وہ مذہب کے خلاف نبرد آزما ہیں اور دوسری طرف حکومت کے خلاف۔ مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو مذہب سے دور کرکے اور حکومت کو ناکارہ ثابت کرکے عوام کو یہ سوچنے پر مجبور کیا جائے کہ نجات صرف کمیونزم میں ہے۔

مذہب کے خلاف جنگ میں ان کی مشکل یہ ہے کہ وہ براہ راست مذہب کو مطعون نہیں کر سکتے کیونکہ عوام کے جذبات بہت ہی نازک ہیں چنانچہ وہ دوسرے طریقوں سے مذہبی تعلیمات کی نفی کرتے ہیں۔ اول تو ادبی رسائل میں بے مقصد مقالات، فحش افسانوں اور رومانی غزلوں کی مہم جاری ہے۔ مقالات میں مذہب کو رجعت پسندی وغیرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ فحش افسانوں میں وہ سب کچھ بیان کیا جاتا ہے جسے پڑھ کر نوجوان دینی کتب سے بیزار ہوتے ہیں اور رومانوی غزلیں ان کے اطراف رومان کا جال پھیلا دیتی ہیں۔ ادب کے علاوہ انہوں نے ثقافت کے عجیب و غریب مطلب وضع کئے ہیں۔ ان کی صفوں کو کچھ افراد پاکستانی ثقافت کا رشتہ اسلام سے توڑ کر اس خطۂ ارضی سے جوڑتے ہیں جہاں اس وقت پاکستان قائم ہے۔ پھر ثقافتی تقریبات کا ایسا سلسلہ شروع کیا گیا ہے جو صرف ناچ رنگ کے لئے مخصوص ہے۔ ان کی زبردست مہم کی وجہ سے اب ہر جگہ ایسے افراد موجود ہیں جو مذہب کا نام آتے ہی یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ کسی نے انہیں صدیوں پیچھے کی طرف دھکیل دیا۔ اخبارات اور ریڈیو سے دین سے متعلق مواد کم سے کم تر پیش کیا جاتا ہے اور وہ بھی محض اس لئے کہ اگر اس کا سلسلہ بالکل ہی بند کر دیا گیا تو لوگ چیخ اٹھیں گے۔

اس کے علاوہ عوام کے دلوں میں اسلام کی قدر کم کرنے کے لئے وہ اختلافات کو بھی ہوا دیتے ہیں۔ اسلامی دستور کا نام آتا ہے تو وہ کہتے ہیں کون سے فرقے کے نظریات کے مطابق دستور بنایا جائے۔ کبھی اسلام کو جاگیر داروں اور سرمایہ داروں کا حامی قرار دے دیا جاتا ہے اور کبھی نام نہاد مولویوں کے اعمال پر تنقید کرکے اسلام کو مطعون کرنا شروع کر دیا جاتا ہے۔

حکومت کے خلاف کام سے ان کا مقصد یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ انتشار پیدا کیا جائے۔ خون ریز فسادات کرائے جائیں ہر معاملے کو الجھایا جائے اور جس طرح بھی ممکن ہو حکومت کو مطعون کیا جائے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ یہ سب کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے ہیں۔ ان کے کارکنوں نے دوسروں کو اشتعال دلا کر چھوٹے چھوٹے مسائل کو الجھایا اور ان پر خون ریز فسادات کرائے۔ وہ اکثر مسائل کے حل کے لئے متحدہ محاذ میں شامل ہوئے اور ہمیشہ ایفائے عہد سے پھر گئے۔

روزنامہ کوہستان (۲۴ اگست ۱۹۶۸ء) نے اپنے اداریہ میں ان کی ان سرگرمیوں کو بے نقاب کیا ہے۔ ۱۹۶۵ء کے صدارتی انتخاب میں بھی نیشنل عوامی پارٹی نے وہی رول ادا کیا جو کمیونسٹ چاہتے تھے، اور اس وقت یہ پارٹی بھی متحدہ

حزب اختلاف میں شامل تھی۔

کشمیر جیسے اہم مسئلے پر اشتراکی عناصر نے عرصۂ دراز تک پاکستان کا ساتھ نہیں دیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ روس اس مسئلے میں بھارت کا حامی تھا اور روس کی حمایت کے خلاف کوئی کام کرنا اشتراکیوں کے بس سے باہر تھا۔

۱۹۵۴ء میں مشرقی پاکستان کے خون ریز فسادات پر پورا پاکستان حیرت و استعجاب میں ڈوب گیا تھا۔ وزیر اعظم محمد علی بوگرہ نے ایک بیان میں کہا تھا:۔

"ہماری اطلاع کے مطابق نارائن گنج کے ہنگاموں میں کمیونسٹوں اور پاکستان دشمن عناصر کا ہاتھ تھا[1]..."

۱۱۔ اور ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۵۶ء کی درمیانی شب میں قومی اسمبلی نے جو انتخابی بل منظور کیا تھا وہ بھی کمیونسٹوں کی مرضی کے عین مطابق تھا۔ جو لوگ جداگانہ طریق انتخاب کا مطالبہ کر رہے تھے وہ دین پرست تھے اور مخلوط طریق کو اپنے دینی نظریات کے خلاف سمجھتے تھے۔ اس کے باوجود مشرقی پاکستان کے لئے مخلوط طریق انتخاب منظور کیا گیا۔ اس سے قبل اشتراکی عناصر نے پورے ملک کے لئے مخلوط طریق انتخاب کا بل منظور کرانے کی مہم چلائی تھی تاکہ دین پرست عناصر پر ضرب کاری لگے اور وہ اپنے مقاصد میں پچاس فیصد کامیاب بھی ہوگئے۔ اس زمانے میں عوامی لیگ اور نیشنل عوامی پارٹی کے اشتراکی عناصر کے دباؤ کی وجہ سے مسٹر سہروردی اور مولانا بھاشانی کا موقف بہت دلچسپ تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہم مخلوط طریق انتخاب کی حمایت ہندوؤں کا زور توڑنے کے لئے کر رہے ہیں۔ جب ان سے پوچھا جاتا کہ ہندو یہ سب کچھ سمجھنے کے بعد آپ کی تائید کیوں کر رہے ہیں تو وہ خاموش ہو جاتے۔

مارچ ۱۹۵۸ء میں جب مشرقی پاکستان اسمبلی کے رکن یار محمد نے (جو مولانا بھاشانی کے قریبی دوستوں میں شمار ہوتے تھے) نیشنل عوامی پارٹی سے استعفیٰ دیا تو ان کا بیان پورے ملک میں حیرت کے ساتھ پڑھا گیا۔ انہوں نے کہا تھا:۔

"..... اس (نیشنل عوامی) پارٹی میں مفاد پرستوں اور کمیونسٹوں کا غلبہ بڑھتا جا رہا ہے۔ اس میں متضاد خیالات و نظریات رکھنے والے لوگ جمع ہوگئے ہیں جن کی سرگرمیاں پاکستان کے مفادات کے لئے نقصان دہ ہیں ....."

انہوں نے یہ بھی کہا کہ پاکستان کو جتنا نقصان اس پارٹی سے پہنچے گا کوئی اور پارٹی نہ پہنچا سکے گی[2]

اکتوبر ۱۹۵۸ء سے قبل تک ملک میں جو سیاسی جوڑ توڑ اور ہنگامے ہوتے ان کا نتیجہ مارشل لا کا نفاذ تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ان ہنگاموں میں اشتراکی عناصر کا بڑا ہاتھ تھا۔

موجودہ صورت حال یہ ہے کہ وہ مشرقی پاکستان میں آج بھی بہت سرگرم ہیں۔ مغربی پاکستان میں ان کا کام مزدوروں میں بہت اچھا ہو رہا ہے۔ لیکن دوسرے میدانوں میں ان کی آواز بہت مدھم محسوس ہوتی ہے ——— لیکن یہ صورت حال بظاہر ہے عین ممکن ہے کہ پس پردہ یہاں بھی ان کا کام زور شور سے جاری ہو۔ ایک مدت تک کمیونسٹوں کی تخریبی سرگرمیوں کا مرکز بلوچستان کا صوبہ رہا ہے۔ انہوں نے حکومت کے خلاف بوچی حریت پسندوں کی تحریک کو اپنے مذموم مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی

---

[1] روزنامہ تسنیم، ۱۹ر مئی ۱۹۵۴ء

[2] روزنامہ تسنیم، ۳۰۔ مارچ ۱۹۵۸ء

سرتوڑ کوششیں کیں۔ اپنے ماہر "گوریلے" اور تربیت یافتہ افراد بلوچستان بھیجے، اس خالص پاکستانی اور ہر لحاظ سے محب الوطن تحریک کا رشتہ بیرون پاکستان سے جوڑنے کی کوشش کی۔ اگر یہ مسئلہ جلد حل نہ کر دیا جاتا تو ہو سکتا ہے اس صوبے میں کمیونسٹوں کی کوششیں کچھ عرصہ بعد بار آور ہو جاتیں۔

اشتراکی عناصر اور ان کی سرگرمیوں کو خواہ کسی زاویئے سے دیکھا جائے ـــ ان سے پاکستان کو خطرہ لاحق ہے۔ یہ لوگ صرف سیاسی اختلافات رکھنے والے نہیں ـــ ان کا مقصد پاکستان میں اشتراکی نظام رائج کرنے کے لئے راہ ہموار کرنا اور پاکستان کو اشتراکی بلاک کے دو بڑوں میں سے کسی ایک کا کاسہ لیس بنانا ہے۔

اشتراکی تحریک کو پاکستان میں جو عروج حاصل ہوا ہے اس کے اسباب میں کچھ تو اس کی اپنی دانشمندی کا دخل ہے لیکن زیادہ حصہ دوسروں کی حماقتوں کا ہے۔ جن باتوں سے اشتراکی تحریک نے فائدہ اٹھایا ان میں پاکستان کی مختلف حکومتوں کا غیر جمہوری ہونا، عوام اور حکومت میں بُعد، اسلام پسند عناصر کا عدم اتحاد اور ان کے پاس وسائل کی شدید کمی اور محب وطن عناصر کی اشتراکیوں کے سلسلے میں عدم توجہی بلکہ سادہ لوحی میں ان سے تعاون اور ان کی تائید خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں جب چین بھارت جنگ کے بعد امریکہ نے بھارت کو فوجی امداد کی ترسیل شروع کی تو پاکستان کے اشتراکی عناصر نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا۔ پریس کی وساطت سے جس پر ان کی اچھی خاصی اجارہ داری ہے، عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اب پاکستان کی نجات اسی میں ہے کہ وہ اشتراکی بلاک میں شامل ہو جائے۔ ۱۹۶۲ء کے بعد پاک چین دوستی کے سرکاری مظاہر نے اشتراکی عناصر کو اور زیادہ تقویت دی۔ چین کو آزاد اور حریت پسند دنیا کے رہنما اور آخری محافظ کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ چینی وفود کی آمد و رفت نے ان کے کام کو اور تقویت بخشی۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد چین سے تعلقات میں مزید گرم جوشی پیدا کر دی گئی۔ چینی سفارت خانے نے اسی دوران میں ماؤزے تنگ اور دوسرے اشتراکی مصنفین کی کتب سستے داموں مارکیٹ میں بیچنے کے لئے ڈال دیں۔ اعلان تاشقند کے بعد چین کی پوزیشن روس کو حاصل ہو گئی۔ اب سستا روسی لٹریچر کھلے عام پاکستان میں فروخت ہو رہا ہے۔ ہر بک اسٹال پر مارکس، اینجلز، لینن وغیرہ کی کتب موجود ہیں۔ ان میں وہ کتب بھی ہیں جن میں براہ راست اسلام پر حملے کئے گئے۔ لیکن حکومت کی عنایات خسروانہ سے یہ اشتراکی لٹریچر دھڑا دھڑ فروخت ہو رہا ہے۔ چونکہ یہ لٹریچر نہایت ارزاں قیمتوں پر فروخت کیا جاتا ہے اس لئے ہر شخص اسے خرید لیتا ہے۔ یہ لٹریچر آہستہ آہستہ اپنا نفوذ کرتا جا رہا ہے اور بڑی حد تک اس نسل کے جانشین پیدا کر رہا ہے جو سوشلسٹ سے ایک ڈگری کم یعنی "اسلامی سوشلسٹ" کہلاتے ہیں۔

وزیر عنازی

پاکستان کمیونسٹ پارٹی

چند اہم انکشافات

پاکستان کمیونسٹ پارٹی نے پابندی سے کچھ عرصہ قبل ایک دستاویز تیار کی تھی جس کا نام تھا "خود تنقیدی رپورٹ" صرف پارٹی ممبروں کے لئے۔ اس دستاویز سے سابق پاکستان کمیونسٹ پارٹی کی داخلی حالت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اور یہ بات بھی پایۂ ثبوت تک پہنچ جاتی ہے کہ پارٹی کس طرح غیر ملکی اشاروں پر اپنی پالیسیوں میں وقتاً فوقتاً رد و بدل کرتی رہی ہے۔ پاکستان میں صوبائیت پرستی کے رجحانات کو ہوا دے کر پارٹی کن مقاصد کو حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس پر بھی مذکورہ دستاویز میں بعض اہم انکشافات موجود ہیں۔ ادارہ

جہاں تک کمیونسٹ پارٹیوں کے داخلی نظم کا تعلق ہے۔ وہ ناگفتہ بہ ہے۔ یہاں سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ اختلاف رائے کرنے والا گردن زدنی ٹھہرتا ہے۔ ممبرشپ کا معیار اتنا گرا ہوا ہے کہ پارٹیوں پر غلط عناصر کا راج ہے۔ ان ممبروں میں سیاسی شعور کی خطرناک حد تک کمی ہے حالانکہ وہ اپنے آپ کو مفکر اور الفکر سمجھتے ہیں اور اپنے آپ کو دنیا کے دانشور طبقہ کا رہبر اور جہان حوادث کا نباض سمجھتے ہیں۔ پارٹی کارکنان کا دعویٰ یہ ہے کہ انہوں نے ایک نیا نظریہ دے کر نوع انسانی کے لئے قندیلیں روشن کر دی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بھوسے اور بد اخلاق لوگ ہیں۔

یہ جو کچھ میں نے کہا ہے اس کے ثبوت میں پاکستان کمیونسٹ پارٹی کی ایک رپورٹ جو صرف پارٹی ممبروں کے لئے ہے پیش کی جا سکتی ہے۔ ایک پیرا ملاحظہ فرمائیے:

"پارٹی آئین میں رکنیت کی شرائط یہ ہیں کہ ہر وہ شخص ممبر بن سکتا ہے جو پارٹی [illegible] پروگرام کو مانتا ہے، جو پارٹی کے کسی عوامی محاذ پر یا پارٹی کے کسی دوسرے شعبے میں باقاعدگی سے کام کرتا ہے۔ جو پارٹی کے فیصلوں پر عمل کرتا ہے اور ڈسپلن میں رہتا ہے اور جو پارٹی ممبری کی فیس باقاعدگی سے ادا کرتا ہے ..... مذکورہ شرائط پر پارٹی میں ممبر بھرتی کرنے کے عمل کو مشکل حد تک ڈھیلا کر دیا گیا اس نے عملی طور پر ان کارکنوں کے لئے بھی پارٹی کے دروازے کھول دیئے جو جلسہ منعقد کرنے کے انتظام میں مصروف ہیں۔ اس پالیسی کے تحت ایسے بہت سے انتظامی بھی پارٹی کے ممبر ہو گئے جنہیں پارٹی کے اغراض و مقاصد، پالیسی اور پروگرام، آئینی ضوابط کا کچھ بھی علم نہیں تھا۔ نیز ایسے شخص بھی ممبر ہو گئے جو بنیادی طور پر تخریب پسند اور خود غرض تھے۔ اور جن کا ماضی مشکوک تھا۔" صفحہ

جس تحریک کی رکنیت کے یہ انداز ہوں وہ ذاتی اختلافات کی آماجگاہ بن جاتی ہے۔ وہ اخلاقیات کی حدود توڑ کر آگے بڑھتی ہے۔ جب جدوجہد حیات میں اس کا مکر خلاف عادت ظاہر ہوتی ہے تو اس کے معمولی ممبر نہیں بلکہ اس کے برگزیدہ ارکان بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ جہاں کہیں قوت، بربریت سے مقابلہ ہو تو وہ اپنی سمت سفر بدل لیتے ہیں۔ اور جب کبھی دوروں سے تیرہ ہوں اور سمندر کے تند و تیز سے سامنا ہوتا ہے۔ تو وہ پارٹی کے راز اگل دیتے ہیں۔ اس کے ثبوت میں بھی بعض حوالوں کا حوالہ دیا جا سکتا ہے مگر ہم چار حوالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔

- عام طور پر ڈھیلا پڑ جانے سے وہ تمام کمزوریاں ابھریں۔ آئیں جو شروع سے پارٹی رہنماؤں اور ممبروں میں موجود تھیں مگر دبی ہوئی تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ خطرناک پارٹی مرکز کے ڈپٹیوں اور ممبروں میں ذاتی اختلافات اور رقابت تھی جس کا بدترین مظاہرہ ترقی پسند ادیبوں اور جمہوریت پسند عورتوں کی انجمنوں میں ہوا۔ اس دور میں وہ اخلاقی کمزوریاں جو مرکزی کمیٹی کے چند ممبروں میں تھیں، وہ بھی بڑے پیمانے پر ابھر آئیں۔ صفحہ ۳

• پارٹی کے کئی سرکردہ رکن پولیس کے تشدد سے خوف زدہ ہو کر اپنے آپ کو گرفتاری سے بچانے یا رہائی حاصل کرنے کے لئے پارٹی کے راز فاش کرنے، اخبارات میں اپنے متعلق بیانات شائع کرنے، پارٹی ممبروں اور ہمدردوں میں دہشت پھیلانے، پست ہمتی پیدا کرنے، پارٹی کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے، پارٹی شکنجوں کو ڈھونڈنے کی مہم جاری کرنے اور پارٹی میں انتشار پیدا کرنے کے جرم کے مرتکب ہوئے۔ صفحہ ۳

• پارٹی کے رہنما افسر شاہوں کی طرح خوشامد کو پسند کرتے تھے اور جو پارٹی ممبر خوشامد کرتے تھے۔ ان کی بات مانتے تھے۔ انہیں وہ سمجھے ہوئے اور عوام کے قریب سمجھتے تھے۔ اور ان کی اخلاقی کمزوریوں کو نظر انداز کرتے تھے۔ جو رفیق نکتہ چینی کرتے تھے، انہیں عوام سے الگ تھلگ، اصلاح پسند وغیرہ کہا جاتا تھا۔ پارٹی کے عہدہ داروں اور اوپر کی کمیٹیوں کے ممبروں کی نامزدگی بھی اسی اعتبار سے ہوتی تھی۔ یہ بیماری نیچے سے اوپر تک سب جگہ پھیلی ہوئی تھی اور پارٹی کے اندر دریا دہ رہنماؤں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا جو اوپر کے رہنماؤں کی خوشامد کرتے تھے۔ اور نچلے ممبروں کو ڈانٹتے رہتے تھے:

- لاہور کے پارٹی ممبروں کی کیفیت حسب ذیل تھی:-

لاہور کے ارکان کا حال

۱. سیاسی شعور کی خطرناک حد تک کمی کی وجہ سے لاہور کے پارٹی ممبر پارٹی مرکز کی غلطیوں کا بنیادی سبب سیاسی پالیسی نہیں بلکہ مرکزی کمیٹی، صوبائی کمیٹیوں اور ڈسٹرکٹ کمیٹیوں کا منتخب شدہ نہ ہونا قرار دیتے تھے۔ وہ پارٹی تنظیم کے بنیادی اصول جمہوری مرکزیت سے ناواقف تھے اور پارٹی کے اندر جمہوریت پر زور دیتے تھے۔ اور جمہوریت کے متعلق ان کے تصورات انفرادیت پسندی اور نراجیت (ANARA CHISM) کی انتہا کو پہنچے ہوئے تھے۔

۲. پارٹی کے اندر تنقید پر زور دیتے تھے مگر عملاً جھوٹ بول کر اپنی غلطیوں کا اعتراف نہیں کرتے تھے اور دوسروں کو گالی گلوچ سنانے کو خود تنقید کے نام سے موسوم کرتے تھے۔

۳. جھوٹ بولنے، ہوٹلوں اور بازاروں میں پارٹی کی باتیں کرنے اور ایک دوسرے کو کوسنے اور ایک دوسرے کے خلاف پراپیگنڈہ کرنے کا مرض عام تھا۔ پارٹی ڈسپلن برائے نام تھا۔ خود پسندی، آزاد روی اور آوارہ مزاجی کی وبا ممبروں میں عام پھیلی ہوئی تھی۔

۴. سیاسی شعور اور تنظیمی صلاحیتوں کی کمی کے سبب پارٹی اور عوامی جتھہ بندیوں کی پارٹی پالیسی کی روشنی میں تعمیری بنیادوں پر رہنمائی کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔

۵. پہلے درجے کی انتہا پسندی اور فرقہ بندی کا غلبہ تھا۔

مذکورہ بالا نوعیت کے غیر مارکسی تصورات اور رجحانات صرف لاہور پارٹی کے ممبروں تک نہیں بلکہ دوسری جگہ کے پارٹی ممبروں میں بھی تھے۔ صفحہ ۳۶

اسی رپورٹ کے صفحہ ۴۹ پر سرمایہ داری نظام۔ کو متعلق کہا گیا ہے کہ سرمایہ داری ایک ایسا اقتصادی، سیاسی اور سماجی نظام ہے جس میں کمانے والا کماتا ہے اور سرمایہ دار اپنے سرمایہ پر ان کی کمائی کو کھاتا ہے۔ کیا یہ الفاظ مندرجہ بالا اقتباسات کی رو سے کمیونسٹ پارٹی پاکستان پر چسپاں نہیں ہوتے؟

پاکستان کمیونسٹ پارٹی جس کی نمایاں خصوصیات خود غرضی، گروہ بندی، بزدلی اور اخلاقی انحطاط کی تھیں بیرونی ممالک سے رہنمائی حاصل کرتی رہی

بیرونی رہنمائی تھی۔ یہ دوسرے ملکوں کے اشارہ چشم ابرو پر حرکت کرتی رہی تھی۔ ان کے پاس جو سرمایہ بھی تھا وہ ممالک غیر کے سے کہ دوں سے ملا تھا۔ اس کے پاس عقل و دانش کی جو متاع بھی تھی۔ وہ اغیار سے مستعار لی گئی تھی۔ اس نے جو قرار داد بھی پاس کی۔ ان میں ہمیشہ ماسکو، پیکنگ اور دہلی

کی روح رواں رہی ہے۔ اس کے ثبوت میں ذیل کی عبارات پیش کی جا سکتی ہیں:۔

• پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے آئین کے متعلق یہ فیصلہ ہوا کہ ہندوستانی پارٹی کے نئے آئین میں جہاں ہندوستان لکھا ہے۔ وہاں پاکستان لکھا جائے اور یہی آئین پاکستان کی پارٹی کا آئین ہو۔ ص۱۱

• سجاد ظہیر ہمیشہ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کے تجربوں کی روشنی میں پاکستان کے حالات کا تجزیہ کرتے اور اس پارٹی کی پالیسی کے مطابق پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی کی پالیسی مرتب کرتے رہے۔ ص۱۳

جنوری ۱۹۵۱ء کے ''کمیونسٹ'' میں ہندوستان کمیونسٹ پارٹی کے پولٹ بیورو کی طرف سے ایک بیان دیا گیا۔ اس بیان کے متعلق رپورٹ میں لکھا گیا ہے کہ ''ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کی اس دستاویز کو پڑھنے کے بعد پاکستان پارٹی کے مرکز نے بھی اپنی پالیسی کو بدلنا شروع کیا۔'' ص۱۶ ''۲۷ جنوری ۱۹۵۱ء میں کمیونسٹ انفارمیشن بیورو کے سرکاری اخبار ''فار لاسٹنگ پیس'' نے اپنے اداریہ میں ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کی انتہا پسندانہ پالیسی پر نکتہ چینی کی تھی۔ اس کے نتیجہ میں پاکستانی کمیونسٹ پارٹی کے حسب ذیل تاثرات تھے:۔

یہ ایڈیٹوریل پارٹی مرکز کے رفیقوں نے فروری کے آخری ہفتہ میں پڑھا مگر پالیسی میں کوئی تبدیلی نہ کی۔ . . . . . . پارٹی مرکز نے اس مضمون کی روشنی میں پالیسی کو ٹھیک کرنے کا اعلان اپریل کے آخری ہفتہ میں اس وقت کیا جب ہندوستان کے پارٹی مرکز کا بیان شائع ہوا اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ پاکستان کے پارٹی مرکز نے اپنی طرف سے اعلانیہ بھی ہو بہو وہی نقل کر کے اخبارات کو دیا جو ہندوستان کے پارٹی مرکز نے دیا تھا۔'' ص۲۰

یہ عبارات اپنی زبان سے خود کہہ رہی ہیں کہ پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی بیرونی ممالک کی ایجنٹ بنی ہوئی ہے۔ اس امر کا اعتراف ایک اور جگہ اس رپورٹ میں یوں کیا گیا ہے کہ ''پارٹی کے مرکزی رفیق ہندوستانی پارٹی کی دستاویزوں کو پڑھ کر ان کے مطابق پارٹی پالیسی کو ڈھالتے اور ممبروں کو ہدایتیں دیتے رہے۔'' یہ ایک نہایت شرمناک جسارت ہے کہ ایک معاشرہ سے حقوق لئے جائیں اور پھر اسی کے خلاف جنگ کی جائے، ایک خطہ زمین جسم و روح کے تعلق کو قائم رکھنے کے لئے بے شمار ذخائر اکل دے۔ اور پھر اس کی بنیاد پر کلہاڑا رکھ دیا جائے۔ ایک ملک کسی انسان کے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے سب کچھ پیش کر دے۔ اس کے عوض وہی انسان اسی معاشرے اور ملک میں مرطان کی جڑیں پھیلاتا رہے . . . .

طلباء کا پارٹی سے خاص رابطہ

اشتراکیت نواز طلبہ نے بار بار یہ بات کہی ہے کہ ان کا اور ان کی تنظیموں کا کمیونسٹ پارٹی سے کوئی تعلق نہیں ہے یہاں ہمیں ہمیشہ خلش رہی ہے کہ پھر یہ رنگ ان پر کیسے چڑھا؟ ان میں بھی وہی ردوایا ہے جو اشتراکیوں میں ہوتی ہے وہی جوڑ توڑ اور ریشہ دوانیاں ہیں۔ یہاں بھی عقل و دانش اور علم و شعور کی خطرناک حد تک کمی ہے۔ وہی آوارہ مزاجی اور شوریدہ سری ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خصوصیات وہی نہیں ہیں لیکن جب اس رپورٹ کو پڑھا تو معلوم ہوا کہ ان حضرات کو تہذیب و آداب زندگی اشتراکی جماعت کے فیضان نظر نے سکھائے ہیں اور ان کی باگ ڈور کمیونسٹوں نے تھام رکھی ہے۔ ان کی محفلوں کے انداز، ان کی جلسوں کے اطوار، ان کی چال ڈھال، ان کی نشست و برخاست، ان کا طرز فکر وہی ہیں جو پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے تھے اور یہ تحریک اشتراکیت زدہ طلباء کی نشر کی اور عملی طور پر امامت کے فرائض ادا کر رہی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:۔

''طلباء کے محاذ پر بھی پارٹی نے وہی رویہ اختیار کیا جو دوسرے محاذوں پر کیا تھا۔ ڈیموکریٹک اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے پھلنے پھولنے کے امکانات بہت زیادہ تھے کیونکہ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کئی فیڈریشنوں میں منقسم ہو کر طلباء میں بدنام و رسوا ہو چکی تھی اور میدان خالی تھا۔ اگر ڈیموکریٹک فیڈریشن کو طلباء کے مطالبات نیز عام قومی مسائل کی بنیادوں پر منظم کیا جاتا تو اس کو طلبا کی بہت بڑی اکثریت کی تنظیم بن جاتا تھا۔ مگر پارٹی نے پورے درجہ کی انتہا پسندی کا راستہ اختیار کر کے حکومت کو تشدد کرنے، طلباء کو ڈرانے دھمکانے اور گرفتار کرنے کا موقع دیا اور وہ صرف اس لئے کہ ایران کے بادشاہ کی آمد پر اس نے (کمیونسٹ پارٹی نے) ڈیموکریٹک سٹوڈنٹس

فیڈریشن کی طرف سے ایک ایسا اشتہار شائع کر کے تقسیم کیا گیا جسے وہ اپنی طرف سے شائع کرنے سے ہچکچاتی تھی۔ انتخابات کا بائیکاٹ اختیار کرنے سے فیڈریشن کا حشر وہی ہوا جو دوسری تنظیموں کا ہوا تھا۔ طلبا کی یہ جماعت جس کے پھلنے پھولنے کے بڑے امکانات تھے، چند کمیونسٹوں اور ان کے ہمدرد طلباء کی ایک چھوٹی سی جماعت بن کر رہ گئی۔" صہ ۷۲

اس حقیقت سے کوئی عقل و ہوش والا جو بھی انکار نہیں کر سکتی کہ ہندوستان کی تقسیم دینی بنیادوں پر ہوئی تھی۔ مسلمانوں نے کہا تھا کہ وہ ایک علیحدہ قوم ہیں، اس قوم کا ایک درخشاں ماضی ہے۔ اس کا ایک علیحدہ مخصوص نظام تمدن ہے۔ اس کا ایک خدا، ایک کتاب اور ایک رسول ہے۔ اس کی اپنی تہذیبی روایات ہیں، اس کے مخصوص قانونی اور دستوری تصورات ہیں اور اس کا اپنا معاشرتی اور معاشی ضابطہ ہے۔ اس لئے وہ ایک الگ خطۂ ارضی چاہتے ہیں کہ جہاں وہ دین کی بنیادوں پر جادۂ حیات پر رواں دواں ہو سکیں۔ چنانچہ اس جدوجہد کے نتیجہ میں پاکستان بنا اور مسلمانوں کو انفرادی، اجتماعی اور قومی و ملی طور پر اپنی تکمیل کا موقع ملا۔ لیکن ذیل کے فقرے پڑھ کر اشتراکیوں کے رجحانات کا اندازہ لگائیے۔

پاکستانی ایک قوم نہیں ہیں

"قوم کا لفظ قرآن مجید میں کبھی قبیلہ، کبھی کسی نبی کی امت اور کبھی کسی بادشاہ کی رعایا، اور اردو بول چال میں گاہے ذات مثلاً سید، شیخ، مغل، پٹھان اور گاہے مذہبی گروہ مثلاً عیسائی قوم، مسلمان قوم، ہندو قوم کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مگر جاگیرداری کے دورِ زوال میں جب سرمایہ داری نے دیہات کو شہروں کا دست نگر اور محتاج بناتے ہوئے مختلف نسلوں اور قبیلوں کے لوگوں کو ایک رشتہ میں منسلک کرنا شروع کیا تو جدید سیاست اور عمرانیات میں لفظ قوم کا مفہوم بدل گیا۔ اب قوم اس انسانی آبادی کو کہتے ہیں جو ایک مخصوص خطے میں اکٹھی رہتی ہو، ایک خاص زبان بولتی ہو، ایک مخصوص نفسیاتی ذہنیت رکھتی ہو اور معاشی اعتبار سے ایک وحدت ہو۔ چنانچہ جدید سیاسی اور عمرانی تصورات کے مطابق یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستانی ایک قوم نہیں۔" (صفحہ ۵۲) یہ سارا فلسفہ جس مقصد کے لئے گھڑا جا رہا ہے۔ وہ یہ ہے کہ پاکستان میں ایک نہیں بلکہ متعدد قوموں کا وجود ثابت کیا جائے اور صوبائیت پرستی کے رجحانات پروان چڑھا کر اپنی مقصد برآری کی جائے۔ ذیل کا حوالہ آنکھیں کھول کر پڑھنے کے قابل ہے :-

"پاکستان میں بہت سی قومیں رہتی ہیں۔ ان میں سے بنگالی، پنجابی، سندھی، بلوچی اور پٹھان قومیں جاگ چکی ہیں اور اپنا حق مانگتی ہیں۔ مگر مسلم لیگی حکومت انہیں خود مختاری کا حق دینے کے بجائے ان حقوق کو بھی چھین رہی ہے جو انہیں حاصل ہیں اور جہاں تک ہماری پارٹی کا تعلق ہے۔ وہ نظری طور پر اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ پاکستان بہت سی قوموں کا گھر ہے اور ان قوموں کو حقِ خود ارادیت حاصل ہونا چاہئیں" (صفحہ ۵۳)

گویا کمیونسٹ پارٹی کی STRATEGY یہ تھی کہ سابق پنجاب، سندھ، بنگال، بلوچستان اور سرحد کے لوگوں میں اپنی اپنی الگ قومیت کا احساس پیدا کر کے پاکستان کو پانچ خود مختار حکومتوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ایک متحدہ و مضبوط پاکستان ظاہر ہے کہ اشتراکیت کے مقاصد کے آگے کبھی سپر نہیں ڈال سکتا تھا۔ اس صورت حال میں اشتراکیوں نے جو ناپاک منصوبہ بنا رکھا تھا۔ وہ عالم (بزعم) پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا اور پھر ان پر کمیونسٹ اقتدار مسلط کرنا تھا۔ ہزار شکر ہے کہ پاکستانی عوام کی دینی حمیت اور سیاسی بصیرت نے کمیونسٹوں کے ان مذموم مقاصد کا وہی حشر کیا جس کے وہ مستحق تھے لیکن مذکورہ بالا اقتباسات ہمارے لئے اس وقت بھی ایک اور لحاظ سے باعثِ تشویش ہیں اور ان کی روشنی میں ہم صاف دیکھ سکتے ہیں کہ آج بھی صوبائیت پرستی کے رجحانات جن مختلف شکلوں میں اظہار کر رہے ہیں ان کا اصل منبع اور ماخذ کیا ہے؟

۵

اسلامی سوشلزم

★

نعیم صدیقی • اسلامی سوشلزم

اے۔کے۔ بروہی • اقبال، اجتہاد اور اسلامی سوشلزم

فاتک عزیز احمد • اقبال اور اسلامی سوشلزم

یہ ممکن ہے کہ بعض حالات میں مذہبی لحاظ سے متشدد عناصر بھی عملاً سوشلزم کا پھل چکھنا منظور کر لیں لیکن جب یہ ترقی (یعنی سوشلزم) ان کی زندگی کا ایک لازمی جزو بن جائے گی تو انہیں معلوم ہو گا کہ اس راستے میں ان کی اصل رکاوٹ کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ سوشلزم کی جانب اس وقت تک ترقی کی ہی نہیں جا سکتی جب تک کہ ساتھ ساتھ اس طرح کی (مذہبی) جہالت کو دور نہ کیا جائے اور عوام کا ثقافتی معیار بلند نہ کیا جائے۔ اس معیار پر پہنچ کر عوام لازماً اس سوال کو اٹھائیں گے کہ کیا سوشلزم کی تعمیر کسی صورت میں بھی مذہبی تعصبات سے ہم آہنگ ہو سکتی ہے؟ پھر یقیناً محنت کش طبقے کی جماعت کی سیاسی قوت ان کو اس سوال کا صحیح جواب تلاش کرنے میں مدد دے گی۔

اسلامی سوشلزم

شرکت میانہ حق و باطل نہ کر قبول

نعیم صدیقی

برادر محترم جناب نعیم صدیقی صاحب نے غزالی کالج حیدرآباد کی دعوت پر اسلامی سوشلزم کے موضوع پر ایک مبسوط تقریر کی تھی۔ ہم نے انہیں اس خاص نمبر کے لئے اس موضوع پر لکھنے کی دعوت دی تھی۔ موصوف نے اپنی بے پناہ مصروفیات سے وقت نکال کر اس موضوع پر مفصل مضمون لکھنے کا ارادہ کیا۔ اس کے لئے مزید تیاری بھی کی لیکن کام اتنا پھیل گیا کہ اس کو ایک مضمون میں سمیٹنا ممکن نہ رہا۔ بالآخر محترم نعیم صاحب نے اپنی مذکورہ بالا تقریر کو، جسے ٹیپ پر محفوظ کر لیا گیا تھا، مفصل نظرثانی کے بعد اس نمبر کے لئے تیار کردیا۔ اپنی موجودہ شکل میں یہ ایک بالکل نئی چیز ہے، گو انداز تقریر ہی کا ہے۔ موصوف نے مزید اصلاحات کے ساتھ بیش قیمت اضافے بھی کئے ہیں اور تمام حواشی نئے لکھے ہیں، یہ تقریر اسلامی سوشلزم کا نعرہ بلند کرنے والوں کے لئے اور پوری قوم کے لئے ایک لمحۂ فکریہ فراہم کرتی ہے۔ ہمیں توقع ہے ہمارے ملک کا سوچنے سمجھنے والا طبقہ اس میں اٹھائے ہوئے سوالات پر ٹھنڈے دل سے غور کرے گا اور اصلاح کے لئے اس راستہ کو انتخاب کرے گا جو حقیقی فلاح اور کامیابی کا راستہ ہے۔ ہم اسلام کے ساتھ باطل کی ہر پیوندکاری کے مخالف ہیں۔ اور پوری فہم اور شعور کے ساتھ اس بات کو پیش کرتے ہیں کہ ہمارے اور پوری دنیائے اسلام کے تمام مسائل اور مشکلات کا حل صرف اسلام ہے۔ اپنی حقیقی شکل میں، اور اپنی مکمل صورت میں؛ ہم سرمایہ داری اور اس نظامِ ظلم کے بھی اتنے ہی مخالف ہیں جو معاشی ترقی کے نام پر مسلمان ملکوں میں رائج ہو رہا ہے جتنے اشتراکیت اور نام نہاد سوشلزم کے۔ ہماری نگاہوں کے سامنے اسلام کی شاہراہِ حیات ہے، کسی دوسری راہ کی میں ہمارے لئے کوئی کشش نہیں۔ اور اسلام معاشی مسائل کو کس طرح حل کرتا ہے، اس موضوع پہ ہم اس نمبر کے آخری حصہ میں مزید مواد پیش کر رہے ہیں۔

(مدیر)

مجھے یہ غلط فہمی ہرگز نہیں ہے کہ میں آپ کے سامنے کسی دانشورانہ اور کسی فاضلانہ مقام سے کوئی خطاب کرنے چلا ہوں۔ تاہم جو موضوع گفتگو مقرر کیا گیا ہے، اس کے متعلق جتنا کچھ میرا محدود سا مطالعہ ہے، میں اپنی گذارشات آپ تک پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ اس گفتگو سے میرا منشا محض یہ ہے کہ آپ بھی ان حالات پہ غور کریں جن سے ہم سب دوچار ہیں۔

اسلامی سوشلزم کے سلسلہ میں کچھ عرض کرنے سے پہلے میں حقائق کی اس جڑ کو لینا چاہتا ہوں جہاں سے یہ اصطلاح چھوٹی ہے۔ فتنہ کی وہ جڑ فی الحقیقت ہمارا انتہائی پیچیدہ اور سنگین طور پہ الجھا ہوا اقتصادی مسئلہ ہے۔ یہ آپ کو معلوم ہے کہ ہم جس نظام کے نیچے اس وقت زندگی بسر کر رہے ہیں وہ ایک ایسا

نظام [illegible] شروع سے سرمایہ دارانہ بنیادوں پر استوار ہوا ہے[1]۔ اور پاکستان بننے کے بعد سے کر اب تک بڑے کرشمے اہتمام کے ساتھ ہر دور میں اس کو اسلامی اصول معیشت کی پرچھائیں سے پوری طرح محفوظ رکھا گیا ہے۔ کوئی ایسی اصلاح جو اسلامی تقاضوں کے تحت اس میں بنیادی طور پر واقع کی جا سکتی تھی اس سے اس کو بالکل بچا بچا کر رکھا گیا ہے۔ اس اسلام گریز پالیسی[2] کے نتیجہ میں جو صورت حال پیش آئی اس کے متعلق ٹھوس حقائق کی بنا پر، ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اب جس سرمایہ داری سے ہمیں سابقہ ہے وہ امریکہ، برطانیہ اور دوسرے مختلف مغربی ممالک کی سرمایہ داری کے مقابلہ میں نہایت گھٹیا، بلکہ بدتر قسم کی سرمایہ داری ہے۔ اس میں خاص تحفظات کے ساتھ اجارہ داریاں ہیں۔ اس میں جارحانہ منافع کے لئے کھلا میدان چھوڑ دیا گیا ہے۔ اور اس میں انتہائی تیز رفتار ارتکاز (CONCENTRATION) پایا جاتا ہے جتنے تیز رفتار ارتکاز کی مثال مغرب کی سرمایہ داری کسی ملک میں پیش نہیں کر سکتی۔ وہ فاصلہ جسے مغرب میں سرمایہ داری نے آدھی آدھی یا پون پون صدی یا ایک ایک صدی میں طے کیا تھا یہاں ہم نے اپنے چھوٹے سے وسائل اور چھوٹے سے دائرہ کے اندر اس فاصلہ کو دس بارہ برس کے اندر اندر طے کر ڈالا ہے۔ وسائل چاہے جاسے کم ہوں، مقدار سرمایہ کی پوزیشن ہماری چاہے ان سے کمتر ہو لیکن ناہمواریوں کا جو تناسب یہاں دس بارہ سال میں پیدا ہو گیا ہے اور جو مسائل ان کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ جو یورپ کے ملکوں میں (جو سرمایہ دارانہ نظام کے علمبردار تھے) تین تین چار چار قرنوں میں جا کر پیدا ہوئے تھے۔

اس واضح صورت حال کے ساتھ، جسے آپ خود بھی بخوبی سمجھتے ہیں، میں آپ کے سامنے تفصیل اور توضیحی باتیں کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ جب میں نے ارتکاز سرمایہ و دولت (CONCENTRATION OF CAPITAL AND WEALTH) کے ٹھوس امر واقعہ کو بیان کر دیا ہے تو اب مجھے اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ میں کچھ گھرانوں کی گنتی آپ کو بتاؤں یا کچھ افراد یا اشخاص کی ایک خاص تعداد کا ذکر کروں، یہ چیزیں بار بار دہرائی جا چکی ہیں۔ اس سلسلہ میں اعداد و شمار پیش کرنے سے بھی میں ایک خاص وجہ سے ڈرنے لگا ہوں۔ اعداد و شمار ذرا اوپر کی دنیا میں بہت ہی ناگواری سے دیکھے جانے لگے ہیں۔ اور میرا یہ خیال ہے کہ یہ چیزیں جن کو مجھے بیان کرنا ہے وہ کسی طرح کے اعداد و شمار کی محتاج نہیں ہیں۔ جس مسئلہ کو انسان کا پیٹ اور راست نشتر کی چبھن کے ساتھ ہر آن محسوس کر رہا ہو اور وہ ایک انسان کا معاملہ نہ ہو بلکہ ایک ملک کی بڑی بھاری اکثریت اور بھاری تعداد اس کا روگ بھگت رہی ہو، اس کے لئے ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ ہم اعداد و شمار کے انبار لگا کر دکھیں تو وہ مطلب ثابت ہو۔ اس لئے اجمال کا راستہ اختیار کرتے ہوئے میں صرف یہی کہوں گا کہ انتہائی تیز رفتار ارتکاز (CONCENTRATION) سے ہمیں سابقہ ہے، سرمایہ کا سمٹتے چلے جانا، دولت اور وسائل پیداوار کا اکٹھے ہوتے چلے جانا اور پھر سرمایہ و دولت کا اکٹھے ہو کر ایک غالب قوت بنتے چلے جانا نہ صرف اقتصادی بلا ہے بلکہ سیاسی بلا بھی ہے۔

ہماری ایک مشکل یہ ہے کہ ایک طرف تو ہم ارتکازی معیشت کے گرداب میں مبتلا ہیں، اور دوسری طرف ہمارے سامنے جس چیز کا بار بار

---

[1] یہ سپک کلاسیکل سرمایہ داری جو خود مغربی ممالک میں بے شمار تبدیلیوں سے گزر چکی ہے، ہمارے یہاں اسی متروک نظام کو اختیار کیا گیا، اور بعد میں حالات و تجربات کے زیر اثر اس میں جو مفید تبدیلیاں ہوئیں (خواہ اسلامی نقطہ نظر سے وہ ناکافی اور محدود اور مزید تغیر طلب ہوں) ان سب سے ہم نے قطع نظر کیا۔ اور پھر اس سیکنڈ ہینڈ فرسودہ نظام کو جس نئے انداز سے ہم نے نافذ کر دیا، اس نے خرابیوں میں مزید اضافہ کر دیا۔ (ن۔ ص)

[2] اسلام سے یہ پرہیز اسلامی تصور تقویٰ کا بالکل الٹا مفہوم رکھتا ہے یعنی اسلامی تقویٰ یہ ہوتا ہے کہ خلاف اسلام چیزوں سے پرہیز اور بچاؤ کیا جائے اور ہمارے نظام معیشت نے خود اسلام سے اپنے آپ کو بچانے کی فکر کی (ن۔ ص)

تذکرہ ہوتا ہے، جسے ہم اخباروں میں، کتابوں میں، رسائل میں، تقاریر میں، ہر جگہ پڑھتے سنتے اور ذہنوں میں اخذ کرتے ہیں، وہ لفظ "ترقی" ہے ہماری ساری داستانِ ارتقاء. ہمارے ہاں کی ساری نفع اندوزیوں اور ذخیرہ اندوزیوں کے تلخ تجربوں کو، اور ساری اجارہ داریوں اور سارے تحفظات کو، جن سے ہم گزر رہے ہیں۔ "ترقی" کا دلفریب اور خوشنما عنوان دیا گیا ہے۔ یہی عنوانِ "ترقی" ہمارے ملک کی کتاب کے ہر باب کی زینت ہے۔ اس ترقی کا جا بجا چرچا ہے۔ اس کے تذکرے ہیں، اس کے ہیجے ہیں، اور کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ ہم اس ترقی کی کوئی نہ کوئی قصیدہ خوانی عالم بالا سے یا عالم زیریں سے نہ سنتے ہوں۔

اس سلسلہ میں یہ حقیقت او جھل نہ ہونی چاہئیے کہ ہم جس دور سے گذر رہے ہیں اس کے عالمگیر اثرات کے تحت یہ ترقی دنیا بھر میں واقع ہو رہی ہے۔ کچھ ممالک آگے آگے جا رہے ہیں، کچھ ان کے پیچھے، لیکن سب پر ترقی کی ایک کیفیت طاری ہے۔ اس قسم کے ادوار میں اگر کسی ملک میں (میں اپنے ملک ہی کا ذکر نہیں کر رہا، ساری دنیا کو سامنے رکھتے ہوئے عرض کرتا ہوں) اتفاق سے نالائق ترین قیادت بھی بیٹھی ہو اور وہ انتہائی شدید قسم کی حماقتیں بھی کر رہی ہو جب بھی ترقی ایک نہ ایک حد تک واقع ہوتی رہے گی۔ اس غیر شعوری ترقی کا ظہور خاص طور پر زیر ترقی (under-developed) اور ترقی پذیر (developing) ممالک میں کچھ اسی فطری طریق سے ہوتا رہتا ہے جیسے کسی ایسے گھر میں پلتا ہوا بچہ قد و قامت میں بڑھتا رہتا ہے جو بچے کے لئے نہ تو اچھی خوراک فراہم کر سکے، نہ اسے اچھی تعلیم دلا سکے اور نہ اس کے سرکردہ افراد اس پر کما حقہ، توجہ صرف کر سکیں، یا کسی اچھے کردار کے ساتھ اس کی سرپرستی کا حق ادا کر سکیں، ان ساری کوتاہیوں کے باوجود اس کا جسم اور دماغ اور کردار بعض کمزوریوں اور خرابیوں اور بیماریوں کے ساتھ نشوونما بہرحال پائے گا۔ پس ایک ترقی وہ ہے جو از خود وارد ہو رہی ہے اور ہر جگہ اپنا عمل کر رہی ہے حتیٰ کہ ملایا، لنکا اور کانگو ہی میں نہیں، نئی گنی، سکیمو لینڈ میں بھی اس کی کچھ نہ کچھ جلوہ گری محسوس کی جا سکتی ہے۔ اور عرب کے بدوؤں کے ادنیٰ خیموں میں اس کے کرشمے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس طرح کی غیر اختیاری اور غیر شعوری ترقی حقیقت میں معاشرہ کو مجموعی طور پر پوری طرح اچھے نتائج بھی دے۔ صحیح معنوں میں ترقی کا اطلاق اس صورت میں ہوتا ہے جبکہ وہ ایسے سوچے سمجھے اصولوں اور متوازن منصوبوں کے تحت نمودار ہو جس سے انسانوں کی زندگی کے دکھوں کا مداوا کرنا مطلوب ہو۔ صرف یہ ترقی ہے جو وسیع پیمانے پر اچھے نتائج دے سکتی ہے۔ محض منصوبہ بندی — کسی نہ کسی طرز کی منصوبہ بندی — سے بھی کام نہیں چلتا۔ منصوبہ بندی کی اساس عدلِ اجتماعی کے بہترین اصولوں پر ہونی چاہئیے اور کسی متوازن نظریۂ حیات کو اس کی روح رواں ہونا چاہئیے۔ بصورت دیگر ترقی اس معنی میں ہوگی کہ بنکوں میں دولت کی ریل پیل بڑھ جائے، مشینیں بہت چلتی ہوئی دکھائی دینے لگیں اور کارخانوں کی چمنیوں کا دھواں شہروں کے اندر پھیل کر ہوا کو گندہ اور خراب کر رہا ہو۔ اپنی ان شکلوں میں یہ ساری ترقی آپ کو ہر ہر دائرے میں محسوس ہوگی۔ لیکن اس کا وہ نتیجہ جو ہمیں اپنے گھر میں، اپنے باورچی خانہ میں، اپنے دستر خوان پر اور اپنی زندگی کے ایک ایک گوشے میں دکھائی دینا چاہئیے وہ ایک بڑی ہماری اکثریت کو کہیں دکھائی نہیں دے رہا ہوگا۔

ہمارے ہاں جو ترقی ہو رہی ہے یہ بڑی تجزیہ طلب ہے آپ میں سے اکثر حضرات یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہم ترقی کے کرشمے جن اعداد و شمار کی زبان میں پڑھتے ہیں ان اعداد و شمار کا حال کیا ہے۔ میں اشارۃً اتنا ہی کہوں گا کہ یہ اعداد و شمار ایک عجیب گورکھ دھندا ہیں۔ بسا اوقات یہ ایک حل طلب معما ثابت ہوتے ہیں۔ ان میں بعض پیچیدگیاں ہیں۔ ان میں کاوش کرنا پڑتی ہے۔ یہ اعداد و شمار بعض اوقات آپس میں ٹکراتے ہیں بعض اوقات ایک طرف سے اعداد و شمار ایک ہی معاملہ میں کچھ کہتے ہیں، دوسری طرف کے کچھ اور کہتے ہیں۔ پھر ان کو ترتیب دینے کی ایک خاص حکمت اور خاص مہارت ہے۔ ایک ہی اعداد و شمار کو ایک ترتیب سے اگر آپ دیکھیں تو اس سے اور نتیجہ نکلتا دکھائی دے گا اور انہی اعداد و شمار کو دوسری

ترتیب سے دیکھیں تو بالکل مختلف قسم کا نتیجہ نکلتا دکھائی دے گا۔ اندریں صورت کسی اقتصادی حقیقت کا صحیح تصور اخذ کرنے کے لئے بڑی کاوش اور مغز ماری کرنا پڑتی ہے[۳]۔ ان پیچیدگیوں کے مختلف حجابوں کو ہٹا کر جب ہم حقیقی ترقی کا جائزہ لینے کے لئے پردۂ حقائق میں جھانکتے ہیں تو اپنی ترقی کے بعض کمزور اور مضر پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں۔

ہمارے ہاں کی ترقی میں پہلا بڑا نقص یہ ہے کہ وہ غیر متوازن ہے۔ غیر متوازن ترقی کی تفصیلات بہت سی ہیں، لیکن اس گفتگو میں، میں ایک آدھ مثال آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ مثال کے طور پر ایک ملک کا اس طرح ترقی کرنا کہ صنعتی میدان میں تو بعض شعبوں[۴] کی حد تک خاصی پیشقدمی ہو جائے لیکن زراعت میں وہ اس حد تک پس ماندہ رہ جائے کہ اس کو غلہ اور سامانِ خوراک دوسروں سے حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئے تو یوں سمجھئے کہ وہ ساری ترقی جو ہوئی تھی اس کے ثمرات کے عوض ہر سال سامانِ خوراک کی درآمد ہوتی ہے ۔ کسی سال زیادہ اور کسی سال کم۔ تو اس صورت میں یہ سمجھنا چاہیئے کہ ترقی غیر متوازن ترقیوں میں سے ہے۔ جیسا کہ آپ بھی جانتے ہیں، میری ناقص معلومات کے مطابق ستر ۷۰۔ اسی ۸۰، نوے ۹۰ کروڑ یا ایک ارب روپے کا غلہ ایک ایک سال کے لئے ہمیں مطلوب رہا ہے۔ اس سال ہی کی ضرورت آگئی ہے کہ ہمیں ساڑھے بائیس لاکھ ٹن غلہ درآمد کرنا ہوگا۔ اس مقدار میں غلہ کے حصول کے لئے کسی حالت میں پون ارب روپے سے کم کا صرفہ نہ ہوگا۔ بلکہ زیادہ تر امکان پورے ایک ارب روپے کا ہے[۵]۔ غور کیجئے کہ ایک قوم جو ہر سال پیٹ کی محتاجی دوسری قوموں کے سامنے لے کے جائے، اور کسی سال سو کروڑ روپے تک کا، کسی سال ستر ۷۰، اسی ۸۰ کروڑ کا اور کسی سال پچاس ۵۰، ساٹھ ۶۰ کروڑ روپے کا غلہ درآمد کرنے پر مجبور رہو پھر اس کو اپنی ترقی کے معنے حقیقت کی ڈکشنریاں خوب اچھی طرح دیکھ کر سمجھنا چاہئیں کہ وہ کس مقام پہ ہے۔

ترقی کے غیر متوازن ہونے کا یہی ایک پہلو نہیں، ایک دوسرا آدمی دفاعی پہلو کو لے سکتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بڑی حد تک اسے پردۂ اخفا میں رکھنا پڑتا ہے، اور یہ ضروری نہیں کہ دفاعی تیاریوں کا ایک ایک جز تمام لوگوں کو محسوس و معلوم ہو۔ پس میں نہیں کہہ سکتا کہ میں دفاعی معاملات سے آگاہ ہوں۔ لیکن اتنا تو بہرحال میں آپ سب جانتے ہیں کہ ایک دشمن قوت یا ایک سے زیادہ دشمن قوتوں کے درمیان گھرے ہوئے ایک ملک کو دس یا پندرہ یا بیس برس میں کیا کچھ کرنا چاہئیے تھا اور فی الواقع اتنا کچھ ہو سکا یا نہیں۔ اس معاملہ میں کم از کم اصولِ تقابل و موازنہ کے مطابق یہ ضرور دیکھا جا سکتا ہے کہ ایک خاص مدت میں دوسروں نے کیا کیا اور ہم نے کیا کیا۔ ہم نے کتنے فولاد کے کارخانے قائم کئے یا اپنے حریف کے سامنے ہم نے اسلحہ سازی کی کتنی آرڈی ننس فیکٹریاں کھولیں[۶]؟ اگر اس تناسب کو ہم دیکھیں تو پھر ہم یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہماری ترقی میں یہ

---

[۳] اس زمانہ میں بہ طورِ خاص اقتصادی صورتحال کا مطالعہ کرتے ہوئے سرکاری اہتمام سے شائع شدہ اعداد و شمار نے مجھے خاصا پریشان کیا۔ میں نے اپنا تاثر خود تجربے سے گزر کر بیان کیا ہے (ن۔ ص)

[۴] خود صنعتی میدان کے اندر جو توازن درکار ہے وہ بھی یہاں کارفرما نہیں ہے۔ مختلف ماہرین نے جن میں یہاں کے صنعت کار بھی شامل ہیں ان پہلوؤں کی واضح نشاندہی کی ہے جن میں ہماری صنعت کارانہ کوتاہیاں عیاں ہیں (ن۔ ص)

[۵] اس موضوع پر میں تفصیلی معلومات اور اعداد و شمار جمع کرنے میں اس تقریر سے پہلے بھی مصروف تھا، اور یہ سلسلہ بعد میں بھی جاری ہے۔ (ن۔ ص)

[۶] انڈیا میں ۶۲ — ۶۵ء کے عالمی اعداد و شمار کے مطابق ۲۴ آرڈی ننس فیکٹریاں تو علی الاعلان کام کر رہی ہیں۔ ایٹمی اسلحہ کی تیاری کے لئے بھی مساعی جاری ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ کام خفیہ طور پر بھی ہو رہے ہوں اور بعض جنگی ضروریات عام فولادی کارخانوں میں تیار ہو رہی ہوں پھر ٹینک سازی، بکتر بند گاڑیوں اور جیپوں کی تیاری کے علاوہ طیارہ سازی کے میدان میں بھی پیشقدمی ہو رہی ہے (ن۔ ص)

عدم توازن کے پہلو کہاں کہاں ہیں۔

ایک بڑا مسئلہ ترقی میں اضاعت[1] (wastage) کا ہے یعنی یہ کہ ترقی تو ہو رہی ہے، آپ حاصل تو بہت کچھ کرتے ہیں اور دولت پیدا کرتے ہیں لیکن ساتھ کے ساتھ اس کا ایک حصہ ضائع بھی ہوتا رہتا ہے۔ یوں تو ضاعت ہر ملک کے کسی نہ کسی میدان میں کم یا زیادہ پیش آسکتی ہے، لیکن اگر یہ اضاعت مسلسل اور مختلف پہلوؤں سے اور خاصے بڑے پیمانے پر پیش آرہی ہو تو پھر ترقی بڑی حد تک اسی خرابی کا شکار ہو جاتی ہے۔ اضاعت کی بہت سی شکلیں ہمیں درپیش ہیں۔ مگر ان سب کا احاطہ کرنا اس وقت ممکن نہیں ہے۔ دو ایک مثالوں سے بات واضح ہو جائے گی۔ مثال کے طور پر لاکھوں کروڑوں روپے کا کوئی منصوبہ ہے اور وہ کسی ایک پہلو سے غلط شکل اختیار کر جاتا ہے۔ اب اس پر جب ہم سرمایہ کاری (investment) کرتے ہوئے بھاری رقوم لگا دیتے ہیں (اور بسا اوقات قرض لے کر لگاتے ہیں) پھر منتشر خرچ کرتے ہیں لیکن اس کا بہت سا فاصلہ طے کرنے کے بعد یہ انکشاف ہوتا ہے کہ اس میں فلاں پہلو خراب یا غلط رہ گیا تھا۔ تب اسے "الف" سے لے کر "ی" تک ایک نئی شکل دینے کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔ اس کی ایک چھوٹی مثال یہ ہے کہ ہم نے ٹریکٹر درآمد کئے کہ ان سے بہت اچھی کاشت ہوتی ہے اور زمین زیادہ فصل دینے لگتی ہے۔ ٹریکٹروں کی ایک بڑی مقدار درآمد کرتے ہوئے ہم نے یہ نہ سوچا (کیونکہ پہلے سے ہمارا دماغ اس کے لئے تیار نہ تھا) کہ جہاں ٹریکٹر ہوں وہاں ورکشاپوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس ضرورت کو ہم نے ٹریکٹروں کے درآمد کر لینے اور ان میں سے ایک خاص تعداد کے عملاً خراب ہو جانے کے بعد محسوس کیا کہ ورکشاپوں کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ چند ہی دن ہوئے کہ یہ بات کہی گئی ہے کہ کچھ ورکشاپ تو فوراً کھڑے جانے والے ہیں اور تین سال یا مزید عرصہ میں مزید متعدد ورکشاپ کھڑے جائیں گے۔ یہ محض ایک مثال ہے۔ ورنہ جن لوگوں نے ان مسائل میں تحقیقات کی ہے، ان لوگوں کی تحقیقات سے تھوڑا سا فائدہ اٹھانے کا جو موقع مجھے ملا ہے اس کی روشنی میں بہت سے واقعات و تجربات اس سلسلہ کے میرے سامنے ہیں لیکن ان سب کو یہاں گنوانا نہ مطلوب ہے نہ ممکن۔

اسی طرح کسی معاملہ میں اگر غلط سودا ہو جائے مثلاً ایک ناکارہ مال کسی مجبوری یا غلطی سے ہم نے اٹھالیا تو یہ ترقی کے اندر اضاعت کا ویسا ہی ایک سوراخ ہے جس طرح کسی ٹنکی میں ایک سوراخ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر ہم نے ایک سودا ایسا کر ڈالا ہے جو ہماری ضروریاتِ زندگی سے متعلق نہ تھا بلکہ خالص تعیش کے دائرہ سے متعلق تھا تو اس قسم کی غریب قوم کے اندر وہ بھی اضاعت کی تعریف کے اندر آئے گا۔ اور آپ حضرات کے لئے یہ کوئی انکشاف نہیں ہوگا کہ پچھلے چند سالوں کی درآمدی تجارت پر اگر نظر ڈالی جائے تو اس میں ایک بہت بڑا تناسب سامانِ تعیش کا ہے اور سامانِ تجارت کا سب سے بڑا حریص گاہک ہماری قوم کا بالائی طبقہ ہے جو سیاسی، اقتصادی یا سماجی و معاشرتی لحاظ سے پیش پیش ہے جس کا جہاں تک بس چل رہا ہے وہ اپنے لئے زیادہ سے زیادہ سہولتیں اور لذات سمیٹنے کے درپے ہے۔ ان لوگوں کو یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ جس قوم کے درمیان بیٹھ کر اپنی جنتیں آراستہ کر رہے ہیں اس کی ستر پچہتر فی صد آبادی مصیبت اور دکھ کی زندگی گذارتی ہے، حتی کہ بے شمار لوگ روٹی، کپڑے مکان اور علاج تک سے محروم ہیں۔ ایسی پاکش قوم کی دولت کا چند افراد کے تعیش و تنعم میں لُٹ جانا اضاعت کی بڑی بُری قسم ہے۔

اسی سلسلہ میں بونس واؤچر اسکیم کا بھی ذکر کروں گا جسے برآمد بڑھانے کی ایک مؤثر تدبیر کے طور پر اختیار کیا گیا تھا۔ فی الحقیقت یہ ایک

---

[1] ہمارے یہاں لفظ ضیاع اس معنی میں استعمال کیا جاتا ہے مگر صحیح لفظ اضاعت ہے۔ اگرچہ مروج نہ ہونے کی وجہ سے مشکل معلوم ہوتا ہے (ن۔ ص)

عاملی یا عبوری قسم کی تدبیر تھی جسے ضرورت سے زیادہ طول دیا گیا۔ چنانچہ اب کئی سال گزر جانے کے بعد ماہرین اس اسکیم پر ناقدانہ نگاہ ڈال رہے ہیں اور کتابوں اور اخباروں میں متعدد بحثیں سامنے آچکی ہیں[8]۔ ان بحثوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ بونس واؤچر اسکیم جہاں ایک طرف یہ افادیت رکھتی ہے کہ برآمد کے لئے محرک ثابت ہو، وہاں دوسری جانب جو پیچیدگیاں اس نے پیدا کر دی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ بونس میں ملنے والے زرمبادلہ پر جو چیزیں درآمد کی جاتی ہیں، تاجر انہیں اس لحاظ سے انتخاب کرتا ہے کہ انہیں اپنے ملک میں مہنگے سے مہنگے داموں بیچ کر زیادہ سے زیادہ نفع کما سکے۔ یعنی ملکی مفاد اور ملک کی حقیقی ضروریات ثانوی درجہ میں چلی گئیں۔ دوسری پیچیدگی اس اسکیم کی یہ ہے کہ ہم اپنا جو سودا یا مال باہر بھیجتے ہیں وہ خسارہ پر بیچتے ہیں اور وہ سارے کا سارا خسارہ وہاں سے اٹھا کر اس کے ساتھ مزید نفع لگا کر درآمدی اشیاء کے واسطے سے اپنے عام آدمی اور گاہک کے سر پر ڈال دیتے ہیں۔ یعنی اس طریق تجارت کا اگر اقتصادی جائزہ لیا جائے تو یہ تجارت ایک قوم کی مجموعی اقتصادیات میں اضاعت کا بہت وسیع پارٹ ادا کر رہی ہے۔ یہ اندازہ کرنا تو مشکل ہے کہ پچھلے چند برس میں مجموعی طور پر اس اسکیم نے قومی اقتصادیات کو کتنی اضاعت سے دوچار کیا ہے، تاہم یہ ظاہر ہے کہ اس کا پیمانہ خاصا بڑا ہے۔ اب یہ تفصیلی محاسبہ و تجزیہ کاری (calculations) کے مراحل طے کرنا آپ جیسے نوجوان طلبہ کے سر آنے والی ذمہ داریاں ہیں۔

کسی قوم کی ترقیاتی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے ہوئے یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ ترقی کی قیمت کیا ادا کی جا رہی ہے۔ میرا محدود سا مطالعہ مجھے اس نتیجہ تک پہنچاتا ہے کہ ہمارے یہاں ترقی جس نوعیت سے اور جس حد تک ہو رہی ہے وہ نہایت ہی مہنگی ترقی ہے جس کی ہم نے بھاری قیمت ادا کی ہے اور ہمیں ابھی اس کی بہت بھاری قیمت مسلسل ادا کرنی ہے یعنی اگر آپ کسی اچھی یا مطلوب چیز کو حاصل کرنے کے بعد جانچیں گے تو اس لحاظ سے جانچیں گے کہ آپ نے اس کے لئے کیا دیا یا کیا دینا پڑے گا؟

آگے چلنے سے پہلے یہ بات پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ ہماری ترقی ہماری اپنی خالص محنت کا یا خالص نہیں تو غالب محنت کا نتیجہ نہیں ہے کہ ہم نے قربانیاں کی ہوں، ہم نے اپنے مفاد چھوڑے ہوں، ہم نے بڑی تنخواہیں قربان کی ہوں، ہم نے اپنے گھر کی جائیدادیں قوم کے قدموں میں ڈال دی ہوں، ہم نے کچھ کارخانے قائم کر کے وقف کر دیئے ہوں، یا اپنے بل بوتے پر کچھ اور شاندار خدمات انجام دی ہوں۔ ہم نے ترقی اس طرح حاصل نہیں کی جیسے ایک آزاد کسان زمین پر اپنی محنت صرف کر کے اس سے فصل حاصل کرتا ہے۔ ہمارا حال اس کسان کا سا ہے جس کی گردن مہاجن کے پنجہ میں آگئی ہو۔ صورت یہ ہے کہ ہماری "تھوڑی سی محنت" اور "تھوڑے سے سرمایہ" کے ساتھ بڑا بھاری قرض شامل ہو گیا ہے۔ اسی قرض کے نتیجہ میں ایک خاص مقدار ترقی دکھائی دیتی ہے۔ سود پر لئے ہوئے اس قومی قرض کا اندازہ یہ ہے کہ ۱۹۷۰ء تک جا کر ہم کو ہر سال سو کروڑ روپے[9] ادائیگی میں صرف کرنے ہوں گے۔ اب ذرا اندازہ کیجئے کہ ایک قوم جس کو کم و بیش تین سو کروڑ روپیہ خوراک کے لئے صرف کرنا پڑے اور جس کو سو کروڑ روپے سالانہ ادائیگی قرض میں دینا ہو اس کا حال کیا بنے گا۔ دو سو کروڑ یا دو ارب روپیہ جس غریب قوم کو بڑی اقوام اور ان کے سرمایہ دار اداروں کے قدموں میں ہر سال رکھ دینا ہو، ذرا یہ بتایئے کہ وہ ترقی کے کتنے پھل کھا سکے گی؟ ہمارے لئے صرف قرض کی قسط ایک ایسا واجب الادا اخراج یا باج

---

[8] دوسرے ماہرین و مبصرین کو چھوڑ کر یہاں میں صرف یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ سٹیٹ بنک کے سابق گورنر جناب ایس اے حسنی نے کم از کم اپنی دو سالانہ تقاریر میں ملکی مالیات اور اقتصادیات کا جائزہ لیتے ہوئے بونس واؤچر اسکیم پر نظر ثانی کی ضرورت کا اظہار کیا ہے۔ (ن۔ص)

[9] ایک دوسرے اندازہ کے مطابق ۱۰۲ کروڑ روپے سالانہ۔ (ن۔ص)

بنتی جا رہی ہے جس کا بار دس روپے فی کس (بچہ، بوڑھا، عورت، مرد، بیکاری، بیمار سبھی پر پھیلا کر) سالانہ ہوگا۔ یعنی ہر شخص کو اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے علاوہ دس روپے سالانہ غیر ملکی قرض خواہوں کے لئے کمانے ہوں گے۔ سات افراد کے کنبہ کے حصہ میں ستر روپے سالانہ آتے ہیں۔ علاوہ ازیں قرض دینے والی قوتیں اپنے ناقص اموال مہنگے داموں بیچ کر اور اپنے ماہرین کی تنخواہوں کی شکل میں ہم سے جو کچھ وصول کرتی ہیں، اس کے بعد قرض کے سرمایہ کا پھل تو مشکل ہی سے ہمارے حصے میں رہ سکتا ہے۔ بس اتنا ممکن ہے کہ کچھ چھلکے ہمیں ملتے رہیں جن کے ساتھ پھل کا گودا لگا رہ جائے۔ پھر ذرا اس ڈپلومیٹک نفوذ اور فکری و ثقافتی تسلط اور داخلی سیاسیات میں مداخلت کا تصور بھی کیجئے جس کے لئے تمام بڑی اقوام بڑے بڑے جال پھیلاتی رہتی ہیں۔

آخری قابل توجہ پہلو اس ترقی کا یہ ہے کہ اس ترقی نے ہماری جھولی میں جو چیز عملاً ڈالی ہے وہ محرومی ہے۔ چند لوگوں کی جھولی میں اس نے یقیناً بھاری بھاری منافع ڈال دیئے ہیں، بعض خوش قسمت افراد کو اس نے سرمایوں اور قرضوں اور پرمٹوں اور لائسنسوں سے نوازا ہے، لیکن اس ترقی نے مجھ جیسے اور آپ جیسے لاکھوں انسانوں کی جھولی میں محرومی کا تحفہ ڈالا ہے۔ یہاں وہ روایتی جملہ صحیح طور پر چسپاں ہوتا ہے کہ امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس عوامی محرومی پر میں اپنی طرف سے کوئی اظہار رائے نہیں کروں گا اور نہ اپنی طرف سے کوئی اعداد و شمار پیش کروں گا۔ میں آپ کو ملک کی ذمہ دار ترین شخصیت کی طرف سے دیئے گئے اعداد و شمار کی طرف توجہ دلاؤں گا۔ جنہوں نے یہ بتایا ہے کہ مشرقی پاکستان میں چالیس فیصد کنبے اور مغربی پاکستان میں چوبیس[۲۴] فیصد کنبے سو روپے سے کم آمدنی رکھنے والے ہیں۔ قومی دولت (National Wealth) اور فی کس آمدنی (Per Capita Income) کے تصور کے ساتھ ذرا یہ حقیقت ذہن میں تازہ رہے کہ سو روپے سے کم آمدنی کے معنی یہ ہیں کہ ملک میں وہ کنبے بھی شامل ہیں کہ جو صفر آمدنی رکھتے ہیں، اس میں وہ بھی شامل ہیں جو پچاس یا ساٹھ روپے آمدنی رکھتے ہیں۔ اب آپ ذرا یہ سوچیئے کہ ایک اوسط کنبہ، جسے ہمارے علمائے اقتصادیات عام طور پر ۵ افراد پر مشتمل قرار دیتے ہیں وہ اگر آج سو روپے ماہانہ بھی پا رہا ہو تو ۲۰ روپے فی کس کے حساب سے زندگی گزارنا کس درجہ کٹھن ہوگا۔ اسی رقم سے آج کل کے نرخ کا غلہ بھی انہیں خریدنا ہے، ان کو کپڑا بھی پہننا ہے، ان کو سر چھپانے کی جگہ بھی چاہیئے، ان کے لئے تعلیم کی ضرورت بھی ہے ان کے لئے علاج کا مسئلہ بھی ہے، ان کی زندگی کے کچھ دوسرے مسائل بھی ہیں، یہ ساری کی ساری چیزیں ذرا آپ سامنے رکھ کر کوئی حساب لگا کر دیکھیں کہ وہ کس طرح زندگی گزارتے ہوں گے، اور پھر جو کنبے اس سے بھی کمتر آمدنی پا رہے ہیں اور ان کی تعداد بہت زیادہ ہے ان پر کیا گزرتی ہوگی؟ اور پھر خوشخبری یہ دی جاتی ہے کہ چند سال کی گردشوں کے بعد یعنی ۱۹۸۰ء تک اس ملک میں کوئی کنبہ ایسا نہیں رہنا چاہیئے کہ جس کی آمدنی سو روپے تک کی نہ ہو۔ بظاہر یہ نہایت اچھی اور خوش آئند بات معلوم ہوتی ہے لیکن یہ ذرا بتائیے کہ آج سے دس یا پندرہ برس کے بعد روپے کی قیمت کیا ہوگی؟ اس روپے سے ہم مختلف ضروریات کتنی مقدار میں خریدنے کے قابل ہوں گے؟

اس ساری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ جس اقتصادی نظام سے ہمیں سابقہ درپیش ہے وہ اجارہ داریوں اور سرکاری تحفظات پر چلنے والا دنیا کا تیز رفتار ترین نظام استکناز ہے اور اس کا نتیجہ عوام کے لئے محرومی ہے۔

اب تک کی گذارشات سے اندازہ فرمایئے کہ ہمارا اقتصادی مسئلہ انتہائی پیچیدہ مسئلہ ہے۔ یہ اس طرح کا مسئلہ نہیں ہے کہ چھومنتر کی طرح کی کوئی چیز میرے یا آپ کے پاس ہو اور تھوڑا سا جاپ کر کے ایک پھونک مارتے ہی یکدم دنیا بدل جائے۔ آج ضرورت ہے کہ کتنے ہی لوگ سر جوڑ کر بیٹھیں، دماغ کھپائیں اور پہلے اس کی مکمل تصویر سب کے سامنے رکھیں اور بتائیں کہ یہ مسئلہ کیا ہے اور اس نے کیا شکل اختیار کر لی ہے؟ یہ

ہمیں کہاں تک لے جائے چھوڑے گا ؟ ابھی تک علمی سطح پہ اقتصادی حالات کا تجزیہ کرنے کی دو ایک کوششوں کے سوا ہمارے دامنِ فکر میں کچھ نہیں ہے۔ یہ آپ کے بڑے بڑے انقلابیان کرام اور بڑی بڑی تبدیلیوں کے نعرے لگانے والے، ان سے اگر آپ پوچھیں کہ یہ موجودہ صورتِ حال کیا ہے اور کیسی ہے تو دو سوا ئے اس کے کچھ بیان نہ کر سکیں گے کہ ہماری دولت صرف دو سو خاندانوں میں سمٹ گئی ہے۔ یہاں ایسے اَنج العالم فقروں کے دانشور تو بہت ہیں، لیکن صاحبِ تحقیق اور تجزیہ کار نایاب یا معدوم ہیں!! یہاں ایک بھی علمی کتاب ایسی نہیں ملتی ہے کہ جس جگہ آج ہم اقتصادی طور پہ کھڑے ہیں اس کی پوری کی پوری تحقیقی تصویر اور قومی معیشت کی داستانِ نشو و نما ہمارے سامنے رکھ دے تاکہ ہم آگے کے لئے سوچ سکیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔

(۲) سلوگنزم کا مرض

اس کیفیت کے اندر رہتے ہوئے کچھ لوگ ہیں جنہوں نے ہمارے سامنے اس انتہائی پیچیدہ مسئلہ کی نئی کلید حل "اسلامی سوشلزم" کے نام سے رکھی ہے۔ مجھے امید ہے کہ بعض لوگ ان میں نیک نیت بھی یقیناً ہوں گے۔ یہ لازم نہیں ہوتا کہ ہر چیز بدنیتی سے سوچی جائے۔ البتہ نیک نیتی کے ساتھ کی ہوئی اچھی باتیں جس طرح لاجواب ہوتی ہیں اسی طرح نیک نیتی کے ساتھ سرزد شدہ غلطیاں بھی لاجواب ہوتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اسلامی سوشلزم کا نسخہ بعض حلقوں میں بہت نیک نیتی سے سوچا گیا ہو اور اس "سلسلۂ سوشلزمیہ" کے چند اصحاب کے متعلق تو واقعتاً میری یہ رائے ہے اور ان کی تحریروں سے پڑھ کر بھی تاثر ہوا کہ ان کے اندر درد پایا جاتا ہے۔ لیکن آیا مسائل کو حل کرنے کے لئے محض درد کافی ہے ؟ میرا خیال ہے کہ اس قسم کے مسائل میں محض درد اگر کافی ہوتا تو پھر مارکس اتنی مغز ماریاں اپنی مشہور کتاب سرمایہ (The Capital) لکھنے میں نہ کرتا۔ صورت یہ ہے کہ ہمارا ذہن غلامی کے زیرِ اثر سہل پسند ہو گیا ہے۔ اس خطرناک بیماری کی تشخیص حکیم الامت نے بڑی کاوش سے کی تھی۔ فرمایا ؎

سہل را جستن دریں دیر کہن
این دلیلِ آنکہ جاں رفت از بدن

سیدھی بات یہ ہے کہ اجتماعی حیثیت میں ہم لوگ شاہانہ حد تک سہل پسند واقع ہوئے ہیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ جب کوئی مسئلہ ہمارے سامنے پیش آئے اور زندگی کی کوئی پیچیدہ گتھی درپیش ہو تو اسے حل کرنے کے لئے کوئی "کھل جا سم سم" قسم کا فارمولا ہونا چاہیئے بس چند لفظوں کے ورد سے بند دروازے کھل جائیں۔ ہم سیاسی و اقتصادی معاملات میں بھی کچھ ذوقِ تعویذ نویسی کے تحت چاہتے ہیں کہ جذبۂ بیتاب کے ساتھ سوچیں، پھر کہیں سے کچھ القا ہو جائے، پھر جو کچھ ذہن میں جمع ہو اسے ایک رسالے یا ایک اخبار کے اندر چھاپ دیں اور اس کاوش کی برکت سے کل نہیں تو دو پرسوں زمانہ کی دو چار گردشوں کے بعد فوراً انقلاب آ جائے اور دنیا بدل جائے۔ مگر یہ دنیا ایسی ٹیڑھی دنیا ہے کہ یہ اس طرح کبھی نہیں بدلی اور اس طرح کے منتروں سے اور اس قسم کے فارمولوں سے یہ کبھی نہیں بدلا کرتی۔ کوئی کنجی ایسی نہیں ہے کہ جسے آپ جا کر کسی لوہارسے اٹھا لائیں اور اس کنجی کو لے کر آپ ان پیچیدہ قفلوں کو کھولتے چلے جائیں جن کی پیچیدگی برسوں میں جا کر مکمل شکل اختیار کرتی ہے۔ ہمارا یہ "سلوگن ازم" سوشلزم اور اسلامی سوشلزم کے علاوہ طرح طرح کے "ازموں" سے غذا حاصل کرتا اور عکس لیتا رہتا ہے۔ یہ ہماری خاص من بھاتی چیز ہے، اور ہماری پوری زندگی میں پھیلی ہوئی۔ جیسی ہم سلوگن کے ذریعہ بڑے سے بڑے معرکہ کو سر کرنا چاہتے ہیں، لیکن ہماری کوتاہ کاری کا عالم یہ ہے کہ خود اپنے ہاں، اپنے فکر اور اپنے تخیل کے مطابق کوئی نیا سلوگن وضع کر کے بھی دنیا کے سامنے رکھنے کے قابل نہیں ہیں۔ بلکہ دوسروں کے ہاں سے مستعار لے کر کبھی

سالم کے سالم اور کبھی مختلف سلوگنوں کے مختلف ٹکڑے لوگوں سے مستعار لے کر ان کو جوڑ جاڑ کے ہم ایک دلفریب سلوگن تیار کر لیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کے سارے مسائل کی کنجیاں ہمارے ہاتھ میں آگئیں اب یہ الہ دین کا وہ چراغ یا جن ہے کہ جس کے ذریعہ سے ہم دنیا میں جو تبدیلی بھی چاہیں پیدا کر سکتے ہیں۔ میں اپنے معاشرے کی ذہنی زندگی کے ایک کمزور پہلو کی طرف متوجہ کرنے کے لئے ایک اجمالی بات کو پھیلا کے بیان کر رہا ہوں۔ میرا منشا یہ ہے کہ کم از کم آپ حضرات اپنی ذمہ داریوں کو پہچانیں اور یہ سمجھ لیں کہ اگرچہ سلوگن بھی اپنی جگہ ضرورت کی ایک چیز ہیں، لیکن جاندار اور موثر سلوگن ہوا میں اُڑتے ہوئے پتے نہیں ہوتے کہ کوئی پتہ امریکہ و برطانیہ کے درختِ افکار سے ٹوٹ کر اڑا اور کوئی پتہ چین یا روس کے شاخسارِ نظریات سے ہوا کے دوش پر سوار ہو کر آپ تک پہنچا اور آپ نے اسے جھپٹ لیا تو گویا زندگی کا وہ نسخۂ کیمیا مل گیا جو آن کی آن میں سارے مسائل حل کر دے گا، یا مختلف اڑتے پتوں کو پیس کر کوئی مرکب تیار کر لیا۔ تو وہ مرکب الجھنوں کو صاف کر دے گا۔ یاد رکھئے ایسے مرکب بالعموم جہلِ مرکب پیدا کرتے ہیں وہ سلوگن جو زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں وہ ہوا میں اڑتے ہوئے پتے نہیں ہوتے، وہ ایسے سلوگن ہوتے ہیں جن کی جڑیں کسی قوم کی ذہنی، روحانی یا فکری زندگی کے اندر ہوتی ہیں۔ سلوگن صرف وہ کام کرتا ہے جس سلوگن کے پیچھے ٹھوس علمی کام موجود ہو، جس پر تادیر لوگوں نے عرق ریزیاں کی ہوں کچھ لوگوں نے دماغ کھپائے ہوں، مسائل کو سمجھا اور ان کو متعین کیا ہو، پھر وہ فکری و علمی کام جب سیاسی میدان میں اثر انداز ہوتا ہے تو وہاں وہ اپنی ضرورت اور اپنے مزاج کے مطابق خود ہی ایک سلوگن یا طغریٰ یا عنوان پیدا کر لیتا ہے۔ لیکن ہم لوگ اس بنیادی کام کو کرنے سے ہر معاملہ میں ہمیشہ کتراتے ہیں اور مزے سے دوسروں کے کئے ہوئے کاموں کے نتیجہ میں سے کچھ اس طرح حصہ وصول کرنے کے خوگر ہیں جس "شان" سے پنجاب میں زمینداروں کے کمیانوں پر جا کر غیر زراعت پیشہ عناصر تیار غلہ لے آتے ہیں۔ ہم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ دوسروں کے درختوں سے کچھ پھول پتے چن کر ہم اپنے ہاں ایک چمن سجا سکتے ہیں۔ یہ بے نظریہ اور بے جان اقوام کی ذہنیت ہوتی ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ اگر ہماری نسل کے لوگ اس معاملہ میں حقیقت کو نہیں پا سکے تو کم از کم نئی نسل اپنی بھاری ذمہ داری کو پہچانے کہ انہیں اپنی قوم کی زندگی کے وسیع اور پیچیدہ مسائل کو حل کرتے ہوئے جہان نو کی تعمیر کن اصول و مقاصد پر ٹھوس طریقہ سے کرنی ہے۔ زندہ قوموں میں بے شمار لوگ وہ ہوتے ہیں جو سیاسی زندگی تو کجا اسرے سے شہرت کی زندگی سے دور دراز کونوں میں بیٹھے اپنی عمریں کھپا دیتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے کاموں سے اور اپنی فکر سے وہ نقوش چھوڑ کر جاتے ہیں جن کی بنیاد پر بڑی بڑی سیاستیں کھڑی ہوتی اور بڑی بڑی تحریکیں چلتی ہیں۔ صرف ہمارے ہاں یہ سستا نسخہ پایا جاتا ہے کہ ہمارے ہاں کا سیاسی آدمی اپنے سرسری مطالعہ و فکر کی بنا پر میدانِ سیاست میں اپنے ایجاد کردہ سلوگن کا سکہ فوری طور پر چلانا چاہتا ہے۔ ہمارے پاس سیاسی نعروں سے بڑی چیز کوئی موجود نہیں۔ اصل ٹھوس گفتگو کے خطوط سے ذرا ہٹ کر میں نے یہ باتیں اس لئے کی ہیں کہ آپ اپنی ایک قومی کوتاہی کو جانچئے کہ وہ کیا ہے؟ اس پر گرفت کیجئے اور کام کرنے کے بے تکے ڈھنگ اور رستے بدل دیجئے۔

(۳) "اسلامی سوشلزم" ہے کیا؟

اسلامی سوشلزم کی اصطلاح پر اس ملک میں جن لوگوں نے آواز اٹھائی ہے ان میں سے بیشتر کے خیالات کو میں نے دیکھا ہے۔ اور میں آپ کے سامنے خود اس کا اعتراف کروں گا کہ اس موضوع پر امکانی حد تک سب سے بہتر استدلال اگر کہیں ملتا ہے تو وہ خلیفہ عبدالحکیم کی کتاب میں ہے۔ میں نے پرویز صاحب کے اسلامی سوشلزم اور ان کے "نظام ربوبیت" کو بھی ان کے مخصوص طرزِ استدلال اور طرزِ بیان کے کمالات کے ساتھ دیکھا ہے، بہرحال ابھی میرے ایک صحافی دوست اور ایک بلند آہنگ پروفیسر کی جو ہیجانانہ نگارشات سامنے آئی ہیں ان سے بھی استفادہ کیا ہے،

جناب سوہارصاحب نے جو پُرزور تقریر اپنی صدارت[9] کے دورِ رفتہ میں کی تھی، اسے بھی پڑھا ہے۔ پھر ان کی باہم دگر ٹکراتی بحثوں کا بھی جائزہ لیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ تیسرے پنجسالہ منصوبہ کے مقدمہ میں بھی یہ اصطلاح مذکور ہے۔ لیکن اس کی کوئی ایسی تصریح یا کوئی ایسا استدلال (سوائے فلاحی سیاست کے تصور کے) اس کے ساتھ نہیں ہے جس سے آپ کوئی نتیجہ نکال سکیں۔ اس لئے یہاں اس کا ذکر کرنا بیکار ہے۔ اس موضوع کی تحریروں اور تقریروں میں سے بیشتر صحافیانہ سطحیت نگاری اور ادیبانہ رنگین بیانی یا سیاسی جذبات انگیزی پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے جسے میں نے بہترین قرار دیا ہے وہ بھی ملت کے سامنے کوئی ایسا روشن راستہ نہیں کھولتی جس پر وہ اطمینان سے ایک مسلمان قوم کی حیثیت سے قدم بڑھا کر یہ سمجھے کہ وہ زندگی کے مسائل کو خالص اسلامی انداز میں حل کرنے چلی ہے[10]۔ بہرحال اسلامی سوشلزم کے نعرے اور نظریے بار بار اٹھے اور ختم ہو گئے۔ ان کا مزاج ہماری اجتماعی فضا سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ ہماری قوم کے جذبات اور اس کا ایمان اور اس کے مقاصد اور اس کا نصب العین ایسے روشن ہو کر اس کے سامنے موجود رہے ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے اس کے نعرے اور نظریے قدم نہیں جما سکے۔ بلکہ مختصر سی جھلک دکھا کر ختم ہو جاتے رہے ہیں۔

لیکن حال ہی میں ستمبر ۶۵ء کے جہاد کے بعد صورتِ حالات ہمارے نئے عالمی تعلقات خصوصاً روس اور چین کی دوستی کے زیرِ اثر جس شکل میں بدل گئی ہے اس میں کچھ لوگوں کو ایک نیا موقع ہاتھ آیا ہے کہ اس نعرہ کو اب نئے مفہوم اور نئے انداز میں بلند کیا جائے۔ لیکن بایں ہمہ اس دلخوش کن سلوگن نے بظاہر جاذبیت کا کوئی بڑا کرشمہ نہیں دکھایا ہے۔ اسے کوئی حقیقی توجہ نہیں مل سکی۔ پھر بھی یہ ایک موضوع ہے اس لئے ہم اور آپ اس کو نظرانداز کر کے کیوں گزریں۔

اسلامی سوشلزم کی اصطلاح میں جو کمزوری اپنی جھلک دکھا رہی ہے وہ سوشلزم سے مرعوبیت ہے۔ اس سلسلے میں جو نیک نیت لوگ بھی ہمارے سامنے ہیں ان کے اندر بھی کم از کم غیر شعوری طور پر تھوڑی سی مرعوبیت لازمی طور پر سوشلزم کے لئے پیدا ہو گئی ہے۔ اس حقیقت کو یہ اصطلاح اور یہ ترکیب خود بول کر بتا رہی ہے۔ اگر کسی غیر جانبدار آدمی کے سامنے، اور کسی دوسرے ملک میں لے جا کر اس کو رکھا جائے تو وہ بھی اس راز کو پالے گا۔ آپ میں سے بہت سے حضرات جانتے ہوں گے کہ ایک اصطلاح کرسچین سوشلزم کی مروّج رہ چکی ہے[11]۔ اور جب آپ اس کے علمبرداروں کے حالات پڑھیں گے تو معلوم ہو گا کہ سوشلزم کے ابتدائی دور میں سرمایہ داری کے اخلاقی مفاسد کے ردِّ عمل میں کچھ عیسائی بھی اس سے متاثر ہوئے تھے، مگر وہ جہاں متاثر تھے وہاں ان میں تحفظِ عیسائیت کا وہ جذبہ بھی تھا جو کمزور مذہبیت میں یہ رجحان پیدا کر دیتا ہے کہ جو کچھ بھی قبول کیا جائے اسے مذہبی بپتسمہ دے دیا جائے۔ کرسچین سوشلزم کے تجربے کا حال اگر آپ پڑھیں تو معلوم ہو گا کہ اس مرکب شکل کو نہ عیسائیت گوارا کر سکی، اور نہ سوشلزم

---

[9] مراد پریس ٹرسٹ کی صدارت ہے۔

[10] یہاں یہ تذکرہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی سوشلزم کے الفاظ پہلے پہل سیاسی میدان میں ایک آدھ بار معمارِ پاکستان اور قائدِ ملت نے بھی استعمال کئے تھے، مگر یہ بات تعین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ انہوں نے اسے محض "اسلامی اجتماعیت" کے معنوں میں استعمال کیا اور اس کے باوجود ان الفاظ کا چلن نہ ہو سکا۔ بعض اصحاب علامہ اقبال کو اپنے حامی گروہ کی حیثیت سے لاکر بڑی زیادتی کرتے ہیں۔ وہ تو سوشلزم کی مخالفت کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ اسلام اپنی جگہ خود ایک طرح کا سوشلزم (نظامِ اجتماعی) ہے لہٰذا مارکسی سوشلزم سے وہ تضاد رکھتا ہے۔

[11] یہ سوال البتہ مجھے پریشان کرتا ہے کہ آخر ہندو سوشلزم، بدھی سوشلزم، یہودی سوشلزم، جینی سوشلزم اور سکھ سوشلزم کیوں ایجاد نہیں ہوئے۔ یہ شرف صرف عیسائیوں ہی کے لئے کیوں مخصوص ہوا کہ انہوں نے اپنا "کرسچین سوشلزم" نکال لیا۔ اب یہ پہلا موقع ہے کہ مسلمان مقابلہ پر آئے ہیں۔ (باقی صفحہ ۴۴۹ پر ملاحظہ فرمائیں)

ہی کا کوئی عنصر زندہ و سلامت رہ سکا۔ یہ آدھا تیتر اور آدھا بٹیر بہت جلدی ناکامی سے دوچار ہو کر ختم ہوگیا۔ آج تاریخ میں کرسچین سوشلزم کا مزار عبرت دلانے کے لئے موجود ہے۔ کرسچین سوشلزم کے علمبرداروں نے مذہب سے خدمتِ انسانیت کا تصور لیا اور کچھ ایسے ادارات قائم کئے اور ایسی سرگرمیاں دکھائیں جو غریب طبقوں کے لئے مفید ضرور تھیں، مگر ان کے بل پر کوئی نظامِ زندگی بننے کا سوال پیدا نہ ہوتا تھا۔ ان حالات میں اگرچہ کرسچین سوشلسٹ پارٹیاں سیاست کے میدان میں بھی جلوہ گر ہوئیں، مگر زیادہ آگے نہ بڑھ سکیں۔ زیادہ دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ یورپ میں مارکسی سوشلزم، کرسچین سوشلزم اور نیشنل سوشلزم کی ساری ریس ہی ختم ہوگئی اور یکے بعد دیگرے ہر گھوڑا وقت سے پہلے ہی گر گیا، اور ان میں سے سب سے پہلے جس ناحوا سے کے پاؤں اکھڑے وہ کرسچین سوشلزم ہی تھا۔ بائبل کے کچھ فقروں کو سوشلزم کے بعض تصورات پر چسپاں کیا گیا، یا ان کا بدل قرار دیا گیا۔ مگر یہ اجتہادی پیوندکاری چل نہ سکی کیونکہ اس کے پیچھے ایک کمزور ذہنیت کام کر رہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اسلامی سوشلزم کے مبلغوں کو عیسائی پیش روؤں کے تجربے کا تفصیلی جائزہ ضرور لینا چاہئیے۔

"اسلامی سوشلزم" یا "سوشلزمی اسلام" کی ماہیت سمجھنے سے پہلے ہمیں خصوصی توجہ خود خالص سوشلزم پر بھی دینی چاہئیے جو زیرِ بحث اصطلاح کا مدرِ ٹکچر ہے کیونکہ سوشلزم کا وجود نہ ہوتا تو اسلامی سوشلزم کا تصور بھی نمودار نہ ہو سکتا۔

(۴) کچھ سوشلزم کے بارے میں

ہماری بدقسمتی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں جو پکا اور مکمل کمیونسٹ اور سوشلسٹ بھی پایا جاتا ہے وہ بھی مطالعہ کے معاملہ میں اتنا بے نیاز واقع ہوا ہے کہ پوری طرح وہ خود بھی یہ نہیں جانتا ہے کہ اس کا یہ محبوب "دین" کہاں سے کس طرح چلا، اس میں کیا کیا ردّ و بدل اور تغیرات ہوئے اور اب وہ کس آخری مرحلہ تک پہنچا ہے، اور آگے اس شترِ بے مہار کی منزل کہاں ہے۔ اس ساری داستان سے بالکل غافل رہ کر وہ وہی راگ الاپ رہا ہے جو مارکس کے دور میں بیٹھا ہوا کوئی شخص الاپ سکتا تھا۔ اس بچارے کو یہ تک معلوم نہیں ہے (پاکستان بھر میں زیادہ سے زیادہ نصف درجن افراد کا استثناء کر لیجئے) کہ وہ سرمایہ داری کبھی کی ختم ہو چکی جس کو سامنے رکھ کر مارکس نے ساری بحثیں اٹھائی تھیں اور اس بچارے کو یہ بھی اطلاع نہیں ہے کہ وہ سوشلزم یا کمیونزم بھی کب کا ختم ہو چکا (بلکہ شروع ہونے کے ساتھ ہی ختم ہونا شروع ہوگیا تھا) جس کو مارکس لے کر اٹھا تھا جہاں اصلی سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کا یہ حال ہو وہاں "اسلامی سوشلزم" کے مبلغین کی تحریروں اور تقریروں میں یہ کرید کرنا بیکار ہے کہ وہ اپنی بات کو خود کہاں تک سمجھ رہے ہیں، اور انہیں اپنے نشتر کی نوک کا کہاں تک اندازہ ہے کہ وہ قیس کی رگِ جاں تک تو نہیں پہنچتی۔ میں نے ایک زمانہ میں لاہور کے حلقوں میں یہ جاننا چاہا کہ یہاں خوب اچھی طرح پڑھے لکھے کمیونسٹ کتنے اور کون سے پائے جاتے ہیں۔ اب برسوں بعد میرا اندازہ یہ ہے کہ ہمارا ملک اس لحاظ سے بھی بے حد غریب واقع ہوا ہے اور یہاں کا سوشلسٹ اور کمیونسٹ بھی مجبور ہے کہ وہ کچھ اشتراکی رجحانات اور سلوگن اور چلتے فقرے اور ڈھلی ڈھلائی اصطلاحات ادھر اُدھر سے "ایڈ" کے طور پر امپورٹ کرے اور انہیں رٹ رٹا کر ان سے کام چلائے۔ اس کے پاس اپنا کچھ نہیں ہے۔ وہ مارکس اور لینن کے اصول و تصورات کو بطور خود حالات پر منطبق (apply) نہیں کر سکتا۔ حتیٰ کہ بھارت اور پاکستان اور

(بقیہ صفحہ ۴۴۸ سے آگے) مگر خطرہ یہ ہے کہ اسلامی سوشلزم میں سے کہیں آگے چل کر دیوبندی سوشلزم، بریلوی سوشلزم، وہابی سوشلزم، شیعہ سوشلزم اور سنی سوشلزم نہ نکل آئے۔ اور اگر دلبہ بھی مقابلہ میں آگیا تو قادیانی سوشلزم بھی نمودار ہو سکتا ہے، نیز اس کے ردِ عمل میں "لاہوری سوشلزم" بھی۔

دوسرے تمام ممالک کے کمیونسٹ ہر معاملہ میں روس اور چین کے اسوہ کو دیکھتے ہیں اور کچھ ماسکو کی فقہ کے مقلد ہیں اور کچھ پیکنگ کی فقہ کے۔

آپ میں سے شاید جان اسٹریچی کو کسی نے پڑھا ہو جو خود ایک روشن دماغ برطانوی سوشلسٹ لیڈر اور مصنف و مفکر تھا۔ اس کے آخری دور کی کئی چیزوں میں سے ایک کتاب اس کے چند لیکچروں کا مجموعہ ہے جو ملایا میں سوشلزم کے متعلق دیئے گئے تھے وہ کہتا ہے کہ کمیونسٹوں میں اور ہم میں یہ فرق ہے کہ یہ لوگ تو بس آنکھیں بند کر کے مکھی کے اوپر مکھی مارتے چلے جاتے ہیں (اور کبھی مکھی مارکس کے دور کی ہوتی ہے اور کبھی لینن کے دور کی) انہیں کچھ پتہ نہیں کہ ایک چیز اب بدل کر کیا ہو گئی ہے اور ایک نظریے کے استعمال کرنے سے کیا نتائج نکل رہے ہیں۔ بلکہ یہ کہ اگر مارکس پرستی یا لینن پرستی کی مستی میں کوئی تجربہ روس میں کیا گیا اور بری طرح ناکام ہوا تو اس کے باوجود چینی کمیونسٹ کے لئے بھی یہ لازم ہے کہ وہ بھی اسی تجربے کو دہرائے اور ویسی ہی ناکامی سے دوچار ہو۔[۲۱] بہرحال خالص اور مکمل سوشلزم کے عقیدت مندوں کو بھی یہ اندازہ نہیں ہے کہ آج کے دورِ مادیت (Age of Materialism) کی پوری تاریخ میں جس نظریہ اور نظام اور جس تحریک کو بدترین اور سنگین ترین ناکامی سے دوچار ہونا پڑا، اپنے اصولوں کے لحاظ سے بھی اور مقاصد کے لحاظ سے بھی، وہ سوشلزم اور کمیونزم ہے میں اس ناکامی کو کبھی کبھی قابلِ رحم ناکامی محسوس کرتا ہوں۔ ہر وہ شخص جو کسی دین کا خادم ہوتا ہے، وہ کسی دوسرے مخالف یا متضاد دین کے ساتھ پیش آنے والے واقعات سے بھی متاثر ہوتا ہے۔ میں یہ دیکھتا ہوں کہ پچاس[۵۰] سالہ لمبی محنتیں اور پچاس[۵۰] سال کے دور کی وہ قربانیاں جو سرخ انقلاب کی خاطر اور سرخ دورِ ڈکٹیٹرشپ کے قدموں میں انسانوں نے بھینٹ چڑھائی ہیں، جن میں رضاکارانہ قربانیوں کے مقابلہ میں مظلومانہ و مجبورانہ قربانیوں کا پلّہ کئی گنا بھاری ہے، وہ ساری کی ساری آج جو حاصل ہمارے سامنے لا رہی ہیں، اس کا اگر بے لاگ تحقیقی جائزہ لیا جائے تو نصف صدی لمبا یہ کاروبار انتہائی خسارے کا کاروبار ثابت ہوتا ہے آپ ذرا اس خوفناک ترین ڈکٹیٹرشپ کا تصور ذہن میں لائیں کہ جس کے ذریعہ کمیونزم یا سوشلزم دنیا کے مختلف گوشوں میں کام کرتا رہا، اور وہ جبری محنت کہ جس سے انسانوں کے گلے کے گلے گزرے، وہ مذاہب کہ جن کا بے دردی سے خاتمہ کیا گیا، انسانیت کی وہ گراں بہا اخلاقی قدریں جو انقلاب کے اندھے لشکروں کے قدموں میں پامال ہو گئیں، ان سب کا حساب لگا کر دیکھئے کہ ان کے عوض میں انسان کی جھولی میں کیا پڑا؟ میں نے اس سلسلہ میں جو کچھ محدود سا مطالعہ اور احوال کیا ہے اس کے بعد میرے لئے تو ۵۰ سال کی قربانیوں کے الفاظ استعمال کرنا بھی مشکل ہے، کہنا یہ چاہیئے کہ ۵۰ سال کی تباہیوں اور مظالم اور تشدد کا حاصل کیا ہے؟ نصف صدی کی تاریخ کا وہ کھیت جس کو انسانی خون سے سینچا گیا، جس کو جبریت کے ٹریکٹروں سے جوتا گیا اور جس میں انسانی کاسہ ہائے سر کی تخم ریزی کی گئی، اس نے آخر اقتصادی اور تمدنی کھلیانوں میں نتائج کی کیا فصل پیش کی ہے؟ سرخ انقلاب کے دریائے خون کا طوفانی ریلا انیس[۱۹] لاکھ انسانی جانوں کو اپنی موجوں کا لقمہ بنا کے سرزمین تاریخ سے گزرا ہے۔

اشتراکیت کی اسی پہلی تجربہ گاہ میں بیس[۲۰] لاکھ افراد سنگین سزاؤں کے کرہوں میں ایک لمبے تسلسل سے پیلے گئے، اور چالیس[۴۰] اور پچاس[۵۰] لاکھ تک کی تعداد ان فرزندانِ آدم کی ہے جن کی زندگی کی جڑیں آبائی وطن کی سرزمین سے اکھیڑ کر ان کو جبریت نے باہر دھکیل دیا۔ اس خونخوار انقلاب

۲۱؎ اسٹریچی نے اس سلسلہ میں کسانوں کی زمینوں کو سرکاری ملکیت میں لے کر اجتماعی کاشت کے تحت لانے کی مثال دی ہے، جس کے بے طرح خرابہ ہونے کے علاوہ روس میں زرعی پیداوار بھی گر گئی۔ مگر جب چین میں اشتراکیت کا دور آیا تو روس کے تجربہ سے سبق لئے بغیر یہاں بھی اسی تجربے کو دوہرایا گیا، اور یہاں بھی زرعی پیداوار کا معیار خراب ہوا۔ البتہ اب روس کے زرعی نظام میں تبدیلی آئی ہے اور اشتراکیت کے زیر نگیں یورپی ممالک میں نسبتاً بڑا فرق زرعی نظام میں پیدا ہو گیا ہے (ن۔ص)

نے اگر انسانوں کی اس عظیم تعداد کو سامنے رکھ کر ان کی اگر محض مزدورانہ قدر (Labour Value) ہی ملحوظ رکھی ہوتی تو وہ ایسے اندھے پن سے کام نہ لیتا۔ پون کروڑ یا ایک کروڑ افراد کی اگر ایک سال کی، دو سال کی، دس سال کی، بیس سال کی عمل مزدورانہ قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جائے تو پھر بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ انقلاب کا سودا کتنے گھاٹے کا سودا تھا۔ مزدورانہ قدر و قیمت سے آگے بڑھ کر اگر ہم تباہ و برباد ہونے والوں کو مرتبۂ انسانیت پر رکھ کر دیکھیں تو تصور کیا جاسکتا ہے کہ ان میں کتنے فکر انگیز دماغ ہوں گے، کتنے حساس قلوب ہوں گے، کتنے شجاعت و سخاوت کی روایات کے امین ہوں گے، اور کتنوں کے سینوں میں اعلیٰ اخلاقی قدروں کے چراغ روشن رہے ہوں گے! وہ لوگ اگر زندہ رہتے تو کسے معلوم ہے کہ اس نصف صدی میں ان کا علمی، فنی، جذباتی اور اخلاقی اضافہ کیا ہوتا۔

بہرحال کتنا عبرتناک حادثہ ہے کہ اتنا کچھ برباد کر دینے کے بعد، ہر شخص کو سی، آئی، ڈی کے نظام[13] میں جکڑ دینے کے بعد، انسانی معاشرہ کو جانوروں کے ایک ریوڑ کی سطح تک گرا دینے کے بعد جس آخری نتیجہ کو حاصل کیا گیا وہ صرف یہ ہے کہ سب کو کسی نہ کسی طرح کا کام مل سکے اور سب کے لئے حالات کی گنجائش کی حد تک سوشل سیکورٹی کا کوئی انتظام[14] ہو جائے! اگر یہی کچھ حاصل کرنا تھا اور اتنی سی کامرانی کے لئے یہ ایک خوفناک طوفانی انقلاب اور پچاس سالہ محنت اور قربانیاں اور بے حساب پروپیگنڈہ، لٹریچر اور بین الاقوامی کیمونزم کی اتنی دھوم دھام ہے تو ——

بریں عقل و دانش بباید گریست

اس کے بالمقابل دیکھئے کہ برطانیہ نے اس ۵۰ سال میں اپنے آپ کو کہاں سے کہاں پہنچایا ہے جو سرمایہ دار ملک ہے (اور میں اس کے مادہ پرستانہ فلسفۂ حیات اور اس پر مبنی اقتصادیات کا بھی ہرگز حامی نہیں ہوں) برطانیہ میں کیا یہ سیکورٹی بغیر کسی خون خرابہ کے بغیر کسی انقلاب کے اور بغیر کسی ہمہ گیر ٹکراؤ کے، لوگوں کو سی آئی ڈی اور تشدد کے نظام میں جکڑے بغیر حاصل نہیں ہوگئی ہے

،اور بعض صورتوں میں کیا اس سے بلند تر معیار پر حاصل نہیں ہوگئی ہے؟ اور اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ دنیا میں برطانیہ ہی وہ سرمایہ دار ملک ہے جہاں یہ عجیب و غریب مثال ملتی ہے کہ برطانوی کیمونسٹ پارٹی اپنی پوری آزادی کار رکھتے ہوئے سالہا سال سے کھلے میدان میں کام کرتی چلی آرہی ہے وہاں کے کیمونسٹ تقریریں بھی کر سکتے ہیں، مضامین بھی لکھ سکتے ہیں ان کی کتابیں بھی چھپتی ہیں، ان کے پاس فنڈ کی بھی کمی نہیں رہی ہے، ان پر اظہار و احتجاج کی کوئی پابندی مسلط نہیں رہی ہے[15]، کوئی آہنی پردہ نہیں ہے، اس کے باوجود برطانیہ ہی وہ ملک ہے جہاں کیمونسٹ پارٹی جمہوری اور انتخابی میدان کے اندر کامل شکست کھا چکی ہے، آج اس کی کوئی موثر آواز نہیں، اس کے لئے آگے بڑھنے کا کوئی راستہ نہیں۔ کیا یہ سارا کچھ سامانِ عبرت

---

[13] اشتراکی نظام جاسوسی کا کوئی تصور آپ کسی فرسودہ ترین معاشرہ میں بھی نہیں کر سکتے۔ اس بے مہر نظام نے شوہروں اور بیویوں اور والدین اور اولاد اور بھائیوں اور بہنوں تک کے درمیان اخلاص کے تعلق کو توڑ کر جاسوسی کا تعلق قائم کر دیا (ن۔ص)

[14] اس معاملے میں ارباب فکر و تحقیق نے اقوام عالم کا ترقیاتی جائزہ لیتے ہوئے یہ اہم نکتہ واضح کیا ہے کہ جہاں کہیں سب کے لئے روزگار اور سوشل سیکورٹی کا انتظام کیا گیا وہاں لازماً مزدوریات کی رسد میں کمی کر کے کام چلایا گیا۔ (ن۔ص)

[15] کئی سال پہلے برطانیہ میں صرف اتنی سی پابندی کیمونزم کے خلاف عائد کرنے کا معاملہ اٹھا تھا کہ کم سے کم تعلیمی اداروں کے سربراہ کیمونسٹ نہیں ہو سکتے مگر اس کے خلاف برطانوی پریس نے سخت احتجاج کیا کہ یہ آزادی رائے کی اس قومی روایت کے لئے خطرہ ہے جس سے تعرض کرنے کا دروازہ اگر ایک بار کھل گیا تو آہستہ آہستہ حکومت اسے وسیع کر کے اور محدود کرتی چلی جائے گی۔

نہیں؟ کیا یہ سب کچھ ہمارا کمیونسٹ پڑھتا اور سوچتا ہے؟ کیا ہمارا سوشلسٹ اس پر غور کرتا ہے کہ گرد و پیش کی دنیا میں کیا کچھ ہو رہا ہے؟ یا اشتراکی نظام جس سے ہم پروپیگنڈہ کی ساحری کے زیر اثر اپنی جگہ اتنے زیادہ مرعوب ہو رہے ہیں اس کی باطنی کمزوری کا عالم یہ ہے کہ دنیا کا کوئی نظام اس درجہ کمزور اور بودا نہیں ہے کہ اگر ایک آدمی بھی اختلاف کرنے والا کسی جگہ پا یا جائے تو اس نظام کے لئے قابل برداشت نہیں ہے۔ ذرا سوچئے یہ نظام اس بات تک کا روادار نہ تھا کہ پیسٹرنیک کا ناول "ڈاکٹر ژواگو"[15] اس کے اپنے ملک میں چھپ سکے، حالانکہ وہ وطن اور انسانیت کی محبت کا آئینہ دار ہے۔ اس ناول کو کچھ اس نظر سے دیکھا گیا کہ بس اس کے روس میں چھپنے سے سارے نظام کی جڑیں ہل جائیں گی۔ ایک ادیب کی نوکِ قلم کی ضرب سے یہ پورا آہنی قلعہ دھڑام سے گر جائے گا۔ اور جو سرخ جہان نو برسوں میں بڑی مضبوط تاریخی اور سائنسی حقیقتوں کی ٹھوس بنیادوں پر مستحکم طریقے سے تعمیر کیا گیا تھا وہ بس پیسٹرنک کی ایک پھونک سے اڑ جائے گا، تقابل کے لئے ذرا مغربی ملکوں کو بھی دیکھ لیجئے ہمیں ان سے اخلاقی، سیاسی اور معاشی نقطۂ نظر سے کتنا ہی اختلاف سہی لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ یہاں بحیثیت مجموعی قانون و اخلاق کی معمولی سی ناگزیر پابندیوں کے اندر جس کا جو جی چاہے بول اور لکھ رہا ہے۔ حکومتوں اور ان کے اکابر کے متعلق لبا اوقات خاصی زلزلہ انگن کتابیں اور اخباری رپورتاژ شائع ہوتے ہیں، سرکاری اور غیر سرکاری نظریات اور تحریکات کے متعلق کھلم کھلا تنقیدی بحثیں ہوتی ہیں، تنظیموں کے مقابلہ میں تنظیموں کا قیام عمل میں آتا ہے، مظاہروں کے مقابلہ میں مظاہرے ہوتے رہتے ہیں، مگر نظام تھوڑا بہت اثر پذیر ہوتے ہوئے اپنی جگہ قائم رہتے ہیں۔ حالانکہ اشتراکی مبلغین ان کو انتہائی فاسد اور کمزور اور بے وقعت قرار دیتے ہیں، موجودہ دور سے ذرا پیچھے جا کر اسلامی دور کو بھی دیکھ لیجئے۔ اظہار کے تمام دروازے چوپٹ کھلے رہے ہیں، تنقید و اختلاف اور مشورہ کا حق ہر شخص کو حاصل رہا ہے، حکومت کے اقدامات پر تبصرے کئے جاتے رہے ہیں، سربراہانِ حکومت (خلفاء) کا احتساب کیا گیا ہے، ان کے خلاف مقدمات دائر ہوئے ہیں اور ان کے دعوے خارج بھی کئے گئے ہیں۔ بیرونی قوموں کے لوگ آتے جاتے رہے ہیں، مسلمان تجارت کرنے کے لئے جدھر چاہتے تھے نکلتے تھے۔ وہ چین آپ کی اس سرزمین پر بھی پہنچے ہیں اور آج آپ کا اسلامی وجود انہی کی یادگار ہے۔ پھر انہوں نے دور دور تک کے جزائر میں جا کر انسانی قلوب و اذہان پر دستکیں دی ہیں۔ زمین کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا۔ وہ اسپین اور فرانس تک پہنچے ہیں، وہ شاہ نجاشی اور سپہ سالارِ ایران کے درباروں میں بے دیانہ سادگی کے ساتھ داخل ہوئے اور اثر لینے کے بجائے اثر ڈال کے آئے۔ کسی کے لئے کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ اسلام نے ان سے یہ نہیں کہا کہ کسی سے نہ ملنا۔ اسلام نے نہیں کہا کہ کوئی کافر و مشرک ہو تو جو نہی تم قریب جاؤ گے مارے جاؤ گے۔ اسلامی نظام کی کھلی فضا میں رواداری کی یہ انتہا تھی کہ جانے پہچانے منافقین نہ صرف موجود رہے بلکہ سازشی اور تخریبی حرکات بھی کرتے رہے۔ مگر اسلامی نظام نے ان کی کبھی کچھ پرواہ نہیں کی۔[16] اشتراکی نظام تاریخ میں اپنی نوعیت کی پہلی مثال ہے کہ جس میں اتنی کمزوری پائی جاتی ہے کہ اگر کسی غیر ملک کا آدمی

---

[15] بیچارے عیسائی مصنف کو ملک سے باہر ناول کی اشاعت اور اس پر نوبل پرائز ملنے کی وجہ سے آخری عمر میں جس ابتلاء سے گزرنا پڑا، وہ خود ایک فسانۂ عبرت ہے (ن۔ص)

[16] اسلام اور اشتراکیت کے نظاموں کی قوت کا تفاوت اس بنیاد پر ہے کہ اسلام فطرتِ انسانی کے تقاضوں کا جامع ہے اور اس کی دعوت انسانوں کو بیرونی دباؤ کے بجائے اندرون سے تبدیل کر دیتی ہے۔ مگر اشتراکی نظام چونکہ فطری تقاضوں سے تضاد رکھتا ہے اس لئے وہ لوگوں کو دعوت و استدلال کے راستے سے فتح نہیں کر سکتا اور نہ ان میں رضاکارانہ تبدیلی لا سکتا ہے، لہٰذا وہ اپنے آہنی خول میں غیر کش جبریت ہی کے ساتھ چل سکتا ہے۔ (ن۔ص)

معاشرے میں آجائے یا خود اپنے ہی کسی شہری میں کوئی بورژوائی یا اختلافی رجحان پایا جائے تو اس کا وجود گویا اس سارے نظام کے لئے ایک مہلک خطرہ ہے ایک جاسوس کا تصور، ایک غیر ملکی کا تصور، ایک چھوٹی سی ناپسندیدہ کتاب کا چھپ جانا، ایک اختلافی مضمون کی اشاعت۔ ایسی چھوٹی چھوٹی چیزوں کو اس نظام نے اپنے لئے ہوّا بنالیا ہے اور ان کا سامنا کرتے ہی اس کا سارا وجود کپکپانے لگتا ہے اور مارے خوف کے اس پر ایک ہیجانی دورہ طاری ہوجاتا ہے۔ آخر یہ کیا بودا کھیل ہے؟

اس کے مقابلہ میں دنیا کے غیر اشتراکی نظام جن کے متعلق تم ہی کہتے ہو کہ یہ سب نظام تو ڈے جانے والے ہیں، ان کا حال یہ ہے کہ جاؤ وہاں جاکے جو چیز چاہو چھاپو، چھپواؤ، پھیلاؤ اور تقسیم کرو اور لندن کے ہائیڈپارک میں جاکر کھڑے ہوکر کمیونزم کی شان میں قصیدے پڑھ لو، تمہیں کوئی پکڑنے والا نہیں، سوائے اس کے کہ بغاوت کی جائے۔ مگر آپ کا مرعوب کن سوشلزم اس کی گنجائش نہیں دیتا۔ ایسے بودے پن کی کوئی اور مثال سوائے کمیونزم یا سوشلزم کے دنیا میں نہ مل سکے گی۔ اسی لئے آہنی پردے آویزاں کئے گئے ہیں۔ اس نظام کی شدید ترین مشکل یہ ہے کہ جہاں ذرا سا اختلاف پیدا ہوا، تو اختلاف کو خوبصورتی سے حل کرنے کا کوئی راستہ اس نظام کے اندر موجود نہیں ہے۔ کوئی مشینری ایسی نہیں ہے جو اس ضرورت کو پورا کرے۔ ادارات نہیں ہیں جن میں بیٹھ کر کھلے دل سے بات کی جائے، آزادانہ لین دین ہو، نقطہ ہائے نظر میں کچھ کتر بیونت ہو اور مسئلہ کو ہنسی خوشی حل کرلیا جائے۔ اس طرح کی کوئی گنجائش اس نظام کے اندر موجود نہیں ہے۔ بلکہ اختلافات کے حل کا واحد راستہ ہے تو یہ ہے کہ ایک گروہ اٹھے اور دوسرے گروہ کو بھنبوڑ ڈالے۔ پھر چند سال گزریں، پھر کوئی اختلاف پیدا ہو، پھر ایک گروہ اٹھے اور دوسرے گروہ کو مسل ڈالے۔ یہ تماشہ ہے جسے ہم پچاس سال سے دیکھ رہے ہیں۔ اختلافات کو حل کرنے کے جو ڈرامے روس میں ہوئے وہ تو پرانے ہوگئے اب جو تازہ ڈرامہ اس مقصد کے لئے اشتراکیت نے ریڈگارڈ کے ہنگامے کی شکل میں پیش کیا ہے، دیدنی ہے۔ یوں دکھائی دیتا ہے جیسے اشتراکی معاشرے روما کے تاریخی دنگلوں کی مانند ہیں۔ بایں ہمہ سوشلزم کی تعریفیں چھپ چھپ کر ہمارے سامنے آتی ہیں۔ کہ یہ نظام ایسے اور ایسے معجزے اور کرشمے دکھا سکتا ہے۔ یہ غریب کو امیر بنا دے گا۔ اور یہ مزدور کے کان میں پھونکتا ہے کہ جیسے کل ہی سے تم اس کارخانے کے مالک ہوجاؤ گے جس میں آج تم مزدوری کر رہے ہو۔ لیکن جن ملکوں میں اس کو "مالک" بنا دیا گیا ہے ان میں اس غریب کا حال ویسا ہی ہے جیسے کسی خچر اور کسی ٹٹو کو ڈنڈے کے زور سے سارا دن استعمال کرنے کے بعد مقررہ تھان پہ باندھ دیا جائے اور بھوسہ چارہ ڈال دیا جائے[۱۸] اور صبح پھر ان کے بے بس ریوڑوں کو ہانک کرلے جایا جائے[۱۹]

---

[۱۸] بھوسہ چارہ بھی ان کو آرام سے فراہم نہیں کردیا جاتا، بلکہ اس کے لئے انہیں ڈپوؤں پہ قطاریں لگا کے کھڑے ہونا پڑتا ہے، اور ضرورت یا خواہش سے کم ہی پہ اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ اس سلسلہ میں آپ حضرات اجرتوں اور قیمتوں اور روس کے اشتراکی سسٹم کا سال وار مطالعہ کریں (ن۔ص)

[۱۹] دراصل اشتراکیت کے جو کچھ بھی پیداآوری کرشمے دکھائے جاتے ہیں (اور وہ کوئی غیر معمولی معیار پیش نہیں کرتے) وہ نتیجہ اسی امر واقعہ کا ہیں کہ بے بس انسانوں کے گلے کے گلے ہیں، جن کی محنت من مانے طریقے سے استعمال کی جاتی ہیں۔ آدمیوں کو اگر بیل بنا کے رکھا جا سکے تو یقیناً بعض کمالات لاجواب قسم کے ہوں گے۔ فراعنہ کے اہرام بھی نہ بن سکتے اگر انسانوں کو حیوانیت کے سانچہ میں ڈھال کر استعمال نہ کیا جاتا۔ (ن۔ص)

مزدوروں کی اپنی ڈکٹیٹر شپ یا حکومت میں مزدوروں ہی کو نہ بولنے کی اجازت ہے، نہ جلسہ کرنے کی، نہ تقریر کرنے کی، نہ ٹریڈ یونین بنانے کی، نہ کوئی مطالبہ رکھنے کی، نہ اختلاف کرنے کی، نہ اسٹرائک کی، بلکہ اگر کوئی مزدور ایک شہر کو چھوڑ کر دوسرے شہر کو جانا چاہے، اگر رشتہ داروں سے ملاقات کے لئے ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصے کا سفر کرنا چاہے، یا ایک کارخانے سے دوسرے پیشے یا صنعت میں جانا چاہے تو ان میں کوئی چیز بھی اس کے ذاتی اختیار میں نہیں ہے۔ ان معاملات کے لئے لازم ہے کہ وہ باقاعدہ اجازت نامہ حاصل کرے اس طرح کی زندگی تک جو نظام پہنچاتا ہے، میں نہیں سمجھ سکا کہ کوئی بیدار دل مسلمان اس سے کس طرح مرعوب و مسحور ہو سکتا ہے۔

اس جملۂ معترضہ کے بعد ذرا ہم اسی موضوع کی طرف لوٹ چلتے ہیں کہ اپنی غلطیوں کی اصلاح اور تجربوں سے سبق سیکھنے کے لئے اشتراکی نظام میں کوئی مشینری نہیں ہے۔ غلطیاں ہر نظام سے ہوتی ہیں، ہر فرد سے ہوتی ہیں، اور ہر ادارے سے ہوتی ہیں دنیا میں کوئی اس سے محفوظ نہیں، وہی جان اسٹریچی[1] جس کا میں نے ابھی ذکر کیا تھا لکھتا ہے کہ برطانیہ نے بھی بڑی بڑی بھاری لغزشیں (blunders) کھائی ہیں اور مہا غلطیاں کی ہیں مثلاً ہٹلر کے مقابلہ میں جنگ کو ملتوی کرنے کی غلطی کو اس نے ایک مثال کے طور پر رکھا ہے کہ ایک جنگِ معلق کو چند برس کے لئے ملتوی کر کے قوم کو جنگ عظیم ثانی کی مصیبتِ عظمیٰ سے دوچار کر دیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود چونکہ برطانیہ کے جمہوری نظام میں غلطیوں کی اصلاح کر لینے اور ان کے نتائج سے عہدہ برآ ہونے کی مشینری موجود ہے، اس لئے لڑے بھڑے بغیر مسائل حل ہو جاتے ہیں اور غلطیاں مستقبل کے لئے سبق بن جاتی ہیں۔ لیکن اشتراکی نظام میں کوئی خودکار مشین غلطیوں کی اصلاح کرنے کے لئے موجود نہیں ہے کہ آپ قیادت کی بڑی سے بڑی غلطی پر بھی ٹوک سکیں۔ کسی کی مجال ہی نہیں ہے کہ کارپردازوں کو یہ کہہ سکیں کہ تم غلطی کر آئے ہو۔ کسی اخبار، کسی ادارے، کسی جماعت، کسی تنظیم کے لئے اس جسارت کا موقع نہیں کہ وہ خداوندانِ نظام سے کہہ سکے کہ آپ سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ بلکہ زبان و قلم سے ایک ہی بات ادا ہو سکتی ہے کہ حضور نے جو کچھ کیا وہ ٹھیک ہی کیا، کوئی خرابی یا مصیبت سر آ پڑی ہے تو وہ یا تو سرمایہ دار ملکوں اور سامراجی قوتوں کی وجہ سے ہے یا ملک کے اندر چھپے ہوئے بورژوائی اثرات کا نتیجہ ہے۔ کیمونزم اور سوشلزم کی یہی وہ شان ہے جس کی وجہ سے بعض ممالک کے انقلابی سربراہ یا کارفرما پارٹیاں سوشلزم کو اپنے لئے پسند کرتی ہیں۔ اس طرح اختلاف اور تنقید سے نجات پاکر کارفرما طاقتیں کروڑوں انسانوں کی قوتوں کو بے زبان جانوروں کی صورت میں استعمال کرنے کے قابل ہو جاتی ہیں۔

کیمونسٹ سرخ جنت کی شانِ استبداد (جس میں مفکرین اور ادیبوں کے لئے ذہنی استبداد بھی شامل ہے) اور تنقید و اختلاف کے راستوں کی بندش کے خلاف جن بہت سے تارکینِ روس نے اپنے آپ کو بہترین احتجاج بنا کے پیش کیا ہے، ان میں تازہ ترین اضافہ اسٹالین کی بیٹی سوتیلانہ کا ہے۔ سوتیلانہ نے اگر اپنا مختصر سا بیان نہ بھی دیا ہوتا، اور اس کی مجوزہ کتاب نہ بھی شائع ہو سکے تو بھی اس کا خاموش وجود روسی معاشرے کے حلق سے نکلی ہوئی ایک اضطراب انگیز چیخ ہے۔

مارکسی سوشلزم اپنے آغاز ہی سے جس داخلی تحریف سے دوچار ہوا ہے اور جس کا سلسلہ برابر جاری ہے اور جس کی وجہ سے حقیقی سوشلزم کے

---

[1] مارکسزم اور سوشلزم کے مسائل پر اس نے کام کی بہت سی چیزیں لکھی ہیں۔ جن میں کارل مارکس کی کتاب سرمایہ کی تلخیص ممتاز مقام رکھتی ہے۔ نہایت ہی ادق بحثوں کو اس نے بڑے سادہ اور واضح انداز میں مرتب کر دیا ہے۔ اور قارئین کو کتاب سرمایہ کے طول و اطناب کے چکر سے نجات دلا دی ہے۔

تمام اصول و مقاصد مسخ ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس کا مطالعہ کرنے کے بعد میرا ایمان اس حقیقت پر اور بھی زیادہ مضبوط ہو گیا ہے کہ انسانی ساخت کے نظریات اور نظاموں کا ہمیشہ یہی حشر ہوتا ہے اور سوائے خدائی قانون و ہدایت کے کوئی شئے پائیدار اور محکم نہیں ہے۔

مجھے اس موقع پر اپنی ایک پرانی بات یاد آ رہی ہے جو چند برس پہلے میں نے لکھی تھی کہ ایک ہی مادہ پرست تہذیب کے پیدا کردہ دونوں نظام۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت۔ اپنے انتہاپسندانہ موقف سے سرکتے سرکتے یہاں تک پہنچیں گے کہ اول الذکر سرمایہ دارانہ اجتماعیت (Capitalistic Socialism) اور ثانی الذکر اشتراکی سرمایہ داری (Socialistic Capitalism) میں بدل جائے گا۔ اس روز سے جب سے میں نے اسلام کو شعوری طور پر بہ حیثیت ایک تحریکِ فلاحِ انسانیت جانا ہے، میں اس راز سے آگاہ ہوں کہ انسان کے من گھڑت نظریات اور الہامی روشنی سے محروم نظاموں کی فطرت میں انتہاپسندی اور یک رخے پن کی وہ خرابی موجود ہوتی ہے جو انہیں کسی متوازن موقف پر ٹکنے نہیں دیتی، بلکہ دیوار سی گھنٹے کے پنگر کی طرح پہلے ایک سرے پر لے جاتی ہے اور پھر دوسرے سرے کی طرف لوٹا دیتی ہے۔ انسانی تاریخ کا بیشتر حصہ ایسی ہی خردمندانہ حماقتوں پر مشتمل ہے۔ اپنے اسی شعور کی بنا پر بعض آثار کو دیکھتے ہوئے میں نے وہ پیشگوئی کی تھی جس کی صداقت کی گواہی آج کے واضح حالات دیں گے۔

اس دور کی ٹریجڈی یہی ہے کہ پہلے سرمایہ دارانہ نظام نے انتہاپسندی دکھائی اور فرد کو بے قید آزادی دے کر سرمایہ دار کے لئے لوٹ مار کا میدان کھول دیا، اور پھر اس کے ردِّعمل میں اشتراکیت نمودار ہوئی تو اس نے فرد کو اجتماعیت کے سامنے بالکل بے بس کر کے ڈال دیا۔

اب یہ دونوں نظام تجربہ گاہِ وقت میں حالات کی مار کھا کھا کر اپنے انتہاپسندانہ مقاموں سے سرک رہے ہیں۔ خصوصاً اشتراکیت کا تو بُرا حال ہوا ہے، جس کے عظیم الشان سائنسی اصول اور تاریخی دعوے چکنا چور ہو گئے ہیں۔ آمدنیوں کی مساوات کا تصور ختم ہوا اور اقتصادی تفاوت کی خلیج مختلف عناصر کے درمیان اتنی وسیع ہوئی کہ سرمایہ داری بھی شرمسار ہو کر رہ گئی۔ طبقات مٹانے کے دعوے کا حشر یہ ہوا کہ پولٹ بیورو، رُوسی پریذیڈیم، جاسوسی ادارے اور دوسرے سرکاری افسروں اور دانشوروں اور ماہرینِ فنون پر مشتمل ایک نیا طبقہ ابھرا اور اس نے اشتراکی نظام میں وہی جگہ سنبھالی جو سرمایہ دارانہ نظام میں اصحابِ سرمایہ کو حاصل تھی۔ اسی طرح اشتراکی نظام نے پکارا تھا کہ دنیا بھر کے مزدورو متحد ہو جاؤ، مگر اب یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجئے کہ دنیا کے مزدوروں کو پکارنے والے دو فریق (روسی اور چینی) خود اپنا ہی اتحاد کھو بیٹھے ہیں اور ان کی باہمی چپقلش نے دنیا بھر کے اشتراکیت پسند مزدوروں اور ان کی رہنمائی کرنے والی کمیونسٹ پارٹیوں میں پھوٹ ڈال دی ہے۔ مارکسزم اور اشتراکیت کا بنیادی تصور تمام سرمایہ دار ملکوں اور نظاموں سے ناقابلِ مصالحت تصادم، اور مسلسل جنگ (گرم جنگ نہ ہو تو سرد جنگ) پر مشتمل تھا، مگر آج اشتراکیت نے سرمایہ داری کے ساتھ ہم وجودیت کا نیا رشتہ پیدا کر لیا ہے۔ پھر بین الاقوامی سوشلزم کی تحریک کا ٹاٹ پیٹ کر اسے آہستہ آہستہ نیشنلزم کی پست سطح پر گرا دیا گیا ہے۔ پہلے انفرادی ملکیت کو بالکل ختم کرنے اور پھر صرف پیدا آوری ذرائع کو قومی ملکیت میں لینے کے ساتھ انفرادی ملکیت کو محدود تر رکھنے کا جو ضابطہ اختیار کیا گیا تھا۔ اب اس میں اتنی ڈھیل آ چکی ہے کہ اب ہر شخص رقوم بنکوں میں جمع کر کے سود وصول کر سکتا ہے، اور شہری آپس میں اشیاء اور سروسز کی خرید و فروخت کر سکتے ہیں۔ زمینوں اور مکانوں کی ملکیت کے دروازے بھی کھلنے لگے ہیں۔ اصل میں مارکس نے مکالماتی تاریخی اور سائنسی سوشلزم کا جو اٹل تصور دیا تھا، لینن نے اس میں عملی تقاضوں کا ذرا سا چھید پیدا کر لیا۔ یہ چھید بعد میں بڑھتے بڑھتے اصولی تغیر کے لئے ایک شاہراہ بن گیا۔ اب وہ تاریخی اور سائنسی اور بین الاقوامی سوشلزم روس میں پچاس سالہ تجربے سے گزرنے کے بعد ایک قومی ریاست میں تبدیل ہو گیا ہے[۷۱]۔ روس کا قومی ریاست کی حیثیت اختیار کر کے مارکسی سوشلزم سے تضاد پیدا کر لینا ایک ایسی واضح حقیقت ہے کہ نہ کسی جاننے والے کو اس کا دعویٰ کرنے میں کوئی جھجک ہو سکتی ہے، اور نہ کسی سننے والے کو ایک حقیقت کے حقیقت ہونے سے

انکار کرنے کی کوئی گنجائش ہے۔ روس کا قومی ریاست بن جانا دینِ مارکسیت کے لحاظ سے کتنا بڑا کفر و فسق کیوں نہ ہو، میری نگاہ میں انسانی نقطۂ نظر سے یہ کوئی بڑا حادثہ نہیں۔ بڑا حادثہ اگر ہے تو یہ ہے کہ روس قومی ریاست بننے کے بعد دنیا کی ان دوسری قومی ریاستوں کی طرح جو اقتصادی اور جنگی اور سفارتی طاقت کے لحاظ سے پیش پیش ہیں، آہستہ آہستہ ایک نوآبادیات گر سامراجی قوت بن گیا ہے۔ میرے اس دعوے کو پرکھنے کے لئے آپ صرف دو حقائق کا مطالعہ کریں۔ ایک یہ کہ روس نے پہلے اپنے وفاقی علاقوں کے الحاق اور وہاں کی کثیر التعداد مذہبی و نسلی اقلیتوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا، اور پھر اپنے حدود سے باہر اس نے یورپ کی چھوٹی چھوٹی قریبی ریاستوں کو، یرغمال کرنے اور پھر ان کو دبوچ رکھنے کے لئے کیا کیا اقدامات اور کس کس طرح کی کارروائیاں کیں۔ خصوصاً پولینڈ، لتھوانیا اور ہنگری کی روداد و دو بغور مطالعہ کرنی چاہیئے۔ اور ادھر دوسری اشتراکی یلغار جس طرح تبت پر ہوئی اور انقلاب انگیزی کا جو ناکام تجربہ انڈونیشیا میں ہوا وہ قابلِ توجہ ہے۔ دوسرا یہ کہ آپ مختلف ذرائع سے پیش کردہ اعداد و شمار کی روشنی میں دیکھیں کہ ایک طرف روسی ترکستان میں خام زرعی اجناس اور صنعتی پیداوار دون کا تناسب کیا ہے، اور دوسری طرف متذکرہ یورپی ممالک کے ساتھ روس کی تجارت درآمد و برآمد کیا بتاتی ہے؟ کیا چیزیں کس مقدار میں اور کن قیمتوں پر لی جاتی ہیں اور جواباً کیا کیا مصنوعات و اجناس کس مقدار اور کس قیمت پر فراہم کی جاتی ہیں۔ نیز روس کے وفاقی علاقوں کی آبادی میں کس طرح تبدیلیاں کی گئی ہیں اور یورپین نوآبادیوں میں روسی فوج اور ماہرین اور عہدہ داروں کا نفوذ کتنا ہے۔ ان حقائق کے بعد اگر کوئی تیسری چیز دیکھنے کی ہے تو وہ سفارتی ہتھکنڈے اور "ایڈ" وغیرہ کے پروگرام ہیں جن کے خطوط ٹھیک نوآبادیات ساز سرمایہ دار ممالک کی سامراجیت سے مطابقت رکھتے ہیں۔ ایک مخالفِ سرمایہ داری اور سامراج دشمن نظام جس طرح اپنے محبوب فلسفہ و دین سے اکھڑ کر ایک متضاد شکل اختیار کر گیا ہے وہ تو بول بول کر اپنی ناکامی کا اعلان کر رہا ہے۔ پھر وہ کس دنیا کے دانشور ہیں جو اس کے بعد بھی سوشلزم میں کوئی کشش اپنے لئے پاتے ہیں۔ ان کا حال تو اس پاگل ماں کا سا ہے جو اپنے مردہ بچہ کو سینے سے چمٹائے اسے لوریاں دے رہی ہے اور اس کی سڑتی ہوئی لاش کی تجہیز و تکفین کی اجازت نہیں دیتی۔

اصل میں ہم نے حقائق و دلائل کا جو راستہ اختیار کیا ہے، اس کے بالمقابل سوشلزم بعض لوگوں پر لاشعوری نفسیات کے پیرائے میں اثر انداز ہے۔ یہ لوگ نہ تو سوشلزم کے نظریاتی تجزیہ میں پڑنے کی تکلیف گوارا کرتے ہیں اور نہ اس سے متعلق واقعاتی حقائق کا مطالعہ کرنے میں وقت ضائع کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ ان کا ایک لاشعوری رجحان یہ ہے کہ سوشلزم مغربی سامراجیوں کے خلاف استعمال کرنے کے لئے ایک اچھا انتقامی حربہ ہے۔ دوسرا رجحان یہ ہے کہ سوشلزم بہ حیثیت نظریہ کوئی اعجاز آفریں قوت ہے جو اقتصادی مسئلہ کو بھی حل کر دیتی ہے اور اپنے ماننے والوں کو ترقی کے راستے پر بھی ڈال دیتی ہے۔ اس رجحان کے سرشار مشکل ہی سے اس پر غور کر سکتے ہیں کہ پچھلی صدی بھر کے یورپ میں یہ اعجاز آفریں نظریہ کیوں جڑ نہ پکڑ سکا؟ یا روس اور چین کے وہ تاریخی احوال و اسباب کیا تھے، جنہوں نے ان کو سوشلزم کا تجربہ کرنے کے لئے میدان میں اترنے کا موقع دیا؟ یا

[illegible] اب بین الاقوامیت کا شائبہ بس اتنا ہی رہ گیا ہے کہ دوسری قومی ریاستوں کو نظریاتی لحاظ سے زیرِ اثر لانے کی کوشش کی جاتی ہے، وہاں کی کمیونسٹ پارٹیوں کو خفیہ اور بالواسطہ طریقوں سے تقویت دی جاتی ہے، افرو ایشیائی اور اسی طرز کی ادبی، صحافی اور دوسری سماجی منظم (مگر مائل بہ سیاست) تنظیموں میں نفوذ پیدا کیا جاتا ہے اور انہیں بین الاقوامی پروگراموں میں استعمال کیا جاتا ہے، جہاں کہیں مغربی سامراج کا زور ٹوٹ رہا ہے وہاں اسے توڑنے میں مدد دیکر جو خلا پیدا ہو اسے خود آگے بڑھ کر پُر کرنے کا اقدام کیا جاتا ہے، نیز جن ممالک میں اشتراکی انقلاب کیلئے حالات سازگار ہو جائیں وہاں افراد، اسلحہ اور روپیہ کو استعمال کر کے تاریخ کو دھکا دیکر وقت سے آگے بڑھا دیا جاتا ہے (ن۔ص)

جاپان، میکسیکو، مغربی جرمنی اور سویڈن جیسے ممالک سوشلزم کی اعجاز آفرین قوت استمداد کے بغیر کیوں اور کیسے ترقی کر گئے ہیں؟ یا جبریت میں کسی ہوئی آبادی کی محنتوں کا دورِ غلامی کی طرح کسی مرتکز طاقت کے اشاروں پہ استعمال جو کرشمے دکھاتا ہے، وہ کہاں تک کسی فلسفہ و نظریہ کے معجزات میں شمار ہونے چاہئیں؟ ان حضرات کا تیسرا لاشعوری رجحان ذوقِ استعجال ہے جس کے تحت ان کو یہ خوش فہمی لاحق ہے کہ بس ادھر سوشلزم یا جزوی یا مرکب سوشلزم آیا، اور اُدھر ہر طرف روٹی ہی روٹی جلوہ گر ہوئی۔ یہ لاشعوری رجحان ان کو یہ باتیں سوچنے کا موقع کہاں دیتا ہے کہ جو نظریہ ایک معاشرے کا پورا ڈھانچہ توڑ کر تشکیلِ نو کرنا چاہتا ہو اس کا انقلاب لمبی مزاحمتوں سے گذرے بغیر نمودار نہیں ہو سکتا، اور وہ نمودار بھی ہو جائے تو وہ دس پندرہ برس تک خواص و عوام سب کو پہلے سے بدتر حالات اور کمتر دولت و رسد پہ وقت گزاری کرنے کے بعد کچھ محسوس اقتصادی نتائج دے سکتا ہے۔ اور پوری آبادی کے لئے اچھا متوسط معیارِ زندگی فراہم کرنے کے لئے تو نصف صدی بھی کافی نہ ہوگی[22]۔ یعنی راستہ آپ آئینی و جمہوری اور تدریجی تبدیلی کا اختیار کریں یا پر تشدد انقلاب کا، اقتصادی مسئلہ بہرحال حل ہوتے ہوتے ایک مدت دراز لیتا ہے۔

مگر اس کا کیا علاج کہ ہمارے ہاں سوشلزم کی یہ ایسی نئی قسم ایجاد ہوگئی ہے جسے میں نے "حشیشی سوشلزم" کا عنوان دیا ہے یہ حسن بن صباح کے ایجاد کردہ پیری مریدی کے خانقاہی نظام کے مماثل ہے۔ جس کے تحت ہر نئے شکار کو ایک جامِ حشیش پلا کر مصنوعی جنت کا سبز باغ دکھا دیا جاتا تھا اور پھر وہ حشیش کا نشہ اترنے کے بعد مریدی کے سحر میں مبتلا ہو کر خوشی خوشی قتل اور دوسرے جرائم کرتا تھا۔ ٹھیک اسی طرح ہمارا حشیشی سوشلسٹ سرم کے نعرے کا ایک جامِ حشیش پی کر جب بہک جاتا ہے اور سرخ جنت کی خیالی جھلک دیکھ لیتا ہے تو پھر وہ مارکسزم لینن ازم کے گدی نشینوں کا مدِ جبوں کیش بن کر ہر قسم کی سازش اور تشدد کاری کے لئے تیار ہو جاتا ہے اور پھر وہ اپنے سلوگنوں اور نعروں کے ذریعہ یہی حشیشی سحر مزدوروں اور سالوں پہ طاری کر کے ان کو انگلیوں پہ نچاتا ہے۔

معذرت چاہتا ہوں کہ اس حشیشی سوشلزم کا مجھے کوئی توڑ نہیں مل سکا۔

(۵) "اسلامی سوشلزم" اور اس کے مضمرات

اب ہم گفتگو کے دو ضروری پہلوؤں سے گذر کر اپنے موضوع کے اہم ترین حصے تک آ گئے ہیں۔ یعنی اب سوال یہ ہے کہ آخر یہ اسلامی سوشلزم کیا شئے ہے اور اس کے مضمرات کیا ہیں۔

پہلا سوال تو یہ ہے کہ اس ترکیب کو کس طرح بنایا گیا ہے؟ اس میں کیا مناسبت ہے؟ آیا یہ صفت موصوف پر مشتمل ہے؟ اگر ایسا ہے تو کیا اصل اسم یا شئے "موصوف" ہے جس کے ساتھ "اسلامی" کا لفظ بطور صفت لگایا گیا ہے؟ نیز کیا فرق ہوگا اگر اسلامی سوشلزم کو "سوشلسٹی اسلام" کی ترکیب سے [illegible] دیا جائے؟ (بظاہر ترکیب سازوں کا منشا دوسری صورت میں زیادہ واضح ہو جاتا ہے) وہ سوشلزم کو ایک خاص قسم کے بجائے

---

[22] روس میں نصف صدی گذر جانے کے باوجود نہ تو خوراک اور اشیائے صرف کی رسد کانی کسی اوسط کسی مغربی سرمایہ دار ملک کے برابر ہو سکا ہے، اور نہ آج تک وہاں رہائش کا مسئلہ ہی اطمینان بخش طریقہ سے حل ہو سکا ہے۔ ایک ایک کمرے میں کئی کئی لوگ انتظارِ فردا میں پڑے سڑتے ہیں، اور ان میں بعض کا سماجی مرتبہ بھی کچھ کمتر نہیں۔ ہاں البتہ خلائی جہازوں اور راکٹوں اور میزائیلوں کی تیاری خاصے زور پہ رہی ہے۔ یعنی کارِ زمیں کو ناتمام چھوڑ کر آسمان پہ وازی، اور حالتِ امن کی ضروریات پوری کرنے کے بجائے تیاریٔ جنگ کا دلچسپ سلسلہ جاری ہے۔ ایسے میں روس کے لوگ بھی دل خوش کریں، اور دنیا کے کمیونسٹ بھی اس پہ سرخ سویرے کے گن گا لیں۔ (ن۔ص)

اسلام کا ایک مخصوص تصور پیش فرماتے ہیں۔ یا کیا یہ دو مختلف عناصر کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی اور ایک مرکب نسخہ تیار کیا گیا ہے جس کی مثال کرسچین سوشلزم کی صورت میں ہمارے سامنے آچکی ہے۔ پھر یہ ایک عجیب و غریب بات ہے کہ اس اصطلاح کے علمبردار پورے قرآن کو ایک طرف رکھ کر، اس کے دوسرے وسیع تقاضوں کو نظرانداز کر کے اپنی پسند کی چند آیات کو استعمال کرتے ہیں۔ اور یہی چند آیات، خلیفہ عبدالحکیم سے لے کر پروفیسر محمد عثمان تک سب کے ہاں برتی جاتی ہیں۔ ان حضرات کی ایک پسندیدہ آیت ہے" قل العفو"[۲۳]۔ دوسری ہے ان الارض للہ یورثھا من یشاء من عبادہ۔ تیسری پسندیدہ آیت ان کے ہاں" لکیلا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم" ہے۔ آیات کی طرح حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال میں سے بھی چند اجزاء انہوں نے چھانٹ لئے ہیں۔ پھر صحابیوں کی وسیع صف میں سے انہوں نے بطور خاص سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو منتخب کر لیا ہے۔ اسی طرح تاریخی واقعات و نظائر میں سے بھی صرف اپنے مطلب کی چیزیں نکال لی ہیں۔ پورے اسلام اور اس کے تقاضوں کو لینے کے بجائے اس کا ایک جزء مجموعی نظام توازن سے الگ کر کے لے لیا گیا ہے تاکہ اس کا پیوند سوشلزم کے ساتھ لگ سکے۔ اسلام کے پورے ڈھانچہ کو نظرانداز کر کے جس میں اجتماعی عدل کے اہتمام کے ساتھ انفرادی آزادی اور حقوق ملکیت کا تحفظ اور آمدنیوں کے تفاوت کے مستند نظائر موجود ہیں، ایک مخصوص قسم کا محدود اقتصادی تصور اخذ کر لیا گیا ہے۔ پورے اسلام سے جب اس محدود تصور کو ایک بار کاٹ لیا گیا تو اب جہاں چاہیں آپ اٹھا کے لے جائیں اور جس شئے کے ساتھ چاہیں اسے ترکیب دے لیں۔

اسلام کے اور بہت سے اہم تر تقاضے ہیں، لیکن اسلامی سوشلزم کے بانیوں کی نگاہ میں ان کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں۔ انہیں اسلام کے اعتقادی اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی اصول و مقاصد کے تحفظ و استحکام سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اور نہ ان کے خلاف اثر انداز ہونے والی قوتوں اور رجحانات کے متعلق کوئی احساسِ تشویش ہے۔ ان میں سے کسی میں صوم و صلوٰۃ کے فروغ کا جذبہ ہے؟ بے پردگی و بے حیائی کے خلاف کوئی اضطراب ہے؟ مغربی ثقافت سے قوم کو بچانے کی کوئی فکر ہے؟ گویا اسلام کے بقیہ سارے تقاضے بالائے طاق رکھ کر صرف اقتصادی دائرے میں ایک خاص رخ پر سوچنے کا ہنج اختیار کیا گیا ہے۔ یہ بقیہ کام اگر ہونے ہوں تو کچھ دوسرے لوگ کرتے رہیں اسلامی سوشلزم کی تحریک اگر چلے (جس کا امکان کم سے کم ہے) تو وہ صرف ایک مسئلہ کو کاٹ کر الگ کرے گی اور ساری توجہ اسی پر صرف کرے گی۔ دوسرے لفظوں میں فی الحقیقت اسلامی سوشلزم کے پردے میں نظام اسلامی اور وحدتِ نظامِ اسلامی کا تصور ختم ہو کر رہ جائے گا۔

ان حضرات کی ایک زیادتی یہ ہے کہ یہ آیات و سنن اور آثار و نظائر کو استعمال کرتے ہوئے ان تمام چیزوں کو چھوڑ دیتے ہیں جو ان کے خلاف پڑتی ہیں اور جو کثرتِ تعداد اور معنوی وزن میں کہیں زیادہ فوقیت رکھتی ہیں۔ دوسری زیادتی یہ ہے کہ بالعموم جزوی یا استثنائی امور اور بعض ہنگامی اقدامات کو اٹھا کر کلیات کی سطح پر رکھ دیا گیا ہے۔ تیسری زیادتی یہ ہے کہ اخلاقی تربیت کے مواد کو قرآن و سنت اور تاریخ سے اخذ کر کے اسے قانونی حیثیت دے دی گئی ہے۔ اسلامی تفکر اور تحقیق کے زیر عنوان یہ تجربات و انکشافات جب جاننے والوں کے سامنے آتے ہیں تو صاف کھل جاتا ہے کہ صحافیانہ اور ادیبانہ اور سیاسی نوعیت کا خطیبانہ ذہن یہ اجتہادی کرشمے دکھا رہا ہے۔ مثلاً ایک صاحبِ علم جب ان کے ہاں "قل العفو" کی تفسیر پڑھے گا تو اسے فوراً معلوم ہو جائے گا کہ سیاق و سباق کا صحیح ترجمہ بھی سامنے نہیں رکھا گیا۔ اصل میں لوگوں نے چندوں اور صدقات کے سلسلہ میں دریافت یہ کیا تھا کہ کیا کچھ خرچ کرنا مطلوب ہے۔ بتایا گیا کہ ساری آمدنیاں اور کمائیاں اور جائیدادیں اور ذرائع و وسائل معیشت کا مطالبہ نہیں، بلکہ

---

[۲۳] یسئلونک ماذا ینفقون، قل العفو

ضروریات (وقتی بھی اور مستقبل کی بھی) سے جو کچھ پس انداز ہو سکے اس میں سے انفاق کیا جائے۔ یہ بھی نہیں کہ سارے کا سارا۔ [۲۴]

پھر ان حضرات کی نگاہ سے یہ بھی اوجھل ہے کہ "قُلِ العفو" کا ذکوٰۃ واجبہ سے کیا تعلق ہے؟ ذوی القربیٰ کی خدمت سے کیا تعلق ہے؟ انسان کی نادیدہ ضروریات سے کیا تعلق ہے؟ اور "العفو" کے متعلق آیا کوئی ایک نظیر بھی ایسی ہے کہ قانوناً اگر وہ ناجائز طور پر حاصل کردہ نہ ہو (مثلاً سرقہ و خیانت سے) تو کسی دورِ نبوت و خلافت میں ضبط کیا گیا ہو۔ پھر یہ حضرات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اعلیٰ درجہ کی ایثار کیشی اور فقر پسندی اس حیثیت سے نہیں جان سکے کہ وہ نہ صرف مرتبۂ نبوت کا امتیازی معیار ہے بلکہ اس کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ بہ حیثیت سربراہِ ریاست سرکاری خزانے اور اس کی آمدنیوں میں سے آپؐ نے شدید احتیاط کے ساتھ کم سے کم حصہ لیا تاکہ بعد کے حکام اسلامی بیت المال پر کھلے ہاتھ نہ ماریں اور اجتماعی خزانہ و دولت کا احترام مالِ یتیم کی طرح ملحوظ رکھیں جیسا کہ خلفائے راشدین نے عملاً کر دکھایا ــــ اور جسے بعد کے بادشاہان نہ نبھا سکے۔

شہریانِ محترم اور جوانانِ عزیز! "نیم حکیم" کے خطرۂ جان ہونے کی طرح "نیم ملّا" کا خطرۂ ایمان ہونا بڑی مسلّمہ صداقت ہے۔ وہ بھی نیم ملائیت کی ایک شکل ہے کہ اسلام میں تعبیرِ حقائق اور نظریہ سازی کا کام جو تحقیق عمیق چاہتا ہے، اوسط درجہ کے علم سے بھی بے نیاز ہو کر شروع کر دیا جائے اور پھر ایسے دانشوروں کی ہر بات تحقیقِ انیق بن جائے۔ میرا مشورہ آپ کے لئے یہ ہے کہ آپ قرآن و سنت اور سیرت و سوانح اور تاریخ کے ابواب کا خود مطالعہ کریں اور اس پر چند سال لگاتار صرف کر کے ٹھوس رائیں قائم کریں۔ آپ کے پاس دینِ حق کا اتنا علم ہونا چاہئیے جو اوگردچھڑنے والی بحثوں کے لئے کسوٹی بن کر آپ کے سامنے احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کر سکے۔ خدارا ابن آدم کو، اس کے دانشوروں کو [illegible] خود اپنے آپ کو نعرہ بازانہ اندازِ فکر سے نجات دلا دیجئے کوئی ایک پسندیدہ فقرہ لے کر اس پر نظریات کھڑے کر دینا ایسا ہے جیسا کوئی ہلدی کی ایک گرہ پا کر پنساری بلکہ پورا حکیم حاذق بن بیٹھے۔

خاص طور پر اس خوفناک بیماری سے اپنے آپ کو اور دوسروں کو بچائیے کہ بیرونی نظریات سے پہلے متاثر ہو کر، اور پہلے ایک خاکۂ نظام ذہن میں بٹھا کر بعد میں اسلام کے اداروں سے اس کے لئے بنیادیں تلاش کی جائیں۔ اور وہ بھی یا تو اخباروں اور رسائل کے شائع کردہ مضامین سے، یا انڈکس کی مدد سے بعض آیات کو قرآن سے برآمد کر کے۔ پہلے ایک نظام تجویز کرنا اور پھر اس کے لئے آیات تلاش کرنا ایسا ہے جیسے کوئی عمارت تعمیر کرنے کے بعد بنیادیں ڈالنے چلے یا محاورے کے مطابق گھوڑے کے آگے گاڑی کو جوتا جائے۔ اس طرح سے جب ادھورے علم پر مبنی غلط کام کئے جائیں تو آپ کا فرض ہے کہ ان سے آگاہ ہوں اور ان کا نوٹس لیں۔

اسلامی سوشلزم کی اصطلاح کو اس حیثیت سے جانچنا بھی ضروری ہے کہ آیا یہ اسلام اور سوشلزم کا مرکب بنانے کی راہ ہے۔ اگر ایسا ہے تو پہلا سوال یہ ہے کہ دو ایسے نظام جو اپنی اپنی جگہ فکر و اعتقاد سے لے کر سیاست و تمدن تک اپنی اپنی مکمل ہیئتیں رکھتے ہوں، اور یہ ہیئتیں بالکل اساسی تصورات سے لے کر [illegible] کی تشکیل تک میں متضاد اور متصادم ہوتی ہوں تو پھر اسلامی سوشلزم کیا ایک مضحکہ خیز اجتماعِ ضدین نہیں ہوگا؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا اس [illegible] مرکب سلوگن کے بانیوں کی نگاہ میں اسلام میں کوئی کمی رہ گئی ہے یا اب پیدا ہو گئی ہے جسے سوشلزم کے پیوند سے پورا کرنا لازم ہے؟ اگر ایسا ہے تو تیسرا سوال یہ ہے کہ وہ کمی کتنی ہے اور نئے مرکب میں کتنے فی صد اسلامی عناصر شامل ہوں گے اور کتنے فی صد سوشلزم کے؟ نیز اس کا کیا علاج ہوگا کہ اسلامی سوشلزم کے مختلف داعی اپنے اپنے نسخے مختلف ترکیبوں اور تناسبوں سے بنا سکتے ہیں، اور کیا یہ راستہ بدترین انتشارِ فکر کا راستہ نہ ہوگا؟

---

[۲۴] مثلاً ایک [illegible] نے سارا مال صدقہ کرنا چاہا تو حضور [illegible] نے روکا اور موصوف کے اصرار پر صرف ایک تہائی کی اجازت یہ کہہ کر دی کہ ایک تہائی بھی بہت زیادہ ہے۔ طبری، زمخشری اور بیضاوی وغیرہ تفاسیر میں "العفو" [illegible] اموال مراد لئے گئے ہیں جو ضروریات سے زائد ہوں اور بے کار پڑے ہوں۔ (ن۔ص)

بعض لوگ اس اصطلاح کو اسلامی نظام کے بعض پہلوؤں کے لئے دورِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق محض ایک ذریعۂ تعارف و تعبیر قرار دیتے ہیں، اور اس کی مثالوں میں بڑی اہم مثال "اسلامی جمہوریت" کی اصطلاح کی پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں اولین ضروری بات یہ پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ اسلام کی کوئی بھی صورتِ تعبیر و تعارف جو اسے دوسرے تمام نظاموں (خصوصاً سرمایہ داری و اشتراکیت) سے ممیز و مختلف بنا کر پیش کرنے کے بجائے، وجہِ التباس بن جائے اس سے شرعاً اجتناب واجب ہے۔ ایسی صورتیں تو اسلام کے رخ کے زیبا کو اور زیادہ مستور کر دیں گی۔ چنانچہ اسی بنا پر قرآن نے حضور پاکؐ سے خطاب کرنے کے لئے صحابہ کو "راعنا" کا لفظ استعمال کرنے سے روک دیا۔ اس سے بڑھ کر تحویلِ قبلہ کا عظیم الشان واقعہ ہے جس نے ملت اسلامیہ کو اہلِ کتاب سے الگ ممیز کر کے "امت وسط" اور "شہداء علی الناس" کے منصب امامت کا واضح طور پہ وارث بنا دیا۔[۲۵] اس سلسلہ میں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اسلام اگر ایک کمل دین یا نظام ہے تو وہ اپنی ضرورت کی اصطلاحیں بھی تو ساتھ رکھتا ہوگا اور نئی اصطلاحات متخالف نظاموں سے مستعار لینے کا محتاج نہیں ہوگا۔ امرِ واقعہ بالکل یہی ہے کہ اسلام نے اپنی اصطلاحات بھی خود مہیا کی ہیں۔ قرآن میں عدل اور اخوت کی اصطلاحوں کا جس وسیع پیمانہ مفہوم کے ساتھ استعمال ہوا ہے، اس کی بنا پر آپ اسلام کو "نظامِ عدل و اخوت" "SYSTEM OF JUSTICE & BROTHERHOOD" کہہ سکتے ہیں۔ آپ اسے "نظامِ تعاون و توازن" کہہ سکتے ہیں اور اسی طرح اس کے اپنے دیئے ہوئے عنوانات کی روشنی میں آپ اسے "نظامِ قسط" یا "میزانی نظریۂ حیات" کہہ سکتے ہیں۔ اسلام کی اپنی اصطلاحات و تراکیب کو نظر انداز کر کے اسے ایک ایسا تعارفی نام دینا جس کا ایک جزو بالکل متخالف فلسفہ و نظام سے مستعار لیا گیا ہے، وہ تو اسے اور زیادہ التباس میں ڈال دے گا۔

"اسلامی جمہوریت" یا اسی طرح کی دوسری مثالیں دینا اس [illegible] پہ غلط ہے۔ اسلامی جمہوریت اول تو پورا پورا نظامِ حیات نہیں ہے، دوسرے اس عنوان سے کوئی غیر اسلامی چیز باہر سے مستعار لے کر اسلام میں داخل نہیں کی گئی۔ بلکہ علمی طور پہ یہ واضح ہو جانے کے بعد کہ اسلام میں آزادئ رائے ہے بیعت (معاہدۂ سیاسی) پر مبنی انتخابی طریقہ ہے، قانون کی عملداری اور قانونی مشاورت ہے، نیز شہریوں اور اقلیتوں کے حقوق وضاحت سے معین ہیں ـــــ اور پھر مغرب کی ملحدانہ جمہوریت کے بالمقابل ان امتیازی حقائق کے تعارفِ عام کے بعد کہ یہاں حاکمیتِ جمہور کے بجائے حاکمیت الٰہیہ ہے، جمہور کے لئے مقامِ نیابت ہے، بنیادی قانون خدا اور رسولؐ کی مقررہ شریعت ہے۔ اور ایک اصولی معیارِ انتخاب (ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم) بھی سامنے رکھ دیا گیا ہے ـــــ اسلامی جمہوریت کی ترکیب اس معنی میں استعمال کی گئی ہے کہ یہ ایک اپنی مخصوص نوعیت کی جمہوریت ہے جو مغرب کی ملحدانہ جمہوریت سے بالکل مختلف اور زیادہ تر واقع ہوئی ہے۔ یہاں ترکیب کا مقصد التباس کو رفع کرنا ہے، مگر اسلامی سوشلزم کی ترکیب التباس پیدا کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسلامی سوشلزم کے بانیوں کا (اکا دکا مستثنیٰ کے ساتھ سہی!) اصل ذہن اسلام کے بجائے سوشلزم کی طرف زیادہ جھکاؤ رکھتا ہے۔ ان میں وہ بھی ہیں جن کا کہنا ہے کہ روس اور چین میں ہی تو اسلام کے اصل بڑے بڑے تقاضائے عدل و مساوات پورے [illegible] ہیں، صرف خدا پہ ایمان کی کمی ہے۔[۲۶] ایک سرکاری افسر صاحب نے خود مجھ سے فرمایا "صاحب! چین میں تو بالکل خلافت راشدہ کا نظام چل [illegible] (لاحول ولا قوۃ) ۔

مجھے اس موقع پر وہ دور یاد آ رہا ہے جب کچھ دانشوروں نے یہ تلقین کی تھی کہ یورپ میں جو کچھ ہو رہا ہے اور ترقی اور دولت افزائی کے جو مظاہر

---

۲۵ اسلامی نظام میں تشبہ بالاجانب سے اجتناب کا اصول اسی لئے رکھا گیا [illegible] تو دوسروں کے افکار و شعائر کا [illegible] تسلط بڑھے اور نہ کسی پہلو سے اسلام کے حقائق میں [illegible] پیدا ہو جائے۔

ہیں وہ بالکل قرآن اور حدیث کے مطابق ہیں۔ بلکہ اصلی مسلمان تو وہی لوگ ہیں۔ ہم نے اسلام کے جن اصولوں کو ترک کر دیا ہے۔ انہی کو اختیار کر کے وہ آگے نکل گئے ہیں۔ لہٰذا ان کی تقلید کرنا دراصل یہ معنی رکھتا ہے کہ ہم اپنے کھوئے ہوئے اسلام پر قائم ہو گئے ان سطحی باتوں نے نہ صرف ہمارے ہاں باقاعدہ ایک نظریئے کی شکل اختیار کر لی بلکہ انہوں نے تنظیمی و تحریکی سانچے بھی نکال لیے، اس دور کے داعیانِ ترقی سے اگر کسی نے اختلاف کیا تو اسے ملّا اور رجعت پسند کہہ کر پیچھے دھکیل دیا گیا۔ بہرحال ہمارے گذشتہ داعیانِ ترقی نے پہلے تو یورپ کی مادیت اور سرمایہ داری پر اسلام کا لیبل لگا کر ہماری نگاہوں کو خیرہ کیا، اور دینی و اخلاقی لحاظ سے خوب اچھی طرح تباہ کرایا۔ اب اسی طبقہ کے نئے داعیانِ ترقی یہ فرماتے ہیں کہ جو کچھ ہوا تھا غلط تھا۔ اب ہم نے اسلام کا نیا مظہر دریافت کیا ہے اور یہ اشتراکی دنیا ہے۔ لہٰذا "آؤ لوگو کہ ادھر نورِ خدا پاؤ گے"۔ دوسرے لفظوں میں اسلام شناس لوگوں کی رائے میں ان کا مشورہ یہ ہے کہ پہلے اُدھر سے مار کھائی تھی، اب ادھر کی مار بھی کھاؤ۔ اس دلچسپ تجربے کے سلسلہ میں میرے ذہن میں ایک لطیفہ گردش کر رہا ہے۔ اس سے آپ بھی لطف اندوز ہوں گے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ اور بڑی مشہور بات ہے کہ مومن ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا۔ اب اگر کوئی کہتا ہے کہ اگر مومن دو مختلف سوراخوں سے اپنے آپ کو ڈسوائے تو نہ حدیث کی خلاف ورزی ہوتی ہے، نہ مومن کی شانِ ایمانی میں فرق آتا ہے۔

اب صورت واقعہ یہ ہو گئی ہے کہ مادہ پرستانہ تہذیب ایک ایسی ناگن ہے کہ جس کے دو منہ ہیں، ایک سفید دوسرا سرخ۔ اور اس نے اپنے دونوں منہ دو مختلف سوراخوں سے باہر نکال رکھے ہیں۔ پہلے ہم نے اپنے دانشوروں کے مشورے سے ایک سوراخ میں ہاتھ ڈال کر اس ناگن کے ایک منہ سے ڈسوایا، اور اسلام شناس اہلِ بصیرت کے مشوروں کو ٹھکرا دیا۔ اب ہمارے د[illegible] کہتے ہیں کہ واقعی وہ سرمایہ داری والا سوراخ تو بڑا پُرخطر نکلا اور وہ سفید ناگن بڑی خراب ثابت ہوئی، اب اسے دفع کرو، اب ہمیں بحیثیت مومن وہاں سے نہیں ڈسوانا چاہیئے، بلکہ آؤ اب اس نئے اشتراکی سوراخ کا تجربہ کرتے ہیں۔ یہ سرخ ناگن کچھ اسلام پسند معلوم ہوتی ہے۔ بےفکر ہو کے اس کا منہ چوم لو۔ اس نیک کام میں کسی ملّا وغیرہ کی بات نہ سنو۔ یعنی ہمارے یہ کرمفرما اب ہمیں ادھر سے ڈسوانے کو لیے جا رہے ہیں۔

---

۲۶ اس خیال کا رشتہ لوگوں نے علامہ اقبال کے اس قول سے ملایا ہے کہ "بالشویزم میں اگر خدا کے تصور کا اضافہ کر دیا جائے تو وہ تقریباً اسلام کی مماثلت اختیار کر لیتا ہے" (تقاریر و ارشاداتِ اقبال بزبانِ انگریزی ص ۸۹) لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اول تو اقبال کا یہ ابتدائی تاثر اس دور کا ہے جبکہ اشتراکیت کی تاریکیاں پوری طرح واضح نہ تھیں، اور اس کا ثبوت لفظ "بالشویزم" کا استعمال ہے جو ایک خاص وقت کے بعد متروک ہو گیا۔ دوسرے یہ کہ خدا کے تصور کا اضافہ کرنے کا مفہوم یہ نہیں کہ ہمارے ہاں کی طرح یہ لفظ دستور میں لکھ دیا جائے یا تقریروں میں یادِ دلیل کی طرح بیان ہونے لگے یا سے قومی تعویذ بنا دیا جائے۔ بلکہ اسلام میں تصورِ خدا کے معنی، خدا کی حاکمیت، خدا کا قانون، خدا کے حدود، حلال و حرام، اور خدا کے مقررہ اداراتِ ہیں۔ اور یہ سب کچھ بالشویزم کے نظام میں کھپ نہیں سکتا کیونکہ [illegible]سی فطرت میں تصادم ہے۔ تیسری ضروری بات یہ ہے کہ وہ بھی علامہ مرحوم ہی تھے جنہوں نے اشتراکیت کو "ملحدانہ مادیت" (حوالہ ماسبق، ص ۱۰۸) قرار [illegible] ہے اور اسے "ایک خطرہ" کا عنوان دیا (حوالہ ماسبق ص ۱۵۱) پھر فرمایا "دونوں (یعنی سرمایہ داری اور اشتراکیت) انسان کی روحانی انفرادیت اور اس کے اخلاقیات کو سوسائٹی سے موسوم اجتماعی مشینری کے خالص مادی تقاضوں پر قربان کر رہے ہیں جبکہ اس مشینری میں ہمارا فرد ایسے ہے جیسے کسی پہیئے کا ایک دندانہ" اس گفتگو کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، میری کتاب "اقبال اور نظریۂ پاکستان" (ص ۵۵ تا ۶۲)، (ن۔ ص)

۲۷ آج کل [illegible] وقت میں ایک صاحب نے تو غضب ہی کر [illegible] ان کے ارشادات کا عنوان اور خلاصہ یہ ہے کہ "سوشلزم ہی اسلام ہے"۔ یہ ہے وہ مریضانہ ذہنیت جو "اسلامی [illegible]" کے مسلم فریب پردوں کے پیچھے چھپی ہوتی ہے۔

پھر اور دل اس بات سے سوا ہوتا ہے کہ آخر یہ ہمیں کیا روگ لگ گیا ہے کہ ہم نظریہ و فکر کے لئے بار بار دوسروں کے دروازوں پر جھکتے ہیں اور اسلام کے عروج کی توقع ہم بار بار دوسرے نظاموں کی تقلید پر منحصر قرار دیتے ہیں۔ اپنی منزل سامنے رکھ کر اپنا راستہ خود نہیں نکال سکتے اپنے جہانِ نو کی تعمیر کے لئے اپنے اصولوں کے مطابق بنیادیں نہیں ڈال سکتے۔ آخر مارکس اور لینن اور اسٹالین نے جو نظام چلایا تھا، اس کے لئے انہوں نے افکار اور اصطلاحات کی گداگری کس دروازے پر کی تھی؟ کیا ہم مسلمان ہی ایسے بنجر دل و دماغ رکھتے ہیں کہ ہم اپنے مسائل کے حل اپنے امتیازی طرز پر نہ نکال سکیں۔ دل و نظر کی اس موت کے ساتھ تو سوائے غلامی کے کچھ حاصل نہ ہوگا — خواہ وہ سرمایہ دار مغرب کی غلامی ہو یا اشتراکی مشرق کی۔

ہمارے جن دانشوروں نے یہ سلوگن اٹھایا ہے ان کا غالباً خیال یہ ہے کہ ہم ایک تیر سے دو شکار بیک وقت کریں گے یعنی مسلمان تو اتنی سی بات پر راضی ہو جائیں گے کہ جو کچھ سلسلہ بھی ہے وہ بہرحال اسلامی تو ہے۔ ہمارے مسلمانوں کو اس طرح کی اسلامی اصطلاحات کا خوگر تو بنایا ہی جا رہا ہے۔ کہ چاہے کسی بوتل میں کفر و فسق کا زہر ہلاہل بھرا ہوا ہو، مگر عوام کو خوش کرنے کے لئے اسلام کا لیبل چپکا دیا جاتا ہے۔ خصوصاً لوگ "اسلامی ثقافت" کے تو عادی ہو ہی گئے ہیں۔ بعض مفکرینِ دینِ متین "سود" کو اسلامی ثابت کرنے کے لئے زورِ دماغ و قلم صرف کر رہے ہیں۔ پھر آخر اسلامی سوشلزم ہی کا سکہ کیوں نہ چل جائے گا؟

بہرحال یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا کہنا یہ تھا کہ اسلامی سوشلزم کے خدنگِ واحد سے مسلمانوں کے ساتھ اشتراکی یا نیم اشتراکی عناصر کو بھی ہم نوا بنانا مطلوب ہے۔ سوشلسٹ عنصر یہ سوچے گا کہ بھئی اگر ہم بھی تھوڑا سا اسلام کا نام لیتے ہوئے ساتھ شامل ہو جائیں تو کیا حرج ہے[28]۔ اس طرح ہمارے دانشوروں کے عالمِ خیال میں دونوں عناصر کو واحد لیڈرشپ کے تحت جمع کر دینے کی راہ نکل آئی۔

لیکن یہ ایک بڑا اجاری مغالطہ ہے۔ دونوں کو رام کرنے کے بجائے یہ تدبیر دونوں کو ہاتھ سے گنوا دینے کا باعث بھی بن سکتی ہے۔ مسلمان بہرحال چند روز کے لئے اس طرح کی پرپیچ اصطلاح یا سلوگن سے کھیل سکتا ہے اور دل بہلا سکتا ہے۔ لیکن ایسے بہت سے تجربوں کی تاریخ گواہ ہے کہ یہ حقیقت اس سے تا دیر چھپی نہیں رہ سکتی کہ یہ راستہ اسلام کا راستہ نہیں ہے۔ ذی شعور مسلمان تو پہلے قدم ہی پر متنبہ ہو گیا ہے، اور وہ دیکھ رہا ہے کہ نئے نئے نعروں کی کھمبیاں نئے دوستانہ تعلقات کے موسمِ برشگال کی پیداوار ہیں۔ رہا عامی مسلمان، سو فی الحال تو اس تک یہ آواز پہنچ ہی نہیں سکی اور جب تک یہ آواز اس کے کانوں میں پہنچے گی، انشاء اللہ اس کا مفہومِ حقیقی بھی ان کے قلوب میں نفوذ کر لے گا۔ اس کے بعد رہ جاتا ہے کمیونسٹ اور سوشلسٹ عنصر، یہ سرخ عنصر صاحبِ تحقیق نہ سہی، سیاسی لحاظ سے اس قدر پکا اور ہوشیار ہے کہ وہ اپنے نظامِ مطلوب کو بھی جانتا ہے اور اس کی طرف بڑھنے کے لئے اس کے استادوں نے جو راہیں نکالی ہیں ان سے بھی آگاہ ہے۔ نیز وہ ان نظریوں اور سلوگنوں کے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتا جو سوشلزم کی حقیقت کو التباس میں ڈال دیں[29]۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ ان سے فائدہ ضرور اٹھا لیتا ہے۔ پس اول تو ایک تیر سے دو شکاروں کا یہ کھیل کامیاب نہیں ہو

---

[28] اس تصور کے حامل سوشلسٹ یہاں موجود ہیں جن کا خیال یہ ہے کہ مذہب پسند معاشروں میں کام کرنے کے لئے ٹھیٹھ مارکسزم اور لامذہبیت اختیار کرنے کے بجائے، کچھ نہ کچھ مذہبی رنگ کی آمیزش کرنا بھی ضروری ہے اور یہی مارکسزم اور سوشلزم کے عین مطابق ہوگا۔ (ن۔ ص)

[29] کراچی کے بزنجو صاحب اور محمود الحق عثمانی اس پر صاف صاف اظہارِ خیال کر چکے ہیں کہ اسلامی سوشلزم وغیرہ سے کام نہیں چلے گا، سیدھی طرح

سکتا، اور ہو جائے تو سادہ دل مسلمان عوام میں اشتراکیت پسند عناصر کو اسلامی سوشلزم کے تصور کا وہ حلیہ بگاڑیں گے کہ جس کا آج اندازہ نہیں کیا جا سکتا

اسی سلسلہ میں، میں یہ اصولی حقیقت بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آج تک تاریخ میں جب بھی ادھر ادھر کے تصورات سے مرکب فارمولے تیار کئے ہیں وہ ہمیشہ انتہائی خراب نتائج پر پہنچے ہیں۔ اور علی الخصوص جس مذہب یا نظام نے سوشلزم کے ساتھ جوڑ میل (COMPROMISE) کا کوئی تجربہ کیا اس نے آخر بری طرح مات کھائی ہے۔ سب سے بڑھ کر مات کھانے والے خود ہم ہیں۔ اور یہ بھی ہمارا ایک کمال ہے کہ ہم خود اپنے ہی تجربات کو فراموش کر دیتے ہیں، بلکہ جو تجربات آنکھوں کے سامنے ہو رہے ہوں، ان سے بھی سبق نہیں لے سکتے، میں سب سے پہلے آپ کو سمرقند و بخارا کی مثال دوں گا یہ علاقے جہاں جاری آزاد حکومتیں قائم تھیں اور بعد میں جہاں کے مسلمان بڑی تعداد میں اشتراکی سلطنت کی تلیں بن گئے، ان کی سرگزشت کو ذہنوں میں تازہ کر لیجئے۔ غیر اشتراکیوں کے بیانات کو تو درکنار رکھئے ایک اشتراکی کی لکھی ہوئی مشہور کتاب "ڈان آف سمرقند" کو بغور ملاحظہ فرمائیے جس میں مصنف نے مزے لے لے کر فخریہ انداز سے اشتراکیت کی اسلام کشی، داستان بیان کی ہے۔ اردو میں اس کا خلاصہ "صبح سمرقند" کے عنوان سے چند برس پہلے شائع ہو گیا تھا۔ اس کے مطالعہ سے حالات کی یہ تصویر سامنے آتی ہے کہ جب سوشلزم کی تحریک اٹھی تو وہاں کی اسلامی حکومت اسی طرح کی بگڑی ہوئی غیر جمہوری اور غیر عوامی حکومت (بلکہ بادشاہت) تھی جیسی حکومتیں ہمارے ہاں مختلف ممالک [illegible] مختلف حالات [illegible] پائی جاتی ہیں۔ ایک طرف جامد قسم کی جبری حکومت کا بوجھ عوام پر لدا ہوا تھا اور دوسری طرف اشتراکی تحریک کا دباؤ پڑنے لگا۔ ان تغیر طلب حالات میں جدید پارٹی کے نام سے ایک تنظیم حرکت میں آئی یہ خالص ملحد پارٹی نہیں تھی اور نہ کمیونزم کی علمبردار، اس کا انداز باغیانہ بھی نہیں تھا۔ بلکہ یہ اسلامی، نیم اسلامی اور غیر اسلامی عناصر سے مرکب جماعت صرف یہ مقصد لے کے اٹھی تھی کہ بغیر کسی توڑ پھوڑ کے محض سیاسی دباؤ سے تھوڑی سی مزید اصلاحات ہو جائیں، نظام کی شکل ایک حد تک جمہوری ہو جائے۔ عوام کے ساتھ حکومت کا رویہ بہتر ہو جائے۔ بہ حیثیت مجموعی یہ گروہ مخالفِ دین نہ تھا بلکہ اسلامی رجحانات اس میں نمایاں تھے لیکن انہی کے ساتھ کچھ سوشلسٹ عناصر بھی شامل تھے۔ انہوں نے یہ منصوبہ سوچا کہ اگر ایک دفعہ اس پارٹی کے ذریعہ دباؤ ڈال کر موجودہ حکومت کو اچھی طرح کمزور کر لیا جائے تو پھر ہمارے لئے میدان کا ہموار ہو جائے گا۔ ورنہ اگر ہم کھل کر کمیونسٹ یا سوشلسٹ کی حیثیت سے میدان میں آتے ہیں تو ہمارے لئے مسلم معاشرہ میں کام کرنا آسان نہیں ہوگا۔ چنانچہ اس جدید پارٹی کے سادہ دل مسلمان نوجوانوں نے اس خطرناک عنصر کو نہ پہچانا بلکہ اسے اپنی ہی طاقت سمجھا۔ یہ دونوں متضاد عناصر خلط ملط ہو کر حکومت کے خلاف خوب اچھی طرح محو کشمکش رہے اور زیادتیاں سہہ سہہ کر پیشقدمی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ حکومت اس پکے اور پلپلے آم کی طرح ہو گئی جو درخت سے ٹوٹ کر گرنے کے قریب ہو۔ جب یہ مرحلہ آیا تو اس وقت جدید پارٹی میں سے موقع پرست اشتراکی عنصر الگ ہو کر "نوجوان پارٹی" کے نئے نام سے میدان میں آ گیا اور جدید پارٹی کے سادہ لوح مسلم عناصر کو دھکیل کر پیچھے پھینک کر اس نے اپنی جھولی پھیلا دی۔ تاکہ ذرا سی ضرب لگتے ہی آم اس کی جھولی میں آ گرے۔ جدید پارٹی اور حکومت کے ٹکراؤ کے دوران حکومت کے ساتھ ساتھ جدید پارٹی بھی کمزور ہو کر رہ گئی۔ اور آخری فتح روس کے آلۂ کار سوشلسٹوں کو ہوئی۔ بعد میں جو کچھ مزاحمت جدید پارٹی کے اسلام پسند عناصر نے اپنی بساط کے مطابق کی وہ رائیگاں گئی۔ تاریخ کا یہ بڑا دردناک تجربہ ہے کہ دیکھتے دیکھتے ایک شاندار تہذیب رکھنے والی جاندار قوم غلامی کے پنجرے میں بند ہو گئی۔ غلط ذہن کے ساتھ مرکب فارمولے بنانے والے لوگ بالآخر ایسے نتیجے تک پہنچتے ہیں۔ یہ تو تاریخ ماضی کا ایک باب تھا۔ ابھی قریب کی بات ہے کہ انڈونیشیا میں بھی مرکب فارمولا اختیار کیا گیا تھا اس میں مغرب کی جمہوریت شامل تھی، سامراج دشمن نیشنلزم بھی شامل تھا، مشرقیت اور افرو ایشیائیت بھی شامل تھی، اسلام کی روحانی اخوت بھی شامل تھی اور سوشلزم کی اقتصادی مساوات بھی شامل تھی۔ سوئیکارنو صاحب نے یہ سوچا کہ اس مرکب فارمولے کی برکت سے اشتراکی عنصر بھی میرے ساتھ ہو گا، اسلام والے بھی راضی رہیں گے اور مغرب والے بھی بہت زیادہ نہیں بگڑیں گے۔ اس مرکب فارمولے کا جو خوفناک نتیجہ جا کے انڈونیشی بھائیوں نے بھگتا ہے وہ پوری

طرح آپ کے سامنے ہے۔ کمیونسٹ اور سوشلسٹ عنصر کو مرکب فارمولے نے ذرا سا راستہ دیا تو وہ سوئیکارنو کے جبری نظام میں (جو اشتراکیوں کے لئے زیر زمین کام کرنے میں بہت سازگار ہوتا ہے) پھلتے پھولتے چلے گئے۔ انہوں نے انڈونیشیا کے مرکز قوت یعنی سوئیکارنو کے گرد بھی اپنا گھیرا ڈالے رکھا اور نیچے عوام میں بھی اپنی جڑیں پھیلاتے چلے گئے۔ انہوں نے اسلام پسند عناصر کو دبانے کے لئے بڑی گہری تدبیروں سے سوئیکارنو کو آلہ کار بنایا پھر باہر سے رہنمائی اور امداد حاصل کی اور جب ان کے نزدیک شبھ گھڑی آئی تو انہوں نے ٹھیک اشتراکی برانڈ کا خونی انقلاب برپا کر دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ مشیت الٰہی نے اس انقلاب کا پانسہ پلٹ دیا اور سرخ انقلاب کے علمبرداروں کو بھی بری طرح حساب دینا پڑا۔ اشتراکی انقلاب کی ناکامی کی یہ پہلی مثال ہے جو انڈونیشیا میں قائم ہوئی اور اس کا جذبۂ انتقام دنیا بھر کے اشتراکیوں میں کھول رہا ہے۔

اسی سلسلہ میں ان عبرتناک تجربات کو بغور ملاحظہ فرمائیے جن سے مصر، شام اور عراق اپنے ہاں سوشلزم کو راستہ دینے کے بعد دوچار ہوئے ہیں۔ وہاں بھی انفرادی مسلمانی کے ساتھ اجتماعی دائرے میں سوشلزم کا جوڑ لگایا گیا۔ پھر ان "اسلامی سوشلزم صاحب" نے جس درندگی سے اسلام پسند عناصر کا خون بہایا ہے اس کو اگر اب تک آپ نے نہ جانا ہو، تو آج کے بعد پہلی فرصت میں مترو رجان لیجئے۔ اسلامی ممالک کے لئے سوشلزم معاشروں کے اندر خونی تصادم کا باعث ہوا ہے اور مختلف حکومتوں میں شدید اختلاف و افتراق کا۔

خوب سمجھ لیجئے کہ مرکب فارمولوں کے تحت جب مسلم، ادھورے مسلم، اشتراکی اور ادھورے اشتراکی جمع ہو کر مخلوط محاذ بنا لیتے ہیں تو مرکب فارمولے سوشلزم جیسے نظریات کے لئے چھینی کا پتلا سرا بن جاتے ہیں۔ پتلا سرا لکڑی میں اترتے ہوئے آگے رہتا ہے اور چھینی کا موٹا حصہ اطمینان سے ہر چوٹ پر اس کے پیچھے پیچھے اندر اترتا چلا جاتا ہے۔ مسلمان ملکوں میں نفوذ کے لئے اشتراکیت یا سوشلزم کے لئے کامیاب ترین تدبیر یہی ہے کہ اشتراکیت اپنا پہلا جلوہ اسلامی میک اپ کے ساتھ دکھلائے۔ پھر جب عوام اس کے لال چہرے کے تیکھے نقوش پہ فریفتہ ہو جائیں تو اسلامی میک اپ کا سلسلہ ختم کر دیا جائے۔ پھر اشتراکیت حزن انسانی سے اپنا من بھاتا میک اپ کرتی ہے۔ پھر اگر کسی کی آنکھیں کھلیں بھی تو ایک بار کھلنے کے بعد ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتی ہیں۔

مسلمان معاشروں میں اسلامی سوشلزم کے ادھورے تصورات سے ترکیب یافتہ سلوگن کو جب آپ لے کے چلیں گے تو اس کے اثر سے مسلمان پہلی بار لفظ "اسلامی" کے سہارے "سوشلزم" کے موضوع کو گوارا کرنے لگیں گے۔ اتنا کام جب ہو چکے گا تو پھر آپ کے پیچھے پیچھے مکمل اور خالص سوشلزم کے علمبردار اور مبلغ میدان میں اتریں گے۔ پھر وہ مسلم عوام کو سمجھائیں گے کہ تمہارے اقتصادی مسئلہ کا حل اسلام میں نہیں، سوشلزم میں ہے۔ "اسلام تو تمہارا مذہب ہے، سو تم اسے اپنے ساتھ رکھو اور نمازیں پڑھتے رہو، روزے رکھتے رہو، اس میں کیا حرج ہے[1]۔ البتہ ہم جو اقتصادی انقلاب لانا چاہتے ہیں وہ سرمایہ داروں کی دولت اور کارخانہ داروں کے کارخانے اور زمینداروں کی زمینیں چھین کر سب کچھ تمہاری جھولی میں ڈال دے گا، اس میں تم ہمارا ساتھ دو، بلکہ اپنے بھلے کے لئے اسے کامیاب بناؤ۔ اور تاریخ کی شہادت یہی ہے کہ کسی ادھورے نظریئے یا تصور کے مقابلہ میں ہمیشہ پورا نظریہ یا تصور زیادہ موثر ہوتا ہے (خواہ وہ اسلامی ہو یا اشتراکی) اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اسلامی سوشلزم کے مبلغوں کا پارٹ اس سفر مینا کا سا ہوگا جو بغیر یہ جانے ایک سڑک تیار کرتی جائے گی کہ یہ سڑک کعبہ کو جاتی ہے یا ترکستان کو — اور مناسب وقت آنے پر اسی سڑک کے اوپر یکایک اشتراکیت کا ٹینک پیچھے سے دوڑتا آئے گا اور وہ خود سفر مینا کے تلیوں کو بھی روندتا ہوا گذر جائے گا۔ اور جہاں کہیں اسلامی سوشلزم کے

---

[1] ابتدائی دورِ کار میں اشتراکیوں کا طریق کار یہی رہا ہے مذہب کشی کا مرحلہ بعد میں آتا ہے۔ خود بخارا میں بھی ٹھیک ایسا ہی ہوا۔ اس کے باوجود ایسا بھولا مسلمان دنیا میں پڑا ہے کہ ایک صاحب دماغ دوست ایک گفتگو میں فرمانے لگے (باقی صفحہ   پر ملاحظہ فرمائیں)

بورڈ لگائے گئے ہوں گے وہ ان کا بھی خاتمہ کرتا چلا جائے گا۔ آپ ایک مدت تک خود اسلامی نظام کے اصل تصور اور اس کے قائلین کے خلاف معرکہ آرا رہیں گے۔ آپ کی محنتوں کا رخ اشتراکیت یا سوشلزم کے خلاف نہیں، بلکہ اسلام پسند عناصر کے خلاف ہوگا۔ آپ کی دعوت کا سارا منفی زور اس بات پر صرف ہوگا کہ یہ اسلام اور اسلامی نظام اور اسلامی نظریہ وغیرہ سب بیکار باتیں ہیں، اصل اسلام تو ہمارا اسلامی سوشلزم ہے اس طرح اگر آپ اپنی دعوت کو لے کر چل سکیں (جس کا امکان عملاً زیادہ نہیں ہے) تو آپ عوام میں اسلام کے اثرات کو کمزور کرنے کا باعث ہوں گے اور اس کے ایک جامع اور کامیاب نظام زندگی ہونے کا اعتقاد متزلزل کر دیں گے۔ اور دوسری طرف آپ (ہو سکتا ہے کہ نیک نیتی کے ساتھ) خالص اشتراکیت کے علمبرداروں کے ہاتھ مضبوط کرنے کا ذریعہ بن جائیں گے۔

اسلامی سوشلزم کے علمبرداروں کو اپنے نظریئے اور نقشۂ کار کے چند اور کمزور پہلو ملحوظِ خاطر رکھنے چاہئیں۔

پہلا۔ یہ کہ جس سوشلسٹ کے مقابلے پر (یا جسے ساتھ لینے کے لئے) آپ جا رہے ہیں، وہ تو پورا سوشلسٹ ہوگا۔ مگر آپ اسلام اور سوشلزم کو ملا جلا کر چلیں گے۔ یعنی بات آدھا تیتر، آدھا بٹیر والی ہوگی۔ مقابلے کی دنیا میں ہمیشہ یکسو، یک آہنگ، اور توحیدی ذہن و کردار کامیاب رہتا ہے۔ نظریاتی دوغلا پن جس میں "ایمان مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر" کی کیفیت پنہاں ہوتی ہے ہمیشہ ناکامی پر منتج ہوتا ہے۔ یہاں تو یا سراپا "لا" بننا پڑتا ہے یا توازن پیدا کرنے کا عزم کرنا ہوتا ہے۔

دوسرا یہ کہ معاشرہ کا نظام بدلنے کے لئے محض سلوگن تو کافی نہیں ہوتے، ایسے وسیع لٹریچر کی ضرورت ہوتی ہے جو بنیادی افکار سے لے کر نظامِ حیات کے ہر شعبے تک کے لئے نئی شکلیں معین کرے جو آپس میں ایک ہی فلسفہ کے ذریعہ مربوط ہوں۔ جب اس لٹریچر کی ضرورت آپ کو پیش آئے گی تو نہ تو قدیم و جدید اسلامی لٹریچر آپ کو کام دے گا۔ اور نہ آپ کا اپنا تیار کردہ ٹھوس اور وسیع لٹریچر اسلامی سوشلزم کے پورے نقشہ حیات کو پیش کرنے کے لئے موجود ہوگا۔ لہٰذا چار و ناچار آپ کو روس اور چین کے مہیا کردہ خالص اشتراکی لٹریچر کی طرف رجوع کرنا ہوگا جس میں ڈوب کر نہ جانے خود آپ کے اپنے کتنے ہم خیال دوبارہ ابھر نہ سکیں۔

تیسرا یہ کہ آپ کو اسلامی سوشلزم کے نئے تصورِ انقلاب کے لئے تبدیلی کے کوئی خطوط اپنے ہاں نہیں مل سکیں گے، بلکہ اس پہلو سے بھی آپ مجبور ہوں گے کہ انقلاب انگیزی کی جدید تکنیک میں آپ اشتراکی اور سوشلسٹ عناصر کو اپنا استاد تسلیم کریں اور ان سے مشورہ و رہنمائی لیں۔

چوتھا یہ کہ پورے اقتصادی نظام کو بدلنے اور سرمایہ دار، حقوق یافتہ اور اقتدار پر قابض عناصر کو ان کے موجودہ مرتبے سے ہٹانے کے لئے محض مضمون نگاری اور تقریر بازی تو کافی نہیں ہوگی، آپ کو تو بھرپور انقلاب برپا کرنا پڑے گا۔ اور آج کل کی تاریخ کے تازہ ترین تجربات بتاتے ہیں کہ اس قسم کے انقلابات کی کامیابی کا دار و مدار بالعموم بیرونی اثر و مداخلت پر ہوتا ہے اس بیرونی تائید کو دینے کے لئے کوئی "اسلامی سوشلسٹ" طاقت تو دنیا میں موجود نہیں ہے جو اپنا ایک عالمی پروگرام رکھتی ہو، لے دے کے اس کام کے لئے آپ کو سوشلسٹ ممالک ہی ملجا و ماویٰ دکھائی دیں گے اور اگر آپ ان سے کوئی خفیہ استمداد کریں گے تو اپنے آپ کو ان کے زیر اثر بھی دینا ہوگا، اور ان کے "نظریاتی مریدوں" سے بھی کامریڈشپ کا رشتہ استوار کرنا ہوگا

(بقیہ صفحہ سے آگے) کہ یہ ساری باتیں مخالفین کا پروپیگنڈا ہیں۔ میں نے عرض کیا آپ نے مارکس اور لینن کے مذہب کے متعلق خیالات (بلکہ پارٹی کے لئے ہدایات) مطالعہ کئے ہیں۔ اور وہ ان چیزوں کو پڑھنے سے بے نیاز ہونے کے باوجود ان چیزوں کو فضول قرار دیتے سب بائے یہ حقیقی طرز فکر کمال یہ ہے کہ یہ دوست اسلام سے بھی سچا پیار رکھتے ہیں۔ (ن۔ ص)

اقبال، اجتہاد اور اسلامی سوشلزم

اے۔ کے۔ بروہی

ادھر کچھ عرصہ سے اقبال، اور اجتہاد کے حوالے سے اخبارات اور نام نہاد دانشور حلقوں میں "اسلامی سوشلزم" کے نظریئے کا بڑی شدت سے چرچا کیا جا رہا ہے۔ یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اسلامی سوشلزم۔۔۔ اگر ہم اس کے عملی امکانات کو سمجھ لیں۔۔۔ ہمارے تمام دکھوں کا مداوا ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں یہ عرض کروں گا کہ مجھے یہ سمجھنے میں سخت دقت کا سامنا ہے کہ آخر اسلامی سوشلزم کے نظریہ کا مطلب کیا ہے؟ "سوشلزم" کی اصطلاح ہر شخص سمجھ لیتا ہے اور میرا خیال ہے کہ "اسلام" کی اصطلاح کا مطلب بھی میں سمجھتا ہوں۔ اگر مجھے عرض کرنے کی اجازت دی جائے تو میں یہ کہوں گا کہ ان دو الفاظ کا غیر منطقی خلط ملط ایک معقول ذہن کو خلفشار سے دوچار کر دیتا ہے۔ اس دو غلے لفظ۔۔۔ اسلامی سوشلزم۔۔۔ سے ذہن انسانی کو جس مخمصہ سے دوچار ہونا پڑتا ہے اس کی تفصیل یوں پیش کی جا سکتی ہے۔۔۔ "اگر سوشلزم کا مطلب بالکل وہی ہے جس کا اسلام ہم سے تقاضا کرتا ہے تو پھر سوشلزم بطور ایک قومی نظریہ کے بھی ہمیں قابل قبول ہونی چاہئے۔ لیکن اگر روایتی سوشلزم کو اسلام ہمارے لئے قابل قبول قرار نہیں دیتا تو پھر سوال یہ ہے کہ اسلام نے اس نظریہ میں کیا تبدیلی کی ہے جس کی وجہ سے اسے اسلامی سوشلزم کا نام دیا جا سکتا ہے اور سوشلزم کی غیر اسلامی اقسام کے مقابلہ میں اسلامی سوشلزم قابل قبول بن جاتی ہے۔ لفظ "اسلام" بذات خود مستقل بالذات ہے۔ آخر اس کو اسقدر کیوں گرا دیا جائے کہ یہ "سوشلزم" کا لاحقہ یا سابقہ بن کر رہ جائے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اس ملک کا کوئی بھی شخص اس سوال کا منطقی اور دیانتدارانہ جواب نہیں دے سکتا۔ ایک طرف کیا ہم یہ نہیں کہتے کہ اسلام ایک جامع ضابطہ حیات ہے جس میں بنی نوع انسان کی اقتصادی، سیاسی اور سماجی تنظیم سے متعلق جملہ مسائل کے حل موجود ہیں۔ دوسری جانب یہ بتایا جاتا ہے کہ "سوشلزم" نام کا بھی ایک نظریہ موجود ہے جس کی ہمیں ضرورت ہے۔ بشرطیکہ ہم اس میں کچھ رد و بدل کر لیں۔ اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ صرف اسلام نہیں بلکہ یہ اسلامی سوشلزم ہے جو ہمیں نجات دلائے گی اور اس وقت ہماری زندگی کا جو نظم و ضبط ہے، اسلامی سوشلزم کی بدولت ہم اس نظم و ضبط کا بدرجہا زیادہ معنی خیز اہتمام کر سکیں گے۔

اسلام اگر ایک عالمگیر مذہب ہے۔ یعنی ایک ایسا طرز زندگی ہے جو ہر دور اور تمام جغرافیائی حالات میں تمام لوگوں کے لئے موزوں ہے تو پھر یہ ان مخصوص اقتصادی اور سیاسی مسائل کا مناسب حل پیش کرنے سے کیوں قاصر ہے جس سے آج کل ہم پاکستانی دوچار ہیں اور جن کی وجہ سے ہم غیر ملکی تہذیب و ثقافت سے "نمونہ" مستعار لینے پر مجبور ہیں؟ اگر سوشلزم کا مطلب سماجی تنظیم کے ایسے نظریہ یا پالیسی سے لیا جاتا ہے جو اس امر کی داعی ہے کہ جملہ ذرائع پیداوار سرمایہ، اراضی اور املاک تمام معاشرہ کی ملکیت قرار دے دیئے جائیں اور ان کا انتظام و تقسیم بھی سب کی بہبود کے لئے عمل میں لائی جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام اس ضمن میں کچھ کہنے سے قاصر ہے۔

اگر آپ کے خیال میں حصول انصاف کا یہی واحد طریقہ ہے تو آپ سوشلزم کے نظریہ یا طریق کار کے حلقہ بگوش ہو سکتے ہیں لیکن اس کے برعکس آپ کے نزدیک سوشلزم کے نظریہ اور پالیسی سے انصاف کے ہدف کو تقویت ملنے کی بجائے ٹھیس لگتی ہے تو آپ کو اس نظریہ کا حلقہ بگوش ہونے سے انکار کر دینا چاہئے۔ لیکن اس کا اسلام سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ انصاف کے حصول کے لئے سوشلزم کا طریق کار آج تو موزوں ثابت ہو لیکن ہو سکتا ہے آگے چل کر موزوں نہ رہے اس لئے اسلام کو اس جھگڑے میں الجھانے سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔

سوشلزم سے عام طور پر ایسے اقتصادی فلسفہ کی مراد لی جاتی ہے جو اپنے علمبرداروں کے لئے اس بات کو فریضہ قرار دیتا ہے کہ تمام ذرائع پیداوار اور تقسیم سے متعلق جملہ مسائل صرف ریاست کی ملکیت اور ذمہ داری خیال کئے جائیں۔ مارکسی فلسفہ — جو لازماً تاریخ کی مادی تعبیر کا جدلیاتی ہے — ہمیں اقتصادی درجہ بندیوں (طبقات) کو ہی سب سے زیادہ اہمیت دینے کا سبق دیتا ہے۔ اسلامی نظریہ حیات کے نظام و فلسفہ میں اس بے جا اور عیاں مادہ پرستانہ نقطہ نظر کو مسترد کر دینا چاہئے۔ کیونکہ یہ بات قرآن حکیم کے اس پرزور دعویٰ کے منافی ہے کہ اخلاقی اور روحانی قدریں ہی بنیادی اور اولین اہمیت کی حامل ہیں۔ اقبال کے نزدیک قرآن کریم کا اہم مقصد یہ ہے کہ انسان کے اندر خدا اور کائنات سے گوناگوں رشتوں کا ارفع شعور پیدا کیا جائے۔ اقبال نے بے شمار طریقوں سے روحانی زندگی کی فضیلت پر زور دیا ہے اور بار بار ہماری توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرائی ہے کہ تمام اشیاء کا منبع خدا ہے اور وہ خدا کی طرف ہی لوٹ جائیں گی۔ اقبال کے الفاظ میں "قرآن کریم کی رو سے انتہائے حقیقت روحانی ہے۔ البتہ اس کی زندگی دنیاوی سرگرمیوں سے عبارت ہے۔ روح اپنا اظہار فطری مادی اور دنیاوی طور پر کرتی ہے۔ ہر وہ چیز جو دنیاوی ہے محض اسی بنا پر اپنے وجود کے اصل کے لحاظ سے مقدس حیثیت رکھتی ہے۔ جدید فکر نے اسلام — بلکہ درحقیقت تمام مذاہب — کی جو سب سے بڑی خدمت سرانجام دی ہے وہ ان امور پر تنقید میں مضمر ہے جنہیں ہم مادی یا قدرتی کہتے ہیں۔ ایسی تنقید واضح کرتی ہے کہ محض مادیت کی کوئی وقعت نہیں۔ جب تک ہم اسے روحانی طور پر بھی گہری بنیادوں پر استوار نہ دیکھیں۔ قابل نفرت دنیا کا کوئی وجود نہیں ہے بے حد وسیع مادی کائنات بھی روح کی تلاش وحصول ذات کا ایک ذریعہ اور وسیلہ ہے۔ کائنات ارضی تمام تر مقدس و متبرک ہے جیسا کہ خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بڑے دلکش انداز میں فرمایا ہے کہ "روئے زمین کا ہر حصہ ایک مسجد ہے۔" اسلام کے نزدیک ایک مملکت انسانی نظام میں روحانیت کو پا لینے کی ایک کوشش کے مترادف ہے۔ لیکن اس مفہوم میں مملکت جس کی اساس محض تسلط پر نہیں اور اس کا مقصد نظریاتی اصولوں کی نشاندہی ہے۔ مذہبی مملکت بن جاتی ہے۔"

اس طرح اسلام میں تاریخ کی مادی تعبیر و تشریح کا کوئی جواز نہیں ہے تاکہ آپ (کسی حد تک حق بجانب ہوتے ہوئے) اقتصادی و معاشی عنصر کی اولیت کا استدلال پیش کر سکیں۔ اس لئے تاریخ کی مادی تعبیر کی ایک پیداوار — سوشلزم — بھی کسی مسلمان کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ اندریں حالات اس امر پر حیرت نہیں ہونی چاہئے کہ "سوشلزم" کو بھی روحانیت کا لبادہ اوڑھنے کی کوشش میں تجاویز تدابیر سر اٹھا رہی ہیں اور اس مقصد کو اس طرح حاصل کرنے کی سعی کی جا رہی ہے کہ سوشلزم کے ساتھ "اسلامی" کا لیبل بھی لگا دیا جائے۔

مجھے تو یہ شبہ ہوتا ہے کہ پاکستان میں لفظ "اسلام" کو غیر ملکی مال — خواہ وہ نظریات ہوں یا ادارے — کی درآمد کے لئے ایک لبادے کے طور پر مسلسل استعمال کیا جا رہا ہے اور ان نظریات اور اصولوں کو جنہیں مغرب کے ملحدانہ، منکرانہ اور دہریانہ افکار نے جنم دیا ہے ہمارے موجودہ دور میں نہ صرف معقولیت کا رنگ دیا جا رہا ہے بلکہ انہیں باعزت شکل دینے کی کوشش بھی کی جا رہی ہے۔ میں نے اکثر یہ بات سنی ہے کہ "اگر آپ کمیونزم کے ساتھ خدا کو بھی شامل کر لیں تو اس طرح جو چیز حاصل ہو گی وہ اسلام کے مساوی ہو گی۔" اگرچہ میں تربیت کے

زاویہ سے ایک فلاسفر ہوں تاہم میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے اس "جدلیاتی حساب" کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں ہے اور میں اس سے متعلق کوئی بات نہیں کہوں گا۔ لیکن جو بات میں قدرے تحکم سے کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ "اللہ تعالیٰ کی ذات میں اس قدر جامعیت ہے کہ اس کی کسی اور چیز میں آمیزش بھی نہیں ہو سکتی اور کمیونزم جس کی اساس یقینی طور پر اللہ کے وجود سے انکار پر استوار ہے" اسے آپ تسلیم کرنے کی کوئی وجہ جواز نہیں رکھتے۔ اگر آپ خدا تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں۔ آپ دونوں باتوں کو بیک وقت نہیں اپنا سکتے۔

یہ سوال بہت پرانا ہے کہ مملکت کو اپنے افراد کے لئے کیا فرض سرانجام دینے چاہئیں۔ جہاں افراد اپنے تئیں ایسی بنیادی ضروریات زندگی مہیا کرنے کے اہل نہیں جو ان کی بقا کے لئے لازم ہیں؟ اسلام اس سوال کا جو جواب دیتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ مملکت کی ذمہ داری اور اس کا فرض ہے کہ وہ ایسے حالات مہیا کرے جن کے مطابق اس مملکت کے شہریوں کے ذہن و کردار کی تشکیل و تعمیر ہو بلکہ ایسے حالات بھی پیدا کئے جائیں کہ مملکت کے تمام شہری خود اپنی مساعی سے وہ سب کچھ حاصل کر سکیں جو شہری استعداد کار کے لئے ضروری ہیں

معاشرتی انصاف کے تقاضے

معاشرتی نظم کا یہی وہ نظریہ تھا جس پر انیسویں صدی کی یورپی سیاست میں "لبرل ازم" کی بنیاد رکھی گئی۔ ایل۔ ٹی۔ ہاب ہوس کا کہنا ہے کہ "جس معاشرے میں معمول کے مطابق ایک دیانت دار اوسط صلاحیتوں کا مالک فرد کسی مفید کام کے ذریعے اپنے آپ کو برقرار رکھنے میں ناکامی سے دوچار ہوتا ہے، اس حد تک اس معاشرہ کو بدنظمی کا عارضہ لاحق ہوتا ہے۔ ایسی صورت حال میں معاشرتی نظام میں کہیں نہ کہیں خرابی اور اس کی اقتصادی مشین میں کوئی نقص ہوتا ہے۔ محض انفرادی توبہ سے کوئی آدمی معاشرہ کی اقتصادی مشین کو صحیح نہیں کر سکتا .... مارکیٹ یا صنعت میں اسے کوئی عمل دخل یا فائدہ حیثیت حاصل نہیں ہوتی۔ ایسے نشیب و فراز کی ذمہ داری اس پر عائد نہیں ہوتی۔ البتہ اسے ان کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شخص "خیرات" نہیں بلکہ انصاف کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے مطالبات پورے کرنا بے حد مشکل ہو ممکن ہے کہ ایسا کرنے کے لئے دور رس اقتصادی تعمیر نو کی ضرورت پیش آئے۔ یہ تمام صورت حال انصاف کے اس مخصوص مطالبہ کو پورا کرنے سے متعلق ذرائع کے حصول میں مشکل کی نشاندہی کرتی ہے بایں ہمہ یہ انصاف کے دعویٰ کے جواز اور موقف کو متزلزل نہیں کرتی۔ حق بہر صورت حق ہوتا ہے خواہ اس کے حصول کے ذرائع غیر واضح ہوں اور وہ محنت کش جو بے روزگار رہے یا جسے کماحقہ معاوضہ ادا نہیں ہوتا، اس کا وجود اقتصادی بدنظمی کے باعث معاشرے کی خیرات کے لئے نہیں بلکہ انصاف کے لئے اس وقت تک باعث ننگ رہے گا جب تک کہ وہ سطح زمین پر نظر آتا رہے گا۔"

خلافت راشدہ میں معاشرتی انصاف

یہ ایل۔ ٹی۔ ہاب ہوس خواہ کچھ بھی رہا ہو کم از کم سوشلسٹ ہرگز نہیں تھا۔ وہ نظریہ انصاف سے سرشار تھا اور اس امر کا آرزومند تھا کہ معاشرہ کی اساس انصاف پر ہونی چاہئے۔ عدل و انصاف پر مبنی معاشرہ کی تشکیل و تعمیر کے لئے انسان از منہ قدیم سے کوشاں اور متلاشی چلا آ رہا ہے اور یہ حالت و کیفیت سوشلزم کے ظہور پذیر ہونے سے بہت پہلے کی ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس وقت سے چلی آ رہی ہے جب کوئی بھی "ازم" پیدا نہیں ہوا تھا۔ آپ حضرت ابوبکرؓ یا حضرت عمرؓ یا حضرت عثمانؓ یا حضرت علیؓ کے اقتصادی اور سیاسی نظام کے متعلق کیا کہیں گے؟ کیا وہ سوشلسٹ تھے؟ ان کے زمانہ میں پیداوار کے ذرائع پر مملکت کی اجارہ داری نہیں تھی اور نہ ان کا ایسا کوئی کنٹرول تھا جس کا دعویٰ آج دولت کی تقسیم کے ذرائع کے سلسلہ میں ایک سوشلسٹ ملک رکھتا ہے۔ بایں ہمہ میرا خیال یہ ہے کہ ان گرامی قدر حضرات نے اپنے زمانے کے حالات اور تقاضوں کے مطابق معاشرے کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں انصاف کی بنیادوں پر استوار کر کے ایک شاندار مثال قائم کر دی تھی۔

اقبال اور اسلامی سوشلزم

خانم عزیز چوہدری ایم اے

کچھ عرصے سے "اسلامی سوشلزم" کا خوب چرچا ہو رہا ہے۔ اور یہ اصطلاح حامیوں اور مخالفوں کے درمیان اخبارات اور جرائد کے کالموں میں موضوع بحث بنی ہوئی ہے۔

اس اصطلاح کے حامیوں کا کہنا ہے۔ کہ نظام سرمایہ داری کی پھیلائی ہوئی برائیوں کے تدارک کے لئے سوشلزم اختیار کرنا لابدی ہے۔ مگر مسلمان ہوتے ہوئے مغربی معاشرے کی مادہ پرستانہ پیداوار سوشلزم کو قبول کرنا ہمارے لئے ناممکن ہے۔ لہذا مسلم معاشرے میں اسے اختیار کرنے کی صورت یہ ہوگی کہ اس میں تصور خدا کو شامل کر دیا جائے۔ بلکہ ان کا کہنا ہے کہ اسلام کا معاشی نظام عین وہی ہے جو سوشلزم نے اختیار کیا ہے۔ یہ لوگ علامہ اقبال کو اسلامی سوشلزم کا سب سے بڑا اور پہلا مبلغ قرار دیتے ہیں۔ اور اپنے موقف کی تائید میں ان کے کلام کے بعض حصوں اور ان کے ایک خط کا حوالہ دیتے ہیں۔ جو انہوں نے ۱۹۳۱ء میں سر فرانسس ینگ ہزبینڈ کو لکھا تھا۔ کہ "اگر بالشوزم میں خدا کی ہستی کا اقرار شامل کر دیا جائے۔ تو بالشوزم اسلام کے بہت ہی قریب آ جاتا ہے۔ اس لئے میں متعجب نہ ہوں گا۔ اگر کسی زمانے میں اسلام روس پر چھا جائے یا روس اسلام پر" اس کے بعد قائداعظم علیہ الرحمتہ کا نام لیا جاتا ہے کہ انہوں نے ۱۹۴۸ء میں ایک تقریر کے دوران اسلامی سوشلزم کی اصطلاح وضع کی اور اسے پاکستان میں سماجی انصاف کے قیام کی بنیاد قرار دیا۔ بعد ازاں لیاقت علی خاں نے اپنے دورۂ امریکہ میں بھی اس اصطلاح کا اسی ضمن میں تذکرہ کیا۔ چنانچہ حامیان اسلامی سوشلزم مسلم معاشرے میں اشتراکی نظام اقتصادیات اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ جس کے تحت وہ معاشرے کی تمام اقتصادی قدریں یعنی نظام پیدائش دولت اور تقسیم دولت انفرادی ملکیت سے نکال کر اجتماعی نگرانی میں دینا چاہتے ہیں۔

مگر عجیب بات یہ ہے کہ اسلامی سوشلزم کی تفصیلات طے کرتے ہوئے اس کے حامی کسی ایک نکتے پر بھی متفق نہیں۔ بلکہ اب تک جو کچھ اس ضمن میں پیش کیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر شخص اسلامی سوشلزم کا ایک علیحدہ مفہوم اپنے ذہن میں رکھتا ہے۔ اگر اس نئے مجوزہ نظام میں حصہ اشتراکیت پر بالشوزم یا اشتمالیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے تنقید کی جائے تو کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد مارکسی کمیونزم یا بالشوزم یا اشتمالیت نہیں۔ بلکہ وہ سوشلزم (اشتراکیت) ہے۔ جسے اب دنیا کی ہر ترقی یافتہ ریاست بطور ریاستی پالیسی کے اپنا رہی ہے۔ مگر اس نظام کے حامی اپنی تائید میں سب سے زیادہ زور شور کے ساتھ علامہ اقبال کا نام پیش کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں۔ کہ انھوں نے اپنے متذکرہ بالا خط میں صرف بالشوزم کا ذکر کیا تھا اور پھر ساتھ ہی روس کا ذکر کرتے ہوئے۔ اس امر کی مزید صراحت کر دی تھی کہ وہ

روح سلطانی رہے باقی تو پھر کیا اضطراب — ہے مگر کیا اس یہودی کی شرارت کا جواب

وہ کلیم بے تجلی وہ مسیح بے صلیب — نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب

کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہ پردہ سوز — مشرق و مغرب کی قوموں کے لیے روز حساب

اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد — توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب

مگر حضرت علامہ کی خداداد بصیرت کتنی گہری ہے دیکھیے وہ چوتھے مشیر کی زبانی وہ اشتراکیت کا کتنا صحیح تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ کیسی شاندار پیش گوئی کرتے ہیں، جو کہ اس وقت اشتراکیت کے کسی بڑے سے بڑے نقاد کے تصور میں بھی نہیں ہوگی۔ وہ کہتے ہیں

توڑ اس کا رومۃ الکبریٰ کے ایوانوں میں دیکھ — آل سیزر کو دکھایا ہم نے پھر سیزر کا خواب

وہ بجا طور پر دیکھ رہے تھے۔ کہ یہ مزدور آمریت فی الواقع نہایت مکروہ آمریت میں بدل جائے گی جو اپنی ظالمانہ اور سرمایہ دارانہ قدروں میں کسی طرح بھی زار شہنشاہیت سے کم نہ ہوگی۔

اور آج کیا یوگوسلاویہ کے سابق معتوب و معزول شدہ نائب صدر میلوون جیلاس کی کتاب نیا طبقہ (New Class) اشتراکیت کی اس انتہا کا واضح اعتراف نہیں ہے۔ بلکہ یہ حقیقت نہیں کہ مارکسیت کا غیر طبقاتی معاشرے کے قیام کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر ہوتا نظر نہیں آتا۔ اشتراکی ممالک میں حکمران عنصر بجائے خود ایک باقاعدہ طبقے کی صورت اختیار کر چکا ہے جو سرمایہ داروں کے تشدد سے زیادہ تشدد، ان کے ظلم سے زیادہ ظالم اور ان کے استحصال سے بہت زیادہ منظم استحصالی صلاحیتوں کا مالک ہے اور بہت زیادہ آمرانہ اختیارات رکھتا ہے۔

چنانچہ اسی بنا پر حضرت علامہ نے ایک دفعہ پھر یہ کہا تھا ؎

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا — طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

پھر دیکھیے پیام مشرق میں قیصر ولیم لینن کے جواب میں کس حقیقت کا اعلان کر رہا ہے۔

اگرچہ تاج کئی جمہور پوشد — ہماں ہنگامہ ہا در انجمن ہست

ہوس اندر دل آدم نہ میرد — ہماں آتش میان مرزغن ہست

ابلیس کی مجلس شوریٰ میں تیسرے مشیر کو چوتھے مشیر نے جو مذکورہ بالا جواب دیا تھا۔ پانچواں مشیر اس کا مجوزہ تسلیم نہیں کرتا اور براہ راست ابلیس سے مخاطب ہو کر اپنے ذہنی اضطراب کا اظہار کرتا ہے۔ کہ یہ اشتراکی نظام ہمارے ابلیسی نظام کے تار و پود بکھیرے گا کہتا ہے۔

وہ یہودی فتنہ گر وہ روح مزدک کا بروز — ہر قبا ہونے کو ہے اس کے جنوں سے تار تار

زاغ دشتی ہو رہا ہے ہمسر شاہین و چرغ — کتنی سرعت سے بدلتا ہے مزاج روزگار

میرے آقا وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے — جس جہاں کا ہے فقط تیری سیاست پر مدار

اب بالآخر خود شیطان کو حقیقت حال کی وضاحت کرنی پڑتی ہے۔

دست فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک — مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو

مارکسی، لینینی، روسی اشتمالیت کا ذکر بھی کر رہے ہیں۔ کسی اور اشتراکی نظام کا نہیں۔

اسلامی سوشلزم کے حامی واقعی بجا طور پر اس مشکل میں گرفتار ہیں۔ کہ سوشلزم کا مفہوم کیا متعین کریں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس لفظ کی بے شمار تعبیریں کی گئی ہیں۔ ہر گروہ نے اسے اس تواتر سے استعمال کیا ہے۔ کہ اس کا بنیادی مفہوم ہی مجہول اور مبہم ہو گیا ہے سیاسیات کے مشہور مفکر سی۔ ایم۔ جوڈ کے الفاظ میں سوشلزم وہ ٹوپی ہے۔ جو کثرت استعمال سے اپنی اصل شکل و ہیئت اور رنگ و روپ کھو چکی ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ امر واضح ہے کہ سوشلزم کا مقصد معاشرے میں اجتماعی قدروں کو پھیلانا ہے اور ہر حال میں ان کی حفاظت کرنا ہے۔ اور اس کا طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے۔ کہ ذرائع پیدائش و تقسیم دولت کو انفرادی ملکیت سے نکال کر اجتماعی نگرانی میں دے دیا جائے۔ اب اشتراکیت کے جو بھی مختلف ایڈیشن ہمیں نظر آتے ہیں۔ ان میں فرق یہ ہے کہ کس حد تک ذرائع پیدائش دولت اور تقسیم دولت کا انتظام اجتماعی نگرانی میں ہو اور اس مقصد کے حصول کا طریقہ کیا ہو۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سنڈیکلزم (انجمنی اشتراکیت) کمیونزم یا بالشوزم (اشتمالیت) انارکزم (لاراجیت) گلڈ سوشلزم (پیشہ ورانہ اشتراکیت) کلیکٹوازم (اجتماعیت) اور فیبی ازم ("تدریجی" اشتراکیت) وغیرہ کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ جن کا بنیادی فلسفہ ایک ہی ہے۔ مگر طریق کار اور کیفیت کار میں فرق ہے اسی طرح نیشنل سوشلزم کی صورتوں یعنی نازیت اور فسطائیت میں بھی اجتماعی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے باقاعدہ منصوبہ بندی کی جاتی تھی۔ بلکہ فاشی اٹلی کو تو کہا ہی فاشی کارپوریٹ سٹیٹ جاتا تھا۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ حامیان سوشلزم کا سب سے مضبوط مورچہ حضرت علامہ اقبال کے کلام کے بعض حصے اور اور متذکرہ بالا خطبہ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ علامہ اقبال نے روسی اشتراکی انقلاب کو بہ نظر تحسین دیکھا اور اشتمالی نظام اقتصادیات کو اسلامی نظام اقتصادیات کے مشابہ قرار دیا تھا۔ اور وہ اس روسی تجربہ سے خاصے پر امید تھے۔ مثلاً علامہ اقبال کے اشعار ہیں۔

ے
قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم — بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ گفتار
جو حرف قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک — اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

اسی طرح سید جمال الدین افغانی کی زبانی چند اشعار پیغام بہ ملت روسیہ کے عنوان سے کہلائے گئے ہیں۔ ے

آفریدی شرع و آئینے دگر — اند کے با نور قرآنش نگر
تازہ دستور حیات آگاہ شوی — از بم و زیر حیات آگاہ شوی

مگر ہر حقیقت پسند مفکر کی طرح حضرت علامہ نے ایک رائے پیش کر دینے کے بعد غور و فکر اور مشاہدہ ترک نہیں کر دیا ان کے افکار میں ایک عام قاری بھی ارتقاء محسوس کرتا ہے۔ انہوں نے کئی ایک عصری تحریکوں میں دلچسپی لی ہے۔ مگر بالآخر انہیں مسترد کر کے خالص اسلام کی طرف رجوع کیا ہے۔ کیا علامہ اقبال کے اس نظریہ وطن ے خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے۔

اور اس نظریہ وطن ے ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے — جو پیرہن اس کا ہے وہ ملت کا کفن ہے

میں کوئی فرق نہیں، چنانچہ اشتراکیت کے بارے میں بھی ان کے خیالات ارتقائی منازل طے کرتے ہیں پہلے وہ اسے پسند کرتے ہیں۔ مگر بالآخر مسترد کر دیتے ہیں۔ دیکھیے "ابلیس کی مجلس شوریٰ" نظم میں اشتراکیت کے ہاتھوں متلکم ابلیسی نظام کے درگوں ہو جانے کا خدشہ پیش کرتے ہوئے ابلیس کا تیسرا مشیر کتنا مضطرب نظر آتا ہے۔

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد　　یہ پریشاں روزگار آشفتہ مغز آشفتہ ہو

جانتا ہے جس پہ روشن باطن ایام ہے　　مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے

گویا خود ابلیس کے نزدیک ابلیسی نظام کو اگر کسی چیز سے خطرہ ہے تو وہ صرف اور صرف اسلام ہے۔ اشتراکیت وغیرہ کی ہرگز یہ حیثیت نہیں۔ بلکہ اشتراکیت نے تو تجربہ گاہ عمل میں آکر یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ انسانی شرف اور وقار کے لئے دنیا میں موجود ہر برے سے برے نظام سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ افسوس یہ ہے کہ موجودہ کیمونزم نے خود مارکس کے خواب کی بھی نہایت غلط تعبیر پیش کی ہے۔ اس نے انسانی معاشرے میں معاشی مساوات کے تصور کو اس لئے پیش کیا تھا کہ اس کے نزدیک فرد کی سیاسی آزادی کے لئے یہ ضروری شرط ہے کہ اس کی معیشت آزاد ہو اور یہ ٹھیک بھی ہے۔ مگر ہوا یہ ہے کہ اشتراکی معاشرے میں نہ تو فرد کو معاشی آزادی حاصل رہی ہے اور نہ وہ سیاسی طور پر آزاد ہوا ہے۔ یہ درست ہے کہ اشتراکی معاشرے میں فرد اب تک مختلف سرمایہ دار افراد کے تصرف سے نکل گیا ہے۔ مگر اس کی بجائے وہ سرمایہ داروں کے ایک بہت بڑے گروہ جس کے قبضہ میں براہ راست سیاسی اقتدار بھی ہے کا غلام بن کر رہ گیا ہے۔ اب اسے وہاں چوں و چرا کی بھی مجال نہیں رہی۔ اور اگر کوئی شخص آج روسی نظام کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیتا چاہے تو وہ موجودہ اشتراکی اور سرمایہ دارانہ نظام میں اس کے علاوہ اور کوئی فرق محسوس نہیں کرے گا کہ وہاں بذات خود ریاست کے نام پر سرمایہ داروں کا ایک گروہ مجموعی طور پر عوام پر مسلط ہے اور یہاں کئی ایک سرمایہ دار انفرادی طور پر عوام کا خون چوس رہے ہیں۔

پھر علامہ اقبال نے ابلیس کی زبانی یہ بھی واضح کیا ہے کہ صرف اسلام ہی کیونکہ ابلیسی نظام کے لئے ایک خطرہ ہے۔

الحذر آئین پیغمبر سے سو بار الحذر　　حافظ ناموس زن مرد آزما مرد آفریں

موت کا پیغام ہر نوع غلامی کے لئے　　نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیر رہ نشیں

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف　　منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب!　　بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں — اور

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں　　ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات

گویا اس لئے کہ اسلام اپنے پیش کردہ نظام پیدائش و تقسیم دولت کے ذریعے دولت اور سرمایہ پر ایسی پابندیاں عاید کر دیتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی دولت کی طرح وہ نقصان دہ ثابت نہیں ہوتی۔ وہ مالکان کے ہاتھوں میں بطور ملکیت نہیں، بلکہ صرف بطور امانت باقی رہ جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ امانت کا غلط استعمال ہرگز نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح یہ نظام انسانی آزادی مساوات اور شرف و ناموس کا پورا پورا محافظ بن جاتا ہے اسلام میں سرمایہ داری کی طرح دولت بجائے خود ایک مقصد نہیں بلکہ انسان کی کچھ بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے اور نیکی کا محض ایک ذریعہ ہے اس سلسلہ میں اسلام سرمایہ داری اور اشتراکیت کی انتہاؤں سے بچتا ہوا راہ اعتدال اختیار کرتا ہے۔ یہ درست ہے کہ انسانی فطرت میں اخوت کی قدروں کے لئے خاصا احترام موجود ہے۔ اور اسی چیز نے انسان کو ایثار و قربانی کے جذبات دے کر اسے معاشرے میں رہنے کے قابل بنایا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ انسانی فطرت میں جذبۂ انفرادیت بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ یہ پابندیوں سے بھاگتا بھی ہے۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت کی یہی غلطی ہے کہ ایک نے صرف انسان کی انفرادیت کو پیش نظر رکھا ہے اور اس کی ترقی کے لئے آزاد مسابقت کے رنگ میں فرد کو وہ مادر پدر آزادی دی ہے کہ اس نے انسانی مساوات اور کمزوروں کے تحفظ کو ختم کر دیا ہے۔ اور یا آخر اس نے اپنا فلسفہ یہ اختیار کیا ہے کہ

زندگی جداست استحقاق نیست۔ مگر دوسرے نظام یعنی اشتراکیت نے انسانی زندگی کی صرف اجتماعی قدروں کو اختیار کیا ہے۔ اور اس کی انفرادیت کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے اور اس طرح مکمل مساوات قائم کرنے کے شوق میں آزادی کو ختم کر دیا ہے۔ (مگر اس مقصد کے حصول میں بھی ناکام رہی ہے)

علامہ نے ان دونوں انتہاؤں سے اعراض کرتے ہوئے انسانی فطرت کے انفرادی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں کو ملحوظ کیا ہے۔ اور کے حق ایک پابندیوں کے ساتھ فرد کو انفرادی سطح پر دولت کمانے کا اختیار دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ ہر دولت کمانے والا اپنی ضروریات سے زائد حصہ خرچ کر دے اور دوسرے ضرورت مندوں کے حوالے کر دے۔ اب اگر سوشلزم کے اقتصادی نظام کو اختیار کر لیا جائے جس میں انفرادی جدوجہد اور انفرادی آزادی کے لئے کوئی گنجائش نہیں اور اسے ہی اقبال کی پسند قرار دے دیا جائے تو یہ علامہ اقبال کے فلسفہ خودی کی پوری نفی ہوگی۔ اور ظاہر ہے علامہ کے کلام کی کوئی ایسی تاویل قبول نہیں کی جا سکتی جو ان کے نظریہ خودی سے متصادم ہو۔ کیونکہ وہی اقبالیات کا بنیادی جزو ہے

علامہ اقبال نے صرف کمیونزم پر ہی بحث نہیں کی اور اس کا اسلام سے تقابلی مطالعہ ہی پیش نہیں کیا۔ بلکہ خود کارل مارکس کے متعلق بھی اپنی رائے پیش کی ہے۔ ابلیس کا مشیر سوم اپنی کم نگاہی کی بنا پر اسے کلیم بے تجلی اور مسیح بے صلیب اور نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب ،، کا اعزاز دے رہا ہے۔ مگر خود حضرت علامہ اس کے متعلق کہتے ہیں۔ع

نیری کتابوں میں اے حکیم معاش رکھا ہی کیا ہے آخر　　　خطوط خمدار کی نمائش مریز و کجدار کی نمائش

اور ــــ　　　دین آں پیغمبر حق ناشناس　　　بر مساوات شکم دارد اساس

ان آراء کے مطالعہ کے بعد بھی یہ کہنا کیا انصاف کا تقاضا ہے کہ حضرت علامہ کیمونزم کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتے تھے؟ وہ اگر فی الواقع کیمونزم سے کچھ نیک توقعات وابستہ کر سکتے تو یقیناً اس چیز کو اپنی نگارشات کا باقاعدہ موضوع بناتے اور بتلاتے کہ عملاً سوشلزم میں تصور خدا کو کیونکر شامل کیا جا سکتا ہے اور اس آمیزہ کی عملی تفصیلات کیا ہوں گی؟ انہوں نے اپنے ۱۹۲۰ء کے خط میں جن تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ وہ یہی ہے کہ سوشلزم نے تقسیم دولت کے سلسلہ میں ایک طریقہ سے انسانی مساوات قائم کرنے کی کوشش میں اسلام سے جزوی سی مشابہت حاصل کی ہے۔ وگرنہ انہوں نے اپنی رائے ایک عقیدہ (formula) وضع کر لینے کے لئے ہرگز پیش نہیں کی تھی۔ اور آخری بات یہ ہے کہ اگر انہوں نے یہ لکھا ہے کہ " بالشوزم میں خدا کی ہستی کا اقرار شامل کر لیا جائے تو بالشوزم اسلام کے بہت ہی قریب آجاتا ہے ،، تو آخر اس قرب سے یہ فارمولا وضع کر لینے کی گنجائش کہاں سے نکلتی ہے کہ بالشوزم + خدا = اسلام انہوں نے اس غیر فطری آمیزہ کو اسلام تو ہرگز نہیں کہا۔ صرف اس سے قریب کہا ہے۔ پھر آخر سوشلزم کے ساتھ اسلام کو نتھی کرتے میں حضرت علامہ کے نام کو یوں استعمال کرنا کہاں کی دیانت ہے۔

مذاکرہ:

عالم اسلام اور اشتراکیت کا چیلنج

★

★ اے۔ جے۔ ٹائن بی
★ ای آئی جے روزنتھال
★ ڈبلیو۔ مونٹگمری واٹ
★ اے۔ کے۔ بروہی
★ سید ابوالاعلیٰ مودودی
★ چودھری محمد علی
★ جسٹس عبدالحمید

"اشتراکیت غربت اور ابتر معاشرتی حالات سے پیدا نہیں ہوتی
کیونکہ اس کی اپیل مہارت یافتہ اور بہتر تنخواہ پانے والے کاریگر کیلئے ہے
ایک غریب آدمی کے لئے نہیں۔ اور نہ ہی ایسی صورت ہے کہ اسکا عروج
اس امر پر منحصر ہے کہ عوام کو سرمایہ دارانہ نظام کے سبب غیر
انسانی حالات کا اچانک شعور حاصل ہوگیا ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں
کہ ہر عہد میں ریاست ان کے مفادات کی حفاظت کرتی رہی ہے۔ پھر
فیکٹریوں میں محنت کی یکسانیت بھی اس کے عروج کی کوئی وجہ نہیں
ہے کیونکہ اس امر کے ثبوت میں کوئی شہادت مہیا نہیں کی جاسکتی کہ
اگر مزدوروں کو احساس تحفظ حاصل ہو اور انہیں یہ یقین دلا دیا جائے
کہ ان کا معیار زندگی معرض خطر میں نہیں ڈالا جائے گا تو پھر بھی انہیں
کام کی یکسانیت ناپسند رہے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ مارکسزم اپنے جوہر کے
اعتبار سے کوئی عوامی تحریک ہے ہی نہیں بلکہ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ
تحریک بورژوائی تحریک ہے اور جیسا کہ مارکس اور اینجلز نے ہمیشہ اس
بات کو تسلیم کیا ہے اس کی اصل قوت اس میں مضمر ہے کہ یہ لوگوں کو
کس قدر متاثر کرسکتی ہے آج بھی یہ زیادہ تر دانشور طبقہ طبقہ کو متاثر
کرتی ہے اور پھر یہ تاثر نچلے طبقوں تک منتقل کیا جاتا ہے۔ آخری
تجزیے میں، مارکسزم ایک ایسا نظام خیال ہے جس نے گذشتہ تین
صدیوں کی بڑھتی ہوئی لادینیت کے نتیجے میں منظم مذہب
(ORGANIZED RELIGION) کے خاتمے سے پیدا ہونیوالے خلا کو پر کیا
ہے۔ اب اگر اس کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے تو یہ صرف انہی اصولوں
کی مدد سے ممکن ہے جو مارکسزم سے کلیتہً مختلف تصور حیات پر
مبنی ہوں۔"

چراغِ راہ نے اپنی روایات کو قائم رکھتے ہوئے اس اشاعتِ خصوصی کے لیے بھی ایک مذاکرہ کا اہتمام کیا ہے۔ ہم نے پاکستان اور بیرونِ پاکستان کے اہم مفکرین کو اس موضوع پر لکھنے کی دعوت دی تھی:

"آپ کی نگاہ میں عالمِ اسلامی کے لیے اشتراکیت کا حقیقی چیلنج کیا ہے اور اس کا مقابلہ کس طرح کیا جا سکتا ہے"۔

ہم نے یہ سوال تین قسم کے مفکرین کو بھیجا تھا: چوٹی کے مستشرقین، جو مغربی نقطۂ نظر سے اسلامی دنیا کا مطالعہ کرتے ہیں، اہم اشتراکی یا نیم اشتراکی اہلِ قلم اور اسلامی مفکرین۔ ہمیں افسوس ہے کہ اشتراکی یا نیم اشتراکی اہلِ قلم میں سے کسی نے بھی ہماری دعوت پر لبیک نہ کہا۔ کچھ نے معذرت کر دی اور کچھ نے جواب دینے کی بھی زحمت گوارا نہ کی۔ البتہ مستشرقین اور اسلامی مفکرین نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور ہم ان کی تحریرات کو قارئین کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ ہمیں مستشرقین کے بہت سے خیالات سے اختلاف ہے لیکن ہم اختلافِ رائے کے سنے جانے کے حق کو تسلیم کرتے ہیں اور خود اپنے صفحات میں اسے جگہ دیتے ہیں۔ اشتراکی اہلِ قلم نے جس تنگ نظری کا ثبوت دیا ہے اس پر ہمیں افسوس ہے۔ ہم چاہتے تھے کہ ان کا نقطۂ نظر بھی انہی کے الفاظ میں ہمارے قارئین کے سامنے آ جائے، لیکن نہ معلوم کیوں وہ علمی مذاکرات سے پہلوتہی کرتے ہیں۔ "کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے"۔ ہم اس کے علاوہ اور کیا کہیں کہ اگر وہ اس بزم میں شرکت کا فیصلہ کرتے تو ہم ان کے خیالات کو من و عن پیش کر دیتے۔ برٹرینڈ رسل سے لے کر فیض احمد فیض تک سب ہی نے عدمِ شرکت کی روش اختیار کر کے سوشلسٹوں کی رواداری کے بارے میں کوئی اچھی مثال قائم نہیں کی ۔۔۔ یا ہو سکتا ہے کہ صحیح مثال یہی ہو!

ایڈیٹر

○

پروفیسر آرنلڈ جے ٹائن بی

(لندن)

میری نگاہ میں عالمِ اسلام کے لیے ۔۔۔ اور باقی دنیا کے لیے بھی ۔۔۔ کمیونزم کا حقیقی چیلنج غیر اشتراکی طریقوں سے بہتر کارکردگی

کے ساتھ عدل اجتماعی کا قیام ہے۔ کمیونزم کی صورت میں دراصل اس بات کی سزا دی گئی ہے کہ ہم غیر اشتراکی طریقوں سے ایک ایسا نظام قائم کرنے میں ناکام رہے ہے۔

جہاں تک سوشلزم کا تعلق ہے، تو میں اسے کوئی اصلی سوال نہیں سمجھتا، یہ مسئلہ صرف درجات کے فرق سے تعلق رکھتا ہے۔ تمام حکومتوں میں اجتماعی ذرائع سے حاصل کی جانے والی آمدنیوں اور اجتماعی خدمات کا نظام موجود ہے۔ میرا خیال ہے کہ کسی ملک کی معیشت کے پرائیویٹ اور پبلک سیکٹرز کا خط امتیاز اس ملک کی معاشرتی، معاشی اور ثقافتی حالات کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ (جو ہر ملک میں مسلسل درجہ بدرجہ ہوتی رہتی ہیں) اپنے تناسب کے لحاظ سے ہمیشہ بدلتا رہنا چاہیے۔

○

پروفیسر مانٹگمری واٹ

(ایڈنبرا)

اسلام کے لیے اور بنی نوعِ انسان کے دوسرے گروہوں کے لیے کمیونزم کا چیلنج دوہری نوعیت کا حامل ہے۔ ایک طرف تو کمیونزم مسلمانوں کو یہ چیلنج پیش کرتا ہے کہ وہ ایک ایسا معاشرہ تشکیل کر کے دکھائیں جس میں جدید ٹکنالوجی کا مکمل استعمال بھی ممکن ہو سکے اور یہ چیز مسلمانوں کی صالح زندگی کی راہ میں رکاوٹ بھی نہ بن سکے۔ یہ حقیقت ہے کہ قرآن مسلمانوں کو بتاتا ہے کہ بنیادی انسانی اقدار کیا ہیں، اور اب مسلمانوں کے لیے صالح زندگی وہی ہے جس میں ان اقدار کو بروئے کار لایا جا سکے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے یہی کافی نہیں ہے کہ وہ مستقبل کے لیے ایک معاشرہ کا خاکہ اپنے پاس رکھتے ہیں، نئے معاشرے کے کچھ اجزا لازماً پہلے سے موجود ہونے چاہئیں۔

دوسرا چیلنج فکری ہے اور یہ چیلنج خالصتاً کمیونزم کا نہیں ہے، بلکہ مختلف دوسری سمتوں سے بھی مذہب کو اس چیلنج کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے —
یعنی دورِ جدید میں مذہب پر بالعموم اور اسلام پر بالخصوص کی جانے والی تنقیدوں کا جواب، خاص طور پر یہ اعتراض کہ "مذہب عوام کے لیے افیون ہے" یا یہ کہ "خدا انسانی ذہن کا ایک تصور ہے"۔ ان میں سے پہلا اعتراض میرے نئے معاشرے والے نکتے سے بھی متعلق ہے:

ان سوالات کا کوئی سہل اور سیدھا سادا جواب تو مشکل ہے البتہ اس سلسلے میں مسلمانوں کے لیے الغزالی ایک اچھے رہنما ثابت ہو سکتے ہیں، انہیں اس چیلنج کا پورا شعور تھا جو یونانی فلسفہ اسلام کو پیش کر رہا تھا۔ اس چیلنج کا جواب دینے کے لیے انہوں نے یونانی فلسفہ کا بغور مطالعہ کیا۔ انہیں عملی مسائل کا بھی گہرا شعور تھا اور وہ جانتے تھے کہ ان مسائل کو محض سوچ بچار سے حل نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کے لیے اپنی عملی زندگی کا بھی جو دینا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے معلمی ترک کر کے تنہائی کی زندگی اختیار کی۔ دورِ جدید میں الغزالی کی مثال پر عمل کرنے سے مراد یہ ہے کہ دورِ جدید کے مسلمان کو ہم عصر سائنسی علوم اور فلسفیانہ فکر کی مختلف قسموں کا بغور مطالعہ کرنا ہوگا، اور ان میں سے جو چیزیں اسلام کے منافی نہ ہوں انہیں قبول کرنا ہوگا۔ اسے دورِ جدید میں عالمِ اسلام کی معاشرتی ضروریات بھی اپنے سامنے رکھنی ہوں گی اور معاشرے کے غریب اور نچلے طبقوں کی بہتری کے لیے کام کرنے والی تحریکوں میں یا تو حصہ لینا ہوگا، یا ان کی حمایت کرنا ہوگی۔

ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

پروفیسر ای۔ آئی۔ جے۔ روزنتھال

(کیمبرج)

ایک ایسا نظامِ زندگی جس کی بنیاد انسانی عقل کی حاکمیت اور مادّی کائنات پر ہو، ایک ایسے نظامِ حیات سے لازماً متصادم ہوگا جس کی بنیاد وحیِ الٰہی پر ہو۔ یہ وحیِ الٰہی، جس کا اظہار قرآن اور سنت سے ہوتا ہے، حاکمیتِ الٰہی پر زور دیتی ہے اور انسان سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنی مرضی کو اللہ تعالےٰ کی مرضی کے تابع کردے یعنی شریعت کی اطاعت کا دم بھرے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں آپ کا نقطۂ نظر بھی یہی ہے اور کلاسیکل (روایتی) اسلام کے مطابق کوئی دوسرا نقطۂ نظر صحیح بھی نہیں ہوسکتا (اگر کہیں اختلاف ممکن ہے اور فی الحقیقت اس طرح کے اختلافات موجود بھی ہیں تو صرف اس بات میں کہ وحی اور شریعت کی خصوصیات اور حدود کیا ہیں)

اگرچہ اسلام اور کمیونزم میں نہایت بنیادی اختلافات ہیں لیکن معاشرتی تعلیمات کی حد تک دونوں میں بعض چیزیں مشترک بھی ہیں۔ لیکن یہاں اس بات کو ایک بار پھر سامنے رکھنا ضروری ہے کہ کمیونزم میں انسان اپنا حاکم آپ ہے اُسے باہر سے کسی ہدایت کی ضرورت نہیں وہ اپنی تقدیر کا خود مالک ہے جس میں روحانیت کے کچھ عناصر ہوں تو کچھ تعجب نہیں لیکن انہیں ہونا نہیں چاہیئے۔ کیونکہ مرانسانی روح سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا، اس کا تعلق انسانی جسم اور انسانی ذہن سے ہے ——— اور ذہن سے بھی اس قدر کہ وہ پارٹی لائن سے ہم آہنگ کس طرح ہوسکتا ہے؟

انسان کی مادّی فلاح و بہبود چونکہ کمیونزم اور اسلام دونوں کے پیشِ نظر ہے، اس لیے یہاں اشتراک کا شائبہ پیدا ہوسکتا ہے لیکن یہاں ہمیں اس بنیاد کی بات کو بھولنا نہیں چاہیئے کہ انسان کی مادّی فلاح و بہبود سے اسلام کا تعلق صرف اسی حد تک ہے جس حد تک یہ اُس کی اُخروی فلاح و برکت پر اثرانداز ہوسکتی ہے ——— کمیونزم کی لغت میں آخرت نام کا کوئی لفظ ہی نہیں ہے۔

میرا خیال ہے کہ اجتماعی عدل کی کوئی ایسی صورت جس کی بنیاد خدا اور اس کے قانون کے سامنے اہلِ ایمان، بلکہ تمام انسانوں کی مساوی حیثیت پر ہو، کمیونزم کے تجویز کردہ مختلف منصوبوں میں سے کسی ایک کی رو سے اختیار کی جاسکتی ہے۔ لیکن یہاں بھی ایک بنیادی اختلاف ہے ——— گو اسلام کی زیادہ تر دلچسپی اہلِ ایمان، یا اُمتِ اسلامیہ اور جماعت المسلمین سے ہی ہے لیکن اسلام اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہونے کی حیثیت سے ہر فرد کی قدر و قیمت، اہمیت اور داخلی حقوق کو تسلیم کرتا ہے ——— جبکہ کمیونزم اس طرح کے کسی حق کو تسلیم نہیں کرتا۔ گو دونوں نظام دولت کی منصفانہ تقسیم، افراد کے لیے مساوی مواقع اور لوگوں کی بنیادی ضروریات پوری کرنا چاہتے ہیں اور افلاس، ظلم و تشدد اور انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال کے خلاف ہیں۔

اسلام کو کمیونزم سے جو خطرہ درپیش ہے وہ اس اشتراک ہی سے پیدا نہیں ہوتا جو انسان کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کے ایک وسیع دائرے میں دونوں میں پایا جاتا ہے بلکہ کمیونزم کی "متشکری آئیڈیولوجی" بھی (جدید مسلمانوں کی اصطلاح میں: "اسلامی آئیڈیولوجی" کے لیے ایک چیلنج ہے۔ چونکہ کمیونزم میں خدا کا تصور ہی نہیں ہے اور جب اس میں خدا کی مرضی کی اطاعت (خواہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کی اطاعت ہو یا عملی شریعت کی اطاعت) کا سوال پیدا ہوتا ہے اس لیے کمیونزم کے خطرے کی نوعیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

اگر اسلام خود مسلمانوں کی مکمل اطاعت اور وفاداری حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ یہ دورِ جدید کے انسان کے لیے کمیونزم کے [illegible] ایک بہتر متبادل کی حیثیت سے سامنے آسکے خاص طور پر اس شخص کے لیے جو خدا پر ایمان نہیں رکھتا، اور نتیجۃً شریعت

(خواہ وہ تبدیل شدہ صورت میں ہو یا غیر مبتدل) کو اپنی زندگی کا ہادی نہیں سمجھتا۔

○

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

میرے نزدیک اشتراکیت کوئی مستقل بالذات تہذیب نہیں ہے، بلکہ اسی مغربی تہذیب کا ایک شاخسانہ ہے جو یورپ میں کلیسا سے بغاوت کے بعد خدا اور رسالت سے آزاد ہو کر زندگی کے مسائل حل کرنے کے لیے اٹھی تھی۔ یہ تہذیب پچھلی چند صدیوں کے دوران میں لادینیت کی بنیاد پر بہت سے مسلکوں کو جنم دے چکی ہے جن میں بظاہر بڑا اختلاف پایا جاتا ہے اور بارہا ان مسلکوں کے درمیان ایسے سخت تصادم ہوئے ہیں کہ سطحی نظر رکھنے والے ان سے یہ نتیجہ اخذ کر بیٹھتے ہیں کہ فی الواقع ان کے اندر کچھ بڑے بنیادی اختلافات ہیں۔ لیکن درحقیقت سرمایہ داری، فسطائیت، اشتراکیت وغیرہ کے تمام اختلافات فروعی نوعیت کے ہیں۔ اصل تہذیبی نظریہ ان سب کے درمیان مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا ہو یا نہ ہو، بہرحال انسان نہ اس کی اطاعت (ارادی و شعوری اطاعت) کا مکلف ہے، نہ اس کی طرف سے کسی رہنمائی کا محتاج ہے، نہ اس کے سامنے اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہے اور نہ موجودہ زندگی کے بعد کوئی زندگی ہے جس میں انسان کے دنیوی اعمال کا کوئی نتیجہ نکلنے والا ہو۔ انسان قطعی خود مختار ہے، اپنی زندگی کا راستہ اسے خود اپنے علم، تجربات اور مصالح کی روشنی میں تجویز کرنا ہے، اور زندگی کا مقصود اسی حیاتِ دنیا کی خوشحالی ہے۔

یہی وہ اصل چیلنج ہے جو اسلام کو قدیم جاہلیت کی طرح جدید جاہلیت بھی صدیوں سے دے رہی ہے، اور اس کے مقابلے کا طریقہ بعینہٖ وہی ہے جو قدیم جاہلیت کے مقابلے میں قرآن اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری کامیابی کے ساتھ استعمال کر کے ہمیں دکھایا ہے۔ ہم جب تک اس تہذیب کی جڑ پر حملہ نہ کریں گے، اس کو شکست نہ دے سکیں گے۔ اس کی فکری بنیادوں کی حقیقی غلطی و گمراہی کو نظر انداز کر کے اس کے شاخسانوں میں سے کسی ایک شاخسانے کے تجویز کردہ نظامِ حیات کو مستقلاً زیرِ بحث لانا، اور پھر اس کے بھی صرف ظاہری پروگرام پر گفتگو کر کے اس کے حسن و قبح کا فیصلہ کرنا ہمیں کبھی کسی صحیح نتیجے پر نہیں پہنچا سکتا، بلکہ اس طرز بحث میں ہر وقت اس کا امکان ہے کہ اس کی بنیادی ضلالت سے غافل ہو کر ہم اس کے بعض اجزا کو ترک اور بعض اجزا کو قبول کرنے کی غلطی میں مبتلا ہو جائیں اور یہاں تک کہہ گذریں کہ "خدا، جمع اشتراکیت مساوی اسلام"۔ مغربی تہذیب کا پیدا کردہ ہر نظام درحقیقت خدا سے کفر اور بغاوت ہے۔ اس کا کوئی جز قابلِ بحث نہیں ہے بلکہ کل کا کل غلط ہے۔ انسان سرے سے خود مختار ہے ہی نہیں کہ اسے اپنے لیے زندگی کا راستہ خود تجویز کر لینے کا کوئی حق ہو اور خدا کی رہنمائی (یعنی بذریعہ رسالت اور بشکل شریعت رہنمائی) کے سوا انسان کے لیے کوئی راہِ ہدایت کی راہ نہیں ہے کہ اس کے یا اس کے کسی جز کے صحیح ہونے کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہو۔ زندگی کا صحیح راستہ صرف ایک ہی ہے اور وہ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا بتایا ہوا راستہ ہے۔ ہم خواہ بیسویں صدی میں ہوں یا چالیسویں صدی میں، جس وقت بھی ہم کو زندگی کے جو مسائل و معاملات درپیش ہوں گے ان کو حل کرنے کے لیے ہم کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے ہدایت اخذ کریں گے نہ کہ امریکہ یا روس یا چین یا کسی اور سے۔ کتاب و سنت رسول سے اخذ کردہ ہدایت کی بنا پر جو نظام اور پروگرام بنے گا اس کا کوئی جز اگر اپنی ظاہری شکل میں ان باغیانہ نظاموں میں سے کسی کے کسی جز کے ساتھ مماثلت بھی رکھتا ہو تو دونوں کے مزاج اور ان کی روح اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج اور ثمرات میں کوئی مماثلت نہ ہوگی کیونکہ کسی مجموعی نظام کے ہر جز

کا مزاج وہی ہوتا ہے جو مجموعہ کا مزاج ہوتا ہے۔ لیکن اگر ہم نے ہدایت کے لیے کتاب و سنت کی طرف رجوع کرنے کے بجائے انسان کے اپنے گھڑے ہوئے نظاموں میں سے کسی کی طرف رجوع کیا اور اس کی کوئی ایسی چیز چھانٹ کر لے آئے جس کی ظاہری شکل کے خلاف کتاب و سنت سے کوئی دلیل بھی نہ لائی جا سکتی ہو۔ پھر بھی چونکہ اس جزو کا اخذ و اقتباس تقلید جاہلیت کی بنا پر ہوگا اس لیے اس کا مزاج قطعی طور پر اسلام کے مزاج سے مغایر ہوگا اور یہ بے جوڑ پیوند کبھی اسلامی زندگی میں ٹھیک نہ بیٹھ سکے گا۔

مسٹر اے۔ کے۔ بروہی

کیمونزم کی حقیقت اور اس کے طریقِ کار کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم مارکسی فلسفہ کے بنیادی عناصر کو اپنے سامنے رکھیں اور ان میں بھی اس کے تاریخی ارتقاء کی مادی تعبیر کے نظریے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ کیمونزم اس حیثیت سے قطعی طور پر ایک لادینی نظریہ ہے کہ یہ تاریخی ارتقاء کی تشریح کے لیے کسی ماورائے تاریخ یا مابعد التاریخ عامل کی مدد کا محتاج نہیں ہے۔ مارکس کو شکایت تھی کہ اب تک فلاسفہ محض دنیا کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، چنانچہ اُس نے اپنے ذمے جو کام لگایا وہ دنیا کو سمجھنے کا نہیں بلکہ اسے تبدیل کرنے کا تھا۔ مارکس کی زیادہ تر دلچسپی دراصل اُن اصولوں کو سمجھنے تک محدود تھی جن کی مدد سے معاشرتی احوال میں تبدیلی لائی جا سکتی ہو۔ مادہ، حرکت اور معاشی محرکات کی حاکمیت اور اوّلیت پر اُس کا یقین تھا اور اُس کا خیال تھا کہ وہ تصورات و نظریات جو بظاہر انسانی زندگی کی رہنمائی کرتے نظر آتے ہیں کوئی آزادانہ وجود اور حیثیت نہیں رکھتے بلکہ مادّے اور حرکت کے باہمی تعامل سے پیدا ہوتے ہیں اور یہ مادّے اور حرکت کا باہمی تعامل ہی ہے جو حقیقت میں معاشرتی احوال میں تبدیلیوں کا اصل محرک ہے۔

ارتقائے تاریخ کے بارے میں مارکسی فلسفہ کو اگر میں صحیح سمجھ سکا ہوں تو میرے خیال میں ایک کیمونسٹ اور ایک مسلمان کے درمیان خطِ امتیاز یہ ہوگا۔

وحی پر مسلمان کے ایمان کی بنیاد دراصل اُس کا یہ اعتقاد ہے کہ اس کی اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے جو ماورائے تاریخ ہے۔ گویا ایک مسلمان کے نزدیک زمان و مکان میں مقید دنیوی زندگی کو صرف مشیتِ الٰہی کی روشنی ہی میں سمجھا جا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم ان ماورائے تاریخ اور مابعد التاریخ عوامل کو دو اور دو چار کی طرح بیان نہ کر سکیں لیکن ان عوامل کے بارے میں اتنی بات پورے یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ یہ انسانی تاریخ کی مادی تعبیر کے نظریے کو مسترد کرتے ہیں۔

اس مسئلے پر ایک کیمونسٹ اور ایک مسلمان کا مکالمہ کچھ یوں ہوگا:

کیمونسٹ:

میرا نظریہ یہ ہے کہ اگر میں دنیا کو تبدیل کرنا چاہوں اور انسانی تعلقات کو ایک بہتر نظم کے تحت لانا چاہوں تو میں یہ کام صرف مادّے اور حرکت کی تسخیر کے بعد ہی کر سکتا ہوں، کیونکہ یہی وہ بنیادی محرک ہے جو تبدیلی پیدا کر سکتا ہے اور مادّے اور حرکت کی تسخیر معاشرے کے معاشی عوامل کی مدد ہی سے ممکن ہے۔

مسلمان:

ایک لحاظ سے تمہاری بات درست بھی ہے لیکن اس کے لیے تمہارے پاس جو دلیل ہے وہ درست نہیں ہے۔ اگر انسان محض تاریخ کی

پیداوار ہے یا جیسا کہ تم انسان کے بارے میں ایک نہایت ہی محدود تصور رکھتے ہو کہ وہ مادی حالات کی پیداوار ہے تو سوال یہ ہے کہ وہ تاریخ یا مادی حالات کو تبدیل کرنے کا تصور بھی کیسے کر سکتا ہے، جبکہ مادے سے ماوراء اور "شعور" کی حیثیت سے اس کا وجود ہی نہیں ہے؟ تمہیں سب سے پہلے تو اس بات کی توجیہ کرنی ہوگی کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف افراد کے لیے یہ کس طرح ممکن ہوا کہ وہ تاریخ کی رو کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے اپنے زمانے کی مروج منطق کے خلاف جہاد کیا، حالانکہ ان کے خیالات سے اتفاق کرنے والا بمشکل کوئی ایک آدھ ہی ہوتا تھا، لیکن اس کے باوجود انہوں نے تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ میں اس امر سے واقف ہوں کہ مارکس کی نگاہ میں انسانی شعور محض مادہ اور حرکت کے ایک فالتو اور غیر ضروری طفیلی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کے خیال میں تاریخ کا ارتقاء پہلے سے ایک طے شدہ امر ہے اور تاریخ ایک متعین منزل کی طرف رو بہ ارتقاء ہے ——— پرولتاریہ ڈکٹیٹرشپ سے غیر طبقاتی معاشرے کی طرف خود بخود ارتقاء ہو رہا ہے۔ اور یہ سب کچھ انسانی شعور کی مداخلت کے بغیر وقوع پذیر ہو رہا ہے۔ جب یہ دریافت کیا گیا کہ پھر تاریخ میں فرد کا رول کیا ہے تو مارکس اور اینجلز کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی جواب نہ تھا کہ فرد کا کام بس تاریخ کی اس جدلیاتی حرکت کو تیز تر کرنا ہے۔ لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے جب فرد کا کوئی مابعد الطبیعاتی وجود ہی نہیں ہے تو پھر تاریخ کی اس حرکت کو تیز تر کرنے کے لیے اس کے پاس ذرائع و وسائل کہاں سے دستیاب ہوں گے؟ اس کے برعکس ایک مسلمان کا ایمان ہے کہ وہ اپنے ماورائے تاریخ وجود کو تسلیم کرتے تاریخ کی تشکیل کر سکتا ہے۔ ایک مسلمان کے عقیدے کے مطابق فرد کے داخل میں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ایک ایسی خصوصیت موجود ہے جو مادے اور حرکت کے تعامل سے ماوراء ہے ——— اور یہی وہ غیر مشخص، غیر محسوس اور غیر مادی شے ہے جو تاریخی ارتقاء کی بنیادی محرک ہے۔ میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ اس عامل کا حقیقی عمل مادے اور حرکت کے قوانین سے بے نیاز نہیں رہ سکتا بلکہ جس قدر اس عامل کا حقیقی تعلق مادے اور حرکت کے قوانین سے استوار ہوگا۔ انسانی شعور اس قدر دنیا میں تبدیلیاں لانے کا اہل قرار پائے گا۔

کمیونسٹ:

گویا تم اس بات کو مانتے ہو کہ تاریخ میں تبدیلی برپا کرنے کے لیے انسان کے مادی احوال پر کنٹرول کرنا ضروری ہے۔ ہم جو کچھ کہتے ہیں، وہ یہ ہے کہ مادے اور حرکت سے ماوراء کسی شے کا وجود نہیں ہے جبکہ تم مسئلہ تاریخ کو سمجھنے کے لیے ایک ماورائے تاریخ عامل، جسے تم خدا کہتے ہو کا وجود بھی فرض کر لیتے ہو۔

مسلم:

ہاں، میرا مطلب بالکل یہی تھا۔ اب میں اپنی بات کو ایک اور مثال کی روشنی میں واضح کرنا چاہوں گا۔ فرض کیجیے جب لینن ۱۹۱۷ء میں پرولتاریہ ڈکٹیٹرشپ قائم کرنے کے لیے زار کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کر رہا تھا۔ اگر اس وقت زار کے شاہی گارڈز اسے بغاوت کی سازش کرتے ہوئے گرفتار کر لیتے اور اس سے یہ پوچھا جاتا کہ جب مارکسی فلسفے کے مطابق تاریخ خود بخود پرولتاریہ ڈکٹیٹرشپ کی طرف بڑھ رہی ہے تو وہ اپنی زندگی کو خواہ مخواہ خطرے میں کیوں ڈال رہا تھا؟ تمہارے خیال میں لینن اس سوال کا کیا جواب دیتا؟ ———

ایک فرد کی کل متاع اس کی زندگی ہی تو ہے ——— اب یہ زندگی بھی اگر کوئی شخص کسی ایسی چیز کو وجود میں لانے کے لیے قربان کر دے جو معاشرے میں پہلے سے موجود عوامل کے میکانکی تعامل سے لازماً خود بخود وجود میں آکر رہے گی، تو ایسے شخص کے پاس کیا جواب ہو سکتا ہے؟ ایک مسلمان کی حیثیت سے میں لینن کے اس عمل کی توجیہ نہایت آسانی کے ساتھ کر سکتا ہوں۔ میں یہ کہوں گا کہ لینن کو معاشرتی عدل کے آئیڈیل سے ایک طرح کی روحانی اور تخلیقی تحریک حاصل ہوئی تھی اور اس روحانی تحریک کی بنا پر اس نے اپنی جان خطرے میں ڈال دی۔ لینن کے عمل کی صرف یہی توجیہ کی جا سکتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ

جس آئیڈیل سے اس نے تحریک حاصل کی وہ محدود تھا لیکن یہ امر واضح ہے کہ ہمارے پاس لینن کے اس عمل کی توجیہہ موجود ہے جبکہ تمہارے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔

ایک مادہ پرست، دہریے، نہلسٹ اور ایک خدا پر ایمان رکھنے والے شخص کے نقطۂ نظر اور فلسفۂ حیات میں جو بنیادی تضاد ہے، مندرجہ بالا سطور میں میں نے کوشش کی ہے کہ اُسے واضح کر دوں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ خدا پر ایمان رکھنے والا شخص ایک ان دیکھی دنیا کو اپنا آئیڈیل سمجھتا ہے اور اس کی دنیوی زندگی کا ہر لمحہ اس کی اُخروی زندگی کا اثبات کرتا نظر آتا ہے۔ کمیونسٹوں کے پاس اس بنیادی سوال کا کوئی جواب نہیں ہے حتیٰ کہ اُن کے پاس اس سوال کا بھی کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ہے کہ گذشتہ پچاس سال میں کمیونسٹ آئیڈیولوجی کو انسانی تاریخ میں اس قدر کامیابی کیسے حاصل ہو گئی۔ کیونکہ نہ تو وہ آئیڈیولوجی کو تسلیم کرتا ہے اور نہ ہی نظریات و تصورات کی اہمیت اور اوّلیت کا قائل ہے ـــــــ مادے اور حرکت کی پرستش کبھی بھی آئیڈیولوجی کو بنیادی عامل قرار دینے پر منتج نہیں ہو سکتی! حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ کمیونزم کی کامیابی خالصۃً تاریخ کی بعض غیر مادی قوتوں کی کامیابی ہے۔ لیکن ایک راسخ العقیدہ کمیونسٹ اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہو گا کیونکہ اسے تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ تاریخی ارتقاء کو ایک غیر طے شدہ شے سمجھتا ہے حالانکہ اس کے نزدیک تاریخ کی منزل متعین اور طے شدہ ہے۔

خدا پر ایمان رکھنے والا شخص اس مسئلے پر کسی شک و شبہ میں مبتلا نہیں ہے۔ وہ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ مشیت ایزدی کی اطاعت کر کے وہ تاریخی ارتقاء کا رُخ موڑنے کا اہل بن سکتا ہے۔ اگر وہ الٰہی قوانین پر عمل نہیں کرتا تو اُسے اس اعلیٰ مقام سے ہٹا دیا جائے گا اور اس کی جگہ انسانوں کا ایک اور گروہ لایا جائے گا جو زمین پر خدا کی مرضی پوری کرے گا۔ ایک مومن کے لیے تاریخ کے دروازے بند نہیں بلکہ ہر وقت کھلے ہیں اور تاریخ کا سارا ارتقاء انسانی کوششوں پر ہی انحصار کرتا ہے۔ ایک مومن اللہ تعالیٰ کے قوانین کی شعوری اطاعت کر کے ہر وقت مسافرِ تاریخ کو اپنے مطلوبہ راستے کی طرف موڑ سکتا ہے اسی طرح وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے قوانین کی اطاعت نہیں کرے گا اور کائناتی مقاصد کی تکمیل سے روگردانی کرے گا تو وہ سزا کا مستحق ہو گا یا اسے مٹا دیا جائے گا۔

چنانچہ ایک مومن کو مادہ پرست سے الگ کرنے والی دو چیزیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں:۔

(۱) ـــــــ یہ انسان کی بنیادی احتیاج ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع کر دے ـــــــ مومن کی زندگی اس احتیاج کا مسلسل اثبات ہوتی ہے (۲) مومن اپنی ساری زندگی الٰہی مقاصد کی تکمیل کے لیے دنیا میں اصلاح و تعمیر کے کام پر لگا دیتا ہے۔

کمیونزم نے روحانی زندگی کا انکار کر کے عیسائیت کی دنیوی زندگی سے لاتعلقی کے تصور کو ضرب لگائی تھی ـــــــ اسلام بھی اس تصور کے خلاف ہے، اسلام میں جو چیز مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ ایک مومن دنیوی زندگی میں الٰہی مقاصد کی تکمیل کے لیے کوشاں رہے ـــــــ آخرت کی زندگی جسے فنا نہیں ہے، اسی دنیوی زندگی کا انعام ہے ::

چودھری محمد علی

میرے خیال میں پاکستان کے نقطۂ نظر سے کمیونزم کا حقیقی چیلنج یہ ہے کہ ہم اپنے معاشی مسائل کو اسلام کے بتائے ہوئے اصولوں

کے مطابق کس طرح حل کرتے ہیں یا حل کر سکتے ہیں۔

پاکستان میں اس وقت جو نظام رائج ہے وہ سرمایہ داری اور کمیونزم دونوں کی برائیوں کو جمع کیے ہوئے ہے اور اس نظام نے دو اہم معاشی مسائل کو جنم دیا ہے۔

۱۔ افلاس

۲۔ دولت کی ناہموار تقسیم

اشتراکیت ان دونوں مسائل کا جو حل تجویز کر سکتی ہے وہ یہ ہے کہ شدید طبقاتی جنگ برپا کر کے مزدوروں کی بہبود کے نام پر آمریت قائم کی جائے اور تمام ذرائع پیداوار قومی ملکیت قرار دے کر اس آمریت کے حوالے کر دیئے جائیں۔ کمیونسٹوں کے نزدیک یہ ناممکن ہے کہ دولت کی منصفانہ تقسیم جمہوری نظام حکومت کی معرفت ہو سکے چنانچہ روس اور چین میں جو کمیونسٹ انقلاب آیا وہ تشدد کے ذریعہ سے آیا اور وہاں جو حکومت قائم ہے وہ اگرچہ عوام کے نام پر ہے لیکن عوام کو یا مزدور طبقہ کو اس حکومت کی تشکیل یا ردّ و بدل میں قطعاً کوئی اختیار نہیں۔

سرمایہ داری نظام پر کمیونسٹوں کا یہ اعتراض کہ اس میں دولت اور سیاسی قوت کا ارتکاز ہے، کافی حد تک اپنے اندر صداقت رکھتا ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس مرض یعنی ارتکاز دولت و سیاست کا جو علاج کمیونسٹ تجویز کرتے ہیں وہ اس مرض کی شدید ترین شکل ہے یعنی سارا سیاسی اور اقتصادی اقتدار ایک آمریت کے سپرد کر دیا جائے جو نام کو تو مزدوروں کی آمریت ہے لیکن درحقیقت چند افراد کا مجموعہ ہے۔ سرمایہ دار تو پھر بھی ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں ہیں اور ان کی گرفت بھی اتنی مکمل نہیں لیکن یہ تو دس بیس یا زیادہ سے زیادہ چند سو اشخاص ہیں جن کے ہاتھ میں دولت کے سرچشمے، معیشت کے تمام ذرائع اور اقتدار کی تمام کنجیاں ہیں، ہر فرد بشر کا روزگار، اس کا کام کاج، اس کی جائے سکونت بلکہ اس کا مرنا اور جینا ان جابر حکمرانوں کی مرضی پر ہے۔ چونکہ سارا پریس اور نشر و اشاعت کے تمام ذرائع ان کے پاس ہیں اس لیے ان سے اختلاف کا کوئی ذریعہ نہیں تعلیم و تربیت کے تمام اداروں پر یہ قابض ہیں اس لیے یہ انسانوں کے ضمیر کے مالک بھی ہیں اگر کمیونسٹ ڈکٹیٹر چاہئے تو لاکھوں بے گناہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دے جیسا کہ اسٹالن نے کیا اور کسی کو چون و چرا کی گنجائش نہیں۔

استبداد، ظلم اور فساد آمریت کی فطرت میں ہے، الغرض بنی نوع انسان کے دکھوں کا مداوا نہ سرمایہ داری میں ہے اور نہ اشتراکی آمریت میں۔ مغربی سرمایہ داری شخصی آزادی اور انفرادی حقوق کی آڑ میں قومی زندگی میں انارکی پیدا کرتی ہے اور طاقتوروں کو کھلی چھٹی دیتی ہے کہ وہ کمزوروں کا شکار کریں۔ دوسری طرف کمیونزم اجتماعی زندگی کو مربوط کرنے کی خاطر ساری آبادی کو ایسی جکڑ بندیوں میں کس دیتا ہے کہ انسان بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ دونوں طریق جادۂ اعتدال سے ہٹے ہوئے ہیں، اسلام میں انفرادیت اور اجتماعیت کا وہ صحیح اور فطری امتزاج ہے جو انسانی معاشرے کو افراط و تفریط سے بچاتا ہے۔ اسلام میں جہاں ایک طرف انسانی شخصیت کا پورا احترام ہے اور اس کے اعمال کی پوری ذمہ داری فرد پر عائد ہوتی ہے وہاں دوسری طرف معاشرے کے اجتماعی حقوق کا اتنا لحاظ ہے کہ معاشرے کی اصلاح کے لیے کوشاں رہنا فرض ہے اور اجتماعی ذمہ داریوں سے کنارہ کشی ممنوع ہے۔

جیسا کہ شروع میں میں نے کہا ہے کہ ہمارے ہاں جہاں اقتصادی اعتبار سے سرمایہ داری نظام کی بدترین شکل موجود ہے وہاں اشتراکیت کی بدترین شق یعنی آمریت کا جوڑ بھی لگا ہوا ہے۔ جو لوگ ارباب حکومت سے اختلاف کی جرأت کرتے ہیں ان کو طرح طرح کی معاشی تنگیوں میں مبتلا کیا جاتا ہے، شہری آزادیاں چھین لی گئی ہیں۔ نہ آزادئ اجتماع ہے نہ آزادئ تحریر و تقریر اور نہ آزادئ پریس۔ بیشتر اخبارات نام نہاد پریس ٹرسٹ کے قبضہ میں ہیں جس کا سرمایہ بڑے بڑے صنعت کاروں نے مہیا کیا ہے اور جس پر قبضہ حکومت کا ہے۔ اس نظام میں حکمران طبقہ طرح طرح کے اقتصادی فوائد اٹھا رہا ہے اور

حکومت کی پالیسیاں سرمایہ دار طبقے کو زیادہ سے زیادہ نفع پہنچانے والی ہوتی ہیں۔

ان گوناگوں خرابیوں سے گھبرا کر بعض حضرات یہ حل پیش کرتے ہیں کہ تمام بڑی بڑی صنعتوں اور بنکوں کو قومی ملکیت قرار دیا جائے یعنی وہ حکومت کی تحویل میں چلی جائیں۔ اگر واقعی ایسا کیا جائے تو اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ نہ ہوگا کہ آج تھوڑی بہت معاشی آزادی ہے وہ بھی جاتی رہے گی فرق صرف یہ ہوگا تو فقط حکومت کے متعلقین کو اور ملک کی تجارت اور صنعت پر اور پبلک کے ذرائع معاش پر حکومت کی گرفت آج سے بھی زیادہ سخت ہو جائے گی۔

پاکستان ——— اور صرف پاکستان ہی نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان ——— کے معاشی مسائل کا حقیقی حل صرف اسلام ہی کے پاس ہے۔ میں یہاں اجمالاً اسلام کے معاشی اصولوں کو بیان کروں گا جن پر عمل کر کے ہم اپنے معاشی مسائل کو نہایت خوش اسلوبی سے حل کر سکتے ہیں — اور ان اصولوں کی عملی تنفیذ ہی کمیونزم کے چیلنج کا حقیقی جواب ہے۔

۱۔ اسلام میں خلافت ارضی کی حق دار ساری امت ہے نہ کہ کوئی فرد واحد اور نہ ایک خاندان یا قبیلہ۔

۲۔ اسلام ارتکاز مال و اقتدار پر ضرب کاری لگاتا ہے اور بجائے اس کے کہ دونوں کو ایک ہاتھ میں جمع ہونے دے، ان میں تفریق کرتا ہے اور پھر مال کی تقسیم سارے معاشرے میں اس طرح کرتا ہے کہ کہیں دولت صرف امیروں ہی کے درمیان دگردش کرتی رہے۔

۳۔ اسلام ہر شخص سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ اپنی محنت سے حلال طریقوں سے کسب مال کرے اور اپنے کمائے ہوئے مال سے ان لوگوں کا حق بھی تسلیم کرے جو حادثے یا بیماری یا کسی اور وجہ سے محروم رہ گئے ہوں۔

۴۔ اسلام صرف اسی حکومت کو تسلیم کرتا ہے جو آزاد عوام کے آزاد مشورے سے تشکیل دی گئی ہو۔

۵۔ اسلام اگرچہ حکومت کو یہ فرض سونپتا ہے کہ ایک عادلانہ نظام قائم کرے جو تمام لوگوں کو ان کے جائز حقوق بہم پہنچائے اور جہاں مختلف مفادات ایک دوسرے سے ٹکرائیں وہاں ان کے درمیان بے لاگ انصاف کرے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرے، اور حدود اللہ کی حفاظت کرے، لیکن وہ حکومت کو رزق کے سارے سرچشموں پر قابض نہیں ہونے دیتا تاکہ ایسا آزاد معاشرہ تعمیر ہو جو حکومت کا محاسبہ بھی کر سکے نہ یہ کہ سب کو ارباب حکومت کا محتاج بنا دے۔

○

جسٹس عبدالحمید

حالات کے مطالعہ سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ کمیونزم عالم اسلام (یعنی اسلامی ممالک) کے لیے یقیناً چیلنج ہے۔ مگر اس کا مقابلہ بآسانی کیا جا سکتا ہے۔ اگر عالم اسلام ان معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی خرابیوں اور برائیوں کا انسداد کرے جن کی وجہ سے کمیونزم چیلنج ہو سکتا ہے۔ ان میں سے بہت سی خرابیوں اور برائیوں کی اصلاح ان اسلامی اصولوں کو اپنانے سے ہو سکتی ہے۔ جو قرآنی تعلیم اور اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم و اسوۂ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین میں ہماری راہ نمائی کے لیے موجود ہیں اور جن پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین عمل پیرا رہے۔

یہ مسئلہ ایک تفصیلی بحث کا طالب ہے اور اس مختصر مضمون میں جن تفصیلات سے بحث کی جائے گی وہ یہ ہیں۔

کیونزم کن معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی خرابیوں اور برائیوں کا مداوا سمجھا جاتا ہے۔

۲۔ کیونزم کیا ہے اور اس کے اصول کیا ہیں، اور اس کی خوبیاں اور برائیاں کیا کیا ہیں۔

۳۔ وہ معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی خرابیاں اور برائیاں جن کا کیونزم علاج سمجھا جاتا ہے عالم اسلام میں کس حد تک پائی جاتی ہیں اور ان کے اسباب کیا ہیں۔

۴۔ کن اصلاحات کے ذریعے کیونزم کا عالم اسلام میں مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔

(ا)

کمیونزم کا دعویٰ

تاریخ کے چند ادوار میں انسانی معاشرہ کی اصلاح کے مفکرین نے انسانی معاشرہ میں مسلسل ایسی خرابیاں اور برائیاں دیکھیں جو انسانی قدروں کو تباہ کر رہی تھیں اور انسانیت کے ارتقاء کے مانع تھیں۔ انہوں نے دیکھا کہ ایسے حالات پیدا کیے جاتے ہیں جن میں کثیر التعداد انسان چند لوگوں کی غلامی میں رکھے جاتے ہیں۔ سیاسی طاقت، حکومت اور دولت گنتی کے چند افراد (لوگوں) کے ہاتھوں میں رہتی ہے۔ اور باقی بنی نوع انسان غلامی کی زنجیروں میں مقید رہتے ہیں۔ حکومت اور دولت صرف ارباب حکومت اور ارباب دولت کے مفاد کے لیے استعمال میں رہتی ہیں۔ باقی لوگ غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہتے ہیں۔ حکومتیں لوگوں کو جہالت اور احتیاج کے گڑھوں میں دھکیلے رکھتی ہیں۔ تاکہ ان کے اندر اپنی بہبود کا شعور اور جذبہ تک بھی پیدا نہ ہو۔ اور ان کو ان تمام وسائل اور ذرائع سے محروم رکھتی ہے جن سے اس قسم کا شعور اور جذبہ پیدا ہوسکتا ہے۔ وہ انسانی بنیادی ضروریات زندگی سے بھی محروم رکھے جاتے ہیں۔ خوراک، لباس، رہائش، صحت اور تعلیم کی ضروریات انہیں کم انسانی درجہ سے بھی کم درجے کی میسر نہیں آتیں۔ اس کے برخلاف گنتی کے چند لوگوں کے ہاتھوں میں ملک کی تمام دولت اور حکومت رہتی ہے۔ جو ان کے اور ان کے معاونوں کے مفاد کے لیے ہی مخصوص رہتی ہے۔ یہ تھے وہ انسانیت کش حالات اور یہ تھیں وہ معاشرتی خرابیاں اور برائیاں جنہوں نے ان مفکرین کو متاثر کیا۔ اور ان کی اصلاح کا علاج تجویز کرنے پر آمادہ کیا۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ کیونزم بہت سی اقتصادی خرابیوں اور برائیوں کا مداوا ہے۔ اسی وجہ سے یہ وہاں پھلا پھولا جہاں یہ خرابیاں موجود تھیں۔ یہ حالات سب سے اول ملوکیت کے اس دور سے شروع ہوئے۔ جب بادشاہوں نے مفتوحہ ملک اور اس کی رعایا کو اپنی شخصی ملکیت قرار دیا۔ اور ملک کی اراضی جو اس وقت دولت اور اقتدار کا سرچشمہ تھی۔ ان لوگوں میں تقسیم کی۔ جو ان کے مددگار اور معاون تھے۔ فیوڈل ازم (FEUDALISM) اور لینڈ لارڈازم (LANDLORDISM) کی بنیادیں اس دور میں استوار ہوئیں۔ اور معاشرہ دو حصوں میں تقسیم ہوا۔ ایک حصہ بادشاہ اور چند فیوڈل لارڈز (FEUDAL LORDS) پر مشتمل تھا۔ اور دوسرا حصہ کثیر التعداد آبادی کو لپیٹے ہوئے تھا کاشتکاروں اور ملازموں پر مشتمل تھا۔ بادشاہ اور اس کے معاونوں کو ہر قسم کا عیش و آرام میسر تھا۔ اور کاشتکاروں اور ملازموں کو بنیادی ضروریات زندگی کا بھی محتاج رہنا پڑتا تھا۔ ان کے پاس رہائش کے لیے کوئی جگہ نہ ہوتی تھی۔ پیٹ بھر کر روٹی کھانا بھی نصیب نہیں تھا۔ ستر ڈھانپنے کے لیے کپڑے کے بھی محتاج رہتے تھے۔ دم درود اور جنگل کی کچی جڑی بوٹیوں سے بیماریوں کا معالجہ اور مقابلہ کیا کرتے تھے۔ جن دلوں میں ان حالات سے انسانی ہمدردی کا جوش اور ولولہ پیدا ہوا۔ انہوں نے ان پسماندہ انسانوں کو اس قسم کی حیوانیت کی زندگی سے نجات دلانے کی تجویزیں سوچنی شروع کیں۔

اس کے بعد اس قسم کے حالات اس زمانے میں پیدا ہوئے۔ جب صنعتی ترقی کا دور چلا۔ بڑے بڑے کارخانہ داروں نے بڑی بڑی صنعتیں قائم کیں۔ جن سے سارے کا سارا مفاد ان کی اپنی صنعتی ترقی اور بہبودی اور عیش و عشرت کے لیے مخصوص رہتا تھا۔ اور غریب مزدور جن کے پسینے کی کمائی پر

دوسرے طبقہ پیش دیا جاتے تھے۔ اس طرح کی نیم انسانی زندگی میں مبتلا رہتے تھے جس میں کاشتکار مبتلا تھے۔ وہ بھی انسانی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم تھے۔ معاشرہ اس طرح دو طبقوں میں تقسیم ہوا۔ ایک طبقہ لینڈ لارڈز (LAND LORDS) مالکانِ اراضی اور صنعت کاروں پر مشتمل تھا۔ جس کو سرمایہ دار (CAPITALISTS) کہا جاتا تھا۔ اور دوسرا کاشت کاروں اور مزدوروں پر جو (LABURER AND TENENTS) مزدور یا کاشتکار کے ناموں سے پکارے جاتے تھے۔ حکومتیں ہمیشہ سرمایہ داروں کی سرپرست رہیں۔ کیونکہ سرمایہ داری حکومتوں کی ممد و معاون رہا کرتی تھی اس سے سرمایہ داروں کو حکومت کی پناہ حاصل تھی۔

وہ مفکرین جو انسانی بہبود کے خواہاں تھے۔ دوسرے طبقے کے انسانوں کی اس پسماندگی کے علاج کی تلاش میں رہے تاکہ ان کو اس نیم انسانی زندگی کے گڑھے سے نکال کر مکمل انسانی زندگی کی معیار و بلندی تک لایا جائے۔ انسانی قدریں بلند ہوں۔ غربت، افلاس، جہالت اور بیماریوں سے انہیں نجات دلائی جائے اور ان کو بنیادی ضروریاتِ زندگی کے احتیاج سے بالاتر رکھا جائے۔ ان میں سے دو بڑے مفکروں (KARL MARX) کارل مارکس اور (ENGILIS) اینجلز نے شخصی ملکیت کے استیصال میں ہی ان خرابیوں کا مداوا پایا اور اس قسم کے کمیونزم کو ہی ان تمام برائیوں کا علاج سمجھا۔

(۲)

کمیونزم کیا ہے؟

کمیونزم ایک سیاسی و اقتصادی نظام کا نام ہے۔ بعض لوگ اس کو مذہب کا درجہ دیتے ہیں۔ مگر حقیقتاً وہ مذہبی اصولوں کا مخالف ہے اور ہر مذہب کا دشمن ہے۔ کمیونزم اس اقتصادی نظریہ کا نام ہے۔ جس کے بنیادی اصول یہ ہیں۔ اراضی اور ملک کی دولت اور ملک کے تمام ذرائع پیداوار قومی ملکیت قرار دیئے جائیں اور تمام قومی ذرائع اور وسائل کی آمدنی قومی آمدنی ہو۔ اور قومی آبادی پر یا حسبِ ضرورت یا مساوی طور پر تقسیم کی جائے۔ شخصی ملکیت بالکل ختم کی جائے۔ اور قوم کے تمام افراد کی ضروریاتِ زندگی حکومت کی ذمہ داری ہو۔ حکومت کا نظام بھی قوم کے ہاتھ میں ہو۔ قوم کے افراد آزادانہ اور براہ راست و بلاواسطہ انتخاب کے ذریعے زمامِ حکومت اپنے منتخب شدہ نمائندوں کو سپرد کر دیں۔ اور وہ نمائندے کمیونزم کے اصولوں کے مطابق حکومت چلائیں۔ قوم کے افراد کو دولت تمام قومی وسائل سے پیدا کرنے کی تعلیم دی جائے۔ اور ان میں کمیونزم کے اصولوں پر دولت پیدا کرنے اور حکومت چلانے کی اہلیت پیدا کی جائے۔ قومی ذرائع اور وسائل سے حاصل کردہ مفادات بھی قومی ملکیت ہوں۔ اور یہ مفادات قومی بہبودی کے لیے استعمال میں لائے جائیں۔ قوم کے افراد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی یعنی خوراک، لباس، مکان، تعلیم اور طبی امداد وغیرہ بہم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہو۔

کمیونزم شخصی ملکیت کا قلع قمع کرتا ہے۔ اور اس کو صفحۂ ہستی سے مٹاتا ہے۔ چونکہ تقریباً تمام مذاہب شخصی ملکیت کو انسانیت کی بقا اور ارتقاء کے لیے ضروری سمجھتے ہیں اور شخصی ملکیت روحانیت اور انسانی اخلاق کا کئی وجوہات سے ماخذ ہے۔ اس لیے کمیونزم تمام مذاہب کا دشمن ہے۔ اور مذہب کو بھی شخصی ملکیت کے ساتھ صفحۂ ہستی سے مٹاتا ہے۔ کمیونزم کے اصولوں کے مطابق قوم کا ہر فرد قوم کی دولت پیدا کرنے کی مشین کا ایک پرزہ بن کر رہ جاتا ہے۔ ان اصولوں کے مطابق زندگی کا مقصد یہی رہ جاتا ہے۔ کہ فرد قوم کے لیے دولت پیدا کرے۔ جس میں اس کا حصہ صرف اس قدر ہو کہ اس کی ضروریاتِ زندگی اس سے پوری ہو سکیں۔ دولت کا باقی حصہ قوم کے دیگر افراد کے مفاد پر صرف ہوتا ہے۔ قوم کے لیے دولت پیدا کرتا اور اس پیدا شدہ دولت کو قوم کے مفاد پر صرف کرنا ہی اگر مقصدِ زندگی ہو۔ تو انسان کے اندر تمام انسانی جواہر معدوم ہو جاتے ہیں۔ اول تو اس سے محنت اور کوشش پر آمادگی کا جذبہ

(INCENTIVE) چھن جاتا ہے۔ اس کے اندر سعی اور کوشش کا مادہ ختم ہو جاتا ہے۔ اپنے کام اور فن میں کمال تک نہیں پہنچ سکتا۔ شخصی کمال کا گہرا تعلق شخصی ملکیت سے ہے۔ جن لوگوں نے اپنے فنون میں کمال حاصل کیا ہے۔ انہوں نے وہ کمال شخصی ملکیت کے جذبہ کے ماتحت ہی حاصل کیا ہے۔ اس انسانی جذبے کو ختم کرنا انسان کو انسانیت سے گراتا ہے۔ اس لیے کمیونزم جو اس جذبے کو تباہ کرتا ہے۔ انسانیت پر ایک کاری زخم کی حیثیت رکھتا ہے۔ روس میں جہاں کمیونزم پیدا ہوا اور نشوونما پائی۔ لوگوں نے تجربہ سے اس نظام میں چند خرابیوں کا مشاہدہ کیا اور ان کو دور کرنے کے لیے چند تبدیلیاں کیں۔ اور ایک محدود مقدار میں شخصی ملکیت جائز قرار دی۔ اس اصلاح اور ترمیم کے بعد اعداد و شمار سے پتہ چلا کہ اس محدود شخصی ملکیت کے مالکوں کی آمدنی اس قدر قومی ملکیت کی آمدنی سے کئی گنا زیادہ تک پہنچ چکی ہے۔ یہ اسی شخصی ملکیت کے جذبہ کا نتیجہ تھا۔ جسے کمیونزم نے اول تباہ کیا اور پھر اُبھارا۔

جب قوم کے لیے دولت ہی پیدا کرنا اور اس کو حسب ضرورت استعمال کرنا ہی مقصدِ زندگی ہو۔ تو انسان مادہ پرست ہو جاتا ہے۔ اور اس کا مذہب بھی مادہ پرستی ہو جاتا ہے۔ روحانیت جو ایک انسانی لازمی وصف ہے ختم ہو جاتا ہے۔ انسان ایک حیوان بن کر رہ جاتا ہے۔ کمیونزم کا دوسرا وار روحانیت پر ہے اور چونکہ روحانیات کی بنیاد مذہب میں ہے لہٰذا مذہب جو انسانوں میں روحانیت کی نشوونما پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے صفحۂ ہستی سے مٹ جاتا ہے۔

تقریباً تمام انسانی اخلاق و انسانی جواہر شخصی ملکیت سے نشوونما پاتے ہیں۔ انسانی ہمدردی ایک انسانی جوہر اور ایک انسانی قدر ہے اور روحانیات کا منبع ہے۔ اگر ایک شخص کسی ضرورت کا محتاج ہے۔ اور وہ اپنی احتیاج شریفانہ طریقہ سے ظاہر کرتا ہے۔ تو وہ اس شخص کے مقابلہ میں جو اپنی احتیاج غیر شریفانہ طریقہ سے پوری کرتا ہے اپنے اخلاقی کردار کا اظہار کرتا ہے۔ اور جس شخص کے ہاتھ میں اس احتیاج کو رفع کرنے کا ذریعہ ہے۔ وہ اس کی احتیاج شریفانہ طریقہ سے رفع کرتا ہے۔ تو وہ بھی اس شخص کے مقابلے میں جو غیر شریفانہ طور پر احتیاج رفع کرتا ہے اپنے بلند اخلاق کا مظہر ہوتا ہے۔ اگر کمیونزم شخصی ملکیت ختم کر کے نہ کسی کو محتاج چھوڑے اور نہ کسی کو احتیاج رفع کرنے کا موقع میسر کرے۔ تو کمیونزم نہ صرف انسانی ہمدردی کو مٹاتا ہے بلکہ محتاج اور احتیاج رفع کرنے والوں کو اخلاقی کردار کے اظہار سے بھی محروم کر دیتا ہے۔ لوگوں کو انسانیت کے درجہ سے گرا کر حیوانیت کے گڑھے میں ڈالتا ہے۔ حیوان بھی تو دوسرے حیوانوں کی امداد کے محتاج نہیں ہوتے۔

شخصی ملکیت کے حاصل کرنے میں انسانی جواہر اور انسانی اخلاق کے اظہار کا بہت بڑا حصہ ہے۔ حصول دولت کے ذرائع جائز بھی ہیں اور ناجائز بھی۔ ایک شخص جہاں تک جائز ذرائع سے مال حاصل کرتا ہے۔ وہ انسانیت روحانیت اور اخلاق میں اس شخص کے مقابلے میں جو ناجائز ذرائع سے مال حاصل کرتا ہے۔ اپنی اخلاقی بلندی کا ثبوت دیتا ہے۔ اگر شخصی ملکیت ختم ہو جائے تو دولت کے حصول کے ذرائع بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ اور اگر ذرائع ختم ہو جائیں۔ تو انسان کی اخلاقی اور روحانی بلندی اور پستی بھی ختم ہو جاتی ہے۔

اس طرح دولت کے استعمال سے بھی انسانی قدروں کا اظہار ہوتا ہے۔ دولت اگر محتاج کی امداد اور قومی بہبودی میں صرف کی جائے۔ تو صارف سخاوت اور قومی ہمدردی کے اوصاف کا مظہر ہوتا ہے۔ اور اگر صاحب دولت اپنی دولت کو اپنے لیے ہی سمیٹتا رہے۔ اور اپنی خوشی اور بہبودی میں ہی صرف کرتا ہے۔ تو وہ بخل اور خود غرضی کا اظہار کرتا ہے۔ مال اور دولت لوگوں کی تکلیف اور آزار کے لیے بھی استعمال کی جا سکتی ہے۔ وہ باعث عزت اور نیک نامی ہو سکتی ہے۔ اگر صاحب دولت اس کو آزار خلق کے لیے استعمال کرتا ہے یا اس کو باعث فخر سمجھتا ہے۔ تو وہ قبیح اخلاقی کردار کا اظہار کرتا ہے۔ اگر شخصی ملکیت نہ ہو تو ان اخلاقی اور انسانی اوصاف کے اظہار کے مواقع ہی سلب ہو جاتے ہیں۔ اور انسانی قدروں کی جانچ پڑتال کی کسوٹی ہی باقی

نہیں رہتی بلکہ دیگر انسانیت ہی ختم ہو جاتی ہے۔

دولت کے نقصان کو برداشت کی طاقت یا نقصان مال پر صبر و شکر کا مادہ بھی ایک انسانی وصف ہے اور جو شخص اس خوبی کا مالک ہے۔ وہ ایک بلند اخلاق کا حامل ہے۔ اور جو شخص دولت اور مال کے نقصان کو برداشت نہیں کر سکتا اور جزع و فزع کرتا ہے۔ وہ اخلاقی کم مائیگی کا اظہار کرتا ہے۔ اس موضوع پہ قرآن پاک کی بہت سی آیات ہیں مثلاً

۱۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔

۲۔ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ ۖ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ

ترجمہ (۱) ہم لوگوں کی آزمائش ان کو خوف اور بھوک میں مبتلا کر کے اور مال اور جان اور میووں (فائدوں) کے نقصان پہنچنے سے کرتے ہیں۔ پس خوشخبری ہے صابرین کو کہ جب انہیں تکلیف پہنچ جاتی ہے تو کہہ دیتے ہیں ہم اللہ کی طرف سے ہیں اور اللہ کی طرف ہم نے رجوع کرنا ہے۔

۲۔ مصیبت پر صبر کرو۔ صبر عزیمت کا مظہر ہے۔

سخاوت، انسانی ہمدردی، فراخی، صبر و تحمل، انکساری، عجز، ضبط نفس اور دیگر بہت سی انسانی اخلاقی خوبیاں شخصی ملکیت کے وجود ہی سے نشوونما پاتی ہیں۔ اور بہت سی انسانی اخلاقی برائیاں جس میں چوری، رشوت، خود غرضی، بخل، سود خوری، حرص و طمع، نخوت و غرور اور بدچلنی شامل ہیں۔ شخصی ملکیت ہی سے رونما ہوتی ہیں۔ شخصی ملکیت اخلاق اور روحانیت کی تکمیل کا آلہ ہے۔ اور اس کی حیوانیت اور بدکرداری کا ترازو ہے۔ انسانیت کی تکمیل انسان کی روحانیت اور اخلاقی کردار ہی سے جانچی تولی جاتی ہے۔ اور اس کی بدکرداری کا بھی یہی ترازو ہے۔ قرآن پاک میں بھی کئی مقامات پر مال اور دنیا کی نعمتوں کو آزمائش کی کسوٹی بتایا ہے۔ اگر روحانیت اور اخلاقی کردار کے اظہار کے مواقع ہی ختم کر دیئے جائیں اور اخلاقی بدکرداریوں کا ترازو توڑ دیا جائے۔ تو انسان اخلاقی اور روحانی بلندیوں تک نہیں پہنچ سکتا۔ وہ حیوان یا مشین کا پرزہ بن کر رہ جاتا ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ انسان کو حیوانی یا مشینی پرزہ بن کر رہنے کے لیے نہیں پیدا کیا گیا ہے۔ اس کا درجہ بہت بلند ہے۔ یہی وہ برائیاں اور نقائص جو شخصی ملکیت کو مٹانے سے پیدا ہوتے ہیں اور جو انسان کو انسانیت کے درجے سے گرا کر حیوان بنا دیتے ہیں یا اس کو مشین کا ایک پرزہ بنا کر رکھتے ہیں۔

کمیونزم کے اندر تقسیم دولت کے اصول اور قواعد تسلی بخش ثابت نہیں ہوئے۔ تقسیم کرنے والے ابھی تک ایسے قواعد یا طریقے ایجاد نہ کر سکے اور نہ کر سکتے ہیں جن سے ہر فرد کو اپنی ضرورت کے مطابق ضروریات زندگی مہیا ہو سکیں۔ ابھی تک انسانی عقل کمیونزم کے اس دوسرے بنیادی اصول کے صحیح قواعد منضبط کرنے سے قاصر رہی ہے۔

(۳)

عالم اسلام کے مسائل

عالم اسلام اسلامی ممالک کے معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی حالات کے مطالعے سے یہ بات بخوبی روشن ہے۔ کہ بجز ایک دو ملکوں کے باقی ہر اسلامی ملک کے سیاسی نقائص و خامیاں، اور اقتصادی اور معاشرتی برائیاں اور خرابیاں کمیونزم کی پرزور داعی ہیں۔ وہاں کے سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی حالات اسی نوعیت کے ہیں جن کا علاج کمیونزم سمجھا گیا تھا۔ اور جن کی وجہ سے کمیونزم زندہ ہوا۔ اگر ان ملکوں میں سیاسی نقائص و خامیوں

(خامیوں) اور اقتصادی اور معاشرتی خرابیوں کی اصلاح نہ کی گئی تو یقیناً کمیونزم وہاں آکر رہے گا

تقریباً تمام اسلامی ممالک باستثنائے چند سیاسی حیثیت سے بہت پسماندہ حالت میں ہیں وہاں یا تو مطلق العنان ملوکیت ہے۔ یا فوجی ڈکٹیٹرشپ۔ صحیح جمہوریت بہت کم ملکوں میں پائی جاتی ہے اور اگر کہیں جمہوریت ہے بھی تو برائے نام۔ حکومت کا اقتدار محدود سے چند افراد کے ہاتھ میں ہے اور انہوں نے حکومت کو صرف اپنے مفاد کا آلۂ کار بنایا ہوا ہے۔ لوگوں کے اندر ایسا سیاسی شعور پیدا ہی نہیں ہونے دیا جاتا کہ وہ صحیح جمہوریت قائم کر سکیں۔ جمہوری جذبات کو ہر طریقے سے کچلا جاتا ہے۔ اور اگر کہیں ذی شعور افراد ہوں یا تو اُن کو کئی طریقوں سے رشوت دے کر ہمنوا بنایا جاتا ہے۔ یا جیلوں میں نظر بند رکھا جاتا ہے۔ کمیونزم کی چند خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ ہے کہ وہ مطلق العنان ملوکیت، فوجی ڈکٹیٹرشپ اور معدودے چند افراد کا اقتدار برداشت نہیں کرتا اور اس کا قلع قمع کرتا ہے۔ اور لوگوں کو غلامی، افلاس، جہالت اور احتیاج سے نجات دلاتا ہے جس قسم کی سرزمین اسلامی ممالک میں ہے۔ وہ کمیونزم کی نشوونما کے لیے بہت زرخیز ہے۔

ان ملکوں میں دولت کا یہ حال ہے۔ کہ وہ اُن چند لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ جو حکومت کے حامی اور ثناخوان ہیں۔ دولت کمانے کے جس قدر ذرائع ہیں، مثلاً اراضی، صنعتیں، کارخانے، تجارت سب کے سب اُن لوگوں کے حصے میں ہیں۔ اور انہی کے ہاتھوں میں رہتے ہیں۔ جو حاکموں کو اپنے مفاد میں شریک رکھیں۔ یا اُن کے سیاسی مقاصد میں اُن کے معاون ہوں۔

کثیر التعداد آبادی افلاس اور جہالت میں مقید ہے۔ خوراک، لباس اور رہائش کے لیے وہ عمر بھر محتاج رہتی ہے۔ اس احتیاج میں اُن کو اس لیے عمر بھر مبتلا رکھا جاتا ہے۔ کہ اُن کے اندر اس قسم کا شعور ہی پیدا نہ ہو جس کے ذریعہ وہ اقتدار حاصل کر کے اپنی بہبودی کی راہیں تلاش کر سکیں اور اپنی غلامی کی زنجیروں کو توڑ سکیں۔ وہاں وہی حالات ہیں جنہوں نے کمیونزم پیدا کیا۔ اور اگر یہی حالات بدستور رہے۔ تو کمیونزم وہاں ضرور آئے گا

اسلامی ممالک کی گذشتہ سیاسی اور اقتصادی تاریخ ان حالات کی ذمہ دار ہے۔ خلفائے راشدین کے دور کے بعد اسلامی ممالک ملوکیت کے چنگل میں گرفتار رہے۔ بادشاہوں نے مسلمان رعایا کے ساتھ وہی سلوک کیا جو مطلق العنان بادشاہ رعایا کے ساتھ غیر اسلامی ممالک میں برتتا تھا۔ حکومت اور دولت صرف اُن لوگوں کے مفاد کے لیے مخصوص تھی۔ جو حکومت کے معاون اور ثناخوان تھے۔ باقی رعایا کو افلاس، احتیاج اور جہالت میں مبتلا رکھا۔ تاکہ ان کے اندر سیاسی شعور پیدا نہ ہو۔ اور وہ حکومت پر نکتہ چینی کے قابل نہ ہو سکیں۔ اس کے بعد بہت سے اسلامی ممالک غیر مسلم فاتحوں کے پنجوں میں مفتوحہ حیثیت سے بطور کالونی رہے۔ ان غیر مسلم حاکموں نے ان کالونیوں کی رعایا کے ساتھ وہی سلوک جاری رکھا جو مطلق العنان بادشاہ اپنی غلام رعایا کے ساتھ کرتے تھے۔ بلکہ انہوں نے تو اُن کو اس سے بھی زیادہ پسماندہ حالت میں رکھا۔ افلاس، احتیاج اور جہالت اس دور میں اور بڑھ گئی۔ اقتدار اور دولت بالکل غیر مسلم حاکموں کے ہاتھ میں چلی گئی تھی۔ رعایا کو حکومت اور دولت پرستی کا سبق سکھایا گیا تھا۔ اور وہ اس میں مستغرق رہے۔ مسلمانوں کی حالت ملازموں اور کاشتکاروں سے بدتر تھی۔

اس کے بعد دنیا میں ایک ایسی ہوا چلی کہ بہت سی غیر مسلم حکومتوں کو اپنی کالونیوں سے دستبردار ہونا پڑا۔ اور حکومت اور سیاسی اقتدار اہلِ ملک کو سونپنا پڑا۔ لیکن چونکہ انہوں (غیر مسلم حاکموں) نے لوگوں کے اندر ایسا سیاسی شعور پیدا ہونے نہ دیا تھا۔ کہ وہ حکومت اور سیاسی اقتدار لوگوں کی بہبودی کے لیے استعمال کر سکیں اس لیے جو حکومتیں غیر مسلم حاکموں کے بعد قائم ہوئیں۔ وہ ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں آئیں جنہوں نے حکومت اور سیاسی اقتدار کو اسی طرح سے مفاد کے تحت استعمال کیا۔ جس طرح غیر مسلم حاکم اُن سے پہلے استعمال کیا کرتے تھے۔ انہوں نے بھی صحیح طور پر افلاس، احتیاج، اور جہالت کو رفع کرنے کے لیے

کوئی صحیح کوششیں نہ کیں۔ اپنے سیاسی اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے وہی حربے استعمال کیے جو غیر مسلم حکمران استعمال کیا کرتے تھے۔ انہوں نے بھی ایسے قوانین وضع کیے۔ کہ حکومت اور برسر اقتدار لوگوں پر کسی قسم کی نکتہ چینی کی نوبت تک نہ آئے۔ عدالتی کارروائی کے بغیر مخالفین کے لیے جیل کے دروازے کھولے اور قسم قسم کی رشوتوں سے اپنے حامیوں اور ثناخوانوں کو نوازا۔ چونکہ کثیر التعداد لوگ صدیوں سے حکومت پرست اور دولت پرست ہو چکے تھے۔ وہ حکومت اور دولت کی پرستش کی لعنت سے آزاد نہ ہوتے۔ اگر کسی کے ہاتھ میں ناجائز طریقے سے بھی حکومت اور دولت آ گئی۔ تو لوگ اپنے مفاد کے لیے اس کے پرستار رہے۔

ان میں سے بہت سے ملکوں میں فوج کے ذہن میں یہ آیا۔ کہ لوگوں کے اندر عدم شعور اور عدم اتحاد کی وجہ سے صحیح جمہوریت کے قیام کا جذبہ ہی مفقود ہو چکا ہے۔ لوگوں کی اس بے بسی نے فوج کو حکومتوں پر قبضہ کرنے پر اکسایا۔ اور فوجوں نے حکومتوں پر قبضہ کر لیا۔ اور حکومت اور دولت مطلق العنان حاکموں کی طرح اپنے اور اپنے حامیوں اور معاونوں کے مفاد کے لیے استعمال کی۔ لوگ چونکہ صدیوں سے حکومت اور دولت کے پرستار رہ چکے تھے۔ جذبہ اور شعور جمہوریت سے معرا تھے۔ انہوں نے فوجی حکومتوں کی پرستاری بھی اسی طرح شروع کر دی جس طرح وہ پہلے مطلق العنان حکومتوں کی کیا کرتے تھے۔ وہاں اب بھی کثیر التعداد لوگ بدستور افلاس، احتیاج اور جہالت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اور ان تمام ملکوں کی آبادی ان ہی دو طبقوں میں بٹی ہوئی ہے جن میں وہ اس وقت تھی۔ جب کمیونزم کے موجدوں نے کمیونزم ایجاد کیا۔ اور اس کے مبلغ اس کی تبلیغ کرتے تھے۔ کثیر التعداد لوگ افلاس، احتیاج، جہالت اور مظالم کا شکار ہیں۔ کیونکہ ان کو اس میں مبتلا رکھنے ہی سے سیاسی شعور اور آزادی کا جذبہ دبا رہتا ہے۔ اس وقت تقریباً تمام اسلامی ممالک میں ملوکیت اور فوجی ڈکٹیٹرشپ نے اس شعور اور جذبے کو دبائے رکھا ہے۔ تاکہ ملوکیت اور سیاسی اقتدار ان کے ہاتھوں سے نہ نکلنے پائے۔ لیکن اس قسم کی حکومتوں کو اس بات کا اندازہ نہیں ہے کہ دنیا کے سیاسی اور اقتصادی حالات لوگوں کے اندر باوجود ان کی کوششوں کے سیاسی شعور پیدا کر رہے ہیں۔ اور اس شعور کے نتیجے میں اور افلاس اور احتیاج کی وجہ سے کمیونزم کا جذبہ پیدا ہو رہا ہے۔ اگر آج ان برائیوں اور خرابیوں کا کوئی صحیح علاج نہ کیا گیا تو کمیونزم ان کا علاج کرے گا۔

یہ سب سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی برائیاں جن کے لیے کمیونزم حقیقی چیلنج ہے عالم اسلام میں ہرگز رونما نہ ہوتیں۔ اگر عالم اسلام میں اس قسم کی حکومتیں قائم کی جاتیں۔ اور اس قسم کا اقتصادی نظام ہوتا جس کی تعلیم قرآن پاک اور جن کی رہنمائی سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسوۂ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین میں موجود ہے۔ اور اسلامی حکومتوں کا اگر راہ عمل وہی ہوتا۔ جو خلفائے راشدین کا تھا۔ اسلامی ممالک میں سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی خرابیاں اس وقت سے پیدا ہونی شروع ہوئیں جب مسلمانوں نے اسلامی تعلیم کے برخلاف ملوکیت قائم کی۔ مسلمان بادشاہ مطلق العنان بادشاہ بنے اور دولت اور حکومت کو اپنے ذاتی اور اپنے رشتہ داروں اور معاونوں کے مفاد کے لیے استعمال کرنا اپنا نصب العین بنایا۔

(۴)

چیلنج اور اسلام کا جواب

۱۔ کمیونزم سب سے اول مطلق العنان ملوکیت اور ڈکٹیٹرشپ (فوجی) کے لیے ایک پُرزور چیلنج ہے۔ ملوکیت اور فوجی ڈکٹیٹرشپ انسانی آزادی اور انسانی قدروں کو کچل کر ہی قائم رہ سکتی ہیں۔ کثیر التعداد آبادی کو افلاس اور جہالت میں مبتلا رکھ کر ہی ایسی حکومتیں چل سکتی ہیں۔ آزادی خیال و آزادی تحریر و تقریر کی ممانعت ہی ان حکومتوں کے آلۂ کار ہیں۔ لوگوں کے اندر سیاسی شعور کو کچلتے میں ہی ان کی بقا ہے۔ اور ظالمانہ قوانین ہی ان کی پناہ گاہ ہوتے ہیں۔ اس لیے سب سے اول عالم اسلام میں جہاں بھی مطلق العنان ملوکیت ہے وہاں بادشاہوں کو جمہوریت کے حق میں دست بردار ہونا

چاہیے۔ یا اگر حکومت رکھتی ہے تو اس کو رعایا کی رضا کے تابع رکھنا چاہیے جیسا کہ برطانیہ میں ملوکیت رعایا کی رضا کے تابع ہے۔ اور بادشاہ لوگوں کے نمائندوں کی مرضی کے برخلاف ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ اسی طرح جہاں فوجی حکومتیں ہیں جو محض فوج کی حمایت اور طاقت سے قائم کی گئی ہیں اور فوج کے بل پر چل رہی ہیں، ان کو بھی جمہوریت کے حق میں دست بردار ہونا چاہیے

جمہوریت کمیونزم کے چیلنج کا اولین حل اور مدافعت کا اولین قدم ہے۔ صحیح جمہوریت صرف بلاواسطہ یعنی براہ راست انتخاب سے ہی قائم ہو سکتی ہے۔ کیونکہ رائے عامہ کا صحیح اظہار صرف براہ راست انتخابات سے ہی ہو سکتا ہے۔ بالواسطہ انتخاب رائے عامہ کا آئینہ دار نہیں ہو سکتا۔ صحیح جمہوریت جو بلاواسطہ یا براہ راست انتخابات سے قائم کی گئی ہو، وہ کمیونزم کے چیلنج کا اولین حل ہے۔ اگر اس قسم کی جمہوریت عالم اسلام میں نہ قائم کی گئی اور مطلق العنان ملوکیتیں یا فوجی ڈکٹیٹرشپیں قائم رہیں تو کمیونزم وہاں آ کر رہے گا۔ اس کے لیے وہاں دروازے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔ اسلامی اصول بھی جمہوریت کے متقاضی ہے۔ لیکن صرف جمہوریت کے قیام سے ہی کمیونزم کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک جمہوریت اُن اقتصادی اور معاشرتی برائیوں کو دور نہ کرے جو کمیونزم کے لیے زمین ہموار کرتی ہیں۔ اس وقت تک کمیونزم کا خطرہ عالم اسلام کے سر پر سوار رہے گا اور یہ چیلنج زندہ رہے گا

کمیونزم ہر شخص کو انسانی بنیادی ضروریات زندگی مہیا کرنے کا دعوی کرتا ہے۔ اور کمیونزم کی کامیابی بہت حد تک اس دعوی کی ایفا پر منحصر ہے۔ انصاف اور انسانیت کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ ہر شخص کو بنیادی ضروریات زندگی میسر ہوں۔ اور وہ اُن سے محروم نہ رکھا جائے۔ افلاس اور احتیاج کا قلع قمع کیا جائے۔ وہ بنیادی ضروریات زندگی جو اسلامی ممالک میں ہر شخص کو مہیا کی جائیں یہ ہیں :۔

۱۔ کوئی شخص خوراک، لباس اور رہائش کا محتاج نہ ہو۔ یہ احتیاجیں ہر شخص کے لیے کام مہیا کرنے اور کام کا مناسب معاوضہ دینے سے رفع ہو سکتی ہیں۔ ہر شخص کو کسی نہ کسی کام کا اہل بنانا حکومت کی ذمہ داری ہو۔ اور حکومت ہر شخص کے لیے وہ کام مہیا کرے جس کا اس نے اُسے اہل بنایا ہو۔ مزدور کے لیے مزدوری، کاشتکار کے لیے زمین، اہل حرفہ کے لیے حرفہ وغیرہ وغیرہ۔ اور جب تک کسی شخص کے لیے کام مہیا نہ ہو سکے اُس کو اس قدر معاوضہ دیا جائے۔ کہ وہ اس کے اور اس کے کنبے کی خوراک اور لباس کے لیے کافی ہو۔ اور وہ معاوضہ اُس کو اس وقت تک ملتا رہے جب تک وہ کام پر نہ لگ جائے۔ کام (EMPLOYMENT) اور عدم کام (UN EMPLOYMENT) کی حالت میں معاوضہ (UNEMPLOYMENT WAGES) حکومت کی ذمہ داری قرار دی جائے۔ یہ بذات خود ایک نظام ہے جس کی بعد میں تشریح کی جا سکتی ہے۔ اصولاً یہ تسلیم کیا جائے کہ کام (EMPLOY.MENT) اور عدم کام (UN EMPLOYMENT) کی حالت میں معاوضہ (UN EMPLOYMENT WAGES) حکومت کی ذمہ داریاں ہیں۔ یہ معاوضہ اس وقت بھی بند کیا جائے جب کام موجود ہو اور معاوضہ لینے والا کام نہ کرنا چاہے۔

۲۔ اگر والدین کی آمدنی کم ہے۔ اور وہ اپنے بچوں کی خوراک اور لباس کا بوجھ برداشت کرنے کے قابل نہیں۔ تو اس حالت میں ہر بچہ کے لیے چودہ برس کی عمر تک اس قدر ماہانہ الاؤنس مقرر کیا جائے۔ جو اُن بچوں کی پرورش کے لیے والدین کا ہاتھ بٹا سکے۔ اگر ایزادی آبادی کو روکنا ہے تو یہ الاؤنس صرف دو یا تین بچوں تک محدود ہو۔ اس سے زیادہ بچوں کے لیے نہ دیا جائے۔ تاکہ الاؤنس کے لالچ میں والدین زیادہ بچے نہ پیدا کریں۔

۳۔ رہائش کے لیے جس شخص کو مکان کی ضرورت ہو اس کو آسان اقساط کے ذریعہ مکان مہیا کیا جائے۔ حکومت ہر طبقہ کے لوگوں کے لیے مکان یا فلیٹ بنائے اور بیس یا تیس سالانہ اقساط میں مکان کی قیمت وصول کرے۔ اس طریقہ سے یا کسی اور آسان طریقہ سے رہائش کے لیے مکان مہیا کرنا بھی حکومت کی ذمہ داری ہو۔

۴۔ طبی امداد ہر شخص کے لیے مفت ہو۔ علاج اور ادویات مفت مہیا کی جائیں۔ اگر بیماری کی وجہ سے کوئی شخص اپنا کاروبار نہیں کر سکتا اور وہ افلاس

کا کنبہ اس کی کمائی سے محروم ہو جاتا ہے۔ اور اس وجہ سے وہ خوراک کے محتاج ہیں۔ تو حکومت اُس شخص اور اس کے کنبے کے لیے اس قدر معاوضہ اس وقت تک دیتی رہے جب تک وہ صحت یاب ہو کر کمائی کے قابل نہ ہو سکے۔ بوڑھے لوگ جو کام کے قابل نہیں اور ذاتی آمدنی نہیں رکھتے۔ وہ بھی اس معاوضہ کے حق دار قرار دیئے جائیں۔

۵۔ تعلیم ہر درجہ تک کی مفت ہو۔ کتابیں وغیرہ بھی مفت مہیا کی جائیں۔ آٹھویں جماعت تک تعلیم لازمی اور جبری ہو۔ تعلیم کا نظام ایسا ہو۔ تعلیمی ادارے حکومت کے کنٹرول سے باہر ہوں۔ اور ملک کی تعلیم قومی تعلیمی کونسل کے سپرد کی جائے۔ حکومت سالانہ آمدنی کا مقرر شدہ حصہ (سات فی صدی سے دس فی صدی تک) قومی تعلیمی کونسل کے حوالے کر دیا کرے۔ ہر درجہ کی تعلیم کا انتظام اس کونسل کی تحویل میں ہو۔ اس کونسل کے ممبران قوم کے تعلیم یافتہ افراد منتخب ہوں۔ آٹھویں جماعت سے اوپر کی تعلیم کے لیے صرف اُن لڑکوں کو چنا جائے جن کی ذہنی قابلیت بلند ہو۔ اسی طرح دسویں اور بارھویں جماعت سے اوپر کے درجوں کے لیے صرف ذہنی قابلیت کی بنا پر طلبا کو داخل کیا جاوے۔ اور صرف اسی تعداد میں لیا جاوے جس تعداد میں ملک کو اُن کی ضرورت ہو۔ اسی طرح پیشہ ور اور فنی کالجوں میں (PROFESIONAL COLLEGES) میں داخلہ ذہنی قابلیت کی بنا پر ہو اور وہاں بھی طلبا اسی تعداد میں لیے جائیں جس کی ملک کو ضرورت ہو اس بارہ میں ایک تفصیلی نظام پیش کیا جا سکتا ہے۔

۶۔ اہل حرفہ اور صنعت کاروں کو اُن کے حرفے اور صنعتوں کے لیے ضروری سرمایہ آلات اور مشینیں و دیگر سامان حسب ضرورت مہیا کیا جاوے۔ اور اس کی قیمت معہ سود و انشورنس آسان اقساط میں وصول کی جائے۔

۷۔ کاشت کاروں کو اگر اراضی موجود ہے تو اس قدر زمین کا مالک بنایا جائے جو ایک اوسط کنبے کی کفیل ہو سکے۔ قیمت بذریعہ اقساط وصول کی جائے۔ اگر زمین اس غرض کے لیے موجود نہیں۔ تو کاشتکاروں کا حصہ اور مالک زمین کا حصہ بذریعہ قانون مقرر کیا جائے۔ اور قانون اس امر کا ضامن ہو۔ کہ مالک کو اپنا مقرر شدہ حصہ اور مزارع کو اپنا مقرر شدہ حصہ بروقت ملتا ہے۔ حصص کی مناسب نسبت بذریعہ قانون مقرر کی جائے۔

۸۔ دولت چند افراد میں محدود نہ رہے۔ دولت کی تقسیم جس قدر وسیع ہو سکے وسیع کی جائے۔ شخصی ملکیت کی ایک مناسب حد مقرر کی جائے۔ تاکہ کوئی شخص اس مقررہ حد سے زیادہ ملکیت کا مالک نہ ہو سکے۔ ٹیکس کا قانون ایسا وضع کیا جائے۔ کہ اگر کسی شخص نے اس قدر دولت کمائی۔ اس کی ملکیت میں مقرر شدہ سے تجاوز کرتی ہو۔ تو قانون کے ذریعہ اس سے اس قدر ٹیکس وصول کیا جائے کہ اس کی کل ملکیت اس مقررہ حد کے اندر رہ جائے۔ کمپنیوں کی ملکیت یا ڈائرکٹر شپ بھی محدود ہو۔ کوئی شخص دو یا چار سے زیادہ کمپنیوں کا ڈائرکٹر یا منیجر نہ ہو سکے۔

۹۔ گورنمنٹ کے ملازمین یا نجی اداروں کے ملازمین کی تنخواہوں میں مناسب نسبت مقرر کی جائے۔ کم سے کم تنخواہ پانے والوں کی تنخواہ اور زیادہ سے زیادہ تنخواہ پانے والوں کی تنخواہ میں ایک اور دس سے زیادہ کی نسبت نہ ہو۔ صرف ایسے ملازم جو خاص قسم کی تعلیم تجربہ اور مہارت کے حامل ہوں اس اصول سے مستثنٰے کیے جائیں۔ اس کے متعلق علیحدہ سکیمیں تجویز کی جا سکتی ہیں۔ اس طرح عوام الناس کا معیار زندگی بلند ہو سکتا ہے۔ مقصد صرف احتیاج ہی سے بالا رکھنا نہ ہو بلکہ عام لوگوں کا معیار زندگی بلند کرنا ہو۔ چند اشخاص کو زیادہ دولت مند کرنے سے قوم کا معیار زندگی بلند نہیں کیا جا سکتا۔ دولتمندوں کا معیار بھی اس قدر بلند نہ ہو کہ وہ اس معیار کو باعث کبر و غرور بنا لیں۔ اور اس معیار کے ذریعہ اور لوگوں پر اس قدر اقتدار یا طاقت حاصل نہ ہو سکے کہ وہ ان کو ذلیل اور نامناسب کاموں پر مجبور کر سکیں۔ اور وہ اس بلند معیار سے ناجائز فوائد حاصل کر سکیں اور معاشرہ کو غلط ادب پیدا کر سکیں۔ اور نہ رشوت دے کر ووٹ خرید کر سکیں۔ اگر معاشرے کے ہر طبقے کے لوگ احتیاج سے بالا ہو کر اچھے معیار پر زندگی بسر کر سکیں۔ تو معاشرہ بہت سے اخلاقی اور سماجی برائیوں اور خامیوں سے پاک ہو سکتا ہے بہت سی اخلاقی کمزوریوں کا سرچشمہ ایک طرف افلاس اور احتیاج ہے۔ اور دوسری طرف بے انتہا دولت کا چند افراد کی مٹھی میں بند رہنا۔ دولت مند

لوگ محتاجوں کو ہر قسم کی ہوس کا شکار بنائے رکھتے ہیں۔ دولت کے ذریعے سیاسی اقتدار بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ ووٹوں کی خریداری دولت کے بل بوتے پر ہو رہی ہے۔ اگر احتیاج اور جہالت دور کی جائے۔ اور معاشرہ میں غریب اور دولت مند میں بہت کم تفاوت رہ جائے۔ اور ضروریات زندگی ہر شخص کو میسر ہوں۔ تو ہر قسم کی چوری اور ناجائز ذرائع سے دولت کمانا، رشوت، بدچلنی اور دولت پرستی اور اس سے جس قدر اور اخلاقی کمزوریاں پیدا ہوتی ہیں۔ سب کی سب تقریباً تقریباً ختم ہو سکتی ہیں یا بہت حد تک کم ہو سکتی ہیں۔ اس سے انسانی قدریں بلند ہوں گی اور اخلاقی کردار اور ذہانت قابلیت اور اہلیت نشوونما پائے گی۔

احتیاج سے بالاتر ہو کر ہی انسان اخلاقی قدروں کا حامل ہو سکتا ہے۔ اس کے اندر آزادی خیال، نیک کردار اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب اسے ضروریات زندگی بآسانی میسر ہوں۔ دوسروں کے مال سے اجتناب بھی اسی حالت میں پیدا ہو سکتا ہے۔ جب اس کو جائز طریقوں سے ضروریات زندگی کے حصول کی ضمانت دی جائے۔ بہت سے جرائم جو ضروریاتِ زندگی کے میسر نہ ہونے کی وجہ سے سرزد ہوتے ہیں، کم ہو جائیں گے بہت سی اخلاقی خرابیاں مثلاً رشوت، بدچلنی، کبر و غرور جو بے انتہا دولت ہاتھ میں آجانے سے پیدا ہوتی ہیں وہ بھی کم ہو جائیں گی۔ سیاست صرف دولت ہی کی غلام ہو کر نہ رہے گی جیسا کہ اب سیاست دولت کی غلام ہے۔ دولتمند اشخاص رشوت دے کر سیاسی اقتدار حاصل کرتے ہیں۔ اور پھر حصول اقتدار کے بعد اس اقتدار کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ انسانی قدریں اسی وقت بلند ہوں گی جس وقت اقتدار صرف دیانتدار اور قابل لوگوں کے ہاتھ میں رہے گا۔ جو اقتدار کو ملک کی بہتری اور لوگوں کی بہبود کے لیے استعمال کریں گے۔

اگر اسلامی ممالک میں جہاں سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی حالات کیمونزم کے لیے زرخیز زمین پیدا کرتے ہیں۔ اس قسم کی اصلاحات کے ذریعہ کیمونزم کی مدافعت نہ کی گئی تو کیمونزم یقیناً وہاں آکر رہے گا۔ اور اگر کیمونزم وہاں آیا تو یقیناً ایک بہت بڑی تباہی اور انقلاب آئے گا۔ اور اسلامی ممالک بہت عرصہ تک نہایت پسماندہ حالات میں مبتلا رہیں گے۔ قتل و غارت بہت عرصہ تک برپا رہے گی۔ اسلام پر بھی کاری ضرب پڑے گی۔ اور اگر اس قسم کی سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی تبدیلیاں عمل میں لائی گئیں جن کا ذکر آچکا ہے تو اس تباہی و بربادی کا سامنا نہ کرنا پڑے گا۔

بہت سی سمجھدار قوموں نے اپنا سیاسی اور اقتصادی ماضی بدل دیا ہے۔ باقی آہستہ آہستہ مذکورہ بالا قسم کی اصلاحات اپنے ملکوں میں رائج کر رہی ہیں۔ اگر اسلامی ممالک زمانے کی رفتار اور حالات سے سبق نہ لیں۔ اور معاشرے کی اصلاح نہ کریں تو ان کو اسلام سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ مذہب ہی صرف کیمونزم کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ یہ درست ہے کہ کیمونزم مذہب پر ایک ضرب کاری ہے۔ اور جو لوگ مذہب کے فریفتہ اور عاشق ہیں۔ وہ کیمونزم کو اپنانے میں تامل کریں گے۔ مگر کیمونزم ایک اقتصادی نظام ہے۔ جو مذہب کے ساتھ بھی چلایا جا سکتا ہے۔ اس کا تجربہ روس میں ہو رہا ہے۔ جہاں بہت صوبوں میں کیمونزم کے باوجود مذہب بھی قائم ہے۔ اگر مجوزہ اصلاحات پر عمل کیا جائے۔ تو مذہب بھی قائم رہ سکتا ہے۔ اور سیاسی اور اقتصادی نظام میں مجوزہ اصلاحات کے ذریعہ ایسا نظام پیدا کیا جا سکتا ہے۔ جس کے مقابلے میں کیمونزم نہیں ٹھہر سکتا۔

اگر عالم اسلام ان اصلاحوں کی طرف قدم نہ اٹھائے تو اقتصادی و معاشرتی اصلاحیں جو دنیا کے اور ملکوں میں رائج کی جا رہی ہیں۔ اسلامی ملکوں پر ضرور اثر انداز ہوں گی۔ اور وہاں انقلاب کا جذبہ اس قدر مضبوط ہو گا کہ مذہب اس کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔ اسلام اس کا مقابلہ اسی وقت کر سکتا ہے۔ جب اسلامی حکومتیں اس قسم کی اصلاحات اسلامی ممالک میں رائج کر لیں۔ اور یہ اصلاحات عین اسلام کے نظام کے مطابق ہیں۔ ان کی بنیاد اسلامی اصول اخوت اور مساوات میں ہے۔ اس قسم کی اصلاحات کی نظیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانہ میں اور خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے دور میں پائی جاتی ہے۔ مسلمانوں کو وہیں لوٹنا پڑے گا

تیسرا راستہ

اسلام کا میزانی نظریۂ معیشت

- موجودہ اقتصادی بگاڑ
- فکری اور نفسیاتی بحران
- طوفانی انقلابوں کے خواص
- ہمارا مطلوبہ انقلابی فارمولا
- تیسرا راستہ
- اسلام بمقابلہ مادہ پرستی
- اسلام کا استعمال، اسلام کے خلاف
- ایک جامع نظام توازن
- غیر معمولی حالات کے لئے اسلامی حل
- اسلام کی میزانی حکمت معیشت کی اصولی بنیادیں
- اقتصادیات میں حکومت کی مداخلت کا مسئلہ
- غیر معمولی حالات کے لئے عملی تدابیر
  اصول محاسبہ، اصول تلافی، اصول تحدید، اصول ازالہ اکراہ،
  اصول حجر، اصول وقف، اصول کفالت عامہ،
- اصلاح و تغییر کا نقشۂ کار
- نوجوانوں کی ذمہ داریاں

نعیم صدیقی

تیسرا راستہ

نعیم صدیقی

اسلام کا میزانی نظریہ معیشت

موجودہ اقتصادی گرداب سے واحد راہ نجات

۱۹۴۸ء کی بات ہے کہ اسلام کے اقتصادی نظام کا جو کچھ مطالعہ میں نے کیا تھا اس کی روشنی میں سرمایہ داری، اشتراکیت اور اسلام کے تقابلی مطالعہ پر مشتمل ایک تقریر تیار کی جسے بعد میں ایک مقالہ کی صورت دے کر "معاشی ناہمواریوں کا اسلامی حل" کے نام سے کتابی شکل میں لایا گیا۔

اُس وقت پیشِ نظر یہ تھا کہ ہمارے ہاں دستور کی اسلامی بنیادیں معین ہونے کے ساتھ ساتھ کرنے کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ شروع ہی سے اقتصادی نظام کی تشکیل اسلامی اصولوں پر کی جائے اور تعمیر کے آگے بڑھنے سے پہلے نقشۂ کار کو بدل دیا جائے۔ اگر ایسا ہو جاتا اور ہم سرمایہ دارانہ نظام کے مغربی تجربے سے عبرت اندوز ہو کر اسلامی نظامِ عدل کو اختیار کر لیتے تو آج وہ پیچیدہ صورتِ حالات نمودار نہ ہوتی جسے میں نے "اقتصادی گرداب" کا نام دیا ہے۔ آج ہماری کشتی اس گرداب میں ڈبکیاں کھا رہی ہے اور ابھی تک راہ نجات نہیں نکلی۔ جو تبدیلی اس وقت آسان تھی اب وہ کئی گنا زیادہ مشکل ہو گئی ہے۔

بہرحال ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے کہ اب ہمارے ہاں کے اقتصادی حالات "معمول" کے دائرے سے نکل کر غیر معمولی پیچیدگیوں کے دائرے میں داخل ہو چکے ہیں۔ اسی وجہ سے پورے مسئلے کو نئے انداز سے لینا ضروری ہو گیا ہے۔ یا یوں کہیے کہ اس کے لیے نئی اجتہادی فکر سے مؤثر تدابیرِ اصلاح و تغیر کے اختیار کیے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ مرض اپنی ہلکی ابتدا سے آگے بڑھ کر مزمن بیماری کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ پس اصولِ علاج کو برقرار رکھتے ہوئے نسخہ از سرِ نو تجویز کیا جانا چاہیے۔ میرے مطالعہ کے مطابق مرض کی بحرانی اور مزمن حالت کے لیے بھی اسلام اپنی بیاضِ مسیحائی میں اسی طرح تیز بہدف نسخے رکھتا ہے جیسے بیماری کے معمولی اور ابتدائی مدارج کے لیے۔ پس بنیادی ایمان و فکر کے لحاظ سے میں کتاب و سنت کے اسی اصولی موقف پر کھڑا ہوں جس پر "معاشی ناہمواریوں کا اسلامی حل" لکھتے ہوئے کھڑا تھا۔ اس کتاب میں جو خطوطِ فکر و عمل اقتصادی تعمیر کے لیے دیے گئے تھے وہ بدستور اپنی جگہ قائم ہیں۔

(باقی ص)

موجودہ اقتصادی بگاڑ

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ہم جس اقتصادی نظام سے دوچار ہیں وہ یورپ کی کلاسیکل سرمایہ داری سے زیادہ غیر عادلانہ اور تیز رفتار ترین ارتکازی نظام ہے جس کی غلط ساخت نے ملکی ترقی کے برگ و بار چند افراد کی جھولیوں میں ڈال کر عوام الناس کو محرومی کا شکار بنا دیا ہے۔ "امیر کا امیر تر، اور غریب کا غریب تر ہوتے چلے جانا" اب ایک ایسی زبان زدِ عام بات ہے کہ جس کی وضاحت غیر ضروری معلوم ہوتی ہے۔ کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ آمدنیوں کا تفاوت اس تیزی سے بڑھا ہے کہ بعض صورتوں میں یہ نسبت ۱:۱۰۰۰ تک جا پہنچی ہے۔ درمیانہ طبقہ تفاوت کی اس چکی میں پس کر رہ گیا ہے۔ اور ہم بحیثیت ایک اسلامی معاشرہ کے موجودہ اقتصادی نظام کی وجہ سے ہم خوفناک حد تک روحانی و اخلاقی قدروں کی تباہی سے دوچار ہیں۔ امراء کو کثرتِ دولت نے عیش و تنعم سے بڑھ کر فسق و فجور میں مبتلا کر دیا ہے، غرباء روٹی کپڑے کے لیے سرگرداں ہیں اور مٹتے ہوئے درمیانہ طبقے کے لوگ جو معاشرے میں اچھے مقاصد و روایات کے پاسبان اور علمبردار ہوتے ہیں، وہ اپنے آپ کو ڈوبنے سے بچانے کے لیے اس بری طرح ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں کہ وہ زندگی کے اعلیٰ تر عنوانات پر سوچنے کا کوئی موقع پا ہی نہیں سکتے۔ یہاں تو ایک دوڑ لگی ہے، سب سے آگے اربابِ مال و جاہ کا چھوٹا سا جتھا ہے جو طیاروں اور کاروں میں سوار ہے پیچھے جو اس باختہ درمیانی طبقہ کے لوگ ہیں جو سکوٹروں اور سائیکلوں پر لپکے جا رہے ہیں اور ان کے پیچھے کروڑوں غریبوں کے انبوہ ہیں جو پاپیادہ بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ اس دوڑ کے شرکا ہانپ رہے ہیں، گر رہے ہیں، زخمی ہو رہے ہیں، دم توڑ رہے ہیں، ایک دوسرے کو روند رہے ہیں، اور اقدار و روایات کے بوجھ اتار اتار کر پھینک رہے ہیں۔ ایک افراتفری اور نفسا نفسی کا عالم ہے کسی کو سر پیر کا ہوش نہیں ؎

کس ندانست کہ منزل گہِ محبوب کجاست

این قدر ہست کہ بانگِ جرسے می آید

بڑی مشکل یہ آن پڑی ہے کہ مسابقت کی سڑک سب کے لیے یکساں کھلی سڑک نہیں ہے، جو جتنے اچھے حالات پا گیا اس کے لیے اتنا ہی اچھا، صاف اور کشادہ راستہ ہے، اور جو جتنے کمزور حالات رکھتا ہے اس کے حصے میں اتنا ہی خراب، ناہموار اور تنگ راستہ ہے۔ یہاں کی فضا جمہوریت کی فضا نہیں، جہاں غیر مساوی ذرائع کے باوجود، مساویانہ مسابقت کا موقع موجود ہو۔ کمزور عناصر منظم اور مجتمع نہیں ہو سکتے، حصولِ انصاف کے لیے سرگرمی سے کام نہیں کر سکتے، اپنے مطالبوں میں زور پیدا نہیں کر سکتے اور مفاد یافتہ طبقوں پر دباؤ نہیں ڈال سکتے۔

اس طرح یہ بند مندسی فضا اور یہ تنگ کے تنگ سے راستے موجودہ اقتصادی ناہمواریوں کے لیے ذریعہ تحفظ بن گئے ہیں۔ ہمارے یہاں کی ہیئتِ سیاسیہ، ہمارا قانون، ہماری پالیسیاں، ہمارے کارپردازوں اور افسروں کے اختیارات، سیاسی سرگرمیوں پر پابندیاں، اختلاف و تنقید کے راستے کی رکاوٹیں، یہ ساری چیزیں مل کر ایک ایسی فصیل بن گئی ہے جس کے حصار میں اقتصادی ناانصافی پناہ گزین بن کر اطمینان سے پھل پھول رہی ہے۔ شور و شرابا سارا، اس فصیل کے باہر ہی باہر ہے، اندر جو کام جس طرح ہو رہا ہے، امن چین سے ہو رہا ہے۔ کبھی کبھی دولت و جاہ کے اس قلعے کے قلعدار فصیل کی برجیوں سے جلوہ فرما ہو کر باہر تڑپتی سسکتی ہوئی قوم کو دلاسا دے جاتے ہیں کہ اندر جو کچھ ہو رہا ہے یہ سب کچھ تمہارے ہی لیے ہے اور ان ساری کمائیوں کے حاصل آہستہ آہستہ تمہاری جھولیوں تک بھی جا پہنچیں گے۔ بدقسمتی سے یہ دلاسا پریشان حال عوام کو اور زیادہ پریشان کر دیتے ہیں۔

فکری و نفسیاتی بحران

یہی پیچیدہ کیفیت ہے جو ایک گرداب کی مانند ہے، اور اس میں ہم سب غوطے کھا رہے ہیں اور بظاہر کوئی راہِ نجات نظر نہیں آتی۔

اس قسم کے گردابی حالات جب کسی بھی معاشرے میں پیدا ہوتے ہیں تو فرد فرد میں غیر شعوری طور پر ایک اضطراب نشوونما پانے لگتا ہے ایک مایوسی، ایک بحران، ایک فکری انتشار اور اس کے ساتھ ذہنی عدم توازن، انتہاپسندی اور استعجال۔ اس طرح آدمی دوہرے گردابوں میں پھنس جاتا ہے۔ ایک تو خارجی حالات کا گرداب، دوسرا ذہنی کیفیات کا گرداب۔ اور یہ دوسرا گرداب آدمی کی ان ذہنی کوششوں کو شل کر دیتا ہے جو کسی بھی خارجی گرداب سے نجات کی راہ نکالنے کا ذریعہ بنتی ہیں۔

بحران و اضطراب کی حالت میں جب سر چکرانے لگتا ہے تو انسان کبھی متوازن حل نہیں سوچ سکتا۔ بلکہ اس کے طرز فکر میں ایک تو انتہاپسندی پیدا ہو جاتی ہے، اور وہ انتہاپسندوں کے پرجوش نعروں اور انقلابی ہنگاموں کی طرف لپکتا ہے۔ مگر وہ ان دلفریب پکاروں میں سے کسی کا تجزیہ نہیں کر سکتا کہ یہ پکار کہاں سے شروع ہوئی، یہ کدھر کو لے جائے گی اور اس سے کب کیا نتائج نکلیں گے اور ان نتائج کی کیا قیمت معاشرے کو ——— بلکہ خود اس شخص کو دینی ہوگی؟

بحران و اضطراب کے حالات میں دوسری ذہنی بیماری ذوق استعجال کی پیدا ہو جاتی ہے (وكان الانسان عجولا)۔ وہ جس مصیبت کے جال میں قدرت کے قانون تدریج کے تحت برسوں میں جا کر پھنستا ہے، اور وقت کی قوتیں مکڑی کی طرح آہستہ آہستہ ایک ایک باریک تار کا حلقہ غیر محسوس طور پر اس کے گرد کستی رہتی ہیں، جب وہ اپنے آپ کو تاب جنبش سے محروم پا کر اس جال کی خوفناکی کا اندازہ کرتا ہے تو پھر چاہتا ہے کہ کسی طرح بس ایک ہی جنبش میں وہ اس سے نکل کر پرواز کرے اور اختیار و اطمینان کی جنت میں جا داخل ہو۔ بات کچھ ویسی سمجھئے جیسے دق، سل یا سرطان کے مریض کی ہوتی ہے۔ مریض اس حقیقت پر تو اچھی طرح دھیان نہیں دے سکتا کہ بیماری نے کتنی لمبی تدریج سے اس کی قوتوں پر فتح پا کر رگ و پے میں سرایت کیا ہے۔ وہ معالج کے پاس اس طفلانہ ہوس کے ساتھ جاتا ہے کہ بس وہ ایک ٹیکہ لگا دے یا کشتہ کی چند پڑیاں دے اور مرض ہوا ہو جائے۔ اور بسا اوقات اپنے اس ذوق استعجال کی وجہ سے وہ نجومیوں اور رمالوں اور جادو ٹونے والوں کی طرف رجوع کر کے ایک نئی مصیبت میں پھنس جاتا ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ جس طرح بیماری تدریج سے آئی تھی اسی طرح اسے دور کرنے کے لیے فطری علاج بھی تدریج (اگرچہ اسے کسی قدر تیز رفتار بنایا جا سکتا ہے) ہی سے ہوگا۔ ٹھیک اسی طرح معاشرے کا بگاڑ ——— وہ سیاسی ہو، اخلاقی و معاشرتی ہو، یا اقتصادی ——— ایک لمبے سلسلۂ احوال کا نتیجہ ہوتا ہے اور اسے کوئی ایک نعرہ لگا کر اور کوئی ایک ہنگامہ اٹھا کر دور نہیں کیا جا سکتا۔

اضطراب ہی کے حالات میں لوگ انقلاب کی راہیں سوچتے ہیں۔ مگر خود انقلاب کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ٹھنڈے دل سے سوچا سمجھا شعوری اور تدریجی انقلاب، دوسرا طوفانی اور ہنگامہ خیز انقلاب۔ اضطراب زدہ معاشرے میں انسان کی استعجال پسند طبیعت طوفانی انقلاب کی طرف بآسانی مائل کی جا سکتی ہے۔ اور اس کی نفسیاتی کیفیت کے رمز آشنا جادوگر چاروں طرف راستہ گھیر کے بیٹھے ہوتے ہیں اور ان کے درمیان سے گزرنے والا پریشان ذہن مسافر بآسانی شکار ہو جاتا ہے۔ ہنگامہ خیز طوفانی اور فوری انقلاب کا تصور ایک اضطراب زدہ ذہن کے لیے ویسا ہی سرور بخش ہوتا ہے جیسا کہ ایک جام شراب۔

طوفانی انقلابوں کے خواص

آگے چلنے سے پہلے ہنگامہ خیز طوفانی اور فوری انقلاب کی مضرتوں کو پیش نظر رکھ لینا ہمارے لیے مفید ہوگا۔

اول یہ کہ ایسے عاجلانہ انقلاب کے لیے سرے سے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ انسانوں کے ذہنوں کو اندر سے تبدیل کرے اور آئندہ آنے والے دور کے لیے محکم کردار کی تعمیر کرے۔ تبدیل شدہ متوازن ذہنوں کے بغیر انسانیت کو سنوارنے والا کوئی نظام وجود میں نہیں آ سکتا۔

دوم یہ کہ ہنگامہ خیز عاجلانہ انقلاب کا اصلی زور منفی جانب ہوتا ہے اس لیے تخریبی عمل کے بعد کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کیا شکل اختیار کرے، اس کے اندر سے کیسی قیادت اُبھرے اور جو مقاصد پیشِ نظر تھے ان کے حاصل کرنے کے لیے کامیاب راستے نکلیں یا نہ نکلیں۔ اس لحاظ سے یہ ایک طرح کا جوا ہوتا ہے جس کا نتیجہ پیشگی کچھ معلوم نہیں ہو سکتا کہ داؤ کس کی طرف جائے گا۔

سوم یہ کہ عاجلانہ انقلاب کی روح چونکہ انتہاپسندی ہوتی ہے اس لیے وہ ایک پہاڑی نالے کی طرح جب بہتا ہے تو بے شمار قیمتی چیزوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے، وہ چٹانیں ہوں یا الماس پارے، وہ پتھر کا کوئلہ ہو یا سونے چاندی کے اجزا، وہ ببول کے درخت ہوں یا گلاب کی جھاڑیاں، وہ زعفران کے تیار کھیت ہوں یا سیبوں کے باغات، طوفانی انقلاب کا ریلا ایک بار سب کچھ بہا لے جائے گا۔ اور جب یہ ایک بار شروع ہو جاتا ہے تو پھر اس کی تمنائیں کرنے والے بھی بسا اوقات کفِ افسوس ملتے رہ جاتے ہیں گر وہ سیلاب برسوں تک تباہی مچاتے سے پہلے رکتا نہیں، بلکہ الٹا وہ اپنے بے شمار تمنائیوں کو بھی اپنی موجوں کے کفن میں لپیٹ کر ساتھ لے جاتا ہے۔ ایسے انقلابوں کے بہت سے علمبردار اور شیدائی اپنی زود پشیمانیوں کا ریکارڈ تاریخ میں پیش کر چکے ہیں۔ ایسے انقلابوں کو انضباط میں رکھنا ناممکن ہے۔

چہارم یہ کہ ایسے انقلاب چونکہ تیز رفتاری سے جلد جلد سب کچھ کر دینا چاہتے ہیں، موزوں فضا تیار کیے بغیر بڑے بڑے سنگین اقدام کر گذرتے ہیں، قوت کے نشے میں لوگوں کی ذہنی ہم آہنگی کے حصول کا اہتمام کرنے سے بے نیاز واقع ہوتے ہیں اس لیے ان کے خلاف شدید جذباتی ردِ عمل بھی پیدا ہوتا ہے اور جا بجا مزاحمت بھی ہونے لگتی ہے۔ اس ردِ عمل اور مزاحمت کو طوفانی انقلابات ہمیشہ جبر و تشدد سے کچلنے کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ قتل و غارت اور توڑ پھوڑ کا سلسلہ بہت بڑے پیمانے پر جاری رہتا ہے، نتیجہ یہ کہ ایک معاشرہ کی اپنی ہی بے شمار قوتیں جو کسی تدریجی انقلاب کے ساتھ آہستہ آہستہ ہم آہنگ ہو سکتی تھیں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں اور گویا معاشرہ اپنے ہی ایک حصے کو ضائع کر دیتا ہے۔ طوفانی انقلاب مزاحم قوتوں کے لیے چونکہ رواداری نہیں رکھتے، اس لیے ان کی اصلاح کرنے سے بھی عاجز ہوتے ہیں۔ اسی لیے وہ اختلاف کرنے والوں کی اصلاح کی سعی کرنے کے بجائے ان کو ختم کر دینے کا سہل مگر مہنگا نسخہ استعمال کرتے ہیں۔

میرے نزدیک ایسے انقلابوں کو تمثیل کی زبان میں ایک ایسے مرگی یا جنون کے دورے سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو فرد کے بجائے پورے معاشرے پر طاری ہو جاتا ہے اور ایسے تباہ کن اجتماعی دورے کے دور رس اثراتِ بد عوام کو برسوں پریشان رکھتے ہیں

پنجم یہ کہ جب کسی عاجلانہ انقلاب کے قائدین ایک مرتبہ جبریت کے ہتھیار سنبھال لیتے ہیں تو پھر وہ پورے معاشرے کے مقابلے میں ناقابلِ تسخیر اور ناقابلِ تحدید قوت بن جاتے ہیں۔ پھر ان کو جبریت کے ہتھیاروں سے کبھی غیر مسلح نہیں کیا جا سکتا۔ جبر جبری طریقوں کو اختیار کرنے، تشدد برتنے، قتل و غارت کرنے اور عامۃ الناس کو بے بس بنا کر جانوروں کے گلے کی طرح ہانکنے سے ان کی اپنی بشری فطرت کی خوبیوں کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔ وہ کسی خوبصورت مقصد کے نام سے ایک بار شر و فساد کے قائد بننے کے بعد انسانی خیر و فلاح کے قائد کبھی بن ہی نہیں سکتے۔ وہ قوت کا مظہر تو ہوتے ہیں مگر اخلاقی شرف سے محروم۔ وہ مسندِ اقتدار تو بلند سے بلند حاصل کر لیتے ہیں مگر کردار کے لحاظ سے پستی و سفلگی کے گڑھوں میں ایسے گرتے ہیں کہ کبھی اٹھ نہیں سکتے۔

ششم یہ کہ طوفانی انقلابات اپنی زلزلہ فگن فطرت کی وجہ سے پورے کے پورے معاشرے کو ادھیڑ کر رکھ دیتے ہیں، اور پھر تمام کے تمام قبیلوں کی تعمیر تجربہ و خطا Trial and error کے اصول پر بعد از خرابی بسیار ہوتی ہے مگر اطمینان بخش مرحلے تک پہنچنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ کسی بستی کو نئے نقشے پر تعمیر کرنے کے لیے ایک ایک حصے کے لیے آہستہ آہستہ میٹیریل فراہم کر کے تبدیل کرنے کے بجائے آپ پوری بستی پر یکدم

انقلاب کا بُلڈوزر پھیر دیں، اور ساری آبادی کو کھلے میدان میں ڈال دیں اور پھر وہ بستی کی تعمیرِ نو کے لیے کام کی تکمیل تک موسم کی ناسازگاریوں کا مقابلہ سقف و دیوار سے محروم ہو کر کریں۔ پھر اگر یہ تبدیلی بھی ایسی تبدیلی ہو کہ ماضی کے سرے سے کوئی آثار ہی باقی نہ رہیں، لوگوں کا وہ ذہنی تسلسل ہی ٹوٹ جائے جو طویل وقت گذرنے سے ایک ماحول میں رہتے ہوئے ان کے اندر پیدا ہوا اور جس نے ان کو ان کے آباؤ اجداد اور واقعاتِ گذشتہ سے جوڑ رکھا ہے، تو ان بچاروں کا حال تو ایسا ہو گا جیسے وہ مہاجر بنا دیئے گئے ہوں۔

اگر کسی سوسائٹی کو یکسر ادھیڑ ڈالا جائے اور اس کی تمام اعتقادی اور روحانی بنیادیں (اچھی بری کی تمیز کے بغیر) تباہ کر دی جائیں تو انہیں اٹھا کے معاشرے کے ایک نئے اور انوکھے نقشے میں ڈال دینا ایسا ہی ہے جیسے آدم علیہ السلام کو باغِ عدن سے اتار کر زمین پر ڈال دیا گیا تھا۔

ہفتم یہ کہ اس نوع کے ہنگامہ خیز انقلابات سے بالعموم لوگوں کا یہ توقع باندھنا کہ یہ ان کو بہت جلد نتائج زریں سے مالا مال کر دیں گے، یہ ان کو ظلم و استحصال کی دنیا میں پیش آمدہ تنگ حالی سے نکال کر آناً فاناً خوشحالی کی حیثیت میں پہنچا دیں گے، وقت گذرنے پر یہ امید مایوسی میں بدل جاتی ہے کیونکہ آج تک کی تاریخ میں کوئی ایسی عملی مثال موجود نہیں ہے کہ کسی انسانی نظامِ فکر کے برپا شدہ انقلاب نے بیس پچیس برس سے پہلے کوئی مؤثر و محسوس نتائج ایسے دیئے ہوں جو عوام تک خوشحالی کے اثرات پہنچا دیں۔ بخلاف اس کے ایسے انقلابات کے لیڈروں کو کئی برس تو مزاحمتوں کا مقابلہ کرنے میں لگتے ہیں، پھر ایک مدت ان زخموں کے اندمال میں صرف ہوتی ہے جو تصادم کی وجہ سے پورے معاشرے کو ——— اور اس کے ضمن میں خود اقتصادی نظام کو ——— لگتے ہیں، پھر جو تعمیر تو شروع ہوتی ہے تو وہ قدم قدم پر سرمایہ مانگتی ہے جسے عوام کی ان قربانیوں سے پورا کیا جاتا ہے جو نظامِ جبر اُن سے جبراً حاصل کرتا ہے۔ مدتوں امساکِ رسد، خوراک کی قلت، تنخواہوں اور اجرتوں کی محدودیت، چیزوں کی گرانی و نایابی، مکانوں کی کمی اور اسی طرح کی دوسری مشکلات نادیر انہی عوام کے سر مسلط رہتی ہیں، جنہوں نے ایک وقت میں بڑے چاؤ سے اس انقلاب کو برپا کرنا چاہا تھا۔

میرا ناقص مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ اگر صحیح نظریہ و اصول پر مبنی اور ممکن حد تک تیز رفتار تدریجی انقلاب برپا کیا جائے تو وہ طوفانی انقلاب سے زیادہ بہتر نتائج اس کے مقابلے میں کم مدت کے اندر دے سکتا ہے اور آج بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً آپ روس جیسے بڑے ملک کے ۵۰ برس بھی لے لیجیے اور مقابلے میں جاپان جیسے چھوٹے سے جزیرے کے ۵۰ برس بھی لے لیجیے ——— یا آپ چین کی ترقی کی رفتار بھی دیکھ لیجیے اور اس کے مقابلے میں سویڈن اور مغربی جرمنی وغیرہ کے حالات کا موازنہ بھی کر لیجیے ——— اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی موازنہ میں پیشِ نظر رکھیے کہ کس ملک کے عوام کا معیارِ خوراک و رہائش یا مزدوروں کی شرحِ اجرت (اشیاء کی قیمتوں کے تناسب سے) کس درجے کی ہے؟

آج روس جس نے وسیع علاقوں کے علاوہ یورپ کے چند ترقی یافتہ ملکوں کی پیداواروں سے نوآبادیاتی طرز کا فائدہ اٹھانے کے باوجود دیکھتے دیکھتے معاشی میدان میں مغربی ممالک سے پیچھے رہ گیا ہے، حالانکہ چند سال پیشتر پروپیگنڈے کے اسکرین پر یہ دکھائی دیتا تھا کہ روس امریکہ کی ٹکر کی قوت بن چکا ہے اور مزید دو چار سال میں وہ آگے بڑھ جائے گا۔ لیکن اب تازہ ترین کتابوں میں دونوں ملکوں کی مختلف زرعی و صنعتی پیداواروں کا جو تفصیلی تقابل سامنے آیا ہے، وہ حقیقت کو بالکل آئینہ بنا کے سامنے رکھ دیتا ہے۔

ہشتم یہ کہ تاریخ کے تمام طبقاتی انقلابات کا اگر آپ مطالعہ کریں جو (غیر الٰہی) انسانی فلسفوں پر اٹھائے گئے تو بلا استثنیٰ یہ امرِ واقعہ سامنے آئے گا کہ ہنگامہ خیز تبدیلیوں کے نتیجے میں کئی برس کی محنتوں کے بعد انسان کو زندگی کے کسی ایک گوشے میں اگر کچھ خیر و فلاح حاصل ہوئی ہے تو دوسرے گوشوں میں اس سے کہیں زیادہ مشکلات اور ناانصافیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ایک جانب سے اگر ظلم سے بچاؤ ہوا ہے تو دوسری جانب سے ظلم کے نئے مارِ سیاہ نے سر اٹھا لیا ہے۔

ان آٹھ نکات پر ان تمام لوگوں کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے جو ہمارے درمیان بیٹھے للچائی ہوئی بلکہ مرعوب نگاہوں سے دنیا کے مارکسی انقلابات کو دیکھتے ہیں اور اپنے ذہنی اضطراب کی وجہ سے لاشعوری طور پر انتہا پسندانہ انداز فکر اختیار کرکے بڑے عاجلانہ نتائج چاہتے ہیں۔ میری نگاہ میں یہ باتیں بچوں کی سی باتیں ہیں ——— اور بدقسمتی یہ ہے کہ انسان نے بالعموم بچوں ہی کی طرح سوچا ہے اور بار بار اسی وجہ سے تباہی مول لی ہے

ہمارا مطلوبہ انقلابی فارمولا

صحیح راستہ یہ ہے کہ ہم ایک ایسے انقلاب کا نقشہ تجویز کریں جو پورے معاشرے کو توڑ پھینکنے کے بجائے تیز رفتار تدریج کے ساتھ ہمارے اقتصادی (مع سیاسی و معاشرتی) مسئلے کو عملاً حل کر دکھائے۔ یہ انقلاب لانا ہمارے اپنے نظریہ حیات پر اور اپنے اصولوں پر مبنی ہونا چاہیے اس کے لیے جو بھی فارمولا ہم مرتب کریں وہ ہمارے اپنے ملی تقاضوں کے مطابق ہونا چاہیے۔ ہماری اپنی تاریخی روایات سے ہم آہنگ ہونا چاہیے، اور پھر جو سلوگن اس سلسلے میں ہمیں وضع کرنا پڑیں وہ بھی ہمارے اپنا نہ ہی نقطۂ نظر کی نمائندگی کرنے والے ہونے چاہئیں۔

اسلام کی میزانی حکمت اقتصادیات کے تحت ہمارا اقتصادی فارمولا وہ ہو سکتا ہے جو:-

۱۔ دولت کے موجودہ ارتکاز کو توڑ کر ہمارے عوام کو جلد سے جلد ضروریات زندگی بہم پہنچانے کا ضامن بنے اور رفتار ترقی کو مناسب حد تک بڑھانے میں کامیاب ہو۔

۲۔ جو عوام کو آزادی کی بھاری قیمت کے عوض روٹی نہ دے، بلکہ ان کو پوری کی پوری آزادی (اسلام کے عطا کردہ وسیع اور غیر متبدل اور غیر منفک حقوق کے مطابق) سے مالا مال رکھ کر ان کو ان کا اقتصادی حق دلوائے اور معاشی و سیاسی زندگی میں اپنا حصہ ادا کر سکیں۔

۳۔ جو روٹی کے مسئلے کو ایسا غالب و برتر اور مرکزی مسئلہ نہ بنا دے کہ معاشرہ کی ساری توجہات صرف اس پر مرکوز ہو جائیں اور زندگی کے دوسرے تقاضے ——— خصوصاً اس کے اخلاقی مقاصد ——— نظر انداز ہو کر تباہ ہو جائیں۔ یا یہ کہ ان کی جو تباہی اب تک ہوئی، مزید تغافل سے رہی سہی کسر نہ پوری ہو جائے۔

گویا ہماری ضرورت محض "روٹی" نہیں ہے، یا ہمارا مسئلہ محض اقتصادی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ ہمارا اقتصادی مسئلہ بھی ہمارا مسئلہ ہے، آزادی کا مسئلہ بھی ہمارا مسئلہ ہے، اور دین و اخلاق کا مسئلہ بھی ہمارا مسئلہ ہے۔ اور ان تینوں بڑے مسائل کو جن کے ساتھ مزید مسائل بھی وابستہ ہیں، ایک جگہ جمع کرکے ہمیں اپنا انقلابی فارمولا تیار کرنا ہے جو ساری زندگی کو توازن سے سنوارنے کا ذریعہ ہو اور ایسا فارمولا نہ امریکہ و برطانیہ سے مل سکتا ہے، نہ روس و چین سے!! نہ ہم اس کے لیے سرمایہ داری سے رہنمائی لے سکتے ہیں نہ سوشلزم کی مریدی کر سکتے ہیں۔ ہمیں تو اپنی ہی خودی کو بیدار کرنا اور اپنے ہی دماغ سے سوچنا ہوگا اور اپنے ہی ایمان سے روشنی لینی ہوگی۔

میرا سوچنے کا راستہ تو ہر حال اسلام کا روشن راستہ ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اسلام کو نہ مانتا ہو تو بھی میں اس سے کہوں گا کہ اوپر کے تین اجزا پر مشتمل وہ کوئی انقلابی فارمولا تجویز کر دے جس میں زندگی کے تینوں تقاضوں میں سے کسی کو ضرر نہ پہنچے اور اقتصادی مسئلہ بھی حل ہو جائے۔ مجھے یقین ہے کہ اب کوئی راستہ اسلام کے سوا کہیں نہ ملے گا۔

تیسرا راستہ

اب تک کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمیں دنیا کے دو بڑے مروج راستوں کو مسترد کرکے ایک تیسرا معتدل و متوازن راستہ نکالنا ہے جو نہ صرف ہماری زندگیوں کو سنوار دے اور مسائل کو حل کر دے بلکہ آگے چل کر وہ ساری دنیا کا مرکز توجہ

آخر ہم دوسروں کے پیچھے ٹامک ٹوئیاں مارنے کی عادتِ بد ترک کر کے کیوں یہ مرتبہ حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں کہ ہمارے نظریات اور ہمارا کیا ہوا کام دوسروں کے لیے سامانِ رہ نمائی بنے۔ اسلام سے وابستہ رہ کر جینے کی راہ صرف یہی ہے۔

اسلام بہ مقابلہ مادہ پرستی

اور یہ کے مجوزہ فارمولے کے اجزائے سہ گانہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں جب یہ کہتا ہوں کہ موجودہ غیر عادلانہ اشتراکی معیشت، سوشلزم کی مرعوبیت اور "اسلامی سوشلزم" کے نعروں سے جو پیچیدہ ذہنی گرداب پیدا ہو گیا ہے، اس سے راہِ نجات صرف اسلام ہی کھول سکتا ہے تو یہ بات میں محض موروثی عقیدے کی بنا پر نہیں بلکہ شعوری ایمان کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔ میں نے اشتراکیت کے "سائنٹیفک مادی تصور" کے مقابلے میں رکھ کر اسلام کے "سائنٹیفک اخلاقی نظام" کو عقلی طور پر بھی جانچا ہے، اور میرے ایمان و عقل میں اس مطالعہ نے کامل ہم آہنگی پیدا کر دی ہے۔ اس مطالعہ نے تمام غیر الٰہی نظاموں کی بنیادی کمزوری سے آگاہ کر کے مجھے بڑے سے بڑے ترقی یافتہ نظام اور شاندار سے شاندار انقلابی تحریکوں کی مرعوبیت سے ہمیشہ کے لیے نکال لیا ہے۔

فی الحقیقت نظامِ سرمایہ داری اور نظامِ اشتراکیت (کمیونزم یا سوشلزم) ایک ہی تصورِ حیات کی جڑ سے پھوٹنے والے ایک ہی درختِ تہذیب کی دو شاخیں ہیں۔ دونوں ایک ہی ماں کی اولاد ہیں جس کا نام مادیت Materialism ہے۔ دونوں کا فکری اور ثقافتی پس منظر ایک ہے۔ اشتراکیت ایک لحاظ سے سرمایہ داری کا ردِّ عمل ہے اور دوسرے لحاظ سے اسی مادی تصورِ حیات کی تکمیلی شکل ہے جو سرمایہ داری کی روح رواں تھا۔ ایک طرف جو فتنہ انفرادیت کے دائرے میں نمودار ہوا تھا اسی نے دوسری طرف جا کر اپنے آپ کو اجتماعیت کی سطح تک پہنچا دیا یعنی فی الحقیقت ایک ہی تہذیب نے اپنے مخفی تضاد کو ابھار کر دو متصادم نظاموں میں متشکل کر دیا ہے۔ اب یہ دونوں نظام اپنے داخلی ماحول میں بھی، اور اپنے باہمی تصادم کی وجہ سے پورے عالمی ماحول میں بھی وجہِ فساد بن گئے ہیں۔ اقبال نے بہت پہلے سچ ہی کہا تھا کہ ؎

ہر دو را جاں ناصبور و ناشکیب

ہر دو یزداں ناشناس آدم فریب[1]

اور اب ان کے تصادم اور ان کے تعاون سے جو دنیا ہمارے چاروں طرف بن گئی ہے، وہ تشدد، سازشوں، خون ریزیوں، خوف اور دہشت سے بھر گئی ہے۔ انسانیت کو جو خانہ خرابی آج اس روشن دور میں درپیش ہے، وہ شاید اتنے بڑے پیمانے پر تاریخ کے کسی تاریک ترین دورِ وحشت میں بھی موجود نہ تھی۔ اب زندگی کے دونوں معروف و مروّج راستوں ـــــ خم دار، خاردار اور پر آزار راستوں ـــــ نے سوچنے سمجھنے والوں کو بری طرح مایوس کر دیا ہے۔ اب صرف "حشیشی" دانش ور اور ان کے مرید یعنی سیاسی میدان میں اچھل کود کرنے والے سطح بین کارکن ہی کسی خوش گمانی میں مبتلا رہ گئے ہیں۔ سب سے ماشاء اللہ کرۂ ارض پر تعداد میں یہ عنصر خاصا زیادہ ہے۔ ہمارے ہاں تو ان رہبرانِ منزل ناشناس و جادہ ناآشنا کی بھرمار ہے۔ اسلام جیسے وسیع نظام کو تو یہ کیا جانیں گے۔ ان کو تو ابھی اپنی آنکھوں سے سامنے چلتے ہوئے اور پے در پے تلخ نتائج دیتے ہوئے نظاموں کا ضروری شعور بھی حاصل نہ ہو سکا۔

---

[1] اقبال کی بصیرت کی داد دیجیے کہ اس نے مغربی سرمایہ داری اور کمیونزم کی اساسی وحدت کو خوب سمجھا بلکہ کمیونزم کو سرمایہ داری کے تکمیلی نتیجے کے طور پر بہت پہلے پہچان لیا۔ لکھا ہے کہ "کمیونسٹ تجربہ جدید مغربی تمدن کے مذہب دشمن اور نتیجے کے طور پر مخالفِ روحانیت رجحانات کی ترقی و تکمیل کے سوا اور کوئی معنی نہیں رکھتا ..... ان کی اندرونی یکسانیت مستقبل میں واضح سے واضح تر ہوتی چلی جائے گی"۔

ہم اس پر مذاقِ حشیش خانے کو اپنے ہنگاموں میں مست چھوڑ کر اپنے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہیں۔ کہنا یہ تھا کہ آج انسانیت کے لیے سوائے اسلام — اسلامی تحریک یا اسلامی تہذیب یا اسلامی نظام — کے اور کوئی راہِ نجات نہیں ہے۔

پھر میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ہم جس پیچیدہ اقتصادی گرداب میں مبتلا ہیں، اس سے نجات دلانے کے لیے اسلام کا معاشی نظام (قسط یا عدلِ اجتماعی) ہر طرح سے کافی و وافی ہے اور میں مختصراً اپنے مضمون میں اسلام کے میزانی نظریۂ حیات اور میزانی نظریہ معیشت Islami Theory of Economic Harmony and Balance کے چند اصولوں کو بیان کر کے دکھاؤں گا کہ یہ اصول ہمارے آج کے مسائل کو کیسے کامیابی سے حل کر سکتے ہیں اور آج کی ضروریات کے مطابق نئے اداروں کی تشکیل اور نئے راستوں کی نشان دہی کر سکتے ہیں۔ یہ اصول ایسے ہیں کہ اگر ان کو صحیح فہم و شعور کے ساتھ استعمال کیا جائے تو نہ بعض منتخب آیات و احادیث کی اوٹ میں بقیہ سارے اوامر و نواہی کو چھپانے کی ضرورت ہے، نہ کسی حکم کا مفہوم بدلنے کے لیے تحریف و تاویل کا تباہ کن راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے، اور نہ کسی دوسرے نظامِ فکر و عمل سے کچھ بیگانہ مزاج کے اجزا لا کر اسلام میں بے جوڑ طریق سے نصب کرنے پڑتے ہیں۔ ان مضحکہ خیز حرکات میں سے کسی میں مبتلا ہوئے بغیر آپ حلِ مسائل کا بہترین راستہ نکال سکتے ہیں۔

اسلام کا استعمال اسلام کے خلاف

لیکن اس بحث کو چھیڑنے سے قبل مجھے ایک جملۂ معترضہ ضرور کہنا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اسلام کوئی منتر نہیں ہے کہ جس کی محض جاپ کرنے سے اقتصادی یا کسی دوسرے شعبے کے مسائل از خود حل ہوتے چلے جائیں۔ مسائل حل کرنے کے لیے تو اس کے اصول و مقاصد پر کامل ایمان رکھتے ہوئے ان کو دانشمندی اور معاملہ فہمی کے ساتھ عملاً اختیار اور نافذ کرنا پڑتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں نہ صرف شعبۂ اقتصادیات میں بلکہ تقریباً ساری زندگی میں مسلسل میں وہ رس سے اسلام کو بطورِ ایک منتر کے استعمال کیا جا رہا ہے۔ دستور سے لے کر تمام ادارِ حکومت کے اکابر کی تقریروں اور بیانوں میں یہ منتر زور و شور سے پڑھا جاتا رہا ہے مگر عملاً کوئی کام اسلام کے نشا کے مطابق کر کے نہیں دیا گیا۔ سود بھی ہے، سٹہ بھی ہے، اجارہ داریاں بھی ہیں، ذخیرہ اندوزی بھی ہے، قمار بھی ہے، شراب بھی ہے، بیہودگی بھی ہے، مخلوط تقاریب بھی ہیں، مغرب کی بلی پرست ثقافت بھی ہے، رقص و سرود کے مشغلے بھی ہیں، غیر اسلامی قوانین بھی چل رہے ہیں، نظامِ تعلیم مخالفِ اسلام نظریات کے بیج بھی بو رہا ہے، جبریت بھی ہے، حقوقِ انسانی (بلکہ حقوقِ اسلامی) کی پامالی بھی ہے — اور یہ ساری من مانی چیزیں کرنے کے ساتھ اسلام کا منتر بھی پڑھا جا رہا ہے۔ اسی منتر کی جاپ کے ساتھ خوفناک قسم کا ارتکازی نظام پروان چڑھ چکا ہے اور اس نے طبقاتی ناہمواریاں اس درجہ بڑھا دی ہیں کہ اچھے اچھے لوگ ذہنی توازن سے محروم ہو کر اوٹ پٹانگ باتیں سوچنے لگے ہیں۔

اسلام کے لیے اس منتر جاپ نے، خود اسلام کو سخت نقصان پہنچایا ہے اور اسلام پسند عناصر کے لیے مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ عام لوگ جب یہ صورتِ حالات اپنی آنکھوں سے مسلسل دیکھتے ہیں کہ موجودہ انصاف کش[1] اقتصادی نظام پر اسلام کا لیبل چسپاں ہے تو وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ شاید اسلام سرمایہ داری اور ارتکازی معیشت کا سرپرست یا خادم ہے۔ اسی تضاد کی بنا پر ایک طرف اصلی کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ موجودہ اقتصادی نظام کے ساتھ ساتھ اسلام کو بھی ہدفِ تنقید و تعریض بنائیں، اور اسی کی بنا پر ایک درمیانی عنصر اسلامی سوشلزم کے سلوگن کا سہارا لیتا ہے کہ خالی اسلام یا "اسلامی نظام" کہنے سے تو اب کام نہیں چلتا، لہٰذا کوئی نئی بات اٹھانی چاہیے۔

---

[1] شارع علیہ السلام نے ایسی نئی باتیں نکالنے ہی کو بدعت قرار دیا تھا اور بدعت کو ضلالت کی تعریف میں داخل کیا تھا۔ دراصل بدعت تحریفِ دین کا مترادف ہے

میں یہ کہتا ہوں کہ اسلام کے نام کے غلط استعمال کو کیوں نہ ہدفِ تنقید بنایا جائے، اور اس کے بالمقابل اس کے صحیح مفہوم اور صحیح استعمال کو اپنے ذہنوں میں بھی متعین کر لیا جائے اور دوسروں کو بھی دونوں استعمالات کے فرق سے آگاہ کیا جائے۔ اسلام کے نام کا ایک استعمال اسلام پر عمل پیرا ہونے کے لیے ہے، اور اس کا دوسرا استعمال اس کو ردِ عمل لانے کے لیے ہے۔ ایک تصور اسلام میں قول و فعل کا تضاد ہے، اور دوسرا قول و فعل کی ہم آہنگی کا تقاضا کرتا ہے۔

ہمارے یہاں تو دانستہ اور بالارادہ، بلکہ عوام کی تمناؤں کے علی الرغم غیر عملی اسلام کا تجربہ مسلسل جاری رکھا گیا ہے۔ پورے نظامِ زندگی میں، پوری سرگرمیوں میں، تعلیم میں، ثقافت میں، بنکنگ میں، مارکیٹنگ میں، درآمد و برآمد میں، پارلیمانی ایوانوں میں، قانون کے نشوونما میں، غرضیکہ کسی شعبے میں ایسے امتیازی خد و خال نہیں پائے جاتے ہیں جو اسلام کی ترجمانی کرتے ہوں اور جن کی وجہ سے ہمارا نقشۂ حیات ساری دنیا سے الگ پہچانا جائے کہ یہ پاکستانی قوم کی بنائی ہوئی مخصوص قسم کی دنیا ہے جو اسلام کی علمبردار ہے۔ اس وقت چونکہ اقتصادی مسئلہ بطورِ خاص زیرِ غور ہے، اس لیے میں اس کے متعلق پر زور طریق سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسلام کے تقاضوں کی کوئی ایک ادنیٰ چھینٹ بھی اس شعبۂ زندگی پر نہیں پڑی۔ بلکہ یہاں ایسی سرمایہ داری نے ظہور کیا ہے جو یورپ کی کلاسیکل سرمایہ داری سے زیادہ خوفناک ہے۔ اب اس میں اگر کسی دوسرے نظریے کے تحت تبدیلی لانا ممکن ہے تو اسلامی نظریہ کے ذریعے تبدیلی لانا اور بھی زیادہ ممکن اور سہل ہے، کیونکہ اسلامی نقطۂ نظر کے لیے رائے عام کو بغیر کسی ذہنی تصادم کے بآسانی تیار کیا جا سکتا ہے۔

ایک جامع نظامِ توازن

اسلام کے اقتصادی اصولوں پر جب بھی آپ غور کرنے چلیں تو یہ حقیقت ضرور سامنے رکھیں کہ یہ سرمایہ داری یا اشتراکیت کی طرح نرے اقتصادی و مادی تصورکو اپنی اساس نہیں بناتا۔ بلکہ یہ ایک جامع قسم کا نظامِ توازن ہے جس میں مادی اور روحانی تقاضے یکجا سموئے گئے ہیں، جس میں معاش اور معاد کو اکٹھا کیا گیا ہے، جس میں انسان کی حیوانی خواہشات اور اس کی اخلاقی ضروریات کا یکساں لحاظ رکھا گیا ہے، جس میں جسم کی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ دل و دماغ کے مطالبوں کو پورا کرنے کے راستے معین کیے گئے ہیں، جس میں فرد کے حقوق اور اجتماعی مفاد میں توازن پیدا کیا گیا ہے۔ اسلامی نظامِ توازن کا کمال یہ ہے کہ وہ اگر ایک طرف آزادی دیتا ہے تو دوسری طرف اس کی کوئی آخری حد بھی مقرر کرتا ہے، وہ ایک حق مہیا کرتا ہے تو اس کے ساتھ ایک فریضہ بھی عاید کرتا ہے، وہ کسی کو کوئی اختیار دیتا ہے تو اس کی تحدید بھی کرتا ہے، وہ قانونی عدل کے ساتھ ساتھ احسان کے راستے بھی کھولتا ہے، وہ قصاص کو ذریعۂ تحفظِ حیات قرار دیتے ہوئے عفو و درگذر کی اخلاقی فضیلت کا پتہ بھی دیتا ہے۔ اسلام کی اسی مخصوص صفت کو واضح کرنے کے لیے قرآن نے "میزان" کا علامتی تصور ہمارے سامنے رکھا ہے۔ اسی میزان پر کائنات قائم ہے۔ اسی "میزان" کو بطور ایک اصول کے انبیا کے ساتھ اتارا گیا، اور آخرت میں بھی اعمال اسی میزان پر تلیں گے۔ اسلامی نظامِ توازن وحدتِ حیات کے تصور پر مبنی ہے۔ پوری انسانی زندگی ایک اکائی ہے۔ وہ بگڑتی ہے تو چاہے بگاڑ کسی شعبے سے شروع ہو، ساری بگڑ جاتی ہے اور اسی طرح سنورتی ہے تو ساری سنور جاتی ہے۔ اسلام انسان کے سامنے "حیاتِ طیبہ" یا حیاتِ صالحہ یا حیاتِ مطمئنہ کے حصول کو منزلِ مقصود بنا کے رکھتا ہے۔ حیاتِ طیبہ نہ محض اقتصادی ترقی اور دولت کے حصول سے حاصل ہوتی ہے اور نہ ترکِ دنیا اور رہبانیت سے۔ بلکہ زندگی کے سارے کے سارے فطری تقاضوں کو یک آہنگی سے صحیح طور پر پورا کرنے سے تشکیل پاتی ہے۔ اس "وحدتِ حیات" کے لیے وحدتِ دین یا وحدتِ نظام ضروری ہے تقطعوا امرهم بينهم زبراً میں تفرقِ اجزائے دین و اجزائے حیات کا جو تصور دلایا گیا ہے، وہ زندگی کا ستیاناس کر دیتا ہے۔ اسی خطرے سے بچانے کے لیے قرآن نے دنیا بھر سے یہ

مختلف اسلوب اختیار کیا ہے کہ وہ اعتقادات، اخلاقیات اور قانونیات کو اکٹھے بیان کرتا ہے۔ وہ عقلی استدلال کے ساتھ ساتھ جذبات کو متحرک کرتا ہے، وہ دلیل کے ساتھ اپیل کو شامل رکھتا ہے۔ وہ دنیا کے مسائل پر بحث کرتے ہوئے انسان کی نگاہ آخرت سے نہیں ہٹنے دیتا یعنی پوری زندگی کی اصلاح و تعمیر کا ایک جامع منصوبہ ہے اسے پورا لیا جائے تو یہ اپنے مخصوص نتائج پیدا کر دیتا ہے۔ اور اگر اس کے ساتھ آمیزشیں کر لی جائیں تو اس کے اختیار کردہ اجزا کی برکات بھی آمیزشوں کی وجہ سے ضائع ہو جاتی ہیں اسی لیے مطالبہ ہے کہ ادخلوا فی السلم کافۃ یعنی اسلام میں پوری کی پوری زندگی کے ساتھ داخل ہو، اس کا کوئی حصہ اس کے دائرۂ اثر سے باہر نہ رکھو۔

پس اسلامی نظام کی ماہیت ذہن میں متعین کرنے کے لیے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ کوئی یک رخا نظام نہیں، اور نہ اس کا مرکزی موضوع ——— دوسرے موضوعات سے الگ کر کے ——— فقط اقتصادی مسئلہ ہے یہیں سے اس کا راستہ مغربی سرمایہ داری اور سوشلزم دونوں سے الگ ہو جاتا ہے۔

موجودہ دور کے بگاڑ کا آغاز وہاں سے ہوتا ہے جہاں سے اقتصادی مسئلہ کو اخلاقیات سے کاٹ کر الگ کیا گیا اور پھر اسی کو ساری زندگی پر حاوی کر دیا گیا یہ کارنامہ مغربی تہذیب نے سرمایہ دارانہ نظام ہی کی صورت میں انجام دے لیا تھا دین و اخلاق سے منقطع اقتصادی فکر و سعی نے اس بلا کی شکل اختیار کی جسے آج ہم مادہ پرستی کے عنوان سے جانتے ہیں۔ خوب سمجھ لیجیے کہ یہ مادہ پرستی اپنی مختلف شکلوں کے ساتھ اسلام کی عین ضد واقع ہوئی ہے۔

اسلام نہ اقتصادیات کو زندگی سے کاٹ کر پیش نظر رکھتا ہے، نہ مادی تقاضوں کو روحانی و اخلاقی تقاضوں پر کوئی فوقیت دیتا ہے۔ اس کا مرکز و محور ایسی خدا پرستی ہے جس کے زیر اثر مادی اور روحانی تقاضے ہم آہنگ اور یک جان ہو کے چلیں۔ اس کے روحانی و مادی توازن کے مظہر سورہ جمعہ کے یہ دو یکجائی احکام ہیں کہ جب تم کو نماز کے لیے پکارا جائے تو بیع و شری ترک کر کے لپکو اور پھر جب نماز ہو چکے تو حصول رزق کے لیے زمین میں پھیل جاؤ۔
علوم اسلامی کے وہ ماہرین جو اسلام کے حقیقی مزاج آشنا تھے انہوں نے علم کلام، علم فقہ یا تصوف یا دوسرے شعبوں کو اگر الگ کر کے زیر غور رکھا ہے تو محض علمی و فنی ضرورتوں کے تحت۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ مرتبہ اختصاص پیدا کرنے کے لیے یہ ایک علمی تقسیم کار پیدا ہوئی جیسے مثلاً ہمارے ہاں قانون میراث کے خصوصی ماہرین پائے گئے ہیں، مگر کسی شعبۂ علم یا طبقۂ علماء کے ذہنوں میں تقسیم حیات کا ویسا تصور پیدا نہیں ہوا جیسا آج کل کے مغربی تمدن میں ہے۔ آپ اقتصادیات کا مطالعہ کریں تو اس علم کو تمام اخلاقی تقاضوں سے آزاد پائیں گے یہی ہر شعبۂ زندگی اور ہر دائرۂ علم کا حال ہے۔ مغرب کی اس تفریق و تقسیم حیات نے وحدت حیات کی حقیقت کو غارت کر دیا۔ اور آج اسی کے نتائج بھگتے جا رہے ہیں۔

بہر حال میں اگر اسلام کے اقتصادی اصولوں پر یہاں اختصاصی گفتگو کروں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہ لیا جائے کہ یہ اصول اس کے دوسرے تقاضوں سے [illegible] آزاد ہیں یا اسلام کی اقتصادی اسکیم کو اس کی پوری زندگی کی اسکیم سے الگ کر کے لیا جا سکتا ہے اور اس سے وہی نتائج پیدا کیے جا سکتے ہیں جو اسلام کو مطلوب ہیں۔

اس وقت میں اس بحث میں نہیں پڑوں گا کہ اسلام کا اقتصادی فلسفہ کن اصولوں پر مشتمل ہے، اور نہ اس کے ان تمام تفصیلی قوانین کا تذکرہ کروں گا جو اس نے انسان کی معاشی زندگی کی صلاح و فلاح کے لیے معین کیے ہیں۔ بلکہ میں یہاں چند اصولی حقائق کی روشنی میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ موجودہ اقتصادی بگاڑ کا حل اسلامی اصولوں کے ذریعے بڑی خوش اسلوبی سے ممکن ہے

غیر معمولی حالات کے لیے اسلامی حل

اسلامی قانون کے ایک وہ اجزا ہیں جو عمومی Normal حالات میں اگر کار فرما

ہوں تو اقتصادی بگاڑ یا ناانصافی پیدا ہونے کے مواقع ہی نہیں رہتے۔ اس نے سود، سٹے، ذخیرہ اندوزی، کاروباری اجارہ داری، اسراف و تبذیر، ناجائز نفع خوری، بیوع فاسدہ، کی روک تھام کے ساتھ وراثت اور نظام زکوٰۃ (جس کا منشا کفالت عامہ کا انتظام کرنا ہے) کے اجرا کے احکام دے کر اس بات کا بڑی حد تک سدباب کر دیا ہے کہ دولت کا ارتکاز پیدا نہ ہو اور ملکیتوں میں غیر معمولی نوعیت کی ناہمواریاں اور آمدنیوں میں غیر منصفانہ درجے کا تفاوت نمودار نہ ہو۔

اب رہا یہ سوال کہ جس درجے کی غیر معمولی صورت حالات شعبۂ اقتصادیات میں ہمارے یہاں پیدا ہو گئی ہے، کیا اسلام اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اپنے اندر طاقت رکھتا ہے اور ہمیں اپنے اصولوں کے ایسے ہتھیار دے سکتا ہے جن سے ظلم و ناانصافی کے خلاف موثر اقدام کیا جا سکے؟ جی ہاں، میرا حتمی جواب یہ ہے کہ اسلام نے غیر معمولی اقتصادی بگاڑ سے بھی نمٹنے کے لیے راستے پیدا کیے ہیں۔ اور ان پر دور سلف میں بھی اس وقت کے حالات کے مطابق عمل کیا گیا ہے۔ آج بھی غیر معمولی نوعیت کے اقتصادی عدم توازن کو توڑنے اور اسلام کے میزانی نظریہ کو کامیاب کر دکھانے کے لیے وہ راستے ویسے ہی کارآمد ہیں۔ اسلام نے عام حالات کے لیے بھی اور غیر معمولی بگاڑ کی صورت کے لیے بھی جو اصول ہمیں دیئے ہیں ان کا استعمال کرنے کے لیے اس کی اساسی حکمت معیشت کے بعض اہم مقاصد نگاہوں میں رہنے چاہئیں۔ کیونکہ اصلاح حالات کے لیے صرف قوانین ہی کام نہیں کرتے بہت سی موثر تدابیر اور مجموعی پالیسیاں اور فکری و تعلیمی مساعی بھی ان کے ساتھ ساتھ روبعمل لانی ہوتی ہیں۔ ان تدابیر اور پالیسیوں کے لیے اسلام کی میزانی حکمت معاشیات کا شعور بے حد ضروری ہے۔

اسلام کی میزانی حکمت معیشت کی اصولی بنیادیں

موثر کام کرنے کے لیے اس حکمت یا فلسفہ کو عملی سطح پر تفصیلاً مدوّن ہونا چاہیئے یہاں ضروری اشارات کو مختصراً نمبروار پیش کیا جا رہا ہے:-

۱۔ اسلام کی حکمت اقتصادیات کا پہلا اصولی تصور یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام جانداروں اور انسانوں کے لیے رزق مقدر ہے (وَمَا مِنْ دَابَّةٍ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا) مگر انسانوں کے لیے رزق بہ حیثیت مجموعی نازل ہوتا ہے[1]۔ کیونکہ ایک طرف فطرت کی قوتوں کو تمام انسانوں کے لیے مسخر کرنے کا اعلان کیا گیا ہے اور دوسری طرف خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا کے ارشاد میں واضح کیا گیا ہے کہ ہر فرد کے لیے رزق الگ الگ بندھا بندھایا نہیں اترتا، بلکہ ایک معاشرہ کو بہ حیثیت مجموعی ذرائع و وسائل دیئے جاتے ہیں اور تمام نباتاتی و حیوانی طیبات کو "رزقاً للعباد" منسوب کیا گیا ہے۔ اور قدر فیها اقواتها سے بھی یہی مراد ہے کہ زمین میں اس کی تمام مخلوقات کی ہر ہر صنف کے لیے رزق کے خزائن مہیا کر دیئے۔ اس رزق کی انسان اگر تقسیم اصول عدل پر کریں تو تھوڑی بہت فضیلتیں (فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَى بَعْضٍ) ضرور پیدا ہوتی ہیں، لیکن محرومی پیدا نہیں ہوتی، جہاں محرومی پائی جائے وہاں قصور وار انسان ہیں جنہوں نے کسی غلط نظام تقسیم کے تحت اپنے کچھ حصے کو مصیبت میں ڈال رکھا۔

۲۔ اسلامی حکمت اقتصادیات حکومت اور معاشرہ کے لیے لازم ٹھہراتی ہے کہ وہ اکتساب کے تمام راستے تمام لوگوں کے لیے یکساں کھلے رکھے۔ اجارہ داریاں اور اختصاص اور ترجیحات ناجائز ہیں[2]۔

---

[1] یہاں غلط فہمی نہ ہو کہ انفرادی طور پر رزق کا مقدر ہونا جو قرآن اور حدیث میں بیان ہوا ہے اس سے صرف نظر کیا جا رہا ہے۔ اصل میں میرے نزدیک انسان کی تمدنی و اخلاقی زندگی میں چونکہ تقدیر الٰہی کا مفہوم اللہ کا علم ہی ہے جو شائبہ جبریت نہیں رکھتا اس لیے انفرادی رزق کے مقدر ہونے کے معنی یہ نہیں کہ اللہ کے ہاں ہر آدمی کا وہ حصہ کتاب تقدیر میں درج ہو گیا جو انسانی معاشرے کی صحیح یا غلط تقسیم کے تحت اسے ملتا ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

۳۔ اسلامی حکمتِ اقتصادیات کا تقاضا حکومت (معاشرہ) سے یہ بھی ہے کہ وہ لوگوں کو محرومی (کلّی یا جزوی) کی حالت میں مبتلا ہونے سے اور جو کوئی ایسی حالت سے دوچار ہو اسے سہارا دے کر نکالے۔ اس معاملے میں قرآن نے وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ کہہ کر معاشرہ کی اسی ذمہ داری کی طرف توجہ دلائی ہے۔ بعض مفسرین و فقہا نے یہاں لفظ "حق" کا اطلاق زکوٰۃ و صدقاتِ واجبہ پر کیا ہے۔ لیکن دوسرے گروہ نے مضبوط تر استدلال[1] کے ساتھ اس کا وسیع مفہوم اختیار کیا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ جب تک لوگوں میں حالتِ محرومی پائی جائے گی اور وہ سوال پر مجبور رہوں گے تو امرا کے اموال میں ان کا "حق" باقی رہے گا۔ پس ایک اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس حق کو وصول کر کے حقداروں تک پہنچائے یہاں تک کہ کوئی سائل محروم نہ رہے۔[2]

محرومی سے انسانوں کو بچانے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اگر خود نظامِ اقتصادیات میں محرومی پیدا کرنے کے اسباب نمودار ہو جائیں تو ان کی تشخیص کر کے ان کا ازالہ کیا جائے۔ کیونکہ اس مصیبتِ عام کی آخری ذمہ داری اسی پر آتی ہے۔

۴۔ اسلامی حکمتِ اقتصادیات کو یہ امر بھی ملحوظ رکھتا ہے کہ انسانی کرامت و شرف (وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ ... الخ) جو عطیہ الٰہی ہے، اس کا تحفظ کیا جائے اور کسی فرد کو دنائت و پستی میں نہ گرنے دیا جائے۔ ظاہر بات ہے کہ غربت و افلاس اور ناداری و محرومی اور اقتصادی بے بسی و بے چارگی نہ صرف انسانی کرامت و شرف کو برباد کر دیتی ہے بلکہ خطرۂ ایمان و اخلاق بھی ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) تقدیرِ اجتماعی اپنی جگہ ہے اور تقدیرِ انفرادی اپنی جگہ اس سلسلہ میں آنے والے اشارات میں مزید وضاحت ہو جائے گی۔

[3] مشہور صحابی جریر بن عبداللہ نے حضرت عمرؓ سے شام میں جا کر آباد ہونے کی اجازت طلب کی۔ انہوں نے عراق جانے کا مشورہ دیتے ہوئے شام کے متعلق یہ فرمایا کہ "اس ملک کو چھوڑ دو جس کی شان و شوکت خدا نے کم کر دی اور اس قوم (گروہ یا طبقہ) سے جہاد کرنے کے لیے تیار ہو جس نے معیشت کے تمام دروازوں پر قبضہ کر رکھا ہے" (تاریخ طبری۔ روداد جنگ سواتب) صاف ظاہر ہے کہ معیشت کے دروازوں پر کسی محدود گروہ کا قبضہ جمالینا دولت کے بل پر، گٹھ جوڑ کے بل پر یا سیاسی اثر اور قانون کے بل پر، اتنا معیوب ہے کہ اس اجارہ دارانہ قبضے کو توڑنے کے لیے جہاد تک کیا جا سکتا ہے۔

(ن ص)

(حاشیہ صفحہ هذا): [1] ان في المال حقاً سوى الزكوٰة (حدیث)

[2] یہی وہ ذمہ داری تھی جس کا احساس کرتے ہوئے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے سلیمان بن عبدالملک کے جنازہ سے پلٹتے ہوئے پریشانی کے عالم میں فرمایا تھا کہ آج امتِ محمدیہ کا کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں کہ جس کا حق اس کی طلب کے بغیر ادا کرنا مجھ پر واجب نہ ہو (ابن الاثیر) اور پھر جاتے نماز پہ آپ رو رہے تھے دیکھ کر آپ کی رفیقۂ محترمہ نے سبب پوچھا تو فرمایا کہ میری وسیع سلطنت میں آج کوئی بھوکا ہوگا، کوئی فقیر ہوگا، کوئی بیمار ہوگا، کوئی مسافر ہوگا اور مجھے ان سب کے بارے میں خدا کے سامنے جوابدہی کرنی ہوگی۔ درانحالیکہ ان تمام لوگوں کی طرف خود نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم میرے خلاف مستغیث ہوں گے۔ (ابن الاثیر) پانچویں خلیفۂ راشد کے سامنے جس نبیؐ کی تعلیم تھی اس کا ارشاد یہ بھی ہے کہ جس بستی میں کوئی شخص فاقہ کے عالم میں صبح کرے اللہ پر اس کی حفاظت کی ذمہ داری ختم ہو گئی۔ (او کما قال) (مسند امام احمد بن حنبل) اسی معنی پر یہ ارشاد بھی دال ہے کہ اللہ تعالیٰ اس امت کو پاکیزگی عطا نہیں کرتا جو اپنے اندر کے کمزور آدمی کے لیے اس کا حق نہیں نکال کے دیتی۔

اس سلسلے میں یہ حقیقت بھی سامنے رہے کہ اگر اسلامی حکومت میں محرومی کے اسباب پیدا ہو جائیں اور ان کی وجہ سے کوئی شخص چوری پہ مجبور ہو گیا ہو تو اللہ کی مقرر کردہ حد تک ساقط ہو جائے گی جو انتہائی مقدس درجہ رکھتی ہے۔ معاملہ اس سے آگے یہاں تک جاتا ہے کہ ایسی حالت میں وہ باقی (اگلے صفحہ پر)

۵۔ اسلامی حکمتِ اقتصادیات کی بنیاد میں یہ حقیقت بھی ثبت ہونی چاہیئے کہ حدِ اعتدال سے بڑھے ہوئے تفاوتِ رزق (معاشی ناہمواریوں) کو جو مترفین و عشرت پسندوں کا بیکار طبقہ اکے لیے فسق و فجور کے مواقع پیدا کر دیتا ہے، انسانی معاشروں کی تباہی اور عذاب الٰہی کے ورود کا باعث قرار دیا ہے: وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُهْلِكَ قَرْيَةً ...... الخ، پس اس سببِ ہلاکت کا دور کرنا ضروری ہے، ورنہ عذاب الٰہی طبعی قوتوں کی صورت میں بھی آسکتا ہے اور خود انسان کے ہاتھوں جنگ و انقلاب کی شکل بھی اختیار کر سکتا ہے۔

۶۔ اسلامی حکمتِ اقتصادیات پر یہ بنیادی تصور حاوی ہونا چاہیئے کہ پورے نظامِ حیات کی طرح شعبۂ اقتصادیات پر بھی اصولِ تعاون کو کارفرما کرنا ہے[1]۔ تمام پیداآوری تنظیموں، تمام اقتصادی مساعی اور تمام لین دین اور قرض و صدقات، اجتماعی کفالت اور وراثت کا نظام، سب کے سب اسلام میں بین الانسانی تعاون کے مظہر ہیں۔ اسی اصول کی بنا پر اسلام میں کاروبار کی وہ تمام صورتیں ممنوع ہیں جن میں جبر و اکراہ اور مکر و فریب پایا جائے جو وجہِ فساد و نزاع بنیں، اور جو فریقین کی حقیقی رضامندی یا آزاد مرضی پر مبنی نہ ہوں۔ اجتہادی نگاہ سے آج کے حالات میں دیکھیں تو ہر وہ صنعتی تنظیم، اجیر و مستاجر کے تعلقات کا ڈھانچہ اور اجرتوں، معاوضوں اور شرائطِ کار کا نقشہ یا اقتصادی و مالی قوانین جو کمزور فریق کو غیر منصفانہ تقاضے قبول کرنے پر مجبور کر دیں، اسلام کی روح کے خلاف ہیں۔ یعنی انفرادی جبر و اکراہ کی طرح، اجتماعی و تنظیمی جبر و اکراہ، بالواسطہ اکراہ کی طرح بالواسطہ اکراہ کی صورتیں بھی اسلامی نظامِ اقتصادیات میں نہیں چلنی چاہئیں۔

۷۔ اسلامی حکمتِ اقتصادیات میں یہ صداقت بھی شامل ہے کہ افادیتِ عامہ (Public Interest) افراد کی معاشی منفعتوں سے مقدم ہے۔ اسلام کے بہت سے اساسی قوانین اسی صداقت پر مبنی ہیں۔ اسی غرض کے لیے بعض چیزوں کو اللہ و رسول کے لیے یا بتبعاً اسلامی حکومت و معاشرہ کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ مثلاً چراگاہیں، قدرتی آبی ذرائع وغیرہ۔ اسی سلسلے میں ایک قسم وہ ہے جس میں گلیاں، سڑکیں، قبرستان، عیدگاہیں وغیرہ شامل ہیں جو متعلقہ بستی کے لوگوں کی مشترک ملکیت (شاملات دیہہ) کی حیثیت رکھتی ہے۔ غیر مملوکہ (اور تین سال تک غیر مزروعہ رہنے والی) زمینیں بھی اسی قسم میں شامل ہیں، مگر فرق اتنا ہے کہ عادی الارض کو جب کوئی شخص کاشت کر لے تو قبضہ و کاشت کی بنا پر وہ اس کا مالک قرار پا جائے گا، خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو۔ ایسا ہی حکم اراضیٔ موات کا ہے۔

اسی صداقت کی عکاسی یہ جواہر پارہ کرتا ہے کہ خیر الناس من ینفع الناس لوگوں میں سے بہترین وہ ہے جو دوسرے انسانوں کے لیے باعثِ نفع و افادیت ہو۔ نہ کہ تمام لوگوں کو نقصان اور دھکہ دے کر اپنا ذاتی فائدہ سمیٹا جائے۔ قرآن خود کہتا ہے: فَمَنْ يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ، بقاء و قرار اس فرد، ادارے، حکومت، اقتصادی نظام یا نظریہ و فلسفہ کے لیے ہے جو زیادہ سے زیادہ انسانوں کے لیے باعثِ افادیت ہو۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ: کسی شخص کو مبتلا کرنے کا باعث اگر اس کا ولی و کفیل یا مستاجر بنا ہو تو موخر الذکر مستوجب سزا ہوگا۔ اس کی مشہور عملی نظیر یہ ہے کہ حضرت حاطب ابن ابی بلتعہ کے غلاموں نے اہل مزینہ کی اونٹنی چرالی (اور غالباً ذبح کر کے کھا گئے ہوں گے) اور حضرت عمرؓ کے سامنے مقدمہ آیا۔ تحقیق کے بعد آپ نے سارق غلاموں کی سزا موقوف کر دی اور اونٹنی کی قیمت مع مساوی تاوان کے مالکان کو حضرت حاطب سے دلوائی (اسلام کا نظامِ عدل از سید قطب شہید۔ ص ۳۳۰، ۳۳۱)

[1] حضرت شاہ ولی اللہ نے اصولِ تعاون کو بنیادی اہمیت دی ہے اور اس کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ شاہ صاحب اللہ تعالیٰ کی جانب سے اصولِ تعاون کے وجوب کے قائل ہیں۔ انھوں نے ایک مستقل فصل "التبرع والتعاون" کے عنوان سے قائم کر کے شرکت، مضاربت، وکالت (باقی اگلے صفحہ پر)

(باقی اگلے صفحہ پر)

چنانچہ حدیث و آثار میں ایسے پیشوں یا مشاغل کو افضل قرار دیا گیا ہے جن کا فائدہ عوام کے لیے وسیع ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلامی حکومت و معاشرہ کو زیادہ سے زیادہ راستے ایسے پیشوں اور مشغلوں کے نکالنے چاہئیں جن کی افادیت کا دائرہ کشادہ ہو۔ اس اصول کا اطلاق ایسی صورتوں پر قانون کے ذریعے بھی ہو سکتا ہے کہ ایک فرد کی کوئی سرگرمی اگر محض اس کے لیے نفع آوری کا ذریعہ ہونے کے بجائے دوسروں کی حق ماری یا ضرر رسانی یا افادیت عامہ کو مجروح کرنے کی وجہ بن جائے تو روک دیا جائے یا ایسی صورت دے دی جائے کہ اس کے اثرات صحت مند نہ ہوں۔

۸۔ اسلامی حکمت اقتصادیات کو توازن کے ساتھ جہاں یہ حقیقت سامنے رکھنی ہے کہ بعض املاک خدا اور رسولؐ یا اسلامی حکومت یا عامۃ الناس کی مشترک اور اجتماعی شکل میں موجود ہو سکتی ہیں وہاں یہ بھی ذہن نشین کرنا چاہیئے کہ یہاں قومی ملکیت کو اصل الاصول نہیں بنایا گیا کہ افراد سے سب کچھ چھین چھان کر اکٹھا کر دیا جائے بلکہ اجتماعی املاک استثنائی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اجتماعی ملکیت کو اصول بنا لینے کا راستہ انفرادی آزادی و حقوق کے خاتمہ کی طرف جاتا ہے۔ اسلامی نظامِ توازن ایک ضرورت کے لیے دوسری ضرورت کو قربان نہیں کرتا بخلاف اس کے حکومتی یا قومی ملکیت کا نظام جہاں سرمایہ دار طبقہ سے معاشرے کو نجات دلاتا ہے وہاں خود اس کی جگہ لے کر فرد کو مکمل طور پر غلام بنا لیتا ہے۔

۹۔ اسلامی حکمت اقتصادیات کے محققین و طلبہ کو اس اصولی حقیقت سے بھی آگاہ ہونا چاہیئے کہ عوام کو مشقت یا ضیق میں ڈالنا خواہ وہ سیاسی لحاظ سے ہو یا اقتصادی لحاظ سے، بروئے حدیث پاک مسلمانوں کے سربراہان حکومت کا ایک ایسا جرم ہے جس پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ایسے حکام کے لیے اللہ سے دعا فرماتے ہیں کہ اے اللہ تو بھی ان حاکموں کو تنگی اور مشقت میں ڈال۔ اسی بنا پر دائرہ معاش میں عوام کے لیے ایسے حالات پیدا کرنا یا ان کو پیدا ہونے دینا جو انہیں مصیبت میں مبتلا کر دیں، قائدین و حکام کے نامۂ اعمال کو سیاہ کر دیتا ہے پس اسلامی حکومت کا کام عوام کو اقتصادی تنگ حالی اور اس کے اسباب سے نجات دلانا ہے، خصوصاً پالیسیوں اور قوانین کے بنانے میں یہ مصلحت خاص طور پر ملحوظ رکھی جانی چاہیئے[2] مثلاً احتکار (اشیائے ضرورت خصوصاً غلہ کا قیمت چڑھانے کے لیے فروخت سے روک رکھنا، جسے آج کل ہم "ذخیرہ اندوزی" کہتے ہیں)۔ اس کی علتِ حرمت بھی مصیبت عامہ ہے۔

۱۰۔ اسلامی حکمتِ اقتصادیات اسراف و تبذیر کے دروازوں کی بندش کا تقاضا کرتی ہے۔ تبذیر تو ہے ناجائز کاموں میں (مثلاً شراب خوری وغیرہ)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مزارعت اور مخابرات سبھی کی بحث اسی فصل میں کی ہے، بلکہ انہوں نے فرائض وراثت کے قانون کو بھی خاندان اور قبیلے کے لیے تعاون کے استحکام کا ذریعہ قرار دیا ہے ضروری اشارہ یہ ہے کہ سود اور قمار جیسی صورتوں پر بحث کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں کہ ان معاملات میں ادائیگی کرنے والے کی حقیقی رضامندی شامل نہیں ہوتی اور وہ خوشدلانہ اور آزادانہ سکام نہیں کرتا۔ (حجۃ اللہ البالغہ۔ ابواب ابتغائے رزق)

[1] حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابیض بن حمال مازنی کو ایک نمک کی کان تفویض فرما دی تھی مگر بعد میں کسی صحابی نے اس کان نمک کی صحیح صورت بیان کی تو مفاد عامہ کے تقاضے کے تحت حضور علیہ السلام نے اسے واپس لے لیا (حجۃ اللہ البالغہ۔ ابواب ابتغائے رزق) اسی سلسلے کی دوسری مثال یہ ہے کہ کسی شخص نے مدینہ میں گھوڑوں کی تجارت کے لیے بڑے پیمانے پر ایک اصطبل قائم کرنا چاہا اور اس کے متعلق حضرت عمرؓ سے گفتگو کی۔ انہوں نے شرط عائد کی کہ اپنی ضرورت کا چارہ تمہیں مدینہ (اور مضافات) کی حدود سے باہر سے لانا ہوگا۔ مصلحت یہ سامنے تھی کہ اگر مدینہ کا چارہ بڑے پیمانے پر ایک شخص استعمال کرے گا تو عام لوگوں کو نایابی اور گرانی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

[2] حضرت شاہ ولی اللہ نے اس کے لیے "اضرار تضییق" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اور اسی کو انہوں نے مدینہ نمبر ۷ والے معاملے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تنسیخ حکم سابق کی علت قرار دیا ہے (حجۃ اللہ البالغہ۔ ابواب ابتغائے رزق)

دولت اڑانا" اور اسراف جائز کاموں مثلاً کھانے پینے میں حدِ اعتدال سے بڑھ کر مال کا صرف کرنا ہے۔ ان دونوں صورتوں کا جب اقتصادی تجزیہ کیا جائے تو فکر و تحقیق اسی نتیجے پر پہنچاتے ہیں کہ یہ صورتیں معاشرے کی مجموعی دولت میں ایسا تصرف بے جا ہیں جن کا وبال بالآخر غیر متعلق پر جا پڑتا ہے۔ جب افراد کے انفرادی اسراف سے آگے بڑھ کر جماعتی سرف کا مقام آتا ہے، یعنی پرانے زمانے کے مطابق درباری اور اشرافی طبقے اور آج کل کے حالات میں اہل سرمایہ وجاہ کے طبقے عیش و تنعم کی عادات میں مبتلا ہوتے ہیں اور قومی سرمایہ و محنت اور نظام پیداآوری کا ایک بڑا حصہ ان کے غیر ضروری مصارف پورے کرنے میں صرف ہونے لگتا ہے۔ اس طرح بہت سی پیداآوری قوتیں حقیقی ضرورتوں کو پورا کرنے سے الگ ہو جاتی ہیں اور دوسری طرف طبقۂ امراء کے عیش و عشرت کے مصارف کا بار ٹیکسوں کی صورت میں غریب عوام اور محنت کش طبقوں پر پڑتا ہے[1]۔ پھر موجودہ دور میں یہ اسراف قومی سطح پر نمودار ہو گیا ہے یعنی قوم کی کمانے کی مجموعی سکت اور اس کا معیارِ آمدنی تو دنیا کی بڑی قوموں سے بہت پیچھے ہے، مگر معاشرت، ثقافت اور دوسرے شئون و اطوار میں (جائز و ناجائز کی بھی تمیز کے بغیر) ان کی نقل اتاری جاتی ہے اور ہر کوئی اس جادۂ اسراف تک جہاں تک دوڑ سکتا ہے "دوڑتا ہے ——— یہاں تک کہ وہ کسی جگہ ہانپ کر گر پڑے اور مزید آگے بڑھنے کی ہمت نہ رکھتا ہو۔ اس میں ہم شہریوں کے ساتھ "زائرین، حکام، دانشور، مصلحین اور علماء وغیرہ سبھی شریک ہیں ——— "جنید و شبلی و عطار ہم مست اند"

اسلامی اقتصادیات اس کی متحمل نہیں ہیں کہ اسرافیات کے یہ سلسلے چل سکیں۔ افراد کے لیے بعض حدود واضح طور پر قائم کر دی گئی ہیں، اور طبقوں اور معاشرے کے لیے رہنما عملی مثالیں چھوڑی گئی ہیں جن کا یہاں تذکرہ طولِ بیان کا باعث ہوگا۔

اسلامی حکمت اقتصادیات کے رہنما اصولوں میں یہ بات بھی شامل ہے کہ سیاسی اقتدار کو معاشی مفاد کے حصول کا ذریعہ نہیں بنایا جا سکتا۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے خود یہ اصول طے فرما دیا کہ کسی حاکم کا اپنی رعیت سے تجارت کرنا بدترین خیانت ہے۔ (کنز العمال) ورنہ ظاہر ہے کہ صاحبِ حکومت چاہے تو خود منڈیاں میں بیٹھے اور دکانیں کھلاتے اور کاروبار کا جال پھیلا دے۔ ایک پٹواری اور تحصیل دار کرسی اپنے علاقے کی زمین کا نجانے کتنا حصہ اپنی جھولی میں ڈال لے سکتے ہیں۔ چنانچہ محصلین زکوٰۃ میں سے کسی نے دورہ کرتے ہوئے ایک جگہ سے مال خرید کر اسے بیچا اور نفع کمایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سارا نفع لے کر بیت المال میں داخل کر دیا۔ کاروبار تو رہا الگ، اسلامی حکومت کے سچے حکام (خلفائے راشدین) تو اشیائے ضرورت کے استعمال میں بھی ترجیحات سے پرہیز کرتے تھے[2]۔ انہوں نے تنخواہیں بھی بیت المال سے لیں تو اس شعور کے ساتھ نہایت قلیل لیں کہ یہ مال "مالِ یتیم" کی مانند ہے۔ باقی رہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ تو کس کو معلوم نہیں کہ لاکھوں اموال آتے اور آپ ضرورت مندوں میں تقسیم فرما کر دامن جھاڑ کے اٹھتے ——— درانحالیکہ کبھی کبھی اپنے گھر میں چولہا تک گرم کرنے کا سامان بھی نہ ہوتا۔

یاد رہے کہ جب کسی نظام میں سیاسی اقتدار کے ساتھ اقتصادی مفاد کا دامن بندھ جاتا ہے تو پھر حکمران طبقہ بے مثال قسم کی لوٹ مچاتا ہے ———

---

[1] اس مسئلے کی بھی شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اچھی وضاحت فرمائی ہے (حوالہ سابق)

[2] ایک بار عتبہ بن فرقد نے فتح آذربائیجان کی خوشی میں مٹھائی کی دو ٹوکریاں خلیفہ دوم کو ہدیتہً بھجوائیں۔ مگر انہوں نے اس بنا پر اس کو قبول نہ کیا کہ ہم کوئی ایسی چیز نہیں کھاتے جو تمام مسلمانوں کے گھروں میں کافی تعداد میں موجود نہ ہو (بلاذری: فتوح البلدان) انہی عتبہ نے ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کھانا کھاتے دیکھ کر کچھ کہا تو فرمایا: میں سب سے برا حاکم ہوں گا۔ اگر اچھا تو میں کھاؤں اور لوگوں کو ردی اور خراب غذا کھلاؤں (تاریخ طبری) یہی اصولی طرزِ فکر تھا جس کے تحت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عام الرمادہ (قحط) میں گوشت اور روغن اور گھی روٹی کا استعمال ترک کر دیا تھا، یہاں تک کہ چہرہ کی رنگت متاثر ہو گئی (سیوطی)۔ اسی طرح حضرت ابوعبیدہ نے ایرانی عہدہ داروں کی ضیافت کھانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ابوعبیدہ وہی چیزیں کھا سکتا ہے جو سب مسلمانوں کو کھانے کے لیے ملیں۔

بلکہ چھوٹے چھوٹے لوٹ مچانے والے رہتے ہی نہیں اور عوام کی بری طرح حق ماری ہوتی ہے۔

۲۔ اسلامی حکمت اقتصادیات میں اس شعور کو جذب ہونا چاہیے کہ محنت و کسب لازمۂ انسانیت ہے اور باعث عزت و شرف۔ قرآن نے لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ کے الفاظ میں یہ راز بیان کر دیا کہ انسان تو پیدا ہی محنت و مشقت کے لیے ہوا ہے۔ محنت گریزی اور خصوصاً ناکارہ بن کر دوسروں کی محنتوں پر مدار رکھنا شرفِ انسانی کے خلاف ہے۔ پیغمبر علیہ السلام نے محنت کش کو اللہ کا حبیب قرار دیا (الکاسب حبیب اللہ) اور ایک صحابی کے ان ہاتھوں کو چوم لیا جن پر محنت کی وجہ سے چھالے اور گٹے پڑ گئے تھے۔ یہ بھی فرمایا کہ اللہ کو وہ مومن عزیز ہے جو کسی صنعت سے روزی کماتا ہو (تفسیر قرطبی) پھر فرمایا بہترین کمانا وہ ہے جو آدمی اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھائے (بخاری) پھر محنت کے شرف و عزت ہی کی بنیاد پر اسلام نے اجیر اور مستاجر (یا مزدور اور سرمایہ دار) کا رشتہ تصورِ اخوت پر استوار کیا۔ ارشاد ہے: اخوانکم جعل اللہ تحت ایدیکم ..... (یہ لوگ) تمہارے بھائی ہیں جنہیں اللہ نے تمہارے زیرنگین کیا ہے۔ یعنی ان سے بھائیوں کا سا سلوک روا رکھو۔ اس حدیث میں اس سلوک کے بعض ضروری پہلو بیان کیے گئے ہیں۔ ایک حدیث قدسی کی رو سے مزدور سے محنت لینے کا معاملہ انتہائی نازک ہو جاتا ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرمایا کہ تین قسم کے لوگوں کے خلاف خود داورِ محشر بھی مدعی بنیں گے، یعنی حکومت الٰہیہ دعویٰ پیش کرے گی۔ ان میں سے ایک وہ مزدور ہے جس سے محنت لی گئی مگر اس کی اجرت ادا نہیں کی گئی (بخاری) ساری اجرت روکنا زیادہ بڑا جرم سہی، مگر اس کا کوئی جزء (جو از روئے انصاف واجب آتا ہو) روکنا بھی دائرۂ جرم سے خارج نہیں ہے۔ مزدوروں سے کام لینے والے سوچ لیں کہ ان کے صنعتی نظام میں معاملہ کہاں پہنچا ہے۔

دوسرے لفظوں میں آج کے صنعتی نظام میں حکومت کو اپنی تعلیم و تربیت کے ساتھ اور بہترین ماحول اور مواقع مہیا کرنے کے ساتھ ایسی قانون سازی بھی کرنی چاہیے کہ محنت کا شرف اور مزدور کا مقامِ اخوت برقرار رہ سکے[1]۔

۳۔ کسی معاشرے کا (خصوصاً اسلامی معاشرہ) مستکبرین اور مستضعفین میں تقسیم ہو جانا اور اس تقسیم میں اضافہ ہوتے چلے جانا، وعیدِ الٰہی کی زد میں آتا ہے۔ پہلی اصطلاح ایسے قوی اور سرکش اور علوپسند لوگوں کے لیے ہے جو جاہ و مال اور رسوخ کو اس مقصد کے لیے استعمال کریں کہ کمزور لوگوں کو کمزور تر بنائیں اور ان کو دبا کر رکھیں اور ان سے استحصال کریں۔ دوسری اصطلاح کا اطلاق ایسے افراد اور طبقوں پر ہوتا ہے جو اول الذکر کے علو و استکبار کے پنجے میں جکڑے گئے ہوں اور اپنے آپ کو استحصال کے لیے ان کے حوالے کر چکے ہوں۔ فرعونی نظام نے معاشرے کی ٹھیک یہی حالت بنا دی تھی (جَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا)۔

واضح رہے کہ قرآن نے بار بار مستکبرین کے لیے تو اللہ کی ناراضگی و ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہی ہے، "مستضعفین" کے اس کمزور رویے کو بھی غلط قرار دیا ہے کہ جب انہیں گرفت میں لیا جا رہا ہو تو اس وقت بھی کوئی مزاحمت نہ دکھائیں اور جب ان کو جکڑ لیا جائے تو جب بھی نظامِ باطل کے

---

[1] حضرت عمرؓ ہی کی قائم کردہ یہ روشن نظیر بھی ہے کہ باہر سے آنے والے وفود سے اپنے ماتحت حاکموں کے متعلق دریافت کرتے تھے کہ ہمارا افسر بیماروں، غلاموں اور خادموں کی عیادت کو جاتا ہے یا نہیں۔ اگر جواب نفی میں ہوتا تو ثابت ہونے پر افسر کو معزول کر دیتے (طبری)۔ اسی بنا پر اسلامی سیاست و فقہ میں محتسب کے قانونی فرائض و اختیارات میں یہ بات داخل ہے کہ وہ گھوم پھر کر دیکھے کہ خادموں یا غلاموں اور اجیروں سے ان کے آقا ان کی طاقت سے زیادہ کام تو نہیں لے رہے۔ اگر ایسا ہو تو مواخذہ کرے اور حکام ان کو زیادتی کرنے سے روک دے (ماوردی۔ احکام السلطانیہ)۔ مدد کرنے کی غرض سے دیکھنے کی یہ روایت کہ بھی حضرت عمرؓ نے ہی شروع کیا تھا، وہ ہفتہ کے دن نکلتے تھے (موطا امام مالک)۔

پھیلائے ہوئے استحصال کے جال کو توڑنے کے لیے کوئی جنبش نہ کریں۔ قرآن میں ہے کہ اس قسم کے لوگ جب آخرت میں یہ عذر پیش کریں گے کہ ہم تو زمین میں کمزور اور بے بس بنا دیئے گئے تھے (كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْأَرْضِ) تو ان کو خدا کی طرف سے یہ جواب دیا جائے گا کہ (اگر تم ظلم نہیں بھی سکتے تھے تو) کیا میری زمین اتنی وسیع نہ تھی کہ تم اس نظام باطل یا نظام ظلم سے ہجرت کر جاتے جس نے تمہیں راہ حق سے روکنے کے لیے بھی اور استحصال کرنے کے لیے بھی کمزور اور بے بس بنا لیا تھا؟

یعنی وہ حکومت، معاشرہ، اقتصادی نظام یا طبقہ بھی قرآنی وعید کی زد میں آتا ہے جو استکبار پسند ہو، یا مستکبرین اور مستضعفین کی تقسیم پیدا کرے اور وہ لوگ یا طبقے بھی گرفت سے بچ نہیں سکتے جو اس حالت کا آرام و سکون سے شکار ہو جائیں اور پھر اسی پر قانع ہو کر پڑ رہیں۔

واضح رہے کہ مستکبرین و مستضعفین کی یہ تقسیم یوں تو سیاست اور دوسرے شعبوں میں بھی کام کرتی ہے مگر اس کا ایک بڑا اور اہم دائرہ اقتصادیات ہی کا دائرہ ہے۔ بلکہ یہ تقسیم اگر اس دائرے میں کامیابی سے نہ چلے تو پھر یہ زندگی کے باقی شعبوں میں بھی پوری طرح کام نہیں کر سکتی۔ مثال کے طور پر غلاموں کا سب سے بڑا استعمال ہمیشہ اقتصادی دائرے میں کیا گیا اور خاص طور پر غیر اسلامی نظاموں نے تو ان سے کم سے کم خرچ (خوراک وغیرہ) کے عوض میں زیادہ سے زیادہ محنتیں وصول کرتے ہوئے ان کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک روا رکھا ہے۔ اور دور فراعنہ میں بھی یہ ادارۂ غلامی اپنی بدترین شکل میں موجود تھا، اور اس دور کے فاقوں مرتے اور کوڑے کھاتے غلاموں کی محنتوں کی یادگار وہ اہرام ہیں جن کو آج ہم تہذیب انسانی کی شاندار یادگاریں قرار دیتے ہیں[1]۔

پس اسلامی نظام معیشت کو اس نہج سے، ایسے قوانین کے تحت اور ایسی حکیمانہ تدابیر کے ساتھ کام کرنا چاہیئے کہ معاشرہ کے اہل سرمایہ و اہل محنت مستکبرین اور مستضعفین کے دو دھڑوں میں نہ بٹ جائیں جن میں —— اول الذکر ظلم و استحصال کرنے والا ہو، اور آخر الذکر ساری عمر ظلم و استحصال کے کولہو میں جانور کی طرح جُتا رہے۔

اسلام نے سر جھکا کر ظلم سہتے رہنے، یا ناانصافی کے ماحول میں استحصال کیشوں کی سواری بنے رہنے کی تعلیم انسان کو ہرگز نہیں دی ہے۔ اسے سر اٹھانا چاہیئے، اسے ظلم کے مقابلے میں اپنے ضمیر کی قوت کے بل پر کھڑا ہونا چاہیئے، اسے ظلم کا ہاتھ پکڑنے کی تدبیر کرنی چاہیئے —— اور اگر وہ غلط طریقوں (منکرات) کی روک تھام ہاتھ اور جسم (یا اجتماع و تنظیم) کی قوت سے نہ کر سکتا ہو تو زبان و قلم کی قوت سے کرے اور اگر اس طریقے سے بھی مدافعت کرنے سے عاجز ہو تو اپنے ذہنی شعور، اپنے دلی جذبات اور روحانی احساسات کو اس کی مزاحمت کے لیے کم از کم اپنے اندر کارفرما رکھے۔ یہ ظلم و منکر کے خلاف کام آنے والا وہ فکر و احساس کا بارودی ذخیرہ ہے جو ذرا سی گنجائش کا ملنے پر کام آ سکتا ہے۔ لیکن اگر دل و دماغ سے حق و صداقت کا مورچہ ہی سرے سے اکھیڑ دیا گیا ہے تو گویا دائمی شکست طاری ہوئی۔

۱۳۔ اقتصادی لحاظ سے بگڑے ہوئے معاشرے کو (جو دوسرے شعبوں میں بھی صحت مند نہیں ہو سکتا ہے) تبدیل کرنے کے لیے جب بھی سوچا جائے تو اسلامی حکمت عملی کی رو سے تبدیلی کی ایسی جامع اساس لے کے چلنا چاہیئے جس کے بل پر اقتصادیات کی اصلاح دوسرے تمام شعبوں سمیت ہو۔ کیونکہ "اسلامی اقتصادیات" بقیہ اسلامی نظام حیات سے (فکر و اعتقاد سے لے کر ریاست و قانون تک) کٹ کر نفاذ پذیر ہو ہی نہیں سکتیں۔ وہ اپنے ساتھ ایک خاص

---

[1] فراعنہ کے اسی مصر کے فاتح حضرت عمرو بن عاص نے اپنی تحریری رپورٹ میں خلیفۂ ثانی رض کو لکھا تھا کہ "ایک مخلوق ہے جو شہد کی مکھیوں کی طرح دوسروں کے لیے محنت کرتی ہے اور اپنی محنت اور گاڑھے پسینے کی کمائی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتی"۔

(النجوم الزاہرہ ص ۳۲۔ تمدن عرب ص ۱۰۱)

طرح کا ایمان و اخلاق بھی چاہتی ہیں اور ایک امتیازی طرز کی جمہوری ریاست بھی۔

ایسی جامع تبدیلی کے لیے طوفانی رفتار کا جبری طریق انقلاب قطعاً غیر موزوں ہے جس کے دلائل ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اسلامی طریق انقلاب چونکہ تدریجی ہے۔ اور اس میں آدمی کا دل (خواہ وہ لیڈر ہو یا کارکن) حدود الٰہی کا پابند رہتا ہے اس لیے اسے لازماً معلمانہ اور مربیانہ اور مزکیانہ انداز سے کام کر کے ایک طرف رائے عامہ کو تیار کرنا ہوتا ہے اور دوسری طرف نظام عدل کو چلانے کے لیے ایسے مردان کار کو صحت مند فکر اور صالح کردار سے آراستہ کرنا ہوتا ہے جن کے قلوب خدا کی جلوہ گاہ ہوں اور جن کے ضمیر ان کے لیے محتسب ہوں۔

محض جذباتی نعروں اور ناممکن العمل مگر خوبصورت وعدوں کے سبز باغ دکھا کر عوام کو بہکانے والے لوگ آج تک کوئی ایسا معاشرہ پیدا نہیں کر سکے جس میں پوری زندگی صحت مند اور متوازن ہو اور ہر شعبے میں یکساں عدل کارفرما ہو۔ بلکہ ایسے تمام انقلابات نے انسان کو ایک ہاتھ سے اگر ضرورت کی ایک چیز دی ہے تو دوسرے ہاتھ سے اس کی کوئی نہایت قیمتی متاع اس سے چھین لی ہے۔ ایک مسئلہ اگر حل کر کے دکھایا ہے تو دس مسئلوں کو الجھا کے رکھ دیا ہے۔

آپ چاہیں تو نپولین اور سکندر اور چنگیز کی یلغاروں کے علاوہ امریکہ، فرانس، جرمنی، اٹلی، روس، چین اور ضمناً مصر، شام اور عراق کے انقلابات کا محققانہ مطالعہ کر کے دیکھ لیجیے کہ انہوں نے کیا دیا اور کیا لیا؟

اسلامی انقلاب کا اصل دار و مدار ایسے تربیت یافتہ افراد کی مناسب تعداد پر ہے جو اپنے اندرونی جذبے کے تحت رضاکارانہ طور پر صلاح و فلاح کی راہ اختیار کریں، اور قانونی تقاضوں سے آگے بڑھ کر اخلاقی علو حاصل کرنے کے لیے ایثار و انفاق کی روشن مثالیں قائم کریں جو دوسروں میں سوئے ہوئے جذبات عالیہ کو جگا دیں۔

یہ بات الگ ہے کہ تغیر کی جد و جہد مسلسل میں بگاڑ کی طاقتوں پر دباؤ ڈالنے کی تدابیر بھی اختیار کرنی پڑتی ہیں اور کی جانی چاہئیں مگر یہاں سوال اسلامی انقلاب کے اساسی مزاج کا ہے اور اس کی غایت اعلیٰ کا ہے۔

اقتصادیات میں حکومت کی مداخلت کا مسئلہ

سابقہ اشارات سے ہم نے اس اہم پندرھویں مسئلے کو الگ کر لیا ہے کیونکہ اس کی اہمیت بھی زیادہ ہے۔ اور یہ توجہ بھی غیر معمولی نوعیت کی چاہتا ہے۔ اسلامی نظام حکومت اگرچہ فرد کو آزادی دیتی ہے اور آزاد لین دین اور کھلی مارکیٹ ہی کو صحیح فطری نہج قرار دیتا ہے (حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے مطالبے پر قیمت بندی سے انکار کر دیا تھا) لیکن سخت مغالطہ ہوگا، اگر آپ اس کے طرز عمل کو مغرب کی کلاسیکل سرمایہ داری کے مشہور اصول آزادی معاملت (Laissez faire) پر قیاس کریں۔

اسلامی ریاست فرد کو عمومی آزادی دے کر خصوصی قدغنیں بھی لگاتی ہے جن میں سے بعض قانونی ہیں، بعض اخلاقی۔ وہ کمانے کے طریقوں پر، خرچ کرنے کے طریقوں پر اور لین دین کے معاملوں میں ناگزیر حد تک مداخلت کرتی ہے تاکہ فساد اور بگاڑ پیدا نہ ہو۔ وہ حلال و حرام کے ضابطے نافذ کرتی ہے۔ وہ ضروریات اور مصالح عامہ کے تحت اجتہادی اوامر و نواہی کو بھی نافذ العمل کر سکتی ہے۔

دوسری طرف وہ اجتماعیت کی طاقت کو بھی قانونی و اخلاقی دونوں قسم کے ذرائع سے اس امر سے روک کے رکھتی ہے کہ وہ فرد کے حقوق میں مداخلت بے جا کرے۔

یعنی وہ فرد اور معاشرہ دونوں کے درمیان عدل کی ترازو تھامے اس امر پر نگاہ رکھتی ہے کہ ایک پلڑے سے کوئی چیز دوسرے پلڑے کی طرف منتقل نہ ہو سکے۔

اپنی اس نوعیت کے لحاظ سے اسلامی حکومت اپنی مثال آپ ہے اور دور حاضر کا کوئی سیاسی ازم اس سے مماثلت نہیں رکھتا۔

اب ہم یہ دیکھ لیں کہ کتاب و سنت نے جو اصولی راہنمائی دی ہے اور قرونِ اولیٰ کے دور میں جو نظائر سامنے آتے ہیں ان کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی حکومت غیر معمولی حالات میں خیر و فلاحِ عامہ کے لیے غیر معمولی نوعیت کی مداخلت بھی کر سکتی ہے اور خود شریعت میں اس کے راستے موجود ہیں۔ چنانچہ قحط میں راشن بندی، یا افلاس زدہ آبادی سے حدِ سرقہ کا سقوط یا سرحدی علاقوں کی آبادیوں کے لیے حدود کے متعلق خصوصی طرزِ عمل کا اختیار کیا جانا بڑے واضح عملی نظائر ہیں۔

اس گفتگو کی روشنی میں ہم جس اصل مسئلے کو لینا چاہتے ہیں وہ آج کے پیش آمدہ اقتصادی حالات کا مسئلہ ہے۔ ہمارے یہاں ادارۂ حکومت نے نہ تو اسلامی حکومت کا فریضہ اقامتِ قسط ادا کرنے کی کوشش کی اور نہ وہ مغربی سرمایہ داری کی طرح غیر جانبداری کے مقام پر رہ سکی۔ وہ جانبداری کے مقام پر آئی اور اپنی پالیسیوں کے لحاظ سے اس کی جانبداری بھی کمزور اور محنت کش عوام کے حصے میں نہیں آئی بلکہ مضبوط سرمایہ دار طبقے کے پلڑے میں جا پڑی۔ اور اس حالت میں کئی سال گزر گئے اور معاشرہ اسلامی نظامِ قسط کی طرف پیش قدمی کرنے کے بجائے اس سے دور ہوتا چلا گیا۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا حکومت کو جبکہ اس کے کارپردازوں کو صورتِ حالات کی غیر عادلانہ نوعیت کا احساس ہو جائے، یا جبکہ ایسا احساس رکھنے والے لوگ ایوانوں اور عہدوں پر کام کرنے لگیں، موجودہ جانبداری چھوڑ کر محض غیر جانبدار بن جانا چاہیے۔ میرا جواب یہ ہے کہ ہرگز نہیں۔ بلکہ جہاں حکومت کی مداخلت سے ناہمواریاں غیر معمولی حد تک بڑھ گئی ہوں، وہاں انہیں ختم کرنے کے لیے حکومت کو کمزور طبقوں کی حمایت میں مداخلت کرنی چاہیے۔

مگر یہ مداخلت اندھا دھند نہ ہونی چاہیے بلکہ اسلامی اصولوں اور قانونِ شریعت کے تابع ہو کر رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے نظائر سے استفادہ کرتے ہوئے ہونی چاہیے۔

غیر معمولی حالات کے لیے عملی تدابیر

یہاں تک ہم نے ان اشارات میں ان اصولی حقائق کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے جن سے اسلام کی میزانی حکمتِ معیشت ترکیب پاتی ہے۔ اب ہم موضوع کے نہایت ضروری حصے کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یعنی موجودہ غیر معمولی قسم کے اقتصادی حالات کی اصلاح کے لیے اسلام کے کن کن اصولوں کو کس کس طرح روبعمل لایا جا سکتا ہے اور ان سے مؤثر نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔

گو ہم یہ طے کر کے چل رہے ہیں کہ ہمیں ضرورت کے تمام اصول و نظائر اپنے ہی نظامِ تہذیب سے لینے ہیں جس کے مکمل نظام ہونے پر ہم ایمان رکھتے ہیں اور جس کے ساتھ کسی دوسرے متضاد فطرت نظام کے اجزا کو ترکیب دینا اس کے لیے تباہ کن سمجھتے ہیں۔ ہم تقلیدِ اغیار کی راہ کو چھوڑ کر ایجاد و اجتہاد (اصولیات کے دائرے کے اندر رہ کر) کی راہ پر جا رہے ہیں۔ ہم عالمِ بے خودی کو ختم کر کے اپنی خودی کو بیدار کر رہے ہیں۔

اب ان چند وسیع الاثر اصولوں کو پیش کیا جاتا ہے جنہیں اگر حکمت و تدبر کے ساتھ موجودہ حالات کی درستی کے لیے استعمال کیا جائے تو بہت کم عرصہ میں ایک تیز رفتار تدریج کے ساتھ، بغیر معاشرے میں کوئی بڑا تصادم پیدا کیے ہم اقتصادی گتھی کو سلجھا سکتے ہیں۔ ان اصولوں سے کام لیتے ہوئے زیادہ سے زیادہ دو پنج سالہ منصوبوں کے تحت موجودہ ارتکازِ سرمایہ و کاروبار کو توڑ کر دولت اور وسائل کو وسیع حلقوں میں پھیلایا جا سکتا ہے۔ آمدنیوں کے تفاوت اور ملکیتوں کی ناہمواریوں کو فطری اعتدال کی حد پر لایا جا سکتا ہے۔

اصولِ محاسبہ

اسلامی شریعت کا اصولِ محاسبہ سب سے پہلے سرکاری افسروں پر استعمال ہوا، اور اس استعمال کا آغاز عہدِ نبوی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) ہی میں ہو گیا تھا۔ اصولِ محاسبہ کی اساس اس دینی حقیقت پر مبنی تھی کہ مناصبِ حکومت [illegible]

امانت ہیں (انها امانة وانها في الآخرة خزي وندامة الا من ادا بحقها) حضور علیہ السلام کے دور سعادت میں یوں تو ہر قسم کی خدمات انجام دینے والوں کو کسی کام پر مامور یا کسی مہم پر روانہ کرتے ہوئے ضروری ہدایات دی جاتی تھیں اور واپسی پر ان کو اپنے کام کی رپورٹ دینا ہوتی تھی جیسے واقعہ نخلہ میں ہوا۔ اور جب کبھی کوئی غلط پہلو سامنے آتا تو اس پر گرفت کی جاتی اور اگر معاملہ تلافی کا تقاضا کرتا تو اس کی تلافی کی صورت اختیار کی جاتی۔ لیکن خاص طور پر جب محکمہ زکوٰۃ برسرِ عمل آگیا جو اسلامی نظام مالیات کا نہایت ہی اہم شعبہ تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس محکمے کے تحصیلداروں اور ان کے ماتحت کارکنوں سے کام کی تفاصیل اور پورے پورے حسابات دریافت کرتے۔ اسی سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان رقوم یا اشیاء کے بارے میں گرفت کی جو بعض اصحاب کو زکوٰۃ کے حسابات سے الگ بعض لوگوں سے بطور ہدیہ وصول ہوئی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ناپسندیدہ و ناجائز قرار دیا۔ اس سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی روشنی میں خلیفہ ثانی نے اپنے ماتحت گورنروں اور حکام پر بڑی کڑی نظر رکھی۔ وہ اپنے عاملوں کی متروکہ آمدنیوں کا حساب پیشِ نظر رکھتے۔ اور اس سے اگر کسی کا اندوختہ زائد نکلتا تو بحق بیت المال ضبط کر لیتے۔[1]

اور پھر جب خلافت راشدہ کے بعد ملوکیت کا دور آیا تو عجمی طرز کی بادشاہت نے ملت کے بیت المال کے ساتھ تو جو کچھ کیا سو کیا، رعایا پر اکراہ اور ان کے اموال کے غصب کرنے کے واقعات بکثرت ہوئے یہاں تک کہ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے بقول امت کی دولت کا نصف یا ⅔ آل مروان کے ہاتھوں میں سمٹ گیا۔ یوں گویا اس طرح کا غیر معمولی اقتصادی ارتکاز ثمر دار ہوا جو موجودہ دور کے لحاظ سے آج ہمارے سامنے ہے۔ اور اس کا علاج کرنے کے لیے حضرت عمر بن عبد العزیز رحؒ نے بھی اسی اصول محاسبہ کو تازہ کیا اور سب سے پہلے اپنے اوپر نافذ کرنے کے بعد اسے شاہی خاندان اور درباری طبقے اور افسران حکومت کے اوپر نافذ کیا۔ مغصوبہ اموال اور جائدادوں کے مستغیث ان کے سامنے آتے اور وہ بڑے بڑے فرد متعلقہ سے پوچھتے کہ اس کے پاس ملکیت کی کیا سند ہے۔ وہ لوگ سابق بادشاہوں کے باقاعدہ سرکاری احکام نکال کے دکھاتے لیکن جب وہ احکام غصب ثابت ہو جاتے تو عمر بن عبد العزیز ان کو منسوخ کر کے مغصوبہ اموال و املاک کو واگذار کر کے یا تو حقدار مستغیث کو سونپ دیتے یا اگر مال بیت المال کا ہوتا تو بیت المال میں لے لیتے۔[2] جن عمال کے منہ کو ناجائز کمائیوں کا خون سابق بادشاہوں کے دور میں لگ چکا تھا وہ چونکہ امیر المومنین کی ان سنگین کارروائیوں میں روڑا ثابت ہوتے تھے لہٰذا آپ نے ایسے کئی گورنر اور عمال برطرف کر دیئے۔

البتہ اس سلسلے میں یہ بات سامنے رہے کہ فقہ کا اصول یہ ہے کہ الاصل براءۃ الذمم اصول محاسبہ کی رو سے ناجائز ملکیتوں کی تحقیق تو ضرور ہوگی لیکن یہ مان کر نہیں کہ سب ناجائز ہیں بلکہ اس بنیاد پر کہ جس ملکیت کے بارے میں اس کا ناجائز ہونا ثابت ہو جائے خواہ حکومت کے دعویٰ پر یا کسی مظلوم کے دعویٰ پر تو وہ تحقیق کے بعد حق دار کو پہنچا دی جائے گی۔

اب آیئے اور اسی اصول محاسبہ کو وہاں سے اٹھا کے آج کے دور میں لے آیئے۔ آج کے اقتصادی اور صنعتی نظام میں کلاسیکل دور سرمایہ داری

---

[1] حضرت عمرو بن عاص والی مصر کے مال میں ایک بار آدھا مال آپ نے ضبط کر لیا۔ اسی طرح حضرت ابو ہریرہ والی بحرین کے مال کی ضبطی عمل میں آئی اور ایسا ہی معاملہ حضرت سعد بن ابی وقاص کے ساتھ ہوا۔

[2] حتیٰ کہ ایک ذمی مستغیث کی مغصوبہ جائداد عباس بن ولید بن عبد الملک سے واگذار کرا کے دی حالانکہ شاہی خاندانوں کے اس معزز آدمی کے پاس ولید کی عطا کردہ سند ملکیت موجود تھی لیکن وہ مبنی بر غصب تھی آپ نے شاہ کے حکم کے مقابلے میں اسے منسوخ کر دیا۔

(سیرت عمر بن عبد العزیز از عبد السلام ندوی۔ باب اموال مغصوبہ کی واپسی)

کی طرح ادارۂ حکومت بے تعلق اور غیر جانبدار نہیں ہے بلکہ منصوبہ بندی، درآمدی و برآمدی پالیسی کی تشکیل اور اس کے لیے لائسنسوں کے اجرا، عوام کے اور قومی سرمایہ میں سے صنعت کاروں اور تاجروں کے لیے قرضوں کی فراہمی، کارخانوں کے لیے مشینری کی درآمد کی سہولتوں کی بہم رسانی، ترسیلات ملکی کے لیے پرمٹوں کے اجرا اور صنعتوں کے لیے تحفظات اور ٹیکس سے استثنا کی پالیسیوں نے اسے صنعتی و تجارتی نظام میں اتنا زیادہ دخیل بنا دیا ہے کہ خود وہ اقتصادی ارتکاز کی تیز رفتاری کا بہت بڑا سبب بن گئی ہے۔

لہٰذا اصول محاسبہ کا آج اگر استعمال ہوگا تو دو طرفہ۔ یعنی یہ کہ ایک طرف ان تمام حکام و عمال کی کارگزاری کا جائزہ لینا ہوگا جنھوں نے اہل سرمایہ و محنت کے متعلق پالیسیاں اور قوانین بنائے اور ان کے تحت ان کی سرپرستی کی ایسے اختیارات حاصل کیے جن کے ذریعے وہ جس راہ پر چاہیں چلیں جو چاہیں کر گزریں اور راتوں رات امیر کبیر بن جائیں۔ دوسری طرف اصول محاسبہ کا اطلاق اہل سرمایہ دکاندار پر بھی ہوگا چاہیے کہ کس نے کہاں سے سرمایہ حاصل کیا؟ قومی دولت میں سے کتنا حصہ قرض لیا؟ کس نے کس استحقاق سے کوئی لائسنس یا پرمٹ حاصل کیا؟ کسی اقتصادی معاملے میں کوئی سیاسی سوداگری تو شامل نہیں ہے؟ نیز کسی نے کس شرح سے منافع کمایا؟ کس حساب سے مزدوریاں دیں اور کس معیار سے مصنوعات یا مال تجارت کی قیمتیں مقرر کیں۔ اور آج نہیں تو کل دیکھنا یہ بھی ہوگا کہ متذکرہ دونوں فریقوں نے ملی بھگت سے کیا کچھ صریحاً ناجائز استعمال کیا؟ ——— اور وہ بھی اپنی ہی قوم سے!

اس دور کی وسعتوں کے لحاظ سے اتنا بڑا کام کسی ایک فرد کے بس کا نہیں ہے۔ اس کے لیے کئی کمیشن بٹھانے کی ضرورت ہوگی جو بڑے پیمانے کے ایک ایک کاروبار کی چھان بین کریں۔

اسلامی اصولوں پر اصلاح احوال کا کوئی موثر اور بڑا کام اس اولین اصول ——— یعنی اصول محاسبہ ——— کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔

اصولِ تلافی

اوپر ہم نے خلیفۂ ثانی اور سیدنا عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے محاسبہ کا تذکرہ کیا تو ان واقعات میں جو دوسرا اصول مضمر تھا وہ تھا اصول تلافی۔ اصولِ تلافی اگر کام نہ کرے تو پھر اصولِ محاسبہ بے کار ہے۔ پھر وہ ایک کاغذی کارروائی ہوگی۔ اصولِ محاسبہ سے اگر کسی سرمایہ یا منافع یا کسی سہولت و تحفظ یا لائسنس یا پرمٹ کے ناجائز حصول یا استعمال کا ثبوت مل جائے تو ایسے ضرر رساں فعل کی تلافی ہونی چاہیے۔ اگر کسی فرد یا ادارے کی حق ماری ہوئی ہو تو اُسے اس کا حق ملنا چاہیے اور اگر قوم یا اس کے عوام کی مجموعی حق ماری ہوئی ہو تو پھر ایسے اموال و املاک کو قومی خزانے میں جانا چاہیے۔[1]

اصول محاسبہ کے ساتھ اگر اصولِ تلافی ٹھیک سے کام کرے تو پھر اس بات کی ضرورت نہیں رہتی کہ لوگوں سے اندھا دھند ان کے سرمائے یا کاروبار چھین کر اجتماعی ملکیت میں لا ڈالے جائیں بلکہ اسی سے اتنی چھانٹی ہو سکتی ہے کہ حالات نارمل ہو جائیں اور پھر اسلام کے نارمل اوامر و نواہی معاشی ناہمواریوں کو نہ بڑھنے دیں اور سارا جاتا دیکھیے تو آدھا دیجیے بانٹ کے محاورے کے مطابق سرمایہ دار طبقے کے لیے بھی یہ صورت قومی ملکیت یا اشتراکی انقلاب سے زیادہ قابل قبول ہوگی۔

---

[1] اس اصول تلافی کے مفہوم کی وضاحت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز نے آل مروان کو جمع کر کے فرمایا کہ تمہارے پاس امت کی نصف یا دو تہائی دولت جمع ہو گئی ہے۔ تم اسے حق داروں کے حوالے کر دو ورنہ میں کارروائی کروں گا۔ اور آج اگر تم عوام کو اس کے مزاحمت کرو گے تو جب بھی مجھے موقع ملے گا میں اس ناجائز طور پر حاصل کردہ دولت کو تمہارے قبضے سے نکال کر عوام کے سپرد کر دوں گا مگر انتخاب کا عمر نے اس کام کی تکمیل کے لیے وفا نہ کی۔

اور جس دن اصولِ محاسبہ اور اصولِ تلافی کو ہم اپنے مسلمہ نظائر کی روشنی میں جامۂ عمل پہنا لیں گے، اس کے بعد پھر کسی کو جرأت نہ ہوگی کہ وہ غلط راستوں سے کوئی فائدہ اٹھائے یا کسی کو فائدہ پہنچائے۔

اصولِ تحدید ہم اسلامی حکمتِ اقتصادیات کے ابتدائی نکات میں یہ اصول بیان کر آئے ہیں کہ افادیتِ عامہ کو اولیت دے کر اور اس کا تحفظ کرتے ہوئے کسی فرد کو کن حدود کے اندر انفرادی نفع کی گنجائش دی جا سکتی ہے۔ اس مقصد کے لیے ہمارے ہاں اصولِ تحدید Limitation پایا جاتا ہے جو فرد کی آزادی کو وہ معنی اختیار نہیں کرنے دیتا جو اسے "کھلا چھوڑ دو" (Laissez Faire) کے قدیم مغربی اصول نے دیئے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ عام حالات میں تو اسلام کے عمومی احکام اور تحدید کے ضابطے غیر فطری عدم مساوات پیدا ہی نہیں ہونے دیتے۔ اور اگر کہیں دولت جمع ہوتی ہے تو اس کو منتشر کرنے کے عوامل آپ سے آپ کارفرما ہو جاتے ہیں لیکن غیر معمولی حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ضرورت کی حد تک اصولِ تحدید مقدار کو خاصے بڑے پیمانے پر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ کسی بڑے مفسدہ کو روکنے کے لیے مباحات ہی نہیں مستحبات تک پر پابندیاں لگائی جا سکتی ہیں جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے برتنوں کے استعمال سے وقتی طور پر روک دیا تھا یا زیارتِ قبور سے منع فرما دیا تھا لیکن جب مفسدہ کا خطرہ باقی نہ رہا تو ان مستحبات کی اجازت دے دی گئی۔

ذرا دورِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ایک مسنون اصولی نظیر کو سامنے رکھیے۔

مہروز نامی نالہ کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اصولی حکم دیا (جو پانی کے غیر ذاتی اور قدرتی ذرائع آبپاشی پر بھی حاوی ہے) کہ "اس کو روک لیا جائے، یہاں تک کہ ٹخنوں تک کھیت بھر جائے، پھر اوپر والا نیچے والے کے لیے پانی چھوڑ دے"۔

اسی کی موید دوسری نظیر ہے کہ پانی کے نزاع کے سلسلے میں آپؐ نے جناب زبیرؓ سے فرمایا کہ "اے زبیر! تو پانی دے، پھر اس کو روک، یہاں تک کہ پانی دیواروں کی جڑوں تک (بعض کھیتیاں ایسی تھیں جن کے گرد دیواریں بنائی جاتی تھیں) پہنچ جائے پھر اپنے پڑوسی کی طرف پانی چھوڑ دے۔"

سرمایہ و دولت کا معاملہ غالباً نالے کے پانی سے زیادہ اہم اور وسیع الاثر ہے۔ اگر وہاں افادیتِ عامہ کے لیے تحدید کا قانون چلا تو کیا وجہ ہے کہ یہاں وہی قانونِ تحدید کام نہ کرے؟ خیال رہے کہ اس معاملہ میں افادیتِ عامہ اور اس کے تقاضوں کا دائرہ زیادہ وسیع ہے اور یہاں انفرادی ارتکاز نالے کا پانی روکنے سے زیادہ ضرر رساں ہے۔

اصولِ تحدید ہی کا وسیع تر پیمانے پر یہ استعمال بھی ہوا کہ دورِ قحط میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے باقاعدہ حساب لگا کر ایک ایک فرد کے لیے راشن معین کیا اور تحریری صک (راشن کارڈ) جاری کیے۔ ورنہ عام اسلامی اصولوں کے تحت ہر شخص کو آزادی ہے کہ جتنا چاہے خریدے اور کھائے۔

اسی طرح ایک تاجر کو اسلامی قانون افادیتِ عامہ کے تحت احتکار سے روکتا ہے۔ (جناس ضرور بیلاد رتنے تجربے کے مطابق وہ لوگ) کا احتکار اتنی بڑی مصیبت عوام کے لیے پیدا کرتا ہے اس سے کئی گنا زیادہ بڑی مصیبت ارتکازِ سرمایہ پیدا کرتا ہے۔ پس قیاس اور استحسان کی رو سے یہاں بھی اسی طرح تحدید لگنی چاہیے۔

اب میں تحدید کی بعض ایسی صورتیں کو صرف اشارۃً بیان کرتا ہوں جو انسدادِ ارتکاز کا ذریعہ ہو سکتی ہیں۔[1]

---

[1] اس گفتگو کو چھیڑتے ہوئے میں یہ وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا منشا یہاں محض بعض خطوطِ فکر کو ابھار دینا ہے، نہ کہ قطعی رائے دینا یا اجتہاد کرنا۔ میرے اشارات بطور مشورہ ہی پیش ہیں اور بلا شبہ استصواب بھی۔ آگے کرنے کا کام یہ ہے کہ مستند علمائے ملت جو جدید علوم و مسائل پر بھی نظر رکھتے ہوں (باقی اگلے صفحہ پر)

۱۔ سرمایہ کاری پر تحدید کی صورت یہ ہے کہ ایک فرد (یا مشترکہ کفالت کے ایک خاندان کے افراد) کے لیے ایک حد مقرر کر دی جائے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اتنا سرمایہ کاروبار میں لگا سکتے ہیں۔ مثلاً شخص واحد کے لیے ایک یا چند لاکھ روپیہ کی حد رکھی جا سکتی ہے

۲۔ کمپنیوں کی تشکیل کے بارے میں یہ تحدید کی جا سکتی ہے کہ کوئی ایک شخص (مثلاً تین سے زیادہ فرموں کا ڈائرکٹر یا حصہ دار نہیں ہو سکتا۔

۳۔ اسی طرح اسراف کی روک تھام کو بھی اگر ملحوظ رکھا جائے تو شخصی املاک کی تحدید بھی کی جا سکتی ہے کہ (مثلاً) کوئی فرد واحد (مع زیرِ کفالت افراد کے) ایک یا چند لاکھ روپیہ سے زاید کی جائیداد یا دولت اپنے تصرف میں نہیں رکھ سکتا۔ وہ چاہے تو بقیہ اموال کو صدقہ کرے، چاہے تو وقف قرار دے، چاہے تو رفاہی ادارات میں صرف کر دے اور چاہے تو قومی خزانہ کو تفویض کر دے۔

۴۔ آج سکنی مکانات کا مسئلہ جس درجہ پیچیدہ ہو رہا ہے۔ افادیت عامہ کے نقطۂ نظر سے اس کو حل کرنے کے لیے کیوں نہ ذیل کی دو تحدیدیں اختیار کی جائیں ایک یہ کہ آئندہ کوئی شخص ایک خاص مقدار زمین (مثلاً دو کنال) سے زائد ذاتی عمارت سازی کے لیے استعمال نہیں کر سکتا (ہم کاروباری عمارات کو مستثنیٰ رکھتے ہیں)

نیز بغیر کسی کی ملکیت سلب کیے قلت مکانات کے مسئلے کے عملی حل کی یہ صورت اختیار کی جائے کہ ۱ تا ۳، ۴ تا ۶ اور ۷ تا ۱۰ افراد کے کنبے اتنے اتنے کمروں کے مکان زیرِ استعمال رکھ سکتے ہیں۔ وہ اگر زیادہ وسیع عمارت رکھتے ہوں تو ظاہر بات ہے کہ انہیں زائد حصہ لازماً کرائے پر دینا ہوگا۔

۵۔ ہماری غریب قوم سعی ترقی کے جس مرحلے میں ہے اور جن مشکلات سے دوچار ہے، ان کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اس ملک میں بڑی سے بڑی تنخواہ کا ایک منصفانہ معیار مقرر کر دیا جائے (مثلاً دو ہزار روپے) کہ اس سے زائد کسی بڑے سے بڑے عہدہ دار کو کچھ نہیں دیا جا سکتا۔

اصول ازالۂ اکراہ

"اکراہ" اسلامی قانون کا ایک اہم اور وسیع موضوع ہے۔ ائمہ فقہا کی اجتہادی آرا بعض تفصیلی صورتوں میں جزوی طور پر مختلف ہونے کے باوجود اس اصولی حقیقت پر ہم آہنگ ہیں کہ کسی فرد یا ادارے کا (چاہے وہ حکومت وقت ہو) کسی فریق سے اکراہ کے ذریعے کوئی معاملہ کرنا، اُس سے اس کے ضمیر کے خلاف کسی بات کا اقرار کرانا (خواہ وہ بیعت یا طلاق کا معاملہ ہو) اُس سے کوئی حق حاصل کرنا یا اُس کی کسی ملک کو اُس سے چھین لینا بروئے شریعت ناجائز اور ظالمانہ حرکت ہے۔ اکراہ کا ایک نتیجہ عظیم غصب ہے۔ یعنی کسی طرح کا دباؤ ڈال کر دوسرے کو اس طرح بے بس کر دینا کہ اس سے زمین، جائداد، مکان، باغ، یا کوئی اور چیز سلب کر لی جائے۔ اس اکراہ کی خطرناک ترین صورت وہ ہوتی ہے جبکہ خود حکومت (یا حکمران فرد یا افسران) اپنی رعایا کے خلاف اکراہ کا حربہ استعمال کرنے لگیں، اور اس کے لیے شاہی اختیارات کے بل پر قوانین، احکام اور فرامین کا اجرا کرنے لگیں یعنی وہی چیز جسے روکنے کے لیے حکومت کا قیام مطلوب تھا، خود حکومت کے ہاتھوں انجام پانے لگے تو پھر ع

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اسلام پسند ماہرین اقتصادیات کو مناسب ہے کہ مشاورتی کانفرنسیں بھی منعقد کریں، علمی تحقیق کے کاموں کا آغاز بھی کریں اور پھر متفق علیہ اجتہادی فیصلے بھی دیں۔ اگر اہلِ وطن تمام فرقوں کے علما ل کر اسلامی ہونے کے متعلق متفق علیہ اصول طے کر کے دے سکتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ وہ اب ۶۸-۱۹۶۷ء میں اقتصادی مسائل کے اسلامی اصول کو جدید اجتہادی پیرائے میں نہ لا سکیں۔ البتہ اس پیچیدہ علم (جو آج کل وسیع ادارے پر جاری ہے) کے دائرے میں صحیح نتیجوں تک پہنچنے میں مالیات و اقتصادیات کے جدید ماہرین کا تعاون بے حد ضروری ہے (ن ص)

"اقربا میرے کریں خون کا دعویٰ کس پر"

بات دور نکلتی جا رہی ہے۔ قابل غور یہ حقیقت ہے کہ دورِ حاضر میں جبکہ اقتصادی مفاد نے اہمیت اختیار کر کے سیاسی اقتدار کے ساتھ "من تو شدم تو من شدی" کا رشتہ قائم کر لیا ہے۔ اکراہ کا بہت بڑا میدان معاشی شعبۂ زندگی میں پیدا ہو گیا ہے، اور اب اقتصادی اکراہ کے لیے جس کی مختلف صورتیں اور راستے ہیں، ہمارے علماء اور فقہاء کو اجتہادی کاوشوں کے ذریعہ فقہ کا ایک نیا باب مرتب کرنا چاہیے۔ اقتصادی اکراہ کی چند پیش افتادہ صورتیں یہ ہیں:-

۱۔ مفلوک الحال آبادی کی کثرت کی بنا پر سرمایہ دار کاروباری طبقوں کا مزدوروں کے لیے ایسی صریحاً غیر منصفانہ اجرتیں اور شرائط کار مقرر کر دینا کہ جن کو اگر آدمی ناپسند کریں تو بے روزگاری اور بھوک کے مارے ہوئے ۵۰ اور آ موجود ہوں اور ناک رگڑ کے اپنی محنتیں بیچ دیں۔

۲۔ محنت کار اگر کسی زیادتی کے خلاف آواز اٹھائیں یا کوئی مطالبات پیش کریں تو بے قید اختیارات سے کام لے کر مستاجر ان کو برطرف کر دے اور پھر ایسے واقعات سے عبرت پذیر ہو کر بقیہ مظلوم کبھی زبان کھولنے کی جرأت نہ کریں۔

۳۔ اپنی سرمایہ دارانہ قوت کو مضبوط تر کرنے کے لیے مستاجرین کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ خود یا ان کے معتمدین سیاسی قوت میں بھی دخیل ہوں۔ اس مقصد کے لیے غیر انتخابی راستے بھی استعمال ہوتے ہیں، مگر جب کبھی انتخابی راستوں کو استعمال کرنے کا موقع آتا ہے تو اسی طریق اکراہ سے یہ طبقہ اپنے مزدوروں سے ان کے ضمیروں کے خلاف ووٹ حاصل کرتا ہے اور اگر کوئی سرتابی کرنا چاہے تو برطرفی کا خطرہ اسے سامنے دکھائی دیتا ہے۔

۴۔ مستاجر طبقہ ایک طرف براہِ راست خود سیاسی مناصب تک پہنچتا ہے، دوسری طرف اپنے معتمد آلہ کاروں کو ایوانِ اقتدار میں داخل کراتا ہے اور تیسری طرف وہ "ولا تدلوا بها الی الحکام" کی پوری پوری خلاف ورزی کر کے اپنی مالی قوت سے اہل جاہ اور اہل کار طبقوں کو مسخر کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اول تو اقتصادی و صنعتی معاملات سے متعلق قانون سازی اور پالیسی میکنگ اس کے مفاد کے خلاف نہیں جاتی، اور اگر کچھ اجزا اس کے لیے ناپسندیدہ بھی ہوں تو ان کے بدل میں قانون اور پالیسیوں کے اندر بے شمار رخنے موجود رہتے ہیں (اور رکھے اور رکھوائے جاتے ہیں) جن سے ایک غلط کار عنصر خوب فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اس سے بھی آگے اگر حالات تقاضا کریں تو رشوت کے ذریعے جس کی بڑی بڑی خوش آہنگ اور معصوم اشکال پیدا کر لی گئی ہیں، قانون کے تقاضوں کو روبعمل لانے والی مشینری یا اس کے بعض پرزوں کو مسخر کر لیا جاتا ہے۔

یہ ایسا وسیع طلسم ہے کہ جس میں گھر کر سادہ دل، غیر خواندہ یا کم خواندہ، بھوک کا مارا ہوا، زندگی کے مطالبوں کی چکی میں پسا ہوا محنت کش بے بس ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ وسیع نظام اکراہ جو کچھ بھی کرتا رہے، وہ سوائے اسے بھگتنے کے اور کچھ کر نہیں سکتا۔ یہ گویا قلیل اجرتوں پر دوسروں کی محنت غصب کرنے اور اس حق ماری کے بل پر بھاری منافع حاصل کرنے کا راستہ ہے۔

اس طلسماتی نظام اکراہ کو اگر آپ پوری طرح زیر نگاہ لائیں تو پھر اندازہ ہو گا کہ کرخندار صرف ایک کاروباری شخص نہیں ہے بلکہ وہ فی الحقیقت اپنی جگہ ایک چھوٹی سی ریاست کا سلطان (Sovereign) ہے جس کے قبضے میں کثیر التعداد رعیت کا ایک گلہ ہے جنہیں وہ حسب منشا استعمال کر سکتا ہے۔

اقتصادی نظام کی اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ اس طلسم اکراہ کو توڑ ڈالا جائے اور اس کے لیے نہایت مؤثر قانونی تدابیر (جن میں سے بیشتر دنیا میں زیر تجربہ آ کر مفید ثابت ہوتی ہیں) اختیار کی جائیں۔ مثلاً مزدوروں کی کم سے کم اجرتوں کا تعین (یہ کام شروع تو ہوا مگر برائے نام حد تک اور قلیل الاثر نتائج کے ساتھ) تقاضائے صحت کے مطابق اوقات کارکردگی کا تعین (موجودہ مقدار اوقات نظر ثانی کی مقتضی ہے) اور ایسی شرائط کار اور قواعدِ اجراء کا تعین جو محنت کار کو روزگار کا تحفظ دینے والے ہوں۔ یہاں اس سے زیادہ تفصیل کا موقع نہیں۔

ایک مناسب تدبیر یہ ہے کہ کوئی ایسا ادارہ وجود میں لایا جائے جو ان تمام معاملات کی نگرانی کرے، محنت کاروں کی مشکلات و شکایات کو سمجھے نیز جو ایسا نظام رکھتا ہو کہ کسی مزدور یا ملازم کو کسی کارخانے یا کاروباری ادارے سے (کم سے کم بڑے پیمانے کے اداروں سے) نکالنے کے لیے مالکان یا انتظامیہ کو پورے کوائف کے ساتھ رپورٹ دے کر منظوری حاصل کرنی پڑے اور اس کارروائی میں متعلقہ محنت کار کو بھی وضاحت و جواب دہی کا حق حاصل ہو۔

اصول حجر

بعض مالکان کے املاک یا کاروبار پر حجر عاید کرنے کا قانون بھی اسلامی شریعت کا ایک اہم قانون ہے جس کی بنیاد سورۂ نساء کی مشہور آیت (وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ ..... الخ) پر ہے۔ اس کا اولین اطلاق یتیموں، نابالغوں اور فاتر العقل لوگوں پر ہوتا ہے کہ ان کے املاک پر قانون حجر لاگو کر دیا جائے اور وہ کسی ذمہ دار ولی یا قاضی یا حکومت کی نگرانی میں رہیں اور اصلی مالکان اس وقت تک بیع و شری یا کسی دوسری طرح کا تصرف اس میں نہ کر سکیں جب تک کہ وہ حالت عقل و تمیز سے بہرہ مند نہ ہو جائیں۔ قانون حجر کا اطلاق کسی شخص کے خلاف اس کے قرض خواہ کے مطالبے پر بھی ہو سکتا ہے کہ جب تک اس میں سے قرض ادا نہ ہو جائے جائداد یا کاروبار کو نہ بیچا جائے اور نہ اس کے منافع یا پیداوار کو کسی دوسرے مصرف میں (ماسوائے کفالت مالک کے) لایا جائے۔

جہاں تک نابالغوں کا تعلق ہے لفظ سفہاء پر غور کر کے فقہا نے مختلف رائیں قائم کی ہیں۔ مثلاً حضرت امام ابو حنیفہ سیدھے سیدھے یہ رائے دیتے ہیں کہ نابالغ یتامیٰ یا زیر کفالت بچے جب ۲۵ برس کی عمر کو پہنچ جائیں تو ان کے اموال ان کے حوالے کر دیے جائیں۔ مگر آپ ہی کے شاگرد ہوتے ہوئے صاحبین (امام ابو یوسف اور امام محمد شیبانی) سفاہت کے مقابلے میں حالت رشد (خوش سلیقگی) کے نمودار ہونے کو لازم قرار دیتے ہیں، یہ ۲۵ برس میں ظاہر ہو یا اس سے پہلے یا اس کے کئی برس بعد (اور ہو سکتا ہے کسی بیچارے کی ساری عمر یہ مرحلہ نہ آئے)

اب ذرا اور آگے چلیے:

متعدد فقہا اس طرف گئے ہیں کہ اگر کوئی شخص قوی طور پر عاقل و بالغ ہوتے ہوئے اپنی دولت کو عیش و عشرت میں اڑا رہا ہو (ظاہر ہے کہ وہ اپنے مالی و اخلاقی نقصان کے علاوہ معاشرے کے لیے بھی موجبات ضرر پیدا کرتا ہے) تو وہ حقیقت میں مقام سفاہت پر ہے۔ مثلاً امام شافعی اسی نقطۂ نظر کو پیش کرتے ہیں (ہدایہ کتاب الحجر)

ذرا اس سے بھی آگے چلیے:

فقہائے سلف کے ہاں یہ رائے بھی پائی جاتی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی نیک کام میں بھی غیر ضروری طور پر (حد اعتدال سے تجاوز کر کے اور دوسرے واجب الادا حقوق کو نظر انداز کر کے) اپنا سارا مال لاپروائی سے لٹا رہا ہو تو اس پر بھی حجر عاید کیا جا سکتا ہے۔

فقہائے حق اندیش کی ان تفاسیر اور اجتہادات پر غور کرنے کے بعد ذہن فوراً ان مالداروں کی طرف منتقل ہوتا ہے جو اپنے اموال سے جاری کردہ وسیع کاروباروں کو محض اسراف کا نہیں، خدا کے بندوں پر ظلم کرنے کا ذریعہ بناتے ہیں اور اپنے ارتکازی عمل سے پورے معاشرے کو بدحالی اور مصیبت کا شکار بناتے ہیں یہ وہ اگر اپنے ذاتی مقاصد کے لیے صاحب خرد بھی ہوں تو بھی اجتماعیت کے لیے وہ مقام سفاہت پر ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اس طبقے کے بگڑے ہوئے اور حد سے تجاوز کرنے والے [illegible] پر قانون حجر کا اطلاق کیوں نہیں ہو سکتا؛ کیوں نہ حکومت ان کے اموال و کاروبار کو ۵ یا ۱۰ برس کے لیے کسی مناسب اہل اور غیر جانب دار ادارہ کی تحویل میں دے دے کہ وہ سے صحیح ترین خطوط پر چلانے کا ذریعہ لانے کے بعد مالکان کو واپس تفویض کریں۔

میرے نزدیک کاروبار اور صنعت کے دائرے میں ظلم اور استحصال کو روکنے کے لیے اگر اس قانون کو مناسب اجتہادی صورت دی جائے تو

محض اس تو ار کا سروں پر لٹکتے رہنا ہی اس مقصد کے حصول کا ذریعہ بن جائے گا کہ اہل سرمایہ اور اہل صنعت اور اہل کاروبار از خود عوام اور خدمتِ عوام کی راہ اختیار کریں۔

اصولِ وقف

اسلامی شریعت نے ہمیں وقف کا ایک ایسا عظیم الشان اور وسیع الاثر اصول عطا کیا ہے جسے گزشتہ تاریخ میں سلاطین نے بھی اور مالدار افراد نے بھی بڑی کثیر شکلوں میں وسیع پیمانے پر استعمال کیا ہے۔ اور جس قوم کے پاس ایسا یہ اصول موجود ہوا سے کسی طرف سائلانہ نگاہ سے دیکھنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔

سرکاری اہتمام سے وقف برائے عوام کی بہت بڑی نظیر وہ ہے جو عراق کی زمینوں کے متعلق حضرت عمرؓ نے قائم فرمائی اور اس کے لیے براہ راست قرآن سے استدلال کیا جب کہیں جا کر لمبی بحث کے بعد وہ اپنی مجلس شوریٰ کو اپنا ہم خیال بنا سکے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ان زمینوں کو ان کے سابق مالکان ہی کی تحویل میں رہنے دیا گیا۔ ان کا قبضہ تبدیل نہیں کیا گیا۔ انہیں قومی ملکیت میں لے کر کمیون نہیں بنائے گئے حتیٰ کہ سابق مالکان کو بیع و شریٰ کے حقوق بھی حاصل رہے۔ وقف کے اصول کا اطلاق اصل زمینوں کے بجائے اُن کی اس پیداوار پر کیا گیا جسے بطور خراج اسلامی حکومت کے خزانے میں داخل ہونا تھا۔

اب ذرا اس نظیر کو سامنے رکھ کر موجودہ حالات میں اس اصول کے اطلاق کے لیے اجتہادی راستے تلاش کیجیے جو وہی نتیجہ دیں جو سیدنا حضرت عمرؓ کے پیش نظر تھا۔ مثلاً کیا ہمارے لیے یہ صورت ممکن نہ ہوتی کہ جو کارخانے بیرونی قرضوں سے ہمارے ہاں قائم ہوئے ہیں یا ایسے ریاستی قرضوں کے بل پر جن میں زراعت پیشہ عوام کا کمایا ہوا زرِ مبادلہ شامل تھا، ان کو افراد کے سپرد کرنے کے بجائے پی آئی ڈی سی یا حکومت اُن کو یا اُن کے منافع کو مزدوروں یا نادار طبقوں یا اعلیٰ تعلیم سے محروم رہنے والے غریب طلبہ کے لیے وقف قرار دے دیتی!

اسی طرح زمینوں اور بعض دوسرے اداروں کے متعلق نئے راستے نکالے جا سکتے ہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ آج ہم وہ دماغ کہاں سے لائیں جو اغیار کی قائم کردہ مثالوں کے قفس سے باہر نکل کر سوچ سکیں اور کوئی نیا تجربہ کر سکیں۔

اصولِ کفالت

یہ اصول عام حالات کے لیے بھی ضروری ہے مگر زیادہ خراب حالات کو رُو بہ اصلاح لانے کے لیے اور بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ اسے میں معاشی ناہمواریوں کے اسلامی حل میں بیان کر چکا ہوں۔ یہاں صرف تین اصولی باتوں کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔

ایک یہ کہ سب سے نچلی آمدنی کے لوگ جن میں غیر فنی مزدور اور درجہ چہارم کے ملازمین شامل ہیں، ان کو سب سے پہلے پیش نظر رکھ کر اسلامی اصولِ کفالت کے مطابق مروجہ قیمتوں کو سامنے رکھ کر اتنی اجرتوں یا تنخواہوں کی فراہمی لازم کر دی جائے جن سے ایک درمیانہ کنبہ کی بنیادی ضروریات — روٹی، کپڑا، مکان، تعلیم، علاج — پوری ہو سکیں۔

دوسرے یہ کہ جو لوگ مناصبِ قیادت و سیادت پر فائز ہوں اور جو قوم کی نگاہوں میں نمونہ و معیار قرار پائیں، ان کو رضاکارانہ قربانی سے کام لے کر اپنے آپ کو اسی اصولِ معاوضہ پر انحصار کرنا چاہیئے جسے سنت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مطابق خلفائے راشدین نے بعد کی

لہ واضح رہے کہ یہ زمینیں "اموالِ فے" کی نوعیت رکھتی تھیں، اور اموالِ فے کے لیے قرآن و سنت کے ضابطے مخصوص ہیں جن کو اٹھا کر ہم ہر جگہ چسپاں نہیں کر سکتے، خصوصاً انفرادی املاک سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ تصریح اس لیے ضروری معلوم ہوئی کہ ماڈرن اجتہاد نے اس معاملے میں عجیب و غریب نکتے نکالے ہیں۔ (ن ص)

ساری امت کے لیے مثال بنا کے چھوڑتا ہے اور جس کے متعلق خلیفہ اول نے تصریح کر دی تھی کہ آپ قریش کے ایک متوسط الحال آدمی کے برابر
وظیفہ لیں گے وفات سے پہلے وہ بھی واپس کرا دیا، تو سب سے اوپر کے لوگوں کو قوم کے متوسط الحال طبقے کی سطح سے بلند تر آمدنی کی طرف ہرگز نہیں
جانا چاہیئے۔ صرف یہی بات ہے جو قوم میں ایثار پیدا کر سکتا ہے اور جو قیام عدل کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

تیسرے یہ کہ تنخواہوں اور اجرتوں میں تفاوت و تفاضل فطری طور پر ضروری ہے، مگر جب وہ حد اعتدال سے بڑھ جاتا ہے تو معاشرے
کے لیے باعث فساد ہو جاتا ہے۔ یہی حالت جو اس وقت درپیش ہے۔

ویسے اول الذکر تقاضا اگر دیانت داری سے پورا کیا جائے تو مالی حالات کا نقشہ از خود ایسی صورت اختیار کر جاتا ہے کہ تیسرا تقاضا پورا
کیے بغیر گاڑی چل ہی نہیں سکتی۔

اصولِ کفالتِ عامہ

اسلام کے عظیم الشان اقتصادی اصولوں میں سے ایک اصول کفالت عامہ (Public maintenance)
ہے جسے جدید عربی لٹریچر میں تکافل اجتماعی اور انگریزی میں سوشل انشورنس (Social Insurance) یا
سوشل سکیورٹی (Social security) وغیرہ عنوانات سے بیان کیا جاتا ہے۔

اس موضوع پر بھی میں تفصیلاً "معاشی ناہمواریوں کا اسلامی حل" میں اظہار خیال کر چکا ہوں۔
یہاں مجھے اتنا ہی کہنا ہے کہ ایک طرف برطانیہ کا سرمایہ دار ملک ہے جو قوم کی اقتصادی فلاح و بہبود کے اسی اصول کو پر زور طریق سے استعمال
کر رہا ہے، اور بغیر آزادی و جمہوریت کی قربانی دیئے عوام کو معاشی بدحالی میں سہارا دینے کا تجربہ کر رہا ہے۔ دوسری طرف روس ہے جہاں سوشلسٹ
انقلاب کے بے حساب خون خرابے اور سالہا سال کے جبر و تشدد اور عوام کی محرومی جمہوریت کے ساتھ جو کچھ آخری ماحصل ہے وہ بھی یہی کچھ ہے کہ
قومی آمدنی میں سے دوڈھائی فی صد حصہ مزدوروں اور عوام کی بہبود کے کاموں میں صرف ہونے لگا ہے۔

گویا آج تک انسانیت نہ جمہوری سرمایہ دارانہ راستے سے اور نہ انقلابی سوشلزم کے راستے سے اُس سے بہتر کوئی معاشی حل نکال سکی جو اسلام
نے اپنے انوکھے انداز میں پیش کیا کہ غربا و عوام کو معاشی سہارا دینے کے لیے اس نے زکوٰۃ کا مطالبہ بطور عبادت کے واجب کیا اور اسی کا نتیجہ ہے
کہ آج کے گئے گزرے دور میں جبکہ نظام اسلامی کارفرما بھی نہیں ہے، صاحب نصاب مسلمانوں کے ہاتھوں سے ہر سال زکوٰۃ کی اتنی گراں بہا رقم
افراد اور اداروں کی طرف منتقل ہوتی ہے کہ اگر اس کا حساب لگایا جا سکے تو ہم سب حیرت زدہ ہو جائیں۔

اس سلسلے میں اجمال کا تقاضا یہی ہے کہ میں تفصیلات اور واقعاتی مثالیں دیئے بغیر (دورِ نبوت، دورِ خلافت اور دورِ حضرت عمر بن عبدالعزیز
سے مواد اخذ کیا جا سکتا ہے) اس وقت اتنا ہی عرض کرتا ہوں کہ قرآن و حدیث اور اس پر عمل پیرا ہونے والے خلفائے راشدین کی سنت
اور ان کے اقدامات کی رو سے اسلامی حکومت کی اساسی ذمہ داریوں میں یہ ذمہ داری بھی شامل ہے کہ وہ عامۃ الناس (یتیم، بیوائیں، معذور، بے روزگار،
حاجت مند اور بیمار) کو محرومی سے نکالے اور ان کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کا انتظام کرے۔

اس دور کے مسلمان ملکوں میں سے دو ملک ایسے ہیں جہاں کسی نہ کسی شکل میں کفالت عامہ کا ادارہ کام کر رہا ہے۔ ان میں سے ایک کویت ہے دوسرا
مصر۔ ہمارا جذبہ یہ تقاضا کرتا ہے کہ جمہوریۂ اسلامیہ پاکستان کو اس معاملے میں دنیائے اسلام کے اندر پیش پیش ہونا چاہیئے
آج کے حالات میں کفالت اجتماعی کے مختلف شعبے اور دائرے ہو سکتے ہیں، مثلاً ایک دائرہ صنعتی دائرہ ہے۔ کیوں نہ بڑے کارخانوں اور
بڑے کاروباری اداروں کو اس راستے پر ڈالا جائے کہ وہ ملک بھر کی کفالت کی جامع اسکیم کے مطابق اپنے مزدوروں کی آمدنیوں کی کمی پوری کریں اور ان کی

اور ان کے اہل و عیال کی صحت و تعلیم کی ذمہ داریاں اٹھائیں۔

گو یہ نہایت ضروری ہے کہ کفالت اجتماعی کا یہ ادارہ جو بنیادی طور پر زکوٰۃ پر کھڑا ہوتا ہے، دین سے بے نیاز قسم کے سول افسروں کے ہاتھوں نہ چلایا جائے بلکہ اسے چلانے کے لیے الگ دفتری نظام کی ضرورت ہے۔ اور اس دفتری نظام کی نگرانی نہ تو براہ راست حکومت کرے اور نہ اس کے نامزد کردہ کار کنان محکمہ اوقات۔ بلکہ اس مقدس کام کے لیے "انتخابی کمیشن" کی طرح کا ایک آزاد ادارہ ہو بلکہ زیادہ بہتر ہوگا کہ وہ منتخب ادارہ ہو — یا کم سے کم اس کے سربراہ مدینی حلقوں کے الیکٹورل کالج کے واسطے سے منتخب کرایا جائے۔ اس مجلس کے ارکان اور اس کا سربراہ تقرری کے بعد اپنی میعاد کار تک معطلی اور بالائی مداخلت سے مامون ہوں۔

اصلاح و تغیر کا نقشہ کار

میں ایک طرف حکومت کو، دوسری طرف اپوزیشن پارٹیوں کو توجہ دلاتا ہوں کہ وہ ان اصولوں کو نظر کے مشورہ و رہنمائی سے پیش نظر رکھ کر اقتصادی اصلاح و تغیر کا ایک نقشہ کار تیار کریں۔ اس نقشہ کار کو ایک دو منصوبوں میں تقسیم کر دینا چاہیے۔ کچھ اقدامات پہلے مرحلے میں ہو جائیں، کچھ قدم اور آگے چل کر۔

ساتھ ہی میں عوام کو توجہ دلاتا ہوں کہ وہ ان اصولوں پر غور کر کے دیکھیں کہ وہ صاف ستھرے اور واضح قسم کے اسلامی اصولوں کو استعمال کر کے تیز رفتار تدریج سے بغیر کسی خون ریز تصادم کے اس سے بہتر نتائج حاصل کر سکتے ہیں جو کسی دوسرے ملک نے آج تک خونی انقلاب اور لشتر کاری کے نتیجے میں حاصل کیے ہیں۔ نیز ان کو اقتصادی عدل کی قیمت میں نہ دین و ایمان دینا پڑے گا، نہ اپنی آزادی۔ بلکہ ان کا دین و ایمان پہلے سے زیادہ درخشاں ہوگا اور ان کی آزادی اور زیادہ مستحکم ہو جائے گی۔

نوجوانوں کی ذمہ داریاں

معاشرہ کی اقتصادی اصلاح کے لیے میری نگاہ میں دوسرے طبقوں سے زیادہ بھاری اور وسیع ذمہ داریاں ان نوجوانوں پر عائد ہوتی ہیں جو اقتصادی موضوعات کا مطالعہ اعلیٰ مدارج تک کر چکے ہیں، یا تکمیل دور سے گذر رہے ہیں۔

اُن کے اوپر نہ صرف ملک کے موجودہ نظام اقتصادیات پر تحقیقی کام کرنے کی ذمہ داریاں ہیں بلکہ انہیں سرمایہ داری رجدید اشکال، اور سوشلزم پر بھی بصیرت افروز لٹریچر تیار کر کے قوم کے سامنے رکھنا چاہیے تاکہ انہیں نعرہ باز لوگ مغالطوں کا شکار نہ بنا سکیں۔ یوں بھی ہمارے ہاں دوسرے مختلف شعبوں کی طرح اقتصادیات کے دائرے میں علمی کام کا بڑا خوفناک قحط طاری ہے۔ ہم ابھی تک اس قابل بھی نہیں ہیں کہ پاکستان میں اقتصادیات پر لکھی جانے والی اعلیٰ درجے کی علمی و تحقیقی کتابوں سے الماری کا ایک خانہ بھی بھر سکیں۔ علی الخصوص جدید اقتصادیات کا اسلامی نقطہ نظر سے تنقیدی جائزہ لینے اور اسلامی نظریۂ اقتصادیات کو مضبوط دلائل کے ساتھ پیش کرنے کی مساعی اتنی کم ہیں کہ ہم بڑی کد و کاوش کے بعد شاید دو تین کتابیں تلاش کر سکیں۔

میری تمنا یہ ہے کہ کچھ ذی علم نوجوان ذوق تحقیق سے سرشار ہو کر اس عظیم الشان کارنامے کے لیے کمر ہمت باندھ لیں کہ وہ اسلامی نقطۂ نظر سے جدید ضروریات کے مطابق پورے علم الاقتصاد کو مرتب کریں گے۔

لے اگر فیملی پلاننگ جیسی غیر اسلامی تحریک کے لیے سارے ملک میں اداراتی کا جال پھیل سکتا ہے تو ادارہ کفالت اجتماعی کے مقدس کام کے لیے کیوں ایسا نہیں ہو سکتا۔

اسلامی علم اقتصادیات کی صحیح اور امتیازی تدوین کی راہ یہ ہے کہ اقتصادیات کے ہر باب اور مسئلہ اور موضوع پر ترتیب وار اسلام کی اقتصادی فکری، عقلی، اخلاقی اور قانونی تعلیمات ہم آہنگی کے ساتھ پیش کی جائیں اور جدید ترین طرز استدلال کے ساتھ اُن کے اخذ کردہ نتائج کو بہترین، معتدل اور متوازن ثابت کیا جائے۔

میں اپنے بیدار دل نوجوانوں سے یہ امید استوار کرتا ہوں کہ وہ تمام غلط نظریات اور بنیادوں کو متزلزل کر دیں گے جن پر مروجہ اقتصادی لٹریچر کھڑا ہے اور لوگ اس کے ہر شوشے کے ساتھ اندھا دھند مکھی پر مکھی مارنے کا معاملہ کرتے چلے آ رہے ہیں۔

میں یہاں ایک آدھ مثال عرض کرتا ہوں۔ آپ ذرا "نظریہ قدر" (Theory of value) پر ناقدانہ نگاہ ڈالیے کوئی نظریہ اطمینان بخش نہیں۔ لے دے کے ایک نوجوان کے لیے چونکہ مارکس کے ہاں انقلابی قدرت کا سحر موجود ہے، لہٰذا بہت سے لوگ اس کے نظریۂ قدر پر ایمان لے آتے ہیں۔ حالانکہ وہ بالکل بے تکی اور بے بنیاد نقل ہے۔

ذرا سوچیے کہ مصنوعات میں قدر کیا چیز پیدا کرتی ہے؟

اور اس سے پہلے یہ سوچیے کہ مصنوعات کیسے وجود میں آتی ہیں؟

یا دوسرے لفظوں میں کوئی بھی تخلیقی عمل (عالم خیال میں، فنون لطیفہ میں یا صنعت میں) کس شے لازم کے بل پر وجود میں آتا ہے؟

وہ شے لازم ہے "انسانی تعاون"!

انسان مدنی الطبع ہے۔ وہ جو کچھ ہے، دوسروں کے ساتھ مل کر ہے۔ اس کے خیالات بھی جو شکل اختیار کرتے ہیں تعاون و تعامل کی اس فضا میں کرتے ہیں جو دوسروں کے ساتھ مل کر رہنے اور کام کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ اگر کسی چیز کو بنانے کے لیے محنت صرف کر رہا ہے تو دوسرے انسانوں کی ضرورتیں اس کے سامنے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر ہم قدیم دور وحشت میں بھی چلے جائیں تو آدمی کے اپنے وجود کے ساتھ کم سے کم اس کے بیوی بچوں کا وجود شامل ہوگا اور ان کی ضرورتوں کا احساس اس پر طاری ہوگا۔ پھر مثلاً ایک لکڑہارا اگر لکڑی کاٹ رہا ہے تو اس کے ہاتھ کی کلہاڑی لوہار کی بنائی ہوئی ہے، یا ایک موچی اگر سلائی کر رہا ہے تو دوسرے انسانوں نے اسے اس کے کام کے لیے لوازم فراہم کیے ہیں۔

پس نظریۂ قدر کی اساس فی الحقیقت انسانی تعاون پر ہے جو اسلام کا خود ایک اصل الاصول ہے۔ اسی تعاون کی ایک شکل سرمایہ و محنت کا تعاون ہے۔

اس طرز فکر سے دو بڑے اہم نتائج اقتصادیات کے لیے نکلتے ہیں:۔

ایک یہ ہے کہ تعاون ہمیشہ آزاد آدمیوں کے درمیان ہوتا ہے، کوئی مجبور آدمی آزاد آدمی سے تعاون نہیں کر سکتا۔ مجبور آدمی صرف اطاعت کر سکتا ہے۔ پس اصول تعاون کا تقاضا یہ ہے کہ موجودہ صنعتی دور میں محنت کش کو مجبورانہ سطح پر گرنے سے بچایا جائے۔

دوسرے یہ کہ تعاون کا اصول اگر مصنوعات میں قدر پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے تو ان کے منافع اور ان کی افادیت میں حصہ داری کیلئے بھی ضروری ہے۔ یعنی خود تقسیم دولت کے طریقوں میں بھی اصول تعاون ہی کی روح کو کارفرما ہونا چاہیے۔ یہ نہیں کہ آپ ضابطے کی مزدوری دینے کے

لے مارکس کے نظریۂ قدر کا بے حد مغالطہ انگیز بلکہ فریب دہی کی حد تک پہنچا ہوا جزو وہ ہے جو قدر زائد (surplus value) سے متعلق ہے۔ مارکس جب یہ دکھاتا ہے کہ قدر زائد جو مزدور کا حق ہے اسے سرمایہ دار لے اڑتا ہے اس تشریح سے سرمایہ دار ایک ظالم اور [illegible]

فارغ ہو گئے بلکہ سب سے پہلے کام لینے والا اور اس کے بعد پورے نظام ملکی کا فرض ہے کہ وہ مزدور کو اس کی ضروریات پوری کر کے دے (جبکہ اس کی اجرت ضروریات سے کم رہ گئی ہو)

اسی طرح ایک نہایت ہی قابل غور مسئلہ یہ ہے کہ دور جدید کی بھاری صنعتوں (خصوصاً دفاعی) اور عالمی مسابقت کے حالات نے ایسے وجوہ پیدا کر دیئے ہیں کہ حکومتیں ایک حد تک اقتصادی دائرے میں براہ راست بھی دخیل ہوتی ہیں اور ایک حد تک منصوبہ بندی اور دوسرے ذرائع سے ——— نیز بہت سی صنعتوں کو وہ اپنے ہاتھ میں لینے پر بھی مجبور ہوتی ہیں (ایسی حد تک ضروریات کی گنجائش اسلام میں بھی شروع سے ہے) ان حالات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اقتصادی قوت اور سیاسی قوت میں گٹھ جوڑ پیدا ہو جاتا ہے، اور ظاہراً جمہوری ماحول ہوتے ہوئے بھی عوام بے بس ہو جاتے ہیں۔

خصوصاً اگر ہم اپنے ملک میں سیاسیات و اقتصادیات کے تعلق کی تاریخ پر نظر ڈالیں، اور پھر آئندہ کی ضروریات و امکانات کو بھی پیش نظر رکھیں تو یہ بات کسی طرح سود مند نہ ہو گی کہ سیاسی اور اقتصادی قوتوں کو یکجا ہونے دیا جائے، یا ان میں سودے بازی اور گٹھ جوڑ کے راستے کھولے جائیں۔ یہ صورت عوام کے حق میں سخت ضرر رساں ہے، اور وہ اس شکل میں آہستہ آہستہ بے بس ہو کے رہ جاتے ہیں۔

میرے ذہن میں ایک نئی تجویز نے جنم لیا ہے، جسے میں ان ذی صلاحیت نوجوانوں کو ذہنی میراث کے طور پر تفویض کرتا ہوں جو اسلامی نقطۂ نظر سے علم الاقتصاد پر کام کریں وہ یہ ہے کہ جس طرح اب سے پہلے نظام حکومت کے تین شعبوں (انتظامیہ۔ مقننہ۔ عدلیہ) کی مکمل علیحدگی کا تجربہ کیا جا چکا ہے، کیوں نہ ہم ایک قدم آگے بڑھائیں اور اقتصادیات کے چوتھے شعبے کو بھی علیحدہ اور مستقل حیثیت دے دیں۔ اس صورت میں انتظامیہ کے اندر آنے والے غلط ساخت کے لوگ نہ تو صنعت و کاروبار پر اثر انداز ہو سکیں گے اور نہ ان سے سیاسی سودا بازی کر سکیں گے۔ اور جو نیا ادارۂ اقتصادی تشکیل پائے گا، وہ ایسی کوئی بڑا کھیل نہ کھیل سکے گا کہ اس کے اوپر ایک بڑی طاقت نگراں ہے۔

میں یہاں شعبہ اقتصادیات کو چلانے والے ادارہ کا کوئی تفصیلی نقشہ کسی حالت میں دینا نہیں چاہتا، البتہ اس کے کام کرنے کی شکل یہ ہو گی کہ اقتصادی ضروریات کی قانون سازی تو مقننہ ہی کے ذریعے ہو گی اور منصوبہ بندی اور معاشی پالیسیاں دونوں اداروں کی مشترکہ کمیٹیوں کے ذریعے ہو سکیں گے۔ لیکن قوانین اور منصوبوں اور فیصلوں اور پالیسیوں کے تحت عملی اقدامات اور تفاصیل کا طے کرنا اقتصادی ادارے کے ہاتھ میں ہو گا۔ وہی قوانین و ضوابط کے مطابق قرضے اور درآمدی و برآمدی لائسنس جاری کرنے کے فیصلے کرے گا۔

میں سوچنے والے دماغوں کو اس نئے موضوع پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہوں۔

آخر میں اپنا ایک مادر مزدوری عقیدہ بیان کر دینا چاہتا ہوں۔ خالص اقتصادی شعبے میں ہمیں سرمایہ داری اور سوشلزم کے دو گونہ مادہ پرستانہ نظامات کے مقابلے میں ایک ایسا نظریاتی و اصولی منشور مرتب کرنا ہے جسے نہ صرف پاکستان کے اسلام پسند اہل نظر اور عوام لے کے آگے بڑھیں بلکہ جو آگے چل کر اتحاد عالم اسلامی کے رجحان کے ساتھ ساتھ پورے عالم اسلامی میں جڑ پکڑ لے اور اسے قبول کرنے والے نوجوان مضبوط ایمانی اور سائنٹفک ہو توں سے مادیت کے خلاف معرکہ آرا ہو سکیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) معلوم ہوتا ہے۔ پھر مارکس جب سوشلزم کی بات شروع کرتا ہے تو مخاطب سمجھتا ہے کہ مارکسی انقلاب کے معنی یہ ہیں کہ قدر زائد مزدور کو ملا کرے گی۔ مگر جس طرح تاریخ میں آج تک قدر زائد مزدور کے پاس نہیں رہی اسی طرح سرخ انقلاب کے بعد روس میں بھی وہ قدر زائد مزدور سے چھین کر سرکاری خزانے میں گئی اور سرکاری خزانے سے اس کا ایک بڑا حصہ اس نئے سرمایہ دار طبقے کی جھولی میں پڑا جو پریزیڈیم کے ارکان، پولٹ بیورو، کمیونسٹ پارٹی کے عہدہ داروں، دانش وروں، آرٹسٹوں اور سائنس دانوں پر مشتمل ہے۔ اسی قدر زائد سے سٹالن کی بیٹی کی وہ شادی ہوئی تھی کہ جس سے دنیا مرعوب ہو کر رہ گئی (داس)۔

Tussamag
COUGH SYRUP
MADE IN GERMANY